مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۃ البقرہ (جلد ۲) —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

—— سورۃ البقرہ (جلد ۲) ——

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیراہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	فروری 2011ء
مطبع	....	باقر پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح
سورۃ البقرۃ

میں نے اس سورت کے متن کو امعانِ نظر سے پڑھا ہے۔
الحمداللہ یہ ہر قسم کی اغلاط سے پاک ہے۔
لہٰذا تصدیق کی جاتی ہے کہ ان کے متن میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

حافظ قاری عطاء اللہ
مستند پروف ریڈ، تاج کمپنی لمیٹڈ

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؑ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفیٰؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات واعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ البقرہ (2)
مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نوٹ: سورۃ البقرۃ کے سلسلے میں ضروری گزارشات جلد اوّل کے شروع میں تحریر کر دی گئیں ہیں۔

فہرست مشمولات (صفحہ 1 تا 23)

اکیسواں باب: **سورة البقرة** (2)، (آیات 63 تا 71)

بنی اسرائیل کی صحرائی زندگی اور نعمائے خداوندی کا ذکر 1
ذکر کا مفہوم: ہر آن قوانین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے 2
مہلت کا وقفہ انسان کو باز آفرینی کا موقع فراہم کرتا ہے 3
بنی اسرائیل کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے نزدیک سبت کے تذکرہ کی اہمیت کی وجہ جواز 3
قرآن حکیم کے نزدیک قوموں کی اجتماعی زندگی میں نظم وضبط کی پابندی کے اثرات کا نتیجہ 5
انفرادی مفاد پرستی کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے دور کا ایک واقعہ 5
ضبط خویش اور احترام قانون کا جذبہ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی پابندیوں سے ہی پیدا ہوتا ہے 6
قوم بنی اسرائیل سبت کے روز مچھلیوں کو نہ پکڑنے کی پابندی پر بھی قائم نہ رہ سکی 7
یہودی ضبط خویش کی نفسیاتی کمزوری کے باعث اعتماد کی لازوال نعمت سے محروم ہو گئے 7
قرآن حکیم انسانی بصیرت کو جلا بخشنے کے پیشِ نظر چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا 8
لفظ لعنت کوئی گالی نہیں، یہ تو نعمتوں کی خوشگواریوں سے محروم ہو جانے کا نام ہے 9
لعنت کے اس لغوی مفہوم کے بعد انسانوں کے لیے بندروں جیسی خصوصیات اپنا لینے والی آیت کے تفسیری تراجم کی نوعیت 9
دوسروں کی تقلید کرنے والا شخص عقلی طور پر مفلوج ہو جاتا ہے 10
تقلید پرست قوم تو اپنے فیصلے بھی خود کرنے کے قابل نہیں رہتی 10
محکوم قوم باہمی طور پر فرقوں میں بٹ جانے کی بنا پر اپنے مرکز کو ہی فراموش کر دیتی ہے 11
کوئی قوم یک لخت زوال پذیر نہیں ہو جاتی 12
تباہی کی اصل وجہ قانون کے احترام کی طرف سے بے رخی ہوتی ہے 12
چار سو سال تک غلام رہنے والی قوم بنی اسرائیل کے ہاں ایک بچھڑا ذبح کرنے کا اہم سبق آموز واقعہ 13
یہودیوں میں ابن اللہ کا تصور اور دیو مالائیت 13
فرعون کی غلامی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم، سامری کی جادوگری، بچھڑے کی پوجا، ضرب کلیم کے 40 سالہ صبر آزما صحرائی سفر کی کشمکش 15
اہل مصر کی بُت تراشی کے اثرات کہاں تک پہنچے 14
علامہ غلام احمد پرویزؒ کے گھر کا مذہبی ماحول 15
تعلیمی اور ذہنی طور پر زاویہ نگاہ بدلے بغیر بچھڑے کے

بت کو توڑا ہی نہیں جا سکتا 16
''سانڈ'' کی شناخت کے بہانے خدائے علیم سے طرح
طرح کے سوالات کیے جا رہے ہیں 17
اے خدائے علیم وخبیر اور رحیم و کریم! تیری عظمتوں کو سلام!
تیری طرف سے ان بار بار کی وضاحتوں کو سلام! انسانی عقل کیا
جانے کہ تو کیا ہے؟ وسیلے کی تلاش کے سلسلہ میں ایک روایت 18
حقیقت کو تسلیم کرنے میں عقیدت مندی سب سے
بڑی رکاوٹ ہوتی ہے 19
تاریخی شہادتوں کے پیش کرنے کا مقصد کسی اصول کو
علم وشعور کی رو سے تسلیم کروانا ہوتا ہے 19
کوئی انسانی بچہ نہ کافر ہوتا ہے، نہ مسلم، نہ وہ شیعہ ہوتا ہے،
نہ وہ سنی، فرقوں کی پچڑوں میں ہم اسے خود بند کرتے ہیں 20
آہستہ آہستہ گروہ بندی کے یہ افسانے مسلّمہ بنتے چلے جاتے ہیں 20
پاکستان بننے کے بعد اس مملکت خداداد میں فرقہ واریت جیسی
دیرینہ بیماری کی مزید مہلک صورت اختیار کرنے کی وجہ جواز 21
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زیر تربیت پروان چڑھنے والی نئی نسل کی
معرکہ آرائی اور اس کا خلاصہ 21
قرآن حکیم کے نزدیک اس قسم کے واقعات کو بیان کرنے کا مقصد 22
قرآنِ حکیم کی طرف سے دیئے گئے اصول غیر متبدل ہوتے
ہیں جبکہ جزیات کی یہ صورت نہیں ہوتی 23
قرآنِ حکیم نے جن جزیات کو متعین نہیں کیا، انہیں متعین
کرانے کی کوشش نہ کریں 23
نئی نسل کی قرآنِ حکیم سے برگشتہ ہونے کی بنیادی وجہ 24
نئی نسل کے سلسلہ میں محترم پرویزؒ کا ذاتی تجربہ 24
قرآن حکیم اپنے ہاں قصے کہانیاں بیان نہیں کرتا بلکہ
زندگی کے اصول بیان کرتا ہے 25
اس کرہ ارض کا مستقبل دین کی شمع نورانی سے وابستہ ہے،
مذہب کی فرقہ واریت کی تعلیم سے نہیں 26
بائیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2) (آیات 72 تا 82)
بنی اسرائیل کے فرد کے قتل ہونے پر قاتل کا سراغ لگانے کے
سلسلہ میں پیش کردہ تراجم وتفاسیر اور ان کی پیدا شدہ الجھنیں 27
شرک کی نوعیت جس سے انسان کی انسانیت ہی مفلوج
ہو کر رہ جاتی ہے 29
شرک میں مبتلا اقوام سوکھے گھاس کی مانند ہو کر رہ جاتی ہیں 29
علامہ پرویزؒ کی زندگی کا وہ حصہ جو تصوف کی جان لیوا
مشقتوں کی نذر ہو کر رہ گیا 31
نفسیاتی طور پر چہرے پر ابھرنے والے نقوش جو حقائق
کو پرکھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں 31
لغت میں ''زندہ کر دینے'' کا مفہوم کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے 32
قرآنِ حکیم قدم قدم پر ہر انسان کو عقل وفکر کی دعوت دیتا ہے 35
بار بار کی بدعملی انسان کو پتھر کی طرح سخت کر دیتی ہے 36
یہود کا دیا ہوا نظامِ سرمایہ داری آنکھوں کی شبنم کو خشک کر دیتا ہے 37
قرآن حکیم کی تعلیم کا انداز بڑا معنی خیز ہوتا ہے، وہ
افسانہ نگاری نہیں کرتا 37
قرآن حکیم کے نزدیک سنگ دلی کا مفہوم 38
داعی انقلاب کے دل کی کیفیت اور اس کی جگر سوزی کی حالت 39
قرآن حکیم کو بغیر سوچے سمجھے پڑھنے کے سلسلہ میں مختلف
تاویلیں بیان کی جاتی ہیں 39

تورات کی موجودہ صورتِ حال اوران کی طرف سے
حقائق کو چھپانے کی کوشش 40
قرآن حکیم نے حقیقی تورات کا کافی حصہ تو اپنے ہاں محفوظ کر
رکھا ہے یہی چیز ہندوؤں کے ہاں پائی جاتی ہے 41
دین کے حقائق کو سمجھنے کے سلسلہ میں ہماری حالت 41
قرآن حکیم سے دین خداوندی کے سلسلہ میں
امت مسلمہ کی کیفیت جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے 42
خودفریبی کی انتہا جو ہمیں خواب غفلت سے بیدار
ہونے ہی نہیں دیتی 42
ہمارے ہاں شریعت پر عمل کرنے کا طریق 43
فکرِ قرآنی سے بے خبر، مذہبی تنکوں سے بنی ہوئی کشتی کے سہارے
زندگی کی تلاطم خیزیوں میں الجھی ہوئی مسلم قوم کا سفر حیات 44
مذہب کی آڑ میں مالی مفادات کے حصول کا نتیجہ اور انسانی
ذات کی قدر و منزلت 45
جہنم کا احساس ہونے کے باوجود اس سے بچنے کے لیے
شفاعت کا عقیدہ 45
قرآن حکیم کے مطابق مکافاتِ عمل کے تحت اس قسم کے
عقائد کا کوئی وزن نہیں 47
قرآن حکیم کی پیش کردہ تعلیم کی وارننگ اور نبی اکرم ﷺ
کا اپنے متعلق ارشاد 48
تمام تر مایوسیوں کا علاج قرآن حکیم کی بیان کردہ صداقتوں
کو عملی طور پر تسلیم کرنے میں ہے 48
تفسیر طبری کی پیش کردہ خوش فہمیوں نے قوم کو اُمی بنا دیا 49
فکرِ قرآنی کے ساتھ صدیوں سے ہونے والا سلوک اور اس کا نتیجہ 50

تیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)، (آیات 83 تا 88)

یہودیوں کے عقیدے کی تلخیص 52
قرآنِ حکیم کے نزدیک گھریلو زندگی کی اہمیت اور نوعیت 53
حیوانی اور انسانی زندگی میں فرق 53
احسان کا مروّجہ مفہوم 54
احسان کا قرآنی مفہوم ہی انسان کے لیے جہانِ نو کی
نوید کا باعث بنتا ہے 55
غیر تربیت یافتہ معاشرے میں ماں باپ کی
حالت زار اور اولاد کی ذہنیت 56
ماں باپ کی اطاعت کا غلط تصور عقلِ انسانی کو پابندِ سلاسل
بنائے رکھتا ہے 56
بچے کی Guidance (راہنمائی) بچے کی حد تک
ضروری ہے، اس کے بعد اس کی نوعیت بدل جائے گی 57
عقلِ انسانی کے لیے قرآن حکیم کی راہنمائی ہر لحاظ سے
مکمل ہے، والدین کے بعد رشتے داروں سے حسن سلوک 57
انسانیت کی دنیا میں ہر وہ شخص جو معاشرے میں تنہا رہ جائے،
قرآن حکیم کے نزدیک یتیم ہے 58
جنت کے حصول کا راز تو نوع انسانی کے لیے سامان
نشو و نما مہیا کرنے میں مضمر ہے 58
خدا کے ساتھ کیے گئے وعدوں کی خلاف ورزیوں کی
نوعیت اور ان کا محسوس نتیجہ 59
خدا سے وعدہ خلافی کے بعد نیک عملی کا معیار اور
باہمی طور پر چندوں کی طلب کا سلسلہ 60
دنیا بھر میں خیرات کے متعلق پائے جانے والے غلط

تصورات اور قرآنی معاشرے کے بنیادی خدوخال 61
معاشی نظام کے سلسلہ میں غلط معاشرے کے بنائے
ہوئے خود ساختہ قوانین کی نوعیت اور ان کا استعمال 61
ویلفیئر اسٹیٹ کی نوعیت 62
نظامِ سرمایہ داری کے تحت چھینی ہوئی حرام دولت کو حلال کا طریقہ 63
خیرات کے یہ چند ٹکڑے بانٹنے والوں کی اور لینے
والوں کی اندرونی حالت 63
مذہب میں انسان قدم قدم پر دوسروں کا محتاج ہوتا ہے'
دین ہر بنی آدم کو باوقار زندگی کا اجتماعی پروگرام عطا کرتا ہے 64
دین کے نظام میں طبقاتی تقسیم نہ ہونے کی وجہ سے
انسانیت خیرات کے ٹکڑوں کی محتاج ہی نہیں رہتی 65
''جتنا کسی سے ہو سکے کر لینا چاہیے'' کا یہ تصور نفسیاتی
تقسیم اور طبقاتی نظام کو جنم دیتا ہے 66
کتاب کے ایک حصے پر عمل اور دوسرے حصے سے
انکار کا نتیجہ جہنم ہے 66
انسانی زندگی کے حصے بخرے نہیں کیے جا سکتے' یہ تو
پوری کائنات کی طرح ایک وحدت ہے 68
جو قوم مذہبی طور پر جس قدر پختہ ہوگی دنیا کی قوموں میں
وہ اتنی ہی ذلیل متصور ہوگی 69
ملکی حالات کے پیشِ نظر معاشی نظام کے علاوہ
خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت 69
دینِ خداوندی کے بلند ترین' مفسر نبی اکرم ﷺ کا ایک فرمان'
جو نوعِ انسانی کے ہر فرد کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ بنا رہے گا 71
خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ نظامِ حیات کے
ٹکڑے ٹکڑے کرنے والوں کا انجام 71
بنی اسرائیل کے سلسلہ میں کتبِ سابقہ کا ذکر اور تورات کی نوعیت 72
قرآنِ حکیم میں کتاب موسیٰ کا نام تورات نہیں ہے 73
یہ تاثر غلط ہے کہ نبی بغیر کتاب کے بھی آتا تھا 74
قرآن حکیم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام
کی عظمت کا تذکرہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے 74
اس کائنات کے استحکام کا تمام تر دارومدار قانون کی
قوت میں مضمر ہے جب کہ وحی کے معنی قوت کے بھی ہیں 75
ملائکہ کے سلسلے میں لفظ ''روح'' کی مزید وضاحت اور مفہوم 75
وحی کے متعلق یہودیوں کا عقیدہ 76
وحی انسانوں کو اُن کے خود ساختہ عقائد سے نکال کر عالمگیر
انسانیت کے لیے غیر متبدل اصولوں کی حامل بنا دیتی ہے 76
مذہب کی دنیا میں مذہبی پیشوائیت کا کردار اور اس کا نتیجہ 77
علم و شعور اور کردار کی بلند ترین سطح پر پہنچنے والی شخصیت کی
خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا 78
صلاحیتوں کے سلسلہ میں انسانی ذات کی نشوونما کا
دارومدار علم کے حصول پر منحصر ہے 79
قلب کی کشادگی کے بغیر انسان اپنی ذات کی نشوونما سے
محروم ہو جاتا ہے اور قرآن حکیم نے اسے لعنت کہا ہے 79
قلبِ انسانی کی ماہیت اور اس کے ادراک کی تپش 80
چوبیسواں باب: **سورۃ البقرۃ (2)**' (آیات 89 تا 96)
سابقہ درس کے سلسلہ میں پیش کی جانے والی آیت (2:85)
کی ایک ضروری وضاحت 81
عبوری دور میں اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ

کتاب کے دونوں حصوں کو پیش نظر رکھیں 83
کرۂ ارض پر موجودہ نظامِ سرمایہ داری کا ماحصل نوے فیصد
لوگوں کی محنت کو سمیٹنے کے سوا کچھ اور نہیں ہے 83
موجودہ اختیار کردہ معاشی نظام انسانیت کو فریب دینے کی
ایک محسوس اور واضح مثال ہے 84
قرآن حکیم کے نزدیک فریب خوردہ قوموں کا انجام 84
دوسروں کو ان کے پاؤں پر کھڑا کرنے کی بجائے انہیں
مدد کا محتاج بنا دینا' جرم کے مترادف ہے 85
باطل نظام کو حق کا نظام سمجھتے ہوئے اس کی بنیادوں کو مضبوط
کرتے رہنا جرمِ عظیم ہے 86
ہزار برس سے مسلمان قوم بنی اسرائیل کی طرح فریب
خوردگی میں مبتلا چلی آ رہی ہے 86
علم کی بلند ترین چوٹی ہر آن انسان کو آخر تک مزید بلندیوں
کی طرف متوجہ کرتی رہتی ہے 87
ہر قوم ایک آنے والے کے تصور کی گرویدہ ہے اور ان کی
اپنی اپنی تنہا منزل ہے 87
قوم کا زاویہ نگاہ بدل جانے سے اس کی تاریخ بدل جاتی ہے 88
امت مسلمہ کی بدحالی کی وجہ جواز: قرآنِ حکیم کو ضابطہ
حیات بنانے کی بجائے اسے ثواب تک محدود کر رکھا ہے 89
زندگی کے ہر شعبہ میں خود ہمارے ہاں پائی جانے والی
تنگ نظری کی کیفیت 90
دین سراپا مساوات انسانیہ کا علم بردار ہوتا ہے جب کہ
مذہب تضادات کے مجموعہ کا گہوارہ 90
نبوت کے سلسلہ میں یہودیوں کی تنگ نظری' زندگی کے
حسانات سے محرومی کا باعث بن گئی 91
ہماری کہانی' بنی اسرائیل کی زبانی 92
بنی اسرائیل کے انبیائے کرام کی مخالفت خود بنی اسرائیل
کی طرف سے کیوں؟ 92
جب قرآن حکیم جا بجا حتمی طور پر انبیائے کرام کو اَغْلِبَنَّ
قرار دیتا ہے تو پھر ان کے قتل ہو جانے کے کیا معنی؟ 93
لفظ قتل کا قرآنی مفہوم اور منصب نبوت کی کامیابی کی تفصیل 94
روشنی کی موجودگی اندھیرے پر غالب نہ آ سکے' یہ ناممکن ہے 95
انبیائے کرام کی تحقیر کیوں' دیوتاؤں سے محبت کیوں؟ 96
حریم کعبہ میں ایک بار پھر آستینوں میں چھپے بتوں کی
آرائش کا اہتمام 96
''سمعنا'' کے سلسلہ میں ثواب کے غلط مفہوم نے ہمیں
قرآنی حقائق تک پہنچنے ہی نہیں دیا 97
کعبہ کے تین سو ساٹھ بتوں کے مقابلے میں تین ہزار بتوں کی پوجا 98
دلوں میں سائیں جی کی محبت اور قرآن سے بغاوت 99
روزِ محشر جزاءِ شفیع المذنبین کا عقیدہ اور رسول اللہ کی
خدا سے درخواست 99
اگر جنت کا حصول اس قدر یقینی ہے تو پھر ہم موت کی
تمنا کیوں نہیں کرتے؟ 100
جہانِ فردا کی زندگی کے پرکشش نظاروں کا پرنور دیدار'
پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کا متقاضی ہے 101
تقسیمِ ہند کے دور میں نظم وضبط کی کم مائیگی کا نتیجہ
لاکھوں افراد کی قربانیوں کی شکل میں ظاہر ہوا 102
زندگی کو کسی بلند نصب العین کی خاطر جہانِ فردا کے حوالے کرنا'

حیاتِ جاوید سے لطف اندوز ہونا ہے 102
مذہب پرستی کے باعث دین خداوندی سے محروم قوم کے لیے
نہ زندگی ہوتی ہے اور نہ ہی موت 104
پچیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)' (آیات 97 تا 103)
یہودیوں کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کی مخالفت کی بنیادی
وجہ نیز قومیت کے محدود تصور کے علاوہ جبرائیل کی مخالفت 105
غیر از نبی کوئی شخص بھی وحی کی ماہیت کو جان ہی نہیں سکتا 106
قرآنِ حکیم کی تعلیم کو پیش کرنے کا طریق 107
وحی کے سچ ہونے کا ثبوت قرآنِ حکیم کا پیش کردہ نظام حیات ہے 107
عالمِ امر اور عالمِ خلق میں ملائکہ کی ماہیت اور فرائض کی نوعیت
نیز بنی اسرائیل کی طرف سے ملائکہ پر اعتراض کا جواب 108
قرآنِ حکیم کی آیاتِ بینات پر اعتراض کرنے والوں کی ذہنیت 109
قوانین خداوندی کے دائرہ سے باہر نکل کر زندگی گزارنے
والے کو قرآن حکیم نے فاسق کہا ہے 110
یہودیوں کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ ان پر کسی قوم نے
بھروسہ نہیں کیا 110
یہودیوں نے ہمیشہ اپنے ہاں نظام سرمایہ داری کی بنیاد
پر سود خوری کو اولیت دی ہے 111
یہودیوں کا منافقانہ طریق اور نبوت کے سلسلہ میں ایک اعتراض 112
تاریخ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق پایا جانے والا
ایک بڑا ہی غلط تصور 113
یہودیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جرم کی نوعیت 113
رومیوں کی غلامی کے باوجود بنی اسرائیل کا حق پر مبنی ایک دعویٰ 114
ہیکل کے اندر مذہبی پیشوائیت کا حکومتی کنٹرول اور
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی نوعیت 114
قرآن حکیم کی مخالفت کرنے والوں کا کردار اور
قرآنی تعلیم کے گمنام مبلغین کو فراموش کرنے کا نتیجہ 115
قرآنی آواز کو دبانے کے لیے وضعی روایات کا سہارا
اور دعاؤں پر قناعت کا عمل 116
خدا کی کتاب کو پس پشت ڈالنے کا طویل عملی پروگرام 117
قرآن حکیم کی وہ آیت (2:102) جو ہمارے ہاں
مشکل ترین سمجھی جاتی ہے 117
قرآن حکیم کی آیت (2:102) کے متعلق نام اور
علمائے کرام کے تفسیری تراجم کی ایک جھلک 118
تفسیر طبری کے مطابق مذکورہ آیت کی تفسیر 119
حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی کا تذکرہ 120
مذکورہ آیت کے پہلے ٹکڑے کے بعد دوسرے حصے کی
تفسیر اور ہاروت و ماروت کا قصہ 121
زہرہ عورت کی کہانی' روایات کی زبانی 122
ہاروت و ماروت کے سلسلہ میں جادو سکھانے اور سیکھنے کی کہانی 123
ان تفاسیر کی روح سے قرآن حکیم کی یہ تعلیم دنیا بھر میں
پیش کی جا رہی ہے 124
حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق عہد نامہ عتیق کا بیان 125
مروّجہ تفاسیر کا اصل سرچشمہ اور اس کا اسلامی لٹریچر پر اثر 126
حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگشتری اور اسم اعظم کی فوقیت
اور اس کی تاثیر کے قصے 126
حضرت سلیمان علیہ السلام کی صحرانوردی کے بعد آپ علیہ السلام
کی تخت نشینی کا ذکر 127

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے حواریوںؑ کی عظمت کے بالمقابل اہل کتاب کی کتابوں میں بیان کردہ واقعات 128

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے متعلق امام طبری کے بیان کردہ قابلِ افسوس قصے 128

حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق پھیلائی ہوئی تہمتیں اور خرافات کے علاوہ ہاروت و ماروت کے خودساختہ قصے 129

قرآنِ حکیم نے اس قسم کے تمام افسانوں کی تردید کی ہے 130

چند ٹکوں کی خاطر زندگی کی نعمت کو فروخت کر دیا جاتا ہے 131

آخر یہ کیا وجہ ہے کہ صدیوں سے کسی نے ان تفسیروں کی تردید نہیں کی 131

چھبیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)' (آیات 104 تا 107)

سابقہ درس میں پیش کردہ آیت (2:102) کے مروّجہ تراجم کی تردید اور اس کا حقیقی مفہوم 132

قرآن حکیم کے الفاظ کا ترجمہ کسی شکل میں ہو ہی نہیں سکتا 133

مومنین کے لیے جماعت کی اہمیت' خصوصیات اور لوازمات کی وضاحت 134

نبوت کے سلسلہ میں یہودیوں اور مشرکین عرب کے اعتراضات کی وضاحت 135

خیر کا مفہوم اپنے عزم واستحکام اور فیصلہ کرنے میں انسانی ذات کا بااختیار ہونا ہے 136

خدا کی طرف اختیار وارادہ کی خصوصیت وہ خصوصیت ہے جو اس کائنات میں صرف انسان کو ہی حاصل ہے 137

لفظ خیر کی وضاحت کے بعد لفظ مَوَدَّة کا قرآنی مفہوم 138

وہ جس فرد کو چاہتا ہے' وحی کے لیے چن لیتا ہے اور پھر جو چاہے اس وحی کی خیر وبرکت سے مستفید ہو سکتا ہے 138

آیت 106 کا وہ ترجمہ جس کے باعث قومِ مسلم صدیوں سے ایک امت بننے سے قاصر ہے 140

قرآن حکیم کے خلاف پہلی چیز وہ تفسیر تھی جو چوتھی صدی ہجری میں زبانی روایات کی بنا پر لکھی گئی 140

مشلہ معہ کے نام پر وحی کی دو قسموں کا عقیدہ اور پھر شانِ نزول کا تصور: دوسری چیز 141

قرآنِ حکیم کے معنی کے سلسلہ میں مولانا رومؒ کا فرمان: تیسری چیز 142

پانچ سو آیتوں کا حکم منسوخ ہے کیوں؟: چوتھی چیز 142

مختلف فرقوں کی مختلف فقہ مختلف روایات اور مختلف فیصلے: پانچویں چیز 143

قرآنی آیات کی منسوخی کا یہ سلسلہ کم سے کم ہوتا ہوا' آخر 5 تک محدود ہو گیا: چھٹی چیز 143

قرآنی آیات کی منسوخی کے سلسلہ میں معتزلہ کو تختۂ دار پر بھی چڑھنا پڑا: ساتویں چیز: 144

قرآن حکیم کے سلسلہ میں خالق کائنات کی طرف سے ہر قسم کی حفاظت کائناتی اصولوں کی طرح اٹل ہے 144

قرآنی آیات کو منسوخ کرنے کی دلیل کی نفی 145

وصیت کے سلسلہ میں دیئے گئے واضح احکام کو منسوخ کر دیا گیا 145

اس آیت کو منسوخ کرنے کے سلسلہ میں ایک روایت جو بیان کی جاتی ہے 146

عقیدہ ناسخ ومنسوخ کی پیدا کردہ الجھنیں 146

وحی کے سلسلہ میں مختلف احکامات کی وضاحت 148

قرآن حکیم نے کس چیز کی منسوخی کی خبر دی؟ 149

مزید وضاحت کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کے دور کی مثال 150
قرآنِ حکیم کی عظمت اور اس کے مکمل ہونے کی شہادت
خود قرآن حکیم میں ہے 151
ذاتِ خداوندی اپنی ذات میں بے مثل ہے اور ابدیت کی حامل ہے 152
خدا تعالیٰ نے قرآن حکیم کے متعلق آخری خدشے کا
ازالہ بھی بڑے جلال کے ساتھ کر دیا 152
قرآن حکیم کے نزدیک جن جن چیزوں کا بدل جانا مقصود تھا'
وقت کے تقاضوں کے تحت انہیں بدل دیا گیا 153
خدا تعالیٰ قادرِ مطلق ہے لیکن اس کے باوجود اس نے
ہر چیز کے لیے قانون اور پیمانے وضع کر رکھے ہیں 154
خدا اگر کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی لم بھی بیان کرتا ہے 154
قدرت نے ہر زمانے کے اندر انسانی ظرف کے مطابق
انسان کو اقدار سے نوازا ہے 155
قادرِ مطلق ہونے کے باوجود خدا اپنے اوپر پابندیاں عائد کرتا ہے 156
ستائیسواں باب: **سورۃ البقرۃ** (2)' (آیات 108 تا 118)
نبی اکرم ﷺ کے ساتھ سوالات کے سلسلہ میں ایک
اہم آیت کا قرآنی مفہوم 157
قرآنِ حکیم کسی انسان کو کسی کی آزادی سلب کرنے کا حق نہیں دیتا 158
انسان اور حیوان میں صرف اقدار کا ہی فرق ہے 159
قرآن حکیم انسانیت کو زندگی گزارنے کے اصول دیتا ہے'
اسے ان پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کرتا 160
زندگی کے غیر متبدل اصولوں کو اختیار کرتے ہوئے
غیر ضروری رسومات پر عمل پیرائی کا نتیجہ 160
ارتقائی مراحل کے پیشِ نظر ثبات اور تغیر کے امتیاز کی اہمیت 162
دین کے بالمقابل مذہب زندگی کی ارتقائی منازل کو
جمود میں بدل دیتا ہے 162
ہمارے ہاں فقہ کے اندر قدم قدم پر جذبات کی گرفت
اور حرام و حلال فہرستوں کی بھرمار ہے 163
قانون ساز اداروں کے علاوہ جج صاحبان کی مجبوری کی
نوعیت اور پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تخصیص کا معاملہ 163
ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں نکاح اور خلع کا معاملہ اور
ہماری عدالتوں کی پریشانی اور ان کا حل 164
حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے اپنے اپنے وقت کے
تقاضوں کے مطابق جزئیات متعین کرنا ہے 166
مسلمانوں کے ہاں یہودیوں کا عمل دخل' تقدیر کا عقیدہ'
اور مضمرات 167
یہودیوں کی یا دیگر قوموں کی ترقی کا راز مذہب سے
چھٹکارا حاصل کرنے میں ہے 168
ملتِ اسلامیہ سیکولر انداز کے تصورات سے کیونکر بچ سکتی ہے؟ 168
اہلِ مذاہب نے اپنی مختلف قسم کی جزئیات کو دین بنا لیا اور
پھر جنت کی خود فریبی میں مبتلا ہو گئے 169
حصولِ جنت کے لیے دین کے پیمانے مذہب سے
مختلف ہوتے ہیں 170
نبی اکرم ﷺ کے مقابل یہود و نصاریٰ کا باہمی اتحاد لیکن
آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت بھی 171
سجدہ کا عملی مفہوم: قرآنی ضابطہ حیات کے مطابق کسی
معاشرے کا قیام ہے 172
قرآن حکیم نے مساجد کو امت واحدہ کے تصور سے دور
رکھنے والوں کو ظالم کہا ہے 173

توحید کے عملی پروگرام کے پیش نظر ہر مسجد کے ماتھے پر صرف مسجد امت واحدہ کندہ کر دیا جائے 173
مسجد نبوی ﷺ کے مقابل مسجد ضرار کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد 174
مسلمانوں میں تخریب کاری کی بنیادی وجہ مساجد کا باہمی اختلاف اور تضاد ہے 175
کشاد کی راہ، دین کی طرف سے پیش کردہ آئیڈیالوجی پر عمل پیرا ہو کر اپنا مال دوسروں کو دینے میں ہے 175
آج نماز کی ادائیگی کے سلسلہ میں صرف اس کی ظاہر پرستی کو ہی ضروری خیال کیا جاتا ہے 176
رسولوں یا بزرگوں کے مقام کو پیش کرتے وقت غلو سے کام لینا تباہی کا موجب ہے 176
خدا تعالیٰ کی ذات کا تصور فاطر اور بدیع السموات والارض کا ہے، اس کے ہاں تولید نہیں ہے 177
کسی شے کے عدم سے وجود میں لانے کو انسانی عقل سمجھ ہی نہیں سکتی 178
خدا کی طرف وحی کے نزولی عمل کو غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتا 179
خدا تعالیٰ کی ہستی تمام انسانی تصورات سے ماورا ہے 179
اربابِ معرفت کے دعویٰ کی کوئی حقیقت نہیں 180
دینِ حق عقل و بصیرت پر مبنی ہوتا ہے جب کہ کرامتوں کے تصور سے فہم و فراست اور آزادی سلب ہو کر رہ جاتی ہے 180
حضور ﷺ کے بیٹے کی وفات پر سورج گرہن (Solar Eclipse) ہونا کوئی معجزہ نہ تھا 182
حضور ﷺ کی صداقت کا ثبوت آپ ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ تھا 182
تصوف اور کرامات کی خیرگی میں علامہ پرویزؒ کے کچھ گزرے ہوئے لمحات کا ذکر 183

اٹھائیسواں باب: سورۃ البقرۃ(2) (آیات119تا125)

وحی کے سلسلہ میں مخالفین کا ایک اعتراض اور اس کا جواب 184
عمل کرنا انسان پر منحصر ہے لیکن مکافاتِ عمل کو بدلنا انسانی اختیار میں نہیں ہے 185
دوسروں کی غلط روش کے باعث نبی اکرم ﷺ کی حساس خیالی کی کیفیت 186
یہود و نصاریٰ کا نبی اکرم ﷺ سے مطالبہ 187
فرقہ بندی کی بنا پر انسان کی نفسیاتی کیفیت اور اس کا انجام 188
مذہبی متضاد خیالی ہو یا سیاسی، چالبازی فیصلہ قرآنِ حکیم کا ہی چلتا ہے 189
فرقہ بندی کی بنیادی وجہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی ہے 189
فرقہ واریت کا وجود علم و شعور کی بجائے جذباتیت کا رہینِ منت ہوتا ہے 190
دین میں دلیل و برہان کی فکر کا حامل شخص جذباتی طور پر مشتعل نہیں ہوتا 190
صدیوں سے ہمارے ہاں قرآن حکیم کے لفظ ''تلاوت'' کو مروّجہ تراجم کے تحت اپنانے کا نتیجہ 191
قرآن حکیم کی تلاوت اور اس کے اثرات 192
لفظ تلاوت کے بعد تمام مومن کی برتری کا ذکر اس کی عظمت کا ذکر 192
نوعِ انسانی کے لیے آخری ضابطۂ حیات کی اہمیت اور عقلِ انسانی کے تصورات کی فریب دہی 194

قرآنی نظام حیات کا نفاذ اس کرہ ارض پر ہوگا اور کوئی چھوٹ نہیں سکے گا 195
قوموں کا وقار اور ان کی فضیلت اجتمائی کردار کی رہینِ منت ہوتی ہے اور یہی اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام ہے 196
لفظ ابتلا کا لغوی مفہوم 197
ملوکیت کے دور میں مذہبی پیشوائیت کا کردار اور اس کے اختیارات کی وسعت 198
بیٹا باپ کے سامنے توحید کا پرچم لیے کھڑا ہے 198
حقائق کو محسوس انداز میں پیش کرنا زیادہ اثر انداز ہوتا ہے 199
قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ بیان کرنے اور اسے محفوظ کرنے کا مقصد 200
باطل کو باطل اور حق کو حق نہ کہنے والی قومیں ہمیشہ تباہ ہو جاتی ہیں 201
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے نوع انسانی کی امامت کا یہ مقام اپنے اندر قدم قدم پر کٹھن منازل سے گزرنے کا سبق لیے ہوئے ہے 202
مروّجہ تفاسیر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے پانچ ''مہمات'' کا ذکر 203
لفظ امام کا قرآنی مفہوم 204
قرآن حکیم کے نزدیک خونی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی 205
میدان بدر نے ''اہل'' کے مفہوم کی عملی طور پر وضاحت پیش کر دی 205
فکرِ قرآنی کا منتہا نوع انسانی کو عالم گیر برادری کی مالا میں پرونا ہے 206
اجتماعی پروگرام کے پیش نظر قرآنِ حکیم نے کعبے کو نوعِ انسانی کا مرکز قرار دیا ہے 207
ہر وہ چیز جسے خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، وہ پوری انسانیت کے لیے ہے 207
نوع انسانی کے لیے امن و سکون حاصل کرنے کا راز، عالم گیر نظام کی طرف رجوع کرنے میں ہے 208
انسانیت کے اس کھلے شہر کے متعلق نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث 208
حج کے اس موقع پر ملت اسلامیہ کی طرف انسانیت کی منفعت کے لیے ایک کھلا اعلانِ عام 209
ملتِ اسلامیہ کا سالانہ اجتماع یعنی حج اور پھر ضرورت کے مطابق گاہے گاہے چھوٹے اجتماعات یعنی عمرہ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوں گے 210

اٹھیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)، (آیات 125 تا 134)

سابقہ درس کے سلسلہ میں چند ایک سطور کی تجدید یادداشت 211
انسانیت کے لیے نسخہ کیمیائے ہونے کے باوجود ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ملت اسلامیہ کی حالت زار 213
مروجہ تراجم میں ''مصلیٰ ابراہیمی'' کے معنی اور اس پر عمل کا طریق کار 213
لفظ مصلیٰ کا مفہوم اور ملتِ ابراہیمی کا فریضہ 214
جب دین انسانوں کے خود ساختہ مذہب میں بدل جائے تو پھر کیا ہوتا ہے؟ 215
کعبہ کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک و صاف کرنے کا مفہوم، دین کی ممی شدہ لاشیں 215
قرآن حکیم کے نزدیک طواف اور اعتکاف کے عملی پروگرام کی نوعیت اور ہمارے عمل کا نتیجہ 216
اُمت مسلمہ کا فریضہ نوع انسانی کی چوکیداری کرتے ہوئے

الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانا تھا 217
قرآن حکیم کے نزدیک رکوع اور سجود کا مفہوم اور
نجات کا عالم گیر تصور 218
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نزدیک انسانیت کے لیے روٹی
کے مسئلے کی اہمیت 219
آج کعبہ کے ساتھ تولیت رکھنے والی قوم کی حالت زار اور
اس کی وجہ جواز 220
قوانین خداوندی کے وہ دو گوشے جن میں سے کسی ایک
کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا 221
کعبہ کی تعمیر کے دوران حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کہ ہماری
پیشانیاں صرف تیرے ہی قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہوں 223
منزل کا انتخاب اور راستے کا تعین: ان دونوں کا صحیح ہونا لازم ہے 224
یہودیوں کی خود ساختہ شریعت میں ''توبہ'' کا یا پلٹ کر آنے
کا تصور ہی نہیں 225
عیسائیت کے اس عقیدے کے برعکس قرآن حکیم کی تعلیم 226
قرآن حکیم نے اپنے ہاں قانون کے ساتھ علت کو بھی بیان کیا ہے 227
تصوف کے تصور کے برعکس تزکیہ کا لغوی معنی 228
تمکن فی الارض کے حصول کے بعد ملتِ اسلامیہ کا فریضہ 228
قرآن حکیم کی آیات کے آخر میں خدا تعالیٰ کی دی گئی
صفات، پوری آیت کا مفہوم بیان کر دیتی ہیں 229
لفظ ملت کے معنی پورے کا پورا نظام اور اس کا طریقِ کار ہوتا ہے 230
صفاتِ خداوندی انسانی زندگی کے لیے ایک معیار مقرر کرتی ہیں 231
علامہ اقبالؒ کے نزدیک خدا پہ ایمان کی نوعیّت اور
معاشرتی انقلاب کا طریقِ کار 231
مقامِ ابراہیمی کے مقابلے میں ہمارے ہاں برگزیدہ افراد کا
تصور اور قرآن حکیم کی تعلیم 233
زورِ بازو کی قوت اور بصیرت: یہ دونوں چیزیں مومن کی
زندگی کا زیور ہوتی ہیں 234
قوانینِ خداوندی انسان کو باوقار زندگی عطا کرنے کی
ضمانت مہیا کرتے ہیں 235
مومن کی زندگی کا ہر قدم، ہر آن زندگی کی بلند اقدار کے
سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے 235

تیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)، (آیات 135 تا 142)

بغیر کسی تخصیص کے پوری انسانیت کے لیے عالمگیر سطح پر
نظامِ حیات کا نام دین کہلاتا ہے 237
حنیفا کا مفہوم یہ ہے کہ دین خداوندی کے علاوہ کسی اور کی
طرف میلان کا تصور کرنا بھی شرک ہے 238
اُمت کی تشکیل تو نبی کی نسبت سے ہی وجود میں آتی ہے
لیکن دین کا معاملہ تو صرف خدا سے قرار پاتا ہے 239
کوئی نبی بھی دین کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتا 239
دین اسلام قبول کرنے والوں کا نام قرآن نے
صرف مسلم رکھا ہے 240
دین جب مذہب میں بدلتا ہے تو انسان کے تمام تصورات
کسی نہ کسی شخصیت تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں 241
قرآن حکیم اپنے ماننے والوں کو کشادہ نگہی سے ہم کنار کرتے
ہوئے تمام انبیائے کرام پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے 242
رواداری اور مفاہمت میں ایک بنیادی فرق ہے 243
توحید کی بنیادی لم ہی یہ ہے کہ تمام انبیائے کرام میں

کوئی بھی کسی فرقے کا پیروکار نہ تھا 243
ہندوستان میں برہمو سماجی تحریک کی حقیقت اور دین کی نوعیت 244
دنیائے مذاہب میں عالم گیر سطح پر خدا کا تصور، قرآن حکیم
کے بیان کردہ تصور کے متضاد ہے 245
دنیا بھر کی مخالفت کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ایسا جواب کہ
جس کا پھر کوئی جواب ہی نہیں ہے 245
مذہب کے خدا اور دین کے خدا میں فرق 246
عیسائیت کے نزدیک اعمالِ حسنہ کی بجائے حضرت مسیح
کے کفارے پر ایمان لازم ہے 247
خدا کی طرف آنے والے کسی نبی کا تعلق بھی گروہ بندیوں سے
نہ تھا، وہ تو دین کو پیش کرنے والے تھے 247
قرآن حکیم میں پاروں کی تقسیم اور کعبے کی حیثیت 248
یہودیوں نے خدا کے دین کو قومی تصور کرتے ہوئے
اپنا مرکز بیت المقدس کو بنا لیا تھا 249
تاریخ اور روایات کا یہ بیان کہ نبی اکرم ﷺ نے تیرہ سال تک
بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائے رکھا، یہ صحیح نہیں ہے 249
انسانیت کے مرکز کعبۃ اللہ کو نظر انداز کر کے قومی نسبت سے
بیت المقدس کی طرف رُخ کرنا توحید کی ہی نفی تھی اور ہے 250
اس قسم کے خودساختہ افسانوں کو اور تصورات کو پیش کرنے
کا مقصد اور طریقِ کار؟ 251
خودساختہ روایات کے تحت دنیا کے ''بت کدوں میں پہلا وہ
گھر خدا کا'' کے عظیم تصور کی تردید 252
دوسرے پارے کی شروع کی آیات کا مروجہ ترجمہ اور تجزیہ 253
خدا تعالیٰ کے ہاں مشرق اور مغرب کی نسبتوں کی کوئی حقیقت نہیں 254
صراطِ مستقیم کی بنا پر عالمگیر انسانیت کے لیے کعبہ کو بیت اللہ
کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے 255
قوم مسلم کو تو عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کا تصور عطا کیا گیا ہے 255
صلوٰۃ کا لفظ تو ایک پورے نظام کے اتباع کا مفہوم
اپنے اندر لیے ہوئے ہے 255
نماز کا فلسفہ اور اہمیت 257
فحاشی کے مرکز میں جھنڈے کے احترام کی ایک مثال 257
وارکعوا مع الرکعین کا قرآنی اور عملی مفہوم 258
کسی نظام یا فارم کی حقیقت سے پیدا ہونے والے تمام
تر نتائج ایک آئیڈیالوجی کے رہینِ لغت ہوتے ہیں 259
قرآن حکیم کی طرف سے ایک ایسا سدابہار محکم نظام ہے کہ
جس پر کبھی خزاں نہ آئے 260
ملت اسلامیہ کی عظمت کا راز عملی طور پر اپنا رخ کعبہ کی
طرف کرنے میں ہی ہے 260
آج کا مسلمان تو کعبہ کے اندر پہنچ کر بھی فرقہ پرستی کے بت
کو علیحدہ نہیں کرتا 261
یہ تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں تعمیر ہونے والے
قبلے اور یروشلم کے قبلے میں بنیادی فرق 263
اکتیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2) (آیات 143 تا 152)
کعبہ پوری نوع انسانی کے لیے ایک ایسا سمبل ہے جو
اپنے اندر اجتماعت کا پیغام لیے ہوئے ہے 265
کعبہ کی طرف صرف منہ کر لینا ہی کافی نہیں، وہاں سے
اٹھنے والی آواز کے سامنے جھکنا بھی ہے 266
آج کرہ ارض کا گوشہ گوشہ قومیت کے تصور میں غسلِ خون

کی ہولی کھیل رہا ہے 266
کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حقیقی مقصد تو اپنے زاویہ نگاہ کو بدلنا تھا 267
قرآن حکیم کی آئیڈیالوجی اتنی بارآور ہوگی کہ اس کی خوشبو سے
کرہ ارض مہک اُٹھے گا 268
بیت المقدس کو قبلہ تسلیم کرنے سے کیسی پوزیشن سامنے آئی ہے 268
ہجرت کے بعد کعبہ پر مشرکین کا کنٹرول' آپؐ کے دل
میں گزرنے والے خیالات کی کیفیت اور خدا کا فیصلہ 269
صرف کعبہ کی طرف رخ کیے رکھنے کے سلسلہ میں
قرآن حکیم کا ارشاد 269
قرآن حکیم کا فرمان ہے کہ کعبہ کو تعمیر کرنے والی
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم شخصیت نہ یہودی تھی' نہ نصرانی 270
قرآن حکیم نے قبلے کا لفظ ملت' ملک اور نظام کے معنوں میں لیا ہے 271
قبلے کا مفہوم متعین کرنے کا مقصد اور اہل کتاب کی مفاد پرستی کا نتیجہ 272
قبلے کے قرآنی مفہوم کو صرف نماز کی حد تک محدود کرنے کا نتیجہ 272
کعبے کو کعبے کا مقام عطا کرنے کا پیمانہ اور اس کا محسوس معیار 273
قوموں کی عظمت اور انکی فضیلت کا معیار ان کے اختیار کردہ
نظام کا ہی رہینِ منت ہوتا ہے 274
نیکی کا قرآنی مفہوم اور اُسے اختیار کرنے کی بنیادی شرط 274
انسانی ضروریات کا تعین اور انسانی ہوس گیری کا نتیجہ 275
قدرت کی طرف سے انسانی جذبات ایک بہت بڑی نعمت ہیں'
اِن کو تباہ کیا ہی نہیں جا سکتا 279
قدرت کی طرف سے عطا کردہ کوئی قوت شر پیدا نہیں کرتی:
بات ان کے صحیح استعمال کی ہے 279
انسان کا قبلہ' نصب العین اور مرکز نگاہ قرآن حکیم متعین کرتا ہے 280
شخصیتوں سے وابستہ نظام کو دوام حاصل نہیں ہوسکتا 281
آخر قبلے کی اس قدر اہمیت کیوں؟ 281
صدیوں سے ملتِ اسلامیہ کی زبوحالی کی وجہ جواز 282
قرآن حکیم کے ایک لفظ کی روح کو مفلوج اور محدود کرنے کا نتیجہ 282
دین جب بھی مذہب میں بدلتا جائے تو اس کا پھر یہی نتیجہ نکلتا ہے 283
کاش ہماری نگاہ بصیرت قرآن حکیم کے عطا کردہ نور سے
منور ہو چکی ہوتی 284
وحی کا علم مادیت کے علم کے برابر نہیں ہوسکتا 285
قرآن حکیم کی پوری تعلیم ''ذکر'' کے لفظ میں سمٹا دی گئی ہے
جس کو تصوف نے بدل کر رکھ دیا 286
عربی زبان کے تحت ذکر کا مفہوم ''خدا کی طرف دیئے گئے
نظامِ زندگی کو بلند کرنا ہے'' 286
انسان کا اپنے جذبات کے تحت عمل کرنا' سب سے
بڑا شرک ہے 288
بتیسواں باب: **سورة البقرة (2)**' (آیات 153 تا 156)
قبلے کا تعین کرنا قرآنی نظامِ حیات کا تعین کرنا ہے 291
روس اور امریکا کے باہمی تصادم کی وجۂ جواز 292
قرآن حکیم کو اپنی اپنی زبان میں پڑھنے کی بجائے قرآن کی زبان
میں اس کا مطالعہ کریں' صلوٰۃ واستعانت کی ایک مثال 293
زندگی سانس لینے کا نام نہیں بلکہ ہر آن سربکف رہنے کا نام ہے 294
قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں لفظ شہید کا مفہوم اور ہمارے
ہاں پایا جانے والا تصور 295
قرآن حکیم کے نزدیک ''زندگی اور زندگی میں''
ایک بنیادی فرق ہے 296

قرآن حیاتِ باشرف کو زندگی کا نام دیتا ہے اور حیات
بے شرف کو موت 297
کچھ ذکر مقتولین فی سبیل اللہ کے مقامِ بلند کا اور انکی جدوجہد کا
قرآن حکیم نے میدان جنگ میں شہید ہونے والوں اور بچ
جانے والوں دونوں کو حیات ابدی کی بشارت دی ہے 299
مرنے کے بعد انسان کا، اس دنیا والوں کے ساتھ کوئی
تعلق باقی نہیں رہتا 300
انسان کی خوش فہمی اور غلط سوچ، انسان کو کئی قسم کی خوش
عقیدگیوں کے جال میں الجھائے رکھتی ہے 301
قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں ''روحانیت'' کا لفظ ہی استعمال نہیں کیا 301
میدان جنگ کے سلسلہ میں منافقین کا تذکرہ 302
جس طرح زندگی اور زندگی میں فرق ہے اسی طرح موت
اور موت میں بھی فرق ہے 302
مومن کی زندگی کا وہ اجرِ عظیم کہ جس کو بیان ہی نہیں کیا جا سکتا 303
مومن کی زندگی میں صبر و استقامت کی نوعیت 303
انا للہ وانا الیہ راجعون کا قرآنی مفہوم اور ہمارے ہاں
کے تراجم اور تصورات 304
لفظ توحید کی وضاحت اور اس پر عمل پیرا ہونے کا طریق 306
خدا کے پاس جانے کے سلسلہ میں شریعت اور
طریقت کا موجودہ تصور 307
وحدت الوجود اور رجعت الی اللہ کے تصور کے علاوہ ہندوؤں
میں آواگون کے چکر اور ہمارے ہاں کی شاعری 307
قرآن حکیم کے متعلق مولانا رومؒ کا فرمان 308
تسخیر کائنات کے سلسلہ میں ہونے والی گہری سازش کا نتیجہ 309
ہم نے قرآنِ حکیم کو چیستاں بنا دیا: اقبالؒ 310
آج کا مسلمان تو اناللہ کی آواز پر افسردہ ہو کر رہ جاتا ہے 311

تنتیسواں باب: **سورۃ البقرۃ(2)**' (آیات 157 تا 163)

صلوٰت کے سلسلہ میں پیش کی جانے والی آیت کی اہمیت
پر ایک اہم درس 312
''درود'' کا لفظ عربی زبان کا ہے ہی نہیں، یہ تو پہلوی زبان کا ہے 313
ہمارے ہاں درود شریف کی عظمت اور فضیلت 314
خدا ''درود'' بھیجنے کے لیے تو ہمیں کہہ رہا ہے لیکن ہم
یہاں خدا کو یہ کہہ رہے ہیں کہ ''تم درود بھیجو'' 314
خدا تعالیٰ کی ذات اور اس کے ملائکہ مؤمنین پر بھی
''درود'' بھیجتے ہیں 315
خدا اور اس کے فرشتے، انسانوں کو، مؤمنین کو، ظلمات سے
نکال کر روشنی کی طرف لے جاتے ہیں 315
ظلمات میں ہر قسم کی توہم پرستیاں، غلط نظریات،
غلط معتقدات اور باطل نظام شامل ہوتے ہیں 316
ظلمات سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریق اور آیام اللہ کی
اصطلاح کا مفہوم 316
جو کچھ انسانوں کے لیے خدا اور ان کے فرشتے کرتے ہیں
وہی کچھ کرنے کا حکم مومنین کو دیا گیا ہے 317
میدان جنگ میں، مومنین کے جم کر کھڑے ہو جانے کے باعث
اُن کے دلوں میں استقامت کا پیدا ہو جانا ملائکہ کا نزول ہی تو ہے 318
حق کی آئیڈیالوجی پر مبنی نظامِ حیات میں کائناتی قوتیں
آدم کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں 319
ذاتِ خداوندی اور اُسکے فرشتے، جماعت مومنین کے لیے

کس طرح مدد و معاون بنتے ہیں؟ 320
''وسلموتسلیما'' کا عملی مفہوم' اہمیت اور طریقِ کار 320
مملکتِ اسلامیہ میں ایک مرکز کی اطاعت کی اہمیت 320
نبی اکرم ﷺ کی حقیقی تعظیم کس طرح ممکن ہو گی؟ 321
رسول ﷺ اکرم کی اطاعت ایک مرکزِ ملت کی حیثیت سے تھی 322
اموال اور انفس کے متعلق ارشاد خداوندی 323
مذہب خودساختہ ذاتی عقائد کا نام ہے اور دین کی عمارت
قرآنِ حکیم کے غیر متبدل اصولوں پر استوار ہوتی ہے 323
قرآنِ حکیم کا معاشی نظام انسان کو دنیا بھر کی خباثتوں
سے ہمیشہ محفوظ رکھتا ہے 324
قرآنِ حکیم کے برعکس سیکولر نظامِ حکومت میں زکوٰۃ
کا خودساختہ تصور 325
مومنین کے لیے ذاتِ خداوندی کی طرف سے
تحسین وتبریک کی آوازیں 326
ملتِ اسلامیہ کی اس جفاکشی اور شوقِ آگہی کو ماند کرنے
کے لیے ایک گہری سازش کے خدوخال 326
ہزار ہزار دانوں کی تسبیح پر کہا جا رہا ہے کہ ''اللہ تو درود بھیجا کر'' 327
اسی حالت زار کے پیشِ نظر قرآن حکیم نے کہا تھا: ''سوچا کرو' 327
خودساختہ روایات کے تحت ایک عملی جدوجہد کو ثواب کے
ایک لفظ میں محدود کر دیا گیا ہے 328
صدیوں سے ہماری نماز فرقہ بندی کا سمبل بن کر رہ گئی ہے 328
صلوٰت کی اس تفصیلی گفتگو اور وضاحت کے بعد حج کا ذکر'
اور کچھ توہمات 330
صفا اور مروہ کی دو پہاڑیوں کے متعلق تورات کا بیان اور
پھر ہمارے ہاں کی روایات کا جائزہ 330
قرآنِ حکیم کے بیان کردہ حقائق سے دُوری کا نتیجہ پژمردگی
اور افسردگی کے سوا کچھ نہیں ہوگا 332
قرآنی حقائق کے واضح طور پر سامنے آجانے کے
باوجود ان کو چھپائے رکھنا خدائی نعمتوں سے محروم ہونا ہے 333
چونتیسواں باب: **سورۃ البقرۃ (2)** '(آیت 164:
انسان اور خارجی کائنات کا تعلق)
قرآنِ حکیم کے نزدیک غیر مرئی بسیط حقائق کو پیش کرنے کا طریق 334
علت ومعلول کے علاوہ تمام کی تمام کائنات کے لیے ایک
اکائی کا غیر متبدل اصول 335
دین کے مقابلے میں دنیا بھر میں پائے جانے والے
مذہبی تصورات کی نوعیت نتائج 335
انسانی زندگی کے ابتدائی دور میں کائنات کے متعلق
انسانی سوچ کی حالت زار 336
اڑھائی ہزار سال پیشتر حکمائے یونان کے نزدیک کائنات کا تصور 337
سقراط کا دیا گیا تصور کائنات جو آج تک ماند نہیں پڑا 337
ہندومت کے نزدیک مادہ کی دنیا کو فریب تصور کیا جاتا ہے 338
دنیائے مذاہب کے متعلق ''مذہب اور سائنس'' کے
عنوان پر ایک ناقابلِ فراموش کتاب 338
آج سے چودہ سو سال پیشتر وحی کی طرف سے عقل کو
جلا بخشنے والے کائناتی حقائق 339
ہندو مذہب کی موجودہ حالت آج بھی اس کی ذہنی پستی
کی ترجمانی کر رہی ہے 340
وحی نے انسان کو جہالت کی پستیوں سے اٹھا کر کائناتی علم

کا گرویدہ بنادیا 340
انسان کے سامنے کائنات کے جمالاتی پہلوؤں کا ذکر 341
کائنات کا ذرہ ذرہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کی کوئی شے
بھی فریب نگاہ نہیں ہے 341
کائناتی حقائق کو نظر انداز کرنا کفر ہے 342
ظہورِ اسلام کے کچھ ہی عرصہ بعد ہم مسلمانوں نے کائنات
کی افادیت اور اس کے مقام کو نظر انداز کر دیا 343
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ
قرآنِ حکیم کائنات کے متعلق کیا تصور پیش کرتا ہے 343
قرآنِ حکیم کی حقیقی تعلیم کی قدر و قیمت کو جاننے اور سمجھنے کا طریق 344
حواس کے تحت حاصل کردہ علم کے متعلق افلاطون کا
تصورِ حیات اور قرآن حکیم کی تعلیم 344
قرآن کے نزدیک جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ
جہنم کا ایندھن ہیں 345
صاحبانِ عقل و بصیرت ہر آن تخلیق ارض و سما اور لیل و نہار
کے اختلاف پر غور و فکر کرتے رہے ہیں 346
کائنات کی ہر شے پر متواتر غور و فکر کرنے کے بعد اسے
حق تسلیم کرنے والے کو مومن کہتے ہیں 347
بندۂ مومن کا شعار ہی یہ ہے کہ وہ کائنات کے ہر گوشے کو
جہنم سے جنت میں بدل دے 349
دنیا بھر میں قوموں کے معیارِ زندگی کو ماپنے کا طریق
''مذہب کی گرفت'' پر ہے: زیادہ گرفت' زیادہ ذلت و خواری 350
مذہب کی دنیا کے برعکس دینِ خداوندی میں متقی کا بنیادی تصور 350
آج تبلیغ کرنے کا انداز قابلِ غور بھی ہے اور باعثِ افسوس بھی 351
کائنات کی پستیوں اور بلندیوں پر علیٰ وجہ بصیرت غور و فکر
کرنے والے شخص کا ایمان ہر قسم کے ابہام سے بلند ہوتا ہے 352
یونان کا فلسفہ حیات صراطِ مستقیم کے بجائے Cyclic Order
(دائروی نظم و نسق) کا تصور لیے ہوئے ہے 352
قرآن حکیم اپنے ہاں چودہ سو سال پیشتر ارض و سماوات میں
زندگی کا ذکر کر رہا ہے 353
ارض و سماوات کے متعلق آج تک ہمارے ہاں پائے جانے
والے تصورات کی نوعیت اور قرآن کے نزدیک علما کی تعریف 354
کائنات کی ساخت پر غور و فکر کرنے والوں کے
دل و دماغ کی کیفیت اور اظہار خیال 355
مذہب کی نشو و نما ہمیشہ اندھیرے میں' جہالت میں اور
توہم پرستی میں ہوتی ہے 355
کیا اہل یورپ کی اقوام' مومن کی کیٹگری (شق) میں شمار ہوتی ہے 355
قوانینِ خداوندی کے مطابق مومن اور کافر کے لیے زندگی
کے دو اہم گوشے 356
آج نوع انسانی کو تین کیٹگری (شقوں) میں تقسیم کیا جا سکتا ہے 357
انسانی زندگی کے متعلق نبی اکرمؐ کا قولِ زریں 358
پینتیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2) (آیات 165 تا 169)
ذاتِ خداوندی کو ماننے اور سمجھنے کا طریق 359
نظامِ خداوندی کے قانون اور انسانی جذبات کے مابین
باہمی تصادم کی کیفیت اور نوعیت 360
ذرائع رزق کو ذاتی ملکیت میں لے لینا خدا کا ہمسر بن جانا ہے 361
قرآن حکیم تصریفِ آیات سے ہی سمجھا جا سکتا ہے 362
نظامِ ربوبیتِ عالمینی کے لیے کائنات کی پستیوں اور

بلندیوں میں بکھرے ہوئے خزانوں کی تفصیل 362
خدا سے محبت کرنے کا مفہوم اور اس کی شکل وصورت 363
لفظ محبت کا لغوی مفہوم 364
تصوف کی دنیا میں پائے جانے والے محبت کے تصورات'
قرآنِ حکیم کی تعلیم کے ہی خلاف ہیں 366
خدا سے محبت محسوس شکل میں اس کے عطا کردہ قوانین کی
اطاعت اور اتباع کا نام ہے 366
خدا کی طرف سے محبت کے جواب کی محسوس شکل 367
خدا سے محبت کے الفاظ کی بجائے قوانین خداوندی کی
اطاعت کے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں 368
قرآن حکیم کے نزدیک اولیا اللہ کا کوئی الگ کردہ نہیں ہے 369
اولیا اللہ کی پہلی نشانی: اقوامِ عالم کی امامت ہے 370
جہنم اور جنت کسی مقام کا نام نہیں بلکہ یہ دو کیفیات کا نام ہے 370
مکافاتِ عمل کے نتائج کی کیفیت 371
غلط معاشی نظام میں ذمہ داری بنیادی طور پر کس پر عائد ہوتی ہے؟ 372
باہمی الزام تراشی کا عمل قوموں کو جہنم میں لے جاتا ہے 373
درخشاں مستقبل کی محرومی کے باعث تباہ حال قوم کو ان کا
ماضی ہمیشہ درخشاں نظر آتا ہے 374
تقلید پرست قوموں کا انجام اور ان کے افراد کے
باہمی تکرار کا منظر 374
جذباتی کیفیت انسان کو پاگل بنا دیتی ہے 375
قرآنِ حکیم کے نزدیک جذباتی قوموں کا حشر 376
غلط روش سے تحفظ دینے کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف
سے راہنمائی 377
آج کرہ ارض کا انسان' انسان کے ہاتھوں محکومی' غلامی اور
تقلید پرستی کے قید خانے میں مقید ہے 378
ظہورِ نتائج کے وقت تقلید پرست قوم کے سامنے جہنم ابھر
کر سامنے آجائے گا 378
جنت اور جہنم کا انحصار اس آئیڈیالوجی پر منحصر ہوگا جو کسی
قوم نے اپنے ہاں اپنا رکھی ہوگی 379
قوم کو غلط لیڈ کرنے والے افراد کے لیے بھی دوگنا عذاب 380
قرآن حکیم کے نزدیک بدترین جرم عقل وفکر سے کام نہ لینا ہے 380
جہنم کی آگ سے محفوظ رہنے یا اس سے نکلنے کا طریق'
قرآن حکیم کے معاشی نظام میں ہے 381
جیل کی روٹی سب سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے 382
قرآنی معاشرے میں سامان زیست کی کیفیت اور نوعیت 382
چھتیسواں باب: **سورة البقرة**(2)' (آیات170 تا171)
کائنات کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ' زندگی کو
جامد بنا کر رکھ دیتا ہے 384
ہر صبح چڑھنے والا سورج' انسان کو ایک نئے راستے کی نشاندہی
کی طرف مائل کرتا ہے 385
مذہب میں اسلاف پرستی عین شریعت کا درجہ اختیار کیے ہوتی ہے 386
قرآن حکیم کے نزدیک جہنم میں زندگی بسر کرنے
والوں کی حالتِ زار 386
تقلید پرستی انسانی صلاحیتوں کو مفلوج ہی نہیں بلکہ جامد کر دیتی ہے 388
دین کے بالمقابل دنیا کا ہر مذہب ہمیشہ تقلید پرستی
کا گہوارہ ثابت ہوا ہے 388
قرآن حکیم کی عظمت یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو کبھی زبردستی نہیں منواتا 389

قرآنِ حکیم کے عطا کردہ اصولِ زندگی، کائنات کے
غیر متبدل اصولوں کی طرح، کبھی نہیں بدل سکتے 390
انسانیت کے پژمُردہ چہرے کو جلا بخشنے کے لیے، یہی وہ
حرفِ آخر (قرآنِ کریم) نسخہ کیمیا ہے جو محفوظ کر دیا گیا ہے 392
کسی کی بات کو تسلیم کرنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی
راہنمائی بڑی واضح اور محکم ہوتی ہے 393
شخصیات کی بنیاد پر قائم کردہ نظامِ حیات، ہمیشہ محدود
ہو کر ختم ہو جاتا ہے 393
خدا تعالیٰ نے عبودیت کے لیے صرف اپنے حکم کو ہی تسلیم کیا ہے 393
''چاہتے ہیں سو آپ کریں، ہم کو عبث بدنام کیا'' 395
مترفین کے سب سے خطرناک حربے کی نشاندہی اور
خدا تعالیٰ کے قانون کی طرف سے ان کا انجام 397
قرآنِ حکیم کی آواز پر مترفین کا اخلاق سوز حربہ اور کردار 398
ہمارے ہاں حاصل کیے جانے والے علم کی کیفیت اور افادیت 399
لفظ تقلید کا قرآنی مفہوم اور اثرات 399
جو روٹی اسلاف کے زیادہ قریب ہو، وہ اتنی ہی زیادہ قیمتی
کیوں ہو جاتی ہے؟ 400
غیر قرآنی سوچ انسانی ذہنیت کو ہمیشہ پیچھے کی طرف دھکیلنے
میں مصروف رہتی ہے 401
قرآن حکیم ہر آن، قدم قدم پر، انسان کو غور و فکر کی ترغیب دیتا ہے 402
قرآنِ حکیم کو قرآنِ حکیم کے آئینہ میں سمجھے بغیر، انسان میں
نفسیاتی پختگی آ ہی نہیں سکتی 402
حیوان ہوں یا انسان، جو کوئی بھی اپنی صلاحیتوں سے
کام لینا چھوڑ دے، اس میں وہ صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں 403
انسان کی سرکش عقل ہمیشہ انسان کے غلط جذبات کو
خوش نما بنا کر پیش کرتی ہے 403
شخصیت پرستی کا جال بڑا مضبوط ہوتا ہے اور اس کو توڑنا آسان
نہیں ہوتا 404
قرآن حکیم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنے کا مقصدِ عظیم 405
سینتیسواں باب: **سورة البقرة (2)**، (آیات 172 تا 176)
اجتماعی اور انفرادی حلال اور حرام کے مسئلے کی اہمیت
اور اس کی مختلف شکلیں 406
قرآنی بنیادوں پر آزاد مملکت کے خدوخال کی نوعیت اور
غلامی کی تعریف 407
حرام معاشی نظام میں حلال وطیّب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا 408
حلال و حرام اشیا کی نوعیت کے سلسلہ میں حدود کے تعین کا
معاملہ خدا تعالیٰ کے ہی پاس ہے 408
کسی انسان کا حلال و حرام کا اشتہار جاری کرنا، نوعِ انسانی
کو اپنا غلام بنانے کے مترادف ہوگا 409
خدا تعالیٰ نے چار چیزوں کو حرام قرار دیا ہے 410
حلال چیز کو بھی حلال کرنے کی ایک شرط سے مشروط کیا گیا ہے 410
غیر اللہ کے نام پر دی گئی حرامِ مطلق شے، ہمارے ہاں
حلالِ مطلق تصور کی جاتی ہے 412
بچپن کے دورِ تصوف میں اپنے منہ پہ کھایا ہوا طمانچہ کبھی
نہ بھولے گا: پرویزؒ 412
مذہب زدہ قومیں دین کے پر لطف نظاروں سے
ہمیشہ محروم رہتی ہیں 413
خدا تعالیٰ کی طرف سے حلّت و حرمت کے سلسلہ میں

ایک زبردست وارننگ 413
عیسائیوں کی شریعت احکام سے محروم ہے اور یہودیوں
کی خودساختہ شریعت عملی طور پر دشوار 414
قرآن حکیم کی روشنی میں حلّت وحرمت کے سلسلہ میں
نبی اکرم ﷺ کی وضاحت 414
قوانین خداوندی کے علاوہ خودساختہ پابندیاں
انسانی زندگی کو مفلوج ہی نہیں بلکہ جامد کردیتی ہیں 415
ارشادِ خداوندی کے علاوہ ہمارے ہاں حلال وحرام
کی خودساختہ لسٹیں 416
ارض وسما میں نبی اکرم ﷺ جیسی بلند ترین ہستی کو بھی
کسی حلال شے کو حرام قرار دینے کا اختیار نہ تھا 416
قرآن حکیم نے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے مقام
کو کلمے کے الفاظ میں متعین کردیا ہے 416
دنیا بھر میں قوموں کی زبوں حالی کی بنیادی وجہ مقامِ نبوت
کو پیش نہ رکھنا ہے 417
حلال کی اس تفصیل کے بعد لفظ ''طیباً'' کی وضاحت 418
ایک غلط نگہی کا ازالہ 419
لفظ طیّب کا قرآنی مفہوم 419
حرام قرار دی گئی چیزوں کی وجہ جواز 419
انفرادی حالت میں حرام شے کو ایک حد تک ہی
استعمال کرنے کی اجازت ہے 421
اضطراری حالت کے سلسلہ میں حضرت محمدؐ کے دور کا
ایک واقعہ اور وضاحت 421
قرآن حکیم کے معاشی نظام میں اضطراری حالت کی
نوبت ہی نہیں آتی 422
ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں
نبی اکرم ﷺ کی ایک روایت 423
حضرت عمرؓ کے دور میں قحط کے دوران اجتماعی زندگی
کی ایک روشن مثال 423
نظام صرف قوانین کا نام نہیں، یہ سیرت وکردار کا
رہینِ منت ہوتا ہے 424
جنسی جذبات کی تسکین کے لیے اضطراری حالت کے
سہارے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا 424
جنسیات کے متعلق قرآن حکیم کی تعلیم انسانی صلاحیتوں
کو مضمحل ہونے سے محفوظ رکھتی ہے 425
جنسی توانائی کو محفوظ کرنے والی قوم، قوتِ آزادی میں
بہت آگے نکل جاتی ہے 425
جنسیات کے متعلق اہل یورپ کی تحقیق 426
ہمارے ہاں حرام وحلال کے سلسلہ میں مرتب کی جانے
والی لسٹوں کی تفصیل اور ان کا مقصد 426
ثمنِ قلیل کا قرآنی مفہوم 427
رزقِ حلال کے مقابلے میں رزق حرام کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی 427
حیوان کے نزدیک حرام اور حلال کی اقدار کا تصور تک نہیں ہوتا 428
ہم صرف فتوؤں کو ہی نہیں بیچتے بلکہ اس کے ساتھ ہدایت
یعنی صراطِ مستقیم کو بھی بیچتے ہیں 428
اڑتیسواں باب: **سورۃ البقرۃ** (2)، (آیات 177 تا 179)
حرام وحلال کا معاملہ تمام مذاہب میں کچھ فرق کے ساتھ
مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے 430

عملی نتائج کے سلسلہ میں دین اور مذہب میں ایک بنیادی فرق 431
مذہب میں صرف ارکان کی صحیح ادائیگی کو ہی مقصود بالذات
سمجھ لیا جاتا ہے جبکہ دین میں ایسا نہیں 432
قرآن حکیم کا یہ خاصہ ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک
موتیوں کی لڑی کی طرح باہمی ربط ہے 432
رسومات میں الجھ کر رہ جانے والا شخص تنگ نظری کا شکار ہو جاتا ہے 433
قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ نظم وضبط، قرآنی
ضابطہ حیات کو عملاً متشکل کرنے کی ترغیب کے لیے ہے 434
قرآن حکیم کے نزدیک ایمان کی تعریف کیا ہے؟ اور
پھر یہ کہ ایمان لانے کا طریق کیا ہوگا؟ 434
کسی منزل کی صحیح ڈائریکشن کے لیے ایک گائیڈ کرنے والے
پر ایمان لانا ضروری قرار پاتا ہے 435
قرآن حکیم کی طرف سے ملنے والی آئیڈیالوجی، آسمان
پر چمکنے والے ستاروں کی طرح، کبھی دھوکا نہیں دیتی 436
قرآنی آئیڈیالوجی سے ثمر بار ہونے کے لیے حق پر مبنی
طرق واسالیب کو قرآن حکیم نے اعمالِ صالحہ کہا ہے 436
اللہ پر ایمان کے معنی یا لم، قوانین خداوندی پر ایمان لانا ہے 437
انسانوں کے بنائے ہوئے برہمو سماجی دین کی ایک مثال 437
خدا تعالیٰ کی طرف سے غیر متبدل اصولوں پر مبنی
وحی بذریعہ رسول ہوتی تھی 438
فطرت کی قوتوں کو دیوی اور دیوتا بنا لیا گیا جبکہ قرآن نے
انہیں ملائکہ کہا اور انسان کے سامنے انہیں سربسجود کر دیا ہے 438
آخرت یعنی ظہورِ نتائج کے وقت پر ایمان اور پھر اس ایمان کا نتیجہ 439
آخر کار انسان کو قرآن حکیم کی پیش کردہ ائیڈیالوجی
پر ایمان لانا ہی پڑے گا 439
خدا، ملائکہ، وحی، رسول، آخرت، پر ایمان لانے کے لیے
وہ معیار جو قرآن نے متعین کیا ہے، وہی تسلیم کیا جائے گا 440
ہمارے ہاں ایمان لانے کی کیفیت اور اس کا نتیجہ 440
مال و دولت کا حصول اور اس کو خرچ کرنے کا طریق،
قرآنی آئیڈیالوجی کے مطابق لازم قرار دیا جائے گا 441
قرآنی آئیڈیالوجی میں سُود وزیاں کے پیمانے ہی الگ الگ ہیں 442
قرآن حکیم کے معاشی نظام کی بنیاد انفاق کے
محکم تصور پر استوار ہے 442
ہر فرد کی انفرادی زندگی کو اجتماعی زندگی میں ڈھالنے کے لیے
پورے کا پورا نظام بدلنا ہوتا ہے 443
جو معاشرہ افراد کی ضروریات کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے
سر نہیں لیتا، وہ معاشرہ جہنمی معاشرہ ہے 444
قرآن حکیم نے اپنے ہاں عمل کے ساتھ احسان کا لفظ بھی
استعمال کیا ہے 445
نبی اکرم ﷺ کی طرف سے لڑی گئی جنگیں کیا
مدافعانہ تھیں یا جارحانہ؟ 445
مومن کی زندگی بھر کا مقصدِ حیات، عہد کی اہمیت اور
امانت وخیانت کا مفہوم 446
لفظ بر کا وہ قرآنی مفہوم جس کے تحت الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ
کے نظام کو عملی شکل دی جاتی ہے 448
چند ایک رسومات کے ادا کرنے کا عمل غیر قرآنی
معاشرے کا علاج نہیں 449
فریب نفس انسانی صلاحیتوں کو پامال کر دیتا ہے 450

مذہب کی دنیا انسان کو ہمیشہ خوش فہمی میں مبتلا رکھتی ہے'
تعمیری نتائج سے کبھی ہم کنار نہیں کرتی 450
انسانی زندگی کی اہمیت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے
جس کے وجود سے انسانی ذات کی نشو و نما پاتی ہے 451
انسانی جان کی حفاظت کا سوال ہو یا ذات یا خودی کی
نشو و نما کا معاملہ' اس کے لیے معاشرتی نظام ایک لازمی جز ہے 452
قصاص کا قرآنی مفہوم 452
قرآن حکیم اصول ہی ایسا متعین کرتا ہے کہ قوانین کی
لمبی چوڑی فہرستیں بنانے کی ضرورت ہی نہ پڑے 453
قرآنی معاشرے میں کوئی فرد بھی لاوارث نہیں ہوتا'
وہاں ہر فرد ایک دوسرے کا نگران ہوتا ہے 454
قرآن حکیم میں عدل و مساوات کی آیات کے سلسلہ میں
مروجہ تراجم کی نوعیت 454
مقتول کے وارثوں کے لیے خون بہا کے قانون کی وضاحت
اور ہمارے ہاں پایا جانے والا غلط تصور 455
قرآن حکیم نے قتل کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے قتل عمد اور قتل خطا 456
وارثان کو قتل عمد کی صورت میں خون بہا وصول کرنے کی اجازت ہی
نہیں قتل بالعمد کی سزا موت ہے کیونکہ قاتل معاشرے کا مجرم ہے 457
اکتالیسواں باب: سورة البقرة (2)' (آیات 180 تا 184)
قصاص کے سلسلہ میں "مجرم کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے" 460
قانونِ وراثت کی اہمیت بڑی حکمت پر مبنی ہے' چند ایک سوالات 460
وراثت کے سلسلہ میں وصیت کا حکم فرض کے طور پر دیا گیا ہے
نیز وراثت میں حصوں کے تعین کی وجہِ جواز 461
قرآن حکیم میں وصیت کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی جزئیات
تک متعین کی گئی ہیں 461
وراثت کے متعلق حصوں کا تعین 462
قرآن حکیم کی تعلیم کے بالکل برعکس ہمارے ہاں کا وراثت
کا قانونِ شریعت 463
مروجہ شریعت کے نزدیک وصیت کی آیات منسوخ ہیں:
یہ صحیح نہیں ہے 464
انسانوں کے فیصلوں کی بنا پر قرآن حکیم کی 500 آیات
کو منسوخ کر رکھنے کا نتیجہ 465
وضعی روایات کو نہ ماننے والا منکر حدیث قرار پاتا ہے 465
کیا تواتر سے تسلیم کی جانے والی روایت قرآن حکیم کی
آیت کو منسوخ کر سکتی ہے؟ 466
ہمارے ہاں صدیوں سے مذہب رائج ہے' دین نہیں:
پرویزؒ کی آہ و فغاں 467
کیا نبی اکرم ﷺ کا کوئی قول معاذ اللہ حکم خداوندی کے
خلاف بھی ہو سکتا ہے؟ 467
پاکستان کے مروّجہ قانون میں وصیّت کرنے کی نوعیت
قرآن کریم کے ہی خلاف ہے 467
وصیت کے سلسلہ میں چند ایک ضروری ہدایات 468
قرآن حکیم کے برعکس مذہب کے نام پر انسان کے
اپنے ہی حکم کا نفاذ 469
لفظ صیام کا قرآنی مفہوم "خود کو روکنا" ہوتا ہے 470
مقامِ مومن کی بنیادی خصوصیت: حکمِ خداوندی کی
ہر آن پابندی ہے 470
تصوف کی انتہا انسانی جذبات کی پامالی یا نفس کشی ہے

جوکہ ایک سعیِ لاحاصل ہے 471
مومن کی مصروفیات کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان 472
جماعتِ مومنین کے لیے ریفریشر کورس کے مہینے میں
(روزوں کے مہینے میں) پابندیوں کو برداشت کرنے کا نتیجہ 472
مجرمین کے بالمقابل دوسرا شخص اپنے اوپر خود پابندی عائد کرتا ہے 473
قدرت نے حضرتِ انسان کے لیے غیر متبدل اصولوں کے ساتھ
ساتھ ان مستقل اقدار کی حقانیت کو قدم قدم پر واضح بھی کیا ہے 474
مذہب کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو نتائج حاصل کیے
بغیر اُسے خود فریبی میں الجھائے رکھے 475
قانون کے ساتھ حکمت انسان کے ارادے کو عمل کے
میدان میں استقامت عطا کرتی ہے 476
اپنے آپ کو بدعملی کے نتائج سے محفوظ رکھنے کا نام تقویٰ ہے 476
روزے فرض کرنے کا مقصد انسان میں نہایت استقامت
کے ساتھ قانون کی پابندی کی استعداد پیدا کرنا ہے 477
پرویزؒ کی طرف سے' تین دن یا نو دن کے روزوں کے
سلسلہ میں' الزام تراشی کا جواب 478
روازوں کی گنتی کے پورا کرنا کے منطق قرآن کریم کا حکم 479
روزوں کے سلسلہ میں جناب مودودیؒ کی ایک عجیب وغریب منطق 481
قرآن حکیم کو عربی زبان کے محاورۂ عرب میں تصریف
آیات کے تحت ہی سمجھا جاسکتا ہے 482
لغت کی بنا پر روزوں کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے
احکامات کی وضاحت 482
حقیقی مفہوم کے برعکس اپنی علمی گم مائیگی کی بنا پر ہمارے
ہاں کیے گئے تراجم کی نوعیت 483
روزہ نہ رکھ سکنے کی صورت میں فدیہ دینے کی کیفیت اور نوعیت 484
چالیسواں باب: **سورة البقرة**(2)' (آیات 185 تا 188)
عیدالفطر دراصل جشنِ نزولِ قرآن کی وہ تقریب ہے
جس کو منانے کا حکم خود خدا قرآنِ کریم میں نے دیا ہے 486
قرآن حکیم کی عظمت کا بیان اور اس کی بنیادی خصوصیات کی وضاحت 487
قرآن حکیم کوئی ایسا حکم صادر نہیں کرتا جو ناممکن العمل ہو 488
قرآنِ حکیم کی راہنمائی کا ماحصل ہمیشہ محسوس شکل کی
صورت میں سامنے آتا ہے 488
روزوں کے دوران جنسی اختلاط کا معاملہ اور قرآن حکیم کی تعلیم 489
مذہب کی زبان میں یوں کہیے کہ تمام دنیاوی معاملات'
مسجد میں ہی طے ہوتے تھے 491
ہم نے آج مسجد کو صرف نماز کی حد تک محدود کر رکھا ہے 491
مذہب کے پیدا کردہ تصور کے برعکس دین میں
اعتکاف کا قرآنی مفہوم 492
قرآن حکیم نے کہیں بھی اپنے احکام کو غیر متعین شکل
میں بیان نہیں کیا 494
رزق کے سلسلہ میں زندگی کو بااصول طریق پر گامزن کرنے
کا فریضہ ہر لمحہ ادا کرنا ہوتا ہے 495
ذاتِ خداوندی کا قُرب حاصل کرنے کا ایک غلط تصور 496
لفظ ''دعا'' کی حقیقت اور خدا تعالیٰ کے ہاں اس کی
قبولیت کی نوعیت 496
''دعا'' کے معنی مانگنا نہیں بلکہ ''پکارنا'' کے ہوتے ہیں 497
خدا کی کتاب قرآنِ کریم قدم قدم پر انسانیت کی
پکار کا جواب دیتی ہے 498

خدا کی طرف سے عطا کردہ گائیڈ بک (قرآنِ حکیم) کے
مطابق سفرِ زندگی طے کرنے کا نام عبادت ہے 499
قرآن حکیم کی عطا کردہ راہنمائی سے غرور وتکبر برتنے کا
نتیجہ جہنم ہے 499
دعا کی قبولیت کے لیے شرطِ اولین 500
اعمالِ صالحہ کیے بغیر خدا سے کچھ مانگنے کا نتیجہ 501
فرعون کے متعلق دعا مانگنے کے سلسلہ میں حضرت موسیٰؑ اور
حضرت ہارونؑ کو خدا تعالیٰ کا جواب 501
دعا کی پہلی شرط: سرکش جذبات سے ہٹ کر صحیح
نصیب العین کا ہونا ضروری ہے 502
دعا کی قبولیت کے لیے شدتِ آرزو کی اہمیت 503
تکمیلِ آرزو کی کے عشق سے کائناتی قوتیں انسان کے
سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں 503
مستقل اقدار کی قدر و قیمت کو ذہنی طور پر تسلیم کرنے
کا نام ایمان ہے 504
عربوں کے ہاں دعا اور لفظ ''الداعیۃ'' کا استعمال اور شکر کا مفہوم 505
دعا کی قبولیت کا دارومدار اجتماعی نظام کے خدوخال کا
رہینِ منت ہوتا ہے 505
مذہب میں انسان کا خدا کے ساتھ تعلق سراپا انفرادی ہوتا ہے
جب کہ دین نوعِ انسانی کی حد تک اجتماعی نظام عطا کرتا ہے 506
قرآن حکیم کی تمام دعائیں اپنے اندر جمع کا صیغہ لیے ہوئے ہیں 506
آج دنیا بھر میں تمام کی تمام مسلمانوں کی حکومتیں ہیں؛
اسلامی یا قرآنی حکومت کہیں بھی موجود نہیں ہے 507
دعا کی قبولیت کے لیے انسان کو خدا کی پکار کا پہلے جواب
دینا ہوتا ہے 507
''مرشد'' کے لفظ کا قرآنی مفہوم 508
انسانیت کی دنیا میں خدا کے سوا کوئی دوسرے کا مرشد نہیں 509

قرآن حکیم کے طالب علموں کے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ خصوصی رعایتی ہدیوں پر دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے

نام کتاب	صفحات	نام کتاب	صفحات
سورۃ الفاتحہ (سٹوڈنٹ/اعلیٰ)	240	سورۃ الفرقان	389
سورۃ بقرہ مکمل تین جلدوں میں	1600	سورۃ الشعراء	453
سورۃ النحل	334	سورۃ النمل	280
سورۃ بنی اسرائیل	396	سورۃ قصص	334
سورۃ الکہف و مریم	511	سورۃ العنکبوت	387
سورۃ طٰہٰ	416	سورۃ روم، لقمان، السجدہ	444
سورۃ الانبیاء	336	سورۃ الاحزاب، سبا، فاطر	569
سورۃ الحج	380	سورۃ یٰسین	151
سورۃ المومنون	408	29واں پارہ (مکمل)	541
سورۃ النور	263	30واں پارہ (مکمل)	624

اکیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)' (آیات 63 تا 71)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَآ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّاذۡكُرُوۡا مَا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ
تَتَّقُوۡنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَكُنۡتُمۡ مِّنَ
الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِيۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡكُمۡ فِى السَّبۡتِ فَقُلۡنَا لَهُمۡ كُوۡنُوۡا قِرَدَةً
خٰسِـئِيۡنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلۡنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهَا وَمَا خَلۡفَهَا وَمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۶۶﴾ وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖۤ اِنَّ
اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا بَقَرَةً ؕ قَالُوۡٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا
ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا هِىَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكۡرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيۡنَ ذٰلِكَ ؕ
فَافۡعَلُوۡا مَا تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا لَوۡنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفۡرَآءُ ۙ
فَاقِعٌ لَّوۡنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيۡنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا هِىَ ۙ اِنَّ الۡبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيۡنَا ؕ وَاِنَّآ اِنۡ
شَآءَ اللّٰهُ لَمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوۡلٌ تُثِيۡرُ الۡاَرۡضَ وَلَا تَسۡقِى الۡحَـرۡثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا
شِيَةَ فِيۡهَا ؕ قَالُوا الۡـٰٔنَ جِئۡتَ بِالۡحَـقِّ ؕ فَذَبَحُوۡهَا وَمَا كَادُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۷۱﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1968ء کی 3 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا سلسلہ کلام سورۃ البقرۃ کی 63ویں آیت سے شروع ہوتا ہے:(2:63)۔

بنی اسرائیل کی صحرائی زندگی اور نعمائے خداوندی کا ذکر

آپ کو یاد ہوگا کہ ان آیات میں داستانِ بنی اسرائیل کو یہ بتانے کے لیے سامنے لایا جارہا ہے کہ جب کوئی قوم قوانینِ خداوندی کے

مطابق زندگی بسر کرتی ہے تو اسے اس دنیا میں کس قدر کامرانیاں اور شادابیاں میسر آتی ہیں اور جب وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرتی ہے تو کس طرح ان پر ذلت اور مسکنت' محکومی' افلاس اور بےبسی کی مار ماری جاتی ہے۔ یہ اگلے چند رکوع بھی اسی داستان کی مختلف کڑیوں پر مشتمل ہونگے۔ یہ داستان بڑی ہی عبرت انگیز اور حقیقت کشا ہے۔ ان پر جو انعامات ہوئے' ان کے سلسلے میں اب یہ کہا گیا ہے کہ ایک طرف تمہیں عام طبعی زندگی کی آسائشیں اور سہولتیں بھی اتنی میسر تھیں یعنی اس صحرا کی زندگی میں' کھانے کے لیے فطرتی سامان' پینے کے لیے صاف اور شفاف چشموں کا پانی اور بادل سایہ فگن تھے۔ اس کے بعد کہا کہ **وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ وَ رَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡرَ** (2:63) حفاظت کا سامان اس طرح سے دیا ہے کہ پیچھے ایک پہاڑ کھڑا ہے' اُدھر وہ اپنی حفاظت کی طرف سے بالکل مطمئن ہیں' بےخطر ہیں اور اس کے دامن میں زندگی بسر ہو رہی ہے۔ طبعی حفاظت کے لیے تو یہ سامان ہے اور اس کے ساتھ کہا کہ **خُذُوۡا مَاۤ اٰتَیۡنٰکُمۡ بِقُوَّۃٍ** (2:63) ان کی انسانیت کی زندگی کے لیے حفاظت کا سامان ایک ضابطۂ خداوندی ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ کس طرح قرآن نے یہ دو چیزیں **اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً** (2:201) کی تعبیر میں ارشاد فرمائیں کہ ایک طرف طبعی زندگی کا سامانِ حفاظت اس قدر محکم' قابلِ اعتماد دیا کہ پشت پر پہاڑ کھڑا ہے اور دوسری طرف انسانی زندگی کی تباہیوں سے بچنے کے لیے ایسا سامانِ حفاظت دیا یعنی ایک ضابطۂ قوانین دیا گیا ہے اور اس کے لیے کہا کہ تم اسے نہایت مضبوطی سے تھامے رکھو۔ **وَّ اذۡکُرُوۡا مَا فِیۡہِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ** (2:63) اسے ہر وقت اپنے پیشِ نظر رکھنا تاکہ تم زندگی کے ہر خطرے سے محفوظ رہ سکو۔

ذکر کا مفہوم: ہر آن قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ ذکر کے معنی کسی چیز کو ہر وقت اپنے سامنے رکھنا ہے۔ یہ وہی ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ زندگی کے مختلف Problems' مختلف مسائل سامنے آتے رہیں گے۔ جو بات بھی سامنے آئے تو اس وقت تمہارے سامنے اس ضابطے کی ہدایت ہونی چاہیے تاکہ تم فوراً دیکھو کہ یہ کیا راہنمائی دیتا ہے۔ اسے ذکر کہتے ہیں۔ اور پھر اس کے مطابق چلنا اور اس کا اتباع کرنا ہے۔ اس میں یہ دونوں چیزیں آجاتی ہیں۔ یہ دیکھیے! اگلے ہی لفظ میں کیسے اس بات کی وضاحت کر دی کہ ذکر کہتے کسے ہیں؟ کہا کہ **ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ** (2:64) تم نے اس کے بعد اس سے اعراض برتا' روگردانی کی۔ گویا جو ذکر ہے یہ اس اعراض اور روگردانی کی ضد ہوا۔ کسی چیز کے ذکر کے معنی ہوئے ''اس کا اتباع کیے چلے جانا' اس کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا' اس کے ساتھ تمسک کرنا' اسے مضبوطی سے تھامنا''۔ اور اس کے خلاف بات ہوگئی' اس سے اعراض برتنا' پہلوتہی کرنا' نظرانداز کر دینا۔ اسی سے آپ دیکھ لیجیے کہ ذکر کا قرآنی مفہوم' یہ تھا اور اس کے بعد ہمارے ہاں جو ایک عجمی روحانیت کا تصور آیا' تو اس میں ذکر کے معنی صرف ان الفاظ کا دہرا لینا' قلب

پر ضربیں لگانا' اس طرح سے قلب کو چلانا ہوگئے۔ اور قرآن نے تولیتم کے لفظ سے وضاحت کردی کہ ذکر کس چیز کو کہتے ہیں۔ تو قرآن کا ذکر یا خدا کا ذکر کے معنی یہ ہونگے کہ ''زندگی کے ہر مسئلے میں قرآن کے ضابطے کو سامنے رکھنا اور اس کا اتباع کرنا''۔ اور ذکر سے غفلت کے معنی ہونگے ''اسے نظرانداز کردینا' اس سے اعراض برتنا اور پہلوتہی کرنا''۔

مہلت کا وقفہ انسان کو بازآفرینی کا موقع فراہم کرتا ہے

کہا کہ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ (2:64) اس کے بعد تم نے اس سے روگردانی برتی' اس روگردانی سے بھی تم ابدی طور پر راندۂ درگاہ نہیں ہوگئے' ابھی تمہاری بازآفرینی کا موقع باقی تھا۔ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ (2:64) اس کے بعد تمہیں پھر موقع دیا گیا اور یہ جو مہلت کا وقفہ ہے' جس میں پھر سے بازآفرینی کا موقع دیا جاتا ہے' اسے خدا نے اپنا فضل اور باعثِ رحمت قرار دیا ہے۔ فی الواقع اگر ذرا سی لغزش اور کوتاہی پر اسی وقت گرفت ہوجاتی اور ابدی طور پر انسان مایوس قرار دیا جاتا تو اس کے بعد تو پھر زندگی مایوسیوں میں گھر جاتی' زندہ رہنے کے لیے اس کے پاس کوئی کشش وجاذبیت ہی نہ رہتی' بازآفرینی کا کوئی موقع ہی نہ رہتا۔ لغزشیں تو ہوسکتی ہیں اور ہوتی ہیں لہٰذا یہ جو تصور ہے کہ کسی ایک وقت کی لغزش سے ہمیشہ کے لیے انسان راندۂ درگاہ ہوجاتا ہے' یہ غلط ہے۔ مہلت کا وقفہ ہوتا ہے لیکن مہلت کے وقفے کے معنی ہوتے ہیں وہ وقفہ جس میں انسان حسنات سے' تعمیری کاموں سے' اپنے تخریبی کاموں کے نقصان کی تلافی کرسکے۔ اگر یہ وقت نہیں ہے' یہ موقع نہیں ہے تو پھر اس کے بعد جسے آپ توبہ کہتے ہیں اس کا مفہوم کچھ نہیں رہ جاتا۔ کہا کہ پھر ہم نے تمہیں ایک موقع دیا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یقیناً تم بڑے ہی نقصان میں رہتے۔

اس داستانِ بنی اسرائیل میں اتباعِ قوانین کے خوشگوار نتائج کی' اس سے اعراض برتنے سے ذلت ومسکنت کی اور' پھر ایک مہلت کا موقع دینے کی بات خاص طور پہ آئے گی۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ پھر کچھ وقت کے لیے ان کی شادابیاں عود کرآتی ہیں' پھر وہ اسی طرح سے اپنی روشِ کہن پر لوٹ جاتے ہیں' پھر نقصان اٹھاتے ہیں۔ یہ سلسلہ آخر تک چلتا ہے تا آنکہ انہوں نے آخر میں آکر ایک ایسی روش اختیار کی جس کے بعد دیکھا کہ اب یہ راہِ راست پر نہیں آتے۔

بنی اسرائیل کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے نزدیک سبت کے تذکرہ کی اہمیت کی وجہ جواز

اب یہ ہوا کہ تم نے پھر اعراض برتا۔ اس کے لیے قرآن نے ان کی زندگی کا' ان کی داستان کا' ایک واقعہ پھر پیش کیا۔ اور وہ واقعہ ہے جسے سبت کا واقعہ کہتے ہیں۔ یہ ان کی تاریخ میں ایک اہم چیز ہے۔ کہا کہ وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ (2:65)۔ سبت کیا تھا؟ یہ یہودیوں کا عقیدہ تھا اور تورات میں یہ چیز موجود ہے کہ خدا نے اس

کائنات کو ہفتے (Week) کے چھ دنوں میں پیدا کیا۔ گویا کائنات وجود میں بھی نہیں آئی تھی کہ ہفتے کے دن (Days of the Week) وجود میں آ گئے ہوئے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ جو تحریف شدہ کتابیں ہوتی ہیں' ان میں ایسی ایسی چیزیں آتی ہیں کہ ذرا سا بھی آدمی غور کرے تو سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہ کیا لکھ دیا گیا ہے؟ تورات میں کہا گیا ہے کہ چھ دن میں کائنات کو پیدا کیا' اس کے بعد خدا تھک گیا تو ساتویں دن اس نے آرام کیا۔ یہ جو ان کے ہاں آرام کا دن ہے یہ Saturday (سینچر) ہے یعنی Week (ہفتہ) نہیں بلکہ ہفتے کا دن' جو جمعہ اور اتوار کے درمیان آتا ہے' اس دن خدا نے آرام کیا۔ اسی اعتبار سے وہ اس دن کو اپنے لیے بھی کاروبار بند کرنے کا دن قرار دیتے ہیں۔ اس دن وہ کوئی کاروبار نہیں کرتے تھے اور پھر جب کاروبار نہیں کرتے تھے تو وہ پوجا پاٹ' پرستش' رسوم وغیرہ کی اس قسم کی کچھ چیزیں تھیں جو وہ کرتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک دن الگ کر دیا ہوا تھا جس میں کاروباری ناغہ ہوتا تھا۔ بات تو انہوں نے بعد میں عقائد کی لے لی اور ہوتا ہی یہ ہے کہ دین تو عملی زندگی سے متعلق ہوتا ہے' جب وہ مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو پھر اس کے پروگرام کی وہی جو عملی کڑیاں ہیں' وہ رسوم کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ ان کی مذہب کی دنیا کی بات تھی کہ سبت میں خدا نے چونکہ آرام کیا' اس لیے ہم بھی آرام کریں گے اور اس دن ہم پرستش میں اپنا وقت استعمال کیا کریں گے لیکن عملی زندگی میں بات اور تھی۔ ہفتے میں ایک دن کا یہ ناغہ کاروبار کے لیے بڑی ضروری چیز ہے۔ یہ جس طرح سے سفر میں سنگِ میل ہوتا ہے' میل کا نشان آتا ہے' تو آپ دیکھتے ہیں کہ سفر کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ بات کچھ بھی نہیں ہوتی' وہ صرف ایک علامت سی ہوتی ہے لیکن جونہی آپ دیکھتے ہیں کہ ایک میل اور ختم ہو گیا' آپ دیکھیے ذہنی طور پر وہ مسافت سمٹ جاتی ہے۔ ہفتے میں ایک دن کی جو چھٹی ہے' یہ ہفتہ' اتوار' سوموار کوئی شے نہیں ہیں' یہ تو ہم نے نام رکھے ہوئے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہم نے وقت کے گز کے اوپر گرہیں لگا رکھی ہیں ہم نے اپنے حساب وشمار کے لیے' دنوں کے Calculation کے لیے' یہ نام رکھے ہیں لیکن آپ دیکھیے کہ اگر دنوں کے نام نہ ہوتے' درمیان میں کہیں کوئی ناغہ نہ ہوتا' یہ تسلسل ہوتا اس میں زندگی کس قدر بور ہو جاتی۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو تصور ہے یہ زندگی کے کس قدر بور ہو جانے کا ہے۔ وہ جو ایک دن کا انقطاع آتا ہے' وہ جو ایک دن Sunday (اتوار) کا درمیان میں پڑتا ہے' آپ دیکھیے Monday (سوموار) تو ایسا شروع ہوتا ہے جیسے ہم نے کوئی نئی زندگی شروع کی ہے۔ بالکل Refresh (تروتازہ) ہو کر انسان جاتا ہے اس میں۔ یہ Weekend (اختتامِ ہفتہ) بڑی عجیب چیز ہے۔ ایک دن کا ناغہ وقت کی مسافت کی بھی کمر توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اچھی چیز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہود یوں کے ہاں بھی جب زندگی کے عملی مسائل سے

یہ لوگ دوچار تھے تو ان کے ہاں یہ چیز طے پائی تھی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وحی کی رو سے ان سے یہ کہا گیا تھا یا انہوں نے اپنے ہاں طے کیا تھا لیکن بہرحال یہ ایک بات طے کی تھی۔

قرآن حکیم کے نزدیک قوموں کی اجتماعی زندگی میں نظم وضبط کی پابندی کے اثرات کا نتیجہ

سوال یہ ہے کہ قرآن اس کو اتنی اہمیت دے کر کیوں سامنے لایا ہے؟ بات بڑی اہم ہے۔ اجتماعی زندگی ہمیشہ ایک نظم اور ضبط کے تابع بسر ہوتی ہے' اس میں چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی اپنے ہاں اہمیت رکھتی ہیں۔ جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ ایک مملکت کے اندر یہ Keep to the left کا قانون ہے کہ بائیں طرف چلو۔ یہ دائیں اور بائیں میں درحقیقت کوئی شے نہیں ہے۔ آپ کا جی چاہے دائیں طرف کہہ لیجئے جی چاہے بائیں طرف کار کھ لیجیے لیکن جب اجتماعی زندگی میں آپ ایک چیز کو طے کر لیتے ہیں' پھر اس کی بڑی اہمیت ہو جاتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں ضبط کے ماتحت' ڈسپلن کے ماتحت' جب آپ آتے ہیں تو ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی بھی آپ کو احتیاط برتنی پڑتی ہے' ان کی اہمیت ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ گوشت کا ناغہ ہے اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے کہ وہ منگل اور بدھ کا ہی دن ہو لیکن آپ نے مل کر طے کر لیا کہ ہم ایسا کریں گے۔ اب اس میں آپ دیکھیے کہ جو قومیں ایسی ہیں' جن میں ضبطِ نفس عادتاً داخل ہو چکا ہے' جنہوں نے اپنے ہاں یہ اپنی سیرت و کردار کا جز بنا لیا ہے کہ جو چیز بھی ہم اپنے اوپر عائد کریں گے' جو پابندی ہم اپنے اوپر عائد کریں گے' اس کا ہم احترام کریں گے تو جب ان سے یہ کہہ دیا جائے گا کہ ایک دن کا ناغہ ہے تو وہ ناغہ کریں گے لیکن جن قوموں میں ابھی اس قسم کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی ہوتی' جن کے ہاں قانون کا احترام نہیں ہوتا' انفرادی مفاد پرستی کے جذبات ضبطِ نفس کے اوپر غالب آئے ہوئے ہوتے ہیں' ان کے ہاں کیا ہوتا ہے؟

انفرادی مفاد پرستی کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے دور کا ایک واقعہ

ان یہودیوں کے ہاں منگل اور بدھ کے دن وہ جو بازار کی طرف کھلنے والا دروازہ ہے' وہ تو بند ہوتا ہے اور گلی کی طرف جو بیک ڈور (پشت کا دروازہ) ہوتا ہے' وہ آدھا کھلا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جو Afford کر سکتے ہیں' وہ سردیوں کے دنوں میں کیا' گرمیوں میں بھی' جن کے ہاں فرج ہوتے ہیں' وہ سوموار کی شام کو ہی اتنا گوشت لے لیتے ہیں کہ وہ جمعرات کی صبح تک چلتا ہے حالانکہ یہ چیز اس قانون کی Spirit (روح) کے خلاف ہے۔ عہد فاروقی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بھی تاریخ پیش کرتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45ء) نے جب ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد گوشت خرید رہا تھا' اتفاق سے بات بھی گوشت ہی کی تھی' تو آپؓ نے اسے روک دیا۔ آپؓ نے کہا کہ تم تو اتنا لے جا سکتے ہو لیکن اس لے جانے سے تمہیں پتہ ہے کہ ایک بھائی کو اس گوشت سے تم

آج محروم کر رہے ہو۔ تمہیں اس کا حق نہیں پہنچتا۔

ضبطِ خویش اور احترامِ قانون کا جذبہ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی پابندیوں سے ہی پیدا ہوتا ہے

کہنے کو یہ بات بڑی چھوٹی سی ہوتی ہے لیکن عزیزانِ من! جو کیریکٹر ہے وہ تو انہی چھوٹی چھوٹی سی چیزوں سے مرتب ہوتا ہے۔ آپ ان چھوٹی چھوٹی سی چیزوں میں احتیاط برتیں گے‘ تو آپ کے کیریکٹر میں استواری اور استحکام پیدا ہوگا۔ اور ان چھوٹی چھوٹی سی باتوں کو آپ Neglect (فراموش) کرتے چلے جائیں گے تو اس کے بعد آہستہ آہستہ آپ کے ذہن سے ضبطِ خویش اور احترامِ قانون کا جذبہ نکل جائے گا۔ پھر جو بڑی بڑی چیزیں ہیں‘ ان میں بھی آپ صرف یہ دیکھیں گے کہ ”سپاہی موڑ پہ تو نہیں کھڑا“۔ یہ جو سائیکل پر دوڑا رہے پہ جا کر آپ دیکھتے ہیں اور وہاں لیفٹ کی طرف سے جانا ہوتا ہے اور رائٹ کو جاتے ہوئے چند قدم کا فاصلہ کم ہوتا ہے‘ صرف سائیکل کا ایک پاؤں کم مارنا پڑتا ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ سپاہی نہیں ہے تو آپ وہاں جاتے جھٹ سے دائیں کی طرف چلتے ہیں‘ ایسے سیٹی بجاتے جیسے بڑے فاتح اور منصور جا رہے ہیں۔ یہ چیز کیا ہے؟ یہ وہی چیز ہے کہ اس قوم کے اندر ضبطِ نفس کی کمزوری ہے۔ جن قوموں کے افراد میں یہ کیفیت نہیں ہوتی‘ ضبطِ خویش کی عادت ہوتی ہے‘ وہ کبھی یہ نہیں دیکھتے کہ سپاہی کھڑا ہے یا نہیں۔ انہوں نے اپنے اوپر ایک پابندی عائد کی ہے‘ وہ اس پابندی کا احترام ضروری سمجھتے ہیں۔ قوموں کی اجتماعی زندگی کے اندر یہ جو چھوٹی چھوٹی پابندیاں ہیں‘ فی ذاتہٖ ان کی اہمیت کچھ ہو یا نہ ہو‘ لیکن ان کا جو ہم احترام کرتے ہیں‘ اس سے خود ہمارے کیریکٹر کے اوپر ایک بڑا اثر پڑتا ہے اس لیے ان پابندیوں کی بڑی ضرورت ہے۔

برادرانِ عزیز! پچھلے ہی درس میں‘ میں نے یہ کہا تھا کہ ایک طرف آپ یہ دیکھیے کہ ان چھوٹی چھوٹی سی چیزوں کو‘ جو رسمی شکل اختیار کر لیتی ہیں‘ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ان کو زندگی کی اساس اور بنیاد سے کوئی تعلق نہیں ہے: **لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ** (2:177) یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے نیکی کا کام یہ نہیں کہ مشرق کی طرف منہ کر لیا یا مغرب کی طرف منہ کر لیا۔ ایک طرف یہ بھی چیز ہے۔ دوسری طرف وہ یہ چیز بھی کہتا ہے‘ جب ہم چل کر تعینِ قبلہ کے متعلق آئیں گے تو وہ یہ کہتا ہے کہ تم دنیا کے کسی حصے میں بھی کیوں نہ ہو‘ تمہاری نگاہوں کا رخ اسی مرکز کی طرف ہونا چاہیے۔ اب دیکھیے وہاں اتنی سی بات نے کتنی اہمیت حاصل کر لی۔ معنی یہ تھے کہ فی ذاتہٖ یہ چیزیں کچھ ایسی نہیں ہیں لیکن جب آپ ان کو اپنی اجتماعی زندگی کا جز بنا لیتے ہیں‘ پھر یہ بڑی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔ میرے اور آپ کے نزدیک یہ چیز کہ پیٹی کہاں باندھنی چاہیے‘ بوٹ کا تسمہ کدھر ہونا چاہیے‘ کچھ معنی نہیں رکھتا لیکن جب آپ فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں‘ تو وہاں سپاہی کے لیے یہ چیزیں بھی ڈسپلن کا جز ہو جاتی ہیں۔ اگر اس کا ایک بٹن بھی کہیں کھلا ہوا ہو تو اس کا کورٹ

مارشل ہوجاتا ہے اور ہونا چاہیے۔ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے تو ضبطِ خویش پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جو آئے دن ہم آوارگی کا، پریشانی فکر ونظر کا رونا روتے رہتے ہیں، تو بات یہ ہے کہ قوم کے اندر یہ چیز باقی نہیں رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے شروع میں ان چھوٹی چھوٹی سی چیزوں کی اہمیت کو نظر انداز کیا، اس کے بعد جو بڑی بڑی چیزیں تھیں خود بخود ان کا دامن ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ برادرانِ عزیز! قرآن نے اس بات کا جو سبت کا ذکر کیا ہے، وہ اس لیے کیا ہے۔

قوم بنی اسرائیل سبت کے روز مچھلیوں کو نہ پکڑنے کی پابندی پر بھی قائم نہ رہ سکی

سبت کی یہ چیز کیا تھی؟ سورۃ الاعراف میں اس کے متعلق قرآن نے تفصیل بتادی۔ کہا کہ **وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِى السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ** (7:163) بات تو کچھ ایسی تھی کہ ان سے کہا گیا تھا کہ اس دن مچھلیاں نہ پکڑنا۔ یہ لوگ زیادہ مچھلیاں پکڑتے تھے، عام طور پر مچھیرے ہوتے تھے۔ کاروباری ناغہ تھا اور خاص طور پہ کہا گیا تھا کہ اس دن مچھلیاں نہیں پکڑنی۔ ان مچھلیوں کی یہ کچھ عجیب کیفیت ہے، اور پرندوں کی بھی یہی صورت ہے کہ اگر انہیں التزاماً یہ پتہ چل جائے کہ فلاں وقت میں یا فلاں دن میں یا فلاں حالات میں، ہمیں کوئی نہیں پکڑے گا تو ایک دو نسلوں کے بعد وہ اس کی خوگر ہوجاتی ہیں کہ اس زمانے میں وہ بالکل آپ کے قریب آجاتی ہیں اور یہ سمجھ کر آپ سے کبھی بھاگتی نہیں کہ ہمیں کوئی خطرہ ہے۔ ہندوؤں کے کنڈ اور خاص طور پہ کشمیر میں بھی ہم نے یہ دیکھا کہ جہاں انہوں نے ان تالابوں کو مقدس بنالیا ہے اور ان میں جو مچھلیاں ہیں، ان کو پکڑتے نہیں ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ مچھلیاں آکر آپ کے ساتھ یوں کھیلتی ہیں جیسے آپ کے بچے کھیلتے ہیں۔ پانی کے اوپر تیرتی پھرتی ہیں، آپ کے ساتھ ساتھ چلتی پھرتی ہیں، وہ انہیں کبھی کوئی آٹا ڈال دیتا ہے کبھی کوئی اور چیز لیکن وہ آپ کے ساتھ اتنی مانوس ہوتی ہیں کہ وہ کبھی آپ سے بھاگتی نہیں ہیں حالانکہ عام مچھلی کا تو آپ کو معلوم ہے کہ پاؤں کی آہٹ سننے سے بھی وہ پانی کی سطح کے نیچے چلی جاتی ہے۔ وہاں کیفیت یہ ہوگئی کہ ان سے یہ کہا گیا کہ اس دن تم نے ناغہ کرنا ہے، مچھلیاں نہیں پکڑنی تو کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوتا ہے قرآن نے جو کہا کہ سبت کے دن وہ مچھلیاں سطحِ آب کے اوپر تیرتی پھرتی تھیں، گویا انہیں خطرہ نہیں ہوتا تھا کہ اس دن ہمیں کوئی پکڑ لے گا۔ اب ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہی چیز Temptation (طمع) کی وجہ بن گئی کہ اتنی مچھلیاں نیچے سے تیر کر خود پانی کے اوپر آجائیں تو ان کے پکڑنے میں بڑی آسانی ہوجائے گی۔

یہودی ضبطِ خویش کی نفسیاتی کمزوری کے باعث اعتماد کی لازوال نعمت سے محروم ہوگئے

آپ دیکھیے کہ اپنے اوپر ایک پابندی عائد کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جانور تک، مویشی تک، جب اس سے خوگر ہوا ہے، اس نے سمجھا ہے

کہ آج ہمیں اس سے خطرہ نہیں ہے' اس کا اعتماد (Trust) پیدا ہوا اور تمہاری ذرا سی مفاد پرستی کی یہ کیفیت ہے کہ تم نے ان کے اوپر ہاتھ ڈال دیا' پکڑ لیا۔ ہوا کیا؟ یہ کہ اعتماد ٹوٹ گیا تمہارا' تم نے دھوکا دیا ہے ان مچھلیوں کو۔ تو ان کی کیفیت یہ ہوگئی کہ سبت کے دن وہ مچھلیاں تیر کر اوپر آجاتی تھیں اور وہ اس پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے' ان کو پکڑ لیتے تھے۔ یوں دیکھیے تو اس میں کوئی چیز بری نظر نہیں آتی لیکن آپ دیکھیے اس کا جو اصول یا اس کے اندر جو نفسیاتی کیفیت ہے' وہ جرم کی ہے۔ پہلا جرم تو یہ ہے کہ آپ اپنا اعتماد اور Confidence پیدا کرتے ہیں کہ اس دن ہم نہیں پکڑیں گے۔ جب آپ کے اعتماد کی بنا پر اپنے آپ کو وہ بے خطر محسوس کرتی ہیں' تو تم ہاتھ ڈال دیتے ہو۔ جب تم زندگی کے اس شعبے میں یہ کرتے ہو تو زندگی کے ہر شعبے میں تم یہی کرو گے چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد یہودیوں کی نفسیاتی کیفیت یہ پیدا ہوگئی تھی کہ وہ دوستانہ حیثیت میں اعتماد پیدا کرتے تھے اور جب کوئی ان کے اوپر اعتماد کر لیتا تھا تو پھر اس کو خنجر گھونپ دیتے تھے۔ آج تک ان کی یہی کیفیت ہے۔ بات چھوٹی سی تھی مگر اس کے نتائج کتنے دور رس تھے۔ اور پھر اپنی سوسائٹی میں بھی آپ دیکھیے کہ یہی جو آپ کے ہاں گوشت کا ناغہ ہے' اس میں سے نوے فیصد جو قصاب ہیں' اس دن گوشت نہ کریں دس فیصد ان میں سے اس طرح سے کرنا شروع کر دیں کہ چوری چھپے یہ کچھ کریں اور وہ بیچیں' ان کو کتنا گراں گزرے گا۔ آہستہ آہستہ ہوگا کیا؟ وہ بھی یہ کچھ کرنے لگ جائیں گے کہ صاحب! یہ کرتے ہیں' اس دن یہ سارا کما کر لے جاتے ہیں' ہمیں اس دن کا نقصان ہوتا ہے' اس لیے ہم کیوں نہ کریں جی! اب نوے کے بعد اس میں سے پانچ اور کم ہوئے دس اور کم ہوئے اور پھر ہوتے ہوتے وہ ضابطہ تو آپ کا وہاں موجود رہا اور اس پہ عمل کرنے والا کوئی باقی نہ رہا۔ انہوں نے گوشت کرنا شروع کیا ہم نے خریدنا شروع کیا' دونوں چور ہیں۔

قرآن حکیم انسانی بصیرت کو جلا بخشنے کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا

بات کچھ ہے نہیں لیکن یہ چیزیں یاد رکھیے! یہ چھوٹی چھوٹی جو چیزیں ہیں' قومی کردار اور کیریکٹر کے اوپر بڑی گہرائی سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی سی چیزوں کو سامنے لا کر بتاتا ہے کہ وہ قومیں جب گرتی ہیں' تو ان کے ہاں اس گراوٹ کی ابتدا کہاں سے شروع ہوتی ہے اور پھر انتہا کہاں جا کر ہوتی ہے۔ کہا کہ تمہاری یہ کیفیت ہوگئی کہ اس کے اندر ذرا سی Temptation (طمع) تھی' کوئی خاص بات نہیں تھی' تم نے خود اپنے اوپر پابندی عائد کی تھی کہ ہفتے میں ایک دن کا ناغہ کریں گے لیکن ہفتے کی ایک دن کی چھٹی پہ ہی تم نے Avoidance (احتراز) شروع کی ہے کہ تمہاری یہ کیفیت پیدا ہوگئی۔ اتنا بھی تم اپنے اوپر ضبط نہ رکھ سکے' اس قدر تمہارے اندر مفاد پرستی اور انفرادیت غالب آگئی کہ اجتماعی زندگی کے ایک چھوٹے سے فیصلے کے اوپر بھی تم اپنے آپ کو کاربند نہ رکھ سکے' یہ کیفیت تمہاری ہوئی۔

لفظ لعنت کوئی گالی نہیں' یہ تو نعمتوں کی خوشگواریوں سے محروم ہو جانے کا نام ہے

یہ تھا وہ سبت جو قرآن نے کہا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ دو مقامات پہ تو صرف وہ کہا ہے' جسے قرآن لعنت کہتا ہے۔ ہمارے ہاں تو لعنت ایسا ہے جیسے گالی دیدی جاتی ہے' اس سے زیادہ کچھ مفہوم ہی ہمارے ہاں لعنت کا نہیں رہا۔ یہ کوئی گالی نہیں۔ جب خدا لعنت اللہ کہتا ہے تو (معاذ اللہ) یہ نہیں کہ اللہ لعنتیں بھیج رہا ہے۔ یعنی خدا اس سے بہت بلند ہے کہ کوئی شخص کسی قسم کی قانون شکنی کرے اور وہ وہاں سے کہے ''فٹے منہ تہاڈا ہور کچھ نئیں' اے فٹے منہ تہاڈا والی گل کیہڑی اے؟ [1]''۔ لعن کے معنی ہوتا ہے ''زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جانا' دور ہٹ جانا''۔ آپ کے کسی کام کا ایک عملی نتیجہ ہوتا ہے۔ اتباعِ قانون سے وہ خوشگواریاں آپ کو ملتی ہیں اس سے اعراض برتتے ہیں تو جو اس کے خوشگوار نتائج ہوتے ہیں ان سے آپ محروم رہ جاتے ہیں۔ اسے عربی زبان میں لعن کہتے ہیں۔ پہلے چیز تو یہ کہی کہ اس سے ہوا یہ کہ آہستہ آہستہ تم میں وہ خصائل اور عادات پیدا ہو گئیں جن سے تم زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہوتے چلے گئے۔

لعنت کے اس لغوی مفہوم کے بعد انسانوں کے لیے بندروں جیسی خصوصیات اپنا لینے والی آیت کے تفسیری تراجم کی نوعیت

یہ ہے وہ چیز جسے (4:47) اور (4:154) میں لعنت کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس سے ہوا کیا؟ کہا کہ **فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ** (2:65)۔ اس کا عام ترجمہ بھی یہ کیا جاتا ہے اور پھر جب تفسیروں میں ہم جاتے ہیں تو وہاں تو پوچھو ہی نہیں کہ کیا کچھ ہوتا ہے کہ ہم نے کہا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ۔ اور پھر ہمارے ہاں جب وہ افسانے شروع ہوتے ہیں تو ان میں تو آپ دیکھیے' اب جو اس قسم کا ایک لفظ مل جائے تو اس بنیاد کے اوپر تو پھر آسمان تک کے افسانوں کی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے۔ پھر وہ بندروں کی گنتی گنائی گئی' ان کی شکلیں بتائی گئیں' ان کے مقام بتائے گئے اور پھر وہ جو اس وقت بھی جتنے یہ بندر پھرتے ہیں وہ سارے بنی اسرائیل کی اولاد گنائے گئے' یہ سارا کچھ اس کے اندر گنایا گیا۔ قرآنِ کریم کا جیسا کہ میں کئی دفعہ یہ کہہ چکا ہوں' خود دعویٰ ہے کہ یہ عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اگر یہ بات سامنے رکھ لی جائے کہ فلاں زبان میں یہ چیزیں محاورۃً کس طرح استعمال ہوتی ہیں تو بات ساری صاف ہو جاتی ہے۔ ہم روز اپنے بچوں کو بندر کہتے ہیں' لوگوں کو سؤر کہتے ہیں۔ تو کیا اس کے معنی سچ مچ کا وہ حیوان جانور ہوتا ہے جسے آپ Monkey یا بندر کہتے ہیں؟ بہادر کو ہم شیر کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو ان کی خصوصیات ہیں وہ اس کے اندر پیدا ہو گئی ہیں۔ خود عربی زبان میں یہ ''ق ر د'' کا جو لفظ ہے' اس کے معنی ہیں ''ذلت' مسکنت، جسے آپ Apish Mentality (بندروں کی سی ذہنیت) کہتے ہیں خصوصیت بندر کی ہوتی ہے'

---

[1] اور کچھ نہیں تو تف! لعنت تم پر۔ یہ ''تف لعنت تم پر'' والی کونسی بات ہے؟

جو کچھ کوئی کرتا ہے وہ کچھ وہ بھی کرتا ہے' سوچتا کچھ نہیں ہے کہ میں یہ کیوں کر رہا ہوں' یہ خالص تقلید ہے' جو دیکھتا ہے کرتا ہے۔اس کے لیے یہ Apish Mentality (بندروں کی سی ذہنیت) ایک محاورہ ہو گیا ہے۔ یہ یونہی دوسروں کی بغیر سوچے سمجھے نقالی ہے۔ ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ بس وہ جو کر رہا ہے۔

دوسروں کی تقلید کرنے والا شخص عقلی طور پر مفلوج ہو جاتا ہے

اب یہ جو صورت ہوئی تو Reasoning' عقل وفکر کی رو سے کسی چیز کا اختیار کرنا یا چھوڑنا' یہ بات چلی گئی۔ جونہی کسی قوم میں خالص نقالی پیدا ہوئی' جسے تقلید کہا جاتا ہے' جو کچھ کوئی کر رہا ہے وہ دیکھ کر کرتے چلے آنا' کھڑے ہو کر سوچنا ہی نہیں کہ وہ کیوں کر رہا ہے' ہم یہ ایسا کیوں کریں یہ ہے Apish Mentality (بندروں کی سی ذہنیت)۔اس سے عقل وفکر کی صلاحیتیں مفلوج ومسلوب ہو جاتی ہیں' عقل وفکر کے سوئچ آف ہو جاتے ہیں۔اس کا نتیجہ ذلت وخواری تو ظاہر ہے۔ جو قوم سوچنا ہی چھوڑ دے' یونہی جو کچھ کوئی قوم کر رہی ہے کرتی چلی جائے' آج ایک قوم ان کے سامنے آ گئی اس کی نقالی شروع کر دی' کل کسی دوسری قوم کی نقالی شروع کر دی۔ وہ قوم سطح انسانیت سے گر جاتی ہے۔عربوں کے ہاں ''ق ر د'' کا مادہ اس کے لیے ہوتا ہے یعنی خود سوچ سمجھ کر کام نہ کرنا' ذلت ومسکنت کی حالت پہ پہنچ جانا' پستیوں پہ پہنچ جانا۔اور اسی لفظ سے انہوں نے **قردۃ** بندر کے لیے یہ لفظ استعمال کیا تھا۔اور پھر **خاسین** کا لفظ تو خود کہہ رہا ہے کہ جس کے معنی ہی ذلت وخواری ہوتا ہے' ذلیل ہو جانا ہوتا ہے۔

تقلید پرست قوم تو اپنے فیصلے بھی خود کرنے کے قابل نہیں رہتی

یہ جو چیز تھی اس کے لیے قرآن نے دوسرے مقام پہ بھی یہ الفاظ استعمال کیے۔ وہاں دیکھیے' وہ کس طرح وضاحت کرتا ہے کہ یہ بات کیا تھی جو ہم نے **قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ** (2:65) میں کہی۔اس Apish Mentality (بندروں کی سی ذہنیت) میں پہلی چیز یہ آئے گی کہ وہ قوم اپنے معاملات کے فیصلے خود نہیں کرے گی بلکہ دوسروں کی محکوم ہو جائے گی۔ **مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ** (5:60) قانون خداوندی کی رو سے' عام ترجمہ ہوگا' جس پہ لعنت اور غضب ہو۔معنی اس کے ہونگے کہ جو اس طرح زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جائے اور اس کی امیدوں کی کھیتی جھلس جائے۔ یہ ہوتا ہے غضب۔کہا کہ **جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ** (5:60) پھر انہیں' عام ترجمے کے اعتبار سے' بندر بنا دیا گیا' خنازیر بنا دیا گیا۔ یہاں سؤر کا لفظ بھی ساتھ آیا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ اگلے لفظ نے بات واضح کر دی کہ **عَبَدَ الطَّاغُوْتَ** (5:60) ہر سرکش قوت کی محکومی ان کے حصے میں آ گئی۔ جو بھی کہیں بالا دست ہوا انہوں نے اس کی عبدیت اختیار کی ہوئی ہے' اس کی محکومی اختیار کی ہوئی ہے۔اب یہ بالا دستی ایک تو Physical Power میں' قوت میں ہو سکتی

ہے۔ یہ جسے ہم کلچر اور تہذیب کی بالادستی کہتے ہیں' یہ تو اس سے بھی کہیں زیادہ غالب ہوتی ہے۔ اور یہاں آتی ہے Apish Mentality (بندروں کی سی ذہنیت) سب سے زیادہ۔ حاکم قوم کی ہر ادا میں ہم شانِ محکومیت دیکھتے ہیں پھر جو محکوم قوم ہوتی ہے سب سے پہلے وہ یہ اختیار کرتی ہے' ان کا کلچر اختیار کرتی ہے ان کی تہذیب اختیار کرتی ہے بغیر سوچے سمجھے ہوئے کہ ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ یہ ہوتی ہے عبودیت۔ یہ چیز ہے جسے قرآن نے کہا ہے پھر اس قوم کی یہ کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اُولٰٓئِکَ شَرٌّ مَّکَانًاوَّ اَضَلُّ عَنۡ سَوَآءِ السَّبِیۡلِ (5:60)۔ بات صاف ہوگئی کہ جو زندگی کی متوازن راہ تھی' جس پہ آنکھیں کھول کر چلنا چاہیے تھا' وہاں سے یہ بھٹک گئے اور ان کے اندر جو زندگی کی بدترین منازل ہیں یہ لوگ پھر وہاں پہنچ گئے ان کی یہ کیفیت پیدا ہوگئی۔

محکوم قوم باہمی طور پر فرقوں میں بٹ جانے کی بنا پر اپنے مرکز کو ہی فراموش کر دیتی ہے

یہ ہے' برادرانِ عزیز! وہ قِرَدَۃً خٰسِئِیۡنَ (2:65) جو کہا گیا ہے کہ پھر اس کے بعد اس قوم کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ اب یہی چیز ہے جہاں بنی اسرائیل کے متعلق یہ بندروں کا کہا ہے۔ کہا کہ اس کے بعد جو کچھ انہوں نے کیا' وہی ہے مچھلیوں والا واقع' آہستہ آہستہ اس قوم کی پھر یہ کیفیت ہوگئی کہ جوہرِ مردانگی ختم ہوگئے' انفرادی مفاد پرستیاں غالب آگئیں' Apish Mentality (بندروں کی سی ذہنیت) آگئی' عقل و فکر کی رو سے معاملات کے فیصلہ کرنے کی صلاحیتیں مفلوج ہوگئیں۔ تو پھر فَقُلۡنَا لَہُمۡ کُوۡنُوۡا قِرَدَۃً خٰسِئِیۡنَ (7:166)۔ یہاں پھر وہی لفظ آیا ہے۔ پھر یہ چیز کیسے ہوئی؟ کہا کہ وَ اِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبۡعَثَنَّ عَلَیۡہِمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَنۡ یَّسُوۡمُہُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ(7:167) قانونِ خداوندی کی رو سے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان کے اوپر ایسے لوگ حاکم بن کر آئے جو ہمیشہ کے لیے ان کو طرح طرح کے عذاب اور تباہیوں کے اندر محصور رکھتے تھے۔ یہ ہے اس کا نتیجہ۔ پھر دوسری چیز کیا ہوئی؟ کہا کہ وَقَطَّعۡنٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اُمَمًا(7:168) پہلے یہ ایک ملت تھے' ایک امت تھے' ایک قوم تھے' ایک مرکزیت تھی' پھر ان کی مرکزیت فنا ہوگئی' یہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے اور اس کے بعد یہ گروہوں میں بٹ گئے' ان کے اندر تفریق پیدا ہوگئی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس عذاب کا کیا نتیجہ نکل رہا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے؟ یہ کہ Apish Mentality (بندروں کی سی ذہنیت) ہوئی' نقالی محض رہ گئی' معاملات کے فیصلے خود کرنے کی صلاحیتیں مفقود ہوئیں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ حکومت چھن گئی' ایسی قوموں سے مغلوب ہوگئے جو طرح طرح کی رسوائیاں اور تباہیاں ان کے اوپر لاتی تھیں۔ اپنی مرکزیت ختم ہوگئی' زمین کے ادھر اُدھر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے قَطَّعۡنٰہُمۡ یہ مختلف گروہوں کے اندر بٹ گئے' مختلف قوموں کے اندر بٹ گئے۔ اور یہ کیفیت پیدا ہوگئی۔

اس انداز سے بات شروع کی کہ جو چھوٹی چیز کی اپنے اوپر پابندی عائد کی تھی کہ ایک دن کا ناغہ کر لیا کریں گے وہ پوری نہیں کی۔ کہا

کہ بات تو بڑی معمولی تھی لیکن آپ دیکھو کہ اتنے سے قانون کا احترام جو دل سے اٹھا تو آہستہ آہستہ پھر قوم کی کیفیت یہ ہوگئی کہ وہ تمام جوہرِ انسانیت سے عاری ہوگئی' دوسروں کی محکوم بن گئی' مرکزیت ختم ہوگئی' دنیا کے اندر ٹکڑے ٹکڑے ہوکر یہ قوم بٹ گئی۔ یوں ذلت و رسوائیاں ان کے حصے میں آگئیں۔

کوئی قوم یک لخت زوال پذیر نہیں ہوجاتی

عزیزانِ من! بات آپ نے سمجھ لی کہ کتنا گہرا تعلق ہے جو قرآن نے اس چھوٹے سے واقعہ میں اور اس قوم کے اس قدر رسوا کن اور عبرت ناک انجام کے اندر بتایا ہے۔ قوموں کے عروج و زوال میں آپ دیکھیں گے' عزیزانِ من! قوم بلندیوں سے ایک دن میں گر کر پستیوں میں نہیں آجاتی' یہ بہت بتدریج آتی ہے' آہستہ آہستہ آتی ہے۔ ہمارے سامنے تو اس کی تباہی کا وہ دن ہوتا ہے جو درحقیقت آخری دن ہوتا ہے۔ مورخ کی نگاہ میں وہ پہلا دن ہوتا ہے اور پہلا دن ہوتا ہے جس دن نہایت غیر محسوس طور پر ان کے ہاں سے کوئی اس قسم کی چیز سامنے آتی ہے کہ انہوں نے اپنے ہاں کی کسی پابندی سے سرکشی اختیار کی' قانون کا احترام اٹھا۔ چھوٹی سی چیز جو تھی بظاہر اس وقت نظر آتا تھا کہ ہوا کیا یہ مانا یا نہ مانا' منگل کے دن کھایا یا نہ کھایا اس میں کیا فرق پڑتا ہے۔

تباہی کی اصل وجہ قانون کے احترام کی طرف سے بے رخی ہوتی ہے

وہ کہتا ہے کہ سوال اس چیز کا نہیں تھا' نہ منگل کا نہ گوشت کا۔ سوال تو اتنی سی چیز کا تھا کہ تم قانون کا احترام کس قدر کرتے ہو۔ جونہی یہ چیز دل سے اٹھی تو پھر اس کے بعد ہر قانون جو ہے اس سے سرکشی تمہاری عادت ہوجائے گی۔ اور پھر تو انسان Momentum (معیار حرکت) سے آگے چلتا ہے۔ اھوا کے معنی' جس کو ہم خواہشات کہتے ہیں جس کا ترجمہ ہم نے خواہشات کیا ہے' اس کے معنی عربی زبان میں ''پہاڑ کی چوٹی سے پتھر کو نیچے کی طرف لڑھکا دینا'' ہیں۔ وہاں سے گرتا ہے تو وہ ذرا سی رفتار سے گرتا ہے' جوں جوں نیچے چلا آتا ہے اس کی رفتار خود کتنی تیز ہوتی چلی جاتی ہے۔ باہر کی کوئی قوت نہیں ہوتی' یہ اپنے اندرونی Momentum (معیار حرکت) سے تیز ہوتا چلا جاتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ یاد رکھو! جب بھی قانون کے احترام پر تمہاری مفاد پرستی غالب آجائے گی ابتدا میں ذرا سی حرکت ہوگی اور اس کے بعد تم دیکھو گے کہ وہ خود اپنے زورِ دروں سے کتنی تیز رفتاری سے نیچے کی طرف آتا چلا جائے گا اور پستیوں کے گڑھے میں گر جائے گا۔ قرآن نے سبت سے بات شروع کی ہے جو بظاہر زندگی کا چھوٹا سا واقع ہوتا ہے مگر انجام اس کا ایسا بتایا ہے: محکومیت' ذلت' مسکنت' لامرکزیت' ایک قوم سے گروہوں میں بٹ جانا' ٹکڑے ٹکڑے ہوجانا۔ یہ یہاں تک قرآن بتا رہا ہے۔ اور اس کے بعد جو پھر آپ نے دیکھا جو کہا کہ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ (2:66) یہ اتنی سی بات غور کرنے والوں کے لیے جو اس وقت موجود تھے ان کے لیے بھی اور جو بعد میں آنے والے ہیں' ان کے لیے بھی' بڑا عبرت کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔ اور جو لوگ زندگی

کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنا چاہیں ان کے لیے تو اس کے اندر سامانِ بصیرت ہے ورنہ اگر بات وہ لے لی جائے کہ اس زمانے کے وہ لوگ جو تھے ان کو بندر بنا دیا گیا تو ہمارے لیے تو آج یہ چیز کوئی عبرت اور موعظت کا باعث ہی نہیں بن سکتی۔ اول تو ہم اس پہ Believe (یقین) ہی نہیں کر سکتے کہ یہ جنہیں ہم Monkey (بندر) کہتے ہیں یہ بھی بنی اسرائیل ہی کی چلی ہوئی نسل ہمارے سامنے آ رہی ہے لیکن قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں کے لیے بھی جو اس وقت تاریخ کے اس دور میں موجود تھے' ان کے لیے بھی یہ چیز بڑی سامانِ عبرت اپنے اندر رکھتی تھی اور بعد میں آنے والوں کے لیے بھی یہ بصیرت کا اور موعظت کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ چھوٹا سا واقعہ ہے نتائج اس کے اتنے بڑے ہیں۔

چار سو سال تک غلام رہنے والی قوم بنی اسرائیل کے ہاں ایک بچھڑا ذبح کرنے کا اہم سبق آموز واقعہ

اب اس کے بعد ایک اور واقعہ آتا ہے۔ کہا کہ وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖۤ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا بَقَرَۃً (2:67)۔ یہ ہے ذبحِ بقر کا واقعہ' یہ ایک بچھڑے کے ذبح کرنے کے متعلق بات ہے۔ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایک بچھڑا' بیل' سانڈ ذبح کر دو۔ پھر یہ بات بڑی چھوٹی سی ہے' قرآنِ کریم اس کو اتنی اہمیت دیتا ہے۔ اہمیت تو وہ اس کے نتائج کے اعتبار سے دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ کیفیت کیا تھی؟ یہ لوگ مصر میں قریب چار سو سال تک محکومیت کی زندگی میں رہے۔ جیسا میں نے کہا ہے پھر تو حاکم کے دیوتا ان کے بھی دیوتا بن جاتے ہیں جب حاکم قوم دیوتا بن جاتی ہے تو ان کے جو دیوتا ہیں وہ پھر خداوند بن جاتے ہیں۔ یہ مصری ایک دیوتا کی پرستش کیا کرتے تھے' Osiris اس کا نام لکھا ہوا آتا ہے [1]۔ مصر کے آثارِ قدیمہ میں اس کا نام اسی اعتبار سے ''ایزاری'' آیا ہے۔ یاد رکھیے! یہ Osiris یونانی لفظ ہے کیونکہ ان کے جو ترجمے موجود ہیں' وہ ابتدا میں یونانی میں ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں حضرت موسیٰؑ کی ابتدائی عبرانی کی تو تورات کی کوئی کتاب ہی موجود نہیں' نہ اس زبان کی انجیل موجود ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی زبان تھی۔ یہ ترجمے یونانی میں ہوئے تھے آج یہ ابتدائی اور یجنل (اصلی) ترجمے بھی موجود نہیں ہیں۔ یہ داستان الگ ہے۔ یہ لفظ Osiris یونانی زبان کا ہے۔ یونانی زبان میں جتنے اسم ہوتے تھے' Nouns ہوتے تھے' ان کے آخر میں ایک S لگاتے تھے' یہ اضافہ ہوتا تھا اس لیے اصل Original میں یہ ''عزیر'' ہی تھا۔

یہودیوں میں ابن اللہ کا تصور اور دیومالائیت

اب قدیم مصر کے جو آثار نمودار ہوئے ہیں' ان میں اس دیوتا کا نام ''ایزاری'' ہی رکھا ہوا ہے۔ یہ وہی ہے جسے Osiris (یعنی عزیر) کہتے ہیں۔ اس کے نام پر یہ ایک سانڈ چھوڑا کرتے تھے۔ اور یہاں تو وہ چیز ہے نہیں' ہم لوگوں نے بھی آدھی زندگی ہندوؤں میں

---

[1] ہیروڈوٹس نے' آج سے قریب اڑھائی ہزار سال قبل' اس دیوتا کا نام Osiris یعنی عزیر میں لکھا ہے (پرویزؒ: لغات القرآن' جلد سوم' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1961' ص 1161۔

بسر کی ہوئی ہے' ہمیں تو معلوم ہے کہ وہ اپنے ہاں دیوتاؤں کے نام پہ سانڈ چھوڑ دیا کرتے تھے۔ وہ جہاں سے جی چاہے کھائے' جہاں سے جی چاہے پیئے۔ وہ چلتا پھرتا رہتا تھا' کھلا چھوڑا ہوا ہوتا تھا' اسے کوئی اذیت نہیں پہنچاتا تھا' وہ تو دیوتا مانا جاتا تھا۔ ان کے ہاں ''سانڈ'' کو دیوتا مانتے ہیں۔ جیسا میں نے پچھلے دنوں یہ کہا تھا کہ ہندوؤں کے ہاں جو یہ اپنا دھرم یا مذہب ہے' ان کے ہاں اپنا کچھ بھی نہیں ہے' یہ ساری چیزیں انہوں نے مختلف جگہ سے مانگی ہوئی ہیں۔ یہ گائے کی پرستش کرنا یا بیل کا ''سانڈ'' بنانا' یہ چیز انہوں نے مصر والوں کے ہاں سے لی ہوئی ہے۔ وہ وہاں کسی دیوتا کی طرف منسوب کر کے ایک ''سانڈ'' چھوڑا کرتے تھے۔ وہ جو ''سانڈ'' تھا' اسے ایزار ھاپی کہتے تھے یعنی ایزار دیوتا کا سانڈ[1]۔ اور اس کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ اس سانڈ کے اندر' خود اس ایزار دیوتا کی روح آ گئی ہوئی ہے' اس لیے وہ اس کی پرستش کیا کرتے تھے۔

اہل مصر کی بت تراشی کے اثرات کہاں تک پہنچے!

مصریوں کے ہاں یہ جو ایزاری دیوتا تھا' اس سانڈ کے توسط سے' جو ان کے ہاں خود معبود بن گیا تھا' کی پرستش ہوتی تھی۔ اس کے مجسمے تراشتے تھے۔ ہندوؤں کے ہاں آپ نے دیکھا ہوگا' میں نے خود یہ وہاں دیکھے ہیں' کہ ان کے سانڈ کے یا گائے کے مجسمے ان کے مندروں کے اندر ہوتے تھے' وہ ان کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے ہاں بھی پھر اس کے مجسمے تراشے جاتے تھے' مصری اس کی پرستش کرتے تھے۔ اور اس ایزار کو وہ خدا کا دیوتا ابن اللہ مانتے تھے۔ میں آگے چل کر جب سورۃ التوبہ میں آؤں گا جہاں یہ ہے کہ یہودی عزیر کو ابن اللہ مانتے ہیں' تو وہاں بتاؤں گا کہ اس کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ وہ عزیر نبی ہیں۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ وہی جو دیوتا تھا' یہودیوں نے بعد میں اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ خود آپ کو معلوم ہے کہ گوسالۂ سامری کا جو واقعہ ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ چند دنوں کے لیے ان سے غائب ہوئے اور سامری نے ایک بچھڑا بنایا اور انہوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ وہ کیا بات تھی؟ وہ یہ بات تھی کہ یہ وہاں اس دیوتا کو پوجتے آئے تھے۔ یہاں اس کی پرستش' حضرتِ موسیٰؑ کی تعلیمِ توحید نے چھڑائی تھی لیکن قرآن نے بتایا یہ ہے کہ **وَ اُشۡرِبُوۡا فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡعِجۡلَ** (2:93) ان دیوتاؤں کی محبت دل کی گہرائیوں کے اندر اتر جایا کرتی ہے۔ قرآن نے یہ بڑی بات کہی ہے کہ ایمان سے پہلے دور

---

[1] اسے عزیر کی روح کا مظہر اور ''فتاح'' یعنی خالق خدا کا اوتار اور بیٹا (ابن اللہ) مانا جاتا تھا۔ مصر سے یہ اعتقادات نکل کر شام اور فلسطین کے علاقوں میں پھیل چکے تھے اور یہی وہ عجل (بچھڑا) تھا جس کی پرستش یہودیوں نے حضرت موسیٰؑ کی غیر حاضری میں شروع کر دی تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے یہود کو اس گوسالہ پرستی سے روک دیا لیکن آپؑ کے بعد اس کی پرستش دوبارہ شروع ہوگئی چنانچہ یہودیوں کی سلطنت کی تقسیم کے بعد شمالی سلطنت کے بادشاہ یربعام اوّل (933 ق م) نے عجل پرستی کو شاہی مذہب قرار دے دیا...... مصر کے آثارِ قدیمہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ دنیا میں غالباً سب سے پہلے' (Osiris) عزیر ہی کو ابن اللہ مانا گیا ہے۔ چنانچہ کم و بیش چار ہزار سال قبل مسیح عزیر (Osiris) کے متعلق یہ اعتقاد ملتا ہے کہ یہ دیوتا خداوند اعلیٰ ''آمن رع'' کی نسل سے اور خداوند ارض کا بیٹا تھا۔ مصر سے اب ایک صحیفہ بھی برآمد ہوا ہے جس میں عزیر (Osiris) کے حالات درج ہیں (حوالہ: پرویزؒ (1961)۔ لغات القرآن جلد سوم' لاہور: ادارہ طلوع اسلام۔ ص۔ 1161)۔

کا جو کفر ہوتا ہے' وہ تحت الشعور کے اندر تک سرایت کر گیا ہوتا ہے۔ اگر ایمان اس انداز سے آئے کہ آہستہ آہستہ بتدریج عقل وفکر کی رو سے یہ چیزیں آتی جائیں اور زمانۂ کفر کی جو اس قسم کی تحت الشعور میں جاگزیں چیزیں تھیں' وہ آہستہ آہستہ نکلتی چلی جائیں تو پھر تو وہ گھر بالکل بتوں سے پاک وصاف ہو جاتا ہے' یوں کہیے کہ وہ اللہ کا گھر بن جاتا ہے۔ اور اگر کیفیت یہ نہ ہو' شپا شپ مسلمان ہونے والی بات ہو کہ اس نے کہا پڑھ کلمہ' پڑھ لیا' مسلمان ہو گئے تو اس کے بعد تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے گھر کا مذہبی ماحول

عزیزانِ من! سنیئے' ہمارے نانا کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ جب بھی چھینک آتی تھی' تو وہ ''جے نندی کی'' کہتے تھے۔ Automatically (خود بخود) غیر شعوری طور پہ یہ چیز منہ سے نکل جاتی ہے۔ وہ جو ''نندی'' ہوتی ہے' وہ تو تحت الشعور میں ہوتی ہے۔ رام جاتا ہی جائے' رحیم گھستا ہی گھسے' یہ کیفیت ہوتی ہے۔ یہ جو ہم وہاں ہندوستان میں مسلمان ہوئے ہیں وہ ٹھیک ہے کہ کسی نے کلمہ پڑھا دیا' مسلمان ہو گئے۔ یہ جتنی رسومات' یہ جتنے اعتقادات تھے' یہ قبل از اسلام کے یا قبل از ایمان کے تھے' یہ ہمارے مسلمان ہونے کے پہلے کے زمانے کے سارے اسی طرح سے آتے تھے۔ ہم تو تازہ تازہ مسلمان ہوئے تھے' ہمارے اپنے گھروں کے اندر ''بدھا پیر'' کی پرستش ہوتی تھی' کڑاہی دی جاتی تھی۔ یہ ''بدھا پیر'' کیا ہے؟ یہ سانپ دیوتا تھا۔ اور ہر ایک کے ہاں یہ کیفیت تھی۔ چیچک کی جو ماتا ہے' اس کی پرستش ہوتی تھی۔ ایسٹ پاکستان [1] میں آپ جائیے' وہاں ہر گاؤں کے باہر آپ کو دو چیزیں نظر آئیں گی: پیر گیارھویں شریف والے کا ایک کھٹولا اور دُرگاہ ماتا کا ایک بت۔ دونوں بیک وقت ان کے جلوس چلتے ہیں صاحب! یہ جو اس طرح سے Conversion (تبدیلی مذہب) ہوتی ہے اس میں ہوتا یہ ہے کہ عبداللہ نام تو آ جاتا ہے لیکن ہوتا ہے وہ درگا داس۔ یہ کیفیت تھی۔

فرعون کی غلامی' حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم' سامری کی جادوگری' بچھڑے کی پوجا' 40 سالہ صبر آزما صحرائی سفر کی کشمکش

اب یہ جو چیز ان میں تھی کہ جب دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ذرا ادھر ہوئے تو وہ ساری توحید اور خدا اور موسیٰ کی تعلیم' ایک طرف چھٹ کر رہ گئی کیونکہ ابھی وہ سطحِ آب کے اوپر تھی۔ اور وہ جو عجل کی محبت تھی جو قرآن کہتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں تھی' وہ ابھر کر سامنے آئی' ایک سامری نے اس کو ذرا سا' تھوڑا سا سہارا دیا اور وہی محبت اور وہی عقیدت اور وہی بچھڑے کی پرستش عود کر آئی اور انہوں نے اسے پوجنا

---

[1] یاد رہے کہ بات نومبر 1968 کی 3 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ جب مشرقی پاکستان بنگلا دیش نہیں بنا تھا۔

شروع کر دیا۔ یہ ہمارے ہاں جتنی بھی یہ بڑی بڑی چوکھٹیں، یہ مزار، یہ گنبد، یہ سارے جن کی پرستشیں ہیں، یہ وہی ہمارے ہاں بچھڑے کی محبت چلی آ رہی ہے۔ اور قرآن نے کہا یہ ہے کہ یہ بڑی مشکل سے چھوٹا کرتی ہے، یاد رکھو! ذرا سی یہ تعلیم نگاہ سے اوجھل ہوئی، چالیس دن کے لیے موسیٰؑ اُدھر گئے اور کسی سامری نے تھوڑی سی کہانی بیان کی۔ یہ پھر اسی طرف لوٹ گئے۔

سامری کے معنی افسانے بیان کرنے والا ہیں، برادرانِ عزیز! جب انہوں نے سامری کی بچھڑے کی محبت کی کہانی سنائی تو دیکھا کہ وہ تو وہی جو بچھڑے کی محبت تھی، وہ پھر ابھر کر اوپر آ گئی تو اب اس کے لیے علاج یہ تھا اور یہ بڑی اہم چیز ہے۔ وہ ہندوستان میں جو گائے کی قربانی کو اہمیت حاصل ہوئی ہے اس کے معنی یہ تھے۔ وہ یہی چیز ہے جو ان سے کرائی گئی کہ یہ جو مسلمان ہوں تو پہلی چیز یہ ہے کہ گائے کا گوشت کھاؤ بھئی! گائے ذبح کرو، گائے کی قربانی دو۔ فی ذاتہٖ اس میں کوئی اہمیت نہیں ہے نفسیاتی طور پہ یہ بڑی چیز ہے۔ آپ سوچیے تو سہی آج بھی جو آپ کے ہاں یہ بت پرستی کی شکلیں موجود ہیں، یہ بڑے بڑے آستانے اور بڑی بڑی مزاروں کی شکل میں، اس سے اگر آپ نے کسی کو توبہ کرائی ہے اور وہ کہتا ہے کہ ہاں صاحب! میں نے مان لیا ہے کہ یہ کچھ نہیں، تو اس سے کہیے کہ پھر اس مزار کو جا کر ڈھاؤ۔ آپ دیکھیں کہ یہ کتنا مشکل مرحلہ نظر آتا ہے، یہ بڑا ٹیسٹ ہوتا ہے صاحب! اب اس کے بعد یہ کہنا تو مشکل ہوتا ہے کہ نہیں صاحب! میں یہ نہیں کرونگا کیونکہ جب تم نے کہہ دیا کہ صاحب! یہ اینٹ اور پتھر کے سوراخ ہیں، اس میں کچھ نہیں رکھا ہوا تو اس میں ڈھانے میں حرج کونسا ہے۔ گھر کے چبوترے کو بھی تو تم عند الضرورت مسمار کر دیتے ہو۔ یہ ایک چبوترہ ہے اس کو ڈھا دو۔ وہ کہتا ہے کہ جی ہاں! بات تو ٹھیک ہے لیکن بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ڈھا دو کے معنی کیا ہیں؟ ڈھا دو کے معنی سمجھ نہیں آ رہے۔ ارے توڑ دو اس کو کہ جی پھاوڑے سے توڑیں یا گیتی سے توڑیں، بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی۔ وہ من کا چور بات سمجھنے نہیں دیتا:

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے

تعلیمی اور ذہنی طور پر زاویہ نگاہ بدلے بغیر بچھڑے کے بت کو توڑا ہی نہیں جا سکتا

یہ دماغ کا بت خانہ بات سمجھ میں آنے نہیں دیتا، بات سمجھ میں آ رہی ہوتی ہے مگر یہ بے ایمان ہے کہ جی! وہ گرا دیں تو کیا زمین کے ساتھ ہموار کر دیں یا ذرا ذرا سا رہنے دیں۔ او! گرا دو، زمین کے ساتھ ہموار کر دو۔ آپ ہی گرا دیجیے صاحب! ''تیرے ہتھاں نوں مہندی لگی ہوئی ہیگی اے ❶''؟ ہاتھوں کو مہندی نہیں لگی ہوئی ہوتی، دل کے اندر جو ایک چیز ہے، وہ اس طرف آنے نہیں دیتی۔

---

❶ کیا آپ کے ہاتھوں میں مہندی لگی ہے؟

’’سانڈ‘‘ کی شناخت کے بہانے خدائے علیم سے طرح طرح کے سوالات کیے جارہے ہیں

یہاں قرآن بڑی عجیب چیز کہہ گیا ہے۔ ہم یونہی واقعہ سمجھ کر گزر جاتے تھے۔ قرآن نے ان سے کہا کہ ایک بچھڑے کو ذبح کردو‘ ’’سانڈ‘‘ کو ذبح کردو اور وہ لگے بات کرنے۔ پہلی بات تو یہ کہی کہ **قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا** (2:67) کہا: موسیٰؑ! ’’ایمان نال کہو‘ سچ مچ کہنا پیا ایں یا ایویں مخول کرن ڈیا ایں۔ ایویں یار مذاق نہ کریا کر ❶‘‘۔ یعنی یہ پہلی چیز ہے۔ آپ اندازہ لگایئے! اس معاملے کو کتنا Lightly (غیر سنجیدگی سے) لے رہے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سنجیدگی و متانت سے (Seriously) ایسی بات نہیں سمجھتے۔ ان کا یہ تصور ہی نہیں ہے کہ تمہارے جیسا معقول آدمی اس قسم کی بات Seriously (متانت سے) کہے گا۔ وہ تو کہتے ہیں کہ مذاق کر رہے ہو۔ **قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ** (2:67) انہوں نے کہا کہ توبہ توبہ‘ پناہ بخدا! ایسے معاملے کے اندر کیا میں مذاق کرونگا؟ یہ مذاق کرنا تو جہالت ہے۔ اچھا! انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے‘ ذبح کردیں گے جی! **قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ** (2:68) کہا کہ ذرا اللہ میاں سے پوچھ دو کہ یہ کیا ہے جو ’’سانڈ‘‘ کہتے ہو۔ ذرا پوچھ دیجیے گا صاحب! کہ مزار کہتے کس کو ہیں؟ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ روز اس کی پرستش ہو رہی ہے‘ اب بات سمجھ میں نہیں آئی‘ ذرا پوچھ دیجیے گا اللہ میاں سے۔ **قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ** (2:68) وہ کہنے لگے کہ وہ ٹھیک ہے‘ وہ ایسا ہی ہے۔ انہوں نے Description (وضاحت) دینی شروع کردی کہ ادھر اُدھر سے جائیں تو متعین طور پہ اسی ’’سانڈ‘‘ دیوتا کے اوپر آجائیں جو انہوں نے تجویز کر رکھا تھا کہ جی پہلے تو جو بات کہی تھی‘ کوئی اسے ’’سانڈ‘‘ لے لیتے‘ کوئی بیل لے لیتے‘ کوئی ذبح کرتے‘ گائے لے لیتے۔ اب متعین کراتے کراتے چلے جارہے ہیں اور وہ بھی متعین کرتے چلے جارہے ہیں کہ وہیں بات آجائے۔ کہا کہ ٹھیک ہے‘ نہ وہ بوڑھا ہے‘ نہ وہ بچہ ہی ہے‘ بھرپور جوانی میں ہے۔ **فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ** (2:68) وہ کہہ رہے ہیں او کم بختو! بات صاف سی کہی گئی ہے‘ کر گزرو‘ خوامخوہ کے لیے اپنے اوپر اور پابندیاں عائد کرتے چلے جاتے ہو۔

عزیزانِ من! یہ بات میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ کہا کہ **قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا** (2:69) ’’انہاں پچھیاں پئی رنگ کی ہونا چاہیدا اے۔ جی اوہدا۔ یعنی جیویں کھلاں دی جتی بنوانی اے ایہناں نیں‘ پہلاں ای طے کردے پئے ہیگے کہ جی رنگ کی ہونا چاہید اے ❷‘‘۔ انہیں بتایا کہ **قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ** (2:69) کہا کہ اس کا گہرا زرد رنگ

---

❶ ایمان سے کہو کہ کیا سچ مچ کہتے ہو یا ہنسی مذاق کر رہے ہو؟ یار! ایسے ہی مذاق نہ کیا کرو۔

❷ انہوں نے پوچھا کہ جی! اس کا رنگ کیا ہونا چاہیے۔ یعنی انہوں نے گویا کہ کھالوں کے جوتے بنوائیں ہیں۔ پہلے ہی طے کر رہے ہیں کہ جی! رنگ کونسا ہونا چاہیے۔

ہونا چاہیے' دیکھنے والوں کو خوشگوار قسم کا نظر آئے۔ یہاں دو باتیں ہو گئیں۔ **قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا** (2:70) کہا کہ ابھی بھی کچھ شبے کی بات رہ گئی ہے' بیل اور بیل میں دیکھو آدمی کو تشابہ ہو جاتا ہے ہم اور قسم کا بیل ذبح کر دیں اور تم بعد میں کہو کہ نہیں نہیں' یہ نہیں' اللہ میاں کا منشا کچھ اور تھا کہ وہ اس قسم کا ہونا چاہیے تھا۔ کہا کہ **وَ اِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ** (2:70) ''امان نال اے نئیں گل ہیگی پئی ذبح نئیں کرنا چاہندے ہیگے' لاحول ولا' اللہ نے چاہیا اسی ذبح کر کے دکھاواں گے تہانوں' گل نئیں سمجھ اچ آرہی''❶۔

اے خدائے علیم وخبیر اور رحیم و کریم! تیری عظمتوں کو سلام! تیری طرف سے ان بار بار کی وضاحتوں کو سلام! انسانی عقل کیا جانے کہ تو کیا ہے؟

قرآن کے انداز کی کیا بات ہے! روز ہمارے ساتھ یہ ہوتا ہے صاحب! بات صاف ہوتی ہے کہ یہ چیز شرک ہے' قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ دماغ مان جاتا ہے' سند دیکھ لیتے ہیں' Reason (وجہ جواز) کوئی نہیں ہوتا ''من حرامی حجتاں ڈھیر''۔ اس کے بعد پھر یہ چیز آجاتی ہے کہ جی! بات تو سمجھ میں آگئی لیکن صاحب! آپ سوچیے کہ سلفِ صالحین سے یہ چیز چلی آرہی ہے۔ اگر یہ چیز یوں ہو تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ صاحب! فلاں حضرت صاحب ہیں گویا وہ بھی شرک ہی کیا کرتے تھے۔ کچھ اس میں بات تو ہوگی دیکھیے! آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی' ان کی تو سمجھ بہت بڑی تھی' وہ تو اسلام کو بہت اچھی طرح سے جانتے تھے۔ وہاں یہ چیز تھی۔ اصل میں ٹھیک ہے جتنا کچھ ہم وہاں مبالغہ کرتے ہیں وہ ہم نہیں کیا کریں گے صاحب! کہ جی! ہم سجدہ نہیں کیا کریں گے' منت مانگنے میں تو کوئی بات نہیں ہے۔ سچ ہے کہ انسانی عقل کیا جانے کہ تُو کیا ہے۔

وسیلے کی تلاش کے سلسلہ میں ایک روایت

ہم ان سے نہیں مانگتے ہیں جی! اصل میں ہم تو خدا سے مانگتے ہیں بس درمیان میں ان کا وسیلہ لے آتے ہیں۔ اور ایک روایت میں آیا ہے صاحب! کہ بارش نہیں ہوتی تھی' حضرتِ عمرؓ (581-644/45AD) نے کہا تھا کہ یا اللہ! حضرتِ ابن عباسؓ کے طفیل بارش کر دے۔ دیکھیے صاحب! دیکھیے' یہ کیا ہو رہا ہے؟ بات وہی ہو رہی ہے کہ پتہ ہے ''سانڈ'' کسے کہتے ہیں' یہ پتہ ہے کہ ذبح کے معنی کیا ہوتے ہیں اور معلوم ہے کہ یہ کیوں کرایا جا رہا ہے۔ مگر عقیدت مندی دامن گیر ہے۔

---

❶ قسم خدا کی' یہ بات نہیں ہے کہ ہم ذبح نہیں کرنا چاہتے' لاحول ولا قوۃ۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم تمہیں یہ ذبح کر کے دکھا دیں گے۔ بات ہی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔

حقیقت کو تسلیم کرنے میں عقیدت مندی سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے

وہ دل میں جو وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ (2:93) ہے۔ایک لفظ میں قرآن نے ساری بات واضح کردی ہے۔دل کی گہرائیوں میں عقیدت پیوست ہوچکی تھی' یہ ان کو اس پہ آمادہ ہونے نہیں دیتی تھی۔ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِی الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِیَةَ فِیْهَا (2:71) کہا کہ یہ نہ کنوئیں میں جوتا گیا ہو' نہ بل میں جوتا گیا ہو' سانڈ تو کسی چیز کے اندر جوتا ہی نہیں جاتا۔کہا کہ وہ بے داغ ہو۔دیکھیے کس طرح سے قرآن نے ان کے معبود کا پورا مجسمہ سامنے لاکر کھڑا کردیا۔اب کوئی راستہ نہیں رہا صاحب بھاگنے کا۔سوچ رہے ہونگے کہ اور پوچھیں کہ صاحب! اس کی چار ٹانگیں ہونگی یا چھ ٹانگیں ہونگی۔کوئی راستہ نہیں تھا۔قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ (2:71) کہنے لگے ہاں ہاں ''گل ہوئی نا ہُن گل کتی تسی ٹھکانے دی❶''۔یعنی پہلے بات ٹھکانے کی نہیں ہو رہی۔کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔کہا کہ فَذَبَحُوْهَا (2:71) اسے ذبح کرنا ہی پڑا۔اور قرآن کی لم یہ ہے کہ وَمَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ (2:71) بات یہ ہے کہ یہ کرنے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا۔

تاریخی شہادتوں کے پیش کرنے کا مقصد کسی اصول کو علم وشعور کی رو سے تسلیم کروانا ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ بات ذبح بقر کی نہیں' یہ کسی خاص دور کے' کسی خاص قوم کے' سانڈ کے ذبح کرنے کا واقعہ نہیں ہے۔قرآن تو قیامت تک کے لیے حقائق بیان کرتا ہے۔ان حقائق کی وضاحت کے لیے صرف یہ اس قسم کی تاریخی شہادات کو پیش کرتا ہے۔ یہ بات تین ہزار سال پہلے کی نہیں ہے' بات آج کی ہے' بات ہمیشہ تک رہے گی۔غلط عقائد کی عظمت' عقیدت اور احترام انسان کے لاشعور تک کے اندر جا پہنچتے ہیں' وہ التزاماً تعلیم' تدریس' تربیت سے آہستہ آہستہ نکلتے ہیں۔یونہی زبان سے چند کلمے دہرا لینے سے یہ نہیں نکلا کرتے' اس کے لیے خاص تعلیم وتربیت کا پروسیس (عمل) ہوتا ہے۔عقل وفکر کی رو سے' دلائل وبراہین کی رو سے' علم وبصیرت کی رو سے' ان کے نقائص' ان کے باطل ہونے کی چیزیں' ان کا غلط ہونا' ان کا خلافِ حقیقت ہونا' علیٰ وجہ البصیرت ایک ایک کرکے نکالا جائے' پھر ان کی جگہ جو حقائق ہیں' ان کو اسی طریقِ کار سے' اسی تعلیم وتربیت کے طریقے سے' ان کا اثبات کیا جائے' ان کو اس طرح سے دل کی گہرائیوں میں اتارا جائے۔ایک ایک کرکے یہ کچھ کیا جائے اور جب اس طرح سے یہ گھر ان بتوں سے بالکل خالی ہوجائے' پھر یہ سمجھیے کہ اس کے اندر خدا آتا ہے۔یہ ہے طریق غلط عقائد کو دل ودماغ سے نکال کر' ان کی جگہ صحیح عقائد کو وہاں بسانے کا۔یہ طریق ہے جس طریق سے آپ کسی کو مسلمان کرتے ہیں۔

---

❶ اب ہوئی اصل بات! کیسی ٹھکانے کی بات کہہ دی!

کوئی انسانی بچہ نہ کافر ہوتا ہے' نہ مسلم' نہ وہ شیعہ ہوتا ہے' نہ وہ سنی' فرقوں کی پچروں میں ہم اسے خود بند کرتے ہیں

یہ جو پہلے ان الذین امنوا آیت گزر چکی ہے اس میں آیا ہوا ہے کہ خود مسلمانوں کے گھروں میں جو پیدا ہونے والا ہے' یاد رکھو! اس کے لیے بھی آپ کو یہ طریق اختیار کرنا ہوگا۔ یہ تو یہ ایک چیز ہے نہیں کہ ہنگامی' وقتی یا پیدائشی طور کے اوپر کوئی شخص ہندو پیدا ہو جائے' کوئی مسلمان پیدا ہو جائے۔ بچہ نہ ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان ہوتا ہے' اسے بعد میں کچھ بنانا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طریق سے ہم نے اپنے بچوں کے دلوں سے اس گوسالے کی محبت کو یوں نکالا ہے؟ کیا اس کی جگہ ہم نے ان کے دلوں کے اندر خدا کو بسایا ہے؟ یہاں تو یہ ہے کہ جس جس طرح سے جس گھرانے میں کوئی پیدا ہو گیا' وہی کچھ وہ بن گیا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم جو اپنا نام مسلمان رکھتے ہیں' وہ بچہ بعد میں اپنے آپ کو ہندو تو نہیں کہتا لیکن یہ چیز بھی تو ایک رسمی ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آئے گا لیکن یہ تو سمجھ میں آ جائے گا کہ جو شیعہ گھر میں پیدا ہونے والا بچہ ہے وہ انہی عقائد کو لے کر پروان چڑھتا ہے۔ سُنّیوں کے ہاں پیدا ہونے والا انہی عقائد کو لے کر پروان چڑھتا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوا تھا' دونوں گھروں میں' وہ نہ شیعہ تھا نہ سنی تھا' وہ نہ مسلمان تھا نہ غیر مسلم تھا۔ جس ماحول میں اس نے تربیت پائی ہے' جو باتیں اس کے کان میں شروع سے پڑنی شروع ہوئی ہیں' تو وہی چیز ہے جو عقائد بنتے چلے گئے۔ اور پھر رفتہ رفتہ جب **فِیُ قُلُوُبِهِمُ الْعِجْلَ** (2:93) دل کی گہرائیوں میں اتر گئے تو وہاں وہ جو چیز تھی وہ مسلمات بن گئی۔ اب پھر زندگی کے کسی بھی مرحلے میں ہم نے کھڑے ہو کر سوچا نہیں ہے کہ جسے ہم مسلمہ مان رہے ہیں وہ حقیقت ہے یا افسانہ ہی ہے۔

آہستہ آہستہ گروہ بندی کے یہ افسانے مسلّمہ بنتے چلے جاتے ہیں

عزیزانِ من! یہ تو زندگی بھر کا پروسیس (عمل) ہے۔ یہ تو اس طرح سے وہ قوم بنتی ہے ورنہ کیفیت یہی رہ جاتی ہے کہ ان کو مصر سے نکال بھی لائیے' ان کے بتوں کو وہاں چھوڑ بھی آیئے' مندر وہاں رہ گئے' یہ سارے ادھر آ گئے' یہ مسلمان بھی ہو گئے۔ ویسے تو یہ اپنے ہاں جب مصر میں بھی رہتے تھے تو بنی اسرائیل نے اپنے ہاں وہاں کا وہ مذہب قبول نہیں کیا تھا جس طرح سے ہم ہندوستان میں رہے تو ہم نے ہندو مذہب کو اختیار نہیں کیا تھا لیکن ان کے ہاں کے یہ جتنے عقائد تھے اور جتنی' رسومات تھیں' یہ تمام چیزیں اپنے دل کے اندر رکھی ہوئی تھیں اور اسی طرح سے ان کے اوپر یہ کاربند تھے۔ حضرتِ موسیٰؑ جلیل القدر پیغمبرؑ انہیں اس ملک سے نکال لائے' توحید کا سبق دیا یعنی یوں کہہ لیجیے کہ مسلمان کیا' آزاد فضا کے اندر آ گئے' وہاں کی محکومی بھی نہیں ہے' مگر نظر و فکر میں وہ رہے وہی کے وہی۔ اور وہ ''افسانے'' مسلمہ بنتے چلے گئے۔

پاکستان بننے کے بعد اس مملکت خداداد میں فرقہ واریت جیسی دیرینہ بیماری کی مزید مہلک صورت اختیار کرنے کی وجہ جواز

پاکستان بھی بن گیا' کوئی چیز وہاں کی باقی نہیں رہی لیکن وہ جو دل کی گہرائیوں میں بت لے کر آئے ہوئے تھے' وہ ویسے کے ویسے ہی موجود ہیں بلکہ یہاں تو ان بت کدوں کو اور زیادہ مرصع کیا جاتا ہے' اور زیادہ ان کو سجایا جا رہا ہے۔ مرورِ زمانہ سے' زمانے کے تقاضوں سے' جو گر رہے تھے ان کو نئے سرے سے استوار کیا جاتا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ کہ دل کی گہرائیوں میں وہ عجل اور گوسالے کی جو محبت ہے' وہ جاگزیں ہو چکی ہوئی ہے۔ اس کے نکالنے کا طریقہ صرف یہی تھا کہ ہم اپنی آنے والی نسل کو سنبھالتے۔ شروع سے ہی ان کے ذہنوں کے اندر غلط خیالات' غیر قرآنی معتقدات' جتنے پڑے تھے' ان کو تعلیم و تربیت سے' علم و بصیرت سے' فکر و نظر کی رو سے' ایک ایک کر کے نکالتے۔ ان کی جگہ قرآن کی مثبت تعلیم ان کے دلوں میں جاگزیں کرتے' پھر یہ جو ہماری نئی نسل تھی یہ مسلمان ہوتی۔ یہ بنی اسرائیل کی پرانی نسل ہے یہ وہی ہے' جس طرح سے کہ ہم ہندوستان سے آئے ہوئے مسلمان یہاں موجود ہیں۔ یا ہندوستان سے آئے ہوئے نہیں' جتنے بھی مسلمان آج کرۂ ارض پہ دیکھ لیجیے جو پیدائشی طور پہ مسلمانوں کے گھر میں جنم لے کر مسلمان بنتے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہے۔ ہم یہاں کے معتقدات لے کر آئے ہیں' وہ اپنے ہاں کے بزرگوں کے جو قبل از اسلام کے تھے ان کو لے کر چلے آ رہے ہیں صاحب! اس لیے کہ اپنے بچوں میں صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام ہم نے کبھی کیا ہی نہیں۔ ان کے دل سے' جب آپ کسی وقت بھی' اس طرح سے گوسالہ کو نکالنا چاہیں گے تو پھر ہزار حجتیں دل میں پیدا ہونگی صاحب! وہ نہیں ادھر آئیں گے کیونکہ انہوں نے علیٰ وجہ البصیرت یہ نہیں کیا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زیر تربیت پروان چڑھنے والی نئی نسل کی معرکہ آرائی اور اس کا خلاصہ

یہی وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے کہا کہ یہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ قوم آئی تھی' قدم قدم کے اوپر ان کا دامن پکڑ کر وہ بیٹھ جاتی کہ یہ نہیں کریں گے وہ کریں گے' یہ نہیں کریں گے وہ کریں گے۔ یہ کیفیت ہوگی۔ اور اس کے بعد کہا یہ گیا کہ اس قوم کو تم ان جنگلوں میں چھوڑ دو' دشت نوردیاں کرنے دو' ان کو مرنے دو' تباہ ہونے دو لیکن ان کی آنے والی نسل کو سنبھال لو۔ اور قرآن نے کہا ہے کہ اس کے بعد جب نئی نسل پروان چڑھی اور موسیٰ علیہ السلام پہ ایمان لائی تو اس پرانی نسل نے جو قدم قدم کے اوپر یہ کہا تھا کہ ہم اندر نہیں جائیں گے' ہم نہیں فلسطین کی زمین جا کر قبضہ لیں گے۔ کہا ہے کہ وہ ایمان لائی اور ایک جھپٹے میں جا کر انہوں نے اس ارضِ مقدس کے اوپر قبضہ کر لیا۔ اس لیے کہ اس نئی نسل کی ان خیالات کے تابع تعلیم و تربیت ہوئی تھی۔

عزیزانِ من! قرآن نے ان آیاتِ مقدسہ میں بات یہ کہی ہے کہ وہ عجل اور وہ گوسالہ جسے یہ پیدائشی طور پہ مسلمان ہونے والی قومیں

اپنے دل کی گہرائیوں میں لے کر آتی ہیں قدم قدم کے اوپر وہ دامن کش ہو جاتی ہیں' یاد رکھیے! اور پھر یہ نہ کسی ڈانٹ ڈپٹ سے نکل سکتی ہیں' نہ کفر کے فتوؤں سے نکل سکتی ہیں' نہ ملک کے اندر قانون سازی سے نکل سکتی ہیں۔ یہ نکل سکتی ہیں نئے سرے سے اس قوم کے نوجوانوں کی صحیح خطوط پر تعلیم و تربیت کرنے سے' یوں کہیے کہ نئے سرے سے ان کو مسلمان کرنے سے پھر وہ ذریت پیدا ہوتی ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ پھر وہ بھپرے ہوئے سیلاب کی طرح ابھرتی ہے' وہ سچے مسلمان ہوتے ہیں۔ یہ ہے چیز جو قرآنِ کریم اس واقعہ سے ہمارے سامنے لایا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک اس قسم کے واقعات کو بیان کرنے کا مقصد

پہلا واقعہ تھا کہ چھوٹی سی چھوٹی چیزیں بھی جو کسی سوسائٹی میں اجتماعی نظام کے اندر اپنے اوپر عائد کر لی جائیں' ان کی پابندی بھی نہایت ضروری ہے۔ ان سے یہ کہا کہ تم ان سے اعراض برتو کہ بات تو بڑی چھوٹی سی ہے' کیا ہوا کہ دائیں کو گزر گئے یا بائیں سے گزر گئے۔ انہوں نے کہا کہ جو قانون کا احترام ہے' وہ ان چیزوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ جذبہ دل سے مٹ گیا تو پھر بڑے بڑے قانون کی بھی تم احتیاط نہیں برتو گے' سرکشی اختیار کر لو گے۔ پھر قوم کے اندر سے قانون کا احترام اٹھ جائے گا۔ دوسرا واقعہ یہ بیان کیا کہ جس قوم کو تم نے صحیح معنوں کے اندر مومن بنانا ہو اس کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا اس طرح انتظام کرو کہ جو غلط عقائد اور معتقدات اور نظریات ہیں' وہ علم و فکر و بصیرت کی روشنی سے ان کے اندر سے نکلتے چلے جائیں اور صحیح اعتقادات اور صحیح نظریات ان کے اندر جاگزیں ہوتے چلے جائیں۔ یہ دوسری چیز ہے جو قرآن نے اسی واقعہ سے بتائی ہے۔ پہلے یہ بات کہی تھی کہ ایک بقرہ' جسے بیل کہا جائے گا' سانڈ کہا جائے گا' اسے ذبح کر دو۔ بات صاف تھی۔ اب انہوں نے اس میں کرید کرنا شروع کی۔ یعنی جو تفاصیل نہیں دی گئی تھیں' وہ تفاصیل متعین کرنا شروع کر دیں۔ اب وہ پوچھتے چلے جاتے ہیں' اس کا جواب دینا ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک چیز جو پہلے کتنی آسان تھی کہ گائے ذبح کر دو' بہت آسان تھا' کوئی گائے لیجیے' ذبح کر دیجیے' حکم کی تعمیل ہو گئی لیکن جب آپ خود کرید کر اس کی جزئیات متعین کرنا شروع کریں تو آہستہ آہستہ آپ دیکھتے ہیں کہ جو آپ کی آسانی تھی وہ کس قدر سمٹتی ہوئی مشکل کے اندر تبدیل ہوتی چلی گئی۔ اب یہی جو آپ کے ہاں کی آسان شریعت تھی' اُسے آپ اپنے اوپر ان جزئیات کے تعین سے' ان تفصیلات کے خود متعین کرنے سے' کتنی مشکل بناتے چلے جا رہے ہیں۔ جو آسان دین ہے' وہ اس قدر ایک مشکل گراں گیر چیز ہو جاتی ہے' بوجھل چیز ہو جاتی ہے۔ یہ کیسے ہو جاتی ہے؟ اس لیے کہ تم خود اس کو یہ کچھ بنا لیتے ہو۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے دیئے گئے اصول غیر متبدل ہوتے ہیں جبکہ جزئیات کی یہ صورت نہیں ہوتی

قرآنِ کریم نے اسی سلسلے کے اندر، اپنے ہاں یہ بات کہی' یہ بڑی عجیب چیز ہے اور یہ دین کے اندر بڑا اہم نکتہ ہے۔ کہا کہ **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَلَکُمْ تَسُؤْکُمْ وَ اِنْ تَسْئَلُوْا عَنْھَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَلَکُمْ عَفَا اللّٰہُ عَنْھَا وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ o قَدْ سَاَلَھَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِکُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِھَا کٰفِرِیْنَ**(5:101-2)۔ کیا بات ہے! کہا کہ اے مسلمانو! جن باتوں کی تفصیلات و جزئیات خود قرآن نے نہ دی ہوں' وحی نے متعین نہ کی ہوں' خواہ مخواہ کرید کر ان کو نہ پوچھا کرو۔ اب جواب دیا جائے گا تو وہ جو جزئیات ہیں' جن کو دانستہ چھوڑا تھا کہ ان کو متعین نہ کیا جائے' وہ آ جائیں گی۔ اس لیے کہ اصول تو ایسے ہوتے ہیں جو ہر زمانے میں قیامت تک کے لیے ممکن العمل ہوتے ہیں' اصول پہ عمل کیا جا سکتا ہے' وہ غیر متبدل ہوتا ہے۔ اصول پہ جس طریقے سے عمل کیا جائے وہ ہنگامی ہوتا ہے' وہ وقتی ہوتا ہے' وہ زمان و مکان کے اندر مقید ہوتا ہے۔ زمانے کے تقاضے اور حالات کے بدلنے سے اس کے طریق کار' جزئیات' تفاصیل' اور Procedure میں تبدیلیاں لانا واجب ہوتا ہے' وہ تبدیلیاں لانا ضروری ہو جاتا ہے لیکن اگر آپ کسی وقت کی متعین کردہ ان تفاصیل کو بھی اصولوں کی طرح غیر متبدل بنالیں تو کچھ عرصے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ پاؤں بڑھ جائے گا' جوتا چھوٹا ہو جائے گا۔ اور اگر یہ فیصلہ ہو کہ نہیں صاحب! ساری عمر اسے ہی پہننا ہے تو آپ دیکھتے ہیں وہ کیا مشکلات پیدا ہونگی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اگر وہی Mentality (ذہنیت) ہے کہ صاحب! کچھ نہیں' کچھ فکر نہیں کرنا' پاؤں کو کاٹنا ہے تو کاٹے' اسے اس کے اندر باندھے رکھو' پہننا وہی ہے لیکن جو کھڑا ہو کر سوچنا شروع کرے کہ صاحب! اسے تو پاؤں کے ماپ پہ ہونا چاہیے اور اسے کہا جائے کہ نہیں صاحب! یہی کچھ کرنا فرض ہے تو مصیبت میں پڑ گئے۔

قرآنِ حکیم نے جن جزئیات کو متعین نہیں کیا' انہیں متعین کرانے کی کوشش نہ کریں

عجیب چیز ہے جو قرآن نے کہا ہے' سنیئے! قرآن کیا کہتا ہے۔ کہا ہے کہ اے مسلمانو! یہ نہ کیا کرو کہ جن جزئیات کو ہم نے متعین نہیں کیا' ان کے متعلق سوالات کر کے خود ہی متعین کرانا شروع کر دو۔ یہ چیز اگر ہوئی تو کسی وقت آگے جا کر یہی چیز تم پر گراں گزرے گی۔ کہا کہ تم سے پہلے قوم بنی اسرائیل نے یہ روش اختیار کی تھی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ نتیجہ ہے جو قرآن بتاتا ہے۔ کہا کہ اس کے بعد ہوا یہ کہ وہ جو اصلِ دین تھا' وہ جو اصول تھا' وہ تو ہر زمانے میں ممکن العمل تھا' اس پہ تو عمل کیا جا سکتا تھا' اس کے خلاف اعتراض ہو نہیں سکتا تھا۔ یہ جزئیات کچھ عرصے کے بعد جا کر بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔ کہا یہ کہ یہ دین ہے اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ پھر ہوا یہ کہ جزئیات کو ناممکن پانے کے بعد اس قوم نے کہا کہ صاحب! یہ دین اس قابل ہی نہیں کہ اس پہ عمل ہو جائے' وہ دین

سے ہی کافر ہو گئے۔

نئی نسل کی قرآنِ حکیم سے برگشتہ ہونے کی بنیادی وجہ

قرآن بڑی عظیم چیز کہہ گیا ہے۔ آج جو آپ کے ہاں یہ نئی نسل ہے جسے آپ کہہ رہے ہیں صاحب! کہ دین سے برگشتہ ہو رہی ہے' کیا آپ کو پتہ ہے کہ یہ کس چیز سے برگشتہ ہو رہی ہے؟ یہ اس جوتے کو اتار کر پھینک رہی ہے جو ان کے پاؤں میں فٹ نہیں آ رہا۔ وہ جو Procedural (طریقِ کار کی) چیزیں تھیں' وہ جو جزئیات اور تفاصیل تھیں' جنہیں ایک ہی وقت تک کے لیے رکھا گیا تھا' اگلے وقت وہ چلنی ہی نہیں تھیں' ان کو کہا گیا ہے کہ ان کے اوپر پابندی کرنا ضروری ہے' یہ دین ہے۔ اب وہ جو پابندی ہے' وہ ہو نہیں سکتی' وہ ناممکن ہے۔ اگر اس پابندی کو کہہ دیا جاتا کہ وقتی تھی' وہ چھوڑ دو تو وہ لوگ اصول سے منحرف نہیں ہوتے' ان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ ان تمام پابندیوں کے ساتھ تمہیں مسلمان رہنا ہو گا۔ تو جب وہ دیکھتے ہیں کہ اس پہ عمل ہی نہیں ہو سکتا تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب! سات سلام آپ کے ہاں کے دین کو' رکھیے اسے اپنے ہاں۔ کہا کہ ثُمَّ اَصۡبَحُوۡا بِهَا كٰفِرِيۡنَ (5:102) ان جزئیات کی پابندیوں کے اوپر جو تم نے شدت برتی تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اصلِ دین سے منحرف ہو گئے۔ یہ ہے چیز جو قرآن کہہ گیا ہے۔ کہا کہ کہیں یہ نہ کرنا' دین کو یہ نہ بنا دینا۔ خود پوچھ پوچھ کر صاحب! وہ خود اسے متعین کرتے ہیں۔ یعنی آپ کے ہاں تو اب اگر مسواک کی جگہ ٹوتھ برش کہہ دیا جائے تو یہ بھی خلافِ شریعت ہو جاتا ہے۔ مسواک کی لمبائی اگر ایک بالشت سے کم رہ جائے تو وہ بھی خلافِ شریعت ہو جاتا ہے۔ آپ کے ہاں کی پتلون اگر آپ کے ٹخنے پر آ جاتی ہے تو یہ بھی خلافِ شریعت ہو جاتا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھیں یعنی وہ صرف دین کے اصول تھے جو غیر متبدل تھے' جزئیات نہیں تھیں۔

نئی نسل کے سلسلہ میں محترم پرویزؒ کا ذاتی تجربہ

عزیزانِ من! یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ یہی جو آپ کے ہاں اس طرح سے مذہب گزیدہ نوجوان پھرتے ہیں' جنہیں دیکھ کر ہمارے ہاں کا یہ جو مقدس طبقہ ہے' اس کی پیشانی پہ جفر کے نقشے بنتے ہیں' منہ میں جھاگ آ جاتی ہے' آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں' لٹھ گھومتا ہے' کفر کے فتوے عائد کرتے ہیں' یہ ان کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ یہ اس قدر سرکش ہوئے نوجوان میرے پاس آتے ہیں' میں انہیں علم و بصیرت کی روشنی میں دین کے اصول سمجھاتا ہوں۔ باور کیجیے! آج تک میرا ایک بھی ایسا کیس نہیں آیا جنہوں نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا ہو۔ عزیزانِ من! یہ کیا مذاق ہو رہا ہے! عام سطح سے ذرا بلند ذہنیت کے انسانوں کی یہ کیفیت ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869) کے اشعار آج بھی اسی طرح سے تر و تازہ ہیں جیسے سو سال پیشتر تھے۔ خدائے عظیم و جلیل و علیم و بصیر کا یہ آخری شاہکار

قرآنِ کریم' کیا اس کے اصول ایسے ہونگے کہ یہ تیرہ سو سال کے اندر ایسے پرانے ہو جائیں کہ اب یہ قابلِ عمل بھی نہ رہیں' سمجھ میں بھی نہ آ سکیں۔ اس کو سمجھ اور سوچ اور فکر و علم و بصیرت سے جاننے والا ہو تو اسے مردود قرار دیدیا جائے (معاذ اللہ)۔ کس کے متعلق یہ بات کہہ رہے ہو؟ ارسطو (384B.C-322B.C) کے بنائے ہوئے جتنے قوانین ہیں' وہ تو آج تک آپ کے ہاں اسی طرح چلے آئیں' خدائے عظیم کے یہ دیئے ہوئے جو اصول ہیں یہ ناممکن العمل رہ جائیں' یہ ناممکن ہے۔ ہوا یہ ہے جو قرآن نے کہا تھا کہ یہ نہ کر لینا کہ ان اصولوں کے اوپر عمل پیرا ہونے کے جو طریق کار تھے' جو جزئیات تھیں' جو ایک وقت کے لیے تم نے متعین کی تھیں' ان کو بھی ابدی طور پر غیر متبدل قرار دے دو' وہ چل سکنے کے قابل نہیں ہونگی۔ بات یہ ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بجائے اس کے کہ یہ بعد میں جو تم نے وضع کی ہوئی تفصیلات ہیں' ان کو چھوڑ کر اصلِ دین پہ آئیں' تم دونوں میں فرق نہیں کرو گے' اس کے اوپر وہ چل نہیں سکیں گے۔ کہا کہ **اَصۡبَحُوۡا بِهَا كٰفِرِيۡنَ** (5:102) وہ اصلِ دین کو ہی چھوڑ دیں گے۔

قرآن حکیم اپنے ہاں قصے کہانیاں بیان نہیں کرتا بلکہ زندگی کے اصول بیان کرتا ہے

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ قرآن یہ جو اس قسم کی بظاہر داستانیں بیان کرتا ہے' یہ جو اقوام سابقہ کی سرگزشتیں بیان کرتا ہے' یہ تاریخ کے واقعات کے طور پہ بیان نہیں کرتا' زندگی کے اصولوں کے طریق پہ بیان کرتا ہے۔ اس کے اندر سے جو وہ نتائج ہمارے سامنے لاتا ہے وہ ابدی ہیں' غیر متبدل ہیں' وہ آج بھی اسی طرح سے زندہ و پائندہ ہیں جیسے اس دور کے اندر تھے لیکن ہم ہیں کہ ان چیزوں کو بھی افسانوں کی طرح پڑھ کر آگے گزر جاتے ہیں' کوئی اس سے ہم سبق نہیں لیتے کہ ہم نے کیا کیا ہوا ہے۔ اس لیے کہ ہم بھی تو اسی سطح کے اوپر آ چکے ہیں' جس سطح کے اوپر یہ قومیں تھیں' ہم نے بھی تو دین کو مذہب بنا لیا ہوا ہے۔

برادرانِ عزیز! یہ چیز مذہب ہے کہ جو اس کے اندر اصول ہیں ان کو تو گم کر دیا جائے اور یہ جو اس کے لیے ہم نے خود تفاصیل متعین کی تھیں' ان کو عینِ دین بنا لیا جائے' پھر یہ مذہب ہو جاتا ہے۔ آپ ان چیزوں کے اوپر' جو انہوں نے ظواہر بنا رکھے ہیں' آپ ان کے اوپر پورے اتر آیئے: وضع قطع' شکل اور شباہت جس طرح کہتے ہیں کہ ہونی چاہیے وہ بنا لیجئے' ان کی اقدار کے مطابق' ان کی Measurement (پیمائش) کے مطابق وہ کچھ کر لیجیے اور پھر آپ دیکھیے کس قدر آپ معتبر' کس قدر شریف' کس قدر قابل اعتماد' متقی' پرہیزگار گنے جا رہے ہیں۔ کوئی نہیں دیکھے گا کہ آپ کے سینے کے اندر کیا کچھ ہے؟ سیرت و کردار کیا ہے؟ نمازی اور پرہیزگاری انہی چیزوں کا نام ہے۔ دین کے اصول کسی کے سامنے نہیں ہیں۔ اور اگر کسی میں یہ چیزیں نہیں ہیں یا اگر اس میں کسی قدر فرق آ گیا ہوا ہے تو کتنا ہی سیرت و کردار کے اعتبار سے بلند کیوں نہ ہو' ان کی نگاہوں کے اندر وہ جہنم کا کندہ بن جاتا ہے۔ آج معیار بدل گیا' اقدار بدل

گئیں، دین کی اقدار اور تھیں، مذہب میں آ کر کچھ اور ہو گئیں۔

اس کرہ ارض کا مستقبل دین کی شمع نورانی سے وابستہ ہے، مذہب کی فرقہ واریت کی تعلیم سے نہیں

عزیزانِ من! یہ جزئیات، یہ تفاصیل، یہ جو کسی زمانے کے انسانوں کی خود پیدا کردہ ہیں، ہمیشہ کے لیے نہ چل سکتی ہیں، نہ چل سکیں گی۔ اگر آپ اس کو عینِ دین بنائیں گے کہ اس کو چھوڑنے سے تم دین چھوڑتے ہو، یہ چل نہیں سکتی ہیں۔ وہ بیچارے منافقت نہیں برت سکتے، یہ جو ہمارے نوجوان ہیں، یہ بڑے Straight Forward (صاف گو) واقع ہوئے ہیں۔ ابھی تو یہ آپ کی ایک جزئیشن آج سلگ رہی ہے، دھواں ہی دے رہی ہے اور آگے آنے دیجیے تو وہ اَصۡبَحُوۡا بِهَا كٰفِرِیۡنَ (5:102) اس لبادے کو یوں چھوڑ کر الگ ہو جائے گی، اصلِ دین سے ہی منحرف ہو جائے گی۔ سنبھال لو اس آنے والی نسل کو، بتاؤ انہیں کہ دین کے جو کچھ اصول قرآن کے اندر ہیں، یہ ہیں غیر متبدل۔ اور اس کے متعلق ہم آج بھی دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ صرف علم وبصیرت کو معیار بنا کر اس کے سامنے لائیے۔ ہم آپ کو بتائیں گے کہ یہ چیزیں آج بھی نہ صرف یہ کہ ممکن العمل ہیں، بلکہ آج بھی ساری دنیا میں نظامِ ہیئت اجتماعیہ کے لیے بہترین تعلیم یہی ہو سکتی ہے اور یہ جتنی چیزیں آپ نے خود وضع کر کے، ان کا نام غیر متبدل شریعت قرار دے دیا ہوا ہے، وہ زمانوں کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتیں، خود بیٹھ کر ان میں تبدیلیاں پیدا کر لیجیے۔ یہ بس اتنی ہی چیز ہے۔ یہ ہے چیز، برادرانِ عزیز! جو قرآنِ کریم نے اس میں دی ہے۔

ہم آج سورۃ البقرۃ کی آیت 71 تک آ گئے، 72 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔ وہاں سے پھر ایک اور بات شروع ہو جائے گی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀

بائیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2) (آیات 72 تا 82)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْیِ
اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ
قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا
يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ
يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا
خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا
تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ
اَمَانِىَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا
النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1968ء کی 10 تاریخ ہے اور ہم درسِ قرآن کریم کے سلسلہ نو میں آج سورۃ البقرۃ کی آیت 72 سے شروع کریں گے: (2:72)۔

بنی اسرائیل کے فرد کے قتل ہونے پر قاتل کا سراغ لگانے کے سلسلہ میں پیش کردہ تراجم وتفاسیر اور ان کی پیدا شدہ الجھنیں

یہ آیت مفہوم کے اعتبار سے مفسرین کے نزدیک قرآنِ کریم کی ایک مشکل آیت سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کا جو ترجمہ یا مفہوم لیا جاتا

ہےاس اعتبار سے واقعی یہ ایسی پیچیدگی پیدا کرتی ہے کہ خود ذہن بھی اس دشواری کو محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔آیت یہ ہے: **وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ o فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** (2:72.73)۔عام طور پر ترجمہ بھی یہی کیا جاتا ہےاور سمجھایا بھی یہ جاتا ہے کہ وہاں بنی اسرائیل میں کسی شخص کو قتل کر دیا گیا اور پھر وہ قاتل کا پتہ نہیں چلتا تھا۔وہ ایک دوسرے پر الزام دینے لگے۔بات صاف نہیں ہوتی تھی تو خدا نے یہ کہا۔ اب آپ کو معلوم ہے کہ پیچھے سے گائے یا سانڈ یا بچھڑے کے ذبح کرنے کا قصہ چلا آتا تھا۔یہاں کہا گیا کہ خدا نے یہ کہا کہ وہ جو ذبح شدہ گائے ہے‘اس کا کوئی ایک ٹکڑا‘اس مردے کو مارو‘اسے اس لاش کے ساتھ چھو دیجیے۔جب وہ ٹکڑا اس مردے سے چھوا تو وہ مردہ زندہ ہو گیا اور زندہ ہو کر اس نے بتا دیا کہ میرا قاتل کون ہےاور یہ بتانے کے بعد پھر یہ مر گیا۔یہی اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے‘یہی اس کی تفصیل بتائی جاتی ہے۔اور آگے کہا یہ جاتا ہے کہ **كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى** (2:73) اس طرح سے خدا مردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔

اب آپ دیکھیے کہ اس واقعہ میں اگر اس کا یہ مفہوم لیا جائے اور تفصیل یہ بیان کی جائے‘ تو اس میں ذہن کو کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں۔گائے یا بیل کو ذبح کیا گیا‘اس میں کوئی تقدس نہیں‘ کوئی خاص بات نہیں۔وہاں یہ چیز کہی گئی کہ ہم نے صرف یہ کہا تھا کہ گائے کو یا بچھڑے کو ذبح کر لو تو انہوں نے خود ہی اس میں باریکیاں نکال نکال کر کہا کہ اس کا کیا رنگ ہوگا‘ کیا عمر ہوگی؟ اتنی سی بات ہے یعنی اس میں کوئی خصوصیت ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کیا جائے۔اور اگر ہو بھی تو آگے یہ چیز ہے کہ ایک مردہ ہے اسے اگر اس ذبح شدہ گائے کے کسی حصے سے چھو لیا جائے اور وہ زندہ ہو جائے اور کہا یہ جائے کہ اس طرح سے اللہ مردے کو زندہ کیا کرتا ہے‘ تو اب یہ جتنے مُردے مرنے کے بعد قیامت میں **كَذٰلِكَ** اس طرح سے زندہ ہونے ہیں‘ تو کیا وہ گائے کے ٹکڑے رکھے ہوئے ہونگے جن سے چھوا جائے گا اور وہ زندہ ہونگے؟ ذبح شدہ گائے کے جسم کا ٹکڑا اس سے چھو دیجیے‘مردہ زندہ ہو جائے گا۔جب بات نہیں بنی تو سیدھی سی چیز ہے کہ یہ کہہ دیا کہ یہ ایک معجزہ تھا جو دکھایا گیا۔یہ کس کا معجزہ ہوا؟ اس گائے کی لاش کا معجزہ ہے کہ جس کے چھو دینے سے مُردہ زندہ ہو گیا تو گائے نے یہ معجزہ دکھایا۔کا ہے کے لیے دکھایا؟ یہ بھی ایک جواب طلب سوال ہے۔

قرآنِ کریم کے سمجھنے کا جو طریق ہے اسے سن لیجیے‘بات یہیں سے واضح ہوتی ہے۔کہا کہ **وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** (2:73) قرآن یہ چیز اس لیے بیان کر رہا ہے تاکہ تم عقل وفکر سے کام لو۔اگر یہ معجزہ ہے تو معجزہ تو کہتے ہی اس کو ہیں جو عقل کو عاجز کر دے۔اس لفظ کے معنی یہ ہیں: ”جہاں انسان کی عقل وفکر عاجز آجائے“۔یہ لفظ معجزہ ہے ہی عجز سے‘جس میں عقل وفکر کچھ نہ بتا سکے کہ یہ کیسے ہو گیا۔معجزہ کہتے ہی اس کو ہیں۔اور یہاں یہ ہے کہ **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** (2:73) تاکہ تم عقل وفکر سے کام لو۔ظاہر ہے یہ کوئی ایسی چیز ہے جس کا تعلق عقل وفکر سے ہے۔خود قرآن یہ بتا رہا ہے۔لہٰذا کوئی چیز نہ تو فوق الفطرت ہو سکتی ہے‘نہ خارقِ عادت ہو سکتی ہے‘نہ

ایسی چیز ہو سکتی ہے جو عقل کی رو سے سمجھ میں نہ آ سکے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** (2:73)۔اب آپ دیکھیے کہ یہاں سے آپ کو اس کے سمجھنے کا Clue (نکتہ) ملے گا کہ کوئی چیز ہے جس کا تعلق علم اور عقل سے ہے' کوئی ایسا طریق ہے جو علمی طور پر' فکری طور پر'اس قسم کی جو چیز ہے یہ کی گئی ہے۔اور وہی چیز ہے جس کی طرف قرآن نے یہاں اشارہ کیا۔

شرک کی نوعیت جس سے انسان کی انسانیت ہی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے

اب اس تمہید کے بعد ربطِ مضمون کی طرف آیئے۔ پیچھے سے جو بات چلی آ رہی ہے' وہ یہ تھی کہ شرک کی وجہ سے تمہارے قلب کی گہرائیوں میں اس معبودِ باطل کی محبت جا گزیں ہو چکی ہوئی تھی جسے مصر کا سانڈ کہا جاتا ہے' بیل کہا جاتا ہے۔شرک کو تمہارے دل سے نکالنے کے لیے یہ چیز کی گئی کہ تمہارے اپنے ہاتھوں سے اس کو ذبح کرایا گیا۔

شرک سے انسانوں کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے؟ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے شرک کی پہلی صورت تو یہ ہے کہ یہ جتنی فطرت کی قوتیں ہیں ان کو اتنا بالا دست مانا جائے کہ انسان اس کے سامنے' سہا ہوا' ڈرا ہوا' لرزتا ہوا' گڑ گڑاتا ہوا رہے۔بجلی چمکے تو سجدہ کرے' بادل گرجے تو ڈنڈوت بجالائے۔اب کہیں بڑے دریا کے سامنے سجدہ ریز ہو رہے ہیں' کہیں سانپ کو دیکھ کر ڈر رہے ہیں' کہیں بڑا سا پیڑ نظر آ گیا اس سے خائف چلے آ رہے ہیں۔خوف خوف خوف اور ہر طرف خوف ہے۔اور اس سے آگے بڑھ کر جب انسانوں کو خدا بنایا تو انسانوں کا خوف در آیا کہ کہیں صاحب ناراض نہ ہو جائیں' خفا نہ ہو جائیں۔ ہر وقت خوف ہی خوف کی حالت میں ہیں۔عزیزانِ من! شرک خوف پیدا کرتا ہے'انسان اپنے مقامِ انسانیت پہ کھڑا ہی نہیں رہ سکتا۔یہ فطرت کی قوتیں ہیں جنہیں اس کے لیے مسخر کیا گیا تھا کہ تم ان سے کام لو اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ ان کے سامنے سجدہ ریز ہے۔یہ انسان ہیں جن کے متعلق کہا گیا تھا کہ تمام انسانی بچے یکساں واجب التکریم ہیں مگر یہ اپنے ہی جیسے انسان کے سامنے اس طرح سے سجدہ ریز ہیں۔خوف ہے یہ۔

ہر کہ رمزِ مصطفیٰؐ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

(اسرار و رموز،(1948)،ص111)

(جو کوئی آدمی حضرت رسولِ اکرمؐ کے رمز سمجھ گیا تو اس نے شرک کو خوف کے اندر پوشیدہ دیکھا)۔

شرک کا نتیجہ خوف ہے کہ انسان اپنے مقام پہ قائم ہی نہیں رہتا۔

شرک میں مبتلا اقوام سوکھے گھاس کی مانند ہو کر رہ جاتی ہیں

دیکھیے! قرآنِ کریم نے شرک کا نتیجہ کیا بتایا ہے' کس خوبصورت اور جامع انداز میں بات کی ہے کہ شرک سے ہوتا کیا ہے؟ کہا کہ وَ

مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ (22:31) جو خدا کے ساتھ شرک کرتا ہے' فَکَاَنَّمَا (22:31) اس کی مثال یوں سمجھو۔ اب کیا مثالیں ہیں؟ کہا کہ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (22:31) جیسے انسان آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ آ گرے۔ کیا بات قرآن کر جاتا ہے صاحب! مقامِ انسانیت اتنی بلندیوں کے اوپر ہے اور :

تُو جھکا جب غیر کے آگے' نہ من تیرا نہ تن ❶

جونہی یہ اپنے مقام سے جھکا تو پھر وہ ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ آ گرے۔ یا یوں سمجھو کہ فَتَخۡطَفُہُ الطَّیۡرُ (22:31) ایک چڑیا کا چھوٹا بچہ' ہمارے ہاں اسے بوٹ کہتے ہیں' پتہ نہیں یہ اردو کا لفظ ہے یا نہیں ہے' وہ ابھی گھونسلے کے اندر نو زائیدہ ہے' جو اڑنے کے قابل بھی نہیں ہے تو کہا کہ وہ گھونسلے سے گر جائے اور چیل اس کو جھپٹ کر لے جائے۔ شرک سے یہ کیفیت ہوتی ہے۔ اَوۡ تَہۡوِیۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ مَکَانٍ سَحِیۡقٍ (22:31) یا گھاس کا ایک سوکھا ہوا تنکا ہو اور کہیں سے آندھی کا جھکڑ آ جائے پھر اس کی جو کیفیت ہوتی ہے' وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ جب شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے تو انسان کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ شرک سے انسان کی کیا کیفیت ہو جاتی ہے۔ اور جو پوری قوم اس طرح سے شرک کے اندر مبتلا تھی' شرک بھی اس قسم کا تھا کہ بچھڑا ہی نہیں بلکہ اپنے ہاتھوں سے' ان کے سامنے اس سامری نے وہ کچھ اس کا بت سا بنایا اور دو دو نبیوںؑ (حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام) کی موجودگی میں اسے سجدہ کرنے لگ گئے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خوف سے ان کی کیفیت کیا ہو گئی تھی۔

اب یہ جو اگلی چیز ہے اس کا تعلق یوں ہے کہ پھر تو ہم پرستیوں سے یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ اب ان تو ہم پرستیوں سے آپ کے لیے سب سے زیادہ ڈر والی چیز مردہ ہوتی ہے۔ گھر کا اپنا عزیز ترین فرد جس کے لیے محبت ہی محبت تھی' وہ مر جاتا ہے' اپنے کمرے کے اندر اس کو رکھا ہوا ہوتا ہے۔ اگر رات بھر لاش کو گھر میں رکھنا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ سارا گھر سہا ہوا ہوتا ہے۔ کوئی اکیلا رات کو اس کے پاس نہیں بیٹھ سکتا' پورا گھر یا سارے عزیز اس کے اردگرد بیٹھتے ہیں' رات بھر جاگتے ہیں' وہ کچھ پڑھتے رہتے ہیں۔ پڑھنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ نیند نہ آ جائے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اس کو ثواب پہنچایا جا رہا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو' وہی جو پانچ منٹ پہلے آپ کا عزیز ترین تھا' ایک سانس کے نہ آ جانے سے جب وہ لاش ہو گیا تو اس لاش سے آپ خود اتنا ڈرنے لگ گئے کہ اکیلے اس کے پاس رات کو اس کمرے میں بیٹھ نہیں سکتے۔ دیکھتے ہیں آپ حالانکہ ذرا لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (2:73) سے اگر آپ کہیے تو جو زندہ ہے اس سے تو کچھ پھر بھی ڈر ہو سکتا ہے کہ تنہائی میں کہیں اس سے چمٹ نہ جائے' جو مردہ ہو گیا ہے اس کا کیا ڈر۔ یہ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (2:73) ارے! اس سے ڈرنے

---

❶ پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تُو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن　　(اقبالؒ: بالِ جبریل)

والی کونسی بات ہے؟ خود کہتے ہو مردہ بدستِ زندہ جو کچھ جی میں آئے اس کے ساتھ کیجیے صاحب! نیند میں سویا ہوا بھی کچھ ہاتھ پاؤں مارے گا وہ تو بیچارہ یہ بھی نہیں کرسکتا لیکن آپ اس سے ڈرتے کتنا ہیں۔ اور اگر کہیں قبرستان میں جانا پڑ جائے رات کا اندھیرا ہو تو خوف کی حالت تو دیکھیے؟ کئی واقعات ہو گئے ہیں کہ انسان وہاں خوف سے گر کر مر گیا۔

علامہ پرویزؒ کی زندگی کا وہ حصہ جو تصوف کی جان لیوا مشقتوں کی نذر ہو کر رہ گیا

یہ جو تصوف میں سخت ترین مشقتیں کرائی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہوتی ہے۔ پرانے قصے یاد آجاتے ہیں کہ یہ کچھ کرایا جاتا ہے۔ سخت ترین مشقت یہ ہوتی ہے کہ قبرستان میں تاریکی اور تنہائی میں قبر کے ساتھ لٹایا جاتا ہے۔ اسے کہتے ہیں کہ کشف القبور ہو رہا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے تھے اور کرتے تھے۔ اب پتہ چل رہا ہے کہ اپنے اندر کا ڈر ہی سب کچھ اندر دکھا رہا ہوتا ہے۔ ویدانت میں ہندوؤں کے ہاں بھیجا جاتا تھا' شمشان بھومی میں مردہ جلتا ہے اس مردے کے جلنے کے وقت مجھے وہاں بھیجا جاتا ہے اور وہ ادھر اُدھر سے کم بخت چیختے چلاتے ہیں کہ بھوت ہے' پریت ہے' چڑیلیں ہیں۔ مردے کو شروع سے ہی آپ دیکھیے کہ اس کے لیے انسان کے دل میں خوف ہوتا ہے۔ اب یہاں قتل ہو گیا ہے' قاتل کا پتہ نہیں چلتا۔ معلوم ہے کہ یہ قوم کتنی خوف زدہ ہو رہی ہے!

نفسیاتی طور پر چہرے پر ابھرنے والے نقوش جو حقائق کو پرکھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں

اب اس کی ایک نفسیاتی تدبیر ہے۔ ان سے کہا یہ گیا کہ جن پہ شبہ ہے ان میں سے ایک ایک کو اندر بھیجو اور اس ماس (گوشت) کا کوئی حصہ' ہاتھ پاؤں' کوئی اٹھا کر' اس کے ساتھ لگاؤ جو قاتل ہوگا اس کے چہرے سے خود بخود پتہ چل جائے گا۔ Psychologically (نفسیاتی طور پر) آج بھی یہ چیزیں کرتے ہیں۔ یہ مجرموں کی پہچان کے لیے ہے۔ اب تو اتنا Psychologically (نفسیاتی طور پر) یہ کچھ کرنا شروع کر رہے ہیں۔ وہ تو یہ ہے کہ نبض کی Beating (حرکت) سے معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ بول رہا ہے۔ آپ نے یہ قصے سنے ہونگے کہ صاحب! اب تو ایسے آلات ایجاد ہو گئے ہیں جن سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ سچ بولتا ہے یا جھوٹ بولتا ہے۔ وہ ہوتا کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ ان چیزوں سے انسان کے اعصاب کے اوپر ایک اثر پڑتا ہے۔ اعصاب کے اثرات سے' جتنی آپ کے اندر' یہ فزیکل مشینری ہے' اس کے اوپر اثر پڑتا ہے۔ ڈر سے آپ دیکھتے ہیں کہ پھر رنگ فق ہو جاتا ہے' نبضیں چھوٹ جاتی ہیں' چہرہ غصے سے تمتما اٹھتا ہے' دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے' دورانِ خون تیز ہو جاتا ہے' نبض پہ ہاتھ رکھیے تو آپ دیکھیے کہ وہ Frontier Mail (تیز رفتار گاڑی) کی رفتار سے چل رہی ہوتی ہے۔ انسان کے اوپر یہ اثرات مرتب ہو جاتے ہیں' پسینے آجاتے ہیں' یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ پہلی دفعہ جب کسی نے کوئی غلطی کی ہو' جھوٹ بولا ہو اور آپ کے سامنے آئے اور اس کو ابھی جرم کا چھپانا نہ آتا ہو' وہ عادی نہ ہو چکا ہو' آپ دیکھیے کہ اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ معلوم کرنے کا یہ ایک نفسیاتی طریق تھا۔

برادرانِ عزیز! یہ ایسی قوم تھی جو پہلے ہی لاش کے معاملے میں اس طرح خوف زدہ ہو رہی تھی۔ کہا کہ جب (ان کے ہاں کی یہ چیز تھی اور پتہ نہیں چلتا تھا' وَ اللّٰہُ مُخۡرِجٌ مَّا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ (2:72) وہ چھپاتے تھے کہ کس نے یہ جرم کیا ہے' اس کے اظہار کے لیے ان کو یہ ایک طریق بتایا گیا۔ اب سوچیے کہ آج تو یہ بات عام ہوگئی ہے کہ Psychologically (نفسیاتی طور پہ) اس طرح سے مجرموں کی شناخت ہوسکتی ہے۔ اس زمانے میں تو ابھی یہ چیزیں عام نہیں تھیں۔ اس زمانے میں یہ Suggest (تجویز) کیا گیا کہ یہ کیجیے۔ ان میں سے ایک ایک بلاتے چلے جاؤ اور مردے کے جسم کا حصہ اس کے جسم کے ساتھ چھواؤ۔ اب دیکھیے کہ Psychologically (نفسیاتی طور پر) پہلے ہی اس کے لیے کس قدر کیفیت پیدا کردی گئی۔ صاحب! وہ جو قاتل ہوگا اس کو تو غش آ گیا ہوگا۔ اب جب وہ کہہ دیا کہ جو قاتل نہیں ہے' اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اب قاتل تو کمرے میں اندر آتا ہوا گھبرائے گا۔ اور اس کیفیت سے کہ لاش کا ہاتھ لگنے سے یہ پتہ چل جائے گا' یہ نفسیاتی طور پہ بڑا ہی مؤثر ہوتا ہے لیکن یہ وہاں ہوتا ہے' جہاں پہلے سے کوئی خوف زدہ ہو گیا ہو۔

یہاں کہا یہ گیا ہے کہ اس کا طریق یہ ہے اور اس میں گائے کا قصہ ہی نہیں ہے اس لیے فَقُلۡنَا (2:73) ہم نے کہا کہ اضۡرِبُوۡہُ بِبَعۡضِہَا (2:73) ۔ وہ جو لاش ہے اس کا کوئی حصہ لو اور اضربوہ (2:73) یہ جو ایک ایک کر کے ملزم اندر بلائے جا رہے ہیں' جن کے اوپر شبہ گزر رہا ہے' وہ حصہ اس لاش کے ساتھ لگاؤ۔ یہاں فادٰرئتم (2:72) نے بتا دیا کہ انہیں شبہ گزر رہا تھا' وہ یہ قتل ایک دوسرے پر ڈال رہے تھے۔ کہا یہ ہے کہ ان میں سے ایک ایک ملزم کو لاؤ اور یہ ایک نفسیاتی تدبیر اختیار کرو۔ کذٰلک یحی اللہ الموتیٰ (2:73)۔ پھر یہاں آ کر اصل میں' ان مترجمین اور مفسرین کو ایک دشواری پیش آئی تو کہا کہ اس طرح سے خدا مردے کو زندہ کرتا ہے۔ انہوں نے یحی کے معنیٰ زندہ کرنا کیے مگر وہاں یہ تھا کہ وَ اللّٰہُ مُخۡرِجٌ مَّا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ (2:72) اللہ یہ ایک بات کو ظاہر کر دے گا جسے یہ چھپاتے ہیں۔

لغت میں ''زندہ کردینے'' کا مفہوم کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے

عزیزانِ من! عربی زبان میں یہ جسے ہم حی کہتے ہیں اس کے معنیٰ ''کسی خفیہ بات کے اظہار کے بھی ہوتے ہیں' یعنی ظاہر کر دینا' واضح کر دینا' نمایاں کر دینا[1] ''۔ دشواری یہ ہوتی ہے کہ یہ اس کے ایک ہی معنی لیتے ہیں: ''زندہ کر دینا''۔ اگر ''یہ زندہ کر دینے'' کے ایک

---

[1] امام راغب نے: حی الطریق کے معنیٰ ''راستہ ظاہر ہوگیا یا واضح ہوگیا'' کیے ہیں اور طریق حی کے معنیٰ ''واضح راستہ کے ہیں۔ جب ''موت'' کا لفظ حی کے مقابل آئے گا تو اس سے مفہوم ''کسی بات کا پوشیدہ ہو جانا'' ہوگا چنانچہ عقل و ہوش یا حواس (Senses) کے گم ہو جانے پر بھی ''موت'' کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ حوالہ پرویزؒ: مطالب الفرقان جلد دوم' ادارہ طلوع اسلام لاہور' 1983' ص-327۔

ہی معنی لیے جائیں گے تو پھر تو یہی چیز ہوگی لیکن دیکھیے تو سہی کہ عربوں کی اس لغت کے اندران عربوں کے ہاں یہ لفظ کن کن معانی میں استعمال ہوتا تھا۔عزیزانِ من! یہ بڑی چیز ہے اور یہاں سے آپ یہ بات سمجھیں گے کہ قرآن نے بار بار یہ کیوں کہا ہے کہ یہ قرآن عربی مبین میں نازل کیا ہوا ہے۔عربی زبان میں نازل کیا ہوا ہے' کہنے کی یہ کیا ضرورت پیش آئی؟ بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ چیز کچھ Abandon (متروک) سی ہے۔انگریزی کی کتاب میں اگر لکھا ہوا ہو کہ جی! انگریزی زبان کی کتاب ہے تو آپ کہیں گے کہ صاحب! وہ تو اس زبان کی کتاب ہے۔وہ خدا تو علیم وخبیر ہے' اس نے بتانا یہ تھا کہ اس کتاب کو سمجھتے وقت' اس زبان کا خیال رکھا کرو کہ اس زبان میں یہ الفاظ کس طرح استعمال ہوتے ہیں۔یہ اس سے کوئی الگ تھلگ بات نہیں ہے کہ قرآن کے الفاظ کے کچھ اور معنی ہیں' عربی زبان میں ان الفاظ کے کچھ اور معنی ہیں۔اور آپ کو پتہ ہے ساری پیچیدگیاں اس طرح پیدا ہوئی ہیں کہ عربی زبان کے اعتبار سے تو ان الفاظ کے اور معنی لیے جاتے ہیں' جب قرآن کی طرف آتے ہیں تو ان کے معنی وہ لیے جاتے ہیں جو کسی طرح سے کسی وقت میں متعین ہوئے اور آج بھی چلے آرہے ہیں۔

آپ نے یہ اعتراض تو کم ازکم میرے خلاف عام طور پہ سنا ہوگا کہ صاحب! قرآن لغت کی مدد سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ارے! قرآن خود کہہ رہا ہے کہ میں عربی مبین میں' لسانِ عربی کے اندر ایک کتاب ہوں۔اس زبان کے سمجھنے کے لیے بہرحال آپ کو لغت کی ضرورت ہوگی' پھر قرآن کی ضرورت ہوگی کہ اس نے کیسے ان الفاظ کو استعمال کیا۔بھئی! یہ بات کیوں نہیں سمجھ میں آتی؟ کہ صاحب! یہ جو قرآن ہے تو قرآن کی زبان اور ہے۔او! قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ عربی مبین ہے۔عزیزانِ من! قرآن سمجھنے کا طریقہ یہ محاورۂ عرب ہے اور خود قرآن نے دوسرے مقامات کے اوپر کسی لفظ کو جس طرح استعمال کیا ہے' وہ سامنے رکھیے' بات صاف ہو جاتی ہے۔جیسا کہ میں نے ضــــرب کے متعلق آپ کو کہا تھا کہ اس کے معنی یوں مارنے کے نہیں ہیں۔مختلف لغت اٹھا کر دیکھیے' پچاسیوں معنی اس طرح سے لیے ہوئے ہوتے ہیں۔انگریزی زبان میں بھی آپ دیکھیے۔میں نے اس دن کہا تھا کہ ڈکشنری کے اندر Make کا لفظ لے لیجیے پھر دیکھیے آپ کو اس کے کتنے معنی نظر آتے ہیں۔اسی طرح آپ خود Strike کا لفظ لے لیجیے اور دیکھیے تو سہی کہ اس میں کتنے معنی آتے ہیں۔اب ان میں سے کوئی ایک معنی لے کر اسے ہی آخری معنی سمجھ لینا درست نہیں ہے' اسی طرح کسی نے کسی دفعہ ایک معنی لیا اور آج تک وہی معنی چلا آرہا ہے۔اس پر آپ کہیں گے کہ نہیں صاحب! بس یہی معنی ہے' اس سے دوسرا معنی نہیں لیا جاسکتا۔کیوں نہیں لیا جاسکتا؟ دیکھیے تو سہی' محاورۂ عرب میں اس کے کتنے معنی لیے جاتے ہیں۔ان میں سے دیکھیے قرآن کی پوری تعلیم کے ساتھ کونسا معنی فٹ ان Fitin کرتا ہے یعنی قرآن کے دوسرے مقامات کے ساتھ کونسا معنی موزوں ہے یہ **يُحۡىِ اللّٰهُ الۡمَوۡتٰى**(2:73) قرآن میں اسی ایک ہی جگہ نہیں آیا' بیسیوں مقامات میں آیا ہے۔دیکھیے تو سہی کہ کیا ہر مقام پہ' وہاں سچ مچ کے مردے کو زندہ کرنا مراد لی جاتی ہے یا اس حیات وموت کے کچھ

اور معنی بھی لیے جاتے ہیں؟

قرآن تو زندہ انسانوں کو یہ کہتا ہے کہ **اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ** (8:24) اے انسانو! خدا اور رسول کی آواز پر لبیک کہو جو تمہیں اس چیز کی طرف بلاتا ہے جو تمہیں زندگی عطا کرے۔ یہ زندہ انسانوں سے کہہ رہا ہے۔ اس لحاظ سے تو اس کے معنی یہ لیے جائیں گے کہ آپ کو قبرستان میں جا کر یہ آواز دینا ہوگی۔ میں نے مثال کے طور پر یہ بات کہی ہے۔ زبان میں دیکھیے کہ کوئی لفظ کیسے استعمال ہوتا ہے۔ زندہ قومیں ہم روز کہتے ہیں، مردہ قومیں ہم روز کہتے ہیں۔ چلنے پھرنے والی قوموں کو مردہ قومیں کہتے ہیں۔ بہرحال ربطِ مضمون سے **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ** (2:73) نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ عقل و فکر کی رو سے سمجھو کہ یہ بات کیا کہی گئی ہے۔ اس میں نہ خرقِ عادت کوئی چیز ہے، نہ فوق الفطرت کوئی چیز ہے، نہ کوئی معجزہ ہے۔ اور پھر معجزہ ایک گائے کی لاش کا؟ آپ ذرا اندازہ تو لگائیے!! اور اگر گائے کی وہ لاش اپنے اندر یہ خصوصیت رکھتی تھی کہ مردے کو زندہ کر دے تو پھر اگر انہوں نے اس کو پوجا تھا تو ان کا قصور کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔

عزیزانِ من! انہیں روکا جا رہا ہے کہ گائے یا بیل (سانڈ) کچھ نہیں ہے، یہ ایک حیوان ہے۔ ان کے ہاتھوں سے اسے ذبح کرا کر اس کی جو عظمت دل کے گوشے میں تھی، اس کو مٹایا جاتا ہے۔ اور (بقول ان مترجمین و مفسرین کے) اسی گائے کی لاش کے ٹکڑے سے مردے کو زندہ کیا جاتا ہے۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ کیا وہ ساری چیز جو پہلے آ رہی تھی یہ اس کی تنقیص ہوگئی یا نہیں؟ کیا وہ خود یہ نہیں کہیں گے کہ حضور! آپ اس گائے کے پوجنے سے منع کر رہے ہیں اور اس کی لاش کی یہ کیفیت ہے کہ یہ مردے کو زندہ کر دیتی ہے اور تمہارا نبی یہ نہیں کر سکتا، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام تو یہ نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا یہ بات ہی نہیں ہے کہ گائے کے ٹکڑے سے مردے کو مارو، وہ زندہ ہو جائے گا اور یہ کہ **كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى** (2:73) اس طرح خدا مردے کو زندہ کیا کرتا ہے اور آگے ہے کہ **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ** (2:73) تا کہ تم عقل و فکر سے کام لو۔ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ تو خدا کا کلام ہے خدا کے کلام کی خصوصیت یہ ہے۔ می نہ سزد خدائے را۔ **سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُونَ** (23:91) وہ اس سے بہت بلند ہے۔ یہ بڑی باربط کتاب ہے، اس میں سے کوئی ایک حرف بھی ایسا نہیں (معاذ اللہ) جس کے متعلق کہا جائے کہ اس میں تک نہیں ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ** (2:73)۔ لیکن جہاں دین کے معاملے میں پہلے ہی قدم پہ یہ کہا جائے کہ صاحب! شرع میں دو چیزوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا یعنی (۱) شرع میں شرم کا دخل نہیں اور (۲) عقل کا دخل نہیں۔ ہاں جی! ''بے شرم تے بے عقل ہونا چاہیدا اے تاں آ وَ[1]'' مگر قرآن کہتا ہے کہ **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ** (2:73) تا کہ تم عقل و فکر سے کام لو۔ دیکھو! قرآن

---

[1] آپ کو بے شرم اور بے عقل ہونا چاہیے تو پھر شرع کی طرف آ وَ۔

کیسے سمجھا تا ہے۔ عزیزانِ من! دور جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ یہ جو کچھ بھی ہے' عقل وفکر سے کام لو' بات سمجھ میں آ جائے گی۔ میں نے عقل وفکر سے کام لیا' قرآن کے الفاظ عربی زبان سے متعین کیے' قرآن کے دوسرے مقامات دیکھے' پیچھے سے ربط دیکھا تو بات سمجھ میں آ گئی۔

اس سے پہلے بات گائے کی عظمت کے خلاف چلی آ رہی تھی۔ جو کچھ پیچھے سے چلا آ رہا تھا وہ یہ تھا کہ تم نے ایک معمولی سی بات میں اس قدر موشگافیاں شروع کر دیں۔ یہ کچھ تم نے اس لیے نہیں کیا تھا کہ پہلے بات واضح نہ تھی' تمہیں شروع سے ہی معلوم تھا کہ ہم تمہارے ہاتھوں سے سانڈ دیوتا اس لیے ذبح کرانا چاہتے تھے کہ تم نے اسے معبود بنا رکھا تھا اور ہم چاہتے تھے کہ تمہارے دل سے یہ جذبۂ عقیدت نکل جائے۔ اس قتل ناحق میں گائے تو بیچ میں آ ہی نہیں سکتی' اس گائے کی عظمت کے قیام وثبات کے لیے تو یہ بات ہی نہیں کی جا سکتی' اس کا تو سوال ہی نہیں ہے اور نہ ہی یہاں یہ بات ہے کہ خدا اس طرح مردے کو زندہ کیا کرتا ہے۔ اگر یوں ہوتا تو صاحب! یہ ساری گائیں جو ذبح ہوئی ہونگی' قیامت میں لائیں گے وہ وہاں ''اوہناں دیاں ہڈیاں کٹھیاں کردے پھردے ہون گے فرشتے کہ اینوں زبان لاؤ' اینوں کھر لاؤ' اینوں سینگ لاؤ[1]''۔ یہاں **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْن** (2:73) میں یہ باتیں نہیں آتیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جب **لَا تَعْقِلُوْنَ** کی بات آئے گی تو یہ سب آ جائیں گے کہ عقل کو دخل نہ دو۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** (2:73) خدا محسوس طور پر تمہیں یہ چیزیں' جتنی بھی ہیں' دکھاتا ہے۔ یہ **يُرِيْكُم** تو محسوس چیز ہے۔ یہ ایک جو اس طرح سے معجزہ ہے' اس میں خدا نے ہمیں دکھایا کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ پھر **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْن** کی گنجائش کہاں باقی رہی؟ کہیں بھی نہیں۔

قرآنِ حکیم قدم قدم پر ہر انسان کو عقل وفکر کی دعوت دیتا ہے

برادرانِ عزیز! دراصل بات یہ نفسیاتی تدبیر اختیار کرنے کی تھی۔ بہر حال میں نے **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْن** (2:73) سے اور قرآن کریم کی دوسری آیات سے یہ مفہوم سمجھا ہے۔ اگر کسی کی عقل وفکر اس کو اس سے کچھ بہتر مفہوم سمجھا دے تو وہ اسے لے لے لیکن ہو وہ عقل وفکر کے مطابق کیونکہ یہاں **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْن** (2:73) آیا ہے۔ عقل وفکر کو ماؤف کرنے کے بعد اگر آپ اسے لیں گے تو یہ قرآن کے خلاف چلا جائے گا کیونکہ اس نے تاکیداً کہا ہے کہ عقل وفکر کی رو سے مفہوم متعین کرو۔ **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْن** (2:73) میں کیا بات ہے قرآن کی!

---

[1] فرشتے ان کی ہڈیاں اکٹھی کرتے پھر رہے ہونگے کہ اس کو زبان لگاؤ' اس کو کُھر لگاؤ اور اس کو سینگ لگاؤ۔

آگے کہا کہ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ (2:74)۔ یہاں بات میں سے بات یاد آ گئی۔ یہی جو چیز تھی کہ اس طرح سے خدا زندگی عطا کرتا ہے، قتل کے سلسلے میں قرآن نے دوسری جگہ کہا ہوا ہے کہ قاتل کو تلاش کر کے، متعین کر کے، اسے ضرور جرم کی سزا دو۔ اس لیے کہ وَ لَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ (2:179) تمہارے لیے قصاص میں، مجرم کا تعاقب کر کے اس کو اس کے جرم کی سزا دینے میں، اے صاحبانِ عقل وبصیرت! زندگی کا سامان ہے، اس میں اجتماعی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ یہاں پھر ''حیات'' کا لفظ آیا ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہاں بھی جو ہے کہ كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى (2:73) تو وہاں بھی یہی بات آ سکتی ہے کہ اس طرح سے جب مجرم کا معلوم ہو گیا اور اس کو آپ اس کی سزا دے دیں تو یہ ہے حَیٰوةٌ یّٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ (2:179)۔ اے صاحبانِ فہم وفراست! وہ چیز جس میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ یہاں لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (2:73) آیا ہے تاکہ تم عقل وفکر سے کام لو اور وہاں یّٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ (2:179) ہے کہ اے صاحبانِ عقل وبصیرت! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے۔ یہ زندہ انسانوں سے کہا جا رہا ہے وہ یّٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ تو زندہ ہوں گے جی! ان سے کہا جا رہا ہے کہ اس طرح مجرم کو پکڑ کر سزا دینے میں تمہارے لیے سامانِ زیست ہے، زندگی کا سامان ہے۔ مجرم کو جب سزا ملتی ہے معاشرے کو زندگی مل جاتی ہے۔

بار بار کی بدعملی انسان کو پتھر کی طرح سخت کر دیتی ہے

دیکھا آپ نے قرآن کی آیات کو ملانے سے کس طرح سے آئینے کی طرح بات صاف ہوتی چلی جاتی ہے! کہا ہے کہ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ (2:74) یہ بات نہیں ہے کہ اس واقعہ کے بعد تمہاری یہ حالت ہو گئی۔ ثم کے یہی معنی نہیں ہوا کرتے کہ اس کے فوری بعد تمہاری یہ حالت ہو گئی کہ پھر تمہارے دل سخت ہو گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ''اس طرح سے تمہارے ساتھ ہوتا رہا، تم بگڑتے رہے، ہم سنوارتے رہے، تم پھر بگڑتے رہے، پھر سنورتے رہے، تمہاری یہ کیفیت ہوتی رہی اور بالآخر یہ صورت ہو گئی'' کہ تمہارے دل اس کے بعد پتھروں کی طرح سخت ہو گئے فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (2:74) بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت۔ پتھروں سے بھی زیادہ سخت۔ مثال کے طور پہ کہا کہ الْحِجَارَةِ (2:74) گویا یہ دل، مانند پتھروں کے ہو گئے، پتھر نہیں ہو گئے۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں تفسیروں میں یہ پتھر ہو جانا بھی چیز ہے۔ کہا کہ پتھروں جیسے سخت ہو گئے۔ سنگ دل تو ہم روز کہتے ہیں صاحب! دل پتھر ہو گیا، ہم روز کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے خود دوسری جگہ کہا ہے کہ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ اگر ہم اس قرآن کو قلبِ کوہ میں نازل کرتے تو وہ بھی اس کے جلال سے لرز کر پھٹ جاتا۔ ہم یہ مثالیں بیان کرتے ہیں تاکہ تم غور وفکر سے کام لو۔

عزیزانِ من! یہ مثالیں ہیں کہ پھر تمہارے دل پتھروں جیسے سخت ہو گئے بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت۔ کیا خوبصورت انداز ہے ادب کا! کہ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ (2:74) پتھروں سے بھی زیادہ سخت اس لیے کہ اگر تم پتھروں کو بھی دیکھو تو ان میں سے کبھی تمہیں پانی ٹپکتا ہوا نظر آئے گا۔ تمہارے دل اتنے سخت ہو گئے کہ کسی مظلوم کی مظلومیت کے احساس سے تمہاری آنکھیں کبھی تر نہ ہوئیں۔ پتھر کے دل سے بھی پانی ٹپک پڑتا ہے۔ وان منها لما يشقق فيخرج منه الماء (2:74) اور وہ بھی ہیں کہ پھٹتے ہیں تو ان کے اندر سے چشمے بہہ نکلتے ہیں۔ پتھروں کی بھی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ تمہارے دل اس سے بھی گئے گزرے ہو گئے۔ آپ یہودیوں کی تاریخ کو دیکھیے انہوں نے ہمیشہ مظلوم کی مظلومیت کو Exploit (استحصال) کیا ہے۔ وہ جو اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے کہ

نم بہ چشمِ منعماں کم دیدہ ام

سود خور کی آنکھ کے اندر نمی کبھی نہیں آتی اور یہ قوم تو سود خوری میں' آپ کو معلوم ہے کہ سب سے آگے ہے۔

یہود کا دیا ہوا نظامِ سرمایہ داری آنکھوں کی شبنم کو خشک کر دیتا ہے

یہ جو سارا نظامِ سرمایہ داری ہے' یہ اس یہود قوم کا دیا ہوا ہے۔ اس کی آنکھ میں نمی نہیں آسکتی' اس کا دل نہیں پگھلتا۔ کہا کہ انسانیت کی مظلومیت کے اوپر تمہارے دل تو اتنے سخت ہو گئے' تمہاری آنکھوں میں کبھی آنسو کا قطرہ تک نہ آیا۔ پتھروں کی بھی یہ کیفیت ہے کہ ان میں سے پانی ٹپکتا ہے' نہریں بہتی ہیں۔ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ(2:74) اور ایسے بھی ہیں کہ جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق اپنی سختیوں کے مقام کو چھوڑ کر پگھل جاتے ہیں' پس جاتے ہیں۔ تم سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ اور آگے بات صاف کر دی کہ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (2:74)۔ یہ عمل کی بات تھی کہ جو ''کچھ تم کرتے تھے' وہ سب ہمیں پتہ تھا''۔ گویا معلوم ہوا کہ یہ جو عقل سلب ہوئی ہے یہ اعمال سے متعلق ہے۔ جسم کا پتھر ہو جانا مقصود نہیں ہے۔ یہ ساری مثالیں اس لیے ہیں۔ یہ چیزیں' جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ قرآنِ کریم ان کی داستان بیان تو کرتا ہے لیکن ہے وہی جو محاورہ ہے۔ ''اوہی پنجابی والی گل جہڑی اے۔ دھی اے نی توں گل سن' نونہہ اے نی توں کن کر۔ کہندی اے دھی نوں سد کے سناندی اے نونہہ نوں [1]''۔

قرآن حکیم کی تعلیم کا انداز بڑا معنی خیز ہوتا ہے' وہ افسانہ نگاری نہیں کرتا

قرآن کا انداز یہ ہوتا ہے کہ یہ جتنی پرانی داستانیں بیان کرتا ہے' یہ تاریخ کی وقائع نگاری نہیں ہوتی کہ ہمیں وہ داستانیں سناتا ہے۔ بات یہ ہمارے ہی متعلق کرتا ہے۔ بات کرتا ہے تو اس کے بعد کہتا ہے کہ دیکھو! اس کو افسانہ سمجھ کر آگے نہ بڑھ جانا۔ کہا کہ اَلَمْ یَاْنِ

---

[1] یہ وہی ہے جو پنجابی کی بات ہے کہ اے بیٹی! تو بات سُن اور اے بہو! تو دھیاں دے۔ بُلا کر کہتی بیٹی سے ہے اور سناتی بہو کو ہے۔

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ (57:16) کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ جو ایمان لا چکے ہیں، جماعتِ مومنین میں داخل ہو چکے ہیں، اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں کہ ان کے دل قرآنِ کریم کی تعلیم کے سامنے جھک جائیں، ان کے دل پگھل جائیں، اس قانون کے سامنے جھک جائیں جو ایک حقیقتِ ثابتہ کی طرح نازل ہوا ہے۔ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ (57:16) یہ دیکھنا کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ تمہاری کیفیت بھی ان پہلے اہلِ کتاب کی سی ہو جائے جنہیں آسمانی کتابیں دی گئی تھیں لیکن فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ (57:16) کچھ تھوڑا ہی عرصہ جب گزر گیا کہ ان کو جو کتاب دی گئی تھی، کچھ شروع شروع میں تو ان کی کیفیت یہ رہی کہ ان کے دل میں گداز بھی تھا، سوز بھی تھا، نرمی بھی تھی، آنکھوں میں نمی بھی تھی۔ لیکن فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ (57:16) اس کے بعد ان کے دل پتھر ہو گئے۔ دیکھنا کہ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (57:16) کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہیں آسمانی کتابیں دی گئی تھیں۔ بات جو وہاں کہی تھی کہ پھر تمہارے دل اس طرح سے پتھر ہو گئے، یہاں کہا ہے کہ اے جماعتِ مومنین! دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ شروع شروع میں، ابتداً، ان کی بھی یہ صورت تھی کہ وہ نرم دل تھے، تھوڑا سا عرصہ گزرا تو پھر اس کے بعد وہ سنگ دل ہو گئے۔ کہیں تم بھی ایسے نہ ہو جانا کہ کچھ عرصے کے بعد انہی اہلِ کتاب کی طرح تم بھی اسی طرح سے سنگ دل ہو جاؤ۔

قرآن حکیم کے نزدیک سنگ دلی کا مفہوم

یہ سنگ دلی کیا چیز ہے؟ کہا کہ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (57:16) یہ جو راستہ ہے جس کی سمت ہم تمہیں لے جا رہے ہیں، جس کے اندر تمہاری نشوونما ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس کو چھوڑ کر دوسرے راستوں کے اوپر چلے جاؤ۔ یہاں پھر آیا کہ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (57:17) دیکھو! بنجر زمینوں کو ہم کس طرح سے زندگی عطا کرتے ہیں، بنجر زمین کو کیسے زندگی عطا ہوتی ہے؟ اس کے لیے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس پہ بارش ہو لیکن بارش سے ہر زمین پہ روئیدگی نہیں اگتی۔ ایک اور بھی شرط ہے کہ زمین کے اندر نمود کی، پیداوار کی یہ صلاحیت ہو یعنی بارش کا پانی اور زمین کی صلاحیت، ان دونوں کے ملنے سے زمین کو زندگی حاصل ہوتی ہے۔ کہا کہ یہ جو ہمارا ابرِ کرم ہے جسے ہم وحی کہتے ہیں، یہ تو برستا چلا جائے گا۔ تمہارے قلوب کی زمین کے اندر بھی یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ اس کو اپنے اندر جذب کرے اور اس میں سے پھر نئی نئی چیزیں اور پیدا ہوں۔ دیکھا یہاں يُحْيِ الْاَرْضَ (57:17) میں حیات اور موت کیسے آئی ہے۔ اور آگے پھر کہا ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (57:17)۔ وہی الفاظ یہاں آئے ہوئے ہیں جو (2:73) میں آئے کہ عقل و فکر سے کام لو۔ یوں زندگیاں عطا ہوا کرتی ہیں لیکن اگر تم نے اپنے دلوں کو پھر یونہی پتھر کر لیا جیسا انہوں نے کیا تھا، تو پھر یہ

زندگی حیات نو نہیں ہوتی۔ یہ ہیں دونوں شرطیں۔ اسی لیے کہا کہ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (2:74) اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ تمہارے دل اس طرح سے سخت بن گئے۔

داعی انقلاب کے دل کی کیفیت اور اس کی جگرسوزی کی حالت

اس کے بعد پھر جماعت مومنین کو خطاب کیا گیا ہے جو اس دور میں یعنی رسول اللہ ﷺ کے زمانے کی تھی۔ کہا کہ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ (2:75) کیا تم ان سے توقع رکھتے ہو کہ یہ ایمان لے آئیں گے؟ داعی کے لیے یہ عجیب صورت ہوتی ہے۔ اس کو اس معاملے میں اتنی حرص ہوتی ہے، جسے کہیے کہ اتنی طمع ہوتی ہے کہ یہ کوئی ایک دن بھی ضائع نہ کر کے یہ اس غلط راستے کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کر لے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس نے کل الیکشن لڑنا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس سے مجھے ایک ووٹ اور مل جائے گا۔ اس کا اپنا تو اس میں کوئی فائدہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ انہی کو بچانے کے لیے ایک طبیب مشفق کی طرح دل گدازیوں اور جگرسوزیوں سے کام لیتا ہے، آخر دم تک کوشش کرتا رہتا ہے۔ قرآنِ کریم میں رسول اللہ ﷺ سے خدا کو کہنا پڑا تھا کہ اے بابا! خدا کے لیے اپنی یہ حالت نہ کرلو کہ ان کے غم کے پیچھے تم آپ ہی مر جاؤ۔ تمہاری تو کیفیت یہ ہو رہی ہے کہ تمہارا دم گھٹ رہا ہے کہ یہ کیوں نہیں صحیح راستے پر آتے۔ طبیب مشفق یہی کرتا ہے۔ وہ گالیاں دیتے ہیں، پتھر مارتے ہیں، یہ ان کے لیے دعائیں کرتا ہے۔ کہا کہ کیا تم ان سے توقع رکھتے ہو کہ یہ صحیح راستہ اختیار کریں گے؟ یہ کون تھے؟ ان کا کیا جرم تھا جو ان سے توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی؟ یہ بڑے ہی اہم سوالات ہیں۔

قرآن حکیم کو بغیر سوچے سمجھے پڑھنے کے سلسلہ میں مختلف تاویلیں بیان کی جاتی ہیں

عزیزانِ من! کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ (2:75) یہ خدا کی کتاب کو صرف سنتے رہتے ہیں۔ قرآن بڑی چیز کہہ گیا ہے۔ انہیں نہیں کہہ گیا ''نو نہہ نوں کہہ گیا ❶''۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کا مصرف ہمارے ہاں کیا رہ گیا؟ صرف پڑھنا سننا۔ ان کی بھی کیفیت یہ ہے کہ سنتے رہتے ہیں۔ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ (2:75) اور پھر ان میں سے یہ جو مذہبی پیشوائیت کا گروہ ہے وہ جانتا بوجھتا اس کے اندر تحریف کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان سے توقع کر رہے ہو کہ یہ راہِ راست پہ آ جائیں گے؟ پھر ان کی کیفیت کیا ہے؟ یہ کہ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا (2:76) جب یہ تم سے آکر ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہاں صاحب! الحمدللہ، ہم مسلمان ہیں صاحب! بالکل مومن ہیں۔ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ (2:76) اور جب یہ آپس میں، تنہائیوں میں، ملتے ہیں تو ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ

---

❶ بہو سے کہہ گیا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ یہ ہم سے کہہ گیا ہے۔

لِيُحَآجُّوكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (2:76)۔

تورات کی موجودہ صورتِ حال اوران کی طرف سے حقائق کو چھپانے کی کوشش

ان کی جو تورات تھی' سنیے! یہ تورات کسی ایک کتاب کا نام نہیں' یہ انبیائے بنی اسرائیل کی کتابوں کا مجموعہ ہے۔اول تو یہ عبرانی میں تھی' پھر یہ اس کو بھی چھپا چھپا کر رکھتے تھے' تو وہ یہ کہتے تھے کہ یہ جو ان کے ہاں کے بڑے بڑے لیڈر' احبار رہبان ہیں' وہ ان لوگوں سے کہتے تھے جو ان کے ہاں متبع تھے کہ بھئی! ٹھیک ہے تم ان کی مجلسوں میں جایا تو کرو لیکن دیکھنا! تمہیں اس کی تاکید کی جاتی ہے ان سے بڑی احتیاط برتنا۔اب اگرچہ ان کی کتابیں محرف تھیں' ان میں بڑا تبدل ہو چکا تھا' اس کے باوجود ان کے اندر ایسی چیزیں موجود تھیں جو اس آنے والے کی نشانیاں بتاتی تھیں' علامات ظاہر کرتی تھیں اور ان کے جتنے کرتوت تھے انہیں نمایاں کرتی تھیں۔اب یہ احتیاط برتتے تھے کہ ان لوگوں کو ابھی تورات کا' ان کتابوں کا تو پتہ نہیں یہ عبرانی بھی نہیں جانتے تو ان کی مجلسوں میں جا کر کہیں ایسا نہ کرنا کہ تم ان سے وہ باتیں کرو جب ان کو اس کا علم ہو جائے تو تمہارے خلاف اسی کو وہ دلیل کے طور پہ پیش کر دیں کہ خود تمہاری کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے۔کہتے تھے کہ اس سے احتیاط برتنا' سارے وعظ کے اندر قرآن کی کہیں صحیح تعلیم سامنے نہ آنے پائے اُسے یہ تمہارے خلاف برت لیں گے کہ یہ کچھ دیکھو تو سہی خود قرآن میں لکھا ہے۔احتیاط برتنا' کہیں یہ باتیں ان سے نہ کر دینا کہ یہ سمجھ کر' سن کر' انہیں معلوم کر کے' تمہارے خلاف بطور دلیل اور حجت کے لے آئیں۔ان کو قرآن کی تعلیم سے بیگانہ رکھو! نہیں پتہ نہ چلنے پائے۔شروع سے ہی یہ احتیاط ہوتی چلی آئی ہے۔

قرآن حکیم نے حقیقی تورات کا کافی حصہ تو اپنے ہاں محفوظ کر رکھا ہے

کہتا ہے کہ اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ (2:77) ان کی حماقت ملاحظہ فرماؤ کہ یہ اس خدا سے ان کتابوں کے صحیح علم کو چھپاتے ہیں جس نے یہ کتابیں نازل کیں۔یہ رسول خود تو کچھ نہیں کہتا اس کے متبعین اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔اب یہ جو چیزیں چھپا رہے ہیں' یہ اس خدا سے چھپا رہے ہیں کیونکہ خدا ہی تو ان کو یہ علم دیتا ہے۔گویا یہ اس خدا سے ان کتابوں کی تعلیم کو چھپانا چاہتے ہیں جو کتابیں خدا نے نازل کی تھیں۔خود قرآنِ کریم کے اندر ان کتابوں کا بیشتر حصہ تو خدا نے Reproduce (دوبارہ بھیج) دیا' وہ اس کے اندر آ چکا ہوا ہے۔اور پھر وہاں کی وہ بات مشکل کیا تھی۔ہمارے ہاں تاریخ میں یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت زیدؓ سے کہا کہ بھئی! ان کی وہ کتابیں عبرانی میں ہیں' عبرانی سیکھ لینی چاہیے۔عبرانی اور جو عربی ہے' وہ تو بنیادی طور پہ ایک ہی زبان ہے' ان کی اصل و بنیاد Root ایک ہے ہے۔اور اصل میں Root (بنیاد) عربی ہے' یہ زبان عربی سے عبرانی بنی ہوئی تھی۔تاریخ یہ بتاتی ہے کہ انہوں نے ایک ہفتے کے اندر اندر اتنی عبرانی سیکھ لی کہ جس سے وہ ان کی ان کتابوں کو پڑھنے لگ گئے تھے۔ان کے لیے مشکل کیا

تھا؟ لیکن بہر حال ان لوگوں کی احتیاط ملاحظہ فرمائیے کہ کتاب کا صحیح علم ان تک نہ آنے پائے تا کہ تمہارے خلاف پھر یہ کوئی دلیل اور حجت نہ لاسکیں۔

یہی چیز ہندوؤں کے ہاں پائی جاتی ہے

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہی چیز چلی آرہی ہے۔ ہندوؤں کے ہاں مذہبی پیشوا اپنی تعلیم کو ''گپت ودیا'' بنا کر رکھتے ہیں تا کہ اس پران کی اجارہ داری قائم رہے' شودر کے کان میں اگر اس کا اشلوک [1] پڑھ جائے' ان کے ہاں زبان سے وید یا مہاتما کا لفظ نکلے تو زبان کاٹ دی جاتی ہے۔ مثلاً شودر چلا جا رہا ہے' یہ کہیں اس کا اشلوک پڑھ رہے ہیں اگر اس کے کان میں یہ آواز پڑھ گئی ہے تو وہ پگھلا ہوا سیسہ اس کے کان میں ڈالتے ہیں۔ یہ زبان ایسی تھی' اس کے بعد وہ Dead Language (زبانِ مردہ) ہوگئی کہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اب جو جی میں آئے' ان کو وہ کہہ دیں۔ یہی کیفیت ان کی تھی جو یہ ادھر کے اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ تھے۔ ان کے عوام کو خود ان کی کتابوں کا پتہ نہیں تھا۔ ایک مخصوص طبقہ تھا' یہ ان تک Preserve (مخصوص ومحفوظ) تھا' وہی شریعت کا علم' دین کا علم جانتے تھے' دوسروں کو کچھ علم نہیں تھا۔

دین کے حقائق کو سمجھنے کے سلسلہ میں ہماری حالت

آپ کو معلوم ہے کہ یہی کیفیت آپ کے ہاں چلی آرہی ہے۔ ایک خاص مخصوص طبقہ ہے جس کے اندر یہ چیز کچھ محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ کوئی بات جو شریعت کے متعلق ہو' آپ اپنے ہاں طے نہیں کر پاتے' ان سے مسئلہ پوچھنے جاتے ہیں۔ وہ مسئلہ بتائیں گے تو پھر تو وہ خدا رسول کے مطابق ٹھیک ہوگا ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اسے گپت ودیا بنا لیا۔ آپ ان کے محتاج ہو گئے۔ ابھی اگلی آیت کے اندر یہ بات آتی ہے۔

عزیزانِ من! آپ دیکھیے گا کہ بات ان کی ہو رہی ہے اور کس طرح سے ہم سے کہی جا رہی ہے۔ اس لیے کہ قوموں کے عروج و زوال کے قوانین تو ایک ہی ہیں۔ قومیں بگڑتی ہیں تو ان کے اندر نقائص' خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ایسی ہیں جو ساری قوموں کے اندر مشترک ہوتی ہیں۔ بس تھوڑا سا احوال و ظروف کا فرق ہوتا ہے' بنیادی طور پہ وہی چیزیں ہوتی ہیں۔ بگڑی ہوئی قومِ بنی اسرائیل کی جتنی باتیں بتائی جا رہی ہیں' آپ ایک ایک کر کے دیکھیں گے کہ وہ ہم پہ چسپاں ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ جو اوپر کا طبقہ ہے جس نے اپنا یہ Preserve (مخصوص ومحفوظ) بنا رکھا تھا کہ یہ جو شریعت کا علم ہے ہم تک ہی رہے' وہ ان لوگوں سے تاکید کرتے

---

[1] شعر' بیت

تھے کہ ان کی محفلوں میں جاؤ تو دیکھنا کہیں اس کے متعلق زبان پہ کوئی بات نہ آ جائے' انہیں معلوم ہو جائے گا تو ہمارے خلاف اس ہتھیار کو استعمال کریں گے۔ کہا کہ یہ تو ہے اوپر کا ان کا گروہ' اور جو باقی امت ہیں وہ وَ مِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ (2:78) یہ سب ان پڑھ ہیں۔ دین کا علم ادھر آنے نہیں پاتا۔ وہ الگ دائرے میں دین ہے۔ باقی ساری قوم اس سے بے بہرہ رکھی جاتی ہے۔

قرآن حکیم سے دین خداوندی کے سلسلہ میں امت مسلمہ کی کیفیت جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے

کہا کہ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ وَ اِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ (2:78)۔ عزیزانِ من! غور سے سنیئے' قرآن کیا کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کتاب کے ساتھ پھر ان کا تعلق سوائے خوش عقیدگی کے کچھ نہیں رہتا۔ یہ بڑی قابلِ تعظیم کتاب ہے' مگر یہ ریشم کے غلافوں میں لپیٹی ہوئی ہے' سب سے اونچے طاق میں رکھی ہوئی ہے تا کہ کسی کا ہاتھ وہاں نہ پہنچے' چلے تو پیٹھ اس کی طرف نہ ہو جائے۔ آپ دیکھیے گا قرآن کا سارا مصرف یہی ہے کہ اگر یہ کہیں غلطی سے گر جائے تو اس کے تول کے مطابق اتنا اناج مسجد میں دے دو۔ اگر کہیں اس کا ورق گر پڑا ہو' تو اس کو سنبھالو اور جا کر کہیں دریا میں بہاؤ' کہیں کسی کنویں میں ڈالو' کہیں اس کو دفن کرو۔ اتنی احتیاط ہے۔ پڑھنے کے لیے صرف یہی کافی ہے کہ اس کی تلاوت کرو' معنی وانی والی بات نہیں ہے۔ اس کے پڑھنے سے ایک ایک حرف سے دس دس نیکیوں کا ثواب ہوتا ہے یعنی الٓمٓ (ال م) تین حرف گنے جاتے ہیں ان کے پڑھنے سے تیس نیکیوں کا ثواب ہو جاتا ہے۔ اگر ناظرہ نہیں پڑھنا جانتے تو اس کے اوپر صبح اٹھ کر انگلیاں پھیر لیا کرو۔

عزیزانِ من! اب تو یہ خوش عقیدگیاں بھی ختم ہو رہی ہیں اس لیے یہ مناظر ہمارے اگلے بچوں کے سامنے نہیں آتے ہونگے۔ ہمارے سامنے تو یہ تھے۔ یہ اَن پڑھوں کا انگلیاں پھیرنا اور جو ناظرہ پڑھنے والے ہیں' صبح کے وقت اٹھ کر التزاماً اس کی بڑی خوش عقیدگی سے تلاوت کرنا۔ قرآن نے کہا ہے کہ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ (2:78) اپنی ہی آرزوئیں' اپنی ہی خواہشیں' اپنی ہی خوش فہمیاں' اپنی ہی خوش عقیدگیاں اس کتاب کے اندر سے ابھرا ابھر کر ان کو بجھارتیں دیتی چلی جاتی تھیں اور کچھ پتہ نہیں کہ اس کتاب میں کیا ہے۔ یہ کتنی بڑی خوش عقیدگی ہے۔ جب وہ رکوع پڑھ لیتے ہیں یا پڑھ لیتی ہیں' تو اس کے بعد انہیں کتنا بڑا اطمینان ہو جاتا ہے۔ یہاں اِلَّاۤ اَمَانِىَّ آیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ قرآن ہے' یہ کہیں بھٹکنے ہی نہیں دیتا۔ اور ان کی خوش عقیدگی کے لیے تو بس:

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

خود فریبی کی انتہا جو ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار ہونے ہی نہیں دیتی

اِلَّاۤ اَمَانِىَّ (2:78) کہا ہے۔ یہ خود پیدا کردہ آرزوئیں ہیں جن سے انسان کو خود فریبی ہو جائے۔ اس کے یہ معنی ہوتے ہیں یعنی''

خود پیدا کردہ آرزوئیں جن سے خودفریبی ہو جائے''۔ نہ آرزو Objective (معروضی) نہ وہ صحیح قلبی اطمینان۔ اس کی کوئی طلب نہیں ہے کہ ایک حرف سے اس کو دس نیکیوں کا ثواب پیدا ہو۔ یہ اس کے متعلق ایک خود وضع کردہ آرزو ہے' یہ کر لینے کے بعد خودفریبی ہے کہ مطلوب ومقصود مل گیا۔ اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تمہارے سامنے کوئی رجسٹر نہیں ہے جس کے اندر سے آپ نے جو کچھ یہ کیا' وہ آپ کے سامنے آ گیا۔ یا کوئی بینک کی کتاب نہیں ہے جہاں آپ نے بھیج کر کہہ دیا کہ صاحب! آپ کی نیکیاں یہاں درج ہو گئی ہیں اور وہ آپ کے سامنے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا۔ وہ کہتا ہے کہ پھر یہ چیزیں کس سہارے پہ آگے چلتی رہتی ہیں؟ دیکھیے اس کا کوئی سہارا نہیں' صاحب! آپ کے لیے Verify (تصدیق) کرنے کا کوئی طریقہ ہی نہیں ہے کہ ثواب ہو گیا ہے' دس نیکیاں مل گئی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ چیز چلتی کیسے ہے؟ کہا کہ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (2:78) یہ ان کو قیاسات کی وادیوں کے اندر پھیرتے رہے۔ یہ قیاس ہی ہے۔ عزیزانِ من! قرآن ہے۔ یہ حق کے مقابلے میں لفظ قیاس لایا ہے' ظن لایا ہے۔ حق کہتے ہیں ''کسی ٹھوس حقیقت کا محسوس طور پہ سامنے آ جانا''۔ ظن صرف تخمین اور قیاس ہوتا ہے' وہ چیز ٹھوس انداز سے سامنے نہیں آتی۔ کہتا ہے کہ یہ پھر 'ظن' ہے۔ جس سے یہ چیز چلتی رہتی ہے۔ آپ غور کیجیے کہ یہ اس قدر ایک اتنی کمزور سی چیز ہے جس کے لیے آپ ساری عمر Verify (تصدیق) نہ کر سکیں کہ آیا کچھ ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا۔

ہمارے ہاں شریعت پر عمل کرنے کا طریق

عزیزانِ من! کیا کبھی آپ نے سوچا ہے جب آپ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! اس سے ثواب ہوتا ہے؟ اس سے پوچھیے کہ صاحب! اس کا پروف (ثبوت) کیا ہے کہ مجھے ہو رہا ہے ثواب؟ کیا پروف ہوتا ہے؟ صرف قیاس۔ امانی میں پہلی چیز یہ ہے کہ جھوٹی آرزوئیں پیدا کرتے ہیں' خودفریبی میں مبتلا رہتے ہیں' سلسلہ قیاسات کے اوپر چلتا ہے۔ عزیزانِ من! غور فرمایا بگڑی ہوئی قوم جو مذہب پرست ہوتی ہے اس کی پھر کیفیت کیا ہو جاتی ہے؟ الکتاب موجود ہے مگر اس کتاب کے ساتھ تعلق یہ رہ جاتا ہے۔ اور باقی رہا یہ معاملہ کہ صاحب! کتاب سے تو ہو گیا ثواب۔ تو تم کہتے ہو کہ تمہیں ہر بات مطابقِ شریعت کرنی چاہیے یہ تو بڑی ضروری چیز ہو گئی۔ کہ صاحب! کتاب سے تو ہمارا یہ تعلق رہا' اب یہ کیسے معلوم ہو کہ اس معاملے میں کیا کرنا چاہیے؟ وہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے ہمارے پاس آؤ' ہم بتائیں گے۔ بچہ پیدا ہوا ہے' پیدا ہوتے ہی وہ دودھ کے لیے روتا ہے' شیرِ مادر جیسی حلال وطیب جو چیز ہے وہ اس کے لیے حرام ہے جب تک وہ آ کر کان میں اذان نہ دے۔ مردہ تیار ہے' نہلایا ہوا ہے' کفنایا ہوا ہے' قبر تیار ہے' آپ سب لوگ وہاں دفنانے والے موجود ہیں' دفن نہیں ہو سکتا جب تک وہ آپ کے ہاں کے آ کر چار کلمے نہ پڑھ لے۔ ہم سے پوچھو۔ اچھا جی! پوچھا بھی تو پھر کیا ہے؟ تم کتاب سے' قرآن کو کھول

کے بتا دیتے کہ اس میں یہ لکھا ہوا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ نہیں! قرآن کہتا ہے کہ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ (2:79)۔ عزیزانِ من! بڑے غور سے سنیے! کیا باتیں آ رہی ہیں! یہ کرتے کیا ہیں؟ یہ کہ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ (2:79) اس الکتاب میں سے کوئی چیز نکال کر تمہیں نہیں دکھاتے' خود فتویٰ لکھتے ہیں' اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں۔ بھئی! ہو سکتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا اگلا پوچھ لے کہ صاحب! ''تہانوں کن چوہدری بنادتا اے [1] ؟'' تمہارا لکھا ہوا میں کیسے مان لوں کہ یہ سند ہے' یہ حجت ہے' یہ دین ہے؟ وہ یہ کہہ سکتا ہے۔

فکرِ قرآنی سے بے خبر' مذہبی تنکوں سے بنی ہوئی کشتی کے سہارے' زندگی کی تلاطم خیزیوں میں الجھی ہوئی مسلم قوم کا سفرِ حیات

عزیزانِ من! اگلی بات ہے کہ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (2:79) اپنے ہاتھ سے فتویٰ لکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ ہے تمہارے خدا کا فرمان۔ کبھی نہیں کہتے کہ یہ میری بنائی ہوئی شریعت ہے' یہ میرا بنایا ہوا فتویٰ ہے' خدا اور رسول کے احکام ہم تمہیں دے رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں بات کیا چلی آ رہی ہے' قوم کو اُمی رکھا جاتا ہے کہ ناظرہ پڑھو۔ عقل وفکر سے کام لے تو برادرانِ عزیز! پانچ منٹ تک کوئی بچہ ایسی کتاب نہیں پڑھ سکتا جس کی زبان وہ نہ سمجھ پائے۔ آپ پڑھ کر بتا دیجئے' کسی وقت کوشش کیجیے گا۔ زبان نہ جاننا تو ایک طرف رہا وہ زبان جو آپ جانتے ہیں اگر اس سے بھی اس کتاب [1] کا اسٹینڈرڈ اونچا ہے' اسے بھی آپ ٹھپ کر رکھ دیتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہم پڑھ ہی نہیں سکتے۔ کس سہارے سے یہ چیز پڑھائی جاتی ہے کہ زبان بھی نہیں سمجھتا' کچھ پتہ نہیں چلتا' صبح اٹھتا ہے' روز پڑھتا ہے؟ اس تلاوت کا اگر ناغہ ہو جاتا ہے تو سارا دن ضمیر ملامت کرتا ہے۔ کس سہارے پہ یہ کچھ ہو رہا ہے؟ یہ ہے اِلَّآ اَمَانِيَّ (2:78) تمہارے دلوں کے اندر خوش فہمیاں وضع کی ہوئی ہوتی ہیں' خوش عقیدگی پیدا کی ہوئی ہوتی ہے' اس کے سہارے پہ یہ جو چیز ہے چلتی رہتی ہے۔ اور یہ جو اس قسم کے تنکوں کے پل ہیں جن کے اوپر سے ہاتھی گزارے جاتے ہیں یہی وہ خود پیدا کردہ خام آرزوؤں کے سہارے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ خود وضع کردہ خام آرزوئیں کیسے چلتی ہیں؟ کہا کہ یہ يَظُنُّوْنَ (2:78) ہیں جب بھی تم آکر ان کو پوچھتے ہو یہ تمہیں قیاسات کی وادیوں کے اندر لے جاتے ہیں۔ کیوں یہ سب کچھ کیا جاتا ہے؟ تاکہ تم انہیں بیگانہ رکھو۔ انہیں بیگانہ کیا' یہ ہمارے پاس آنے کے لیے محتاج ہو گئے' اب ہر بات جو ہے یہ ہمارے پاس آکر پوچھیں۔ آپ آکر پوچھیے تو یہ نہیں کیا کہ قرآن کھول کر بتا دیں کہ اس میں یہ لکھا ہوا ہے بلکہ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ (2:79) پھر وہ اپنے ہاتھ سے حکم لکھتے ہیں' اس کا نام فتویٰ ہوتا ہے۔ جب یہ دیکھتے ہیں کہ صاحب! اعتراض ہو جائے گا کہ آپ کو یہ سند کہاں سے حاصل ہوئی؟ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ

---

[1] تمہیں کس نے معتبر بنا دیا؟

اللّٰهِ (2:79) کہتے ہیں کہ یہ خدا کا فرمان ہے' یہ شریعتِ حقہ ہے' ارشادِ خداوندی ہے حالانکہ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ (2:79) یہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (2:79) کہتے ہیں کہ یہ خدا اور رسول کا حکم ہے۔ برادرانِ عزیز! یہ کچھ چل ہی اسی طرح سکتا ہے۔

مذہب کی آڑ میں مالی مفادات کے حصول کا نتیجہ اور انسانی ذات کی قدر ومنزلت

جھوٹ کبھی بے نقاب سامنے آ ہی نہیں سکتا' کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔ ان سے' جو بڑے سے بڑا بھی ہے' کہیے کہ وہ یہ کہے کہ صاحب! یہ میرا حکم ہے' اسے جا کر مانو تو ایک شخص بھی اسے نہیں مانے گا۔ اسے اپنے حکم کو یہ کہہ کر منوانا ہوگا کہ یہ خدا اور رسول کا حکم ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اتنا لمبا چوڑا بکھیڑا کیوں کرتے ہیں؟ کاہے کے لیے یہ اتنی بڑی تدبیریں' یہ اتنی بڑی سازشیں کرتے ہیں؟

عزیزانِ من! ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے آپ دیکھیے کہ کتنا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیوں کرتے ہیں؟ اسے کرنے کی Motivation (ترغیب) کیا ہے؟ مقصد کیا ہے؟ سنیے' عزیزانِ من! قرآن بتاتا ہے کہ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (2:79) ۔ روٹی کا سوال ہے صاحب! یہ اس کو بیچتے ہیں۔ یہ سارا مسئلہ معاشی ہے۔ اور ایک بات یہ کہہ دی کہ یہ ثَمَنًا قَلِيْلًا (2:79) ہے' تھوڑی سی قیمت ہے۔ پھر یہ نہیں ہے کہ انہیں چاہیے کہ بہت زیادہ قیمت لیا کرو۔ قرآن نے دوسرے مقامات پہ کہا ہے کہ دنیا کی یہ جتنی چیزیں بھی تم اضافی کہتے ہو' جو Relative ہوتی ہیں' جسے تم کہتے ہو کہ یہ میری ہیں' جب بھی تم ان کو اپنی ذات کے مقابلے میں تو لو گے تو ہر چیز اس سے کم قیمت کی رہ جائے گی۔ یہ مذہبی پیشوا کرتے یہ ہیں کہ اپنا آپ بیچتے ہیں اور پیسے لے لیتے ہیں۔ کہا کہ جتنا جی چاہے لے لو وہ ثَمَنًا قَلِيْلًا ہوگا جب خود اپنے آپ کو بیچ کر یہ چیز لے لو گے۔ حق کو بیچ کر جو قیمت بھی تم لو گے' وہ ثمنِ قلیل ہوگی۔ دو ہی لفظوں میں بات کہہ دی۔ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (2:79)۔ یہ دونوں ہی چیزیں تباہی کا موجب ہیں یعنی جو لکھا اپنے ہاتھ سے اور اسے خدا کی طرف منسوب کیا' وہ ان کو تباہ کر گیا۔ انہوں نے جو اس سے کمائی کی وہ ان کو جہنم میں لے گئی۔

جہنم کا احساس ہونے کے باوجود اس سے بچنے کے لیے شفاعت کا عقیدہ

ٹھیک ہے کبھی کبھی انہیں احساس بھی ہوتا ہے' تنہائیوں میں وہ سوچتے ہی ہوں گے کہ بالآخر یہ کاروبار ہے کیا جو ہم کر رہے ہیں؟ جھوٹ بولتے ہیں' پھر اسے خدا اور رسول کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس سے دل کو کیسے تسلی دیں؟ آپ نے دیکھا کہ اس استثنا کو بھی قرآن نے لیا ہے جو ان میں شاید کبھی کھٹک پیدا ہو کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟ کیا ہوگا؟ اس کھٹک کو دور کرنے کے لیے پھر یہ ایک بڑا عمدہ عقیدہ وضع کیا ہے اور وہ عقیدہ ہے شفاعت کا۔ قرآنِ کریم نے بتایا کہ وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (2:80) ان کے ہاں

عقیدہ تھا کہ قیامت میں ہم وہاں جائیں گے' سارا حساب کتاب ہوگا' ہم جہنم میں بھیج دیئے جائیں گے۔ پتہ تھا جہنمی کام کرتے ہیں لیکن یہ صرف اتنے وقت کے لیے ہوگا جب تک ہمارے وہ جو سفارش کرنے والے ہیں' وہ خدا سے سفارش کر کے' ہمیں جنت میں بھیجنے کا حکم نامہ نہ لے آئیں' بس اتنے سے وقت کے لیے ہی ہم جہنم میں جائیں گے۔ پہلے ہی کیوں نہ سفارش کر دی تھی ''جتھے اپنے اوہناں دے سامنے کھلوتے ہوئے ہیگے [1] سن'' وہ ہوتا ہے کہ شروع ہی میں یہ کچھ کیوں نہ کر دیا۔ کہ نہیں جی! یہ انتظار کرتے رہے' پھر جب وہاں یہ سارا قصہ طے ہو گیا تو پھر انہوں نے تنہائی میں' جج کے چیمبر میں لے جا کر یہ بات کی تو پھر وہ حکم نامہ لے آئے اور چھڑا کر لے گئے۔ صرف اتنے وقت تو ہمیں جہنم میں رہنا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ بہر حال کسی نہ کسی طرح ''ایناں تے کٹ ای لاں گے [2]''۔ اور پھر جب یہ توقع ہوگی کہ چھڑانے والا آ رہا ہے تو پھر وہ کاٹ ہی جاتے ہیں۔ یہ تھا ان کا عقیدہ۔

عزیزانِ من! میں نے یہ کہا ہے کہ یہ تھا اُن کا عقیدہ شفاعت۔ کہو تو یہ سارا قصہ سفارش لفظاً لفظاً کہہ دوں۔ ہاں میری بہن! اسے بیان کرنے یا اسے کہنے کی ضرورت کیا ہے' آپ تو لفظاً لفظاً خود بھی جانتی ہیں۔ مسلمانوں کا بعینہٖ انہی الفاظ میں عقیدہ ہے کہ یہ حساب کتاب کی رو سے جہنم میں بھیجے جائیں گے۔ آپ کے ہاں کی جو حدیثوں کی معتبر ترین کتابیں ہیں' یہ عقیدہ ان کے اندر موجود ہے کہ یہ حساب کتاب سب کچھ ہو جائے گا' یہ جہنم میں بھیجے جائیں گے' کورٹ (عدالت) کا وقت بھی ختم ہو جائے گا' رجسٹر ٹھپ دیئے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ پھر کرسی عدالت سے جانے کے لیے تیار ہونگے تو یہ دیکھا جائے گا کہ میدانِ حشر میں کوئی ایک فرد سجدے میں گرا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ کہیں گے کہ بھئی! ہم نے تو فیصلے کر دیئے' جنت والوں کو جنت میں بھیج دیا' جہنم والوں کو جہنم میں بھیج دیا' اب تو کوئی ایک متنفس بھی کہیں باہر نہیں رہنا چاہیئے' یہ ایک فرد کون ہے جو باہر رہ گیا ہے؟ پھر بیٹھ گئے پتہ لیا تو وہ نبی اکرم ﷺ تھے۔ پوچھا جائے گا کہ آپ ﷺ اس طرح سے باہر کیوں ہیں؟ آپ ﷺ یہ فرمائیں گے کہ میں جنت میں کیسے چلا جاؤں' جب میری امت جہنم کے اندر ہوگی؟ اچھا جی! اللہ میاں پھر بیٹھ جائیں گے۔ حساب کتاب سارا ہو چکا ہوا ہے۔ قانون کی رو سے تو یہ چیز ٹھیک ہے' ہو گئی ہے' یہ جہنم میں چلے گئے ہوئے ہیں۔ بہر حال بڑی لمبی چیز ہے۔ پہلی دفعہ اتنے نکال کر اُدھر بھیجے جائیں گے تو پھر یہ کہیں گے کہ آپ ﷺ جایئے وہ کہیں گے کہ میں ابھی نہیں جاتا' پھر اور بھیجے جائیں گے' پھر اور بھیجے جائیں گے۔ پھر بالآخر جب وہ آخری چیز ہوگی تو آپؐ مسکرا دیں گے۔ قرآنِ فرقان کہتا ہے کہ **وَ قَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً** (2:80)۔

---

[1] جہاں اتنے ان کے سامنے کھڑے ہوئے موجود تھے۔

[2] اتنا تو کاٹ ہی لیں گے۔

آپ نے دیکھا کہ وہ کھٹک کیسے دور ہوگئی؟ اس سے کہ یہ ہاتھوں سے لکھتے ہیں' خدا کا بتاتے ہیں' اس سے کمائی کرتے ہیں۔ اور وہ جو کبھی کھٹک پیدا ہوتی تھی' اس کھٹک کے لیے یہ عقیدہ ہے کہ ٹھیک ہے تھوڑے سے وقت کے لیے حوالات میں رہنے والی بات ہے' رہ لیں گے۔ آپ نے جواب سنا کہ کیا ہے؟ کہا کہ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (2:80) کیا تم نے خدا سے اس قسم کا کوئی وعدہ لے رکھا ہے؟ اگر لے رکھا ہے تو ذرا وہ ہمیں بتا دیجیے۔ اگر وعدہ لے رکھا ہے تو سنو! فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ (2:80) خدا وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا لیکن ذرا یہ بتا دیجیے کہ تم نے جو خدا سے وہ وعدہ لیا تھا وہ کہاں ہے؟ کیا خدا سے تم نے کوئی وعدہ لے رکھا ہے؟ یہ کتنی بڑی چیز ہے۔ کہنے کے معنی یہ ہیں کہ کیا خدا اس قسم کے وعدے کیا کرتا ہے جو تم کہتے ہو؟ وعدہ لے رکھا ہے تو ٹھیک ہے وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا لیکن کیا اس قسم کا وعدہ تم نے اس سے لے رکھا ہے؟ کیا وہ اس قسم کے وعدے دے گا جو پورے نہ ہوں؟ نہیں' قطعاً نہیں۔

قرآن حکیم کے مطابق مکافاتِ عمل کے تحت اس قسم کے عقائد کا کوئی وزن نہیں

ابھی بات آ جاتی ہے۔ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (2:80) جہالت کی بنا پہ یہ ایسی چیزیں خدا کی طرف منسوب کرتے ہو جن کا تمہیں علم بھی نہیں ہے اور یہ کہ قانونِ مکافاتِ عمل کے اندر اس کی کبھی گنجائش نہیں ہوا کرتی۔ تمہاری اپنی کیفیت یہ ہے کہ جب کبھی ایسا کوئی افسر آ جائے جو سفارشوں سے کام کرے تو تم روز اس کے متعلق کہتے ہو کہ ہاں صاحب! اب تو یہاں قانون کی مٹی پلید ہوگی' یہاں تو کام سفارش سے چلتا ہے' جس کی سفارش ہوگئی بچ گیا' جس کی سفارش نہیں ہے مارا گیا۔ کسی یہاں کے ایک حاکم کے متعلق تو یہ کہتے ہو کہ سفارش کی بنا پہ یہ کر واور وہاں تمہاری کیفیت یہ ہے کہ انسانوں میں سے بزرگ تریں ہستی ﷺ کے متعلق یہ یقین رکھتے ہو کہ مجرم جو حساب کتاب کی بنا پر خدا کے قانون کی رو سے جہنم میں چلا گیا ہے اس کو بچانے کے لیے رسول ﷺ سفارش کر رہا ہے اور خدا سفارش کو مان کر جہنم سے نکال رہا ہے۔ کم بختو! اتنا بھی تمہیں پتہ نہیں ہے۔ اور کیا یہ وعدہ تمہیں خدا دے گا؟ نہیں' قطعاً نہیں۔

قرآن حکیم کی پیش کردہ تعلیم کی وارننگ اور نبی اکرم ﷺ کا اپنے متعلق ارشاد

یہ کچھ بیان کرنے کے بعد آپ کو پتہ ہے قرآن پھر وہ عظیم محکم اصول لاتا ہے۔ سب کچھ بیان کرنے کے بعد کہا کہ بَلٰى (2:81) سب بکواس ہے جو تم کرتے ہو۔ سنو کہ حقیقت کیا ہے؟ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ (2:81) کسے باشد' کوئی بھی کیوں نہ ہو' جس نے جرم کا ارتکاب کیا ہے اور پھر اس کی کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ اپنی اصلاح نہیں کی' اس کی ناہمواریوں نے اس کو گھیر لیا۔ کہا ہے کہ من کسب (2:81) کسے باشد' کوئی بھی کیوں نہ ہو جس کی یہ کیفیت ہوتی ہے تو سنو! فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ (2:81) وہ جہنم کے اندر جانے والے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ کہیں گے ہم نے بھی کہا تھا کہ جہنم میں چلے جائیں گے لیکن چند دنوں کی بات ہے۔ کیا یہ خدا

کولا جواب کر دیں گے؟ نہیں بلکہ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ (2:81)۔ چند دن کی بات نہیں ہے انہیں وہاں سے کوئی نکال نہیں سکے گا۔ دیکھا ایامِ معدودۃ کا جواب! کہ یہ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ (2:81) اصول دیکھا' برادرانِ عزیز! مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ (2:81)۔ من کے اندر آپ کو پتہ ہے کہ قرآن کی رو سے کون کون آتے ہیں؟ جو کوئی بھی یہ کرے وہ اس میں آ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہا' یہ قرآن میں موجود ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی خدا کے قانون کی خلاف ورزی کروں گا تو میں بھی عذاب سے نہیں بچ سکتا۔ اب سوچیے کہ جو شخص یہ کہہ رہا ہے کہ اگر میں بھی قانون شکنی کروں' جرم کا ارتکاب کروں' تو میں بھی نہیں بچ سکتا تو کیا' وہ مجرمین کو چھڑانے کے لیے سفارشیں کرے گا؟ سوچیے تو سہی! اور پھر وہ اپنی طرف سے نہیں' خدا کی طرف سے کہہ رہا ہے' یہ بات اس کی زبان مبارک ﷺ سے کہلوائی جا رہی ہے۔ جو خدا رسول ﷺ سے یہ کہہ رہا ہے کہ اگر تم نے بھی جرم کا ارتکاب کیا تو یاد رکھو! تم بھی سزا سے نہیں بچ سکتے' وہ خدا کیا اس رسول ﷺ کی اس سفارش کو پھر مان لے گا کہ یہ سارے مجرم جو جہنم میں چلے گئے' انہیں میرے کہنے پہ چھوڑ دو؟ وہ تو یہ کہے گا کہ ہم نے تو تمہیں وہاں کہہ دیا تھا کہ یہ تو ایک طرف رہے' تم بھی (معاذ اللہ) اگر یہ چیز کرو گے تو تمہیں بھی وہاں سے نہیں نکالا جائے گا۔ تو یہ باتیں تو یہیں طے ہو گئی ہوئی ہیں۔

برادرانِ عزیز! خدا نے رسول کی زبان سے کہلوا دیا۔ آپ کے ہاں دو ہی تھے' یہ سفارش کرنے والا ﷺ' وہ سفارش ماننے والا۔ وہ تو اس نے یہیں بات طے کر کے رکھ دی۔ ان سے کہیے کہ صاحب! قرآن میں تو سارا کچھ یہ ہے۔ کہتے ہیں کہ جی! یہ ٹھیک ہے "اے ٹھیک اے' قانون دیاں گلاں نیں' پر محبت دے رنگ وی نرالے ہوندے ہیگے۔ تہانوں کی پتہ پریت دی ریت کی ہوندی ہیگی؟ ویکھدے نئیں او کہ کس طراں مڑ کے دفتر لگ گئے تے' کچہریاں کھل گیاں' تے سارے بیٹھ گئے۔ کیوں؟ اک محبوب جیہڑا اجے باہر بیٹھا ہویا ہیگا۔ تہانوں پتہ ای نئیں ہیگا کہ حبیب تے محبوب دے راز و نیاز کی ہوندے ہینگے؟ او پہلے ای کیوں نہ کردتا؟ کہن لگا: آجیہڑ یاں محبت دیاں گلاں ہونیاں سن فیر کس طراں نال ہوندیاں ❶"۔

تمام تر مایوسیوں کا علاج قرآن حکیم کی بیان کردہ صداقتوں کو عملی طور پر تسلیم کرنے میں ہے

کہا ہے کہ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ (2:81)۔

---

❶ یہ ٹھیک ہے کہ یہ قانون کی باتیں ہیں لیکن رنگِ محبت بھی کیا ہی نرالہ ہوتا ہے! تمہیں کیا معلوم کہ محبت کی ریت کیا ہوتی ہے؟ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ کس طرح وہ دفتر پھر لگ گئے' کچہریاں کھل گئیں' اور سبھی بیٹھ گئے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ابھی ایک محبوب باہر بیٹھا ہے۔ تمہیں علم ہی نہیں ہے کہ حبیب اور محبوب کے راز و نیاز کیا ہوتے ہیں؟ ارے! یہ پہلے ہی کیوں نہ کر دیا۔ کہنے لگا: یہ جو محبت کی باتیں ہیں' وہ پھر کیسے ہوئیں۔

انسان اس کے بعد کپکپا اٹھتا ہے' نظر آ جاتا ہے کہ کوئی راستہ نہیں ہے صاحب! معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مایوسیاں اور افسردگیاں گھیر رہی ہیں۔خدا ہے' کہا کہ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (2:82) ڈرنے کی بات نہیں' مایوسیوں کی بات نہیں ہے' جو بھی ان صداقتوں کے اوپر یقین کرلے' وہ پھر ہمواریاں پیدا کرنے والے کام کرلے' ان سے ان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے گی' تو اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ (2:82) یہ لوگ ہیں جو خوشگواریوں کی زندگی کے اندر جائیں گے۔اور یہ زندگی بھی وقتی نہیں ہوگی کہ چند دنوں کے بعد وہاں سے نکال دیئے جاؤ بلکہ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ (2:82) یہ بھی ان کے اندر ہمیشہ اسی طرح سے رہیں گے۔

تفسیر طبری کی پیش کردہ خوش فہمیوں نے قوم کو اُمی بنا دیا

برادرانِ عزیز! غور فرمایا کہ کہاں سے بات شروع ہوئی تھی اور قرآن کہاں تک لے آیا ہے۔اور یہ اس قرآن کے متعلق بڑے فخر سے کہا کرتے ہیں کہ صاحب! اس میں تو کوئی ربط ہی نہیں ہے' یہ بے ربط کتاب ہے' مجمل ہے' مبہم ہے' اس کی بات ہی نہیں سمجھ میں آتی ہے۔میں پھر وہی کہوں گا کہ

بیاں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے

(اقبالؒ: ضرب کلیم)

برادرانِ عزیز! یہ ہمارے دماغوں کے اندر بت خانے کیا ہیں جو بسا دیئے گئے ہیں؟ قوم کو اُمی رکھا گیا ہے۔اس کے دلوں کے اندر جو امانی ہیں' وہ Create (پیدا) کرتے چلے گئے ہیں۔خواہشیں' جھوٹی آرزوئیں' خوش عقیدگیاں' خوش فہمیاں یہ ساری چیزیں ان کے دلوں کے اندر ہیں۔جب کبھی انہوں نے آ کر کوئی سند اور حجت پوچھی تو یَظُنُّوۡنَ (2:78) یہ ان کو قیاس آرائیوں کے اندر لے گئے۔ آپ کے ہاں کی ساری تفاصیل' وہاں طبری (838-923AD) سے لے کر اس وقت تک کی جو کچھ بھی ہے وہ یہی ہیں کہ یَکۡتُبُوۡنَ الۡکِتٰبَ بِاَیۡدِیۡهِمۡ ثُمَّ یَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ (2:79) ان کے علما کرتے یہ ہیں کہ شریعت کے احکام خود اپنے ذہن سے' اپنی مرضی کے مطابق' وضع کر لیتے ہیں اور اِن اَن پڑھ لوگوں سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب ارشاداتِ خداوندی ہیں۔کسی نے یہ کہہ کر پیش نہیں کیا کہ یہ میری تفسیر ہے۔امامِ طبری کی پہلی تفسیر جو آپ کے ہاں لکھی گئی' اس کی طرف سے' مفسر کی طرف سے' سارا کچھ لکھا ہوا ہے۔اگر لکھا ہوا یہ ہوتا کہ یہ میری تفسیر ہے تو کوئی جرم نہیں ہے' ایک شخص کے خیالات ہیں' دوسرے شخص کو حق حاصل ہے کہ اس سے انکار کر دے۔ انہوں نے کیا کیا؟ کہا کہ هٰذا من عند الله (2:79) ہر تفسیر کے بعد لکھا کہ یہ میری نہیں ہے' یہ رسول اللہ ﷺ کی تفسیر ہے۔اس میں چار

آدمیوں کے نام لکھے، اب یہ امام طبری کی نہ رہی، ساری رسول اللہ ﷺ کی ہوگئی۔ ممکن ہے کوئی یہ کہہ دے کہ بھئی! ٹھیک ہے آپ نے اپنے ہاں کے ان لوگوں کو سمجھانے کے لیے اپنے طور پہ کہا ہوگا۔ کہا کہ رسول ﷺ کا ہر قول وحی ہوتا تھا۔ اب یہ خدا کی ہوگئی۔ یہ جو تفسیر، طبری نے **یَکۡتُبُوۡنَ بِاَیۡدِیۡهِمۡ** 'اپنے ہاتھوں سے لکھی پھر **یَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ** (2:79) کہہ دیا۔ دیکھا یہ کیسے ہوگیا۔ اب یہ تفسیر طبری کی نہیں ہے، رسول ﷺ کی ہے، رسول ﷺ کا قول خدا کا قول ہوتا ہے کیونکہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ اب جب یہ کہہ دیا گیا کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ خدا اور رسول ﷺ کا ہے تو اب اس کے بعد یہ جرأت کرنے والا کون ہے جو یہ کہے کہ میں اس کے خلاف اس کی کوئی تفسیر کرسکتا ہوں۔ جونہی اس نے یہ کہا، تو سوال یہ آ گیا کہ قرآن تم بہتر سمجھتے ہو یا رسول ﷺ بہتر سمجھتا تھا۔ کون مسلمان (معاذ اللہ معاذ اللہ) جو یہ جرأت کرے کہ نہیں، صاحب! میں حضور ﷺ سے بھی بہتر قرآن سمجھتا ہوں۔ توبہ توبہ توبہ۔ بس دلیل ختم ہوگئی۔

یہاں کہا ہے کہ **یَظُنُّوۡنَ** (2:78) وہ توہم پرستیوں اور قیاس آرائیوں میں مست رہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس ساری عمارت کی بنیاد کیا ہے؟ وہ ہے قیاس، طبری کا قیاس۔ یہ چوتھی صدی ہجری میں بیٹھ کر وہ تفسیر طبری لکھی جاتی ہے۔ اس کا کوئی Written Record (تحریری ریکارڈ) پہلے سے موجود نہیں ہے۔ یہ کہاں سے بات ہوئی؟ کہ جی! میں نے فلاں سے سنی۔ اس نے کیسے معلوم کیا؟ وہ کہتا ہے کہ میں نے اپنے دادا سے سنی۔ اور دادا کو بھی تو ابھی دو سو سال یا ڈیڑھ سو سال ہی ہوئے۔ انہوں نے اپنے پردادا سے سنی۔ یہ سارے قیاسات ہیں، ظن ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ظن کے اوپر یہ ساری چیزیں ہیں۔ اس کی بنا پہ امانی قلوب کے اندر Create (پیدا) کی جاتی ہیں۔ کتاب ان کے اوپر بند کردی جاتی ہے۔ پھر **یَکۡتُبُوۡنَ الۡكِتٰبَ بِاَیۡدِیۡهِمۡ** (2:79) اپنے ہاتھوں سے یہ سارا کچھ لکھا جاتا ہے۔ یہ کچھ بے نقاب ہو کر یوں سامنے نہیں آتا۔ کہتا ہے کہ **هٰذا من عند الله** (2:79) یہ خدا کی ہے۔ اور اس طرح سے اپنی چیزوں کو خدا کی چیزیں بنا کر پیش کرنے سے یہ سارا کچھ ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ کاہے کے لیے ہو رہا ہے؟ کہا کہ **لِیَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا** (2:79) تا کہ ان سے ناجائز فائدہ حاصل کریں اور پھر یہ جو کبھی کھٹک پیدا ہونے کی چیز ہے اس کے لیے یہ عقیدہ وضع کرلیا گیا کہ کوئی بات نہیں، چند دنوں کے لیے ہم جہنم میں ہیں پھر جنت کے اندر ہونگے۔ بات ایسے ہو رہی تھی جیسے بنی اسرائیل کی داستان دہرائی جا رہی ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے۔

فکرِ قرآنی کے ساتھ صدیوں سے ہونے والا سلوک اور اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! جہاں بھی خدا کے نام کو Exploit (استحصال) کیا گیا، وہ دو ہزار سال پہلے کے یہود و نصاریٰ ہوں یا آج کی آپ کے ہاں کی امت ہو یہی طریق ہر جگہ اختیار ہوتا ہے کہ اپنے ہاں سے یہ چیزیں وضع کی جائیں گی اور خدا کی طرف منسوب کی جائیں گی۔

اگر یہ وہاں منسوب نہ کریں تو ان کی کوئی نہیں مانے گا۔ یہ تکنیک ہے جسے اختیار کیا جاتا ہے اور یہ قرآن نے بتایا ہے۔ اس کے بعد محکم اصول بتادیئے کہ یاد رکھو! مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتۡ بِہٖ خَطِیۡٓـَٔتُہٗ (2:81) کسے باشد' کوئی بھی ہو' جس نے بھی یہ کچھ کیا' اس کی اس کو سزا بھگتنی پڑے گی۔ بچنے کے لیے طریقہ ایک ہی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جرم کرتے چلے جاؤ اور دل میں یہ خوش عقیدگی پیدا کر لو کہ کوئی بات نہیں' اس کے بعد چھڑانے والا آ جائے گا۔ نہیں' برادران عزیز! قطعاً نہیں۔ یہ سراسر غلط ہے۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (2:82) جو خدا کے قانون پر یقین رکھتے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو' صلاحیت بخش عمل کرے تو وہ جو تمہارے اپنے اعمال ہیں' صرف وہی تمہیں اس سے بچا سکتے ہیں' کوئی اور نہیں بچا سکتا۔ صرف یہ ہیں جن کے متعلق کہا کہ یہ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ (2:82) ہیں' یہ ہیں جن کو جنّتی زندگی نصیب ہوگی۔ آپ سوچیے تو سہی کہ جن کے یہ اعمال صالحہ نہ ہونگے ان کے ساتھ تو وہ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ہو نہیں سکیں گے اور جب پہلے کہہ دیا کہ ہم وعدہ خلافی نہیں کیا کرتے تو وعدہ تو اس کا یہ ہے کہ مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً (2:81) جس نے بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کی وہ جہنم میں گیا۔ اور الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (2:82) جس نے بھی قانونِ خداوندی پر یقین رکھتے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل کیا صرف یہ جنت میں گیا۔ تو کیا خدا اس کے بعد پھر یہ کرے گا کہ ادھر والے سارے جو ہیں' ان کو نکال کر یہاں بھیج دے خواہ ان کے ساتھ ایمان اور اعمالِ صالحہ ہوں ہی نہیں؟ نہیں' ایسا قطعاً نہیں ہوگا۔ یہ تو وعدہ خلافی ہوگئی۔ کہا کہ ہم یہ نہیں کیا کرتے۔ بس یہ ہے Criterion (کسوٹی)' یہ ہے اسٹینڈرڈ' یہ ہے معیار۔ اس کے مطابق یہ چیز ہوگی۔ عزیزانِ من! یہ وہ چیز ہے جو آپ کو دین میں ملے گی۔ مذہب وہ کچھ سکھائے گا خواہ وہ یہودیوں کا ہو خواہ وہ نصاریٰ کا ہو۔

برادرانِ عزیز! بات آگے بھی یہی چلتی ہے' اسے ہم آئندہ درس کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

❀......❀......❀

تئیسواں باب: **سورۃ البقرۃ** (2)، (آیات 83 تا 88)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ ۟ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی
وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا
مِّنۡکُمۡ وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۸۳﴾ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ لَا تَسۡفِکُوۡنَ دِمَآءَکُمۡ وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ
مِّنۡ دِیَارِکُمۡ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَشۡہَدُوۡنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنۡتُمۡ ہٰۤؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ وَتُخۡرِجُوۡنَ
فَرِیۡقًا مِّنۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِہِمۡ ۫ تَظٰہَرُوۡنَ عَلَیۡہِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ؕ وَاِنۡ یَّاۡتُوۡکُمۡ اُسٰرٰی
تُفٰدُوۡہُمۡ وَہُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیۡکُمۡ اِخۡرَاجُہُمۡ ؕ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَتَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا
جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ
الۡعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا بِالۡاٰخِرَۃِ ۫ فَلَا
یُخَفَّفُ عَنۡہُمُ الۡعَذَابُ وَلَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۸۶﴾ وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَقَفَّیۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ
بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَیۡنَا عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ الۡبَیِّنٰتِ وَاَیَّدۡنٰہُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ؕ اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌۢ
بِمَا لَا تَہۡوٰۤی اَنۡفُسُکُمُ اسۡتَکۡبَرۡتُمۡ ۚ فَفَرِیۡقًا کَذَّبۡتُمۡ ۫ وَفَرِیۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا
غُلۡفٌ ؕ بَلۡ لَّعَنَہُمُ اللّٰہُ بِکُفۡرِہِمۡ فَقَلِیۡلًا مَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۸﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1968ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ البقرۃ کی 83ویں آیت سے ہوتا ہے: (2:83)۔

یہودیوں کے عقیدے کی تلخیص

سلسلۂ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ یہودیوں کے اس عقیدہ کو سامنے لایا گیا تھا جس کی رو سے وہ کہتے تھے کہ لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً (2:80)۔ اول تو ہم جہنم میں جائیں گے ہی نہیں اور اگر ایسا ہی ہوا تو محض چند دن کے لیے جہنم میں رہنا ہوگا جب تک

ہمارے شفاعت کرنے والے نہیں آئیں گے۔بس جونہی انہوں نے شفاعت کی' ہم جنت میں چلے جائیں گے اور کہا یہ گیا تھا کہ **قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا** (2:80)ان سے پوچھو کہ کیا تم نے خدا سے اس قسم کا کوئی عہد لے رکھا ہے؟اگر عہد لے رکھا ہے تو پھر واقعی وہ وعدہ خلافی نہیں کرے گا لیکن بتاؤ تو سہی کہ تم نے خدا سے کیا عہد لیا تھا؟ خدا سے کیا معاہدہ کیا تھا؟ اور اس کے بعد خود ہی آگے بتا دیا کہ عہد تو یہ تھا کہ **وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ** (2:83)۔عہد یہ تھا کہ **لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ** (2:83)تم خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت اور محکومیت اختیار نہیں کرو گے۔یہ تھا عہد۔اور اس کے ساتھ تفصیل اس اجمال کی یہ تھی کہ **وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ** (2:83)۔اس معاہدہ میں آپ دیکھیے کہ پہلے ابتدائی معاشرتی زندگی کی اقدار دی گئیں۔بات گھر سے شروع کی۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک گھریلو زندگی کی اہمیت اور نوعیت

قرآن کے نظام کا انداز یہ ہے کہ وہ معاشرے کو چھوٹے چھوٹے Units (اکائیوں) میں بانٹتا ہے' مختصر سے Units (اکائیاں) قائم کرتا ہے اور بہترین وحدت تو گھر ہوتا ہے۔گھر سے ابتدا کرتا ہے۔اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہی قرآن کا اعجاز سامنے آتا ہے۔قرآن نے ماں باپ سے یہ کہیں تاکیداً نہیں کہا کہ تم بچوں کی پرورش کیا کرو۔بچوں کی پرورش ہر حیوان کرتا ہے' یہ ایک Instinct (جبلی جذبہ) ہے۔ہر ماں بچے کی پرورش کرتی ہے' یہ مامتا کا تقاضا ہوتا ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ وہ Instinctively (جبلی جذبے سے) ایسا کرتی ہے۔کسی چڑیا کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے کہ تم جاؤ اور دانہ دنکا اکٹھا کر کے بچے کو کھلاؤ۔کسی بکری کی طرف یہ کہنے کے لیے رسول نہیں بھیجنا پڑتا کہ بچہ پیدا ہو تو اس کو دودھ پلایا کرو۔وہ تو فطرت نے انتظام ہی ایسا کر رکھا ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ہوتا اور یہی وہ انسانی ماں کے سینے میں مامتا ہوتی ہے جس کے لیے وہ خود صعوبتیں اور تکلیفیں برداشت کرتی ہے' بچے کی پرورش اور آسائش کا فکر کرتی ہے۔اس کے لیے یہ ضرورت نہیں تھی کہ اسے تاکید کی جائے۔

حیوانی اور انسانی زندگی میں فرق

عزیزانِ من! اس سے آگے بڑھ کر آپ دیکھیے کہ کوئی حیوان بھی ایسا نہیں ہے کہ جب وہ ماں باپ کی پرورش کے دائرے سے باہر چلا جائے' تو پھر کبھی وہ پہچان بھی سکے کہ میرے ماں اور باپ کون تھے۔یہ چیز حیوانی جذبے کی نہیں ہے۔بیل بچھڑا ہے' بچہ ہے' ماں باپ کا محتاج ہے۔یہ بچھڑا بڑا ہوا تو اس کو اس کا احساس بھی نہیں اور جوان ہوا' وہ ماں اس کی گائے' بوڑھی ہو چکی ہو' بھوکی مر رہی ہو' اس کو اس کا احساس ہی نہیں ہوتا' اس کو اس کا علم ہی نہیں ہوتا کہ یہ میری ماں تھی۔انسانی دنیا میں یہاں آ کر یہ جذبہ حیوانی نہ رہا' انسانی معاشرے میں

یہ بات ہوئی کہ ماں باپ جب اس عمر کو پہنچیں کہ وہ اپنی پرورش آپ کرنے کے قابل نہ رہیں تو چونکہ یہ جبلی یا Instinctively (جبلی جذبے کے تحت) ایسا نہیں کرسکتی تھی' قرآن میں اس کے لیے تاکید آئی ہے کہ حیوان کی سطح پہ نہ رہنا کہ تم بھی اس کے بعد انہیں پہچانو ہی نہیں کہ یہ تمہارے ماں باپ تھے۔اب ان ماں باپ کے لیے جو کچھ قرآن نے کہا ہے اس کے لیے ہر جگہ لفظ **احساناً** آیا ہے۔

احسان کا مروّجہ مفہوم

کیا اعجاز ہے قرآن کا اور لفظوں کے غلط معنی یا معنی کے بدل جانے سے جو چیز آتی ہے' اس میں یہ ایک مثال بڑی عمدہ ہے۔احسان کا لفظ تو آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔جونہی آپ نے کسی کی مدد کی اور اسے آپ نے زیرِ بارِ احسان کیا۔یعنی ہمارے ہاں کی ''زیرِ بارِ احسان' احسان کے بوجھ کے نیچے اصطلاح ہے۔یہ اس اصطلاح کا لفظی ترجمہ ہے کہ زیرِ بارِ احسان کر دیا۔ہم یہ کہتے وقت سوچتے بھی نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔احسان کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہے۔اب ہر جائز و ناجائز' جاؤ و بے جا معاملے کے اندر' یہ احسان کرنے والا اس سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کی ہر بات کو مانے اور جونہی کسی بات میں اس نے اپنی مرضی سے کچھ فیصلہ کرنا چاہا' ان کی نہیں مانی' معاشرے میں دہائی مچ جاتی ہے کہ یہ احسان فراموش' محسن کش' طوطا چشم ہے' کیفیت ان کی دیکھیے کہ کل یہ بھیک مانگتا ہوا' روتا ہوا' گڑگڑاتا ہوا' ہمارے پاس آیا تھا' اس وقت ان کی یہ کیفیت تھی۔ایسے وقت میں ان کے ساتھ ہم نے احسان کیا اور آج یہ آنکھیں دکھا رہا ہے' کہتا ہے کہ نہیں صاحب! ووٹ تو میں اسی کو دوں گا جسے میں سمجھتا ہوں کہ ووٹ کے قابل ہے۔جی ہاں! ٹھیک ہے بھئی! ماتھے پہ آنکھیں رکھ لیجیے' جس طرح جی چاہتا ہے۔میاں! زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے' کوئی کسی کے احسان کو جانتا پہچانتا نہیں ہے۔یعنی آپ کی جو ضرورت کے وقت' محتاجی کے زمانے میں' کچھ انہوں نے مدد کی تو اب ہمیشہ کے لیے ان کے غلامِ بے دام بن گئے۔ہر بات ان کی مانتے چلے جایئے کیونکہ آپ ان کے زیرِ بارِ احسان ہیں اور احسان کا بدلا احسان' آپ کے ہاں مشہور ہے۔

اب احسان کا بدلا ہے' اس پہ آپ احسان کس طرح کریں؟ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہ اسی صورت میں کہیں محتاج ہو' تکلیف میں پھنسے' مصیبت میں آئے' پھر وہ آپ کے پاس گڑگڑاتا ہوا آئے' پھر آپ اس پر وہ احسان کریں تو احسان کا بدلا چکایا جائے۔اب ساری عمر آپ کی یہ دعا ہونی چاہیے کہ یا اللہ! اسے بھی اسی طرح سے محتاج کرتا کہ یہ بھی میرے پاس گڑگڑائے تو کسی طرح سے احسان کا بدلا تو چکا سکوں اور اس کے لیے پھر قرآن کی سند یہ **هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ** (55:60) ہے۔چل بھئی! فقرہ بولا اور سمجھ لیا۔آپ غور کیجیے کہ معاشرے میں اگر کیفیت یہ ہو کہ کسی ضرورت مند کی کسی وقت آپ نے مدد کی اور وہ آپ کا ہمیشہ کے لیے محکوم ہوگیا۔محتاج تھا' ایک وقت میں اب محکوم ہوگیا ابدی طور پر۔اور اب اس کے زیرِ بارِ احسانیت سے آپ چھوٹ نہیں سکتے تاوقتیکہ وہ اسی قسم

کی مصیبت میں نہ پھنسے۔ اور پھر آپ اسی قسم کا اس پہ احسان کریں تو یوں بدلا چھوٹ سکتا ہے۔

ذرا تصور میں لائیے ایسے معاشرے کو۔ تصور میں کیا لانا' ہمارا اپنا معاشرہ ایسا ہی ہے۔ عذاب میں پھنس جاتا ہے' وہ شخص جس کی کبھی کسی نے مدد کی ہو اور اگر یہ معاملہ والدین پہ ہو۔ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (2:83) تو اب ان بوڑھوں بیچاروں پہ جو آپ نے احسان رکھا' وہ زیرِ بارِ احسان ہو گئے' اب اس کے بعد انہیں آپ کی ہر چیز ماننی پڑے گی اور وہ ایسی شکل میں ہیں کہ ہر نیا چڑھتا ہوا دن' ان کو پہلے سے زیادہ کمزور کیے چلا جا رہا ہے۔ ان کو تو ہر روز آپ کے احسان کی ضرورت ہے اور وہ تو آپ کے احسان کا بدلا چکا نہیں سکتے۔ کہا یہ کہ صاحب! انہوں نے تم پر بچپن میں یہ احسان کیا تھا' اب یہ اس کا بدلا چکایا جا رہا ہے۔ ایک لفظِ احسان کے غلط مفہوم نے' آپ دیکھتے ہیں کہ یہ بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔

احسان کا قرآنی مفہوم ہی انسان کے لیے جہانِ نو کی نوید کا باعث بنتا ہے

برادرانِ عزیز! یہ چیز پہلے بھی آ چکی ہے' میں کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں کہ احسان اور حسن کا مادہ ''ح س ن'' ہے اور اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ''توازن کا برقرار رکھنا' Proportion (تناسب) کا صحیح کر دینا۔'' اور حسن تو نام ہی ''صحیح Proportion (تناسب)'' کا ہوتا ہے۔ ذرا کسی کی Proportion (تناسب) بگڑی ہوئی ہو' حسین سے حسین تر چہرے میں ذرا سی آنکھ کی سیاہی انچ کا سواں حصہ بھی اگر اپنے اس صحیح مقام سے اِدھر اُدھر ہٹ گیا ہو' آپ دیکھتے ہیں کہ کس طرح سے جو سارا حسن ہے' اس کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ احسان کے معنی ہوتے ہیں ''حسن کو برقرار کر دینا' کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو درست کر دینا۔'' اور قرآن نے جو وہاں کہا تھا کہ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (55:60) تو وہ کہا یہ تھا کہ معاشرے کا توازن بگڑے تو اس توازن کو صحیح کر دو اور اس کا کوئی بدلا' اس سے یا معاشرے سے نہ لو' اس کا بدلا یہ ہے کہ توازن صحیح ہو گیا ہے۔ کیا بات ہے جو قرآن کر جاتا ہے۔ جہاں بھی والدین کے متعلق یہ کہا ہے' آپ دیکھیے کہ اس میں احسانا لفظ آیا ہے۔ ان میں ایک کمزوری آ گئی ہے' ان کا توازن بگڑ گیا ہے۔ اب جتنی ان میں وہ کمزوری آئی ہوئی ہے' اتنے حصے تک آپ اسے درست کر دیجیے' توازن صحیح ہو گیا۔ اس کا معنی احسان ہے۔ اگر ان کا توازن بگڑا ہوا نہیں ہے تو پھر تو ان کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ ہر ماں باپ' خواہ وہ کسی کی ضرورت سے مستغنی کیوں نہ ہوں' اس کے ساتھ یہ کیا جائے۔ آپ کو تو اب یہ معلوم ہے۔ یہ نہ ہو کہ وہ لٹھ لے کر بیٹھ جائیں کہ ''او تہانوں پڑھایا۔ ایناں اک چڑی دا بوٹ ہونداسیں' اج متھے تے اکھاں رکھیاں ہویاں دیکھو جی [1]!'' ٹھیک ہے' ہمیں ضرورت نہیں ہے لیکن تم پہ تو احسان کیا تھا' احسان کا بدلا تو ہونا چاہیے۔ ٹھیک ہے جی! احسان کا بدلا ہونا چاہیے۔ ایک طرف وہ کیفیت ہوتی ہے اور دوسری طرف ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

---

[1] ارے! تمہیں پڑھایا لکھایا۔ تم تو صرف ننھے سے چڑیا کے ایک نوزائدہ بچے ہی تھے۔ اب آنکھوں پہ ٹھیکری رکھ لی' ذرا دیکھو جی!

غیر تربیت یافتہ معاشرے میں ماں باپ کی حالت زار اور اولاد کی ذہنیت

ایسے گھرانے بھی موجود ہیں اور مثالیں بھی موجود ہیں کہ خود اوران میاں صاحب کی جو اولاد ہے' وہ عیش وعشرت میں زندگی بسر کر رہی ہے' ماں باپ فاقوں میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں' ان کی طرف دیکھتے ہی نہیں ہیں اور اب تو دنیا بہت زیادہ ''مہذب'' ہوگئی ہے۔ غریب باپ کو تو یہ جو بڑا افسر ہے' وہ اس کو کبھی باپ کہتا ہی نہیں ہے اور جی چراتا ہے' آنکھیں چراتا ہے کہ کسی کو معلوم نہ ہو جائے کہ یہ اس غریب باپ کا بیٹا ہے۔ دونوں طرف افراط و تفریط ہے ہمارے ہاں! قرآن نے ایک لفظ کہہ دیا کہ اگر وہاں ان میں کہیں پہ کوئی کمی واقع ہوگئی ہے' توازن بگڑ رہا ہے' تو اسے درست کرو۔ یہ دو افراد کا توازن نہیں بگڑتا جسے آپ ماں باپ کہتے ہیں' اس سے آپ کے گھر کا توازن بگڑتا ہے۔ آپ گھر کے اندر یہ کچھ کر کے دیکھیے تو سہی۔ جن گھروں میں یہ کیفیت ہے کہ آپ نے جن کا آپس میں توازن برقرار نہیں رکھا تو پھر آپ دیکھیے سارے گھر کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس گھر میں حسن پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ بچوں کا' میاں بیوی کا' ماں باپ کا' صحیح توازن وہاں رکھیے' اور پھر اسے دیکھیے کہ سارا گھر آپ کو کیسا حسین نظر آتا ہے۔ قرآن نے جہاں کہا ہے کہ **وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا** (2:83) وہ یہی چیز ہے۔

ماں باپ کی اطاعت کا غلط تصور عقلِ انسانی کو پابندِ سلاسل بنائے رکھتا ہے

میں کئی دفعہ دہرا چکا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے' یہ چیز کہیں نہیں آئی۔ قرآن جیسا Progressive (تدریجی) دین یہ کبھی نہیں کہے گا۔ ان کے متعلق وہ خود یہ کہتا ہے کہ **وَمَنْ نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ** [1] (36:68)۔ عمر کا جو آخری حصہ ہوتا ہے اسے قرآن ارذل العمر [2] کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ دماغی توازن بگڑ جاتا ہے' انسان کی عقل اوندھی ہو جاتی ہے اور دوسری جگہ ہے کہ اس عمر میں پہنچ کر کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ پہلے آتا جاتا ہے' وہ بھی بھول جاتا ہے تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن اس قسم کی تعلیم دے گا؟ کہ وہ آنے والی نسلیں اب جو بھرپور شباب میں پہنچی ہوئی ہیں' ان کی صلاحیتیں بھرپور ہیں' اپنے معاملات خود فیصلہ کرنے کے قابل ہیں' اب جس زمانے میں یہ ہیں' وہ پچھلے زمانے سے پچاس ساٹھ برس آگے بڑھ گیا ہے' زمانے کے تقاضے مختلف ہو چکے ہیں' ان کی اپنی صلاحیتیں ان کے مقابلے میں کہیں بڑھی ہوئی ہیں' ان پہ وہ فرض قرار

---

[1] ہوتا یہ ہے کہ عمر کے آخری حصہ میں جا کر ایک فرد کی قوتیں' قانونِ طبعی کے ماتحت' مضمحل ہو جاتی ہیں اور اس کی طبعی صلاحیتیں آگے بڑھنے کے بجائے' اوندھی ہو جاتی ہیں......ان کی ترقی روبہ تنزل ہو جاتی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 1029)۔

[2] وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا (22:5)

دے دے گا کہ اپنے تمام معاملات کے فیصلے ان کے فیصلوں کے ماتحت کیا کرو کہ جن کے متعلق خدا خود کہہ رہا ہے کہ ان کی عقل اوندھی ہو چکی ہوئی ہے۔ اگر یہ فرض قرار دیدیا جائے کہ اپنا کوئی معاملہ یہ ازخود نہ طے کرے' جو کچھ وہ کہیں اس کے مطابق یہ طے کرے' تو آپ دیکھیے کہ معاشرے کی کیفیت کیا ہو اور جیسا کہ میں نے کنونشن ❶ میں بھی کہا تھا کہ اگر یہ چیز کہیں مسلسل چلی آئے' تو سیدھی سی بات یہ ہے کہ آج کا جو یہ نوجوان ہے' یہ اپنے ماں باپ کی اطاعت کرتا ہے' وہی کچھ کرتا ہے جو کچھ وہ کہتے ہیں تو کل کو جب یہ بوڑھا ہو جائے گا' اس کی اولاد اس کے کہنے کے مطابق چلے گی' تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جہاں کوئی دس ہزار سال پہلے آپ کا پہلا ماں باپ تھا' وہیں آج کی نئی نسل ہونی چاہیے۔ پہلے ماں باپ نے تو آنے والوں سے یہی کہنا تھا کہ غاروں میں رہو جیسے ہم رہتے ہیں اور یہی جب پھر باپ بنتا' اپنے بچوں سے کہتا کہ غاروں میں رہو جیسے ہم رہتے ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لیے قرآن نے جہاں کہیں کہا ہے تو وہاں وہ بات یہ کہی ہے کہ انسانی زندگی حیوانی جذبے کے تابع نہیں ہوسکتی تھی اور یہ بھی نہیں کہا کہ چونکہ حیوانات ایک عمر تک پہنچنے کے بعد ماں باپ کو Neglect (نظر انداز) کرتے ہیں' پہنچانتے نہیں ہیں' اس لیے تم بھی یہی کرو' وہ چیز نہیں کہی۔

بچے کی Guidance (راہنمائی) بچے کی حد تک ضروری ہے' اس کے بعد اس کی نوعیت بدل جائے گی

پھر یہ بات نہیں کہی ہے کہ تم ماں باپ کی اطاعت کرو۔ جب تک یہ بچہ ہے' اس وقت تک تو اسے بہرحال ماں باپ کی Guidance (راہنمائی) کے تابع چلنا ہوگا۔ جب وہ اپنے معاملات خود سنوارنے کے قابل ہوگیا ہے' وہ مشورہ لے سکتا ہے' ان کے تجربے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے' فیصلے اسے خود کرنے ہوں گے۔ ہر آنے والی جنریشن (نسل) اپنے فیصلے آپ کرے گی مگر یہ ضرور کہا ہے کہ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (2:83) اپنے والدین سے حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔

عقلِ انسانی کے لیے قرآن حکیم کی راہنمائی ہر لحاظ سے مکمل ہے: والدین کے بعد رشتے داروں سے حسنِ سلوک

آپ دیکھتے ہیں کہ مذہب کی دنیا میں جو چیز بطور مسلمات چلی آتی ہے' قرآن اس کے خلاف کتنا انقلابی پیغام دیتا ہے۔ دنیا کے ہر مذہب میں یہ مسلمہ ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ آپ کے ہاں بھی جب سے یہ دین مذہب میں تبدیل ہوا ہے۔ ماں باپ کی اطاعت فرض بنا دی گئی ہے اور یہ چیز چلی آرہی ہے۔ ہر شخص یہ کہتا ہے مگر کبھی کھڑے ہو کر سوچتا ہی نہیں ہے لیکن قرآن تو ہمارے آپ کے مسلمات کی پرواہ نہیں کرتا' وہ تو حقائق سے بحث کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (2:83) اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ اور اگر ان کی اطاعت فرض ہوتی تو جس کی اطاعت فرض ہے' اس کے لیے یہ کہنا کہ ان کے اوپر احسان کرو' ان

---

❶ طلوع اسلام کی گیارہویں سالانہ کنونشن اکتوبر (10 لغایت 13) 1968ء

کے ساتھ حسنِ سلوک کرو تو اس کے معنی کیا ہیں؟ وہ تو ایک حکم دے کر منوالیں گے' وہ کہیں گے کہ جو تنخواہ ہے' وہ میرے ہاتھ میں لا کر دیا کرو۔ ماں باپ کی اطاعت فرض ہوئی تو پھر اس تاکید کی کیا ضرورت تھی کہ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (2:83) ان کے ساتھ تم احسان کرو۔ اگر وہ صحیح ہے کہ ان کی اطاعت فرض ہے وہ تو خدا کے اس فیصلے کی رو سے اپنے حکم کو منوائیں گے۔ گھر کے اس یونٹ (وحدت) کے اندر والدین کے بعد سب سے پہلے انہیں لائے جو زیادہ قریب ہیں اور وہ ہیں' وَّ ذِی الْقُرْبٰی (2:83) یعنی اپنے رشتہ دار جو ذرا والدین سے ہٹ کر قریب ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ ایک یونٹ (وحدت) ہے' اس میں کوئی تعصب کی بات نہیں' کوئی عصبیت نہیں ہے کہ قرآن اپنوں کے ساتھ یہ کچھ کرانا چاہتا ہے۔ وہ یہاں سے ابتدا کرتا ہے۔ دیکھیے کس طرح Step by Step (قدم بہ قدم) تدریجی طور پر آگے بڑھ رہا ہے۔ پہلی چیز والدین کی ہے پھر ان سے ذرا اور آگے ہٹ کر جو آپ کے قریبی ہیں' ان سے ہے۔ یہ تو ہو گیا جن کے ساتھ آپ کا رشتے کا تعلق ہے' قریب میں رہنے کا تعلق ہے۔

دنیا میں ہر وہ شخص جو معاشرے میں تنہا رہ جائے' قرآن حکیم کے نزدیک یتیم ہے

اب یہ دائیں اور بائیں کی' گھر کی جو دیواریں ہیں' اس نے ان کو گرانا شروع کیا۔ گھر کو معاشرے میں تبدیل کیا' معاشرے کو انسانیت میں تبدیل کیا۔ یہ کہا کہ وَ الْیَتٰمٰی (2:83)۔ اب یہاں وہ یہ نہیں کہہ رہا کہ اپنے ہی ہاں کے جو یتیم ہیں' ان کے ساتھ یہ کرو۔ اور جیسا آپ کو معلوم ہے یتیم کے معنی تو عربی زبان میں' ہر وہ شخص ہے جو تنہا رہ گیا ہو۔ چونکہ سب سے پہلے وہ بچے ہوتے ہیں' جن کے ماں باپ مر گئے ہوں' اس لیے ان کو بھی یتیم کہتے ہیں لیکن مادے (Root) کے اعتبار سے ''ہر وہ شخص جو تنہا رہ گیا ہو یتیم ہے''۔ اب اس میں رشتے دار اور غیر رشتے دار کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ آگے کہا کہ وَ الْمَسٰکِیْنِ (2:83) ہر وہ شخص جس کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو۔ کہا کہ تم نے خدا کے ساتھ تو یہ وعدہ کیا تھا' یہ تو نہیں تھا کہ تم جو جی میں آئے کرتے جاؤ' چند دن کے لیے تم جہنم میں رہو گے' اتنے میں سفارشی آ جائیں گے اور وہ آ کر تمہیں چھڑا لیں گے۔ معلوم نہیں وہ بعد میں کیوں آئیں گے' ساتھ کیوں نہیں آئے؟ پھر یہ وعدہ لیا تھا کہ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا[1] (2:83)۔ اب یہ انسانیت آئی۔

جنت کے حصول کا راز تو نوعِ انسانی کے لیے سامانِ نشو و نما مہیا کرنے میں مضمر ہے

آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کس طرح سے یوں بہ تدریج بڑھ رہا ہے۔ اب اس کے اندر الناس آیا ہے' اس کے اندر پوری انسانیت آ گئی ہے۔ قالوا کے معنی یہی نہیں کہ ان سے بات کرو۔ اس کے معنی ہیں کہ ان کے ساتھ ہر معاملہ حسنِ کارانہ انداز سے کرو۔ یہ جو لفظ قال

---

[1] عوام الناس سے ایسا برتاؤ کرو کہ ان کی کمیاں پوری ہو جائیں اور اس طرح معاشرے کا توازن بگڑنے نہ پائے (ماخوذ از پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص 28 تا 29)

ہے' یہ عربی زبان کے اندر بڑے وسیع المعنی چیز ہے۔ ہر معاملہ جو کسی کے ساتھ کرو' حسن کارانہ انداز سے کرو۔ انسانیت کے ساتھ اب یہ معاملات آ گئے ہیں۔ اب آیا ہے کہ وہی نظام قائم کرو یعنی وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ (2:83)۔ وہی جو دین کی دو بنیادی چیزیں ہیں' اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ یعنی ایسا معاشرہ جس میں افرادِ معاشرہ قرآن کے قوانین کے پیچھے پیچھے چلتے جائیں اور مقصود اس سے نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما دینا ہو۔ کہا کہ تم سے یہ وعدہ لیا گیا تھا' تم نے خدا سے یہ اقرار کیا تھا' اب تم یہ اقرار پورا کرو' اس کے بعد دیکھو کہ کیسے جنت میں جاتے ہو۔ ثُمَّ تَوَلَّـیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ (2:83) بجز استثنائے چند کے سب پھر گئے۔ آگے کہا کہ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (2:83)۔

برادرانِ عزیز! یہ معرضون عجیب چیز ہے۔ پہلے تو ایسا نظر آتا ہے' یہ پہلے جو کہا ہے کہ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ (2:83) کسی زمانے میں تم نے یہ بات کہی تھی اور اس کے بعد اس سے پھر گئے۔ کہا ہے کہ پھر تمہاری ذہنیت ہی یہ ہوگئی۔ دیکھا! لوٹا کے یہ دو الفاظ کہے ہیں کہ پھر تم ہو ہی ایسے گئے۔ یعنی وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (2:83) تم پھر ہو ہی ایسے گئے' تمہاری ذہنیت ہی ایسی ہوگئی۔ یہ بڑی عجیب چیز قرآن نے کہی ہے کہ ابتداً' کسی زمانے میں' کوئی گروہ' کوئی ایک چیز کرتا ہے' راستے سے ہٹتا ہے اور جب وہ چیز بعد میں آ کر متوارث چلی آتی ہے' وہ رسم وہ روش متوارث چلی آتی ہے تو کچھ عرصہ کے بعد پھر جو آنے والی نسلیں ہیں' وہ خود بخود ویسی ہی ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (2:83)۔ کیا انداز ہے قرآن کا! تَوَلَّـیْتُمْ کوئی ہنگامی چیز ہے کہ کسی خاص وقت میں' کسی خاص گروہ نے' ایسا کچھ کیا لیکن وہ جو چیز پھر متوارث آگے چلی ہے' Traditionally (رسماً) آپ آگے آئے ہیں تو وہ تمہارے سلفِ صالحین کے کارنامے بن گئے کہ اس کے بعد آنے والی وہ نسلیں مُّعْرِضُوْنَ خود بخود ہی ایسی ہوگئیں کہ انہوں نے اپنے اصلی قول سے' اپنے معاہدے سے' اعراض برتا' پھر تم ہو ہی ایسے گئے' پھر یہ وعدہ تم نے لیا تھا کہ وَ اِذْ اَخَـذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَ کُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ (2:84)۔ قرآن ان کے وعدے کی ایک ایک شق گنا رہا ہے کہ جاتے کہاں ہو۔ وعدہ یہ لیا تھا کہ یاد رکھو! باہمی خوں ریزیاں مت کرو' اپنے لوگوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو۔ دیکھتے ہو کتنی اہم چیز ہے۔ آگے چل کر اس کی اہمیت آتی ہے۔ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ (2:84) تم نے اقرار کیا۔ وَ اَنْتُمْ تَشْهَـدُوْنَ (2:84) چونکہ تمہاری کتابوں میں یہ چیز لکھی ہوئی چلی آ رہی ہے' تم آج بھی اس کی شہادت دیتے ہو کہ جی! ایسی بات ہوئی تھی۔ یہ معاہدہ تھا۔

خدا کے ساتھ کیے گئے وعدوں کی خلاف ورزیوں کی نوعیت اور ان کا محسوس نتیجہ

اب آگے دیکھیے عزیزانِ من! آیت (2:85) ہمارے سامنے ہے۔ اس لیے دہرایا ہے کہ یہ ہمارے سامنے ایک عظیم آیت ہے۔

بات تو بنی اسرائیل کی چلی آ رہی ہے لیکن ہمارے سامنے اس میں دین اور مذہب کا بنیادی فرق آ جاتا ہے۔ کہا ہے کہ ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓـؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَ تُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ (2:85) معاہدہ تو تم نے وہ کیا تھا' عہد تو تم نے وہ لیا تھا' اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ باہمی خوں ریزیاں بھی کرتے ہو اور پھر اپنے ہی لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو۔ کچھ لوگ یہ کرتے ہیں اور تم میں جو باقی ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ انہیں روکیں کہ تم یہ نہ کرو' وہ ایسا کرنے میں Indirectly یا Directly (بالواسطہ یا بلاواسطہ) ان کی مدد کرتے ہیں۔

خدا سے وعدہ خلافی کے بعد نیک عملی کا معیار اور باہمی طور پر چندوں کی طلب کا سلسلہ

مدد کرنے میں بِالۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ دو الفاظ قرآن نے کہے ہیں۔ یہ عجیب چیز ہے۔ ''اثم'' کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ''تھکا دینا یا تھک جانا' کمزور ہو جانا' سست ہو جانا' افسردہ ہو جانا''۔ عُدۡوَان ہوتا ہے ''سرکشی اختیار کر لینا' آگے بڑھ جانا''۔ سوال یہ آتا ہے کہ قرآن نے یہ دو چیزیں کیوں کہی ہیں؟ یہ مدد کرنے والے کس طرح سے مدد کرتے تھے؟ ان کے ہاں ایک طبقہ کمزور ہو جاتا تھا' دوسرا طبقہ بالا دست ہو جاتا تھا۔ غلط معاشرے میں ہوتا ہی یہ ہے کہ دو طبقے ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس انداز سے مدد کرتے تھے کہ جو کمزور ہو جاتا تھا' اس کو کمزور تر کرتے چلے جاتے تھے اور جو صاحبِ قوت و اقتدار ہوتا تھا' ان کا اقتدار اور قوتِ بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ وہ Directly (بلاواسطہ) یہ کچھ کرتے تھے' تم اپنے معاشرے کے اندر یہ کچھ کرتے تھے اور اس طرح سے تمہاری کیفیت یہ تھی کہ اپنوں کو ہی ان کے گھروں سے نکالتے جاتے تھے۔ اب بات وہ آگے آتی ہے کہ وَ اِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ (2:85) پھر کیفیت تمہاری یہ تھی کہ جنہیں تم اس طرح سے لاوارث' بے نوا بنا کر گھروں سے نکال دیتے تھے' ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا تھا' دشمن ان کو اچک کر لے جاتے تھے' ان کو پکڑ کر لے جاتے تھے' تو پھر تم یہ کہنے کے لیے بیٹھے تھے کہ صاحب! قیدیوں کو قید سے چھڑانا بڑا نیک کام ہے' یہ پُن کی بات ہے' نیکی کی بات ہے۔ پھر تم آپس میں چندہ کرتے تھے' چندہ کر کے دشمنوں کو یرغمال کے پیسے دے کر' ان کا فدیہ دے کر' ان کو چھڑا کر لاتے تھے اور پھر بہت خوش ہوتے تھے کہ ہم نے بڑا نیکی کا کام کیا ہے۔ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ (2:85) اور یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ان کا گھروں سے نکالنا ابتدائی چیز تھی' تمہارے اوپر وہی حرام تھا۔ اُدھر سے یہ کچھ کرتے چلے جاتے تھے اور پھر اس کے بعد آپس میں بیٹھ کر خیرات کے پیسے اکٹھے کر کے' چندہ اکٹھا کر کے' ان کا وہاں فدیہ دے کر' ان کو چھڑا کر' لا کر' پھر بڑے مطمئن ہوتے تھے کہ ہم نے بڑا کارِ خیر کیا' نیکی کا کام کیا' گھر کے اندر خوش ہو کر آ رہے ہیں۔ اس میں ایک لفظ ہے کہ یہ نہیں سوچتے تھے کہ وہ جو ابتداً تم نے کیا ہے' اس کی وجہ سے یہ ایسے ہو گئے ہوئے تھے' وہ بجائے خویش ایسا کرنا تمہارے اوپر حرام تھا۔

دنیا بھر میں خیرات کے متعلق پائے جانے والے غلط تصورات اور قرآنی معاشرے کے بنیادی خدوخال

یہ بات میں ابھی سمجھا تا ہوں کہ یہ بنی اسرائیل کی داستان بیان نہیں ہورہی پوری دنیا کی ایک روش بیان ہورہی ہے' دین اور مذہب کا فرق بیان ہورہا ہے۔ یہ بات کیا ہوئی؟ مذہب کی دنیا میں خیرات سب سے بڑا نیکی کا کام سمجھا جاتا ہے۔ یہ مذہب کی دنیا کا مسلمہ ہے۔ کبھی آپ نے سوچا بھی کہ خیرات کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ خیرات کے معنی یہ ہیں کہ نظامِ معاشرہ ایسا ہے کہ اس میں کچھ لوگ مفلس ہیں' محتاج ہیں' غریب ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے پاس ان کی ضروریات سے زائد ہے' ان کے پاس افراط ہے' یہ وہ طبقہ ہے' یہ خیرات دیتا ہے جو مفلس اور محتاج ہیں۔ خیرات کی یہی صورت ہے۔ معاشرے کے اندر اگر یہ محتاج طبقہ نہ ہوتو اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ معاشرے میں اگر کسی کے پاس فاضلہ دولت نہ ہوتو وہ دینے والا ہی نہیں ہوتا۔ انسانی بچے جب پیدا ہوتے ہیں ان میں سے نہ تو کوئی محتاج پیدا ہوتا ہے اور نہ کوئی فاضلہ دولت (Surplus Money) ساتھ لے کر آتا ہے۔ خدا کی طرف سے دونوں بچے یکساں آتے ہیں۔

معاشی نظام کے سلسلہ میں غلط معاشرے کے بنائے ہوئے خودساختہ قوانین کی نوعیت اور ان کا استعمال

عزیزانِ من! اب یہ جو آپ کے ہاں معاشرے میں تقسیم ہوئی ہے کہ کچھ محتاج ہوگئے اور کچھ ایسے ہیں جن کے پاس زیادہ ہے' یہ آپ کے معاشرے کی تقسیم ہے۔ آپ کے معاشرتی نظام نے پہلے یہ صورت پیدا کی کہ کچھ لوگ محتاج کر دیئے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ یہ زیادہ امیر ہوگئے' یہ کہیں آسٹریلیا سے جا کر روپیہ نہیں لاتے' یہ آپ ہی کے معاشرے کی جو دولت ہے اس کی تقسیم اس طرح سے کی جاتی ہے کہ کچھ ایسے لوگ ہیں جن کے پاس زیادہ سے زیادہ آتا چلا جائے۔ یہ کہاں سے آتا جاتا ہے؟ انہی کے ہاں سے جن کو آپ غریب کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ جن کے پاس زیادہ ہوتا ہے ''اپنے گھر نوٹ بنان ڈے ہوندے نیں [1]؟'' یہ کہاں سے آتا ہے؟ یہ دولت کی غلط تقسیم ہے۔ یہ ساری دولت اسی معاشرے کے اندر پھیلی ہوئی تھی' اس میں سے کچھ لوگوں نے ایسی کاری گری کی' نظامِ معاشرہ ایسا بنایا اور پھر اس نظام معاشرہ کی ایک تو چیز یہ تھی کہ کسی ڈاکو نے کسی کے ہاں سے روپیہ چھین لیا اور وہ لے گیا۔ آپ کے معاشرے نے اس بات کو جرم قرار دیا کہ وہ اس کا روپیہ چھین کر لے گیا ہے لیکن آپ کے ہاں ہیں' بیسیوں ایسی چیزیں جو دوسروں کا روپیہ یعنی وہی چیز جو دوسروں کے ہاں روپیہ خود کھینچ کر لے جانا تھا اس کی ایک نوعیت تو جرم تھی' جسے آپ نے ڈاکہ کہا' بیس نوعیتیں اس کی اس قسم کی ہیں کہ جسے آپ نے جرم نہیں قرار دیا۔ کس نے جرم نہیں قرار دیا؟ ہوا یہ کہ آپ نے خود ہی بیٹھ کر قانون بنا دیا تو قانون آپ بنا رہے ہیں اور یہ قانون

---

[1] کیا یہ اپنے گھر نوٹ بنا رہے ہوتے ہیں؟

کبھی ان سے نہیں بنتا جن کا روپیہ چھن کر جا رہا ہوتا ہے۔ قانون بنانے والے وہ ہوتے ہیں جن کے ہاں جا رہا ہوتا ہے تو انہوں نے کیا کیا؟ اپنے آپ کو باقیوں سے نکالنے کے لیے' لفظی طور پر' قانونی طور پر' وہ کہہ دیا کہ یہ جرم نہیں ہے۔ اب جو معاشرہ ہے اس کے اندر غلط تقسیم ہوگئی۔ ان کے ہاں کا روپیہ سمٹ کر ان کے ہاں چلا آ رہا ہے' یہ محتاج ہو گئے۔ ایک فیکٹری کے اندر آپ نے ہزار مزدور لگا لیا۔ ایک مزدور شام کو اتنی چیز بنا دیتا ہے کہ جس کی قیمت دس روپے مل جاتی ہے۔ آپ از روئے قانونِ عدل وانصاف اسے تین روپے دیتے ہیں' اس لیے کہ یہ Wages (اجرتیں) مقرر کی ہوئی ہیں۔ کیا یہ آسمان سے مقرر ہوئی تھیں؟ وہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ باہمی رضامندی سے ہے۔ یہ تین روپے روز کے اوپر مزدور آتا ہے' ہم زبردستی تو نہیں لاتے۔ پہلے قرآن کہتا ہے کہ ان کو گھروں سے نکال دیتے ہو' پہلے ان کو اس حالت میں پہنچا دیتے ہو کہ ان کے اور ان کے بچوں کے پاس دوپہر کی روٹی نہیں ہوتی' تم تین کہتے ہو وہ بے چارہ تو دو میں بھی آنے کو تیار ہوگا۔ ''پنجابی دا محاورہ ساہڈے ہے بھاہ کن وگاڑیا؟ رات دیاں بھوکیاں نیں [1]۔''

یہ بڑی عجیب چیز ہے' عزیزانِ من! کہ بھاہ رات دے بھوکے وگاڑ دے ہیگے [2]''۔ پہلے تو معاشرے میں یہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ یہ رات کے بھوکے صبح مارکیٹ میں بیٹھے ہوئے انتظار کر رہے ہیں کہ کوئی مزدوری پہ لے جانے والا آتا ہے۔ پھر تم اسے تین روپے آفر کرتے ہو' وہ لپک کر جائے گا۔ کہتے یہ ہو کہ یہ باہمی رضامندی سے ایسا ہوا ہے۔ اسے تین دیتے ہو' ان کی کمائی میں سے سات روپے لے جاتے ہو۔ اس کے بعد آپ کے ہاں خیرات ہوتی ہے۔ سردی آ گئی ہے جی! غریب ہیں' ان کے ہاں کچھ نہیں ہے' کچھ تھوڑا سا بونس کا پیسہ ان کو دے دیجیے' گرم کپڑے بنا دیجیے۔ بیگمات تشریف لاتی ہیں' تقریب ہوتی ہے' وہ بچوں کو کپڑے بانٹ رہی ہوتی ہیں۔ وہ سارے اکٹھے ہو کر ان کے لیے اٹھتے ہیں' جو سستا غلہ ہے' اس کی دوکان کھولی جا رہی ہے۔ مل (Mill) کے اندر روٹی سستے داموں دی جا رہی ہے۔ دیگیں پک رہی ہیں صاحب! نیاز بٹ رہی ہے۔ ان کے لیے Welfare (فلاح و بہبود) کے کام ہو رہے ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ پہلے گھروں سے نکال دیتے ہو۔ یہ قرآن کی آیت ہے کہ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ (2:85) پھر جب دشمن پکڑ لیتا ہے تو چندے کر کے ان کو چھڑا کر لاتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ بڑا نیکی کا کام ہے۔

ویلفیئر اسٹیٹ کی نوعیت

قرآن کہتا ہے کہ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ (2:85) او! جس حالت میں تم نے ان کو پہنچایا ہے' وہی حرام تھی'

---

[1] بھاؤ کس نے بگاڑا؟ ہمارے ہاں پنجابی زبان کا محاورہ ہے۔ (کہا کہ) رات کو بھوکے سونے والوں نے۔

[2] رات کو بھوکے سونے والے بھاؤ بگاڑ دیتے ہیں۔

تمہارے اوپر ایسا کرنا حرام تھا۔ پہلے ان کو اس حالت میں پہنچاتے ہو' پھر اس میں تم ان کے لیے نیکی کا کام کرتے ہو' خیرات کے کام کرتے ہو' پُن کے کام کرتے ہو اور یہ چیز چھوٹے سے معاشرے کی بات نہیں ہے' آج دنیا اونچے سے اونچے معاشرے میں جہاں پہنچی ہے' اسے Welfare State (فلاحی ریاست) کہا جاتا ہے۔ انسان کے ذہن میں اس سے بڑا تصور ابھی تک آیا ہی نہیں۔ یہ Welfare State (فلاحی ریاست) کیا ہوتی ہے؟ وہاں وہ جو اسٹیٹ ہے' وہ غریبوں' محتاجوں' مفلسوں' بوڑھوں کی مدد کرتی ہے۔ ارے! بات تو یہی ہے' وہی خیرات کا تصور ہے۔ Charity (خیرات) کے لیے آپ نے Welfare (فلاح و بہبود) کا لفظ Substitute کر لیا' سمجھ لیا کہ بات بدل گئی۔ یہاں بھی وہی دو طبقے ہیں۔ یہ جو طبقہ' جسے آپ کہتے ہیں کہ محتاج ہو گیا ہے' قرآن کے الفاظ میں پھر یہ پوچھتا ہوں کہ کیا پیدائش کے وقت وہ جو دو بچے تھے' وہ یہ تقسیم اپنے ماتھے پہ لکھا کر لائے ہوئے تھے کہ یہ محتاج ہے اور یہ امیر ہے؟ یہ ان کو کس نے بنایا ہے؟ ان کی کس نے یہ تقسیم کی ہے؟ تمہارے معاشرے کے نظام نے یہ تقسیم کی ہے۔ کہتا ہے کہ پہلے یہ معاشرے میں تقسیم کر لیتے ہیں کہ دولت سمٹ کر چند افراد کے ہاں آتی چلی جائے اور یہ جو پورا طبقہ ہے' یہ مفلس اور محتاج ہوتا چلا جائے۔ پھر انہیں جنہیں خود مفلس اور محتاج بنایا' ان کا روپیہ اپنی جیب میں لے آئے ہو۔

نظامِ سرمایہ داری کے تحت چھینی ہوئی حرام دولت کو حلال کرنے کا طریقہ

یہاں سے پھر آگے بڑھے۔ مذہب نے کہا کہ ہم بتاتے ہیں کہ کیا کرنا ہے؟ یہ جتنا چھین کر لے آئے ہو' اس میں سے اڑھائی فیصد دے دیا کرو۔ پہلے ان سے یہ لے آیا کرو' پھر اس کے بعد اس میں سے اڑھائی فیصد ان کو دے دیا کرو' فریضۂ خداوندی اتارو۔ کیا ہوگا جی؟ یہ کہ یہ جو باقی سارا مال ہے شیرِ مادر کی طرح حلال وطیب ہو جائے گا۔ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ (2:85) او! تمہارے لیے تو یہ روپیہ ان کی جیب سے نکالنا ہی حرام تھا۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ قرآن یہ کتنی عظیم بات کہہ گیا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ کوئی تاریخ کی داستانیں بیان نہیں ہو رہیں' یہ عہدِ گزشتہ کے اقوام کے قصے ان کی زبانی نہیں گنائے جا رہے' یہ جو غلط نظامِ زندگی ہے اس کی تشریح کی جا رہی ہے کہ پہلے کسی نظام میں' کسی کو اس حالت میں پہنچا دینا کہ وہ مدد کا محتاج ہو جائے اور پھر اس کی مدد کر کے اپنی Ego (پندارِ نفس) کو Satisfy (مطمئن) کر لینا۔

خیرات کے یہ چند ٹکڑے بانٹنے والوں کی اور لینے والوں کی اندرونی حالت

پہلی بات تو یہ ہے کہ پوچھیے نہیں کہ خیرات دینے والے کا جو نفس ہے' وہ پھر اس خیرات دینے سے کتنا موٹا ہوتا ہے۔ وہ جو دیگ پکا کر بانٹ رہا ہوتا ہے' کبھی اس بانٹنے والے کے انداز کو دیکھا کیجیے۔ اس لینے والے کو جو وہاں بیٹھا ہوا ہوتا ہے دیکھا کیجیے۔ اور اس دینے

والے کو دیکھا کیجیے جو وہاں چل پھر کر بانٹ رہا ہوتا ہے۔ بظاہر اس کے چہرے کے اوپر کچھ مسکراہٹ ہوتی ہے' جیسے بڑی خوشی سے یہ کر رہا ہوتا ہے۔ پوچھیے نہیں اندر سے' اس کے چلنے کا انداز آپ کو بتا رہا ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو یہ شخص کتنا ''خدا'' بلند سمجھ رہا ہے۔ کر کیا رہا ہے؟ یہ ڈاکو کر یہ رہا ہے کہ جن کی جیب سے سات روپے نکالے تھے' اس میں سے سات پیسے ان کو دے رہا ہے۔ لینے والا یہ سمجھ رہا ہے کہ صاحب! ان داتا' پروردگار ہے' یہ رزق دے رہا ہے۔ مانگنے والا جب آپ سے مانگتا ہے تو پوچھیے نہیں کہ وہ اپنے آپ کو کیا کہہ کر مانگتا ہے۔ پھر سوچ لیجیے گا کہ خدا کے ہاں سے یہ دونوں بچے یکساں چیز لے کر آئے تھے۔ یہ جو اس وقت اس پوزیشن میں پہنچا ہوا ہے کہ تمہارے لیے روٹی کا محتاج ہے' یہ تمہارے اپنے نظام کا بنایا ہوا ہے۔ یہ جو تمہارے پاس اتنا کچھ جمع ہو گیا ہوا ہے' یہ تمہارے اس نظام کی وجہ سے ہو گیا ہوا ہے۔ خدا نے ایک بچے کے ساتھ زیور کی یا روپے کی کوئی پوٹلی باندھ کر نہیں بھیج دی تھی۔ **وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ** (2:85) انہیں اس حالت میں جو پہنچانا تھا' وہ سب سے بڑا جرم ہے۔ اس جرم پہ تمہاری نگاہ نہیں ہے۔ چند پیسے خیرات کے' چند پیسے زکوٰۃ کے' نکالنے کے بعد تم کہہ رہے ہو کہ صاحب! ہم نے بہت بڑا کارنامہ کیا یعنی وہ جو جرم تھا **مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ** (2:85) تم نے اس کا کفارہ ادا کیا۔ کیا تمہارا کفارہ اس طرح سے ادا ہو جاتا ہے؟

مذہب میں انسان قدم قدم پر دوسروں کا محتاج ہوتا ہے' دین انسان کو باوقار زندگی کا اجتماعی پروگرام عطا کرتا ہے

مذہب کی دنیا یہ کرتی ہے' مذہب کی دنیا کو نظام سے واسطہ نہیں ہوتا' مذہب کی دنیا انفرادی نیکیوں کو لیتی ہے۔ معاشرے کا نظام کس قسم کا ہے؟ یہ دنیاداری کا قصہ ہے' یہ حکومت کا کام ہے' مملکت کا کام ہے۔ مذہب کا کام کیا ہے؟ لوگوں کو خیرات پہ اکسانا' نیکیوں کی تلقین کرنا کہ غریبوں کی مدد کیا کرو' بھوکوں کو کھانا کھلایا کرو' سبیلیں لگا دیا کرو' دیگیں پکا دیا کرو۔ مذہب ہمیشہ یہ کہتا چلا جاتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں مذہب کی تلقین ہمیشہ خیرات کی ہوتی ہے۔ مذہب اس مقام سے جس کے اندر انسانیت محتاج ہوتی چلی جاتی ہے' اپنا واسطہ ہی نہیں رکھتا۔ دین خیرات کی تلقین کرنے کے لیے نہیں آتا۔ دین وہ نظام متشکل کرتا ہے جس میں کوئی فرد دوسرے کی خیرات کا محتاج نہیں رہتا۔ یہ انہیں پہلے گھروں سے نکالتا ہی نہیں ہے جن کو چھڑانے کے لیے پھر تم خیرات کے پیسے جمع کرتے ہو۔ مذہب ان نیکیوں کا جو ثواب ہے' وہ ایک بنک کی کتاب میں جو کریڈٹ (Credit) ''بہی کھاتے میں جمع رقوم'' اور Debit (بہی کھاتے میں خرچ شدہ رقوم) کی ہوتی ہے' اس میں جمع کرتا چلا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس خیرات کا اتنا ثواب ہے' اس خیرات کا اتنا ثواب ہے۔ غلط نظام کی وجہ سے جو کچھ آ رہا ہوتا ہے' Credit ''بہی کھاتے میں جمع رقوم'' ہوتا ہے' اس کو وہ گناہ قرار نہیں دیتا' اس لیے Debit (بہی کھاتے میں خرچ شدہ رقوم) کی طرف تو یہ چیز نہیں ہوتی' Debit (بہی کھاتے میں خرچ شدہ رقوم) کی طرف ان کے کچھ اور قسم کے گناہ ہوتے ہیں۔ وہ جو بنیادی جرم ہیں کہ اس

کی وجہ سے انہیں اس حالت میں پہنچا دیا' یہ جرم ان کے Debit (بہی کھاتے میں خرچ شدہ رقوم) کی طرف کہیں نہیں آتا۔ ان کے ہاں کی یہ جو چھوٹی موٹی چیزیں ہیں' وہ بھی انفرادی ہوتی ہیں مثلاً شراب پی لی' کہیں جوا کھیل لیا' کوئی اس قسم کی جو چیزیں ہیں یہ انہوں نے معائب میں گنا دیں اور اس کے لیے ایک پیسے نے ان کو اتنی نیکیاں دے دیں کہ ان کا پلڑا شام کو جھکتا چلا جائے۔ وہ کہتا ہے ٹھیک ہے' شروع میں ہی یہ کہا گیا تھا کہ یہ جو اس طرح کے ہوں ان کی مدد کرنا ضروری ہے۔

دین کے نظام میں طبقاتی تقسیم نہ ہونے کی وجہ سے انسانیت خیرات کے ٹکڑوں کی محتاج ہی نہیں رہتی

پہلی چیز تو یہ لیجیے کہ یہ جو اس قسم کے ہیں جن کی مدد کرنا وہ خود کہتا ہے' جب یہی نہیں رہیں گے تو پھر ان کی یہ مدد کیسے کہتا ہے؟ کیا قرآن ان کی موجودگی کو تسلیم کرتا ہے؟ پہلے یہ سوچ لیجیے کہ یہ کیسے ہے؟ یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! قرآن میں بھی تو ان چیزوں کی تلقین ہے۔ ابھی ابھی اس آیت کے اندر یہ چیز آئی ہے کہ یتیموں کو' مساکین کو یہ دیا کیجیے۔ سن لیجیے! پہلے تو یہ ہے کہ جب بھی کسی معاشرے سے دین اپنا آغاز کرتا ہے' اس معاشرے میں حالت یہ موجود ہوتی ہے۔ یہ ایک دن کے اندر اپنا نظام متشکل نہیں کر سکتا' اسے اپنے آخری نظام تک' آئیڈیل تک' جانے کے لیے ایک وقت لگتا ہے۔ یہ جو درمیانی دور ہوتا ہے جو عبوری دور (Interim Period) ہوتا ہے' اس میں یہ لوگ موجود ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ جن کے پاس زیادہ ہے' ان سے تو کم ہوتا چلا جائے اور جن کے پاس نہیں ہے' ان کے پاس آتا چلا جائے۔ اس عبوری دور (Interim Period) میں وہ یہ کرتا ہے اور آہستہ آہستہ نظام کو بدلتا چلا جاتا ہے۔ جس وقت وہ نظام کو بدل دیتا ہے' اس وقت یہ دو کلاسز باقی ہی نہیں رہتیں۔ اس معاشرے کے اندر طبقات کی تقسیم ہی نہیں ہوتی۔ اور یا اپنے معاشرے سے باہر جو باقی دنیا ہوتی ہے' اس میں تو ابھی یہی چیز ہوتی ہے۔ وہ اپنی اس امداد کو اپنے معاشرے کے افراد تک ہی محدود نہیں رکھتا۔ کوشش تو اس کی یہی ہوتی ہے کہ اپنے معاشرے سے باہر بھی یہ جو نظام ہے اس کو متشکل کرے لیکن یہ تو ممکن نہیں ہوتا یا کم از کم سہل نہیں ہوتا۔ یہ اپنے معاشرے سے باہر جو قسم قسم کے لوگ ہیں' یہ ان کی بھی مدد کرتا ہے لیکن دین کا معاشرہ وہ ہوتا ہے جس میں طبقات کی یہ تقسیم باقی ہی نہیں رہتی۔ اس میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی محتاج ہے اور کوئی تونگر ہے۔ تونگر جو ہے وہ محتاج کی مدد کرتا ہے۔ اس معاشرے کے اندر نظام ایسا ہوتا ہے' دولت کی تقسیم ایسی ہوتی ہے کہ اس میں نہ کوئی مفلس اور محتاج ہوتا ہے' نہ کوئی اتنا تونگر ہوتا ہے کہ اس کے پاس ضروریات سے اتنا زیادہ بچا ہوا ہو۔ قرآن نے بتایا ہے کہ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (2:219) پوچھتے ہیں کہ اس آئیڈیل نظام کے اندر جن کے پاس زائد ہے انہیں کتنا دوسروں کو دے دینا ہوگا؟ کہا کہ جتنا ان کی ضرورت سے فارغ ہے' زیادہ ہے' وہ سب دوسروں کے لیے دے دینا ہوگا۔ طبقات' آپ دیکھتے ہیں کہ کس طرح سمٹ کر لیول (برابر) ہو جاتے ہیں۔

''جتنا کسی سے ہو سکے کر لینا چاہیے'' کا یہ تصور نفسیاتی تقسیم اور طبقاتی نظام کو جنم دیتا ہے

مذہب کی دنیا میں یہ دو چیزیں ہیں۔ جب ان سے یہ کہا جائے کہ بھئی! یہ کچھ جو تم کرتے ہو یہ کیوں کرتے ہو؟ تو کہا یہ جاتا ہے کہ ٹھیک ہے جی۔ لیکن آپ سوچیے کہ اس سارے ضابطۂ اخلاق کے اوپر کون عمل کر سکتا ہے' جتنا کچھ کسی سے ہو سکے کر لینا چاہیے۔ یہ آپ کے ہاں بھی مسلمہ ہے کہ جتنا کسی سے ہو سکے کر لینا چاہیے۔ بالآخر قرآن کے اندر اس کا بھی تو حکم ہے کہ خیرات دیا کرو' محتاجوں کی مدد کیا کرو۔ یہ اتنا تو ہے۔ اور وہ جو چیز ہے کہ جتنا تمہارے پاس زائد ہے' وہ سارا دیدیا کرو تا کہ وہ تقسیم ختم ہو جائے۔ او بھئی! دیکھو' جنا کوئی کر سکے میاں! گل تے اے ہیگی اے بس۔ اے ویکھنا چاہیدا ہیگا پئی' اے کناں کوں کر سکدا ہیگا[1]''۔ بظاہر یہ بات نظر آتی ہی ٹھیک ہے۔ دونوں قسم کی یہ چیزیں موجود ہیں' اتنا کر لینا چاہیے' نظام کے بدلنے کی بات نہیں ہے' غلط نظام کے اندر یہ جتنا کرتا ہے کر لینا چاہیے۔

سنیے' عزیزانِ من! قرآن کیا کہتا ہے؟ مذہب میں تو یہ ہے کہ یہ جتنا کچھ کر رہا ہے اس کا تو اس کو بہر حال ثواب مل جاتا ہے۔ یہ کچھ تو اس نے کیا' اس سے نیکی کے پلڑے میں بات کچھ آ گئی۔ یہ Credit (اندراج) اور Debit (اخراج) والی بات ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہ Concept (تصور) مذہب کا ہے۔ سنیے! قرآن کی باقی آیت جو میں نے کہا تھا کہ عظیم چیز ہے۔ کہا کہ **اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَ تَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ** (2:85)۔ ضابطۂ خداوندی کے حصے بخرے کر دیئے ہیں کہ ان میں سے کچھ حصے کے اوپر تو ایمان لے آؤ اور جو کچھ حصہ ہے' اس سے انکار کر لو۔ مذہب کی دنیا تو یہی کہتی ہے کہ جتنا کر سکو کر لو۔

کتاب کے ایک حصے پر عمل اور دوسرے حصے سے انکار کا نتیجہ جہنم ہے

عزیزانِ من! دین یہ نہیں کہتا۔ نظام یا باطل کا ہے یا حق کا ہے' ان دونوں کے اندر نہ مفاہمت Compromise ہو سکتی ہے' نہ اس میں پیوند لگ سکتا ہے۔ کہا ہے کہ **اُدۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً** (2:208)...... نظام جو تم نے عائد کرنا ہے' یہ نظام پورے کا پورا عائد ہوگا۔ کہا ہے کہ کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو' کتاب کے معنی ضابطۂ زندگی کے ہیں' اور ایک حصے سے تم انکار کرتے ہو۔ مذہب کہتا ہے کہ ہاں! ایسا کرنے سے جتنے حصے کے اوپر تم عمل کر رہے ہو' ایمان رکھ رہے ہو' اتنے کا تو تمہیں ثواب مل جائے گا' اور ہو سکتا ہے کہ یہ جو ثواب ہے تم زیادہ کما لو۔ سنیے! اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ پھر سن لیجیے کہ قرآن نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے کہ ایک حصے کے اوپر ایمان رکھ کر اس کے مطابق تو عمل کیا جاتا ہے' اس کا تو کچھ ملنا چاہیے۔ قرآن بتاتا ہے کہ **فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ** (2:85) تم میں سے جو بھی ایسا کرے گا' اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ دیکھتے ہیں جو اس جملے کی Construction (ترکیبِ

---

[1] جتنا کوئی کر سکے۔ ارے میاں صاحب! بات تو یہ ہے بس۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ کتنا کچھ کر سکتا ہے۔

جملہ) ہے کہ اس کے سوا ایسی روش کا کوئی نتیجہ نہیں ہوگا۔ کیا نتیجہ ہوگا؟ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اس کا نتیجہ وہ ہوگا کہ اس کے ایک پلڑے میں یہ نیکیاں ہوں گی دوسرے پلڑے کے اندر وہ کچھ خرابیاں ہوں گی مگر کہا ہے کہ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ **اِلَّا خِـــزۡیٌ فِـــی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا** (2:85) اس دنیا کی زندگی کے اندر ذلت اور خواری ہوگی **وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ** (2:85) اور قیامت کے دن اس سے بھی زیادہ سخت عذاب کی طرف کھینچے ہوئے چلے جاؤ گے۔ اس حصے کا کوئی کریڈٹ (Credit) نہیں مل رہا جس پر یہ ایمان لایا ہوا ہے۔ یہ Credit (تسلیمانی نشان) مل ہی نہیں سکتا۔ انسان کی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے' یہ Indivisible Whole (ناقابل تقسیم وحدت) ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ اس بازو کو اس حصے سے کاٹ دیں تو یہ بازو بھی زندہ رہے۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ اندر کے ایک ٹکڑے' جگر کو نکال کر آپ الگ رکھیں تو جسم بھی زندہ رہے اور جگر بھی زندہ رہے۔ یا ان میں سے ایک مرے' دوسرے کا کچھ نقصان نہ ہو۔

عزیزانِ من! وہ جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ نظام تو ایک ڈاکٹر کے نسخے کے مشابہ ہوتا ہے' اس میں پانچ سات دوائیاں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ کبھی ایسا کر کے آپ نے دیکھا ہے کہ وہ جو دوائیوں کا نسخہ ہے اس میں سے تین چار دوائیاں سستی سستی جو ہوں' وہ لے لو اور اس کے بعد باقی جو اس نے چھ نشان لگائے ہیں' اس میں پانی ڈال لو' چھ ڈوز (خوراک) تو ہو گئے۔ اب اس کے پینے کے بعد کہو کہ صاحب! کم از کم 33% فائدہ تو ہوگا ہی' میں نے نو میں سے تین دوائیاں تو لے لی تھیں۔ کیا یہ 33% فائدہ ہوگا یا شام کو یہ بخار نمونیے میں بدل گیا ہوگا؟ یہ جو تین دوائیاں آپ نے پی ہیں' یہ آپ کا اور نقصان کر دیں گی۔ اس نے تو اس کے اندر یہ چیز رکھی تھی کہ اس نے یہ کرنا ہے' یہ یوں کرے گی' یہ یوں کرے گی۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس نے کاغذ قلم لیا اور یونہی الل ٹپ پانچ سات نو دس دوائیاں لکھ دیں تاکہ سمجھا جائے کہ میں بہت بڑا ڈاکٹر ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔

برادرانِ عزیز! دوائیاں ہی نہیں' اس نے تو اس کے اندر جو وزن لکھا ہوا ہوتا ہے' اس میں بھی اگر آپ چند ڈراپس (قطروں) کی کمی کر دیں پھر بھی وہ نقصان دے جائے گی۔ کہا کہ **خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ** (2:85)۔ یہ اس وقت تو Immediate (فوری) مرض ہے' اس جسم کے اندر پتہ نہیں یہ مرض کیا کر دے اور معلوم نہیں کہ فیوچر (مستقبل) میں تمہارے جسم کے اوپر کیا اثر پیدا کر دے مثلاً اس نے آرسنک (سنکھیا) کے دس قطرے لکھے ہوئے ہیں' اس میں پچاس ڈال دیجیے' کیونکہ ''ستا البھدا اے [1] جی!'' اور جو اس کے بعد اس نے باقی لکھے ہوئے ہیں' ان کو ختم کر دیجیے اور جا کر اسے پی لیجیے' نتیجہ ظاہر ہے۔ یاد رکھیے! نظام کلی ہوتا ہے' نظامِ مملکت یا تو کلی ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔

---

[1] یہ سستے داموں ملتا ہے۔

انسانی زندگی کے حصے بخرے نہیں کیے جاسکتے' یہ تو پوری کائنات کی طرح ایک وحدت ہے

مذہب جزوی ہوتا ہے' اس کے کسی حصے کے اوپر بھی آپ عمل کر سکتے ہیں۔ صبح کے وقت اٹھے' آپ نے نہایت اطمینان سے منہ ہاتھ دھویا یا غسل کیا۔ مندر والے نے مندر میں' مسجد والوں نے مسجد میں' گرجا والوں نے گرجا میں' کسی نے گھنٹی بجائی' کسی نے Hymn (مُناجات) گائیں' کسی نے قرأت پڑھی' جھومے' اس کے بعد دعا مانگی' یہ سارا کچھ کیا اور بس۔ یہ سب کچھ کر کے مصلّٰی دیا ٹھپ' مذہب کے اس حصے کے اوپر ہوا عمل' باہر نکلے' اب جو باقی حصہ ہے تو کہا کہ ''اوئے تو جھوٹ بولنا ایں فریب دینا ایں؟ میاں! اے دنیا داری دا معاملہ ہیگا وے کہ بھئی! ایہد ے متعلق وی آیا اے کسے نوں دھوکا نہ دیو۔ سارے قرآن تے کن عمل کتا میاں! جنے جوگا کوئی ہووے کر لینا چاہیدا ہیگا۔ اے جنے جوگا سی کر لیا اے نا اوس نے ❶۔''

برادرانِ عزیز! یہ بات تو کئی دفعہ سامنے آئی ہے لیکن ہے اتنی دلچسپ کہ ہر بار دہرانے کو جی چاہتا ہے اور اس لیے بھی کہ سامعین میں شاید وہ ہیں جن کو دیکھ کر یاد آ جاتا ہے کہ انہیں یہ بات سنائی ہوئی ہے۔ ''اک دکاندار کسے نال سودا کر آیا۔ آن کے اپنے منڈے نال گل کتی۔ او ہنے کہیا: اے کر آئے ہیگے او؟ ایہد ے اچ تے بڑا نقصان ہو جانا اے ❷۔'' وہ ابھی بچہ تھا۔ کہن لگا: گھبرانا کیوں ہیگا ایں؟ کہن لگا: جی گھبراواں کیوں نہ؟ ایہد ے اچ بیڑہ غرق ہو گیا' ایہد ے اچ ایناں نقصان ہو گیا۔ کہن لگا: اوے! گھبرانا کیوں ہیگا ویں؟ کہن لگا: ہن ایہد ے بعد کی ہووے گا؟ کہن لگا: اسی رپھڑ پادیاں گے' گل کیہڑی ہیگی؟ او کہن لگا کہ فیر چھیتی کرو۔ کہن لگا: او چھیتی والی گل نئیں ہیگی' کل کر لواں گے۔ او کہن لگا: ہن کیوں نئیں جاندے؟ کہن لگے: ہن میری عصر دا ویلا تنگ ہوندا جاندا اے ❸۔'' عزیزانِ من! یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ ''اے عصر دا ویلا تنگ ہوندا جاندا اے'' ❹۔

---

❶ اے! تم جھوٹ بولتے ہو' فریب دیتے ہو؟ (کہا کہ) میاں! یہ دنیاداری کا معاملہ ہے۔ (جواب دیا) کہ بھئی! اس کے متعلق بھی یہ ہے کہ کسی کو دھوکا نہ دو (کہنے لگے کہ) میاں! سارے قرآن پر کس نے عمل کیا! جو جتنا کرنے کے لائق ہو' اسے کر لینا ہے۔ یہ جتنے کے لائق تھا' سو اس نے کر لیا۔

❷ ایک دکاندار کسی سے سودا کر آیا۔ آ کر اس نے اپنے لڑکے کے ساتھ بات کی۔ لڑکے نے کہا: یہ آپ کیا کر آئے ہیں؟ اس میں تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔

❸ کہنے لگا کہ تم گھبراتے کیوں ہو؟ لڑکے نے کہا کہ جی کیوں نہ گھبراؤں' اس میں تو بیڑہ غرق ہو گیا۔ اس میں تو اس قدر نقصان ہو گیا۔ کہنے لگا کہ اوئے! نہ گھبراؤ۔ لڑکے نے پوچھا کہ اب اس کے بعد کیا ہوگا؟ (باپ) کہنے لگا کہ ہم بکھیڑا ڈال دیں گے' رولا ڈال دیں گے۔ یہ بات ہی کونسی ہے؟ وہ لڑکا کہنے لگا کہ پھر جلدی کرو' رولا ڈالو۔ باپ کہنے لگا کہ یہ جلدی کرنے والی بات نہیں ہے' کل کر والیں گے۔ وہ لڑکا کہنے لگا کہ اب' اسی وقت کیوں نہیں جا کر یہ کچھ کرتے؟ باپ نے کہا کہ اب میری نمازِ عصر کا وقت تنگ ہوا جاتا ہے۔

❹ یہ نمازِ عصر کا وقت تنگ ہوا جاتا ہے۔

یہ کسی ایک فرد کی بات نہیں' یہ مذاق کی بات نہیں' مذہب کا سارا دارومدار اس کے اوپر ہے۔ وہ کام تمہارے ہاں کا سودا ہے' یہ دنیا کا کام ہے' اس میں وہ چیز اسی طرح کرنی ہے۔ یہ جو مذہب کا معاملہ ہے وہ خدا کے ساتھ معاملہ ہے ''عصر دی نماز اپنے ویلے سر پڑھنی ہیگی اے۔ جے اے وی نئیں پڑھیاں گیاں' تے اوہدے بعد جیس ویلے اپناں کچھ کٹھا کر لیا ہیگا اوہدے بعد حج کر آئے''❶۔ حج کرنے کے بعد ایسے ہوتا ہے جیسے آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ چل بھئی! ''پچھلا جو کچھ سارا اسی او تے زم زم دے پانی اچ روڑ آیا نا''❷۔

جو قوم مذہبی طور پر جس قدر پختہ ہوگی دنیا کی قوموں میں وہ اتنی ہی ذلیل متصور ہوگی

دیکھ رہے ہیں آپ کہ یہ کیا چیز ہے؟ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ کہا ہے کہ **فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (2:85)۔ عزیزانِ من! اس آیت کا یہ ٹکڑا لیجیے کہ **خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (2:85)۔ جس جس قوم کے اندر مذہب جتنا زیادہ شدید رہا ہے' اتنی ہی وہ قوم دنیا میں ذلیل رہی ہے۔ دنیا کی تاریخ پہ نگاہ دوڑا کر دیکھ لیجیے۔ جو قوم مذہب کو چھوڑتی گئی ہے' چھوڑنے کے بعد دو صورتیں ہوسکتی تھیں کہ یا تو وہ دین کی طرف آتی اور اگر یہ نہیں آئی ہے تو کم از کم مذہب کو چھوڑ دیتی' خالص دنیا دار بن جاتی۔ جو قوم مذہب کو چھوڑ کر دنیا دار بھی بن گئی ہے کم از کم دنیا کے اندر وہ ذلیل نہیں رہی۔ جس نے دین اختیار کیا ہے' اس کا تو پوچھو ہی نہیں کہ پھر کیا ہو گیا! مذہب کو چھوڑ کر دین اختیار کرنے والے' چودہ سو سال پہلے کی تاریخ لیجیے۔ ہمارے لیے مشکل ہی یہ ہے کہ اس سے ورے اب ہم کچھ مثال بھی نہیں دے سکتے لیکن میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جو چیز قرآن نے کہی ہے کہ **خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (2:85)۔ صرف مجرد مذہب کو چھوڑ کر عقل و فکر کی بنیادوں کے اوپر جس قوم نے اپنے معاملات سنوارنے شروع کر دیئے' اس کے ہاں بھی **خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (2:85) والی بات نہ رہی اور آج بھی آپ دیکھیے گا جو قوم جتنے جتنے درجے تک مذہب پرست ہے' اتنے ہی درجے تک دنیا کے اندر وہ ذلیل ہو رہی ہے۔

ملکی حالات کے پیش نظر معاشی نظام کے علاوہ خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت

آپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ساری دنیا سے آپ ایک ایک چیز کے لیے بھیک مانگ رہے ہیں۔ یہ خالص ذمہ داری آپ کی مذہب پرستی کی ہے۔ جونہی کسی طرح سے آپ نے یہ آواز اٹھائی صاحب! یہاں دولت کی تقسیم غلط نہیں ہونی چاہیے' صحیح ہونی چاہیے' آوازیں آنے لگیں کہ یہ کمیونزم ہے' سوشل ازم ہے' یہ ملحد ہیں' دہریئے ہیں۔ مذہب کا طبقہ اس کے خلاف اٹھ کر کھڑا ہو گیا' یہ اس کی طرف

---

❶ نمازِ عصر اپنے مقررہ وقت پر پڑھی ہے۔ اگر یہ نمازیں نہیں پڑھی گئیں تو اس کے بعد جس وقت اتنا کچھ اکٹھا کر لیا تو حج کر آئے۔

❷ پچھلا جو کچھ کیا دھرا تھا وہ زم زم کے پانی سے دھو ڈالا (رات پی زم زم پہ مے اور صبحدم دھوئے دھبے جامۂ احرام کے)

آنے ہی نہیں دیتا' کہہ دیا جاتا ہے کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں' خدائی دعویٰ کرتے ہیں۔ آپ کو مذہب کی دنیا کہہ رہی ہے۔ بر سبیلِ تنزل اتنا کہا گیا کہ اچھا بھئی! ہم کوشش کرتے ہیں کہ کچھ زیادہ غلہ پیدا کریں تم کم از کم ہمارے ساتھ اتنا ہی تعاون کرو کہ ہمارے ہاں اولاد کم پیدا ہو' بچے کم پیدا ہوں۔ چلیے! یہ بھی جو ایک تفصیل ہے' اس میں کسی بڑی حد تک اس کے اندر بھی اصلاح ہو سکتی ہے۔ 'غلہ زیادہ اگاؤ' کے متعلق تو ایک آواز مذہب کی طرف سے نہیں نکلتی کہ شاباش! بڑا کچھ کام کیا۔ 'اولاد کم پیدا کرو' کے خلاف اتنی مہم چلائی جا رہی ہے جیسے کہ یہاں کفر الحاد' بے دینی کی رو بہہ رہی ہے۔ سڑک کے اوپر اگر خاندانی منصوبہ بندی کا بورڈ لگا ہوا ہوتا ہے تو اسے اکھیڑ پھینکتے ہیں' پھر اس جہادِ عظیم کے اوپر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہیں یعنی کیا کام کیا؟ ''ہور سور ماں و دھاندے ترے گئے ❶'' میں پوچھتا یہ ہوں کہ غلہ پیدا کرنے کی جتنی کوشش آپ کر لیں گے اگر اس کے مقابلے میں آپ یہ جو چیز ہے' یہ کرتے رہیں گے کہ Eat (کھانا) کرنے والے جو Mouth (منہ یعنی افراد) ہیں' جو کھانے والے ہیں' وہ اگر (Geometric Progession) ❷ سے بڑھاتے چلے جائیں گے' تو پھر آپ کو بھیک مانگنی پڑے گی۔ کہا ہے کہ **خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا** (2:85)۔ جہاں مذہب نہیں ہے' وہاں تو وہ یہ بات نہیں کریں گے۔ وہاں تو وہ دیکھ لیں گے کہ اتنی پیدائش' اتنی آبادی ہے تو آبادی پہ کنٹرول کرو' پیدائش پہ کنٹرول کرو **خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا** (2:85) سے بچ جائیں گے۔ دیکھا! ایک حصے پہ عمل کرنا' دوسرے حصے کو چھوڑ دینا' کیا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ ٹھیک کہا تھا اقبالؒ (1938-1877ء) نے کہ:

یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

عزیزانِ من! کفر بھی اپنا نتیجہ رکھتا ہے۔ شعلۂ مستعجل ہوتا ہے لیکن نتیجہ رکھتا ہے اور دین کے نتائج کا تو پوچھتے کیا ہیں! اس کے لیے کہا ہے کہ **کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ** (14:24) وہ شجرِ طیب کہ جس کی جڑیں پاتال میں ہوتی ہیں' اس کی شاخیں آسمان میں بھولے جھول رہی ہوتی ہیں۔ کفر کے متعلق بھی قرآن نے یہ کہا ہے کہ ٹھیک ہے' یہ اپنے نتائج اس دنیا کے اندر دے دیتا ہے' وہ مستعجل ہوتے ہیں اور قرآن نے کہا ہے کہ **کُلًّا نُّمِدُّ ھٰٓؤُلَآءِ وَ ھٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّکَ** (17:20) وہ اگر طبعی قوانین کے تابع کچھ کرتا ہے جو ہمارے دوسرے قوانین کو نہیں بھی مانتا' ہم اس کے راستے میں پھاٹک نہیں لگا دیتے کہ ہم تمہاری کھیتی نہیں اُگنے دیں گے۔ **وَ مَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحْظُوْرًا** (17:20) ہم ان کے راستے میں پھاٹک نہیں لگا دیتے۔ وہ Physical Laws (طبعی قوانین) کے تابع' فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے' اس کے نتائج لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے ہم یہ کبھی نہیں کرتے کہ ان کو اس حصے

---

❶ مزید بچے پیدا کرتے چلے گئے۔

❷ ہندسی سلسلہ' ایک سلسلہ جس میں رقمیں ایک مشترک نسبت کے ساتھ کم ہوتی ہیں یا بڑھتی ہیں' جیسے......64`32`16`8`2,4

سے روک دیں۔ یہ ہیں کفر کے نتائج۔ مذہب' دنیا کے اندر کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔ اس لیے کہا ہے کہ **اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ** (2:85)۔ قرآنِ کریم نے یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم قرار دیدی ہیں یعنی **خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا** (2:85)۔ جو قوم اس دنیا کی زندگی کے اندر ذلیل اور خوار ہوگی' وہ کہتا ہے کہ اُخروی زندگی کے اندر عذاب کے اندر مبتلا ہوگی۔ یہ تو ہماری تقسیم ہے' یہاں اور وہاں کی زندگی کی تو یہ تقسیم ہے ہی نہیں' زندگی تو مسلسل چلتی ہے۔ کہا ہے کہ **مَنۡ کَانَ فِیۡ ہٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی** (17:72):

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

دینِ خداوندی کے بلندترین مفسر نبی اکرم ﷺ کا ایک فرمان' جو نوعِ انسانی کے ہر فرد کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ بنا رہے گا

یہ امروز وفردا کی بات تو لمبی ہے' قرآن ہی کے ان حقائق کے سب سے بلندترین مفسر نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ **من استوی یوماہ فھو مغبون** ❶. کتنی عظیم چیز ہے' تم تو لمبے حال اور مستقبل کہتے ہو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کے دو دن یکساں گزر گئے' جس کا آج' کل کے مقابلے میں آگے نہیں ہے' سمجھو وہ تباہ ہوگیا۔ اس لیے جو حیاتِ دنیا کے اندر خِزۡیٌ ہے' وہ قیامت کے اندر عذاب کے اندر ہو جاتا ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ نظامِ حیات کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے والوں کا انجام

عزیزانِ من! یہ ہے نتیجہ۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کس چیز کا نتیجہ ہے؟ یہ اس چیز کا نتیجہ ہے جو کہا ہے کہ **اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَ تَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ** (2:85)۔ یہ وہ نہیں ہیں' جنہوں نے پوری کتاب سے انکار کیا ہوا ہے' وہ تو خالصتاً ملحد اور بے دین ہوگئے جنہیں آپ

---

❶ جس کا کل (Yesterday) اور آج (Today) ایک جیسا ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ تباہ ہوگیا۔

کافر کہتے ہیں، یہ وہ ہیں جنہوں نے ایمان رکھا ہوا ہے لیکن اس کے ٹکڑے کر دیئے ہیں، جب دین کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں تو وہ مذہب بن جاتا ہے۔ پھر یہ نہیں ہوتا کہ اس کا اپنا ایک حصہ Proportionately (ایک تناسب سے) آپ کو فائدہ دیدے اور جو دوسرا حصہ ہے اس کا نقصان ہو۔ وہ پورے کا پورا خراب ہو جاتا ہے۔ دودھ میں تو ایک چھینٹ دہی کی پڑی ہوئی ہو تو سارا دودھ ضائع ہو جاتا ہے۔ آپ اس میں سے Proportionately (اس کے تناسب سے) فائدہ گن رہے ہیں۔ اس سے 99% نکال لیجیے کیونکہ جس میں آپ نے 1% دہی ڈالا تھا، یہ نہیں ہوسکتا، وہ دودھ نہیں نکل سکتا۔ آپ کو پورے کا پورا نظام متشکل کرنا ہوگا۔ اپنے آپ کو دھوکے میں نہ رکھیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔

آپ نے غور فرمایا، یہاں کہا ہے کہ وَ مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ (2:85) جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے غافل نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کچھ ہوتا کیوں ہے؟ اس قسم کی چیزیں کیوں ہوتی ہیں؟ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا بِالۡاٰخِرَۃِ (2:86) حقیقت میں، یہ لوگ جو بظاہر نظر آتے ہیں کہ دین کے ایک حصے کے اوپر تو عمل کر رہے ہیں، نظر ایسا آتا ہے کہ یہ لوگ ایمان والے ہیں اور ایمان میں جسے ہم ایمان بالآخرت کہتے ہیں، وہ بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بات نہیں ہے۔ ان کے سامنے صرف دنیا کے مفاد ہوتے ہیں اور یہ فریبِ نفس ہوتا ہے جو انہوں نے مذہب کا حصہ ساتھ لگا رکھا ہوتا ہے۔ انہوں نے مستقبل کو بیچ دیا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ کہا ہے کہ فَلَا یُخَفَّفُ عَنۡہُمُ الۡعَذَابُ وَ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ (2:86)۔ مذہب کی دنیا میں گرے ہوئے لوگوں کی دنیاوی زندگی بھی ذلیل ہوتی ہے۔ کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لیں، وہ اس تباہی سے نکل ہی نہیں سکتے اور مدد کے لیے یقیناً دوسروں کو پکاریں گے۔ ٹھیک ہے ان کی مدد ہوگی۔ اگر یہ اس فریب میں رہتے ہیں کہ یہ ہمارے دوست اور مددگار بن گئے ہیں تو یہ بالکل غلط ہے، فریب ہے، کوئی ان کا دوست نہیں ہوسکتا۔ عزیزانِ من! ذلیل کا دنیا میں کون دوست ہوسکتا ہے۔ یہ دوستی نہیں ہوتی۔ جس بھکاری کو آپ خیرات دیتے ہیں کیا آپ اس کے دوست بنے ہوئے ہیں؟ اس کے دوست نہیں ہوتے۔ کہا ہے کہ تمہاری یہ کیفیت تھی۔ دیکھ لیا عزیزانِ من! کہ اقوامِ سابقہ کی داستانیں بیان ہوتی ہیں اس کے اندر قرآن ابدی حقائق بیان کرتا ہے۔

بنی اسرائیل کے سلسلہ میں کتبِ سابقہ کا ذکر اور تورات کی نوعیت

بنی اسرائیل کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کہا ہے کہ وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَ قَفَّیۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ بِالرُّسُلِ (2:87) موسیٰ علیہ السلام کو ضابطۂ ہدایت دیا اور میں ضمناً یہ عرض کر دوں، بعض دفعہ اور عام طور پر بھی یہ کہا جایا کرتا ہے کہ یہ جو تورات ہے یہ کتاب موسیٰ علیہ السلام ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف تورات نازل ہوئی یاد رکھیے! قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے، قرآن میں کتابِ موسیٰ علیہ السلام کا نام نہیں ہے۔ اسے

یہاں کتابِ موسیٰ علیہ السلام کہا گیا ہے' دراصل قرآنِ کریم میں صرف صحف کہا گیا ہے: صُحُفِ اِبۡرٰهِیۡمَ وَمُوۡسٰی (87:19) اور یہ بڑی چیز ہے۔ جو آپ کے ہاں کی بائبل ہے' اس کے دو حصے New Testament & Old Testament (عہد نامۂ جدید اور عہد نامۂ عتیق) ہیں۔ عہد نامۂ جدید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جتنی چار کتابیں ہیں' وہ شامل ہیں' عہد نامۂ عتیق وہ ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے تک کے تمام انبیائے بنی اسرائیل کے صحیفے شامل ہیں۔ یہ جو ان تمام انبیاء کے صحیفوں کا مجموعہ ہے اسے تورات کہا جاتا ہے۔ یہ مجموعہ 39 کتابوں پر مشتمل ہے اور اسے علمائے یہود تین سلسلوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ کتابِ موسیٰ علیہ السلام کا نام تورات نہیں ہے۔

میں نے یہ اس لیے کہا کہ آپ احباب کو عام طور پہ تو اس سے دلچسپی نہ ہوگی۔ بعض احباب کو اگر یہ دل چسپی ہوتی ہے تو یہ احمدی حضرات کی طرف سے ایک چیز کہا کرتے ہیں کہ صاحب! بغیر کتاب کے نبی آیا کرتے ہیں اور اس کے لیے ایک دلیل ان کے پاس ہوتی ہے کہ قرآن میں یہ ہے کہ انبیاء آیا کرتے تھے' وہ تورات کے مطابق احکام جاری کرتے تھے یا فیصلے دیا کرتے تھے۔ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ دیکھیے! انبیا کا ذکر ہے اور وہ تورات کے مطابق فیصلے دیتے تھے اور تورات حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے تو گویا ان انبیا کے پاس اپنی کتابیں نہیں تھیں' جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تھی' اس کے مطابق یہ فیصلے دیتے تھے۔ اس لیے ایسا نبی آ سکتا ہے جو اپنے پہلے کسی نبی کی بڑی کتاب کے مطابق فیصلے دے۔ اسی طرح سے یہ مرزا صاحب[1] آئے تھے' قرآن کے مطابق فیصلہ دیتے تھے۔ آپ دیکھتے ہیں' کہ یہ کتنے الجھاؤ میں ڈالنے والی بات ہے اور بات اصل میں یہ ہے کہ جنہوں نے ابتداً ان کے ہاں یہ خدا سے علم پانے کا دعویٰ کیا اور جو پھر اس کی تبلیغ کر رہے ہیں' ان کو اتنا بھی علم نہیں ہے کہ قرآن میں کتاب موسیٰ علیہ السلام کو تورات کہیں نہیں کہا گیا ہے۔ کتابِ موسیٰ علیہ السلام ہی دراصل صحیفۂ موسیٰ علیہ السلام ہے۔ عہد نامۂ عتیق میں بھی اس کے متعلق جو ہے وہ یہ ہے کہ اس میں پانچ کتابیں (اسفار) شامل ہیں۔ یہ ہیں' پیدائش' خروج' احبار' گنتی اور استثنا۔ یہ پانچ جو ان کے ہاں الگ صحیفے ہیں الگ ان کو یہ کتب موسیٰ علیہ السلام کہا گیا' تورات ان کو بھی نہیں کہا گیا۔

قرآنِ حکیم میں کتاب موسیٰ کا نام تورات نہیں ہے

یاد رکھیے گا قرآن کی رو سے تورات انبیائے بنی اسرائیل پر جو مختلف کتابوں کا مجموعہ ہے' اسے کہا گیا ہے' کتابِ موسیٰ علیہ السلام کو تورات نہیں کہا گیا۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل تورات کے مطابق احکام دیا کرتے تھے' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر نبی کا جو اپنا صحیفہ ہوتا تھا' جو کتاب ہوتی تھی' جو شریعت ہوتی تھی' اس کے مطابق وہ احکام دیتے تھے۔

---

[1] یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی (1835 تا 1908ء) کی طرف ہے۔

یہ تاثر غلط ہے کہ نبی بغیر کتاب کے بھی آتا تھا

برادرانِ عزیز! ضمناً بات آ گئی۔ یہ احمدی حضرات کہا کرتے ہیں کہ صاحب! حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب ملی' دیکھیے! حضرت ہارون علیہ السلام ساتھ آئے وہ بغیر کتاب کے تھے۔ میں نے کہا ہے کہ ان لوگوں کا علم تو یہ ہے کہ ان کے ہاں وہ ایک پاکٹ بک ہوتی ہے' اس کے اندر ان لوگوں نے' ان کے ہاں کے جو بڑے ہیں' چند باتیں لکھ دی ہوتی ہیں' ان کا سارا علم اس پاکٹ بک کو یاد کرنے پہ ہوتا ہے۔ اس میں یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو کتاب ملی' ہارون علیہ السلام کو نہ ملی۔ ان کے مقابلے میں وہ ہوتے ہیں' جن بیچاروں کے پاس اتنی سی پاکٹ بک بھی نہیں ہوتی ''اوا ے سن کے کہدیں نیں' گل تے ٹھیک ہیگی اے پئی' ٹھیک ہے دو بھرا ہیگے سن۔ اک نوں ملی ہوئی سی کتاب' دوسرے نوں تے نال نئیں ملی ہوئی ہیگی سی۔ نہ قرآن دا ایناں نوں علم' نہ اوہناں نوں [1]۔'' قرآن نے بالتخصیص یہ کہا ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ قرآن ہے' یہ عجیب چیز ہے کہ جو اس قسم کے آنے والے اعتراض ہیں' وہ Deal کیے ہوئے ہیں حالانکہ شاید ضرورت نہ پڑتی۔ کہا ہوا ہے کہ یاد رکھنا! موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دونوں کو ہم نے الگ الگ کتاب دی تھی' قرآن میں یہ لکھا ہوا ہے۔ **وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَ قَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ** (2:87)۔ اس کے بعد پھر اور رسول آتے گئے۔

قرآن حکیم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی عظمت کا تذکرہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے

وَ اٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (2:87)۔ بنی اسرائیل کا جو آخری نبی تھا' اس کا بھی ذکر کر دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آگے چل کر تفصیل آئے گی' تو وہاں ہم پھر یہ سارا دور بھی بیان کریں گے' ان کے متعلق بھی عرض کریں گے کہ یہ کتنی بڑی عظیم انقلابی شخصیت تھے اور پھر وہی جو اس کنونشن [2] میں بھی ہماری ایک طاہرہ بیٹی نے کہا تھا کہ وہ صرف امِ عیسیٰ علیہ السلام ہی نہیں ہیں' وہ بڑی انقلابی عورت ہیں' صاحب! قرآن میں انبیائے کرام علیہم السلام کے ذکر کے ساتھ یہ ایک ہی عورت ہے جس کا یہ ذکر اس شاندار طریقے سے کیا ہے' بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ تو تفصیل کی وہ بات یہ نہیں تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں تھی۔ ان کا اپنا ایک کردار ہے' اپنی شخصیت ہے' حضرتِ مریمؑ کی بڑی عظیم شخصیت ہے' وہ بہت بڑی انقلابی تھیں۔ جبھی تو قرآن انہیں اپنی دفتین میں جگہ دیتا ہے ورنہ قرآن یونہی جگہ نہیں دیتا ہے۔ ''اے ایویں کنئیں کسے دی ماں نوں لیا کے اوہدے اچ بٹھا دینا [3]۔'' یہ بات وہاں آئے گی۔ کہا ہے کہ **اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ** (2:87) اس روح القدس کا- Holy Ghost ترجمہ کیا ہوا ہوتا ہے۔ صدر [4] کا ایک ناول ''جہنمی حور''

---

[1] وہ یہ سن کر کہتے ہیں کہ یہ بات تو صحیح ہے۔ ٹھیک ہے' یہ دو بھائی تھے۔ ایک کو کتاب ملی تھی دوسرے کو نہیں ملی تھی۔ نہ انہیں قرآن کا علم ہے اور نہ انہیں۔

[2] طلوعِ اسلام کی گیارہویں سالانہ کنونشن اکتوبر (10 لغایت 13) 1968ء

[3] یہ یونہی کسی کی ماں کو لا کر جگہ دینے والی بات نہیں ہے۔

[4] اس نام کی تصدیق نہیں کی جا سکی۔

ہوتا تھا' ایک اورناول تھا اس کا نام تھا ''خوبصورت[1] بلا''۔ ''اے خوبصورت بلاواں تے بہت لبھد یاں سن''[2]۔

اس کائنات کے استحکام کا تمام تر دارومدار قانون کی قوت میں مضمر ہے جب کہ وحی کے معنی قوت کے بھی ہیں

میں عرض کروں کہ یہ جو قرآنِ کریم میں روح ہے جب ہم اس آیت کے اوپر آئیں گے تو آپ اس کا قرآنی مفہوم دیکھیے گا۔ لفظِ روح کے (عام) معنی Spirit کیے جاتے ہیں۔ جسے ہم روح کہتے ہیں' اس کے یہی معنی نہیں ہوتے۔ اس کے بنیادی معنی تو ''ایک توانائی'' کے ہوتے ہیں' قوت کے ہوتے ہیں اور یہ بڑی چیز ہے اور قرآنِ کریم نے وحی کو الروح کہا ہے کہ یہ ''بہت بڑی توانائی'' ہے۔ قانون سے بڑی توانائی دنیا میں کہیں نہیں ہوتی۔ برادرانِ عزیز! قوت ہوتی ہی قانون میں ہے۔ آپ قانون کی وہ قوت دیکھتے ہیں جو آپ کے ہاں آج کل یہ نیوکلیر چیز چل رہی ہے' جسے ایٹم کہا جا رہا ہے' یہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ایک قانون ہے اور اس کی قوتوں کا آپ کو اندازہ ہے کہ ایک ایٹم ایسا بھی ہے کہ وہ اگر کہیں انہوں نے چلا دیا تو آپ کی یہ پوری کی پوری صفحۂ ارض بالکل محو ہو کر رہ جائے گی۔ اس کی قوت یہ ہے کہ انسان یہاں سے اب چاند تک تو جانے لگ گیا ہے۔ قانون کی کوئی قوت ہے' انہوں نے اس قانون کو پا لیا ہے۔ روح کا لفظ وحی کے معنوں میں قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ کہا ہے کہ وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ (17:85)۔ اور اس کے بعد پھر قرآنِ کریم نے وہیں یہ کہا ہوا ہے۔

ملائکہ کے سلسلے میں لفظ ''روح'' کی مزید وضاحت اور مفہوم

میں ضمناً یہ چیز عرض کر دوں تاکہ بات صاف ہو جائے کہ قرآنِ کریم میں روح وحی کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہے کہ وَ کَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا (42:52)۔ اور اس طرح سے ہم نے تمہاری طرف وحی کیا: رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا۔ جب ''روح'' کی بات آئے گی تو میں وہاں عرض کروں گا' اس وقت صرف ضمناً یہ چیز کہہ دیتا ہوں۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ یُلۡقِی الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ (40:15) وہ وحی عطا کرتا ہے' نازل کرتا ہے' اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے۔ الروح کے معنی وحی ہوتے ہیں۔ روح القدس میں قدس کے معنی ہوتا ہے جو ''دور دور تک جانے والی چیز ہو۔'' مقدس تو اسی لیے کہتے ہیں کہ جو چیزیں ناپاکیزگی کی ہوتی ہیں' ان سے دور ہوتا ہے۔ اس کے مجازی معنی ہیں' ورنہ قدس کے معنی دور دور جانے کے ہوتے ہیں۔ وہ جو ملائکہ نے خدا سے کہا تھا کہ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ (2:30) وہ ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ ہم تیری تسبیح بیان

---

[1] یہ ڈرامہ آغا حشر کاشمیری نے لکھا تھا' اس کے دیگر مقبول ڈراموں کے نام یہ ہیں: رستم وسہراب' عورت' آنکھ کا نشہ' دل کی پیاس' عشق اور پیاس' عشق و فرض' یہودی لڑکی' خوابِ ہستی اور اسیر حرص۔

[2] یہ خوبصورت بلائیں تو بے شمار مل جاتی تھیں۔

کرتے ہیں، ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ آپ سوچ لیجیے کہ معنی کیا ہوئے؟ اس کے معنی یہ تھے کہ جو فرائض ہمیں تفویض کیے گئے ہیں، ہم ان کی تسبیح میں سرگرداں رہتے ہیں۔ وَ نُقَدِّسُ لَکَ (2:30) اور اس میں جس دوری تک جانے کی ضرورت ہوتی ہے، ہم وہاں تک پہنچتے ہیں۔ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ (2:87) آیا ہے۔ وہ وحی جو بہت دور تک جانے والی تھی۔

وحی کے متعلق یہودیوں کا عقیدہ

برادرانِ عزیز! یہ دور تک جانے والی خاص طور پہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو کیوں کہا گیا؟ یہودیوں نے یہ عقیدہ بنا لیا تھا کہ جو وحی یا نبوت ہے، وہ صرف بنی اسرائیل کی نسل تک محدود رہے گی، اس کے باہر وحی نہیں جائے گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ جو غیر بنی اسرائیل تھا وہ Convert (تبدیل) ہو کر یہودی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہودی نسل کے باہر کا کوئی انسان یہودی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ دین قبول ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس چیز کو انہوں نے ایک نسل کے اندر ایک قوم کے اندر محدود کر دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دین لے کر آئے تھے۔ انہوں نے یہ چیز دی تھی کہ نہیں! دنیا کا ہر انسان خدا کی وحی سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ یہودیوں نے جو آپ علیہ السلام کے خلاف اور الزامات عائد کیے تھے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ یہ شخص غیر یہودیوں کو خدا کی سلطنت کے اندر داخل کرتا ہے۔ اس لیے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وحی ہے، اس کی خصوصیت قرآن نے ہر جگہ یہ روح القدس بتائی ہے۔ یعنی وہ وحی جو بڑی دور تک جائے گی، مقید نہیں ہوگی۔ ویسے قرآنِ کریم میں وحی لانے والا ذریعہ جو ہے ان کو جبریل علیہ السلام بھی کہا ہے، روح القدس اور روح الامین بھی کہا ہے۔ یہ چیزیں میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ یہاں میں یہ عرض کروں گا کہ جہاں یہ آئے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو ہم نے روح القدس سے تقویت دی، اس کے معنی یہ ہیں، ایسی وحی جو عالمگیر انسانیت کی طرف جانے والی تھی۔

وحی انسانوں کو اُن کے خودساختہ عقائد سے نکال کر عالمگیر انسانیت کے لیے غیر متبدل اصولوں کی حامل بنا دیتی ہے

یہاں قرآن نے کہا ہے کہ تمہاری کیفیت یہ رہی کہ پھر ایک بڑی چیز کہہ دی ہے۔ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَهۡوٰٓى اَنۡفُسُكُمُ اسۡتَكۡبَرۡتُمۡ فَفَرِيۡقًا كَذَّبۡتُمۡ وَ فَرِيۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ (2:87)۔ تمہاری طرف رسول خدا کا پیغام لے کر آتے رہے۔ جس تعلیم کے متعلق تم نے دیکھا کہ وہ تمہاری مرضی کے مطابق ہے اس کو تو کہا کہ ہاں صاحب! ہم اطاعت کرتے ہیں، ایمان لاتے ہیں اور جس کے متعلق یہ دیکھا کہ وہ اس کے خلاف جاتا ہے، تمہاری کسی مرضی کے خلاف ہے تو اس کی تردید کر دی، اس کے خلاف اکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ بات بھی بنی اسرائیل کی نہیں ہو رہی۔ مذہب میں کیفیت کیا ہوتی ہے؟ آپ کے ہاں کچھ مسلمات، کچھ

عقائد' کچھ چیزیں چلی آ رہی ہوتی ہیں' جو آپ نے پہلے سے تسلیم کی ہوئی ہوتی ہیں۔ جو شخص ان کی تائید میں کچھ کہہ رہا ہوتا ہے' آپ جھوم رہے ہوتے ہیں' سبحان اللہ صاحب' اللھم صلی علیٰ' کیا بات کہی ہے صاحب! وعظ سے نکلنے کے بعد' کیا بات ہے صاحب وعظ کی' ایک ایک بات لاکھ روپے کی ہوتی ہے۔ جونہی کسی نے کوئی ایسی بات کہی جو آپ کے عقیدے کے خلاف جا رہی ہے تو آپ لٹھ لے کر کھڑے ہو گئے۔ یعنی آپ کے پاس کوئی دلیل نہیں' کوئی سند نہیں۔ دلیل اور سند تو یہ ہے کہ صاحب! یہ جتنا کچھ ہمارے ہاں متوارث چلا آ رہا ہے' یہ اس کے خلاف ہے۔ فلاں مولوی صاحب یہ کہہ رہے ہیں' یہ اس کے خلاف ہے۔ فلاں صاحب نے وعظ میں یہ کہا' یہ اس کے خلاف ہے۔ یعنی آپ کے ہاں سچ اور جھوٹ کا Criterion (معیار) کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ جس چیز کو آپ پہلے سے صحیح سمجھتے چلے آ رہے ہیں' جس کے ساتھ آپ کو عقیدت ہے' اس کی تائید میں جو کچھ کہتے چلے جائیں گے وہ تو بالکل ٹھیک اور صحیح ہے۔ اس کے خلاف اگر کسی نے کچھ کہا ہے تو اس کے خلاف آپ اٹھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے آن میرٹ اس کو پرکھ کر دیکھیں' اس سے سند مانگیں' پھر اس سے دلیل مانگیں۔

دو ہی چیزیں ہیں۔ اگر ایمان کی بات ہے تو سند درکار ہے' اگر عقل وفکر کی بات ہے تو دلیل چاہیے۔ یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں۔ صرف یہ ہے کہ یہ ہمارے عقیدے کے خلاف ہے' وہاں نہ جانا۔ اس سے کیا ہوگا؟ یہ کہ عقیدہ بگڑ جائے گا' ایمان میں خلل آ جائے گا یعنی جو کچھ تم مانتے چلے آ رہے ہو' اسے پکا کر کے رکھو' اس میں کوئی چیز اور نہ آنے پائے' خلل آ جائے گا۔ جس پہ پہلے سے جی چاہتا تھا' اس کی تم نے تائید کی۔ جونہی کسی نے کوئی ایسی بات آ کر کہی کہ جو تمہاری منشا' تمہاری مرضی' تمہاری مفاد پرستیوں کے خلاف جاتی ہے' بغیر سند اور دلیل کے اس کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے۔ تو یہ تھا جو کچھ تم کرتے چلے آ رہے تھے۔

مذہب کی دنیا میں مذہبی پیشوائیت کا کردار اور اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! کیا مذہب میں یہی کچھ آپ کے ہاں نہیں ہوتا چلا آ رہا؟ جو چیزیں یوں چلی آ رہی ہیں' ان کے خلاف یہ بات کہی جا رہی ہے' اس کے متعلق یہ نہیں ہے کہ کھڑے ہو کر سن لو' صرف یہ کہتے ہیں کہ کل بدعة ضللة ہر نئی بات گمراہی ہے' صاحب! سن لو۔ دلیل یہ ہے کہ صاحب! کروڑوں مسلمان مانتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ سارے کے سارے جو تھے یہ سارے بس غلط ہی یہ کہہ رہے ہیں صاحب! اس وقت آپ کے ہاں لاکھوں کی تعداد میں یہ علمائے کرام' یہ واعظ' یہ سارے' یہ چیزیں مسلمہ کہہ رہے ہیں' بس یہ سب غلط ہی کہہ رہے ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ صاحب! وہ غلط کہہ رہا ہے یا یہ صحیح کہہ رہا ہے' سوال تو یہ ہے یہ جو بات کہی جا رہی ہے' اس کے متعلق کبھی کھڑے ہو کر سوچ لیجیے۔ مگر یہ کبھی نہیں سوچیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ مذہب کے اندر ہو جاتا ہے' کہ پہلے سے تم چیزوں کے متعلق فیصلے کر لیتے ہو اور جو چیز اس کے خلاف جاتی ہے' اس کو رد کر دیا' لٹھ لے کر پڑ گئے۔ یہاں کہا ہے کہ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ (2:87) کچھ تو یہیں

تک ہی رہے کہ انہوں نے اس کی تکذیب کر دی' کہا کہ جھوٹا ہے' مردود ہے' مرتد ہے۔ جب اس مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں کوئی قوت آ جائے تو **وَ فَرِیۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ** (2:87) تو پھر اس کو سولی پہ چڑھا دیا۔ اس کا جرم کیا تھا؟ یہ کہ جو کچھ تم مانتے چلے آ رہے تھے' یہ ایک ایسی بات کہتا تھا' جو اس کے مطابق نہیں تھا۔ بات کو نہیں پرکھا اس کو سولی پہ چڑھا دیا اور جو کہا کہ بھئی! خدا کے لیے سن تو لو کہ **وَ قَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ** (2:88) کہا کہ نہیں بھائی صاحب! غلف کہتے ہیں کہ یا تو اس قسم کا غلاف چڑھا ہوا ہو جیسے انڈے کے اوپر چھلکا ہوتا ہے' باہر کی ہوا تک اندر نہ جا سکے' تو کہا کہ ہمارے دل تو ایسے ہیں اور یا اس کے لیے ہوتا ہے کہ ایسا بھرا ہوا پیالہ ہو جس میں ایک قطرہ بھی اور ڈالنے کی گنجائش نہ ہو۔

مذہب پرست طبقے سے آپ بات کر کے دیکھیے' دوسرے کی سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوں گے۔ علم کا زعم اتنا بڑا ہو گا کہ نخوت سے کہیں گے کہ وہ جانتا کیا ہے صاحب! اسے پتہ کیا ہے' یہ داڑھی منڈھے ہیں یعنی جتنا علم تھا وہ صبح کے وقت وہاں سے نائی (حجام) لے جاتا ہے۔ سوچو تو سہی کہ ''علم رکھیا ہویا کتھے ہوندا ہیگا[1] ''۔ بھئی! اس کی کچھ تو سنیے: **قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ** (2:88)۔ ہمیں سب پتہ ہے جو کچھ بھی ہے۔ اٹھارہ علم پڑھ کر یہ دستارِ فضیلت حاصل کی ہے' باقی کونسا یہ علم رہ گیا۔ یہ ہے **قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ** (2:88)۔ بڑی عجیب چیز قرآن کہہ گیا ہے۔ عزیزانِ من! کسی قوم کی جب یہ کیفیت ہو جائے کہ وہ کسی بات کے سننے کے لیے تیار ہی نہ رہے' وہ کہہ دے کہ ہم علم میں اتنے زیادہ پکے ہو چکے ہیں' اتنے مکمل ہو چکے ہیں کہ اب اس برتن میں ایک اور قطرہ ڈالے جانے کی بھی ضرورت نہیں رہی ہے' سوچیے کہ وہ قوم یا وہ افراد دنیا میں کبھی بھی صداقتوں کو پا سکتے ہیں؟ نہیں' قطعاً نہیں۔

علم و شعور اور کردار کی بلند ترین سطح پر پہنچنے والی شخصیت کی خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا

قرآن تو یہ بتاتا ہے اور کس کی مثال دے کر بتاتا ہے؟ اس ذاتِ گرامی ﷺ کی جس کے متعلق یہ خود کہتا ہے کہ تو اُفقِ مبین کے اوپر گیا ہوا ہے۔ علم کی انتہائی بلندیاں جسے کہا جاتا ہے' وہ ذاتِ رسالت مآب ﷺ اس پہ فائز المرام ہیں اور اس ہستی کی کیفیت یہ ہے کہ عمر بھر اس کی یہ دعا قرآن میں ہے کہ **وَ قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا** (20:114) میرے نشوونما دینے والے! میرا علم بڑھاتا چلا جا۔ کبھی کہیں علم کی بھی انتہا ہوتی ہے؟ میں انہی سے پوچھتا ہوں کہ تم اپنے ایمان سے کہو کہ اس ہستی سے زیادہ وسیع علم بھی کسی اور کو حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ ذاتِ گرامی ﷺ اگر کہہ دیتی کہ **قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ** تو بہرحال چچتا سجتا بھی تھا لیکن یہ تو ذہنیت ہی نہیں ہے' سوال ہی نہیں کہ علم کے متعلق یہ کہہ دیا جائے۔ حضور ﷺ دعا کرتے چلے جاتے ہیں کہ **وَ قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا** (20:114) اور آپ کو پتہ ہے کہ یہاں

---

[1] علم رکھا ہوا کہاں ہوتا ہے؟

رب کیوں کہا گیا ہے؟ میں نے کہا ہے کہ یہ قرآن ہے۔ یہاں ربوبیت کی صفت کیوں آئی ہے؟ ایک تو ربوبیت وہ ہے کہ کسی شے کو نقطۂ آغاز سے اس کے نقطۂ تکمیل تک درجہ بہ درجہ تدریجاً پہنچاتی چلی جائے۔

صلاحیتوں کے سلسلہ میں انسانی ذات کی نشوونما کا دارومدار علم کے حصول پر منحصر ہے

انسانیت کی تکمیل کے لیے علم کی ضرورت تھی اور تکمیلِ انسانیت کا اس زندگی کے اندر تو کبھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا' اس نے تو آگے چل کر تکمیل تک پہنچنا ہے۔ اس لیے زندگی کے آخری سانس تک آپ کو علم کی ضرورت رہتی ہے۔ اس لیے حضور ﷺ کی یہ دعا تھی کہ **وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا** (20:114) تیری ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ علم بڑھتا چلا جائے۔ اسی سے تو انسان کی ذات کی' اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ زندگی کے کسی حصے میں یہ کہنا **قُلُوْبُنَا غُلْفٌ** تو سمجھ لیجیے کہ اس کے دل کے اوپر مہر لگ گئی' قلوب مختوم ہو گئے' مغلوب ہو گئے' اب اس میں کچھ اور گنجائش ہی نہیں۔

برادرانِ عزیز! علم تو ہر آن بڑھتا ہے۔ قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ **سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ** (41:53) ہم اپنی نشانیاں عالمِ آفاق اور عالمِ انفس میں دکھاتے چلے جائیں گے تاآنکہ یہ بات سامنے آ جائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے' حق ہے۔ انفس اور آفاق کی نشانیاں تو ہر آن' ہر دور میں' ہر دن نت نئی سامنے آتی ہیں۔ علم کہاں جا کر ختم ہو سکتا ہے؟ کہیں نہیں۔ **وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ** (2:88)۔ مذہب کی دنیا میں ہمیشہ یہ ہوتا ہے' ان میں سے جتنے بھی یہ اتھارٹی والے ہوتے ہیں' یہ پیشوائیت والے ان کے پاس جا کر آپ دیکھیے کبھی ان میں سے کوئی اس انکساری میں یہ نہیں کہے گا کہ نہیں صاحب! میں تو ایک طالب علم ہوں' میں تو عمر بھر علم حاصل کروں گا۔ نہیں صاحب! علم کی انتہا پہ پہنچے ہوئے ہیں۔

قلب کی کشادگی کے بغیر انسان اپنی ذات کی نشوونما سے محروم ہو جاتا ہے اور قرآن حکیم نے اسے لعنت کہا ہے

قرآن کہتا ہے کہ **بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ** (2:88)۔ یہ بات نہیں ہے کہ قرآن نے لعنت کر دی۔ میں نے آپ کو کہا تھا' کہ لعنت کا سوال ہی نہیں' ذہن سے یہ بات نکال دیجیے کہ خدا لعنتیں بھیجتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ ان کے اس پیالے میں مزید گنجائش نہیں رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ انہوں نے اس صداقت سے انکار کیا ہے کہ انسان کو عمر بھر طالبِ علم رہنا چاہیے' اس کی وجہ سے وہ علم سے محروم کر دیے ہیں' ان کے ہاں قلب میں کشادگی نہیں رہی' وہ اپنی ذات کی نشوونما سے محروم ہو گئے اور انہوں نے اپنے آپ کو علم سے محروم کر لیا۔

قلبِ انسانی کی ماہیت اور اس کے ادراک کی تپش

علم کی تو انتہا ہی نہیں ہوتی' نہ انسان کا قلب کبھی بھی غلاف کے اندر آ سکتا ہے۔ قلب کا تو فطری تقاضا یہ ہے کہ وہ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ آپ بچہ دیکھتے ہیں' جس کا قلب ابھی غلاف میں نہیں ہوتا' وہ آپ کی جان کھالیتا ہے ''ابا جی! اے کی اے' ابا جی! اے کی اے' اے کیوں اے' اے کیوں اے۔'' یہ کچھ قلب کا تقاضا ہے۔ قلب کو ساری عمر یہ رہنا چاہیے۔ جہاں قلب کی یہ کیفیت مٹی' آپ سمجھ لیجیے کہ **لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ** (2:88) قلب کو آپ نے اس شے سے محروم کر دیا' جس کا تقاضا' اس کے اندر موجود تھا۔ وہ تو ہمیشہ ہی رہتا ہے' کبھی سیراب نہیں ہوتا۔ کہا کہ جن کی کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ کہیں کہ **فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ** (2:88) اب اس میں ایک اور قطرہ آ ہی نہیں سکتا' ہمیں کچھ معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے' ہم کھڑے ہو کر سوچنا ہی نہیں چاہتے' کہتا ہے' وہ کیا ایمان لائیں گے۔ ایمان کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ ہم اس کے سینے کو کشادہ کر دیا کرتے ہیں: **يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ** (6:125)۔ عزیزانِ من! سینے کی کشادہ بڑی چیز ہے' یہ وسعتِ ظرف بڑی چیز ہے۔

اب درس کا وقت ختم ہوا۔ 89 ویں آیت سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

چوبیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)' (آیات 89 تا 96)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ
فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا
بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ
وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٩٠﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا
وَرَآءَهٗ ۤ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۭ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩١﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٩٢﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا
مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ۭ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۤ وَاُشْرِبُوْا
فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۭ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩٣﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ
الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا
بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٩٥﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ
اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1968ء کی 24 تاریخ ہے اور درس قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 89 سے ہو رہا ہے: (2:89)۔

سابقہ درس کے سلسلہ میں پیش کی جانے والی آیت (2:85) کی ایک ضروری وضاحت

قبل اس کے کہ آج کے درس کے سلسلے کا آغاز کیا جائے' سابقہ درس میں ایک اہم آیت سامنے آئی تھی اور میں نے اس کی امکان بھر وضاحت بھی کی تھی لیکن اس سلسلے میں بعد میں ایک سوال سامنے لایا گیا اور میں سمجھتا ہوں کہ پہلے اس کی کچھ مزید وضاحت کر دوں اور پھر آگے چلوں۔ یہی طریق بہتر ہے۔ یہ آیت (2:85) تھی۔ اس میں ایک بڑا عظیم اصول بیان ہوا تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم بات تو یوں ہے کہ جیسے بنی اسرائیل کی کر رہا ہے لیکن دین کے ایک اہم گوشے کو وہ سامنے لایا تھا۔ اس نے بنی اسرائیل سے

کہا تھا کہ تمہاری کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ تم پہلے اپنے ہی لوگوں میں سے بعض کو محتاج و کمزور بنا کر گھروں سے بھی نکال دیا کرتے تھے پھر جب ان خارج البلد لوگوں کو دشمن اُچک کر لے جاتے تھے' پکڑ کر لے جاتے تھے تو پھر تم آپس میں بیٹھ کر چندے کیا کرتے تھے کہ ان کا فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا کر لائیں اور اسے بڑا نیکی کا کام شمار کیا کرتے تھے حالانکہ ان لوگوں کا جو گھروں سے نکال دینا تھا تو وَ هُـــوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ (2:85) یہی چیز ایک سنگین جرم تھی کہ پہلے اس سنگین جرم کا ارتکاب کرنا اور پھر اس کے بعد ان کو چھڑانے کے لیے کچھ خیرات کے پیسے دینا اور اسے نیکی شمار کرنا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ ایسی ہی چیز ہے جیسے اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) ضابطۂ زندگی کے ایک حصے پر ایمان رکھنا اور دوسرے حصے سے انکار کرنا' کفر برتنا۔ اگلی بات یہ تھی کہ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85) نظر بظاہر ایسا نظر آتا تھا کہ انہوں نے جو چیز نیکی کی' خیرات کی' پن کی' دان کی ہے' اس کا تو انہیں کچھ بدلا ملنا چاہیے لیکن قرآن نے یہ کہا تھا کہ جو قوم بھی ایسی روش اختیار کرتی ہے' یاد رکھو! اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہوتی ہے اور قیامت میں اس سے بھی زیادہ شدید ترین عذاب میں محصور ہوگی۔

جس بات کی وضاحت مزید چاہی گئی ہے' وہ یہ ہے کہ غلط نظامِ زندگی کے اندر انفرادی طور پر نیکی کے کام بھی کیے جاتے ہیں۔ پھر اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ نیکی کے یہ کام بالکل غارت گئے' کسی کام نہ آئے۔ ایسا تو نہیں ہے۔ اس کا یہ مفہوم کیا ہوا؟ یہ بات سمجھنے کی ہے۔ غلط نظامِ زندگی سے اسلام کے صحیح نظام کی ابتدا کی جائے گی۔ ابتدا کرنے والی جماعت وہ ہوگی جو غلط نظامِ زندگی کو کلیتاً غلط سمجھے اور صحیح نظامِ زندگی کو کلیتاً عمل میں لانے کے لیے کوشش شروع کرے۔ یاد رکھیے گا! نظامِ زندگی اس وقت اسلامی کہلائے گا جب وہ کلیتاً اسلامی ہوگا۔ بین بین کی شکل اسلامی نہیں ہو سکتی۔ ایک نظام میں دوسرے نظام کے پیوند نہیں لگ سکتے لیکن بہرحال جب غلط نظام سے ہم اچھے نظام کی تشکیل کی طرف قدم اٹھائیں گے اس میں تو کچھ وقت لگے گا' یہ چیز بتدریج ہو سکے گی۔ اسے عبوری دور (Transitory Period) کہا جائے گا۔ صحیح نظامِ زندگی کا متشکل کرنا بطور نصب العین تو ہمارے سامنے ہوگا اور اس کی طرف ہم بتدریج بڑھتے ہوئے چلے جائیں گے۔ اس میں بہت سی چیزیں غلط بھی ابھی باقی ہوں گی' آہستہ آہستہ ہم ان کی اصلاح کرتے چلے جائیں گے۔ یہ جو روش ہے' اس میں تو ہر وہ قدم جو اس نظام کی تشکیل کی طرف بڑھتا جائے گا' جسے ہم نیکی کا کام کہیں گے' اس کا وزن ہوگا' وہ اپنا نتیجہ پیدا کرے گا۔ اس کا نتیجہ خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (2:85) وغیرہ نہیں ہوگا' یہ تو اس دنیا کی زندگی کو سنوارنے کے لیے ابتدائی اقدام ہوں گے اور پھر آخر میں جب یہ دنیا سنورے گی تو اس سے آخرت کے سنورنے کا بھی امکان پیدا ہو جائے گا۔ اس انداز میں' اس دور کے اندر یہ جتنے اس قسم کے کام کیے جائیں گے' وہ یقیناً اپنا وزن رکھیں گے۔

عبوری دور میں اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کتاب کے دونوں حصوں کو پیش نظر رکھیں

غلط نظام کے اندر' جیسے آج ہمارا یہ نظام ہے' انفرادی طور پر کسی کی مدد کرنا یقیناً نیکی کا کام ہے۔ افلاس کا دور کرنا' دوسروں کی مصیبتوں کا حل تلاش کرنا' انفرادی طور پر ہی سہی یہ یقیناً اچھا کام ہے۔ غلط چیز یہ ہے کہ ہم غلط نظامِ زندگی کو صحیح سمجھ لیں یا اس کی طرف سے Indifferent (لاتعلق) ہو جائیں اور اس کو علیٰ حالہٖ رہنے دیں اور اپنے آپ کو یہ فریب دے لیں کہ اس کے اندر بھی اگر ہم انفرادی طور پر یہ کچھ چھوٹے موٹے نیکی کے' خیرات کے' کام کرتے رہیں گے تو یہ بہرحال اسلامی بات ہو جائے گی' اتنا حصہ اسلامی ہو جائے گا اور یہ باقی جو حصہ ہے وہ بہرحال غیر اسلامی ہی سہی' یہ غلط ہے' اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85)۔ ایک تو یہ ہے کہ ہم صحیح اسلامی نظام پر ایمان رکھیں۔ اس ایمان کے معنی ہوتے ہیں ''اپنا نصب العین زندگی متعین کر لینا''۔ ہم نصب العین متعین کر لیں کہ ہم نے یہاں صحیح اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔ یہ موجودہ نظام غلط ہے' یہ کفر کا نظام ہے' یہ باطل کا نظام ہے' ہم اس میں مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتے لیکن چونکہ آج Overnight (شباشب) ہم اس کو Change (تبدیل) نہیں کر سکتے' اس لیے آہستہ آہستہ ہم اس کی طرف اُٹھتے چلے جائیں گے۔ اس میں ہر قدم' وہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی کا کام بھی کیوں نہ ہو' وہ اپنا وزن رکھے گا لیکن اگر غلط نظامِ زندگی کے اندر مطمئن ہو کر بیٹھیں اور اپنے آپ کو یہ فریب دے لیں کہ ہم اس میں انفرادی طور پر بھی یہ جو نیکیوں کے کام کرتے ہیں' بہرحال یہ نیکی کا کام ہے' وہ ہے یہ چیز جو قرآن کہتا ہے کہ کتاب کے ایک حصے پہ ایمان لانا اور دوسرے حصے سے انکار برتنا۔ اس کا نتیجہ ہے: اس دنیا کی زندگی کے اندر بھی ذلت وخواری اور عقبیٰ کے اندر بھی اشد عذاب۔

کرۂ ارض پر موجودہ نظامِ سرمایہ داری کا ماحصل اَسّی نوّے فیصد لوگوں کی محنت کو سمیٹنے کے سوا کچھ اور نہیں ہے

اب وہی مثال ہے جو میں نے بیان کی تھی اور جو قرآن نے یہاں خود بیان کی ہے اور وہ ہے پہلے لوگوں کو گھروں سے نکال دینا۔ باطل نظام جو ہمارے ہاں یا ساری دنیا کے اندر اور سارے اسلامی ممالک کے اندر موجود ہے' یہ ہے نظامِ سرمایہ داری جس میں اسی نوے فیصد لوگوں کی محنت کے ماحصل کو چند افراد سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔ اس طرح سے اتنے بڑے حصۂ آبادی کو وہ محتاج مفلس اور ضرورت مند بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ ان کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں' کھانے کو نہیں ملتا' پہننے کو نہیں ملتا' علاج کے لیے نہیں ملتا' تعلیم کے لیے کچھ نہیں ملتا۔ ان کی یہ کیفیت پہلے کر دی جاتی ہے۔ وہی بنی اسرائیل کے واقعہ میں ہے کہ پہلے تم ان کو گھروں سے نکال دیتے ہو' ان کو ضرورت مند اور محتاج بنا دیتے ہو اور پھر جن کے پاس یہ دولت سمیٹ کر چلی جاتی ہے' وہ یہ دولت کہاں سے سمٹا کر لے آتے ہیں؟ یہی جو اسی نوے فیصد مزدور ومحنت کش ہے' اس کی محنت کے ماحصل میں سے اسے تو اتنا سا دیتے ہیں اور باقی سارا سمٹا کر لے جاتے ہیں۔

موجودہ اختیار کردہ معاشی نظام انسانیت کو فریب دینے کی ایک محسوس اور واضح مثال ہے

یہ جو اتنی دولت جمع ہوئی تو اب اس میں سے ان کے لیے کہیں خیرات کے چار پیسے دے دیئے' کہیں اڑھائی فیصد زکوۃ نکال دی' کہیں نیاز کی دیگیں پکا کر ان کو دے دیں' کہیں یتیم خانے میں کوئی چار کپڑے بھیج دیئے' کہیں قربانی کی کھالیں دے دیں اور اس طرح سے یہ سمجھ لیا کہ ہم بڑا نیکی کا کام کر رہے ہیں' برادران عزیز! یہ ہے فریبِ نفس اور جو موجودہ نظام ہے اس کو کبھی یہ نہ سمجھا کہ یہ خود غیر اسلامی نظام ہے اور اس کا قائم رکھنا سخت ترین جرم ہے اس لیے کہا ہے کہ **مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ** (2:85)۔ یہاں قرآن نے حرام کا لفظ استعمال کیا ہے کہ آبادی کے ایک حصے کو اس کیفیت میں پہنچا دینا۔ یہ سنگین جرم تھا۔ یاد رکھیے! حرام کا لفظ جو سنگین ترین جرم ہوتا ہے اس کے لیے آتا ہے۔ یہ غلط نظام قائم رکھنا' جس میں کثیر آبادی کا ایک حصہ محتاج ہو جائے' ان کی ضرورتیں رکی رہیں اور آبادی کا تھوڑا سا حصہ' ساری کی ساری دولت' سمیٹ کر لے جائے اور پھر ان دولت مندوں سے روز اپیلیں کرتے رہنا کہ فلاں معاملے میں چندہ دیجیے' ذرا یہاں ڈسپنسری بنا دیجیے' یہاں کوئی ویلفیئر (فلاح و بہبود) کا کام کر دیجیے' ادھر مسجدوں کے اندر اپیلیں کرنا کہ خدا کے نام پر مسجد بنوا دیجیے' قالین بچھا دیجیے' سبیل لگوا دیجیے' اور ان سے یہ جو خیرات کے کام لیے جائیں' انہیں کہہ دینا کہ تم نے مسجد بنائی' جنت میں تمہارے لیے گھر بن جائے گا' تم حج کر آئے' تمہارے سارے پچھلے گناہ دھل جائیں گے' اس غلط نظام میں' یہ سب کچھ حرام کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ کہاں سے مسجد کے لیے اس کے پاس پیسے آئے تھے؟ یا یہ چیز ہے کہ ان غریبوں کے لیے سیلاب آ گیا ہے' ان کی کچھ مدد کیجیے' وبا پھوٹ گئی ہے' ان کے لیے کچھ دوائیوں کا انتظام کر دیجیے' بہت سے لوگ مرنے شروع ہو گئے' کفن دفن کا انتظام کر دیجیے۔ یہ ہیں جنہیں نیکی کے کام کہا جاتا ہے۔ غلط نظامِ زندگی پہ' باطل کے نظام پہ' مطمئن ہو کر بیٹھے رہنا اور اس کے اندر اس قسم کے چھوٹے چھوٹے نیکی کے کاموں کو یہ کہہ دینا کہ اس سے تمہاری نجات ہو جائے گی' غلط ہے۔ آج یہ اسلامی خدمات ہو رہی ہیں' نیکی کے کام ہو رہے ہیں۔ یہ ہے وہ چیز جو قرآن کہتا ہے کہ جو قوم یہ کرتی ہے کہ باطل نظام زندگی پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتی ہے اور اس میں پھر یہ چھوٹے چھوٹے نیکی کے کام کر کے اپنے ذہن میں یہ تصور کر لیتی ہے کہ اس سے اس چیز کا کفارہ ادا ہو جاتا ہے' غلط روشِ حیات ہے: انہوں نے خدا کی میزان میں یہ وزن رکھ دیا ہوا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک فریب خوردہ قوموں کا انجام

برادران عزیز! قرآن یہ کہتا ہے کہ یاد رکھو! **فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا** (2:85) جو بھی قوم یہ روش اختیار کرے گی' وہ اپنے آپ کو فریب دے لے تو اور بات ہے کہ ہم نیکیوں کے کام کر رہے ہیں' یہ کوئی نیکی کا کام

نہیں ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ تم کس قسم کا نظامِ زندگی متشکل کرنا چاہتے ہو۔ یہ ہے ایمان' ٹھیک ہے کہ وہ ایک دن میں متشکل نہیں ہو جائے گا' ٹھیک ہے' اس میں عبوری دور (Transitory Period) ہوگا لیکن اپنا ایمان تو یہ رکھو کہ ہم نے یہ کچھ کرنا ہے' نصب العین تو اپنے سامنے یہ رکھو۔ ہو سکتا ہے کہ گھنٹے بھر کے کھیل کے اندر یہ جو فٹ بال کی ٹیم ہے' اس گیند کو گول تک پہنچا نہ سکے' بعض موانع ایسے آ جائیں لیکن اس ٹیم کا ایمان تو یہ ہو کہ اس گیند کو ہم نے اس گول کے اندر پہنچانا ہے۔ اگر تمہارا یہ ایمان ہی نہیں ہے' یہ نصب العینِ حیات ہی نہیں ہے' یہ مقصدِ زندگی نہیں ہے' جو بھی موجودہ نظام ہے' اس کے اوپر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ہو' اس نظام کے اندر اس قسم کے خیرات کے' پن کے' دان کے کاموں کے متعلق یہ اطمینان کر رہے ہو کہ یہ ہم نیکی کا کام کر رہے ہیں تو قرآن کہتا ہے کہ سوچو تو سہی کہ **وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ** (2:85) جن لوگوں کی تم مدد کر رہے ہو' یہ ان کو مدد کا محتاج بنا دینا ہے یہی تمہارا سنگین ترین جرم تھا۔ اس کا تم ارتکاب کرتے ہو' مسلسل ان کو اس حالت میں پہنچاتے چلے جاتے ہو اور اس کے بعد ان کو چار ٹکے جو خیرات کے' زکوٰۃ کے' تم دے دیتے ہو' اس کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہو کہ ہاں صاحب! دیکھیے ہم نے بڑا نیکی کا کام کر دیا' یہ فریبِ نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔

دوسروں کو ان کے پاؤں پر کھڑا کرنے کی بجائے انہیں مدد کا محتاج بنا دینا' جرم کے مترادف ہے

آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کیا کہتا ہے کہ اس کا بدلا کیا ہوگا؟ کہا ہے کہ **خِزۡيٌ فِي الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ** (2:85) یاد رکھیے! دنیاوی زندگی کے اندر عزت و توقیر صحیح نظام کی وجہ سے ہوتی ہے۔ باطل نظام کا لازمی نتیجہ ذلت و خواری ہے' اس میں انفرادی نیکی کے کام اس قوم کو عزت کا مستحق کبھی نہیں بنا دیتے۔ آپ دنیا کی قوموں پہ نگاہ ڈال کر دیکھ لیجیے' جہاں جہاں غلط نظامِ زندگی ہوگا' وہ قوم ذلیل و خوار ہوگی۔ ہر چند اس کے اندر انفرادی طور پر ایسے لوگ ہوں گے جو بڑے نیکیوں کے کام کر رہے ہوں گے۔ انفرادی نیکیاں' اجتماعی باطل کے نظام کا کفارہ نہیں ہو سکتیں۔ اسلام انفرادی نجات کا قائل نہیں ہے۔ وہ جنت میں جانے والوں کی پہلی شرط یہ قرار دیتا ہے کہ **فَادۡخُلِيۡ فِيۡ عِبٰدِيۡ** (89:19) میرے بندوں کے اندر داخل ہو' اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ **وَادۡخُلِيۡ جَنَّتِيۡ** (89:30) اور جنت کے اندر آ وَ۔ یہ تو حیاتِ اجتماعیہ کا نام ہے' یہ تو ایک صحیح نظامِ زندگی کا نام ہے۔ باطل نظامِ زندگی قائم رکھنا' اس کی جڑیں مضبوط کرتے چلے جانا اور اس کے بعد پھر اس فریب کے اندر رہنا اور ان لوگوں کو اس فریب میں رکھنا کہ تم اگر اس قسم کے دان پن کے کام کرتے چلے جاؤ گے تو اس سے پھر خدا کے ہاں تمہاری نجات ہوتی چلی جائے گی' ایک فریب ہے اسی لیے کہا ہے کہ **وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ** (2:85)۔

باطل نظام کو حق کا نظام سمجھتے ہوئے اس کی بنیادوں کو مضبوط کرتے رہنا جرمِ عظیم ہے

برادران عزیز! جو بات میں واضح کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ غلط نظامِ زندگی سے صحیح نظامِ زندگی تک پہنچنے میں ایک عبوری دور کا عرصہ ہوتا ہے' ایک Transitory Period ہوتا ہے۔ اس میں جتنا حصہ باطل کا ہوتا ہے' جسے ابھی ہم تبدیل نہیں کر سکے' اس پہ ہمیں ابھی اختیار نہیں ہوتا۔ اسے ہم کبھی صحیح نہیں سمجھتے' یہ ہے ایمان کہ ہم ہر وقت اس کے متعلق سمجھتے ہیں کہ یہ غیر اسلامی ہے' یہ غیر دینی ہے' یہ باطل کا نظام ہے' یہ مسموم فضا ہے' زہریلی ہوا ہے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں' جلدی سے جلدی اس کو بدلنا چاہیے' ہر وقت یہ کوشش ہوتی ہے اور اس دوران انفرادی طور پر جو چیزیں بھلائی کی' منفعت کی ہم کر سکتے ہیں' وہ کرتے چلے جانا چاہیے۔ یہ ہیں نیکیاں۔ لیکن اگر اس نظام پہ مطمئن ہو جائیں یا اسی کو ہم اچھا سمجھیں اور اس باطل کے نظام کے اندر انفرادی طور پر ان کاموں کے متعلق سمجھیں کہ خدا کے نظام میں اس کا کچھ وزن ہوگا' تو عزیزانِ من! یہ میں نہیں کہہ رہا' یہ خدا کہہ رہا ہے کہ **فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ‌ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ‌ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ** (2:85)۔ اس لیے قوموں کو کسی فریب میں نہیں رہنا چاہیے۔

ہزار برس سے مسلمان قوم بنی اسرائیل کی طرح فریب خوردگی میں مبتلا چلی آ رہی ہے

ہزار برس سے اس قوم کو بالکل اسی طرح سے اس فریب میں رکھا جا رہا ہے' جس طرح بنی اسرائیل فریب کے اندر تھے۔ باطل نظام زندگی مسلط کیا ہوا ہے' اس نظامِ زندگی کو عین اسلامی سمجھا ہوا ہے۔ یہ جو اس نظام کو اسلامی نظام میں بدلنے کے مدعی بھی آپ کے ہاں ہیں' آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ذہن میں اسلام کا 'اسلامی نظام کا' تصور کیا ہے؟ یہ کہ چور کے ہاتھ کاٹ دیجیے' زانی کو کوڑوں کی سزا دے دیجیے' نماز میں صفوں کا انتظام کر دیجیے' مسجدوں میں لوٹے رکھ دیجیے۔ یعنی یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ جو چند تعزیرات ہیں' ان کو اگر نافذ کر دیا جائے' یہ اس قسم کے چند قوانین اگر نافذ کر دیئے جائیں تو یہ نظام اسلامی ہو جائے گا۔ ہر قوم کے اندر پرستش کا کوئی نہ کوئی طریقہ موجود ہے۔ دان اور پن کے کام بھی ان کے ہاں ہوتے ہیں' وہ مسلمانوں سے بھی زیادہ کام ہوتے ہیں۔ انہیں آپ کافر کیوں کہتے ہیں؟ انہیں آپ جہنم کا کندہ کیوں کہتے ہیں؟ وہ بھی رسمی طور پہ آپ کہہ دیتے ہیں' اپنے متعلق بھی رسمی طور پہ آپ کہہ دیتے ہیں۔ یاد رکھیے! اس میں سوال یہی نہیں ہے کہ وہ مندر میں پرستش کرتا ہے اور آپ مسجد میں عبادت کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ خیرات کا کام کرتا ہے' اسے آپ پن اور دان کہتے ہیں' اپنے ہاں اس کو زکوٰۃ اور خیرات کہہ دیتے ہیں۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ ایسا نظام رکھتے ہیں' جس میں انسانوں کا ایک گروہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہوتا چلا جاتا ہے' تو یاد رکھیے! اس کے بعد اس نظام کے اندر ان کی امداد کا جو کام ہے وہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے'

وہ تو خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ (2:85) ہے۔صحیح نظامِ زندگی کا قیام اور استحکام' یہ ہے اسلام کی خدمت اور جب وہ قائم ہو جائے' پھر اس کو مستحکم رکھنا' یہ ہے جہاد۔ اور اس نظام کے اندر پھر جو کچھ کیا جائے گا' اسے آپ نیکی کہیں گے۔ عبوری دور (Transitory Period) کے اندر بے شک جیسا میں نے عرض کیا ہے' ہمارا قدم اس کی طرف اٹھتا چلا جائے' نصب العین ہم نے وہی رکھا ہوا ہو' پھر جب بتدریج اس تک پہنچیں گے تو ٹھیک ہے۔ جب تک اجتماعی طور پر وہ نظام قائم نہیں ہوگا' ہم انفرادی طور پر اس کے لیے یہ سب کچھ کریں گے۔ یہ انفرادی طور پر جو کچھ کرنا ہے' یہ ہے نیکی کا کام لیکن جیسا میں نے پہلے عرض کیا ہے' باطل کے نظام پر مطمئن ہو کر بیٹھے رہنا اور اس کے اندر یہ سمجھنا کہ یہ چھوٹے چھوٹے جو دان پن کے کام ہیں' یہ نیکیوں کے کام ہیں جو ہم کر رہے ہیں' یہ فریبِ نفس کے سوا کچھ نہیں۔

علم کی بلند ترین چوٹی ہر آن انسان کو آخر تک مزید بلندیوں کی طرف متوجہ کرتی رہتی ہے

عزیزانِ من! قرآن کا فیصلہ ہمارے سامنے ہے' اب ہمارا جی چاہے تو ہم آنکھیں بند کر کے کبوتر کی طرح بیٹھ جائیں لیکن خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل تو بڑا سخت ہے وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ (2:85) ہم غافل نہیں ہیں' اس بات سے کہ تم کیا کرتے ہو۔ یہ تھی چیز جو آیت (2:85) کی باقی رہ گئی تھی' جس کی وضاحت میں نے ضروری سمجھی۔

پھر کہا کہ ان مذہبی پیشواؤں کی ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ جب ان کے سامنے جا کر کوئی حق کی بات کہو تو وَ قَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ (2:88) وہ کہتے ہیں کہ جاؤ جاؤ ہمیں سب پتہ ہے' ہمارے جتنا علم کسی نے حاصل نہیں کیا ہے' ہم سات سال کے بعد اٹھارہ علوم کی تحصیل کے بعد فارغ التحصیل ہو کر آئے ہیں۔ اب اس علم میں مزید کچھ گنجائش نہیں ہے' ایک قطرے کی گنجائش نہیں ہے' بھرا ہوا پیالہ ہے۔ اب یہ قلوب غلافوں کے اندر لپٹے ہوئے ہیں۔ کسی انسان کا اپنے متعلق یہ کہنا کہ اب مزید علم کی گنجائش نہیں' سراسر غلط ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ جو ذہنیت ہے' اس میں یہ نہیں ہے کہ گنجائش نہیں بلکہ بَلۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ (2:88) ان کی اس ذہنیت کی وجہ سے وہ زندگی کی خوشگواریوں سے اور علم کی فراوانیوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ علم کی تو کبھی انتہا ہوتی ہی نہیں ہے' کسی مقام پہ بھی کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ وہ علم کی انتہا کے اوپر پہنچ چکا ہے۔

برادرانِ عزیز! جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا وہ ذاتِ گرامی ﷺ کہ جو قرآن کی سند کے اعتبار سے علمِ انسانی کے "افقِ مبین" کے اوپر ہے۔ حضور ﷺ کی ساری عمر یہ دعا رہی' قرآن کے الفاظ میں: قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا (20:114) اے ہمارے پروردگار! میرا علم زیادہ کرتا چلا جا۔ انہوں ﷺ نے بھی کبھی زندگی کے آخری سانس تک یہ نہیں کہا کہ اب مجھے مزید علم کی ضرورت نہیں ہے

اور یہاں نخوت اور تکبر اور استکبار کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (2:88) کہتے ہیں کہ ہمیں قطعاً ضرورت نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ (2:88)۔ لعنت کے معنی ''محرومی'' ہوتی ہے۔ انہوں نے خود ہی محروم کر لیا ہے۔ کسی دوسرے کو اس چیز کا کیا' دوش انہوں نے اپنے آپ پر اپنے دروازے خود بند کر لیے ہیں۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَ لَمَّا جَآءَ هُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (2:89)۔ پہلے ان کی کیفیت یہ تھی' یہ اہلِ کتاب کے متعلق بات ہو رہی ہے' کہ کفار کے مقابلے میں یہ کہا کرتے تھے کہ کوئی بات نہیں ہے' ایک آنے والا ابھی آئے گا اور اس کے بعد وہ پھر ایسا نظام' ایسی تعلیم لائے گا کہ اس کی رو سے ہم تم پر غالب آ کر بتائیں گے۔

ہر قوم ایک آنے والے کے تصور کی گرویدہ ہے اور ان کی اپنی اپنی تنہا منزل ہے

برادرانِ عزیز! یہ آنے والے کا تصور اس سے پیشتر تمام قوموں کے اندر پایا جاتا تھا۔ بنی اسرائیل ایک آنے والے کے انتظار میں تھے۔ اس آنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب دعویٰ کیا تو ان علیہ السلام کے جان کے لاگو ہو گئے۔ پھر یہ عیسائی اس آنے والے کے انتظار میں تھے۔ اس کے بعد اس آنے والے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ کہا کہ میں وہ پیغام لایا ہوں' جس کے تم انتظار میں تھے تو یہ ان علیہ السلام کی مخالفت پہ اتر آئے اور پھر اس کے بعد یہ جو قوم ہے' یہ خود مسلمانوں کی قوم' ایک آنے والے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے اور جس کے انتظار میں بیٹھی ہے' پچھلی ہسٹری بتا رہی ہے کہ جب وہ آنے والا آئے گا تو پھر کیا حشر ہوگا؟ پہلی چیز تو یہ سوچیے کہ دنیا کا ہر مذہب' ہر مذہب والی قوم' آنے والے کے انتظار میں ہے۔ بدھ مت والے ایک آنے والے مسیحا (متیا) کے انتظار میں ہیں' جینی ایک اور آنے والے تری تھنکر کے انتظار میں ہیں' مجوسی متر یا مصرا (Mithra) یا متھرا کے انتظار میں ہیں' یہودی ایک آنے والے مسیحا کے انتظار میں ہیں' عیسائی پھر حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے انتظار میں ہیں ❶۔ مسلمان اپنے ایک آنے والے کے انتظار ❷ میں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ قیامت کے قریب آئے گا۔

---

❶ ہندو کلنکی اوتار کے انتظار میں ہیں۔

❷ مسلمان ہر صدی پر ایک مامور من اللہ (مجدد) کے آنے کا عقیدہ رکھتے ہیں اور قیامت کے قریب امام مہدی کی آمد کے انتظار میں ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں۔

قیامت کے قریب ایک ہی وقت میں آئیں گے اور ہر ایک ان میں سے یہ کرے گا کہ اپنا جو دین ہے وہ غالب آئے۔ اس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ ان کا آنے والا قیامت کے قریب آئے گا ''قیامت تے آ ہی جانی آیا او ہدے بعد۔ او سارے ایہڈے ایہڈے وڈے جیہڑے نیں اکو واری آ جان تے ہر اک اے کوشش کرے کہ میرا دین غالب آئے' تے او سچی گل اے پئی او قربِ قیامت دی گھڑی ہووے گی ❶۔'' اور اگر ان کے ہاں کا دین' آپ کہتے ہیں صاحب! کہ غلط ہے' آپ اپنے ہاں کے آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں' پھر اس کے اندر شیعہ حضرات اپنے ہاں کے امام کا انتظار کر رہے ہیں' سُنی اپنے ہاں کا۔ اب یہ دیکھیے کہ اگر ان کے وہ امام آ گئے تو پہلا جھگڑا شیعہ اور سنی کا ہوگا' پھر سنیوں کے اندر اہلِ حدیث اور حنفیوں کا ہوگا' پھر حنفیوں میں بریلویوں کا اور دیوبندیوں کا' پھر اہلِ طریقت تو ان کے ہاں الگ رہے' وہ اگر ایک ہی آیا تو آپ پوچھیے کہ اس کے لیے کیا مصیبت ہوگی' اور اگر وہ ان کے الگ الگ آئے تو پھر وہ جھگڑا جو باقی مذاہب میں پڑ رہا ہے' یہ اپنے اندر ان کا یہ جھگڑا ہوگا۔ یا میرے اللہ! ''اے چنگے ہوئے جیہڑے پہلے جان گے ❷۔''

قوم کا زاویہ نگاہ بدل جانے سے اس کی تاریخ بدل جاتی ہے

آپ سوچیے تو سہی کہ جب قومی ذہنیت بدلتی ہے تو کہاں پہنچ جاتی ہے؟ بنی اسرائیل سے کہا کہ تمہاری بھی یہ کیفیت تھی کہ اس سے پیشتر تم کفار سے یہ کہا کرتے تھے کہ آنے والا آئے گا تو اس کے بعد تم دیکھنا کہ ہم کس طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ برادرانِ عزیز! یہ قیامت کے قریب آنے والے کی بات نہیں ہے۔ آنے والا آیا اور آ کر اس نے کہا کہ میں وہی پیغام لے کر آیا ہوں جو خدا کی طرف سے تمہارے رسول کو ملا تھا اور تمہارے پاس نہیں رہا تھا۔ جو تم دعوے کرتے ہو کہ خدا کا بھیجا ہوا دین غالب آئے گا تو مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (2:89) وہ اس کو سچ کر دکھائے گا۔ میں سمجھتا ہوں پہلے بھی یہ بات آ چکی ہے' پھر دو لفظوں میں دہرا دوں یہ جو مصدق کا لفظ ہے' یہ کیا غلط فہمی پیدا کیا کرتا ہے؟ جب اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ یہ قرآن آیا' جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرتا ہے تو اعتراض یہ ہوا کرتا ہے کہ قرآن ہی یہ کہہ رہا ہے کہ ان کی کتابیں محرف تھیں' ان میں تحریف ہو چکی تھی' وہ مسخ ہو چکی تھیں۔ اس میں سے بہت سا حصہ بھلا یا جا سکتا تھا تو جن کو وہ خود تحریف شدہ کہتا ہے' پھر یہ ان کی تصدیق کس طرح سے کرتا ہے؟ مصدق کے معنی' جو ہم اردو میں تصدیق کہتے ہیں' نہیں ہوتے۔ اس کے معنی ہوتا ہے ''کسی دعوے کو سچا کر دکھانا''۔ کہا یہ ہے کہ وہ جو تمہارے دعوے ہیں کہ خدا کی حکومت اس زمین پر قائم ہوگی' دین خداوندی

---

❶ اس کے بعد قیامت تو آ ہی جائے گی۔ وہ سارے جو اتنے بڑے بڑے ہیں' جب وہ تمام اکٹھے ہی آ جائیں گے اور ہر ایک کوشش کرے گا کہ اس کا دین غالب آ جائے تو سچی بات پھر یہی ہے کہ وہ قربِ قیامت کی گھڑی ہوگی۔

❷ یا اللہ! وہ اچھے ہوئے جو پہلے مر جائیں گے۔

کا غلبہ ہوگا' یہ قرآن ان دعووں کو اور اس نظام کو سچا کر دکھائے گا۔ مصدق کے معنی ''سچا کر کے دکھا دینے والا''۔ کہا ہے کہ یہ سچا کر دکھائے گا۔ جب یہ کچھ لے کر آیا' تو تمہاری کیفیت یہ تھی فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (2:89) جسے تم پہچانتے تھے' تمہارے ہاں کی اپنی کتابوں میں جو اس کی نشانیاں لکھی تھیں' اس کے مطابق یہ آیا' تم اس کو پہچانتے تھے' تو اس کی تم نے مخالفت شروع کر دی۔

امت مسلمہ کی بدحالی کا سبب: قرآنِ حکیم کو ضابطہ حیات بنانے کی بجائے اسے ثواب تک محدود کر رکھنا ہے

عزیزانِ من! آج مسلمان بھی اسی مقام پہ ہے' جس مقام پہ نبی اکرم ﷺ کے وقت اہلِ کتاب تھے۔ بس اس فرق کے ساتھ ہے کہ ان کے پاس اپنی کتاب اصلی شکل میں موجود نہیں تھی' یہاں وہ موجود ہے لیکن اس کتاب کی موجودگی ان کے ہاں ان کو کوئی فائدہ نہیں دے رہی کہ وہ کتاب ان کے ہاں ضابطۂ زندگی نہیں ہے' وہ کتاب ثواب کی خاطر ہے۔ مَّا عَرَفُوْا (2:89) کہا ہے کہ اس کتاب کو یہ لوگ بھی پہچانتے ہیں' کہ قرآن ہے خدا کی کتاب ہے لیکن جو عمل ہے' وہ سارا اس کتاب کے خلاف ہو رہا ہے۔ کہا ہے کہ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (2:89) جو یوں انکار کرنے والے ہوتے ہیں' وہ اس کتاب کے خوشگوار نتائج سے محروم رہ جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ کتاب کی موجودگی کے باوجود اس کے خوشگوار نتائج سے محروم رہ جانا' یہ ہے جسے لعنت کہا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (2:90)۔ یہ انکار کیوں کرتے ہیں؟ یہ ایک دوسری چیز مذہبی دنیا کی تنگ نظری اور تعصب ہے۔ یہودیوں کے ہاں عقیدہ یہ تھا کہ نبوت صرف بنی اسرائیل کے اندر رہ سکتی ہے' ان سے باہر نہیں جا سکتی۔ نبوت کو انہوں نے قومی بنا رکھا تھا اور نبی اکرم ﷺ بنی اسماعیل علیہ السلام کی شاخ سے آئے تھے۔ یہودیوں نے محض اس لیے انکار کیا تھا کہ یہ بنی اسرائیل میں سے کیوں نہیں۔

زندگی کے ہر شعبہ میں خود ہمارے ہاں پائی جانے والی تنگ نظری کی کیفیت

آپ کہیں گے کہ صاحب! واقعی یہ چیز تو بڑی تنگ نظری ہے۔ یہ بھی کوئی دلیل ہے؟ اور روز ہم یہی کچھ کرتے ہیں۔ ابھی الیکشن آنے والے ہیں کہ بھئی! یہ جو دوسرا Candidate (امیدوار) کھڑا ہے یہ تو بہت زیادہ اچھا ہے' اسے ووٹ کیوں نہیں دیتے'' کہ جی او سہڈا اجٹ بھرا ہیگا اے او ہنوں کیوں نہ دیئے ❶۔'' بات بڑی چھوٹی سی بظاہر نظر آئے گی لیکن کیا یہ وہی چیز ہے کہ یہ بنی اسرائیل میں سے

---

❶ جناب! وہ ہمارا ذات برادری جاٹ کا ہے' یہ ووٹ اسے ہی کیوں نہ دیں۔

نہیں ہے‘ اس لیے ہم اس کی بات کو کیوں مانیں۔ وہی نسبی تعصب ہے‘ وہی قومی تنگ نظری ہے۔ ذرا آگے بڑھے ہم برادریوں کے اندر تقسیم ہوگئے۔ پہلی چیز ہمارے ہاں مذہبی فرقہ پرستی ہے۔ آپ کوئی حنفی کھڑا کر دیجیے اور کسی اہلِ حدیث سے کہیے کہ اسے ووٹ دیدے۔ وہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے کہ ہمارے فرقے کے باہر کا کوئی آدمی بھی نیک شریف اور قابلِ عزت اور قابلِ قدر ہوسکتا ہے۔ دوسرے فرقے والے تو سارے جہنمی ہوتے ہیں۔ مذہب کی دنیا سے باہر نکلے تو آپ برادریوں کے اندر بٹے ہوئے ہیں۔ پہلی چیز برادری کی آجاتی ہے۔ عزیزانِ من! دو لفظوں میں دین کی اصل اور بنیاد سمجھ لیجیے۔ جہاں مساواتِ انسانیہ کے خلاف کوئی تصور آپ کے ہاں آیا وہ غیر اسلامی ہوگیا! یاد رکھیے!

دین سراپا مساواتِ انسانیہ کا علم بردار ہوتا ہے جب کہ مذہب تضادات کے مجموعہ کا گہوارہ

دین کی لم مساواتِ انسانیہ ہے۔ سب انسان پیدائش کے اعتبار سے یکساں ہیں اور **لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا** (6:132)۔ ان کے مدارج سوسائٹی کے اندر ان کی ذاتی ہنر اور قابلیت اور کردار کی بنا پہ ہیں۔ **اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ** (49:13) ان میں سے جو سب سے زیادہ اپنے فرائض کو سرانجام دینے والا ہو‘ وہ سب سے قابلِ عزت ہے۔ یہ ہے مساواتِ انسانیہ‘ یہ ہے دین کی اصل و بنیاد اور یہی چیز ہے جو میں نے پچھلی دفعہ معاشی دنیا کے اندر عرض کیا تھا‘ اس دنیا میں جس انداز سے دو بچے پیدا ہوتے ہیں‘ وہ کسی خاندان کے ہوں ان میں مساوات ہوتی ہے۔ کوئی اپنی پیٹھ کے اوپر سونے (Gold) کی گٹھڑی لاد کر نہیں لاتا‘ کسی بچے کے ہاتھ میں ایسی دستاویز نہیں ہوتی کہ یہ دس ہزار مربعے کا مالک ہے۔ دونوں بچے یکساں طور پہ آتے ہیں۔ یہ ہے فطرت کی مساواتِ انسانیہ۔ اس کے بعد آپ کا باطل نظامِ زندگی ہے‘ جوان دونوں کے اندر اسی دن تفریق کر دیتا ہے کہ یہ کروڑ روپے کا مالک ہے اور اس کے لیے دودھ کے بھی پیسے نہیں ہیں۔ یہ ہے باطل نظام۔ انسان اور انسان میں انسانیت کے اعتبار سے کسی طرح سے بھی کوئی فرق پیدا کر دینا‘ تفریق و تمیز پیدا کر دینا‘ یہ ہے باطل کا نظام‘ یہ ہے غلط تصورِ زندگی‘ یہ ہے کفر۔ اس لیے انسانیت کو مذہبی فرقوں کی بنا کے اوپر تقسیم کر دینا یا یہ ذات اور برادریوں کی بنا پر تقسیم کر دینا یا دولت کے اعتبار سے تقسیم کر دینا‘ یہ ساری چیزیں غیر اسلامی اور غیر دینی تصورات ہیں۔ ہر انسانی بچہ‘ انسانی بچہ ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ معاشرے کے اندر ان کے مقامات ان کے ذاتی جوہر اور کیریکٹر اور کردار کی بنا پر ہیں۔ بس یہ ہے اسلام۔

نبوت کے سلسلہ میں یہودیوں کی تنگ نظری‘ زندگی کے حسانات سے محرومی کا باعث بن گئی

کہا ہے کہ **بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ** (2:90)۔ بنی اسرائیل کی طرف سے نبوت کیوں چلی گئی‘ یہ محض اس بنا پر انکار کر رہے ہیں‘ نتیجہ اس کا یہ کہ **فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ**

مُّهِيۡنٌ (2:90)ان کی اپنی کھیتیاں جھلس گئیں۔ جو زندگی کی خوشگواریاں' جو اس نظام کے اتباع سے' ان کو حسنات میسر آنی تھیں' ان سے محروم رہ گئے' ان کی امیدوں کی کھیتیاں جھلس گئیں اور پھر رسوا کن تباہیاں ان کے اوپر مسلط ہو گئیں عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ کہا ہے کہ رسوا کن تباہیاں تھیں وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَآ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَ يَكۡفُرُوۡنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (2:91)۔ اب ان کے پاس یہ چیز سامنے لے کر جاؤ کہ بھائی! آن میرٹ (حُسن و قبح کی بنیاد پر) اس کو پرکھ کر دیکھو کہ یہ کیسی ہے۔ اور اگر یہ تمہارے معیارِ حق وصداقت پہ پوری اتر آئے تو اس کو تسلیم کر لو۔ وہ کہیں گے کہ نہیں صاحب! یہ جو ہمارے ہاں عقیدے ہیں' جس چیز کے اوپر ہم چلے آ رہے ہیں' جن چیزوں کو ہم صحیح مانتے ہیں' ہم اسی کو صحیح مانتے چلے جائیں گے' ہم کسی دوسری بات کو دیکھنے پرکھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔

ہماری کہانی' بنی اسرائیل کی زبانی

آپ دیکھتے ہیں کہ مذہبی تنگ نظریاں کیا ذہنیت پیدا کر دیتی ہیں؟ اور پھر دیکھتے ہیں کہ بات بنی اسرائیل کی ہو رہی ہے اور آئینہ ہمارے سامنے رکھا ہوا ہے۔ اس میں ایک ایک بات ہماری بیان ہو رہی ہے۔ کسی فرقے والے کے ساتھ بات کر کے دیکھیے' وہ دوسرے کی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا کہ نہیں صاحب! ہم نے دیکھ لیا حق اور صداقت ہمارے پاس ہے' بس اس کے اوپر جم کر کھڑے ہو جائیے اور پھر اپنے حلقے کے لوگوں کو شدت کے ساتھ تاکید کی جاتی ہے کہ وہاں نہ جانا' ایمان خراب ہو جائے گا۔ یعنی اس ایمان کا اندازہ لگائیے جو کہیں دوسری جگہ جانے سے ہی خراب ہو جاتا ہے۔ یہ عجیب قسم کی چھوئی موئی ہے۔ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جب کہا جاتا ہے کہ صاحب اسے آن میرٹ (حُسن و قبح کی بنیاد پر) دیکھیے قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَآ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَ يَكۡفُرُوۡنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (2:91) آؤٹ رائٹ فیصلہ ہے کہ نہیں صاحب! ہم تو اس کو سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ وَ هُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمۡ (2:91) حالانکہ ذرا کھڑے ہو کر سوچ لیتے تو انہیں نظر آ جاتا کہ یہ ان کی کوئی مخالفت نہیں کر رہا۔ جو ان کے دعوے ہیں' یہاں ان دعوؤں کو سچا کر کے دکھانے والی چیز ہے لیکن یہ بات تو اس کی سمجھ میں آئے جو کھڑا ہو کر ذرا سوچے' اسے پرکھے اور جس نے اپنی روش ہی یہ بنا لی ہو کہ جونہی اس کے خلاف کوئی بات آ کر اس نے کہی' کسی دوسری چیز کی طرف توجہ لائی' بغیر سوچے سمجھے اس نے اس کو ردّ کر دیا کہ نہیں صاحب! ہم تو اس کے اوپر غور کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ کہا کہ تم یہ کہتے ہو کہ نہیں صاحب! جو ہمارے انبیاء کی طرف آیا تھا' جو ہمارے پاس ہے' ہم اسی کے اوپر ایمان لاتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے انبیائے کرام کی مخالفت خود بنی اسرائیل کی طرف سے کیوں؟

قرآن ایک اور دکھتی ہوئی رگ پکڑتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر یہی چیز تھی تو تمہاری تاریخ بھی تو تمہارے سامنے ہے۔ تمہاری اپنی تاریخ

یہ ہے کہ قُلۡ فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِیَآءَ اللّٰہِ مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ (2:91) تمہارے اپنے ہی بنی اسرائیل کے انبیاء بھی جب تمہاری طرف آتے رہے اور وہ ایسی بات کہتے رہے جیسا کہ پہلے قرآن نے کہا ہے کہ بِمَا لَا تَہۡوٰۤی اَنۡفُسُکُمُ (2:87)۔ کوئی ایسی بات جب انہوں نے کہی کہ جو تمہیں پسند نہیں تھی، تم اپنی روش سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے، تمہاری کیفیت پھر یہ ہوگئی کہ تم نے ان کی بھی مخالفت کی۔ تو سوال اگر بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل ہی کا تھا تو خود انبیائے بنی اسرائیل میں سے بھی جو ایسے آئے تھے جنہوں نے تمہیں تمہاری غلط روش پہ روکا، ٹوکا، تو تم نے ان کی بھی مخالفت کی۔ بات پھر یہ تو نہ ہوئی کہ تم غیر بنی اسرائیل کی طرف آنے والی اس وحی کو، اس پیغام کا انکار کرتے ہو۔ تمہاری تو کیفیت یہ ہے کہ جو بات بھی تمہاری مفاد پرستیوں کے خلاف جاتی ہے تم اس کا انکار کر دیتے ہو۔ معیار تو تمہارے ہاں یہ ہو گیا۔

جب قرآن حکیم جا بجا حتمی طور پر انبیائے کرام کو اَغۡلِبَنَّ قرار دیتا ہے تو پھر ان کے قتل ہو جانے کے کیا معنی؟

برادرانِ عزیز! یہاں ایک چیز سامنے آئی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ صاف ہو جانی چاہیے فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِیَآءَ اللّٰہِ مِنۡ قَبۡلُ (2:91)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے کہ پھر تم نے اس سے پیشتر جو انبیاء تمہاری طرف آئے انہیں کیوں قتل کر دیا۔ سمجھا اس سے یہ جاتا ہے کہ خدا کے انبیا کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ دوسری جگہ قرآن میں رسل بھی آیا ہے کہ رسولوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ یہ بات ذرا اہم ہے، میں اس لیے عرض کر رہا ہوں۔ کہا ہے کہ قُلۡ قَدۡ جَآءَکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِیۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیۡ قُلۡتُمۡ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡہُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (3:183)۔ اس سے پیشتر تمہاری طرف رسول وہی چیز لے کر آئے تھے جو تم چاہتے تھے تو بتاؤ کہ تم نے انہیں قتل کیوں کر دیا؟ اب یہاں یہ چیز سامنے آئی کہ انبیا اور رسول دونوں کے متعلق قرآن میں یہ چیز ہے کہ تم انہیں قتل کر دیا کرتے تھے یعنی ان کے ترجمے کی رو سے یہ میں عرض کر رہا ہوں۔ قتل کا ترجمہ اگر یہ کیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ قرآن خود اس کی شہادت دیتا ہے کہ انبیا یا رسولوں کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ قرآنِ کریم کا دعویٰ یہ ہے اور بڑے زور سے یہ بات کہی گئی ہے کہ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیۡ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ (58:21)۔ خدا نے یہ فیصلہ کر دیا ہوا ہے، اس کا قانون ہے، یہ بات مقدر ہو چکی ہے، یہ طے شدہ بات ہے، کَتَبَ اللّٰہُ (58:21) لازم کر دیا ہوا ہے۔ کتنے زور سے یہ چیز کہی گئی ہے۔ یہ چیز کیا ہے؟ یہ کہ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیۡ (58:2) میں اور میرے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کا تو یہ دعویٰ ہے اور اس کے دعوے کے بعد کہا کہ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ (58:21) ہم قوت رکھتے ہیں، ہم غلبہ رکھتے ہیں۔ ان کے معنی ہیں کہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا نظامِ رسل جو اس نظام کو لے کر آنے والے ہیں، اس کو قائم کرنے والے ہیں۔ یہاں تو اتنا حتمی دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ غالب رہیں گے: کَتَبَ اللّٰہُ. اس کے ساتھ ہی دوسری

آیت ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحَآدُّوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗۤ اُولٰٓئِکَ فِی الۡاَذَلِّیۡنَ (58:20) جو خدا اور رسول کے خلاف جنگ کریں گے یقیناً وہ مفتوح ہوں گے، مغلوب ہوں گے، ذلیل ہوں گے اور اس کے بعد ہے کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ (58:20)۔ اور پھر انہی آیات کے اندر قرآن نے دو گروہ گنائے ہیں۔ ایک تو حزب الشیطان ہے، ہر غیر خداوندی گروہ، کہا کہ ھُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ (58:19) وہ تباہ ہونے والے ہیں اور اس کے مقابلے میں یہ دوسرا گروہ حزب اللہ ہے۔ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (58:22) یہ خدا کی پارٹی ہے، خدا کا گروہ ہے، اس کی جماعت ہے، اس کی فوج ہے۔ یہ کامیاب ہوں گے، وہ ناکام رہیں گے، یہ غالب آئیں گے، وہ مغلوب ہوں گے۔ یہ بالکل بیّن آیات ہیں۔ اب اگر یہ چیز ہے جو قرآن نے یہاں کہی ہے کہ خدا کے رسول غالب آئیں گے تو یہ جو چیز ہے کہ تم خدا کے رسولوں کو، نبیوں کو قتل کر دیا کر دیتے تھے، تو جو مقتول ہے وہ تو غالب نہیں آتا۔ یہ کیا چیز ہے؟

برادرانِ عزیز! اس کی بنیادی وجہ وہی ہے جو میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ ہم قرآن کے ان الفاظ کا ایک معنی اپنے ہاں جو مروج ہے، وہ لے لیتے ہیں، اسی کی بنا پہ ہم ترجمہ کر دیتے ہیں اور اس کی وہ تفسیر جو اسرائیلیات میں چلی آ رہی تھی، ہم ان کے ہاں وہی ترجمے کر دیتے ہیں۔ یہودی اپنے ہاں بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ وہ اپنے نبیوں کو قتل کر دیا کرتے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تو وہ بڑے زعم سے اور بڑے فخر سے اور تکبر سے یہ آج تک کہتے چلے آ رہے تھے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا، صلیب پہ چڑھایا، یہ سب کچھ کیا اور انہی کے ہاں کے اس تصور کے ماتحت، مسلمان بھی یہ مانتا چلا آیا ہے کہ ٹھیک ہے، انہیں پکڑا اور صلیب پہ چڑھایا۔ اگرچہ اگلی بات پھر ذرا ان کے ساتھ مل کر یہ بھی کہی کہ ہاں جی پھر وہ خدا نے اس کو آسمان پہ اٹھا لیا۔ یہ قتلِ انبیا یا قتلِ رسل تو غلبے والی بات نہیں ہے۔

لفظ قتل کا قرآنی مفہوم اور منصب نبوت کی کامیابی کی تفصیل

عزیزانِ من! یہ لفظ جو قتل ہے اس کے غلط مفہوم سے یہ ساری چیزیں پیدا ہوئیں۔ عربی زبان کے جو بڑے بڑے مستند لغت ہیں، انہیں آپ اٹھا کر دیکھیے۔ یہ لفظ ان کے ہاں بڑا ہی وسیع المعنی ہے۔ یہ ٹھیک بات ہے کہ جسے ہم قتل کہتے ہیں، ذبح کہتے ہیں، یہ بھی اس میں ایک چیز ہے لیکن اس کے یہی معنی نہیں ہیں۔ اس کے معنی ان کے ہاں تحقیر اور تذلیل کے بھی ہیں، کسی کو ذلیل کرنا، کسی کی تحقیر کرنا اور اس کے معنی ہوتے ہیں، کسی شے کو غیر مؤثر بنا دینا، Ineffective کرنے کی کوشش کرنا، اس کے پیغام کا اثر زائل کر دینا، ایسی کوشش کرنا کہ وہ جو بات کہے، تو اس پہ دھیان نہ دیں، اس پہ غور نہ کریں، اس کے پیچھے نہ لگیں۔ ان تمام چیزوں کے لیے عربی زبان میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جب آپ اس کے یہ معنی لیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن کے ان بیانات میں جہاں وہ کہتا ہے کہ آخر الامر غالب آتے ہیں، یہ ٹھیک ہے، جنگ ہوتی ہے، آپس میں حق و باطل کی کشمکش ہوتی ہے، اس میں اتار چڑھاؤ بھی ہوتا ہے، جنگ احد میں ہنگامی طور پہ کچھ شکست

بھی ہو جاتی ہے' یہ ہنگامی اور وقتی طور پہ شکست اور فتح کی بات نہیں ہے۔ کہا تو یہ ہے کہ پھر ان کا پیغام غالب آ کر رہتا ہے۔ قرآن کی بتائی ہوئی تاریخ یہ ہے کہ جب بھی خدا کا سچا پیغام لے کر آنے والا جو رسول بھی آتا ہے' جو نبی بھی آتا ہے' وہ جس حلقے میں جس جگہ بھی' جتنے حصے کے اندر بھی' جو بھی اس کا دائرۂ تبلیغ ہوتا ہے' اس میں اپنے اس پیغام کو جب وہ دیتا ہے اور اس نظام کے قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ یقیناً کامیاب ہوتا ہے۔ یہ اس کے بعد کے اس کے متبعین ہیں' اس کے نام لیوا ہیں' جب اس پیغام و نظام کو چھوڑتے ہیں تو پھر ان میں شکست ہوتی ہے' وہ مغلوب ہوتے ہیں' وہ مفتوح ہوتے ہیں۔ خدا کا پیغام صحیح معنی میں اور اس کا قائم کرنے والا اس کا رسول اور وہ جو جماعت تیار کرتا ہے' یہ ہو نہیں سکتا کہ اتنا سچا پیغام اس قسم کے اس پیغام کو لے کر اٹھنے والے' یہ اپنے اس حلقے کے اندر ناکام ہو جائیں اور یہ جو نبی ہے وہ خاسر اور ناکام (معاذ اللہ) دنیا سے چلا جائے۔ ساری تاریخ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہی بیان پیش کیا جاتا ہے' انہی کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بہرحال مغلوب ہوئے' گرفتار ہو گئے' صلیب پہ چڑھائے گئے۔ قرآن کہتا ہے کہ **مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ** (4:157) یہ بات قطعاً غلط ہے۔ نہ انہیں قتل کیا گیا' نہ انہیں صلیب پہ چڑھایا گیا۔ وہ جو ہمارے ہاں ایک استثنائی مثال پیش کی جاتی ہے' قرآن اس حتم و یقین سے انکار کرتا ہے اور پھر اس اصول کے ماتحت تو ہم ایک سیکنڈ کے لیے اس چیز کو تسلیم ہی نہیں کر سکتے۔ جب وہ کہتا ہے کہ **كَتَبَ اللّٰهُ** (58:21) خدا کا یہ مقدر کیا ہوا فیصلہ ہے' یہ قانونِ خداوندی ہے کہ خدا کا نظام اور اس کے رسول ہمیشہ غالب آتے ہیں۔ عزیزانِ من! انسانیت کی منفعت کا' اتنا عظیم انقلاب' لے کر اٹھنے والے اتنی بلند سیرت کے انسان' خواہ ان کی جماعت کتنی چھوٹی سی کیوں نہ ہو' اور وہ بھی اپنے حلقۂ اثر و تبلیغ کے اندر ناکام رہ جائیں' اس کے بعد تو پھر شروع سے آخر تک کامیابیاں شیطان ہی کے حصے میں رہیں گی اور وہ کہتا ہے کہ جو حزب الشیطان ہے وہ کبھی غالب نہیں آ سکتا' اگر مقابلے میں یہ جماعت موجود ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی Absence' اس کی غیر موجودگی میں تو یقیناً وہی غالب آئیں گے۔

روشنی کی موجودگی اندھیرے پر غالب نہ آ سکے' یہ ناممکن ہے

اگر روشنی کی موم بتی بھی نہیں ہے تو اندھیرا غالب آئے گا لیکن اگر ایک ماچس بھی کسی وقت آپ نے جلا دی ہے تو ماچس کی جو روشنی ہے وہ اندھیرے کے اوپر غالب آتی ہے۔ **كَتَبَ اللّٰهُ** (58:21) یہ قانونِ خداوندی ہے اور یاد رکھو! جہاں حق اور باطل کی کسی کشمکش کے اندر آپ دیکھیں کہ یہ مغلوب ہو جانے والی بات ہے تو سوچ لیجیے کہ یا وہ پیغام خداوندی نہیں تھا یا اس کو لے کر جو اٹھے تھے وہ اپنی سیرت و کردار کے اعتبار سے پیغامِ خداوندی پہ پورے نہیں اترتے تھے' ورنہ قرآن کا یہ جو دعویٰ ہے' یہ غلط ہو جائے گا اور قرآن کا دعویٰ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ عزیزانِ من! آج بھی یہی صورت ہو گی۔ یہ ٹھیک بات ہے کہ انفرادی طور پر غلط معاشرے کے اندر اگر ایک شخص یہ کوشش

کرتا ہے جیسا میں کئی دفعہ کہا کرتا ہوں کہ آج کے معاشرے میں ایک شخص کہتا ہے کہ صاحب! میں دیانتداری سے کوئی دکانداری کروں گا' اس کو اس میں نقصان ہو جاتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ صاحب! یہ جو دیانت اور امانت ہے' یہ ہے ہی ایسی کہ کامیابی نہیں ہوتی۔ یہ غلط تصور ہے۔ یہ ایک اجتماعی چیز ہے اجتماعی نظام کا نام ہے۔

انبیائے کرام کی تحقیر کیوں' دیوتاؤں سے محبت کیوں؟

یہ نظام جن بنیادوں پہ قائم ہوتا ہے' قرآن نے ان کے متعلق یہ کہا ہے کہ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ (14:24) اس کی وہ بنیادیں بڑی محکم ہیں بشرطیکہ خالص نظامِ خداوندی ہو اور اس کو لے کر اٹھنے والی جو جماعت یا افراد ہیں' وہ پہلے اپنی سیرت و کردار کو اس کے قالب میں ڈھال لیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ کبھی دنیا میں ناکام نہیں ہوں گے' اس لیے یہاں جو کہا ہے تو کہا یہی ہے کہ فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ (2:91)- تم ان کی تحقیر و تذلیل کیوں کرتے تھے؟ ان کے پیغامات کو تم غیر مؤثر کیوں بنایا کرتے تھے؟ اگر تم یہی کہتے ہو کہ ہم بنی اسرائیل کے انبیا پہ تو ایمان لائیں گے' غیر بنی اسرائیل پر ایمان نہیں لائیں گے' تو تم بنی اسرائیل کے انبیا کے متعلق یہ کچھ کیوں کیا کرتے تھے؟ عام انبیا تو ایک طرف' اگلی آیت میں ہے کہ وَ لَقَدۡ جَآءَكُمۡ مُّوۡسٰى بِالۡبَيِّنٰتِ (2:92) حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا عظیم القدر پیغمبر صاحب ضربِ کلیم تمہارے ہاں آیا' اتنے اتنے واضح پیغام اور قوانین تمہاری طرف لے کر آیا' تم نے کیا کیا؟ ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَ اَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ (2:92) اس کی عدم موجودگی میں وہی پرانے دیوتا جو ایک ایک کر کے اس نے نکالے تھے' اسی دیوتا کی محبت تمہارے دلوں کے اندر تھی' تم نے پھر ان کو اپنا معبود بنا لیا۔

حریم کعبہ میں ایک بار پھر آستینوں میں چھپے بتوں کی آرائش کا اہتمام

عزیزانِ من! پھر یہ عرض کر دوں کہ بات بنی اسرائیل کی ہو رہی ہے اور کہا ہم سے جا رہا ہے کہ ذرا کان کھول کر سنو۔ یہ جو کہا ہے کہ مِنۡ بَعۡدِهٖ (2:92) کیا نبی اکرم ﷺ کے بعد اس قوم نے بھی یہی نہیں کیا کہ وہی بت جو ان کی آستینوں میں پہلے سے چھپے ہوئے تھے اور ایک ایک کر کے نکالے گئے تھے' انہوں نے پھر ان ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو اپنی مژگانِ عقیدت سے ایک ایک کر کے اکٹھا کیا اور انہیں پھر پہلے سے بھی زیادہ شوکت و حشمت کے ساتھ حریمِ کعبہ کے اندر نصب کر دیا کہ اب انہیں کوئی وہاں سے نکال نہ سکے۔ کیا اس اسلام کے اندر وہ سارے گوسالہ پھر سے نہیں گھس آئے جن کو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہؐ کے خنجر سے ذبح کیا گیا تھا۔ ایک ایک کر کے باطل کے وہ سارے عقائد' نظریات' تخیلات' رسومات' تمام کی تمام آج آپ کے ہاں اسلام کا جزو نہیں بن گئیں؟ اور پھر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جب کوئی بھی ان کے خلاف اٹھ کر کہتا ہے کہ ان کو ذبح کرو جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا' تو کوئی اس کے لیے تیار نہیں ہوتا؟ اس لیے کہ اگلی

آیت میں ہے کہ کہا یہ گیا تھا کہ وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ وَ رَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡرَ بِقُوَّۃٍ (2:93) اس بات کو سنو اور پھر پوری قوت کے ساتھ اس کے اوپر جم جاؤ' اس کی اطاعت کرو' اس کے مطابق اپنا نظامِ زندگی متشکل کرو' اپنے آپ کو اس میں پوری قوت کے ساتھ ڈھالو۔ یہ لفظ اسۡمَعُوۡا (2:93) ہے کہ سنو اور یہ ''سننے'' کے بعد اگلی چیز صرف ''سننا ہی نہیں' سنو اس لیے کہ سمجھو' سمجھو اس لیے کہ اس کے مطابق پھر اپنے ہاں نظام متشکل کرو' اپنی زندگیاں اس کے مطابق بناؤ۔ یہ عہد تھا۔ تمہاری کیفیت کیا ہوئی؟ عزیزانِ من! بڑے غور سے سننے کی بات آ گئی۔ تمہاری کیفیت یہ ہوئی کہ قَالُوۡا سَمِعۡنَا (2:93) تم نے کہا کہ ہم نے سنا ہے۔ اس پیغام کو سننے تک کی بات تو تم نے قائم رکھی اور اس کے بعد بجائے اس کے کہ تم اطعنا (2:285) کہتے کہ ہم پھر اس کے مطابق عمل کرتے ہیں' سنو! وَ عَصَیۡنَا (2:93) تم نے عمل اس کے خلاف کیا۔

''سمعنا'' کے سلسلہ میں ثواب کے غلط مفہوم نے ہمیں قرآنی حقائق تک پہنچنے ہی نہیں دیا

عزیزانِ من! ان کے ہاں تو معلوم نہیں تھا کہ سننے کا طریق کیا تھا؟ اتفاق سے آج کل یہ بات ہو رہی ہے۔ وہاں اس مسجد میں کیا ہوا جی؟ جی! انہوں نے ایسا اچھا قرآن سنایا!! ہم قرآن سنتے ہیں اور اس شدت سے سنتے ہیں کہ دنیا کی کسی قوم نے اپنی کتاب کو ایسے نہیں سنا ہوگا۔ آج اس مہینے کے اندر ہر سال اس دور میں بھی جب یہ بہرحال کہا جاتا ہے کہ لوگوں نے یہ چیزیں چھوڑ دیں' پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ ستر کروڑ [1] کی آبادی میں سے کوئی بیس تیس کروڑ تو یقیناً ایسے ہوں گے جنہوں نے اس التزام کے ساتھ اس کتاب کو سنا اور سنایا جاتا ہے' جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ قرآن سنا: سَمِعۡنَا اور اس سننے کے بعد وَ عَصَیۡنَا (2:93) ہم نے اس کے خلاف سب کچھ کیا۔ کونسی چیز ہے جو فریب دیتی ہے؟ یہ کہ سننے سے ثواب حاصل ہوتا ہے۔ تلاوت سے' ایک ایک حرف سے' دس دس نیکیاں ملتی ہیں۔ کیسے جاؤ کریڈٹ بیلنس اپنی طرف' آپ کے رجسٹر کے ورق کے ورق بھر جائیں گے۔ سَمِعۡنَا: قرآن سننا۔ عجیب چیز ہے جو قرآن کہہ جاتا ہے۔ ہم نے قرآن سنا اور اس کے لیے بڑی مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ آج کل تو خیر وہ کم مشقت طلب ہے۔ گرمیوں کے زمانے کا روزہ' صبح چار بجے سے رات کے آٹھ بجے تک اس قدر شدت کی گرمی میں اس کے بعد آدمی نڈھال ہو جاتا ہے۔ تو پھر آواز آتی ہے' اٹھ کر چلا جاتا ہے' بیس بیس تراویح' پارہ پارہ دو دو پارہ' تلاوت کا ہے' پھر وہ آپ کے ہاں کے شبینے ایک ایک رات میں ختم ہوتے ہیں۔ بڑی عقیدت اور بڑی محبت سے سنتے ہیں۔ کہا ہے کہ سَمِعۡنَا (2:93) ہم سنتے ہیں۔ نہ پڑھنے والے کو پتہ کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں' نہ سننے والے کو پتہ کہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ وہ قرآن پڑھا رہا ہے' یہ قرآن سن رہے ہیں' ایک لفظ کے معنی کا اسے پتہ نہیں' ایک لفظ کا مطلب ان کو پتہ نہیں۔ یہ کروڑوں کی تعداد میں دہرایا چلا جا رہا ہے' عمل وہی ہو رہا ہے جو اس سے پیشتر ہو رہا تھا' جیسا ہوتا چلا آ رہا ہے۔

---

[1] یاد رہے یہ بات نومبر 1968ء کی 24 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

برادرانِ عزیز! اب سوال یہ ہے کہ اس کے اوپر کونسی چیز ان کو آمادہ کر دیتی ہے کہ اتنی مشقتوں کے بعد یہ جا کر قرآن کو سنیں؟ انہیں یہ آمادہ کرتا ہے جو عقیدہ دیا جاتا ہے کہ اس کے سننے سے بڑا ثواب ہوتا ہے۔ قرآن کا سننا **سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا** (2:285) دو چیزیں تھیں۔ اس میں سننے کے حصے کو تو اس انتظام کے ساتھ باقی رکھنا' اور **اَطَعۡنَا** (2:285) کے حصے سے ایسا کفر برتا ہے۔ کیا **اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَ تَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ** (2:85)۔ یہی نہیں ہے؟ کہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھنا' یہ **سَمِعۡنَا** ہے۔ اور دوسرے حصے سے انکار برتنا **اَطَعۡنَا** (2:285) کی جگہ **وَ عَصَيۡنَا** (2:93) ہے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ **فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا** (2:85) اس دنیا کی زندگی کے اندر ذلت اور خواری ہے۔

برادرانِ عزیز! جتنی تبلیغ' نشر و اشاعت' سمع' تلاوت' اس کتابِ عظیم کا پڑھنا ہوتا ہے' دنیا میں کسی کتاب کا ایسا نہیں ہوتا اور جس قدر یہ قوم اس کتاب کی خوشگواریوں سے محروم ہے' اس کی مثال بھی شاید ہی تاریخ میں کہیں ملے۔ اس لیے کہ **قَالُوۡا سَمِعۡنَا** (2:93) کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور اس کے بعد وہ **وَ عَصَيۡنَا** (2:93) ہے کہ عمل اس کے خلاف کیا۔ یہ عمل کیوں اس کے خلاف ہوا؟ کونسی چیز ہے جو اس کے خلاف لے جاتی ہے؟ عزیزانِ من! اس لیے کہ **وَ اُشۡرِبُوۡا فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡعِجۡلَ بِكُفۡرِهِمۡ** (2:93) وہ معبودانِ باطل' جو انہوں نے اپنے ذہن کے اندر تراشے ہوئے تھے اور ان کے حریمِ قلب کے اندر نصب تھے' ان کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں کے اندر پیوست ہو چکی ہوئی ہے' وہ وہاں سے نہیں نکل رہی۔ اس لیے **سَمِعۡنَا** کی حد تک تو یہ ایک Mechanical (میکانکی) عمل ہے۔ وہ تو ہوتا جاتا ہے' کھڑے ہیں' سن رہے ہیں۔ کان میں قرآن کی آواز پڑ رہی ہے مگر قلوب کے اندر وہی گئو سالے ہیں:

ره مده در کعبه اے پیر حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

(اے حرم کے پیر! اقبال رحمہ اللہ کو کعبہ میں داخل نہ ہونے دے۔ وہ تو ہر گھڑی اپنی آستین میں ایک نیابُت (خدا) رکھتا ہے)۔

کعبہ کے تین سو ساٹھ بتوں کے مقابلے میں تین ہزار بتوں کی پوجا

اس چیز کو تو ہم بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں ہے اور یہ ہے بھی قابلِ فخر کہ نبی اکرم ﷺ نے فتحِ مکہ کے بعد' کعبے کے اندر جو وہ پتھر کے بت تھے ان کو نکال کر پاک وصاف کر کے خدا کا گھر خدا کے لیے متعین کیا۔ ٹھیک ہے جب تک اس میں سے دوسرے کرائے دار نہ نکلیں' خدا تو اندر نہیں جا سکتا تھا لیکن ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ وہاں تو اگر تین سو ساٹھ بت تھے تو تین ہزار بت ہمارے ہاں قلب کے اندر ہر وقت پیوست ہوتے ہیں۔ اس قلب کے اندر خدا کیسے آ سکتا ہے جس میں ہم نے اتنے بُت رکھے ہوئے ہیں؟ آنے کا سوال ہی نہیں

ہے۔ وہ تو بڑا غیور واقع ہوا ہے۔ ایک باعزت کرائے دار اس مکان میں نہیں آتا جہاں پہلے کرائے دار بیٹھا ہوا ہو۔ کیا خدا اس قلب کے اندر آ جائے گا' جس کے اندر اتنے گئوسالہ رکھے ہیں؟ کہا ہے کہ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ (2:93) اگر یہ ان کی پرستش بھی Mechanically (میکانکی طور پر) کر رہے ہوتے تو وہ ان کا نکال دینا آسان تھا' وہ کہتا ہے کہ دل کی گہرائیوں کے اندر' ان معبودانِ باطل کی محبت جاگزیں ہوتی ہے۔

دلوں میں سائیں جی کی محبت اور قرآن سے بغاوت

عزیزانِ من! لاکھ قرآن کی آیتیں پیش کیجیے ''اک سائیں بوہڑ شاہ دا قول جیہڑا ہیگا او ایناں گج گیا ہویا ہوندا ہیگا ئیں منن نوں تیار ہوندا آدمی۔ حضرت صاحب دے فرمان دے خلاف جاندا اے جی ❶ ۔'' او! کیا قرآنِ کریم کہتا ہے؟ کہ جی وہ آپ اس کے ظاہرہ معنی لیتے ہیں' اس کے باطن کے معنی وہی جانتے ہیں جی۔ او بابا! معنی تو اس کے پڑے ہوئے ہیں؟ کہ نہیں صاحب! وہ تو خود خدا سے رات کو جا کر پوچھ کر آتے ہیں۔ ''ایہد اہُن جواب کی دیوے بندہ ❷ ''۔ بات کیا ہے؟ یہ کہ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ (2:93) سائیں جی کی محبت دل کی گہرائیوں میں آئی ہوئی ہے۔ قرآن کے الفاظ سمعنا Mechanically (میکانکی طور پر) کان میں آ رہے ہیں' یہ بھی ہو رہا ہے' وہ بھی ہو رہا ہے۔ اس کا نتیجہ خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (2:85) ہے۔ تو ہم روز دیکھتے ہیں اور اس کے بعد پھر باقی دوسرا حصہ کیوں نہیں صحیح ہوگا' اس کے لیے کہا کہ وَ مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (17:72) جو کوئی اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (2:93) کہا ہے کہ اس طرح کے ایمان کے دعوے میں تمہارا ایمان جو کچھ تمہیں کہہ رہا ہے یہ بدترین چیز ہے جو تم کر رہے ہو۔ یہ ایمان کہ ہم قرآن سن آتے ہیں' کرتے وہ ہیں جو حضرت صاحب فرماتے ہیں' کہتا ہے کہ کیا ہے تمہارا ایمان جو تمہیں یہ کچھ بتا رہا ہے؟ پھر ان کا ادعا یہ تھا کہ ہم خدا کی چہیتی اولاد ہیں وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (5:18) ہم خدا کی چہیتی اولاد ہیں' ہم اس کے محبوب ہیں' اس لیے ہمارے سوا جنت میں کوئی نہیں جائے گا: وَ قَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی۔

روزِ محشر گناہگاروں کی شفاعت کا عقیدہ اور رسول اللہ کی خدا سے درخواست

یہ پھر وہی تنگ نظری ہے کہ ہم خدا کے محبوب ہیں' آپ کہیں گے کہ اس کے متوازی ہمارے ہاں کا عقیدہ ہے۔ یہ اپنے آپ کو ہم

---

❶ جو بابا بوہڑ شاہ کا قول ہے یہ اتنا رچ بس گیا ہوتا ہے کہ آدمی یہ کچھ ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔ یہ حضرت صاحب کے فرمان کے خلاف جاتا ہی نہیں ہے۔

❷ اب بندہ اس کا کیا جواب دے۔

براہِ راست نہیں کہتے' ایک واسطے سے خدا کے محبوب کی امت کہتے ہیں کہ جی ٹھیک ہے محبوب کا محبوب بھی تو محبوب ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے متعلق یہ کہہ لیا تھا' ہمارا بھی تو یہ شافع روزِ جزا' شفیع المذنبین عقیدہ ہے۔قرآن میں کہیں رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ الفاظ نہیں آئے کہ خدا اپنے محبوب کو ناراض نہیں کرے گا اور ایسا پیغمبر یہ دیکھ ہی نہیں سکے گا کہ اس کی امت جہنم کے اندر چلی جائے۔ یہ بات وہی ہے جو وہ کہتے تھے۔انہوں نے بھی تو یہی کہا تھا کہ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً (2:80) کے لیے ہم جہنم میں چلے جائیں گے۔ دو چار دن جب تک یہ ہمیں چھڑانے والے فارغ ہو کر آتے نہیں' اور اس کے بعد یہ آئیں گے اور ہماری شفاعت کر کے لے جائیں گے۔ مسلمانوں کا بھی تو یہی عقیدہ ہے۔ان کے ہاں جو شفاعت کی روایات ہیں' ان میں یہ پہلے فیصلے کے مطابق جہنم میں تو بھیجے جاتے ہیں۔حساب کتاب ہو کر اس کے مطابق جو فیصلہ ہے' ان کے اعمال کی بدولت' وہ تو جہنم میں اور پھر اس کے بعد وہ چھڑانے والے آ جاتے ہیں اور اس کے اندر سارا انداز یہ ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ جنت میں نہیں جائیں گے اور جب خدا یہ سارے فیصلے کرنے کے بعد' کورٹ کا ٹائم ختم ہو جائے گا' اٹھ کر جانے والا ہو گا تو اس وقت یہ دیکھے گا کہ رسول اللہ ﷺ تو باہر ہیں۔ان سے پوچھا جائے گا کہ آپ ﷺ کیوں جنت میں نہیں جاتے؟ آپ ﷺ فرمائیں گے کہ جب تک یہ میری امت نہیں جاتی' میں کیسے جنت میں چلا جاؤں صاحب! اگر وہاں بات صرف عدل کی ہوتی تو وہ کہتے کہ بھئی! عدل کے مطابق یہ کچھ ہو چکا ہے' اب اس میں کیا کیا جائے لیکن وہ تو محبوب ہیں' انہیں کیسے ناراض کیا جا سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ پھر بیٹھ جائیں گے۔ وہ لمبی بات آپ کو کئی دفعہ سنائی ہے اور آپ اسے روایات کی کتابوں کے اندر دیکھ لیجیے گا۔ پھر یہ جو خدا کے قانونِ عدل اور مکافاتِ عمل کی بنا پر اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے جو جہنم میں گئے ہوئے ہیں' وہ اس انداز سے پھر جنت میں بھیجے جائیں گے۔ان لوگوں کے سارے عقائد یہ تھے۔

اگر جنت کا حصول اس قدر یقینی ہے تو پھر ہم موت کی تمنا کیوں نہیں کرتے؟

عزیزانِ من! اب آگے بات آئی ہے جو قرآن کہتا ہے۔ سنیے! کس سے کہتا ہے' کس کو سناتا ہے؟ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ (2:94)۔ اگر یہی بات ہے جیسا تم کہتے ہو کہ مرنے کے بعد تو پھر جنت تمہارے ہی لیے ہے کسی اور کے لیے نہیں ہے' اور یقینی چیز ہے کہ وہ زندگی تمہیں ملے گی اور اس زندگی کے متعلق تم کہتے ہو کہ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوشگوار زندگی' کہیں زیادہ آسائشوں کی' آرائشوں کی زندگی ہے۔ اگر واقعہ یہی ہے تو یہاں کی بات سن لو کہ ایک شخص جھونپڑی میں مشقت سے دن گزار رہا ہے' دوسرے شہر میں اس کے لیے بہت بڑا محل تعمیر شدہ ہے' آرائش و آسائش کے سامان موجود ہیں' فراوانیاں' خوشحالیاں موجود ہیں' وہ تو انتظار کر رہا ہو گا کہ کس دن وہاں تکمیل ہو اور میں اس میں جاؤں۔ کہا ہے اگر یہی کیفیت

ہے جو تم کہتے ہو کہ آخرت کا گھر تمہارے ہی لیے ہے اور آخرت کا گھر تم کہتے ہو کہ اس کے مقابلے میں اتنا زیادہ خوشحالیوں اور آسائشوں کا گھر ہے تو پھر تم موت کی تمنا کیوں نہیں کرتے: فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:94) اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو پھر موت کی تمنا کیوں نہیں کرتے؟ پھر موت سے بھاگتے کیوں ہو؟ کہا کہ وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا (2:95) یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔

جہانِ فردا کی زندگی کے پرکشش نظاروں کا پرنور دیدار، پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کا متقاضی ہے

برادرانِ عزیز! یہ بڑی چیز ہے جو قرآنِ کریم نے زندہ قوموں کے متعلق کہی ہے۔ وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جو مرنا جانتی ہے۔ جو جان کو سنبھال کر رکھتی ہے، اس قوم کے نصیبوں میں زندگی نہیں ہو سکتی۔ قوموں کے متعلق یہ بڑا محکم معیار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ان کے لیے معیارِ زندگی دینے کو کیا ہے لیکن بنیادی چیز یہ ہے۔ قوم تو ایک بڑی چیز ہے، ایک فرد جو جان دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، یعنی جان بوجھ کر، خودکشی کرنے کے لیے نہیں، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ ٹھیک ہے، تیار ہو جاتا ہے۔ آپ دیکھیے گا وہ شخص کتنے آدمیوں کے اوپر بھاری اور دلیر ہوتا ہے، ایک فرد کے اندر بیسیوں آدمیوں کی قوت آ جاتی ہے۔ جان بوجھ کر، سمجھ سوچ کر، جان دینا اور پھر ایک بلند نصب العین کی خاطر جان دینا، اس کی حفاظت کے لیے میدانِ جنگ میں آ جانا، آپ سمجھتے ہیں کہ اس میں کتنی قوتیں ہوتی ہیں۔ قرآن نے ایک اور دس کا تو خود فیصلہ کر دیا ہوا ہے۔ جو آخری چیز انسان کو ان مقامات سے بھگاتی ہے، وہ جان کی حفاظت ہوتی ہے۔ پہلی چیز چھوٹے درجے پہ مال کی بھی حفاظت ہوتی ہے لیکن مال صدقہ جان ہوتا ہے۔ اگر مال اور جان کے اندر Tie (ٹکراؤ) پڑ جاتی ہے تو انسان جان کی خاطر مال دے دیتا ہے، انسان کی عزیز ترین متاع ہوتی ہے اور جو بطیّب خاطر، سمجھ سوچ کر، جہالت سے نہیں، محض ہنگامی جذبات کے طور پر نہیں، مایوسیوں کا شکار ہو کر خودکشی پہ نہیں، بطیّب خاطر، علم و بصیرت کی بنا پر، سوچ سمجھ کر، چیز کو تول کر، جان دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، وہ ایک جو فرد ہے، اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہوتا ہے تو قوم کا تو آپ پوچھتے کیا ہو۔ قرآن کریم نے ان چیزوں کے متعلق بتایا ہے۔ کہا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا (2:243) کیا تمہیں ان کا معلوم ہے؟ لاکھوں کی تعداد تھی، محض دشمن کے ڈر سے گھروں کو چھوڑ کر، موت کے خوف سے، بھاگ اٹھے۔ کہا کہ ان کی اتنی تعداد کچھ کام نہ آئی۔ خدا کے قانون کا فیصلہ یہ تھا کہ ان کے اوپر موت طاری ہو گئی۔ یہ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ کیا ہوا تھا؟ حَذَرَ الْمَوْتِ (243) موت کے ڈر سے بھاگ اٹھے تھے۔

تقسیمِ ہند کے دور میں نظم وضبط کی کم مائیگی کا نتیجہ لاکھوں افراد کی قربانیوں کی شکل میں ظاہر ہوا

عزیزانِ من! وہ جو ہمارے ساتھ تقسیم ہند کے زمانے میں ہوا تھا ہم لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ کسی نظم (Discipline) کے ماتحت اگر وہیں ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے تو کبھی یہ کیفیت نہ ہوتی۔ بہرحال قرآن بات وہاں کی کہہ رہا ہے کہ تم موت کے ڈر سے بھاگ اٹھے۔ خدا کا فیصلہ یہ تھا کہ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا (2:243) ان کے لیے اللہ کی طرف سے موت مقدر ہو گئی' اس کے بعد ثُمَّ اَحْیَاهُمْ (2:243) پھر ان کے لیے زندگی ہے' پھر ان کے لیے حیات آئی' یہ حیات ان کے لیے کیسے آئی؟ ہمارے ہاں تو وہ معجزے ہیں کہ ''اللہ میاں نے کہیا: مرجاؤ' سسری وانگوں مرگئے' کہیا: اٹھ کھلوؤ' اٹھ کے بیہہ گئے۔ اے پتلیاں دا تماشا ہون ڈیا اے[1]۔''

زندگی کو کسی بلند نصب العین کی خاطر جہانِ فردا کے حوالے کرنا' حیاتِ جاوید سے لطف اندوز ہونا ہے

یہاں ثُمَّ اَحْیَاهُمْ (2:243) پر غور کیجیے۔ یہاں پھر ھم آیا ہے۔ اسی قوم کو زندگی کیسے نصیب ہوئی؟ اس کے لیے کہا کہ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (2:244) موت کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھو' میدانِ جنگ میں کھڑے ہو جاؤ' زندگی مل جائے گی۔ یہی ہیں وہ جن کے لیے کہا ہے کہ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ (2:154) جو یوں اللہ کی راہ میں جان دے دیتا ہے اسے کیا تم مردہ کہتے ہو؟ مردہ تو تم ہو جو جان کو سنبھال کر رکھتے ہو۔ وہ اقبالؒ (1938-1877ء) کی اس تشبیہ کے الفاظ میں کہ جسم اور جان میں تو فرق ہی یہ ہے کہ جسم کا جتنا حصہ تم کاٹ کر پھینک دیتے ہو' وہ مر جاتا ہے' موت ہوتی ہے' وہ مردہ ہوتا ہے۔ جان کو اس طرح سے تم دے دیتے ہو تو وہ زندہ ہوتی ہے۔ جسم کا حصہ جسم کے ساتھ رہتا ہے تو جسم کے ساتھ مرتا ہے' جان بھی تمہارے جسم کے اندر رہتی ہے تو جان مر جاتی ہے۔ اس جان کو اگر خود کسی کی خاطر دیدو تو یہ ہمیشہ کے لیے حیاتِ جاوید حاصل کر لیتی ہے۔ کہا ہے کہ ثُمَّ اَحْیَاهُمْ (2:243) ان کو ہم نے زندگی عطا کی۔ کس طرح زندگی عطا کی؟ کہا کہ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (2:244) راہ خدا میں' انہوں نے جان دی۔ برادرانِ عزیز! اس طرح سے زندگی عطا ہوتی ہے۔ صحیح نصب العین کی خاطر جان دینے کے لیے میدان میں آ کر کھڑا ہو جائے' یہ ہوتی ہے زندگی اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے موت کو اس بات کا سب سے بڑا ٹیسٹ قرار دیا ہے کہ تمہاری ذات میں کتنی نشوونما ہو چکی ہے۔ کہا ہے کہ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (67:2) موت اور زندگی اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ اس بات کا ٹیسٹ ہو جائے کہ تم میں سے کون ہے کہ جو سب سے زیادہ متوازن

---

[1] اللہ تعالیٰ نے کہا: مرجاؤ' وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح مر گئے۔ کہا: اٹھ کھڑے ہو' وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ یہ پتلیوں کا تماشا ہو رہا ہے۔

(Balanced)ذات بنائے ہوئے آگے چلتا ہے:

ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تُو موت سے بھی مر نہ سکے

موت تو اس چیز کا آخری ٹیسٹ ہے کہ تم میں زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہوئی ہے یا نہیں۔ اسی لیے کہا کہ اگر یہ حقیقت ہے جو تم کہتے ہو کہ آخرت کا گھر تمہارے ہی لیے ہے' تم نے اپنے آپ کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ اخروی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے چلے جاؤ تو فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ (2:94) پھر موت سے کیوں گھبراتے ہو؟ موت کی تمنا کرو اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:94) اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو لیکن تم دیکھو گے کہ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ (2:95)۔ ''پتہ ہے کرتو تاں دا اپنے[1]''۔ عزیزانِ من! یہ ہیں موت سے ڈرنے والے۔ مومن کی تو کیفیت یہ ہے کہ

نشانِ مردِ مومن باتو گویم

بتاؤں تمہیں مردِ مومن کا نشان کیا ہوتا ہے؟

چوں مرگ آید' تبسم بر لبِ اوست

موت آتی ہے تو مسکراتا ہے۔

عزیزانِ من! جس نے پاس ہو کر اگلی کلاس میں جانا ہو' وہ نتیجے کے بعد ہنستا ہوا گھر آتا ہے۔ وہ نتیجے سے روتا نہیں۔ نتیجہ نکلنے سے تو وہ گھبراتا ہے' جسے پتہ ہے کہ میں نے فیل ہو جانا ہے۔ پاس ہونے والے کے لیے تو نتیجے کی برآمدگی کا دن عید کا دن ہوتا ہے' جشن کا دن ہوتا ہے' خوشیوں کا دن ہوتا ہے۔

مرگ کیا ہے؟ یہ کہ اس زندگی میں جو سال بھر میں کام کیا ہوا ہے' اس امتحان کے نتیجے کا دن ہے۔ مومن کون ہے؟ وہ جسے یقین ہے کہ میں نے پاس ہونا ہے۔ چوں مرگ آید' تبسم برلبِ اوست[2]۔ کہا ہے کہ وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا (2:96) موت کی تمنا کرنا تو ایک طرف' ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ مشرکین سے بھی زیادہ زندگی کی تمنا اپنے سینوں میں لیے ہوئے ہیں۔ کہتا ہے کہ وہ کفار اور مشرک تو پھر بھی' کسی نہ کسی ایک مقصد کی خاطر' جان دے دیتے ہیں یہ کم بخت اتنا بھی نہیں کرتے۔

---

[1] انہیں اپنی کرتوتوں کا علم ہے۔
[2] موت آتی ہے تو مسکراتا ہے۔

مذہب پرستی کے باعث دین خداوندی سے محروم قوم کے لیے نہ زندگی ہوتی ہے اور نہ ہی موت

عزیزانِ من! زندہ قومیں، کسی حد تک بھی جو زندہ ہیں اور کچھ نہیں ہے، وہ Patriotism (حب الوطنی) کی بنا کے اوپر، ہی سہی، وطن کے لیے سہی، قومیت کے لیے سہی، اس کے لیے بھی وہ جانیں دیدیتے ہیں۔ جو مذہب گزیدہ قوم یا مذہب پرست ہے، جن کو اس چیز کے فریب میں رکھا جاتا ہے کہ چند رسومات ادا کر لو اور تم جنت کے وارث بن جاؤ، وہ ان مقاصد کے لیے بھی جان نہیں دیتے۔ یہ کل [1] ہی کی بات ہے۔ یہ بات آپ کے سامنے آئی کہ آپ کی ان سرحدوں کے اوپر، آپ کی ان نہروں کے کناروں کے اوپر، وہ جو آپ کی عزت و آبرو کے محافظوں کی ایک فصیل بن کر کھڑی تھی، وہ آپ کے ٹیڈی بچے تھے۔ وہ آپ کے جو سارے صاحب پیروانِ پیشوائیت تھے، ان میں سے ایک شخص بھی میدانِ جنگ میں نہیں گیا تھا۔ وہ مسجد میں بیٹھے ہوئے دعائیں کرتے تھے۔ اور اُدھر وہ جانیں دے کر اپنے دعوے کو ثابت کر رہے تھے۔ یہ لوگ تو ان سے بھی زیادہ، مشرکین سے بھی زیادہ، زندہ رہنے کی خواہشیں اپنے دل کے اندر سموئے ہوئے ہیں **یَوَدُّ اَحَدُهُمۡ لَوۡ یُعَمَّرُ اَلۡفَ سَنَةٍ** (2:96) ان میں سے تو ایک ایک کہہ رہا ہے کہ ہزار ہزار برس کی ان کی عمر ہو جائے۔ ٹھیک ہے یہ کیوں مرنا چاہیں گے؟ اس لیے کہ انہیں پتہ ہے جو کچھ انہوں نے کہا ہوا ہے **وَ مَا هُوَ بِمُزَحۡزِحِهٖ مِنَ الۡعَذَابِ اَنۡ یُّعَمَّرَ** (2:96) یہاں عمر کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو جائے، مکافاتِ عمل سے تو تم کسی طرح سے نہیں چھوٹ سکتے، وہ تو آ کر رہنے والی بات ہے۔ اس لیے یہ چیز کہ یہاں اگر اتنی زیادہ لمبی عمر ہو جائے کہ اس کے ہاں مساوات سے بچ جائیں گے، غلط چیز ہے، قانونِ مکافاتِ عمل خدا کا اٹل قانون ہے۔ کہا ہے کہ **وَ اللّٰهُ بَصِیۡرٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ** (2:96)۔ دیکھتے ہیں کہ آیت کے آخری الفاظ کیسے عجیب آیا کرتے ہیں۔ اس کی تو ان چیزوں کے اوپر نگاہ ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ اس لیے اس بات کا کہ یہاں لمبا عرصہ تم جی لو گے تو اس سے بچ جاؤ گے، سوال ہی نہیں ہے۔ مفرور مجرم شاید یہاں کے مواخذے سے، پولیس کے پنجے سے، بچ جائے، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا جو نظام ہے، اس سے تو کوئی مفرور اشتہاری مجرم بچ نہیں سکتا۔ عزیزانِ من! اس لیے کہا ہے کہ کیوں اپنے آپ کو یہ فریب دیتے ہو کہ اگر اور زیادہ لمبا عرصہ جئیں گے تو ہم اس سے بچ جائیں گے۔ سنو اور زیادہ تمہاری تباہی کے سامان جمع ہوتے چلے جائیں گے اور زیادہ عذاب تم پر آتا چلا جائے گا۔ اس بات کو اپنے پلّے باندھ لو۔

عزیزانِ من! سورۃ البقرہ کی آیت 96 تک، ہم آ گئے۔ 97 ویں آیت سے ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

---

[1] یہ اشارہ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کی طرف ہے۔

پچیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)' (آیات 97 تا 103)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى
وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٧﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ
لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿٩٩﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا
عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ
مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا
يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ
الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ
وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا
يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا
يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۟ؕ وَلَبِئْسَ مَا
شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٢﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ
كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٣﴾

عزیزانِ من! آج دسمبر 1968ء کی یکم تاریخ ہے اور ہم درسِ قرآنِ کریم میں سورۃ البقرۃ کی 97ویں آیت سے شروع کر رہے ہیں: (2:97)۔

یہودیوں کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کی مخالفت کی بنیادی وجہ' قومیت کا محدود تصور اور جبریل کی مخالفت؟

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ کہا یہ گیا تھا کہ اہلِ کتاب میں سے یہودی ایک آنے والے کے انتظار میں تھے اور اپنے مخالفین سے یہ کہا کرتے تھے کہ جب وہ آنے والا آئے گا تو پھر دیکھنا کہ ہم کس طرح تم پر غالب آ جاتے ہیں۔ جب وہ آنے والا آیا تو انہوں نے یہ نہیں

کیا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس پہ غور وفکر کریں' ان علامات کو بھی دیکھیں جو خود ان کی کتابوں میں ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں بلکہ محض اس بنا پر کہ آنے والا بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل میں سے کیوں ہے' اس کی مخالفت شروع کر دی۔ یعنی وہ نبوت کو بھی اپنی قومیت کے دائرے کے اندر محدود رکھنا چاہتے تھے۔ یہ تو آپکو معلوم ہے کہ یہودیوں کا مذہب قومی مذہب ہے' نسلی مذہب ہے' کوئی غیر بنی اسرائیل' یہودی مذہب اختیار ہی نہیں کر سکتا۔ اتنی سی بات ہی نہیں بلکہ انہوں نے اس عقیدے کو یہاں تک آگے کھینچا تھا کہ غیرِ بنی اسرائیل میں نبوت آ ہی نہیں سکتی۔ اس بنا پر نبی اکرم ﷺ کی مخالفت شروع کی کہ وہ بنی اسماعیل میں سے کیوں ہیں اور اس مخالفت میں جیسا کہ چھچھورے پن کا انداز ہوتا ہے' انہوں نے یہ عقیدہ قائم کیا کہ یہ (معاذ اللہ) ساری شرارت جبریل کی ہے کہ وہ نبوت کو دوسرے گھرانے میں لے گیا ہے۔ اس لیے یہ جبریل کے دشمن ہو گئے۔ اسے برا بھلا کہتے تھے۔ یہیں سے قرآنِ کریم نے بات شروع کی ہے۔ کہا کہ **قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ** (2:97)۔ یہ اس حماقت کا کیا علاج کہ تم جبریل کی مخالفت کر رہے ہو حالانکہ وہ تو خدا کا پیغام لاتا ہے اور اسی کے حکم کے مطابق جس کی طرف وہ پیغام بھیجتا ہے' اس تک وہ پہنچا دیتا ہے۔ وہ تو روح الامین ہے۔ اگر یہ نبوت غیرِ اسرائیل کی طرف آ گئی ہے تو اس لیے نہیں کہ جبریل نے اپنی طرف سے یہ کر دیا بلکہ یہ تو عزیزانِ من! قرآن میں خدا کے حکم سے ایسا کیا ہے۔ تمہیں اگر اعتراض ہے تو خدا کے خلاف اعتراض ہونا چاہیے' جبریل کے خلاف اعتراض کے کیا معنی ہیں؟ تو یہ ہے کہ **اِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ** (2:97)۔

غیر از نبی کوئی شخص بھی وحی کی ماہیت کو جان ہی نہیں سکتا

ضمناً میں دو حرفوں میں یہ عرض کر دوں کہ جیسا کہ بنیادی طور پر کئی مرتبہ یہ بات سامنے آ چکی ہے کہ وحی ایک ایسا ذریعۂ علم تھا' میں نے ''تھا'' اس لیے کہا کہ وہ تو پھر وحی کا سلسلہ ہی ذاتِ نبی اکرم ﷺ پر ختم ہو گیا' جس میں نبی کے علاوہ کوئی دوسرا شریک ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے غیر از نبی یہ جان ہی نہیں سکتا کہ وحی کی ماہیت کیا ہوتی تھی' یہ علم خدا کی طرف سے نبی کو کیسے ملتا تھا' جبریل کے واسطے سے کیا مراد ہے' اس کی وہ نوعیت کیا ہوتی تھی' ماہیت کیا ہوتی تھی' کیفیت کیا ہوتی تھی' کس طرح سے وہ ایک الوہیاتی قوت خدا کے ہاں سے پیغام لاتی تھی' وہ کیسے نازل ہوتا تھا؟ اور یہاں کہا **عَلٰى قَلْبِكَ** (2:97) کہ قلبِ نبوی پر خدا کا پیغام وساطتِ جبریل اس طرح نازل ہوتا تھا۔ غیر از نبی ان حقائق کو پا نہیں سکتا۔ اس کے متعلق یہ بحث کرنا کہ صاحب! اس کا انداز یہ ہوتا تھا' وہ مفہوم کے اعتبار سے' یونہی خیال کے طور پر' وجدانی طور پر' نبی کے دل میں پیدا ہوتا تھا۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں صاحب! وہ اسی طرح سے الفاظ تھے' جبریل ایک شخصیت تھی' ایک Objective Personality (معروضی شخصیت) ہے' وہ اس طرح سے خدا کی طرف سے ایسے لاتا تھا' جیسے چٹھی رساں چٹھی لاتا

ہے۔ غیراز نبی کا ان بحثوں کے اندر الجھنا بالکل بے سود چیز ہے۔ وہ تو ایسے ہی ہے' جیسے دو اندھے مل کر یہ بحث کر رہے ہوں کہ سرخ رنگ کیسا ہوتا ہے۔ وہ اسے جان ہی نہیں سکتے۔ ہم وحی کو صرف وحی کے متن سے جان سکتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کو پیش کرنے کا طریق

قرآنِ کریم پر ہمارا ایمان ہے کہ یہ خدا کی طرف سے عطا کردہ ہے اور نبی اکرم ﷺ کی طرف بالالفاظ آیا ہے۔ اس لیے کہ لفظ کے بغیر تو کوئی خیال ذہن کے اندر آ ہی نہیں سکتا۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔ یہ کیسے ہوا تھا؟ اس کو جاننے کے نہ ہم مکلّف ہیں' نہ ہم یہ جان ہی سکتے ہیں۔ اس لیے جو چیز ہم جان ہی نہیں سکتے' اس کے متعلق بحث کیا کرنی ہے۔ ہمیں اس قرآن کو آن میرٹ لینا چاہیے اور یہ بھی یاد رکھیے کہ جس کے سامنے آپ قرآن کو پیش کریں' تو شروع میں اس کے ساتھ اس بحث میں نہ الجھیے کہ یہ جو وحی ہے' اس کا Source (سرچشمہ) کیا ہوتا تھا؟ وہ کیسے آتی تھی؟ یہ Possible (ممکن) بھی تھا یا نہیں تھا؟ اسے کہیے کہ یہ بعد کی بات ہے۔ یہ ایک کتاب ہے' اسے ہم ضابطۂ زندگی کے طور پر تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس کا دعویٰ یہ ہے' اور ہم اسی دعوے کے ساتھ اسے پیش کر رہے ہیں کہ اس کے اندر انسانیت کی مشکلات' Problems (مسائل) اور معاملات کا حل ملتا ہے اور حل بھی ایسا ملتا ہے جو کہیں اور نہیں مل سکتا۔ اسے کہیے کہ اس دعوے کی بنا پر اس کتاب کو جیسی بھی تمہارے سامنے ہے' پرکھیے۔ اس کے متعلق اگر کوئی چیز کسی شبہ اور شکوک کی ہے تو وہ ہمارے سامنے پیش کیجیے' اس پہ اگر آپ کوئی اعتراض کرنا چاہتے تھے' تو اسے کیجیے۔ یہ بات بعد میں دیکھی جائے گی کہ اس کتاب کا سرچشمۂ علم کیا تھا' دینے والے نے ہمیں اسے کیسے دیا تھا۔ اس کتاب کے متن کو دیکھیے' جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہے' اسے دیکھیے' اس پہ غور کیجیے۔ اگر یہاں سے بات چلائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ بات نتیجہ خیز ثابت ہوگی اور اگر بات ہی یہاں سے کی جائے کہ صاحب! وحی کی نوعیت کیا ہوتی تھی؟ کیا فکرِ انسانی سے ماورا کوئی سرچشمۂ علمِ انسانی ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ اس بحث سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اسی ضمن میں یہ چیز آئی تھی' میں نے جو عرض کیا تھا۔ جبریل کے متعلق کہا کہ **نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ** (2:97) وہ تو خدا کے حکم سے اس نے تمہارے قلب کے اوپر' اسے نازل کیا ہے۔ اس لیے اگر کسی کو اس سے شکایت ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی جگہ بنی اسماعیل کی طرف کیوں آ گیا تو یہ شکایت خدا کے خلاف ہونی چاہیے' یہ شکایت جبریل کے خلاف کوئی معنی نہیں رکھتی۔

وحی کے سچ ہونے کا ثبوت قرآنِ حکیم کا پیش کردہ نظامِ حیات ہے

عزیزانِ من! پھر دوسری چیز وہی کہی جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس کتاب کو تم دیکھو کہ یہ کہتی کیا ہے؟ کہا ہے کہ **مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ** (2:97) جو تمہارے پاس پہلے سے دعاوی چلے آ رہے تھے' جو تم خود کہتے تھے کہ وہ آنے والا آئے گا' ایک ایسی تعلیم دے گا'

ایسا نظام قائم کرے گا جو باقی ادیان پر غالب آ کر رہے گا تو یہ دیکھو کہ آیا اس کے اندر یہ تعلیم ہے یا نہیں؟ اگر یہ ان باتوں کو سچ کر کے دکھانے والی ہو' جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہیں' تو پھر تمہیں اس کو تسلیم کر لینا چاہیے' اسے قبول کر لینا چاہیے اور اس کی اگلی خصوصیت یہ بتائی کہ تم نے اس وقت تک ہدایت اور نجات اور سعادت کو بنی اسرائیل کی نسل کے اندر محدود و مقید کر رکھا تھا' یہ کتاب' یہ اس نبوت کا پیغام' یہ جو اس کا دعویٰ ہے' یہ ایسا نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (2:97) نوعِ انسانی میں سے جو بھی ان صداقتوں کو صحیح تسلیم کرے گا' زندگی کی کامرانیوں کی طرف اس کی راہنمائی ہو جائے گی اور اسے حسنِ انجام کی بشارتیں مل جائیں گی' خوشخبریاں مل جائیں گی۔ کسے باشد' کوئی بھی' اس صداقت کے اوپر ایمان لے آئے گا' اسے یہ نتائج حاصل ہو جائیں گے۔ کہا کہ تم اس کتاب کی ان خصوصیات کو دیکھو۔ اس کے بعد یہ دیکھو کہ آیا یہ اس قابل ہے کہ انسانیت اسے تسلیم کر لے؟ یہ بحث ذہنی طور پر' نظری طور پر' پر لے کر بیٹھ جانا کہ صاحب! یہ جبریل فلاں کی طرف یہ پیغام کیوں لے کر چلا گیا اور فلاں کی طرف کیوں نہیں لے گیا' فضول اور بے کار ہے۔ نہ تم جبریل کو جانو' نہ وحی کی ماہیت کو سمجھ سکو۔ کتاب کو آن میرٹ دیکھیے۔

عالمِ امر اور عالمِ خلق میں ملائکہ کی ماہیت اور فرائض کی نوعیت نیز بنی اسرائیل کی طرف سے ملائکہ پر اعتراض کا جواب

اگلی بات یہی ہے کہ اس نے کہا کہ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ (2:98)- یہ جو جبریل کی مخالفت اور اس سے دشمنی کی چیز ہے' یہ درحقیقت خدا کے پورے نظام کے خلاف عداوت ہے۔ یہ جتنے بھی جنہیں ملائکہ کہا جاتا ہے' جتنی بھی وہ قوتیں ہیں' جنہیں مدبراتِ امورِ الٰہیہ کہا جاتا ہے' قرآنِ کریم ان کے متعلق جو کچھ بتاتا ہے' وہ یہی ہے کہ خدا کا جو پروگرام' جو پلان' جو امر' جو تدبیر' ہوتی ہے' وہ جو Carry-out ہوتی ہے' عمل میں آتی ہے' اس کیلیے خدا ہی کی طرف سے مقرر کردہ کچھ قوتیں ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جو اس کے عالمِ امر سے متعلق ہیں۔ وہاں کیا ہوتا ہے' کس طرح ہوتا ہے؟ ہم یہ نہیں جان سکتے۔ اس سے نیچے عالمِ محسوسات میں یہ قوتیں ہیں' جنہیں فطرت کی قوتیں کہا جاتا ہے' جنہیں Forces of Nature کہا جاتا ہے' یہ قوانینِ فطرت کے مطابق یہاں کارفرما رہتی ہیں۔ یہ قوتیں بھی خدا کی پیدا کردہ ہیں' یہ قوانین بھی اسی کے وضع کردہ ہیں لیکن یہاں کی جو قوتیں ہیں' ان قوانین کے تابع کارفرما ہوتی ہیں' انہیں بھی ملائکہ کہا جاتا ہے۔ یہ وہ ملائکہ ہیں جو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ یعنی انسان کے اندر اس کی صلاحیت اور استطاعت اور استعداد دیدی گئی ہے کہ وہ فطرت کی ان قوتوں کو مسخر کر سکے۔ انہی میں سے یہ قوتیں ہیں جو خدا کی طرف سے پیغام انبیائے کرام علیہم السلام کی طرف لاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس پیغام رسانی کی جہت سے لغت میں بھی ملائکہ کا

جو مادہ ہے وہ ''م ل ک'' سے آتا ہے' جس کے معنی قوتیں ہوتا ہے یا ''ا ل ک'' سے آتا ہے' جس کے معنی پیغام رسانی ہوتی ہے۔ اصل میں یہ دونوں ہی چیزیں ان کے اندر آجاتی ہیں۔

برادرانِ عزیز! کہا یہ ہے کہ اگر تمہیں اس پہ اعتراض ہے کہ یہ جبریل یا فلاں فرشتہ' اس پیغام کو فلاں کی طرف کیوں لے گیا تو یہ درحقیقت تمہارا اعتراض خدا کے اس پورے نظام کے اوپر ہے۔ ان کی تو کیفیت ہی یہ ہے جیسا کہ قرآن نے دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ ان کو تو اختیار وارادہ ہی کوئی نہیں ہے۔ وہ تو جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے' اس کے مطابق وہ کیے چلے جاتے ہیں' وہ خدا کے حکم کے خلاف اپنی مرضی سے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ اب ظاہر ہے کہ جو اپنی مرضی سے کچھ کرتا ہے' خدا کے حکم کے مطابق کرتا ہے' اس کے کسی فعل پر اعتراض کرنا درحقیقت خدا ہی کے اوپر اعتراض کرنا ہے کہ جس کے حکم کے مطابق وہ یہ کچھ کرتا ہے۔ کہا کہ ان سے کہیے کہ یہ اس قسم کے اعتراضات درحقیقت خدا پر اعتراض ہیں' خدا کے پورے نظام پر اعتراض ہیں اور اگر تم نے اس بنا پر ہی دشمنی قائم کر لی ہے تو پھر تو جو بھی خدا کے اس نظام سے انکار کرتا ہے' خدا اور اس کا نظام خود اس کا دشمن ہو جاتا ہے' ان میں تو کھلی ہوئی عداوت ہو جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم کی آیاتِ بینات پر اعتراض کرنے والوں کی ذہنیت

عزیزانِ من! اس کے بعد کہا ہے' کہ یہ دیکھیے! حقیقت یہ ہے کہ وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ (2:99) جو کچھ ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے' یہ پھر اسی کی طرف آ گیا' جو میں نے پہلے کہا تھا کہ اسے آن میرٹ دیکھنا چاہیے جو بات کہی گئی ہے' اس کے متعلق یہاں خصوصیت بیان کی ہے کہ یہ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ (2:99) ہیں یعنی یہ کوئی مبہم علم نہیں ہے' کوئی گپت ودیا نہیں ہے' کوئی باطنی علم نہیں کہ تم اسے پہچان نہ سکو' جان نہ سکو' سمجھ نہ سکو۔ یہ کھلے طور پر تمہارے سامنے ہے' واضح قوانین ہیں' بیّن ہیں۔ ان بین قوانین کو تم دیکھو' عقل وفکر کی رو سے ان کو سمجھو۔ اس قسم کے یہ نظری' ذہنی اعتراضات ہیں کہ صاحب! جبریل اس کو ادھر لے گیا حالانکہ فلاں طرف لے جانا چاہیے تھا' یہ تو حماقت ہے۔ یہ آیات ہیں بینات' یہ تمہارے سامنے کھلی کھلی آ گئیں ہیں' تم ان کو دیکھو' پرکھو' سوچو' سمجھو' پھر کسی نتیجے پر پہنچو۔ اگر اعتراض کرنا ہے تو هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:111) اگر سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ' بات اصل میں یہ ہے کہ یہ آیات بینات ہیں' واضح ہیں' ان کا تمہیں کہیں سے بدل نہیں مل سکتا لیکن وَ مَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ (2:99) اس سے انکار وہ کرنا چاہتے ہیں جو اس خاص Pattern (قالب) کے اندر زندگی بسر نہیں کرنا چاہتے' وہ اس قالب سے نکل کر اپنے لیے کوئی

دوسرا قالب تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ فاسق کہتے ہی اس کو ہیں جو اس قالب کے اندر نہ رہنا چاہے' جس کے اندر کسی کی نشوونما ہوتی ہے۔

قوانین خداوندی کے دائرہ سے باہر نکل کر زندگی گزارنے والے کو قرآن حکیم نے فاسق کہا ہے

یہ لفظ کئی دفعہ آ چکا ہے۔ فسق کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کہ جیسے یہ پھل ہیں' ہر پھل اپنے خول اور چھلکے کے اندر رہتا ہوا نشوونما پاتا ہے' پکتا ہے' انتہا تک پہنچتا ہے۔ بعض پھل آپ نے دیکھے ہوں گے جو راستے ہی میں خراب ہوتے ہیں' ہوتا یہ ہے کہ وہ اس اپنے چھلکے اور خول سے نکل کر ایک دوسری طرف چلے جاتے ہیں' ان کی نشوونما نہیں ہو سکتی' وہ سڑ جاتے ہیں' گل جاتے ہیں۔ یہ فسق کہلاتا ہے۔ انسانیت کی نشوونما کے لیے Pattern (قالب) تجویز کیا گیا ہے' اس ندی کے بہنے کے لیے ساحل تجویز کیے گئے ہیں۔ پانی ساحلوں کے اندر بہتا ہے تو وہ دریا یا نہر کہلاتا ہے' وہ زندگی کا موجب ہوتا ہے' اس سے خدا کی برکات اور رحمتیں نکلتی ہیں' اس سے ہزار ہا کام لیے جاتے ہیں۔ اگر وہ پانی ساحلوں کو توڑ کر بہنا شروع کر دے تو وہ سیلاب بن جاتا ہے اور سیلاب کا نتیجہ تو تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اسی کو فسق کہتے ہیں کہ جن سواحل کے اندر بند کیے ہوئے کسی نے راستے پہ چلنا ہو' جس پیٹرن یا قالب کے اندر رہتے ہوئے اس کی نشوونما ہونی ہو' جب بھی اس قالب کو توڑ کر دوسری طرف نکل جائے گا' ان ساحلوں کو بہا کر لے جائے گا تو سیلاب بن جائے گا تو اس کے بعد ان کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔ کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن سمجھ میں نہیں آتا' یہ بھی نہیں ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جبریل از خود ان پیغامات کو کسی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ بات ساری یہ ہے کہ وہ جو راستہ تجویز کرتا ہے' جو ساحل تجویز کرتا ہے' جو پیٹرن تجویز کرتا ہے' یہ اس کے اندر نہیں رہنا چاہتے۔ یہ کیوں نہیں رہنا چاہتے؟ یہ پیٹرن یا ساحل جو پابندیاں عائد کرتا ہے' جو پیٹرن تجویز کرتا ہے' یہ اس کے اندر نہیں رہنا چاہتے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کیوں نہیں رہنا چاہتے؟

یہودیوں کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ ان پر کسی قوم نے بھروسہ نہیں کیا

قرآن نے انسان کے اوپر بھی ایک مثال دی اور یہ وہ چیز تھی جو آپ دیکھیے کہ یہود کی تاریخ کے اندر بیّن طور پہ ملے گی کہ ان کے ہاں عہد شکنی ایک معمول بن چکا تھا۔ یہ وہ قوم تھی جس پہ کبھی کوئی دوسری قوم بھروسہ نہیں کر سکتی۔ انہوں نے ہمیشہ معاہدات کر کے توڑے' ہمیشہ یہ قوم عہد شکن رہی۔ دنیا کی کوئی قوم ان کے اوپر بھروسہ ہی نہیں کیا کرتی تھی۔ ان کی سینکڑوں سال تک' بلکہ ہزاروں سال تک' The Wondering Jews (آوارہ یہودی) کی کیفیت رہی' انہیں دنیا میں کہیں پناہ نہیں ملتی تھی' دنیا کی ذلیل ترین قوم شمار کی جاتی تھی۔ کہا ہے کہ وَ ضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡکَنَةُ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61)۔ جہاں جاتے تھے ذلت و مسکنت کی ماران

کے پیچھے پیچھے لگی رہتی تھی۔ یہ کیا چیز تھی؟ کوئی یہ بات تو نہیں تھی کہ ان کے اوپر کوئی اس قسم کی محسوس تلاوت ہوتی تھی جو کسی کو ان کے پاس نہیں آنے دیتی تھی۔ ان کے اندر اس قسم کے اخلاقی عیوب پیدا ہو گئے تھے' اس قسم کے اجتماعی عیوب پیدا ہو چکے تھے کہ کوئی قوم ان کو قریب نہیں آنے دیتی تھی' ان پہ کوئی قوم بھروسہ نہیں کرتی تھی' اعتماد نہیں کرتی تھی۔

یہودیوں نے ہمیشہ اپنے ہاں نظام سرمایہ داری کی بنیاد پر سود خوری کو اوّلیت دی ہے

بنیادی چیز ان کے ہاں یہ تھی کہ ان کی کسی بات کا اعتبار ہی نہیں ہوتا تھا۔ دو چیزیں تو ان کے ہاں مخصوص چلی آتی تھیں: ایک جسے عام طور پہ سود خوری کہا جاتا ہے یعنی دوسروں کی محنت کو غصب کر کے لے جانا' خود کچھ نہ کرنا اور دوسری چیز یہ تھی کہ یہ ہمیشہ عہد شکنی کرتے تھے' کسی قوم کو ان پہ بھروسہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ **اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ** (2:100)۔ یہ کرتے یہ تھے کہ من حیث الجماعت یہ دوسروں کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیتے تھے۔ اب جب بھی کوئی معاہدہ ہوتا ہے تو اس قوم کی طرف سے ہوتا ہے' اس ملک کی طرف سے ہوتا ہے' اس مملکت کی طرف سے ہوتا ہے۔ پوری قوم ایک معاہدہ کر لیتی تھی' اس قوم کا ایک حصہ جہاں جی چاہتا' جہاں مصلحت کا تقاضا ہوتا' اس معاہدے کی خلاف ورزی کر دیتا۔ اب وہ جو شکایت کرتے تو یہ جو دوسرا حصہ تھا' جس نے یہ نہیں کیا ہوتا تھا' وہ یہ کہتا کہ صاحب! ہم نے کیا تو نہیں ہے' اب دیکھیے اس میں سے کچھ ایسے لوگ نکل آتے ہیں' اب ان کے اوپر کیا کسی کا قابو ہے' کیا کسی کا کنٹرول ہے' یہ ہیں ہی اس قسم کے سرکش' کیا کیا جائے یہ کرتے ہی اسی طرح سے ہیں۔ وہ کہتے کہ صاحب! معاہدہ من حیث القوم ہوا ہے' تمہاری قوم کا اگر کوئی گروہ ایسا کرتا ہے تو یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس گروہ کو اس معاہدے کے سامنے جھکاؤ۔ یہ اس کے لیے کونسی Justification (وجہِ جواز) ہے کہ تم دوسرے سے آ کر یہ کہہ دو کہ صاحب! وہ دیکھیے ہم نے تو نہیں کیا ہے' یہ ہیں ہی ایسے اور یہ تو بڑے پیمانے پہ ہے' چھوٹے چھوٹے پیمانوں کے اوپر تو آپ بھی دیکھیں گے کہ اس قسم کے گھرانے ہوتے ہیں' جنہوں نے اپنے گھر میں سے کوئی ایک آدھ ایسا رکھا ہوا ہوتا ہے۔ وہ سارا گھر جا کر کسی سے نہیں لڑتا' وہ جو ایک ہوتا ہے اس کو بھڑا دیتے ہیں۔ آج اس سے لڑائی ہے' کل اس سے دنگا ہے' چوتھے دن دوسرے سے فساد ہے۔ وہ جب شکایت کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں ''او جی کی دسیے؟ نکل ای آیا ہے ایہو جیا سمجھو نا۔ اے زمانے اچ کوئی وس ہیگا ایناں منڈیاں اُتے۔ اے تے مندے ای کسے دے دی نئیں ہیگے ❶۔'' حالانکہ یہ بالکل پلاننگ کے تحت کیا ہوا ہوتا ہے' یہ ذمہ داری نہیں لیتے' یہ بڑی غلط چیز ہے۔ اگر وہ آپ کے گھر کا فرد ہے تو آپ کے گھر کے اوپر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے' اگر آپ کی جماعت کا فرد ہے تو آپ کی جماعت پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے

---

❶ جناب! کیا بتائیں؟ یہ ایسا ہی بن کر ابھرا ہے۔ آپ سمجھیں تو اس زمانے میں ان لڑکوں پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ یہ تو کسی کی مانتے ہی نہیں ہیں۔

یا اس کو جماعت سے نکال دیجئے' کہیے کہ ہماری جماعت کا فرد نہیں ہے۔ جب تک وہ آپ کی جماعت کا فرد ہے آپ کی جماعت نے جو کسی کے ساتھ عہد کیا ہے' اس عہد کے نبھانے کی ذمہ داری تمام افراد پہ عائد ہوتی ہے اور اگر اس میں کوئی ایک فرد بھی اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ پوری جماعت کو اس کا کفارہ دینا ہوگا اور اگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہے تو اسے چاہیے کہ اس فرد کو اپنی جماعت سے نکال دو۔ اسی طرح قوموں کے اندر اگر کوئی اس قسم کا گروہ ہے جو قوم کے کسی کیے ہوئے معاہدے یا قانون کا احترام نہیں کرتا ہے اور قوم اس سے باز پرس نہیں کرتی ہے' اپنے میں سے الگ نہیں کرتی ہے' وہ پوری کی پوری قوم اس چیز کی ذمہ دار ہے جو انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ یہ کوئی وجہ جواز نہیں کہنے کی کہ صاحب! ہم میں سے یہ لوگ ایسے ہیں جو سرکشی برتتے ہیں۔ اپنوں میں سے الگ کیجیے' ایسی صورت نہیں ہو سکتی تو انہیں ان کے حوالے کیجیے۔ جن کے خلاف انہوں نے یہ کیا ہے۔

یہودیوں کا منافقانہ طریق اور نبوت کے سلسلہ میں ایک اعتراض

ان کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ یہ خاص پالیسیوں کے ماتحت کرتے تھے' ایک معاہدہ کیا جاتا ہے۔ اس معاہدے میں سے کچھ اپنا یہ ایک حلیف ہوتا تھا' وہ اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے تو اس کے بعد کہتے ہیں کہ صاحب! کیا کیا جائے' یہ ہیں ہی اس قسم کے۔ کہا کہ تمہاری کیفیت یہ تھی اور آگے بتایا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ **بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ** (2:100)۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ ساری جماعت ہی ایسی تھی ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی تھی' جو وہ کرتے تھے' اس کے اوپر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ وہ بھی منافقت کے طور پہ ہوتا تھا' وہ بھی ان کے ہاں کی ایک سیاسی Strategy (حکمتِ عملی) ہوتی تھی کہ یہ ایسا کیا جائے گا' **بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ** (2:100) نے بات واضح کر دی کہ یہ ساری ملی بھگت ہی تھی' جو اندر سے کی جاتی تھی اور یہ ایک طریقِ کار انہوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ کہا کہ یہ تو اعتراض کر رہے ہیں کہ بنی اسماعیل میں کیوں نبوت آ گئی۔ ہم اس کی خلاف ورزی اس لیے کرتے ہیں کہ یہ تو بنی اسرائیل میں سے آنی چاہیے تھی۔ کہا کہ کل ہی اسی نزولِ قرآن سے Immediately (فی الفور) پہلے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کا ایک پیغمبر ان کے ہاں آیا تھا۔ کہا کہ ان سے پوچھیے کہ وہ تو بنی اسرائیل کا تھا' اس کے ساتھ انہوں نے کیا کیا تھا؟ اعتراض اگر نسل پرستی کا ہی ہے تو وہ تو ان کی اپنی نسل میں سے تھا: **وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ** (2:101) ان میں سے ایک رسول آیا۔ وہ بھی وہ کچھ لایا جو ان چیزوں کو سچ کر کے دکھانے والا تھا' جو ان کے پاس چلی آ رہی تھیں۔ ان وعدوں کو اس نے پورا کر کے دکھانا تھا۔ وہ یہ کہتا تھا کہ میں یہ کر کے دکھاؤں گا۔

تاریخ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق پایا جانے والا ایک بڑا ہی غلط تصور

میں وہاں تفصیل سے عرض کر دوں' اس وقت بتاؤں گا جب حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات قرآن میں آگے چل کر آئیں گے' میں ان کی تاریخ بھی بیان کروں گا۔ اتنا یہیں عرض کر دوں کہ یہ جو ان کے متعلق ایک تصور دیا گیا ہے کہ وہ ایسے تھے جیسے کہ ایک جھگی کے فقیر' درویش' تکیے والے ہوتے ہیں۔ کچھ اس قسم کا تصور دیا گیا ہے کہ وہ بھوکے مرتے تھے' پھٹے پرانے کپڑے تھے' فقیرانہ حال تھا' درویشانہ زندگی تھی اور ان کے خلاف جب کسی قسم کی یہ چیز آئی تو ان کے سارے حواری انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے' وہ اکیلے ان کے قابو آ گئے' انہوں نے ان کو پکڑ کر صلیب پہ چڑھا دیا بقول ان کے تعلیم ان کی یہ تھی کہ کوئی ایک گال پہ طمانچہ مارے تو دوسری گال آگے کر دیجیے۔ اگر کوئی تمہارا چغہ اتارتا ہے تو کُرتہ خود اتار کر دیدیجیے۔ چور اگر تمہارے گھر چوری کرنے آتا ہے اور وہ سب کچھ اٹھا کر سر پہ رکھنا چاہتا ہے' گٹھڑی بھاری ہے چور کمزور ہے' تو وہ گٹھڑی اپنے سر پہ رکھ کر اس کے گھر چھوڑ آؤ۔ عزیزانِ من! یہ ساری تحریف ہے۔ یاد رکھیے! خدا کا کوئی رسول بھی اس قسم کی زندگی بسر کرنے اور اس قسم کی تعلیم دینے کے لیے نہیں آتا۔ وہ تو بہت بڑا اداعیٔ انقلاب ہوتا ہے' وہ تو جتنی وہاں کی باطل کی بساطِ سیاست ہوتی ہے' شیاطین کے نظام ہوتے ہیں' ان کی بساط کو الٹ کر رکھ دینے کے لیے آتا ہے۔ ہر نبی اسی قسم کا تھا' ہر رسول یہی دعوت لے کر آتا تھا اور یہی دعوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تھی۔

یہودیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جرم کی نوعیت

دیگر تمام چیزیں تو چھوڑ دیئے آخری شہادت تو وہ تاریخ ہے جو ان کے ہاں بھی ملتی ہے۔ انجیل میں ان کی طرف یہ تعلیم منسوب کرتے ہیں کہ ان کی ایک درویشانہ زندگی تھی' ان کو دنیا کے کاروبار سے کچھ واسطہ ہی نہیں تھا۔ یہ چیز ان کے ہاں بھی ملتی ہے کہ جس صلیب پہ لٹکاتے تھے' اس صلیب کے تختے کے اوپر' اس کا جرم لکھ کر تختی لگایا کرتے تھے۔ ان کی انجیل میں یہ چیز موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس صلیب کی تختی کے اوپر لکھا یہ گیا تھا کہ ''یہ وہ شخص تھا جو بنی اسرائیل کا بادشاہ بننا چاہتا تھا۔'' آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ ایک فقیرِ بےنوا' نہیں' یہ درویشِ گوشہ نشین نہیں جس کی تعلیم یہ کہی جاتی ہے کہ اگر کوئی ایک گال پہ طمانچہ مارے تو دوسرا گال اس کے سامنے رکھ دیں۔ اس کا جرم' جس کی بنا پہ بقول ان کے' صلیب دیا جاتا ہے' یہ لکھا جاتا ہے کہ ''یہ بنی اسرائیل کا بادشاہ بننا چاہتا تھا۔'' وہ تو رومن کی حکومت تھی' بادشاہت تو رومیوں کی تھی' یہ ان کی بادشاہت میں بستے تھے۔ رومیوں کی طرف سے' ان کے خلاف یہ جرم عائد کیا گیا تھا کہ یہ شخص سلطنت حاصل کرنا چاہتا تھا' ہماری حکومت کو الٹنا چاہتا تھا' بنی اسرائیل کا بادشاہ بننا چاہا تھا۔ یہ جرم تھا۔ کیا وہ جو ایک فقیرِ گوشہ نشین ہے' اس کا یہ جرم ہوا کرتا ہے کہ وہ حکومت کا تختہ الٹ کر اس کی جگہ ایک نئی حکومت قائم کرنا چاہے؟ بنی اسرائیل انتہائی محکومیت کی حالت میں تھے' ایسے ہی تھے جیسے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھے۔

رومیوں کی غلامی کے باوجود بنی اسرائیل کا حق پر مبنی ایک دعویٰ

یہ جو چیز قرآن نے کہی ہے کہ **مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ** (2:101)۔ یہ بات کیا ہے؟ یہ کیا چیز تھی جس کو وہ سچا کر کے دکھانے آیا تھا؟ دین کا یہ دعویٰ ہے کہ دین کی حامل قوم کسی دوسرے کی محکوم نہیں رہ سکتی۔ اور یہ قوم محکومیت کے شکنجے میں جکڑی ہوئی چلی آ رہی تھی، ان کا دعویٰ یہ تھا کہ دین کی حامل قوم کسی کی محکوم نہیں رہ سکتی۔ میں یہ اس وقت بتاؤں گا جب قرآنِ کریم میں اس کی تفصیل آئے گی۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس وقت بھی ان بنی اسرائیل کے اندر ایک گروہ ایسا موجود تھا، جن کا اس وقت بھی یہ ایمان تھا کہ حکومت خدا کے نظام کے علاوہ کسی کی جائز نہیں ہے۔ وہ رومن کے اس گورنر کو اپنا بادشاہ ہی تسلیم نہیں کرتے تھے، وہ ان کو ٹیکس ہی نہیں دیتے تھے اور وہ اس انتظار میں تھے کہ ایک آنے والا آئے گا اور وہ اس حکومت کا تختہ الٹے گا۔ ان کا یہ دعویٰ تھا۔ یہ جو کہا ہے کہ **مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ** (2:101)۔ یہ کیا چیز ہے جس کو یہ سچ کر کے دکھانے کے لیے آیا تھا؟ ان کے ان دعویٰ کو سچ کر کے دکھانے کے لیے آیا تھا کہ واقعی خدا کے دین کو ماننے والی کسی دوسرے کی محکوم نہیں رہ سکتی۔ وہ یہ سچ کر کے دکھانے کے لیے آیا تھا۔

کہا یہ ہے کہ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سے تمہارے ہاں رسول آتا ہے، جو دعاوی تم لے کر بیٹھے ہو، ان دعاوی کو سچ کرنے کے لیے تمہارے پاس وہ آتا ہے، وہ یہی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے بعد تمہاری کیفیت کیا تھی؟ سنو! کہا کہ **نَبَذَ فَرِيۡقٌ مِّنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ كَاَنَّهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ** (2:101)۔ خدا کے اس پیغام کو، اس کتاب کو، تم میں سے وہ لوگ جو اس بات کو جانتے تھے کہ یہ واقعی سچی بات لے کر آیا ہے، انہوں نے اس کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اور دوسرے موقعے کے اوپر ہے کہ تم اس کی جان کے دشمن ہو گئے۔

ہیکل کے اندر مذہبی پیشوائیت کا حکومتی کنٹرول اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی نوعیت

یہ کیا چیز تھی؟ عزیزانِ من! میں وہاں آؤں گا تو یہ عرض کروں گا کہ یہ مذہبی پیشوائیت تھی، ہیکل کے یہ سارے احبار و رہبان، مل بیٹھ کر یہ مشورے کر رہے تھے کہ اس وقت تو ہماری بڑی موج ہے، Personal Laws (شخصی قوانین) سارے ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ رومیوں کی سلطنت کے اندر بنی اسرائیل کے جتنے بھی یہ شخصی قوانین وغیرہ تھے، وہ سارے ہیکل کے ان احبار و رہبان کے ہاتھ میں تھے، مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں تھے۔ یہ انہیں سزا بھی دے سکتے تھے، صرف سزائے موت کے لیے انہیں رومی گورنر کے پاس جانا پڑتا تھا۔ ان کے پاس اتنا اقتدار تھا، ہیکل کے ساتھ جاگیریں وقف تھیں، سلطنت کے اندر ان کی ایک سلطنت تھی، وہ بیٹھ کر یہ چیزیں کہا کرتے تھے،

انجیلوں کے اندران کے بیانات موجود ہیں کہ اس وقت تو ہماری یہ کیفیت ہے' یہ برنباس نے لکھا کہ انہوں نے مشورہ یہ کیا کہ یہ کیفیت بڑی اچھی ہے کہ سیکولرقسم کی گورنمنٹ ہے' ہمارے مذہبی معاملات میں وہ دخل نہیں دیتی' قیصر کا حصہ قیصر کو' خدا کا حصہ خدا کو ہے۔ عزیزانِ من! یہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا قول نہیں ہے' یہ ہیکل کے نظام کا قول تھا کہ اب تو بھئی! موج ہے' انکم ٹیکس ان کا ہے زکوٰۃ ہماری ہے' وہ اس میں دخل ہی نہیں دے سکتے۔ ذرا کوئی اس قسم کا قانون بننے لگے کہ نہیں صاحب! انکم ٹیکس جو ہے یہ بھی اسی کا حصہ ہے' یہ زکوٰۃ ہی کا حصہ ہے' آپ دیکھیے کس طرح سے احتجاج بلند ہوتا ہے۔حکومت ان کی تھی فتویٰ ان کا تھا۔ وہاں یہ بیٹھ کرکونسلیں کرتے تھے' وہ کہتے تھے کہ اب تو ہمارے ہاں یہ کیفیت ہے کہ بادشاہ بھی ہماری بادشاہت میں کوئی دخل نہیں دیتا لیکن اگر اس شخص کے تصور کے مطابق یہاں حکومت قائم ہوگئی تو پھر ہمارا اقتدار باقی نہیں رہ سکتا۔ اور ہمیں کچھ کما کر کھانا تو آتا نہیں' یہ ان کا فقرہ ہے' اس کے بعد سوائے اس کے کہ ہمیں خیرات کے ٹکڑے ملیں' ہماری تو اس کے اقتدار کے اندر' جدھر یہ ہمیں لانا چاہتا ہے' یہ حیثیت رہ جائے گی' یہ تھا حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا وہ جرم جس کے بعد یہ مذہبی پیشوائیت ان کے خلاف ہوئی ہے۔ مذہبی پیشوائیت نے ہمیشہ ہر داعیٔ انقلاب کے خلاف یہی کیا ہے۔ اس انقلاب میں سب سے پہلی زد' خود ان پہ پڑتی تھی' حکومتِ وقت کی باری تو بعد میں آیا کرتی تھی۔ جن اپنوں پہ ان کا اقتدار ہوتا تھا وہ اقتدار تو سب سے پہلے چھنتا تھا' اس لیے سب سے پہلے یہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ کہا کہ تمہاری کیفیت یہ تھی۔

عزیزانِ من! کہا یہ ہے کہ آج تم یہ اعتراض لے کر آگئے کہ صاحب! یہ نبی بنی اسرائیل میں سے کیوں آ گیا ہے؟ جبریل نے یہ نبوت اس گھرانے کے اندر لا کر کیوں دیدی؟ غلطی سے ادھر کیوں نہیں دی؟ اس کی مخالفت شروع کر دی۔ تمہاری تو کیفیت شروع سے یہ چلی آ رہی تھی۔ کل ہی جو پیغمبر آیا ہے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا' اس کے خلاف تو یہ اعتراض تمہیں نہیں ہو سکتے تھے' اس کے ساتھ تم نے یہ کیا کیا؟ وہ ساری بات یہ تھی کہ تمہاری اس چوہدراہٹ کے اوپر آ کر اس کی زد پڑتی ہے۔ تمہیں اپنے ہاں کے باٹل مال کھانے' قرآن نے کہا ہے کہ ہر وہ مال جو اپنی محنت کی کمائی سے نہیں کمایا جاتا باطل کا ہے اور حرام کا مال ہوتا ہے' لت پڑ گئی ہوئی تھی۔ داعیٔ انقلاب کی مخالفت تم اس لیے کرتے تھے کہ وہ یہ چیزیں تم سے چھیننا چاہتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ تمہاری طرف غلط پیغام لاتا تھا' پیغام تو وہ ہوتا تھا جو تمہارے دعاوی کو سچ کر کے دکھانے والا ہوتا تھا۔ یہ تمہاری کیفیت ہو چکی تھی۔

قرآن حکیم کی مخالفت کرنے والوں کا کردار اور قرآنی تعلیم کے گمنام مبلغین کو فراموش کرنے کا نتیجہ

ضمناً میں پھر عرض کر دوں کہ یہ کوئی بنی اسرائیل کی داستان نہیں بیان ہو رہی۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد نبی تو نہیں آ سکتا لیکن خدا کی کتابِ زندہ تو قیامت تک کے لیے موجود ہے۔ آپ کی تاریخ میں بھی جب انہوں نے دین کی یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر ڈالی ہے تو وہ دین

مذہب میں تبدیل ہوا ہے۔ جس شخص نے بھی قرآن کے انقلاب کی دعوت ان کے سامنے پیش کی' انہوں نے وہی کچھ کیا ہے جو یہودیوں نے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا۔ آج ان کی کتابوں کے اندر کہیں نام تو دیکھنے میں آتے ہیں' وہ نام بھی نہ آتے' اگر یہ ان کو گالیاں نہ دیتے' ان کی کتابوں میں سے' ان لوگوں کا نام صرف اس لیے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ دیکھیے صاحب! یہ ''آیا تھا اور آ کر یہ کہہ رہا تھا کہ صاحب! دنیا میں انسانوں کی راہنمائی کے لیے خدا کی کتاب کافی ہے' دیکھا! اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ دیکھا! اس کا کیا حشر ہوا؟'' یوں ہمیں تاریخ میں ان کے کچھ نام ملتے ہیں۔ پھر ان کے خلاف یہ نہایت طعن کرتے ہیں کہ دیکھیے صاحب! وہ یہ کہتا تھا۔ وہ جو یہ کہتا تھا تو نظر آتا ہے کہ اللہ اکبر! کس قسم کی ہمارے ہاں یہ عظیم ہستیاں آ چکی تھیں' آج نہ ان کی کسی کتاب کا کوئی ورق ملتا ہے' نہ ان کی سوانح حیات کے کوئی واقعات آپ کے سامنے آتے ہیں۔ بس اتنی سی چیزیں کہیں لکھی ہوئی مل جاتی ہیں۔ ہاں تو رسول نہیں تھا' رسول کی کتاب تو موجود ہے۔

قرآنی آواز کو دبانے کے لیے وضعی روایات کا سہارا اور دعاؤں پر قناعت کا عمل

وہی کچھ خدا کے پیغام کے ساتھ جو پہلے اہل کتاب نے کیا ہے' آج کل آپ کے ساتھ ہوتا چلا آ رہا ہے' یعنی یہ یہاں تک ہے کہ یہ جو آپ کے ہاں کی وضعی روایات ہیں' ان میں ہے' سوچیے کہ کتنی عجیب طعن آمیز چیز ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے (معاذ اللہ) کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دیکھیے ایک فتنے کا دور آئے گا کہ ایک شخص اٹھ کر یہ کہے گا کہ تمہارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے۔'' فتنے کا دور آئے گا!!!' جی ہاں! اور انہیں کہا گیا ہے کہ تم پھر اُٹھ کر اس کی مخالفت کرنا' ایسے شخص سے خدا کے دین کو بچانا جو یہ کہے کہ تمہارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے۔ اندازہ لگائیے کہ معاملات کہاں تک بگڑ چکے ہیں۔ اور پھر جس نے بھی یہ کہا ہے' جو اس کے ساتھ ہوا ہے'' وہ خود ان کی کتابوں کے صفحوں کے اوپر' جو اس کے خونِ ناحق کے چھینٹے آج نظر آتے ہیں' ان سے کچھ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ یہ جنگلوں میں دھکیلے گئے' ان کی کھالیں اتار دی گئیں' یہ سولیوں پہ چڑھائے گئے' ان کی کتب کا ایک ایک ورق جلا دیا گیا' ان کے گھروں پہ جا کر ہل پھروا دیئے گئے [1]۔ انہوں نے بڑے فخر سے ان کی چیزیں' اپنے ہاں کی کتابوں کے اندر لکھی ہوئی ہیں۔ ان کا

---

[1] کچھ نام ملاحظہ فرمائیے:

1- Imam Moinuddin of Iraq (313-363A.H) Crucified
2- Imam Nafees Sheristami of Arabia (395-461A.H) Crucified.
3- Imam Shariq Alawi Mutazali of Palestine (407-457 A.H) Hanged.
4- Imam Ash-Shaikh Muhammad Tahir Al- Makki (417-460 A.H) Burnt
5- Imam Abdullah Zanjani of Arabia (459-610 A.H) Crucified.
6- Imam Raghib Al- Isphahani of Persia (1327-1409 A.D) Beheaded.
7- Imam Ahmad Amin Tahir Al- Masri (1883-1953 A.D) Tortured to Death in Prison.

جرم کیا تھا؟ کہ یہ کہتے تھے کہ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (2:101)۔ وہ ان اقدار و دعاوی کو سچ کر کے دکھانے والا تھا جو تعلیمِ خداوندی میں سے ان کے پاس موجود تھا۔ یہی نظری دعویٰ کرتے چلے آئے تھے کہ اسلام کا بول بالا ہوگا' یہ قوم دنیا کے اندر غالب رہے گی۔ آج بھی ان کا اسی قسم کا دعویٰ ہے۔ آج بھی ہر نماز کے بعد دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! ان دشمنوں کو غرق کر' ان کا بیڑہ غرق کر' اسلام کی فتح ہو' مسلمانوں کا بول بالا ہو۔ یہ دعاوی ہیں مگر جو ان دعاوی کو سچ کرنے کے لیے اٹھتا ہے' اس کو پھانسی پہ لٹکا دیتے ہیں۔ یہ دعاوی صرف دعاوٴں تک رہ گئے ہوئے ہیں مگر وہ داعیٔ انقلاب دعاوٴں کو حقیقت بنانے کے لیے آجاتا ہے۔ مگر انہوں نے ہمیشہ یہ کیا اور کیا کس طرح سے؟ اس کا طریقہ صرف یہ تھا کہ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ (2:101) اللہ کی کتاب کو پسِ پشت ڈال دو اور فرقہ پرستی کی ان خرافات کو اپنے ہاں دین بنالو۔ بس ٹھیک ہے پھر اس کے بعد راوی عیش لکھتا ہے۔

خدا کی کتاب کو پس پشت ڈالنے کا طویل عملی پروگرام

قرآن کیا بات کہہ گیا ہے! عزیزانِ من! کہا ہے کہ الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (2:101)۔ گویا اس کا پتہ ہی نہیں کہ یہ بھی کوئی خدا کی کتاب ہے' یہی ہے ضابطۂ حیات۔ اس طرح سے اس کو پسِ پشت ڈال کر اس سے اعراض برتا' گویا اسے جانتے ہی نہیں ہیں اور نہ جاننے کا تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ان کے ہاں کا سات سالہ کورس ہے' جس سے پھر ان کے سر پہ دستارِ فضیلت بندھتی ہے۔ اس سات سالہ کورس کے اندر فخر سے کہتے ہیں کہ اٹھارہ علوم پڑھائے جاتے ہیں اور قرآنِ کریم نصاب میں کہیں نہیں ہے۔ آخری سال میں جو سورۃ البقرہ ہے' ثواب کی خاطر اسے پڑھا دیا جاتا ہے۔ ''اوجیوں مگروں تبرک ونڈ دے ہوندے نیں نا❶'' صرف تبرکاً۔ سورۃ البقرہ سات سال میں پڑھا دی جاتی ہے اور یہ جو کتاب اللہ ہے' یہ نصاب میں ہی نہیں ہے' گویا كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (2:101)۔ اس کا پتہ ہی نہیں کہ یہ بھی کوئی ایسی چیز ہے۔ یہ داستانِ بنی اسرائیل بیان ہو رہی ہے۔ ارے دل! یہ تو اپنی ہی داستاں معلوم ہوتی ہے ورنہ قرآن کوئی تاریخ کی کتاب نہیں کہ ہمیں ان اقوامِ سابقہ کی تاریخ اور ہسٹری سے آشنا کرانے کے لیے آیا تھا۔ وہ تو ایک ذہنیت بتاتا ہے۔ جب اور جہاں بھی دین مذہب میں تبدیل ہوا' یہی ذہنیت ہوگئی۔ جب بھی ایسا ہوگا' یہی ذہنیت ہو جائے گی۔

قرآن حکیم کی وہ آیت (2:102) جو ہمارے ہاں مشکل ترین سمجھی جاتی ہے

پھر کتاب اللہ کو تو پیچھے پھینکا اور کن چیزوں کے پیچھے لگے؟ کن چیزوں کا اتباع کیا؟ اس کا کہ وَ اتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ

---

❶ یہ ویسے ہی ہے جیسے کہ بعد میں تبرک تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ (2:102)۔عزیزانِ من! یہ 102 آیت اس اعتبار سے قرآن کی مشکل ترین آیت کہی جاتی ہے کہ جو اس کا مفہوم بیان ہوتا ہے' جو اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے' اس سے اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔میرے ہاں دل کے اندر قرآن سے بالکل بد کے ہوئے جو لوگ آتے رہتے ہیں' اور آتے رہتے تھے' وہ زبان پہ تو خیر یہ لانے کی جرأت نہیں کرتے' ان میں سے وہ جو چیزیں قرآن کے خلاف بیان کرتے تھے' ان میں یہ آیت نمایاں طور پہ سامنے آتی تھی۔مجھے اس لیے یہ دہرانا پڑا ہے کہ آپ آج بھی جب قرآن کی اپنے طور پہ تلاوت کرتے ہوں گے' تو ترجمے سے دیکھتے ہوں گے۔یقیناً اس مقام پہ آ کر آپ کھڑے ہو جاتے ہوں گے کہ یہ کیا چیز ہے۔اس لیے مجھے ذرا یہ آیت تفصیل سے سمجھانی پڑے گی۔میں نے اس دفعہ یہ انتظام کیا تھا کہ یہ اس قسم کی روایات کی تفصیل کی چیزیں' جو ہمارے ہاں چلی آتی ہیں اور ان کے اندر اوہام اور خرافات ہیں' میں انہیں نہیں لا رہا تھا لیکن اس آیت کے ضمن میں مجھے وہ لانی پڑیں گی کہ ان کے بغیر بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی' یہ بڑے ہی الجھاؤ پیدا کرنے والی آیت ہے۔

قرآن حکیم کی آیت (2:102) کے متعلق نام اور علمائے کرام کے تفسیری تراجم کی ایک جھلک

یہ عظیم آیت ہے۔کہا ہے کہ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ وَ مَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَ لٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ وَ مَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ یَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَ لَا یَنْفَعُهُمْ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (2:102)۔میں نے عرض کیا ہے کہ آپ اسے ترجمے سے پڑھتے ہیں۔ترجمے میں دیکھیے کہ اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے؟ میرے پاس یہ مولانا شاہ عبدالقادرؒ کا[1] ترجمہ ہے۔یہ اس زمانے کی زبان کے اعتبار سے مستند سمجھا جاتا ہے۔مولانا محمودالحسن مرحوم شیخ الہند نے اسی کو آج کی زبان میں سلیس طور پہ بیان کیا ہے۔مولانا شبیر احمد عثمانی (1887-1949ء) نے اس کے اوپر حواشی لکھے۔میں وہاں سے یہ ترجمہ پڑھ کر سناتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ جو اس قدر مستند ترجمہ ہے' اس کو بھی جب آپ پڑھیں گے تو اس آیت کا کیا مفہوم آپ کے ذہن میں آئے گا۔لکھا ہے کہ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوْا (2:102)''اور پیچھے ہو لیے اس علم کے جو پڑھتے تھے شیطان' سلیمان کی بادشاہت کے وقت۔اور کفر نہیں کیا سلیمان نے لیکن شیطانوں

---

[1] آپ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے تیسرے فرزند ہیں۔انہوں نے ''موضح قرآن'' کے نام سے 1205ھ مطابق 1790ء میں قرآنِ پاک کا بامحاورہ ترجمہ اور حواشی رقم فرمائے (منظورالحق: بیسویں صدی کے قرآنی اردو تراجم مقالہ 66-1965 'شعبہ اردو' سندھ یونیورسٹی' جام شورو' 1966ء ص-20)۔

نے کفر کیا کہ سکھلاتے تھے لوگوں کو جادو۔ اور اس علم کے پیچھے ہو لیے جو اترا دو فرشتوں پر شہرِ بابل میں، جن کا نام ہاروت و ماروت ہے اور نہیں سکھاتے تھے وہ دونوں فرشتے کسی کو جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو آزمائش کے لیے ہیں، سو تو کافر مت ہو۔ پھر ان سے سیکھتے وہ جادو جس سے جدائی ڈالتے، مرد میں اور اس کی عورت میں اور وہ اس سے نقصان نہیں کر سکتے کسی کا بغیر حکم اللہ کے اور سیکھتے ہیں وہ چیز جو نقصان کرے ان کا اور فائدہ نہ کرے اور وہ خوب جان چکے ہیں کہ جس نے اختیار کیا جادو کو، نہیں اس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ۔ اور بہت ہی بری چیز ہے جس کے بدلے بیچا انہوں نے اپنے آپ کو۔ اگر ان کو سمجھ ہوتی۔'' یہ ترجمہ ہے، اس کا جی! اگر آپ سمجھ گئے ہوں تو میں آگے بڑھ جاؤں۔ تفسیر سے سمجھیے، ترجمے سے بات سمجھ میں نہیں آیا کرتی۔

برادرانِ عزیز! ہمارے ہاں تفسیرِ طبری [1] ام التفاسیر ہے، یہ قرآن کریم کی سب سے پہلی مکمل تفسیر ہے اور ان کے ہاں سب سے زیادہ مستند سمجھی جاتی ہے۔ یہ زیادہ پھیلی ہوئی، تیس Volumes (جلدوں) میں ہے۔ اسی تفسیر میں سے جو چیزیں تکرار کی آتی ہیں، وہ الگ کر کے علامہ ابنِ کثیر [2] نے، جو ہمارے ہاں کے مفسر ہیں، اپنے ہاں اس تفسیر کو ذرا مختصر کر کے لکھ دیا ہے۔ اسے تفسیرِ ابن کثیر کہتے ہیں۔ اس کا عربی متن تو میں پڑھ کر نہیں سناتا کہ پھر مجھے اس کا ترجمہ کرنا پڑے گا۔ اس کا ترجمہ بھی شائع [3] ہو گیا ہوا ہے۔ یہ بڑی متداول (مروج) تفسیر ہے، یہی عام پڑھائی جاتی ہے۔ آپ یہ دیکھیے کہ اسی تفسیر ابنِ کثیر میں اس کے متعلق کیا تفسیر بیان ہوتی ہے۔ سنتے جائیے اور پھر قرآنِ کریم کو تفاسیر کی رو سے سمجھیے !!!

تفسیر طبری کے مطابق مذکورہ آیت کی تفسیر

یہ بات اگر طبری (923-838ء) کی ہوتی تو بہر حال امام ہی سہی، ایک انسان ہی تو ہیں بعد میں کہا جا سکتا تھا کہ صاحب! ہمارے اوپر کونسی یہ چیز کوئی Binding (پابندی) ہے کہ ہم یہی مانیں۔ امام طبری کی تفسیر میں کہا یہ گیا ہے کہ یہ جو تفسیر بیان ہوئی ہے، یہ تفسیر رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے اور یوں یوں فلاں راویین کے ذریعوں سے ہم تک پہنچی۔ گویا جو تفسیر ہے، وہ تو صرف اس کے ناقل ہیں، امام طبری اس تفسیر کی نقل کرنے والے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ اب آپ سوچیے کہ کسی آیت کے متعلق جو یہ کہا جائے کہ

---

1. یہ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (923-838ء/310-224ھ) کی ہے۔
2. آپ ہیں: امام المفسرین حافظ عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر القریشی البصروی الدمشقی (774-700ھ)، کنیت ابو الفداء اور لقب عماد الدین۔ ان کی تفسیر کا نام ہے تفسیر ابن کثیر۔
3. تفسیر ابن کثیر کے مترجم کا نام امام العصر مولانا محمد جونا گڑھی (1941-1890) ہے۔ یہ ترجمہ مکتبہ اسلامیہ لاہور سے 2005 میں بھی 4 جلدوں میں طبع ہوا ہے۔

حضور ﷺ نے اس کی یہ تفسیر فرمائی ہے تو کیا کسی مسلمان کو اس کے بعد یہ جرأت ہوسکتی ہے کہ وہ اس کے خلاف کچھ کہہ سکے؟ نہیں' قطعاً نہیں گویا وہ جو تفسیرِ طبری ہے' وہ آپ کے ہاں آخری تفسیر ہوگئی۔ اس کے بعد کوئی دوسرا شخص اس کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ ہی نہیں سکتا۔

عزیزانِ من! یہ تفسیر تیسری صدی ہجری میں' بغیر کسی پہلے لکھے ہوئے ریکارڈ کے لکھی گئی۔ رسول اللہ ﷺ کے ساڑھے تین سو یا تین سو سال کے بعد' لوگوں سے باتیں سن کر لکھی گئی۔ ایک سے سنا' انہوں نے کہا کہ صاحب! میں نے اپنے باپ سے یوں سنا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ان سے جا کر پوچھ لیں۔ کہنے لگے کہ وہ تو وفات پا گئے ہیں۔ بھئی! وہ تو پھر بھی رسول اللہ ﷺ کے بعد تین سو سال ہوئے تو انہوں نے کیسے کہا؟ انہوں نے کہا کہ جی! وہ کہتے تھے کہ میں نے اپنے دادا سے سنا تھا۔ باپ ہی وفات پا گئے تو دادا کہاں ہیں؟ بھئی! انہوں نے کہاں سے سنا؟ وہ کہتے تھے کہ جی! میں نے فلاں سے سنا تھا۔ اس کو روایت کہتے ہیں' انہیں راوی کہتے ہیں' اور آخر میں انہوں نے کسی صحابیؓ پہ پہنچایا' کسی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا۔ یہ روایت یوں آ گئی' اس طرح سے یہ تفسیر مرتب ہوگئی۔

برادرانِ عزیز! اس کی ہر تفسیر کے متعلق' ہر روایت کے متعلق' ایمان یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ آپ نے غور فرمایا ہے کہ ہمارے ساتھ ہوا کیا ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ یہ جو چیز ہے کہ صاحب! یہ جو قرآنِ کریم ہے' یہ یوں سمجھ میں نہیں آتا' یہ ان چیزوں سے سمجھ میں آتا ہے۔ اب وہ چیزیں ہمارے سامنے ہیں' میں ابھی ابھی آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں' اس میں وہ کیا ہے۔ ان کے متعلق کوئی شخص نہ اعتراض کر سکتا ہے' نہ ان کے خلاف کچھ کہہ سکتا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی ہیں۔ اب سن لیجیے کہ پھر تفسیر اس کی کیا پیش ہوتی ہے جس پہ آپ نہ اعتراض کر سکتے ہیں' نہ اس کے خلاف کچھ کہہ سکتے ہیں **مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ** (2:102) یہ ہے' جی وہ آیت۔ یہاں لکھ کر وہ فرماتے ہیں کہ ''حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ......'' اب آپ نے دیکھا کہ تیسری صدی ہجری میں یہ لکھتے ہیں اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ فرمایا کہ انہوں نے کہا ہوا ہے۔ گویا رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی رضی اللہ عنہ ہیں' ان کی یہ تفسیر ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی کا تذکرہ

انہوں نے تو رسول اللہ ﷺ سے سن کر یہ تفسیر بیان فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ' حضرتِ سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک انگوٹھی تھی۔ جب آپ پاخانے جاتے تو اپنی بیوی حضرت جادہ کو دے جاتے۔ جب حضرتِ سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کا وقت آیا' اس وقت ایک شیطان جن آپ کی صورت میں آپ کی بیوی صاحبہ کے پاس آیا اور انگوٹھی طلب کی' جو دی دی گئی۔ اُس نے پہن لی اور تختِ سلیمانی علیہ السلام پر بیٹھ گیا۔ تمام جنات وغیرہ حاضرِ خدمت ہوگئے۔ حکومت کرنے لگا۔ اِدھر جب حضرت سلیمان علیہ السلام واپس آئے۔'' بیت الخلا سے اتنے

دنوں کے بعد واپس آئے ''اور انگوٹھی طلب کی تو جواب ملا تُو جھوٹا ہے' انگوٹھی تو حضرت سلیمان علیہ السلام لے گئے۔'' بیوی یہ کہہ رہی ہے۔ ''آپ علیہ السلام نے سمجھ لیا کہ یہ خدا کی طرف سے آزمائش ہے۔ ان دنوں میں شیاطین نے جادو کی اور نجوم کی اور کہانت کی اور شعر اشعار کی اور غیب کی جھوٹی سچی خبروں کی کتابیں لکھ لکھ کر حضرتِ سلیمان علیہ السلام کی کرسی تلے دفن کرنی شروع کر دیں۔ آپ کی آزمائش کا یہ زمانہ ختم ہوگیا۔ آپ پھر تخت و تاج کے مالک ہوئے۔ عمرِ طبعی پر پہنچ کر جب رحلت فرمائی تو شیاطین نے انسانوں سے کہنا شروع کیا کہ حضرتِ سلیمان علیہ السلام کا خزانہ اور وہ کتابیں جن کے ذریعے سے وہ ہواؤں اور جنات پر حکومت کرتے تھے' وہ ان کی کرسی تلے دفن ہیں۔ چونکہ جنات اوس کرسی کے پاس نہیں جاسکتے تھے' اس لیے انسانوں نے اوسے کھودا تو وہ کتابیں برآمد ہوئیں۔ بس اون کا چرچا ہوگیا اور ہر شخص کی زبان پر چڑھ گیا کہ حضرتِ سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا راز یہی تھا بلکہ لوگ' حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت سے انکاری ہوگئے اور آپ علیہ السلام کو جادوگر کہنے لگ گئے[1]۔'' یہ ہوا جی اس آیہ مقدسہ کا پہلا ٹکڑا۔

مذکورہ آیت کے پہلے ٹکڑے کے بعد دوسرے حصے کی تفسیر اور ہاروت و ماروت کا قصہ

عزیزانِ من! اب آگے جو ہے وہ فرشتوں کی بات ہے۔ لکھا ہے کہ حضرتِ علی رضی اللہ عنہ' حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ' حضرتِ ابن عباس رضی اللہ عنہ' حضرتِ ابن عمر رضی اللہ عنہ' حضرتِ کعب احبار رضی اللہ عنہ' حضرت صلبی' حضرت قلبی رضی اللہ عنہ' فرماتے ہیں۔ یہ اتنے سارے صحابی رضی اللہ عنہ اس پہ راضی ہوگئے۔ اس کے بعد آیئے اپنی کتب تفاسیر کی طرف۔ یہ تفسیر ابن کثیر کی روایت میں آئی ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا اور اُون کی اولاد پھیلی اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہونے لگی تو فرشتوں نے کہا کہ دیکھو! یہ کس قدر بدلوگ ہیں' کیسے نافرمان اور سرکش ہیں' ہم اگر ان کی جگہ ہوتے تو ہرگز ہرگز خدا کی نافرمانی نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اچھا! تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو پسند کرلو۔ میں ان میں انسانی خواہشات پیدا کرتا ہوں اور انہیں زمین پر بھیجتا ہوں' پھر دیکھتا ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہاروت ماروت کو پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں انسانی طبیعت پیدا کی اور اون سے کہہ دیا کہ دیکھو بنی آدم کو تو میں نبیوں کی معرفت اپنے حکم احکام پہنچاتا ہوں لیکن تم سے بلاواسطہ خود کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا' زنا نہ کرنا' شراب نہ پینا۔ اب یہ دونوں زمین پر اترے اور زہرہ کو ان کی آزمائش کے لیے حسین و شکیل عورت کی صورت میں ان کے پاس بھیجا۔'' یہ سب کچھ اللہ میاں کررہے ہیں۔ ''جسے دیکھ کر یہ مفتون ہوگئے''۔ میری بیٹیاں اور بہنیں معاف رکھیں۔ ''اور اس سے زنا کرنا چاہا۔ اُوس نے کہا اگر تم شرک کرو تو میں منظور کرتی ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ تو ہم سے نہ ہوسکے گا...... وہ چلی گئی۔ پھر آئی اور کہنے لگی: اچھا' اس بچے کو قتل کر

---

[1] تفسیر ابن کثیر' پارہ اول۔ ص 125۔ (یہ واوین میں دی گئی' عبارت کا حوالہ ہے)۔ یہ اس تفسیر کا نمونہ ہے۔

ڈالو تو مجھے تمہاری خواہش پوری کرنا منظور ہے۔اونھوں نے اسے بھی نہ مانا۔وہ پھر آئی اور کہا کہ اچھا یہ شراب پی لو۔اونھوں نے اسے ہلکا گناہ سمجھ کر منظوراُسے کرلیا۔اب نشہ میں مست ہوکر زنا کاری بھی کی اور اوس بچے کو بھی قتل کرڈالا۔ جب ہوش وحواس درست ہوئے تو اوس عورت نے کہا: جن جن کاموں کا تم پہلے انکار کرتے تھے' سب تم نے کرڈالے۔یہ نادم ہوئے۔انہیں اختیار دیا گیا کہ یا تو عذابِ دنیا کو اختیار کرو یا عذابِ آخروی کو۔اونھوں نے دنیا کے عذاب پسند کیے [1] ''۔اور ان کو اس طرح سے بابل کے کنویں میں لٹکا دیا گیا۔

زہرہ عورت کی کہانی' روایات کی زبانی

یہ جو زہرہ عورت تھی' جسے آزمائش کے لیے بھیجا تھا' ذرا ہی آگے (تفسیر ابن کثیر میں) اس کی بھی تفصیل دی گئی ہے۔(ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ......) ''اس عورت کا نام عربی میں زہرہ تھا اور نبطی زبان میں اس کا نام بیدخت تھا اور فارسی میں ناہید تھا۔یہ عورت اپنے خاوند کے خلاف ایک مقدمہ لائی تھی۔جب انہوں نے اوس سے برائی کا ارادہ کیا تو اوس نے کہا: پہلے مجھے میرے خاوند کے خلاف حکم دو تو مجھے منظور ہے۔'' عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں کہ آپ عدالت میں یہ کیا کچھ ہو رہا ہے! ''اونھوں نے ایسا ہی کیا پھر اوس نے کہا: مجھے یہ بھی بتادو کہ تم کیا پڑھ کر آسمان پر چڑھ جاتے ہو اور کیا پڑھ کر اترتے ہو؟ اونھوں نے یہ بھی بتادیا۔چنانچہ پڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی لیکن اترنے کا وظیفہ بھول گئی۔'' اے گل پلے بنّھو' جو پہلاں سیکھا تسی' تے دوانہ بھل جانا کتھے [2] ''۔لیکن وہ اترنے کا وظیفہ بھول گئی۔'' اور وہیں ستارے کی صورت میں مسخ کردی گئی۔'' حالانکہ زُہرہ ستارہ سب سے خوبصورت ہوتا ہے لیکن مسخ کردی گئی۔'' حضرتِ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جب کبھی زُہرہ ستارے کو دیکھتے تو لعنت بھیجا کرتے تھے۔اب ان فرشتوں نے جب چڑھنا چاہا تو چڑھ نہ سکے'' ۔اے چڑھن والا بھل گئے او اترن والا بھل گئی سی [3]۔ ''سمجھ گئے کہ اب ہم ہلاک ہوئے۔حضرتِ مجاہدؒ فرماتے ہیں: یہ سب بڑے بڑے محدث ہیں' بڑے بڑے مفسر ہیں' یہ آئمہ کرام ہیں' جن کے یہ نام آرہے ہیں'' کہ پہلے پہل چند دنوں تک تو یہ فرشتے ثابت قدم رہے۔صبح سے شام تک عدل سے حکومت کرتے رہتے۔شام کو آسمان پر چڑھ جاتے۔پھر زُہرہ کو دیکھ کر اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے۔زُہرہ ستارے کو ایک خوبصورت عورت کی شکل میں بھیجا گیا [4]۔''

---

1. تفسیر ابن کثیر' پارہ اول' ص۔126 (یہ واوین میں دی گئی عبارت کا حوالہ ہے)۔
2. یہ بات پلے باندھنا کہ جو بات آپ نے پہلے سیکھی' تو دوسری نہ بھول جانا۔
3. یہ چڑھنے والا وظیفہ بھول گئے' وہ اترنے والا بھول گئی۔
4. تفسیر ابن کثیر' پارہ اوّل' ص128 '127 (یہ واوین میں دی گئی عبارت کا حوالہ ہے)۔

ہاروت و ماروت کے سلسلہ میں جادو سکھانے اور سیکھنے کی کہانی

یہ تھا ہاروت و ماروت کا قصہ- اب اسی ہاروت و ماروت کے قصے کے ساتھ ذرا آگے چلیے' یہ جادو والی بات جو آئی ہوئی ہے۔ حضرتِ عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ دومۃ الجندل کی ایک عورت حضور ﷺ کے انتقال کے تھوڑے ہی زمانے کے بعد آپ ﷺ کی تلاش میں آئی اور آپ ﷺ کے انتقال کی خبر پا کر بے چین ہو کر رونے پیٹنے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آخر کیا بات ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھ میں اور میرے شوہر میں ہمیشہ ناچاکی رہا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ مجھے چھوڑ کر لا پتہ ہو گیا' کہیں چلا گیا۔ ایک بڑھیا سے میں نے یہ سب ذکر کیا۔ اس نے کہا جو میں کہوں وہ کر' وہ خود بخود تیرے پاس آ جائے گا۔ میں تیار ہو گئی۔ وہ رات کے وقت دو کتے لے کر میرے پاس آئی۔ ایک پر وہ خود سوار ہوئی اور دوسرے پر میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں بابل پہنچ گئے۔ میں نے دیکھا کہ دو شخص الٹے لٹکے ہوئے ہیں اور لوہے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس عورت نے مجھ سے کہا کہ ان کے پاس جا اور ان سے کہہ کہ میں جادو سیکھنے آئی ہوں۔ یہ بابل کے ہاروت ماروت تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ انہوں نے کہا سن! ہم تو آزمائش میں ہیں' تو جادو نہ سیکھ' اس کا سیکھنا کفر ہے۔ میں نے کہا میں تو سیکھوں گی۔ انہوں نے کہا اچھا! پھر جا اور اس تنور میں پیشاب کر کے چلی آ۔ میں گئی' ارادہ کیا لیکن کچھ دہشت سی طاری ہوئی اور میں واپس آ گئی اور کہا میں فارغ ہو آئی ہوں۔ انہوں نے پوچھا کیا دیکھا؟ میں نے کہا کچھ نہیں۔ انہوں نے کہا تو غلط کہتی ہے' ابھی تک کچھ نہیں بگڑا کیونکہ تیرا ایمان ثابت ہے' اب بھی لوٹ جا اور کفر نہ کر۔ میں نے کہا مجھے تو جادو سیکھنا ہے۔ انہوں نے پھر کہا اس تندور میں پیشاب کر کے آ۔ میں پھر گئی لیکن اب کی مرتبہ بھی دل نہ چلا' واپس آئی' پھر اسی طرح سوال جواب ہوئے۔ میں تیسری مرتبہ پھر تنور کے پاس گئی اور دل کڑا کر کے پیشاب کرنے کو بیٹھ گئی' ہاروت ماروت فرشتے اس بڑھیا کو یہ جادو سکھا رہے ہیں' میں نے دیکھا کہ ایک گھوڑا سوار منہ پر نقاب ڈالے نکلا اور آسمان پر چڑھ گیا۔ میں واپس چلی آئی' ان سے ذکر کیا۔ انہوں نے کہا ہاں! اب کی مرتبہ تو سچ کہتی ہے۔ وہ تیرا ایمان تھا جو تجھ سے نکل گیا۔ اب جا چلی جا۔ میں آئی اور اس بڑھیا سے کہا کہ انہوں نے تو مجھے کچھ بھی نہیں سکھایا۔ اس نے کہا بس تجھے سب کچھ آ گیا' اب تو جو کہے گی ہو جائے گا۔ ''بس ایمان نکلن دی دیر ہے۔ اَے جیہڑے تہاڈے کم نئیں نا ہوندے آج کل' او گل بالکل ٹھیک ہے۔ اوہدے اچ تھوڑی جی رتی ایمان دی بچے ہوندی اے۔ اینوں کڈ کے ویکھو کس طرح کم ہوندے نیں! اے سارا دور ہاروت ماروت فرشتیاں دا ہیگا❶ ۔'' میں نے آزمائش کے لیے ایک دانہ گیہوں کا لیا' اسے زمین پر ڈال کر کہا اگ جا' وہ فوراً اُگ گیا۔ میں نے کہا

---

❶ بس ایمان نکلنے کی دیر ہے۔ یہ جو آج کل آپ کے کام نہیں ہوتے تو وہ بات بالکل صحیح ہے۔ اس میں ابھی رتی بھر ایمان باقی ہوتا ہے۔ اسے بھی نکال کر دیکھو کہ کس طرح کام ہو جاتے ہیں! یہ سارا دور ہی ہاروت ماروت فرشتوں کا ہے۔

تجھ میں بال پیدا ہو جائیں' ہو گئے۔ میں نے کہا سوکھ جا' وہ بال سوکھ گئی۔ میں نے کہا الگ الگ دانہ دانہ ہو جا' وہ بھی ہو گیا۔ پھر میں نے کہا سوکھ جا' سوکھ گیا۔ پھر میں نے کہا آٹا بن جا' آٹا بن گیا۔ میں نے کہا روٹی پک جا' روٹی پک گئی۔'' لے موج ہو گئی۔ یہ دیکھتے ہی میرا دل نادم ہونے لگا' مجھے اپنے بے ایمان ہونے کا صدمہ ہونے لگا۔ اس عورت نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اے ام المؤمنین! قسم خدا کی' نہ میں نے اس جادو سے کوئی کام لیا' نہ کسی پر کیا۔ میں یونہی روتی پیٹتی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ حضور ﷺ سے کہوں لیکن افسوس! بدقسمتی کہ آپ ﷺ کو بھی میں نہ پایا' اب میں کیا کروں اور اس کے بعد پھر وہ لمبا چوڑا ہے کہ اسے کیا سکھایا گیا اور کیا کچھ کرایا گیا تو جادو کا وہ اثر جا کر دور ہوا۔ یہ میں نے اس تفسیر میں سے صرف دو تین ورق پڑھے ہیں'' اے سارے ورقے ایسے جئے ہیگے نیں ❶'' اور اس کے بعد بھی یہی کچھ ہے۔

ان تفاسیر کی روح سے قرآن حکیم کی یہ تعلیم دنیا بھر میں پیش کی جا رہی ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کی آیت آپ کے سامنے آئی' ترجمہ آپ نے سن لیا جو متداول چلا آ رہا ہے۔ نہیں سمجھ میں آئی بات' آپ تفسیر کی طرف چلے۔ جو آپ کے ہاں کی سب سے معتبر تفسیر ہے' آپ نے اس کو اٹھا کر یہ دیکھ لیا۔ اسے آپ نے اس تفسیر میں سے پڑھا' قرآنِ کریم کی کتنی عظمت کا نقشہ آپ کے دل پہ ثبت ہوا؟ عزیزانِ من! بدنصیبی یہ ہے کہ یہ وہ چیزیں ہیں' جن کے ترجمے بھی ہو چکے ہوئے ہیں۔ جو قرآن آپ نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہوا ہے' وہ یہ قرآن ہے۔ آپ سوچ رہے ہیں کہ آپ کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ یہ چیزیں کہاں سے آئیں؟ یہی جو چیزیں ہیں' یہ ہے تورات' یعنی تورات کے اندر Extracts (اقتباسات) میں سناتا ہوں۔ یہ میری کتاب ''برقِ طور'' ہے۔ پہلی چیز اس کے اندر یہ تھی کہ **وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوْا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ** (2:102)۔ تورات میں ہے کہ ''حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص یربعام نامی نے حیا کاہن کے ساتھ مل کر آپ کی سلطنت کے خلاف سخت سازشیں کی تھیں ❷''۔ عزیزانِ من! یہ ایک چیز ذہن میں رکھیے گا کہ حضرتِ سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کے خلاف ان لوگوں نے کچھ سازشیں کی تھیں۔ ان سازشوں میں وہ کیا کرتے تھے؟ ہمیشہ جو کچھ سازشی کرتے ہیں' ان میں الزام تراشیاں ہیں' افترا پردازیاں ہیں' تہمتیں ہیں' جھوٹا پروپیگنڈہ ہے۔ انہوں نے تو یہ کچھ کیا ہوگا۔ یہ اپنی تفسیر تو آپ نے سنی۔ اب یہ اہلِ کتاب کی کتاب ''سلاطین'' دیکھیے یعنی وہ ان کے ہاں کا قرآن سمجھ لیجیے' اس کی تفسیر نہیں۔ آپ کے ہاں یہ جو تورات موجود ہے' یہ اس کے اندر لکھا ہوا ہے۔ یہ ان سازشیوں کا پروپیگنڈہ نہیں کہا ہوا' بلکہ خود تورات حضرت سلیمان علیہ السلام کی جو تاریخ بیان کرتی ہے' اس میں یہ لکھا ہوا ہے۔ کتابِ سلاطین دو کتابیں ہیں یعنی سلاطین کی

---

❶ یہ تمام اوراق ایسے ہی ہیں۔

❷ کتاب سلاطین نمبر 1' باب (12-11)۔

تورات کے اندر یہ لکھا ہوا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق عہد نامہ عتیق کا بیان

عزیزانِ من! میں یہ عرض کر دوں کہ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کو نہیں کہتے۔ تورات ان تمام کتابوں کے مجموعے کا نام ہے جو انبیائے بنی اسرائیل کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ بجز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان سے پیشتر کی جتنی کتابیں ہیں ان کو اکٹھا کیا ہے اس کو آپ عہد نامہ عتیق یا Old Testament کہتے ہیں اس مجموعے کا نام تورات ہے۔ اس میں یہ کتاب سلاطین نمبرا ہے اس کا گیارھواں باب ہے ایک سے چھ تک (1-6) اس کی آیات ہیں۔ وہ بھی Verses (آیات) ہی کہتے ہیں۔ سنیے! یہ خود یہودی بنی اسرائیل نے اپنے اولوالعزم پیغمبروں کے متعلق اپنی کتاب کے اندر کیا لکھا ہوا ہے؟ حضرتِ سلیمان علیہ السلام ایک جلیل القدر نبی ہیں۔ لکھا ہے کہ ''پر سلیمان بادشاہ بہت سی اجنبی عورتوں کو فرعون کی بیٹی کے سوا چاہتا تھا' موآبی اور عمّونی اور ادومی اور صیدانی اور حتّی عورتوں کو''۔ ان کے ترجمے کی زبان اسی قسم کی ہوتی ہے۔ ''ان قوموں کی (عورتوں کو) جن کی بابت خداوند نے بنی اسرائیل کو حکم کیا کہ تم ان کے پاس اندر نہ جاؤ اور وہ تم پاس اندر نہ آئیں۔'' خدا نے حکم دیا تھا کہ ان کو تم نکاح میں نہیں لا سکتے ہو سلیمان نے ان سے یہ نکاح کیا ہوا تھا۔ ''کہ وہ یقیناً تمہارے دلوں کو اپنے معبودوں کی طرف مائل کرائیں گی۔'' وہ مشرکین کی عورتیں تھیں تو خطرہ یہ تھا کہ وہ اگر بیویاں بن کر آ گئیں تو وہ تمہیں اپنے معبودوں کی طرف مائل کرائیں گی اس لیے ان سے نکاح نہ کرنا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سب کو اپنے گھر میں داخل کیا۔ ''سو سلیمان انہی سے عاشق ہو کے لپٹا'' خدا کے نبی کی بات ان کی اپنی کتاب میں یہ ہو رہی ہے۔ ''اس کی سات سو جوروواں بیگمات تھیں اور تین سو حرمین۔ اور اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو پھیرا۔ کیونکہ ایسا ہوا کہ جب سلیمان علیہ السلام بوڑھا ہوا' تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا۔'' خدا کے پیغمبر کے متعلق ان کی مقدس کتاب کے اندر یہ بات ہو رہی ہے۔ ''اور اس کا دل اپنے اپنے خدا کی طرف مائل نہ تھا۔'' نبی کا دل خدا کی طرف مائل نہیں تھا' ان بتوں کی طرف مائل تھا' جو اس کی بیویوں کے معبود تھے۔ ''جیسا کہ اس کے باپ داؤد کا دل تھا' ویسا اس کا نہیں۔ سو'' سلیمان نے صدانیوں کی دیبی غنارات اور بنی عمّون کے نفرتی ملکوم کی پیروی کی۔'' خدا کا پیغمبر بتوں کی پرستش کر رہا ہے اور سلیمان علیہ السلام نے خداوند کی نظر میں بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی اپنے باپ دادا کی طرح کی[1]۔''

عزیزانِ من! یہ کیا بات ہوئی؟ وہاں یہ تھا کہ سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ میری آزمائش[2] ہو رہی ہے تو وہ یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے یہ کیا تھا جس کی وجہ سے اس کے اوپر وہ عذاب آ رہا تھا' جو آپ کی تفسیر میں لکھا ہوا ہے۔ (کتاب سلاطین میں کہا گیا ہے کہ) ''سو از بس اس کا (حضرت سلیمانؑ کا) دل خداوند اسرائیل کے خدا سے' جو اسے دوبارہ دکھائی دیا' برگشتہ ہوا۔ اس لیے خداوند سلیمان پر غضب ناک ہوا کہ

---

[1] واوین میں دی گئی عبارت کا حوالہ: سلاطین (ا) 11/1-6

[2] تفسیر ابن کثیر۔ پارہ اول' ص۔ 125۔

اس نے اسے حکم کیا تھا کہ وہ غیر معبودوں کی پیروی نہ کرے پر اُس نے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا ❶۔" اس وجہ سے وہ ساری چیزیں آ رہی ہیں۔ اب آگے دیکھیے وہی انگوٹھی والا قصہ ہے' جو آپ سن چکے ہیں۔

مروّجہ تفاسیر کا اصل سرچشمہ اور اس کا اسلامی لٹریچر پر اثر

میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ آپ کی تفاسیر جن کی نسبت نبی اکرم ﷺ کی طرف کی جا رہی ہے' کا سرچشمہ کیا ہے؟ وہ تفسیریں آئیں کہاں سے ہیں؟ وہ یہ لوگ تھے جو ان میں سے اکثر اسلام لا کر اس نقاب کے اندر آپ کے ہاں آ کر داخل ہوئے تھے اور یہ ساری جتنی خرافات ان کی اپنی کتابوں کے اندر تھیں' آپ کی کتاب میں تو وہ داخل نہیں کر سکتے تھے' وہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر کے کتاب کی تفسیروں کے اندر داخل کیں۔ یہ کیا۔ یہ کیسے کیا؟ ہوا یہ کہ ان لوگوں کے ساتھ جب بھی مسلمانوں کا مباحثہ یا مناظرہ ہوتا تھا' مسلمان ایک طرف اپنی کتاب کو پیش کرتے تھے' تو انہی انبیائے کرام علیہم السلام کی عصمت و عظمت اتنی بلندیوں پہ وہاں دکھائی دیتی تھی۔ وہ ان سے کہتے تھے کہ یہ تمہارے نبی ہیں' تمہاری کتاب کے اندر ان نبیوں کے متعلق یہ کچھ لکھا ہوا ہے۔ اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں بن پڑتا تھا۔ انہوں نے یہ کیا کہ وہ اِدھر آئے اور اپنے ہاں کی یہ جتنی چیزیں تھیں' ان کو روایات' نبی اکرم ﷺ کی حدیثیں' بنا کر آپ کی تفسیر کے اندر داخل کر دیا۔ جونہی آپ نے ان پہ اعتراض کیا' انہوں نے کہا کہ یہ روایت تو آپ کے رسول اللہ ﷺ نے خود بیان کی ہوئی ہے تو آپ ہماری کتاب کو کیسے جھٹلا سکتے ہیں' آپ کا رسول اللہ ﷺ تو اس کی تصدیق کرتا ہے۔ یوں وہ ساری چیزیں' جتنی اسرائیلیت کی خرافات تھیں' وہ آپ کے ہاں تفسیر کا جز بنیں اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ تفسیر اگر کسی مفسر کی ہوتی تو ہم پہ Binding (پابندی و مجبوری) نہیں تھی۔ مذہب کے اندر تو اس فریب دہی میں رکھا جاتا ہے کہ ہر چیز جو انسان کے ذہن کی ساختہ ہوتی ہے' اسے یا رسول کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یا خدا کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ آپ اس پہ اعتراض ہی نہیں کر سکتے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ انگوٹھی کی بات وہاں ❷ سن چکے ہیں۔ دیکھیے کہ یہ ہے کہاں؟ یہودیوں کے ہاں کی "تالمود"' ویسے تو فقہ ہی کی کتاب ہے لیکن یہ تفسیر کی بھی کتاب ہے۔ یعنی جیسے آپ کے ہاں ایک کتاب ہے' پھر اس کی تفسیریں ہیں' ان کے ہاں بھی یہ سارا کچھ ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگشتری اور اسم اعظم کی فوقیت اور اس کی تاثیر کے قصے

"تالمود" میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ "ان کے پاس ایک انگشتری تھی جس پر اسمِ اعظم ❸ کندہ تھا"۔ کیا یہ آپ کو پتہ ہے

---

❶ واوین میں دی گئی عبارت کا حوالہ: سلاطین (ا) 13-11/9

❷ تفسیر ابن کثیر- پارہ اوّل' ص 125

❸ آپ غور فرمائیے کہ مسلمانوں میں اسمِ اعظم کا تصور تالمود سے آیا ہے۔

کہ آپ کے ہاں بھی اسمِ اعظم ہوتا ہے؟ اور اسمِ اعظم تو پوچھو ہی نہیں کہ کتنی بڑی چیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جس کو اسمِ اعظم آجائے صاحب! اسے تو وہ عرش تک کے لیے اقتدار اور قوتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ دنیا اسمِ اعظم کے لیے ماری ماری پھر رہی ہے۔ یہ چیز تالمود میں ہے‘ یہودیوں کے ہاں کی چیز ہے اور پھر آپ کے ہاں یہ جتنے تعویذ گنڈے ہوتے ہیں‘ آپ کو پتہ ہے ان کو نقشِ سلیمانی کہا جاتا ہے‘ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ ''تالمود‘‘ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ ''حضرتِ سلیمان علیہ السلام کے پاس انگشتری تھی‘ جس پر اسمِ اعظم کندہ تھا۔ جس کی تاثیر سے انسان‘ حیوان‘ چرند‘ پرند‘ جنات‘ بھوت سب آپ کے مسخر تھے۔ جب آپ علیہ السلام کی سلطنت مستحکم ہوگئی تو آپ کو اپنی قوت پر بڑا ناز ہو گیا۔ یہ بات خداوند یہوہ کو ناگوار گزری جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیوؤں کا بادشاہ احمودیس چالاکی سے آپ کی انگشتری چرا کر لے گیا‘‘۔ انہوں نے اتنا ہی لکھا تھا کہ یہ انگشتری چرا کر لے گیا۔ ہماری تفسیر میں یہ بات بھی بیان کر دی کہ کیسے چرا کر لے گیا تھا۔ دونوں کو ملا دیجیے تو یہاں کسر رہ گئی ہے تو وہ یہ پوری کر دیتے ہیں۔ افسانہ میں خلا کوئی نہیں رہنا چاہیے۔ ہاں تو کہا کہ احمودیس چالاکی سے انگشتری چرا کر لے گیا‘‘ اور آپ کا ہم شکل بن کر تخت پر بیٹھ گیا۔‘‘

حضرت سلیمان علیہ السلام کی صحرانوردی کے بعد آپ علیہ السلام کی تخت نشینی کا ذکر

حضرت سلیمان علیہ السلام کی قوت کا راز تو اسی انگشتری میں تھا۔ جب وہ چھن گئی تو سب کچھ چھن گیا۔ ''چنانچہ آپ جان بچا کر بھاگے اور فقیروں کا بھیس بدل کر بھیک مانگنے لگے۔‘‘ برادرانِ عزیز! پتہ نہیں اب بھی وہ ہے یا نہیں؟ ہمارے ہاں بچپن میں وہ فقیر آیا کرتے تھے‘ وہ سنایا کرتے تھے کہ خدا دیاں قدرتاں دا‘ سلیمان نوں وارث شاہ (1798-1722) آکھدا وے۔ اوہدیاں قدرتاں جناب! اوچا ہے تے سلیمان جہیا بادشاہ نوں قہلت کہلوائے بھکارن شہزادی دا جناب![1] ہاں تو حضرت سلیمانؑ ''جان بچا کر بھاگے اور فقیروں کا بھیس بدل کر بھیک مانگنے لگے۔ آخر شاہِ آموں کے ملک میں پہنچ کر آپ علیہ السلام نے شاہی باورچی خانے میں نوکری کر لی۔‘‘ خطا کار بادشاہ ہانڈی بھونن لگ پیا[2]۔ ''قضا کار بادشاہ کی بیٹی آپ پر عاشق ہوگئی۔ جب بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے ان دونوں کو جنگل میں نکال دیا۔ ایک دن ایک ماہی گیر مچھلی لے کر ادھر سے گزر رہا تھا۔‘‘ بچپن میں یہ کہانیاں سنتے تھے کہ ''اک سی بادشاہ‘ اوہناں دے گھر آٹا مک گیا‘ تے ایہدی رانی گوانڈیاں دے گھر گئی‘ تے اوتھے چکی پی کے جیس ویلھے آئی‘ تے آٹا تے لے آئی‘ تے اپنا نولکھا ہار اوتھے بھل گئی‘‘[3]۔ ہاں تو

---

[1] وارث شاہ (1798-1722ء) خدا کی قدرتیں سلیمان بادشاہ کو دکھاتا ہے۔ اس کی قدرتیں تو جناب یہ ہیں کہ وہ سلیمانؑ جیسے بادشاہ کو قہلت کہلوائے بھکارن شہزادی کا۔

[2] خطا کار بادشاہ ہنڈیا بھوننے پر لگ گیا۔ یعنی آپ نے شاہ آمون کے ملک پہنچ کر شاہی باورچی خانے میں نوکری کر لی۔ نیز 1983ء میں ص-395 پر شاہ آمون کے بجائے شاہ رسمون بھی لکھا گیا۔ (پرویزؒ: مطالب القرآن‘ جلد دوم‘ ادارہ طلوع اسلام‘ لاہور

[3] ایک تھا بادشاہ‘ ان کے گھر آٹا ختم ہو گیا۔ اس کی ملکہ پڑوسن کے ہاں گئی۔ وہاں چکی پیس کر جب واپس ہوئی تو آٹا تو لے آئی مگر اپنا نولکھا ہار وہاں بھول آئی۔

''بھکارن شہزادی نے وہ مچھلی اس سے خرید لی اور جس وقت اس کا پیٹ چاک کیا تو اس میں سے ایک انگوٹھی برآمد ہوئی (حضرت) سلیمان علیہ السلام نے جنہوں نے اپنا نام قہلت رکھ چھوڑا تھا' فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی انگوٹھی ہے۔ اسے فوراً اٹھالیا اور آنکھ جھپکنے کے عرصے میں یروشلم پہنچ کر اس غدار کو قتل کیا اور تختِ حکومت پر متمکن ہو گئے ❶۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے حواریوںؓ کی عظمت کے بالمقابل اہل کتاب کی کتابوں میں بیان کردہ واقعات

عزیزانِ من! آپ نے یہ داستانیں سن لیں۔ افوہ! یہ ہے اہلِ کتاب کی خدا کی یہودی تالمود کتاب اور یہ ہے اس کے اندر خدا کے انبیا کے متعلق!! قرآنِ کریم آیا اور آکر ان انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرت و کردار پر جس قدر یہ افسانوی پردے پڑے ہوئے تھے ان میں سے ایک ایک کو چاک کر کے' ان کی منزہ' پاکیزہ' بلند سیرت کو سامنے لے آیا۔ انبیائے کرام علیہم السلام ہی کی نہیں صاحب! اس کی تو کشادہ نگہی ہی کیا' وہ تو حقیقت کو بیان کرتا ہے' جبکہ اور تو اور انجیل کہتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وہ بارہ حواری تھے' جن کے متعلق عیسائیوں کا متفقہ فیصلہ ہے' ان کی انجیل میں یہ چیز لکھی ہوئی ہے کہ جب حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام پہ ہاتھ ڈالا گیا تھا' تو وہ سارے ان کو اکیلے ہی چھوڑ کر بھاگ گئے اور ان کو حوالے کر دیا۔ ان کا یہ کیریکٹر بتایا ہوا ہے۔ عیسائی ان کو Apostle (حواری) کہتے ہیں یعنی رسول کہتے ہیں۔ وہ اپنے رسولوں کا یہ کیریکٹر بتاتے ہیں' ان کی انجیل میں آج بھی یہ لکھا ہے۔ قرآن آیا تو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی جو صحیح سیرت تھی' وہ تو ایک طرف رہی' ان حواریوں کے متعلق اس نے یہ کہا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا کہ آؤ کون ہے' اس انقلاب میں خدا کی مدد میں میرا ساتھ دینے والا ❷' حواریوں نے کہا کہ ہم تمہارا ساتھ دینے والے ہیں اور ہمیں اس میں لکھ لو کہ ہم تمہارے ساتھ جانیں دیدیں ❸ گے۔ برادرانِ عزیز! وہ نبی تو ایک طرف رہا' وہ تو ساتھیوں کے متعلق بھی یہ کچھ کہتا ہے۔ جن کے وہ Apostle (رسول' حواری) ہیں' وہ ان کی وہ سیرت بیان کر رہے ہیں۔ یہ قرآن آتا ہے تو اس نبی کے حواریوں کے متعلق یہ شہادت دیتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے متعلق امام طبری کے بیان کردہ قابلِ افسوس قصے

بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ آپ کی تاریخ میں بھی تو آپ کے نبی کے حواریوں کے متعلق پھر کچھ کم نہیں کیا ہوا۔ انجیل کے بیانات تو ہمارے سامنے آجاتے ہیں جو حواریوں کے متعلق ہیں۔ اسی ابوجعفر محمد بن جریر طبری (923-838ء مطابق 310-224ء) نے اپنے ہاں جو صحابہ کبارؓ کے متعلق لکھا ہوا ہے' اسے پڑھ کر خون کھول جاتا ہے۔ اب بدبختی یہ ہے کہ آج اس ہمارے دور میں بھی فخر کے ساتھ

---

❶ واوین میں دی گئی عبارت کا حوالہ ہے: یہودی تالمود ماخوذ از پرویزؒ: برقِ طور (1993ء)' ص ص 274-273۔
❷ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ (3:51)
❸ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (3:51)

ان کو اچھالا جاتا ہے' خلافت وملوکیت کے اوپر کتابیں لکھی جاتی ہیں' ہزاروں کی تعداد کے اندر ان کو پھیلایا جاتا ہے اور اس بات کے اوپر بڑا فخر کیا جاتا ہے (معاذ اللہ) کہ ہمارے شجرِ طیّب نے نبی ﷺ کے یہ پھل پیدا کیے ہوئے تھے۔ عزیزانِ من! درخت تو اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ قرآن آیا' میں نے یہ کہا کہ وہ جتنے ایسے افسانے آئے' وہ ایک ایک کی تردید کرتا چلا جارہا ہے۔ پسِ منظر آپ نے سن لیا' بیک گراؤنڈ ہمارے سامنے آگئی۔ معاف فرمایئے گا میں یہاں نہیں بات چھوڑنا چاہتا' مجھے یہ ضرور پورا کرنا ہے اور آپ بھی متفق ہوں گے کہ مجھے کرنا چاہیئے بات تو اب سامنے آئی ہے' وہ آیا' کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بنی اسماعیل کی طرف پیغمبر آگیا' اس لیے نہیں مانتے۔ جبریل نے غلطی سے ادھر دیدیا۔ ان کی کیفیت اپنے پیغمبروں کے متعلق کیا تھی؟ یہ کہ انہوں نے خدا کے پیغمبروں کی کتابوں کو پیٹھ پیچھے پھینک چھوڑا تھا اور اپنی کیفیت یہ تھی کہ **وَ اتَّبَعُوۡا مَا تَتۡلُوا الشَّیٰطِیۡنُ عَلٰی مُلۡکِ سُلَیۡمٰنَ** (2:102) وہ جو مملکت سلیمانی علیہ السلام کے خلاف سازشیں کرنے والے تھے ان کا اتباع کرتے تھے۔ عزیزانِ من! یتلوا علیٰ کے معنی صرف پڑھنا ہی نہیں ہوتا۔ قرآن عجیب لفظ استعمال کر گیا ہے۔ "یتلوا علیٰ" تو وہ چیز ہے کہ جس کو عام طور پہ پڑھا جائے اور پھیلایا جائے' کسی کے پیچھے چلا جائے۔ میں نے کہا ہے کہ وہ پروپیگنڈے کے ذریعے سے وہ سازش کرتے تھے۔ ان کے خلاف الزامات' افترات پھیلاتے تھے' اور ہر جگہ جو سازشی پروپیگنڈہ ہوتا ہے' وہ آپ کے سامنے ہی ہے۔ وہ بیٹھے ہوئے کس کس قسم کی چیزیں تراشتے ہیں؟ یہ کہ **وَ اتَّبَعُوۡا مَا تَتۡلُوا الشَّیٰطِیۡنُ عَلٰی مُلۡکِ سُلَیۡمٰنَ** (2:102) ان کا اپنا پیغمبر تھا اس کے خلاف اس کے دشمنوں نے' شیاطین نے' سازشیوں کے سرغنوں نے' جو خرافات تراشی ہوئی تھیں' یہ ان کے پیچھے پیچھے چلتے تھے اور کتاب اللہ کو انہوں نے اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑا ہوا تھا۔ یہ ہے وہ قوم۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق پھیلائی ہوئی تہمتیں اور خرافات کے علاوہ ہاروت و ماروت کے خودساختہ قصے

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کریم کیا بتا رہا ہے' اس گھڑی ہوئی تہمتوں میں کیا بات تھی کہ سلیمان علیہ السلام نے اپنی بیویوں کے کہنے میں آکر خدا سے انکار کیا' بتوں کی پرستش شروع کی **وَ مَا کَفَرَ سُلَیۡمٰنُ** (2:102) کہنے کو یہ ان کے پیغمبر ہیں' ان کی Defence (دفاع) کون پیش کر رہا ہے؟ **وَ مَا کَفَرَ سُلَیۡمٰنُ وَ لٰکِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ کَفَرُوۡا** (2:102) یہ خود تھے جو کچھ یہ کرتے تھے' انہیں شیاطین کہیں گے۔ خدا کے اولوالعزم پیغمبر کی طرف یہ نقش اور ٹونے اور ٹوٹکے اور جادو اور یہ سارا کچھ سلیمان کی طرف منسوب کرتے ہیں' نقشِ سلیمانی کہہ کر **یُعَلِّمُوۡنَ النَّاسَ السِّحۡرَ** (2:102) یہ تھے وہ شیاطین جو لوگوں کو اس قسم کے ٹونے اور ٹوٹکے اور جادو اور خرافات کی چیزیں سکھاتے تھے۔ پھر یہ قصہ کہ صاحب! بابل میں یونہی کہتے ہیں کہ ان کے ہاں کا جو وضعی پروپیگنڈہ تھا' ان میں اس قسم کی چیزیں تھیں' کبھی سلیمان کے متعلق کہ وہ کفر کرتا تھا' جادو سکھاتا تھا' کبھی یہ کہ بابل میں دو فرشتے اترے ہوئے تھے۔ قرآن یہ ان کی بات بیان کر رہا ہے۔ عزیزانِ من! وہ کہہ یہ رہا ہے کہ یہ جو کچھ خرافات یہ افترا پردازیاں انہوں نے اس زمانے میں وضع کر رکھی تھیں' ان میں یہ چیز بھی تھی کہ سلیمان کفر کرتا تھا' جادو سکھاتا تھا۔ یہ بھی ایک افسانہ تھا کہ بابل کے کنویں میں دو فرشتے ہاروت و ماروت ہیں۔ یہ ان

کا افسانہ نقل کر رہا ہے اور یہ بھی کہ پھر وہ لوگ ان کے پاس جاتے ہیں، وہ لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں۔ جادو سکھانے سے پہلے یہ کہتے ہیں کہ دیکھو بھئی! یہ جو جادو والی بات ہے، یہ کافر والی بات ہے۔ ہم تمہیں کہہ دیتے ہیں کہ کفر نہ کرو لیکن یہ سیکھنے والے تو اس قدر خواہش مند ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! اس کے باوجود ہمیں سکھایئے۔ وہ کہتے ہیں کہ اچھا! اگر تم ایسے ہی مصر ہو تو لیجیے ہم تم کو سکھا دیتے ہیں۔ وہ ان سے یہ سارا کچھ کہتے تھے کہ دیکھو بھئی! ہم تو آزمائش میں پھنسے ہوئے ہیں، کفر کر رہے ہیں، تم کیوں کفر کرتے ہو ہم سے نہ سیکھو، لیکن وہ ضرور سیکھتے تھے۔ کہتے تھے کہ ہمیں وہ چیزیں سکھاؤ جو میاں بیوی کے اندر تفریق کرنے والی ہوں، اس قسم کا کالا علم بتاؤ۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج بھی یہ کچھ ہوتا ہے۔ گھر میں میاں بیوی میں مناقشہ ہوا تو اس کے بعد جب پیر صاحب کی طرف گئے تو وہ کہتے ہیں ہوں ہوں! میں بتاتا ہوں بھئی! وہ جن کو بلا کے پوچھتے ہیں کہ تمہارے ہاں کیا ہوا ”فلاں نے چولہے دے تھلے فلاں نی جیہڑی ہے نونہہ، او ہنے آن کے تیرے تے تعویذ دبے ہوئے ہیگے نیں [1]۔“ یہ ساری خرافات وہاں سے آئی ہوئی ہیں کہ وہ ان سے یہ کچھ کہتے تھے اور یہ دیکھیے کہ صاحب! وہ کہہ دیتے تھے کہ صاحب! دیکھیے، ہم کچھ نہیں کر سکتے، ہمارے بس میں کوئی بات نہیں ہے، خدا کا کلام ہے، اس کے اندر یہ قوت ہے۔ **وَ مَا هُمۡ بِضَآرِّيۡنَ بِهٖ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ** (2:102)۔ یہ سارا کچھ جو ہے، سنیے! یہ وہ افسانہ تھا جو ان لوگوں نے تراشا ہوا تھا۔

قرآنِ حکیم نے اس قسم کے تمام افسانوں کی تردید کی ہے

قرآن کہتا ہے کہ **وَ مَاۤ اُنۡزِلَ عَلَى الۡمَلَكَيۡنِ** (2:102) کچھ نہیں تھا، نہ ہم نے ان پہ کوئی نازل کیا ہے، نہ وہ کوئی فرشتے تھے، نہ وہ کوئی سکھاتے تھے، نہ وہ یہ کچھ کہتے تھے، یہ ساری بکواس تھی۔ عزیزانِ من! ایک ”ما“ نے معاملہ صاف کر کے رکھ دیا۔ قرآن ہے مگر

ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

اسرائیلیات کی خرافات کے افسانے دماغوں کے اندر ہیں اور پھر اتنی بڑی سازش ہے کہ ساری وہ خرافات کی چیزیں ہیں، آپ کے ہاں وہ حدیثیں، روایتیں، تفسیریں بن کر آپ کے ہاں کی تفسیروں کے اندر موجود ہیں، ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کا اعجاز ہے کہ ان کے ہاں کی اتنی بڑی چیزیں ایک لفظ کے اندر کہہ دیا کہ **وَ مَاۤ اُنۡزِلَ عَلَى الۡمَلَكَيۡنِ بِبَابِلَ هَارُوۡتَ وَ مَارُوۡتَ ؕ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنۡ اَحَدٍ** (2:102) قطعاً یہ بات نہیں تھی، کیا بات ہے قرآن کی صاحب! کہا کہ یہ سب غلط ہے، سب افسانے ہیں کہ وہ یہ کہتے تھے وہ کہتے تھے۔ **وَ مَا هُمۡ بِضَآرِّيۡنَ بِهٖ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ** (2:102) قطعاً یہ بات نہیں ہے **وَ يَتَعَلَّمُوۡنَ مَا يَضُرُّهُمۡ وَ لَا يَنۡفَعُهُمۡ** (2:102) یہ ٹونے ٹوٹکے، یہ جادو خرافات ہیں، اس میں ٹھیک ہے کچھ فائدے حاصل ہو جاتے ہیں۔ ”ٹھیک ہے جی ڈبہ پیر نوں پوچھو کی کچھ ہوندا ہیگا [2]“۔

---

[1] فلاں بہو نے چولہے کے نیچے تمہارے اوپر تعویذ دبائے ہوئے ہیں۔

[2] ٹھیک ہے جی! ڈبہ پیر سے پوچھو کہ کیا کچھ ہوتا ہے۔

چند ٹکوں کی خاطر زندگی کی نعمت کو فروخت کر دیا جاتا ہے

اب جیسا کہ میری بچی نے یہ کہا تھا' یہ ڈبہ پیر کوئی خاص نہیں ہے ہر پیر ڈبہ پیر ہوتا ہے' بس ڈبوں کی نوعیت میں فرق ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے' اس سے فائدہ ہوتا ہے لیکن اے کاش کہ انہیں پتہ ہوتا کہ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (2:102) یہاں تو ان کو چند ٹکے مل جائیں گے' زندگی کے مستقبل میں تو ان کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ (2:102) چند پیسے تو یہ لے لیتے ہیں' اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں۔ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (2:102) اے کاش! اتنی سی بات بھی سمجھ لیتے۔ یہ بات تو ایک چھوٹا سا دکاندار بھی سمجھ لیتا ہے' وہ بھی کبھی نہیں کہتا ہے کہ گاہک آ کر اس سے کہے کہ صاحب! یہ لیجیے سو روپیہ دیتا ہوں' اپنی جان دید یجیے۔ وہ اس کو حوالات میں بھیج دے گا۔ کبھی وہ یہ نہیں کرتا۔ وہ کہے کہ دس ہزار لے لیجیے' کہتا ہے کہ بکتے کیا ہو؟ کہہ یہ رہا ہے کہ چند ٹکے لیتے ہیں' اپنا آپ بیچ دیتے ہیں۔

آخر یہ کیا وجہ ہے کہ صدیوں سے کسی نے ان تفسیروں کی تردید نہیں کی

قرآن کریم کہتا ہے کہ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (2:102) اے کاش! اتنی سی بات ان کی سمجھ میں آ جاتی تو پھر تو یہ کچھ نہ کرتے۔ اس وقت تک عزیزانِ من! یہ ہے وہ آیت جس کے اُس ترجمے اور تفسیر نے یہ کچھ الجھاؤ ڈالے' اور یہ تفسیر نے آپ کے ہاں اس وقت تک متداول چلی آ رہی ہے' یاد رکھیے! کسی نے ان تفسیروں کی تردید نہیں کی۔ اس لیے کہ تردید کوئی کر نہیں سکتا' تردید کرنے والے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسول اللہ ﷺ زیادہ سمجھتے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں زیادہ سمجھتا ہوں۔ ہم کہتے یہ ہیں کہ جنہیں تم رسول اللہ ﷺ کی تفسیر بتاتے ہو' وہ حضور ﷺ کی ہے ہی نہیں۔ بات یہ ہے عزیزانِ من! اس ایک ''ما'' نے قرآن کا سارا مسئلہ حل کر کے رکھ دیا۔ آگے کہا کہ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَیْرٌ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (2:103)۔ بڑی عمدہ بات ہے۔ کہا کہ اگر یہ لوگ ان افسانوں کے پیچھے لگنے کے بجائے ان قرآنی صداقتوں پر ایمان لاتے' قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے' یہ ان خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلتے تو خدا کے ہاں سے انہیں اس کا بہت اچھا بدلہ' نتیجہ ملتا۔

برادرانِ عزیز! 103 آیت تک ہم آ گئے۔ آئندہ 104 ویں آیت سے ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

چھبیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)' (آیات 104 تا 107)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَقُولُواْ رَٰعِنَا وَقُولُواْ ٱنظُرْنَا وَٱسْمَعُواْ ۗ وَلِلْكَٰفِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ١٠٤ مَّا يَوَدُّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ
مِنْ أَهْلِ ٱلْكِتَٰبِ وَلَا ٱلْمُشْرِكِينَ أَن يُنَزَّلَ عَلَيْكُم مِّنْ خَيْرٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَٱللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِۦ مَن يَشَآءُ ۗ وَٱللَّهُ
ذُو ٱلْفَضْلِ ٱلْعَظِيمِ ١٠٥ مَا نَنسَخْ مِنْ ءَايَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ أَوْ مِثْلِهَآ ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ
قَدِيرٌ ١٠٦ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ ٱللَّهَ لَهُۥ مُلْكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۗ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ مِن وَلِىٍّ وَلَا نَصِيرٍ ١٠٧

عزیزانِ من! آج دسمبر 1968ء کی 8 تاریخ ہے اور درس میں سلسلۂ کلام سورۃ البقرۃ کی آیت 104 سے شروع ہوتا ہے: (2:104)۔

سابقہ درس میں پیش کردہ آیت (2:102) کے مروّجہ تراجم کی تردید اور اس کا حقیقی مفہوم

ابھی ابھی مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ پچھلے درس میں' میں نے آیت 102 کی تشریح میں کافی وقت لیا تھا' بات کافی حد تک صاف ہو گئی ہے لیکن اگر اس آیت کا محض ترجمہ ایک بار دہرا دیں تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔ ترجمہ سمجھنے کے لیے اس پس منظر کو جو اس سابقہ درس میں بیان کیا ہے' یہ Understood (طے شدہ) ہے' کہ اسے سامنے لے آیا جائے تو ترجمے سے بات واضح ہو جائے گی۔ وہ پس منظر یہ تھا کہ یہودیوں کے ہاں یہ ایک افسانہ چلا آ رہا تھا کہ دو فرشتے اتارے گئے' وہ بابل میں ہیں' ہاروت و ماروت ان کا نام ہے۔ ان پر خدا کی طرف سے کچھ قہر نازل ہوتا ہے' کچھ اسمِ اعظم کی قسم کی چیزیں ہیں۔ پھر لوگ ان دو فرشتوں کے پاس جاتے ہیں کہ ہمیں بھی یہ سکھا دیجیے۔ وہ ان سے یہ کہتے ہیں کہ نہ بابا! ہم تو مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں' تم کیوں مصیبت میں پھنستے ہو لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اصرار کرتے

تو وہ پھر بہر حال ان کو سکھا دیتے۔ وہ ایسی چیزیں سکھا دیتے جو میاں بیوی میں تفرقہ پیدا کر دیتیں اور اس سے ان کو نقصان ہو جاتا اور پھر وہ یہ کہتے کہ صاحب! یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے' یہ بہر حال خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! یہ چیز ذہن میں رکھیے تو اس کے بعد آپ دیکھیے کہ ترجمہ صاف ہو جاتا ہے۔ بات یہاں سے چلتی ہے کہ یہ سارا افسانہ ہی افسانہ ہے' ان کی یہ ساری باتیں خرافات ہیں' ان میں کوئی چیز بھی ٹھیک نہیں ہے' اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بتایا ہے کہ **مَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ** (1:102) ہم نے ان فرشتوں کے اوپر کوئی کچھ نہیں نازل کیا جو یہ کہتے ہیں کہ بابل میں ہاروت و ماروت کے نام سے یہ دو فرشتے ہیں۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ وہ لوگوں کو سکھاتے تھے۔ جب لوگ ان کے پاس آتے تھے تو کہتے تھے کہ صاحب! ہم سے نہ سیکھیے' ہم تو فتنے میں مبتلا ہیں' تم کیوں کفر کرتے ہو۔ کہا یہ ہے کہ یہ بات بھی نہیں ہے۔ یہ بات بھی نہیں کہ پھر وہ لوگوں کو وہ کچھ سکھاتے تھے جس سے میاں اور بیوی میں تفرقہ پیدا ہوتا تھا اور نہ ہی یہ چیز تھی کہ وہ یہ کہتے تھے کہ صاحب **وَ یَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّھُمْ وَ لَا یَنْفَعُھُمْ** (2:102) ہم تو کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے' یہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ یہ کوئی چیز بھی ان میں سے ٹھیک نہیں ہے۔ یہ یہاں تک جو کچھ کہا گیا ہے' یہ اس کی تردید ہے' جو ان کے ہاں یہ چیز اس زمانے میں مسلم و معروف چلی آ رہی تھی۔ یہ ہیں اس زمانے کے افسانے' پھر یہودی ان کی پیروی میں یہ سند دیتے ہوئے ٹونے' ٹوٹکے' تعویذ' گنڈے کرتے تھے اور اس سے وہ کچھ پیسے بٹور لیتے تھے' کچھ اس سے نفع حاصل کرتے تھے۔

اب یہاں سے ایک دوسری چیز آئی ہے۔ یہاں آپ دیکھ لیجیے' وہاں پہ مطلق ''ط'' کا نشان دے کر ایک دوسری بات شروع کی ہے' یہ جو کچھ لوگوں کو سکھاتے ہیں کہ یہ ان کو حقیقت میں فائدہ نہیں پہنچاتے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ہم کچھ کمائی کر لیتے ہیں۔ یہ چیزیں فائدہ نہیں پہنچاتیں' یہ درحقیقت نقصان پہنچانے والی چیزیں ہیں۔ اس لیے کہ وہ اس سے اس دنیا کا کچھ نفع تو کما لیتے ہیں' یہ تو خرید لیتے ہیں لیکن اس کے عوض میں یہ آخرت بیچ دیتے ہیں اور کتنی بری چیز ہے جو وہ اپنے آپ کو بیچ کر خریدتے ہیں۔ اے کاش! وہ اتنی سی بات جان لیتے۔ یہ ہے جی عام ترجمہ اور اس کا اگر آپ ایک مربوط سلیس اردو میں ترجمہ دیکھنا چاہیں تو میرا ''مفہوم القرآن'' دیکھیے اس میں یہی چیز ایک ربط کے ساتھ میں نے بیان کر دی ہے۔ یہ اس کا آپ ترجمہ سمجھ لیجیے۔

قرآن حکیم کے الفاظ کا ترجمہ کسی شکل میں ہو ہی نہیں سکتا

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' قرآن کی آیات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کیا کیجیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جو ترجمہ ہے' اس میں لفظوں کا بدل (Substitute) ایک لفظ میں اردو میں ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ دوسری زبان میں قرآن کا آپ مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔ قرآنِ کریم کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں ہو ہی نہیں سکتا۔ ترجمے کے معنی ہوتے ہیں' لفظ کی جگہ دوسری زبان کا لفظ دے دینا۔ اس طرح سے قرآن نہیں سمجھا جا سکتا'

اس کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہوسکتا۔ بہرحال میں کوشش یہی کیا کرتا ہوں کہ اس میں تشریح کروں اور ''مفہوم القرآن'' میں' میں نے ان آیات کا مفہوم سمجھایا ہے' ترجمہ میں نے وہاں بھی نہیں کیا۔ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسا میں نے شروع میں عرض کیا تھا' قرآں کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہوسکتا۔

اب آج آیت 104 سے بات شروع ہوتی ہے۔ وہی بنی اسرائیل کی داستان ہے' وہی یہودیوں کی ذہنیت ہے' وہی ان کی نفسیاتی کیفیات ہیں۔ انہیں سامنے لا کر کہا یہ گیا ہے کہ اے جماعتِ مومنین! تم کہیں یہ نہ کرنا' تم ایسا نہ ہوجانا' تم یوں نہ بن جانا۔ یہ ہے جو قرآن میں ان آیات میں انداز چلا آ رہا ہے' درس کی ان آیات میں اس وقت تک یہ انداز چلا آ رہا ہے۔

مومنین کے لیے جماعت کی اہمیت' خصوصیات اور لوازمات کی وضاحت

کہا کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقُوۡلُوۡا رَاعِنَا وَ قُوۡلُوا انۡظُرۡنَا وَ اسۡمَعُوۡا وَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (2:104)۔ اس آیت کے اندر جماعتی زندگی کا ایک بڑا بنیادی اصول بیان ہوا ہے۔ جماعت کے اندر آنے سے' آپ کے لیے یہ ضروری ہے' کہ آپ ڈسپلن قائم رکھیں' جو فیصلے وہاں ہوں ان کو بگوشِ ہوش سنیں' پھر ان پر عمل کریں۔ اگر قدم قدم پر آپ نے یہ اصرار شروع کر دیا کہ فلاں معاملے میں بھی ہم پہ رعایت کر دیجیے' فلاں معاملے میں ذرا ڈھیل دے دیجیے' اس کو Relax کر دیجیے' اس میں کوئی Favour Show (اظہارِ رعایت) کر دیجیے تو جماعت چل ہی نہیں سکتی۔ یاد رکھیے! جماعت میں پہنچ کر آپ نے یہ کچھ شروع کیا تو وہ جماعت چل ہی نہیں سکتی' وہ نظام چل ہی نہیں سکتا۔ جس جماعت اور نظام میں افراد اس قسم کے تقاضے کریں اور اگر افراد کے تقاضے پورے کرنے شروع کر دیئے جائیں تو جماعتی مصلحتیں کہاں جائیں گی اور اگر افراد کے تقاضے پورے نہ کیے جائیں تو نظام اور جماعت بگڑ کر رہ جائیں گے' چل نہیں سکیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج کل جس جھنڈ کا نام ہم پارٹی یا جماعت رکھتے ہیں' وہ حقیقت میں تَحۡسَبُھُمۡ جَمِیۡعًا وَّ قُلُوۡبُھُمۡ شَتّٰی (59:14) ہوتی ہے' جو قرآن نے یہودیوں کے متعلق کہا ہے کہ تم نظر بظاہر ایسا دیکھتے ہو کہ صاحب! ہزاروں' لاکھوں کی ایک جمعیت ہے' جماعت بن چکی ہوئی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ جماعت نہیں بنی۔ کیوں نہیں بنی؟ یہ عجیب چیز ہے۔ اس لیے نہیں بنی کہ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ جب اس قسم کی جماعت بنتی ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ پھر اس جماعت کو قائم رکھنے کے لیے جماعت کے سربراہ کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ اسے ہر وقت یہ دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ اس کی بھی رعایت برتی جائے' اس کی بھی رعایت برتی جائے' یہ نہ بگڑ جائے' وہ نہ چلا جائے لیکن اس انداز سے آپ زیادہ سے زیادہ الیکشن کے دنوں تک تو جماعتیں رکھ سکتے ہیں' یہ جماعت نہیں بن سکتی۔

عزیزانِ من! جماعت کے تو معنی یہ ہیں کہ آپ پہلے' سوچ سمجھ کر' عقل وفکر سے' غور وتدبر کے بعد دیکھ لیں کہ اس جماعت کے اصول ایسے ہیں کہ میں اس کے ساتھ منسلک ہوسکتا ہوں۔ اس کے بعد اس جماعت کے اندر آیئے اور پھر وہاں جو فیصلے ہوتے ہیں' ان

فیصلوں کو سنیے اور ان کے مطابق عمل کیجیے اور اگر ایک ایک بات میں آپ نے یہ کہنا شروع کیا کہ صاحب! میری رعایت کر دیجیے' تو اب اس میں ہر فرد رعایت چاہنے لگا' تو اس کے بعد جماعتی فیصلے تو ختم ہو جائیں گے۔ کہا ہے کہ دیکھیے! یہ ہے اصول' ایک امت کی حیثیت سے جماعت کی حیثیت سے' زندگی بسر کرنے کا۔ **لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا** (2:104) اس قوم بنی اسرائیل کی طرح قدم قدم پر یہ بات نہ کہنا شروع کر دینا کہ ہماری یوں رعایت کیجیے اور ہماری یوں رعایت کیجیے۔ زیادہ سے زیادہ سربراہ کے متعلق یہ کہیے کہ **وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا** (2:104) ہمارے اوپر ذرا نگاہ رکھیے گا کہ ہم بے راہرو نہ ہونے پائیں۔ یہ بڑی چیز ہے کہ ''ہمارے اوپر نگاہ رکھیے' **وَ اسْمَعُوْا** (2:104) اور اس کے بعد ان فیصلوں کو سنیے اور جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ فیصلوں کو سننے کے معنی ان کی اطاعت کرنے کے ہیں کیونکہ پچھلی آیت یعنی (2:93) میں قرآن نے کہا تھا کہ ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ **قَالُوا** (2:93) یہ کہتے ہیں کہ **سَمِعْنَا** (2:93) ہم سنتے ہیں **وعصینا** (2:93) اور اس کے بعد خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یہ سننا نہیں ہے۔ ''سماعت کے اندر اطاعت آ جاتی ہے''۔ اس لیے تم سربراہ سے تو یہ چیز کہو کہ ہم پہ ذرا نگاہ رکھیے کہ ہمارا قدم اِدھر اُدھر نہ ہونے پائے اور پھر سنیے اور اس کی اطاعت کیجیے۔ یاد رکھیے! جو یہ روش اختیار نہیں کرتے' اس کا نتیجہ ایک الم انگیز تباہی ہوا کرتا ہے۔

نبوت کے سلسلہ میں یہودیوں اور مشرکین عرب کے اعتراضات کی وضاحت

عزیزانِ من! بات یہ چلی آ رہی تھی کہ یہودیوں نے ایک تو یہ اعتراض کیا تھا کہ صاحب! بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل میں یہ نبوت کیوں چلی گئی؟ نبوت تو ہمارے خاندان کی Monopoly (اجارہ داری) تھی' یہ دوسری قوم میں کیوں چلی گئی؟ اور اس کے لیے پھر جبریل کے دشمن ہو گئے کہ وہ اصل میں یہ پیغام اس گھرانے کے اندر لے گیا' لانا تو ادھر چاہیے تھا۔ 'کتھے قابو آ جائے تے سچ لیے اینوں صاحب! اینے کیتا کی اے[1]!'' وہاں سے قرآن نے اس کی تردید کی' آگے بڑھا۔ قرآن کہتا ہے کہ **مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ** (2:105) بات اصل میں ہے ہی یہ کہ یہ آ کر جتنی باتیں کرتے ہیں' یہ سب کٹ حجتیاں ہیں۔ یہ دل سے یہ چاہتے ہی نہیں' نہ یہ اہلِ کتاب اور نہ یہ مشرکینِ عرب کہ تمہارے اوپر کوئی خیر نازل ہو جاتا۔ یہ چاہتے ہی نہیں تھے۔

اہلِ کتاب کا ذکر تو پہلے آ گیا کہ وہ اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ یہ نبوت ان کی قومی گروہ بندی سے باہر چلی جاتی ہے۔ وہ عصبیت تھی قومی' جس کی بنا پہ وہ نہیں چاہتے تھے۔ اور یہ جو مشرکین تھے' ان کے ہاں کیفیت یہ تھی یعنی یہ خود عرب تھے جن میں نبی اکرم ﷺ پیدا

---

[1] اگر ہمارے ہتھے چڑھ جائے تو صاحب! ہم اس سے نپٹ لیں کہ تم نے یہ کیا کیا ہے!

ہوئے۔ان کے قبیلوں کے لوگ تھے'ان کے ہاں قبائلی عصبیت بھی بہت بڑی تھی۔اس میں شبہ نہیں کہ کعبے کے متولی ہونے کی جہت سے قریش کا قبیلہ باقی عرب قبائل کے مقابلے میں بہت اونچا سمجھا جاتا تھا لیکن قریش کو ایک بہت بڑا قبیلہ یا قوم سمجھیے' اس کے اندر چھوٹے چھوٹے خاندان تھے۔ان خاندانوں میں باہمی مناقشت تھی' باہمی رقابت تھی' حسد تھا' وہ ایک دوسرے سے بڑھنا چاہتے تھے اور کسی کو بڑھتا ہوا دیکھ نہیں سکتے تھے چنانچہ یہ چیز ابو جہل ❶ کے گھرانے کی موجود ہے کہ انہوں نے کہا کہ جو فلاں چیز تھی' وہ بھی یہ بنو ہاشم لے گئے' فلاں معاملے کے اندر بھی یہ لے گئے لیکن پھر ہم نے اس کے مقابلے میں یہ کیا' یہ انہوں نے کیا اور ہم نے یہ کیا۔اب آخر میں دیکھیے کہ یہ نبوت بھی اپنے گھرانے میں لے گئے تو ہم اس کے بعد کیا کریں۔کہا کہ یہ مشرکین بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ چیزیں آ جائے۔

خیر کا مفہوم اپنے عزم واستحکام اور فیصلہ کرنے میں انسانی ذات کا بااختیار ہونا ہے

قرآن نے یہاں کہا ہے کہ اَنۡ یُّنَزَّلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ (2:105)۔ایک لفظ اس نے یہ خیر کہا ہے۔اب ہمارے ہاں اگر آپ اس کا عام ترجمہ کریں گے تو خیر کے معنی زیادہ سے زیادہ بھلائی کر دیں گے اور وہ بھلائی بھی اگر اور سمٹائیں گے تو اس کے لیے ''تے تہانوں پتہ ہے سویرنوں خیر پائی داہیگا فقیرنوں ❷ ''۔کہاں یہ بات چلی جاتی ہے اور یہ کہ اللہ خیر کرے' خیریت رکھے' اس کے اندر یہ سارا منفی پہلو آتا ہے' حالانکہ یہ ''خیر'' بڑی عظیم چیز ہے۔علمی دنیا میں اور ذرا اونچا چلے جایئے تو زیادہ سے زیادہ جو خیر اور شر ہے' اسے Good & Evil سے تعبیر کر دیا جائے گا۔یہ Good & Evil (خیر وشر' نیک وبد) کی بھی بات نہیں ہے۔یہ تو قرآن ہے اور اسی لیے میں نے کہا تھا کہ اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔یہ ''خ ی ر'' ہے۔جس سے یہ ''خیر'' ہے' یہ وہی چیز ہے' جس سے آپ کے سامنے ''اختیار'' کا لفظ آیا ہے۔یہ مادہ ہی وہی ہے' یہ تو انسان کو صاحبِ اختیار بنانے کی چیزیں ہیں۔شر وہ چیز ہوتی ہے' جس سے انسانی Personality میں' انسانی ذات میں Disintegration (انتشار' پژمردگی' اضمحلال) پیدا ہو جاتی ہے' ''شر'' کے معنی ہی Disintigrate کر دینا ہوتا ہے۔جسے Diffuse (منتشر' پریشان) کر دینا بھی کہتے ہیں۔اس کے لیے A Diffused & Disintegrative Personality (ایک پژمردہ وناتواں سی شخصیت) کی اصطلاح آتی ہے تو یہ ذاتِ انسانی صاحبِ اختیار نہیں ہوتی ہے۔جس ذات میں

---

❶ ابو جہل کا اصل نام عمر بن ہشام بن مغیرہ تھا اور ابوالحکم کنیت تھی۔چچا زاد بھائی خالد بن ولید مغیرہ تھا۔یہ خاندان حضرت عبدالمطلب کا ننیال تھا۔ان کی ایک بیگم فاطمہ بن عمرو تھی' ان کے تین بیٹے تھے: حضرت زبیرؓ ' حضرت ابو طالبؓ اور عبداللہ۔قبیلہ بنو مغزوم تھا۔یہ ابو جہل' حضرت عمرؓ ابن الخطاب کا ماموں تھا۔ابو جہل کا بیٹا عکرمہ مسلمان ہو کر حضرت عکرمہؓ کہلایا۔

❷ آپ کو معلوم ہے کہ صبح سویرے فقیروں (بھک منگوں) کو خیر خیرات ڈالتے ہیں۔

انتشار ہوتا ہے' اس کی پہلی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ شخص کبھی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اسے اپنے آپ پہ بھی کنٹرول نہیں رہتا' ہمیشہ تذبذب میں ہوتا ہے' اس کی Dual Personality (دوہری شخصیت) ہوتی ہے۔

انسانی Personality (شخصیت) کی Development (نشوونما) کا پہلا معیار اور علامت یہ ہے کہ انسان اپنے لیے فیصلہ کس قسم کا کرتا ہے۔ اس کے اندر ایک Determination (عزم) پیدا ہوتا ہے' صحیح فیصلہ کرتا ہے اور فیصلے کے اوپر جم کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ اگلی بات ہے کہ اس کے سامنے وحی کی روشنی ہو تو فیصلے ہمیشہ صحیح کرتا ہے لیکن صحیح کرے یا غلط کرے' پہلی چیز یہ ہے جسے آپ جمعیت کہتے ہیں' جسے Personality (ذات) کا استحکام کہتے ہیں کہ وہ Determination (عزم) سے ایک فیصلہ کرے۔ آپ نے ان لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ فیصلہ ہی نہیں کر پاتے۔ اور یہ بھی کہ اس فیصلہ نہ کر پانے سے کتنی تباہیاں آتی ہیں۔ یہ ہوتا کیا ہے؟ یہ ہے Weak Personality (کمزور شخصیت)۔ اسے اصطلاح میں Disintegrative Personality (شرزا اور منتشر شخصیت) کہتے ہیں' اسے آپ Split (ٹکڑے ٹکڑے ہوئی) ذات بھی کہتے ہیں۔ یہی چیز شر ہے۔ یہ ہر وہ ایکشن ہے' ہر وہ فعل ہے' ہر وہ عمل ہے جس سے انسانی ذات میں ضعف اور انتشار پیدا ہو جائے' وہ Disintegrate (مضمحل و منتشر) ہو جائے۔

خدا کی طرف سے اختیار و ارادہ کی خصوصیت وہ خصوصیت ہے جو اس کائنات میں صرف انسان کو ہی حاصل ہے

عزیزانِ من! خیر ہر وہ عمل ہے جس سے اس ذات میں اتنا استحکام پیدا ہو جائے کہ وہ صاحبِ اختیار و ارادہ بنتی چلی جائے اور یہی چیز ہے جو اس کائنات میں اوپر خدا کو حاصل ہے اور اس سے نیچے انسان کو حاصل ہے۔ جو انسان فیصلے نہیں کر پاتا' صاحبِ ارادہ نہیں ہوتا' سمجھ لیجیے کہ اس کی Personality Split-up (ذات ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی) ہے۔ وہ ضابطہ' وہ اصول' وہ قوانین' جن سے انسانی ذات میں اس قسم کا استحکام پیدا ہو جائے کہ وہ صاحبِ اختیار بن جائے' یہ ہے خیر۔ ایک ہی مقام پہ نہیں دیگر مقامات پہ بھی قرآنِ کریم کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ کیا ہے؟ کہا ہے کہ وَ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ (16:30) یہ لوگ' جماعتِ مومنین سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے خدا نے' تمہارے رب نے' تم پر کیا نازل کیا ہے یعنی یہ جو نازل کیا ہے' یہ کیا ہے؟ اب دیکھیے! اس کی تفصیل میں جائیے تو وہ تو پھر مہینے لگ جاتے ہیں' قرآن کی تفصیل میں وقت لگے گا کہ خدا نے کیا نازل کیا ہے لیکن اعجاز دیکھیے بلکہ اس کا ایجاز ایک لفظ میں دیکھیے' جواب سنیے کہ قَالُوْا وہ کہیں گے کہ خَيْرًا (16:30) نازل کیا ہے۔ اس میں کتنی جامعیت ہے!

سوال یہ ہوا کہ یہ جو خدا نے خیر نازل کیا ہے' یہاں تو ایک لفظ میں بات کہہ دی ہے' اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے' جسے خیر سے تعبیر کیا گیا ہے؟ عزیزانِ من! یہ غور سے سننے کی چیز ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ (16:30) جو اس کے

مطابق متوازن زندگی بسر کرتے ہیں' ان کی اس دنیا کی زندگی حسین ہو جاتی ہے تو کیا اتنا ہی ہوتا ہے؟ کہا کہ نہیں! وَ لَدَارُ الۡاٰخِرَةِ خَيۡرٌ (16:30) اس کی بعد کی انسان کی جو ارتقائی زندگی ہے' اس کے اندر بھی وہ صاحبِ اختیار وارادہ ہوتا ہے وَ لَنِعۡمَ دَارُ الۡمُتَّقِيۡنَ (16:30) جو اس طرح سے Personality (ذات) کی Disintegration (انتشار واضمحلال) کے خطرات سے بچ کر چلتا ہے' اس کا جو انجام ہے وہ ہمیشہ خیر اور بہتر ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں بھی قرآن کے متعلق یہی کہا کہ اس نے خیر نازل کیا ہے۔ اس ''خیر'' کے مطابق عمل کرنے سے ہوتا کیا ہے؟ یہیں ساتھ ہی بتا دیا کہ اس دنیا کی زندگی بھی حسین' آخرت کی زندگی بھی ایسی حسین کہ جس میں یہ انسانی ذات مزید اختیارات وارادوں کی مالک بنتی ہے۔ یہ ہے جو خدا نے نازل کیا ہے۔ یہاں بھی وہی لفظ آیا تھا اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ ''خیر'' کی تشریح کر دوں کہ یہ ہے کیا چیز۔ کہا ہے کہ مَا يَوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَ لَا الۡمُشۡرِكِيۡنَ اَنۡ يُّنَزَّلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ❶ (2:105)۔ اصل میں یہ چاہتے ہی نہیں تھے۔ عزیزانِ من! میں لفظوں میں جاؤں تو ایک ایک لفظ سامنے آ جاتا ہے۔

لفظ خیر کی وضاحت کے بعد لفظ مَوَدَّة کا قرآنی مفہوم

برادران عزیز! یہ جو لفظ وَدَّ' يَوَدُّ ہے' یہ محبت کے مقابلے میں Comparative Degree (تفصیلی درجہ) مَوَدَّة ہے' جہاں سے یہ لفظ آیا ہے۔ یہ جو مَوَدَّة ہے' یہ محبت کا اگلا درجہ (Comparative Degree) ہوتا ہے' محبت میں صرف کشش ہوتی ہے۔ مودۃ کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی چیز سے محبت کرنا اور اس کے ہو جانے کی تمنا کرنا' ایسی تمنا کہ مجھے ایسی چیز ضرور مل جائے۔ بڑا باریک سا فرق ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ وَاللّٰهُ يَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ (2:105)۔ یہ چیز کہ نبوت کہاں دی جائے گی' لوگوں کے پیمانوں کے مطابق طے نہیں کی جا سکتی۔ اس میں قومی گروہ بندیاں کوئی شے نہیں ہیں۔ جو معیار تمہارے نزدیک ہو سکتے ہیں' وہ معیار نہیں ہیں۔ نبوت صرف مشیت پر مبنی ہے۔

وہ جس فرد کو چاہتا ہے' وحی کے لیے چن لیتا ہے اور پھر جو چاہے اس وحی کی خیر و برکت سے مستفید ہو سکتا ہے

عزیزانِ من! یہ وحی ایک ہی چیز ہے' جس میں انسان کے اپنے کسب و ہنر کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور وہ تھی نبوت۔ یہ ''تھی'' میں نے اس لیے کہا ہے کہ وہ سلسلہ اب ختم ہو چکا ہے۔ نبی کا ذریعۂ علم اس کی اپنی فکر کا پیدا کردہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ

---

❶ ان اہلِ کتاب اور مشرکین عرب میں سے جو لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے وہ اسے دیکھ ہی نہیں سکتے کہ تمہاری طرف خدا کی وحی آئے (3:71;16:30) اور اس کی بنا پر تمہیں زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوں لیکن اس میں ان کے چاہنے یا نہ چاہنے کا کیا سوال ہے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص-37)۔

ایک Objective Reality (معروضی حقیقت) تھی' اس کو خارج سے علم حاصل ہوتا تھا' ان ذرائع کے بغیر جو علم حاصل کرنے کے لیے انسان اختیار کرتا ہے اور یہ وہ چیز تھی جسے خدا نے اپنی مشیت پر رکھا تھا یعنی یہ خدا ہی جانتا ہے۔ کہا ہے کہ **اللہ اَعۡلَمُ حیث یجعل رسالته** (6:125) اللہ جانتا ہے کہ کونسا سینہ ایسا ہے جو اتنے بڑے رازہائے کائنات کے اٹھانے کا مہبط بن سکتا ہے۔ یہ باتیں آگے چل کر آئیں گی۔ یہ وہ چیز نہیں ہے کہ وہ اپنی مشیت کے مطابق کسی کے سر پہ یہ تاج رکھ دیتا تھا' تو وہ کیفیت ہوتی تھی' جو اس مثال میں ہے کہ بادشاہ مر گیا' اس کا ولی عہد کوئی نہیں تھا' انہوں نے فیصلہ یہ کیا کہ جی! کل صبح شہر میں سب سے پہلے جو شخص داخل ہوا' اسے بادشاہ بنا دیا جائے۔ وہ ایک فقیر تھا' وہ آ گیا اور اس کو بادشاہ بنا دیا۔ اس مشیت میں یہ چیز نہیں ہے۔ جو مشیتِ خداوندی ہے' وہ تو بہت کچھ دیکھ کر نبی کا انتخاب کرتی تھی۔ تو نبی کا انتخاب یوں ہوتا تھا۔ اس لیے لوگوں کے پیمانوں کے مطابق یہ بات طے نہیں ہوا کرتی تھی۔ کہا ہے کہ **وَ اللّٰهُ يَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ** (2:105)۔ یہاں مشیتِ خالص وہ قوانین ہیں جو عالمِ امر سے متعلق ہیں' وہاں خدا یہ طے کرتا ہے کہ کون ہے وہ' جو اس منصب کے اہل ہے' اسے یہ منصب مل جاتا تھا اور جسے نبی بنایا جاتا تھا' قرآن کہتا ہے کہ اسے اس سے دو منٹ پہلے تک بھی اس کا علم نہیں ہوتا تھا کہ مجھ پر یہ اتنی بڑی نعمت وارد ہونے والی ہے لیکن یہ بھی نہیں تھا کہ یونہی راہ چلتے کسی کو نبی بنا دیا جائے۔ وہ جو ہمارے ہاں مشہور چلا آتا ہے کہ

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

جہاں یہ آگ لینے کو گئے تھے' جب میں سورۃ القصص پہ آؤں گا تو وہاں یہ دیکھیے گا کہ کیا کہا گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی سمجھا تھا کہ یونہی آگ لینے کو آیا تھا' پیمبری مل گئی۔ وہیں بات صاف کر دی کہ یہ نہ سمجھنا۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ تمہاری پیدائش سے لے کر اس وقت تک کن کن کٹھالیوں میں سے تمہیں گزارا گیا اور اس کے بعد جا کر کہا کہ **ثُمَّ جِئۡتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوۡسٰى** (20:40) تب کہیں جا کر تم ہمارے پیمانے پہ پورے اترے اور یہ چیز تمہیں دی جا رہی ہے۔ تمہیں اس کا علم نہیں تھا۔ بڑی کٹھالیوں میں سے گزارا جاتا ہے صاحب! یہ ہے اختصار اور یہ ہے کہ **وَ اللّٰهُ يَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ** (2:105) اللہ تعالیٰ اپنے قانون مشیت کے مطابق جس فرد کو چاہتا ہے' وحی کے لیے چن لیتا ہے' اور پھر جو چاہے اس وحی کی خیر و برکت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کی نعمتوں کا دسترخوان ہر شخص کے لیے کھلا ہے۔ جو ہاتھ بڑھا کر اٹھانا چاہے' اٹھا لے۔

آیت 106 کا وہ ترجمہ جس کے باعث قومِ مسلم صدیوں سے ایک امت بننے سے قاصر ہے

عزیزانِ من! اب آگے آیت 106 آتی ہے۔ یہ آیت ویسی ہی ہے جیسے کہ 102 آیت کے متعلق میں نے یہ عرض کیا تھا کہ بڑی اہم آیت ہے لیکن اس کے غلط مفہوم نے پتہ ہی نہیں کہ گاڑی کو کس پٹڑی سے کس پٹڑی پہ ڈال دیا۔ یہ اس 102 آیت سے بھی زیادہ اہم ہے اور اس کا غلط مفہوم نقصان رساں نتائج کے اعتبار سے اس سے کہیں زیادہ تباہ کن ہے۔ آیت یہ ہے کہ **مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ** (2:106)۔ یہ بڑی عظیم آیت ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ رسول خدا کی طرف سے ایک پیغام لاتا تھا۔ وہ پیغام اپنی قوم تک پہنچاتا تھا' اسے متشکل کر کے دکھاجاتا تھا۔ وہ چلا جاتا تھا تو اس کے بعد اس کی قوم کے مذہبی پیشوا اپنی مفاد پرستیوں کے لیے اس کے پیغام میں تحریف کرتے تھے' ملاوٹ کرتے تھے' آمیزشیں کرتے تھے' کچھ حصہ ضائع ہوجاتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ دین مذہب میں تبدیل ہوجاتا تھا۔ خدا کے اصلی پیغام کی جگہ انسانی خیالات لے لیتے تھے۔ پھر وہ اس کی تشریحات کرتے تھے۔ تورات تھی تو تالمود ایک اسی قسم کا ساتھ لے آتے تھے۔ پھر یہودیوں کے ہاں' جیسا کہ ان کے ہاں ایک عقیدہ وضع کیا گیا' کہ وحی کی دو قسمیں ہوا کرتی ہیں' ایک تو وہ ہے جو خدا کی کتاب میں آجاتی ہے اور دوسرا ہے **ومثلہ معہ** اس کے ساتھ ایک اور ہوتا ہے' وہ الگ ہوتا ہے۔ یہ یہودیوں کا عقیدہ تھا۔ وہ سارا کچھ یہ کرتے تھے تاکہ خدا کا دین انسانوں کے خود ساختہ مذہب میں تبدیل ہوجائے۔ نبی اکرم ﷺ تشریف لائے' خدا کا دین قرآن کے اندر محفوظ کر کے دیا۔ اب آپ ﷺ کے بعد یہ جو مفاد پرست گروہ تھا' اس کے لیے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ قرآن کے الفاظ میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی کرسکیں' اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا تھا۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی تو ممکن نہیں تھی۔ اب اسے مذہب میں کیسے تبدیل کریں؟ انہوں نے کہا کہ اس کے ہزار طریقے ہیں۔ حق کے لیے تو ایک ہی طریقہ رہتا ہے' صحیح جواب تو ہوتا ہی ایک ہے اور غلط جواب سینکڑوں ہوتے ہیں۔ باطل کے بیسیوں طریقے ہیں۔ اب اسے مذہب میں تبدیل کرنے کے لیے وہ ساری کوششیں' جو اس سے پیشتر میں گناتا چلا آرہا ہوں' گناتا چلا جاؤں گا' وہ آئیں۔

قرآن حکیم کے خلاف پہلی چیز وہ تفسیر تھی جو تیسری' چوتھی صدی ہجری میں زبانی روایات کی بنا پر لکھی گئی

قرآن کے متعلق پہلی چیز تو وہ ہے جو میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا۔ وہ یہ ہے کہ اس کی تیسری چوتھی صدی ہجری میں وہ تفسیر [1] کی گئی جسے نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دیا۔ یہ تفسیر زبانی روایات سے کی گئی تھی اور اس کے بعد یہ کہہ دیا کہ قرآن کا یہی مفہوم ہے جو اس کے اندر بیان ہوا ہے۔ اب قرآن کی آیات آپ کے پاس محض پڑھنے کے لیے رہ گئیں۔ ان کا مفہوم کیا ہے؟ وہ جو تفسیر میں دیا گیا ہے

---

[1] یہ ہے تفسیرِ طبری جو الطبری ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (225-311 H/838-923 AD) نے لکھی۔

اور وہ جو تفسیر تھی، وہ ساری انسانی خیالات کا مرقع ہے اور اس کے بعد جو آپ وہاں سے چلے ہیں، وہ ایک طرحی غزل تھی، اس کے بعد ہر شخص اسی طرح کے اوپر ایک مصرع لگاتا چلا گیا۔ تفسیریں تعداد کے اعتبار سے ہزارہا، ضخامت کے اعتبار سے ایک ایک تفسیر سوسو جلدوں کی بھی لکھی گئی لیکن اگر آپ مفہوم کے اعتبار سے دیکھیں تو اس پہلی تفسیر سے ذرا اِدھر اُدھر ہٹ نہیں سکتے کیونکہ اس کے ساتھ یہ کہہ دیا گیا تھا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی تفسیر ہے صاحب! اب اس چیز نے قرآن کی جگہ لے لی۔ روایات کے متعلق تنقید ہونی شروع ہوئی کہ صاحب! بہرحال انسانوں کے راستے سے یہ یہاں پہنچتی ہیں۔ کسی نے یہ کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے سامنے جو مخاطبین تھے، ان کو سمجھانے کے لیے یہ چیز اختیار کی ہوئی تھی، آپ ﷺ کی اپنی یہ چیز ہے۔

مثلہ معہ کے نام پر وحی کی دو قسموں کا عقیدہ اور پھر شانِ نزول کا تصور: دوسری چیز

قرآن نے کہا تھا کہ آپ ﷺ صحابہؓ سے مشورہ کیا کیجیے۔ کسی نے یہ کہا کہ صاحب! باہمی مشاورت سے کوئی چیز طے پائی تھی۔ عقیدہ اس کے ساتھ وہی یہودیوں والا وضع ہو گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی تھیں۔ ایک وحی تو قرآن کے اندر آ گئی اور دوسری وحی مثلہ معہ، اس کی مثل اس کے ساتھ، وہ ساری وحی روایات کے اندر ہے۔ اب یہ روایات نبی اکرم ﷺ کے اقوال نہ رہے، وحیِ خداوندی ہو گئے۔ یہ قرآن تو صرف اتنی سی کتاب ہے جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ میرے کمرے کے اندر ایک چارٹ کے اوپر ایک صفحے پہ یہ ساری کتاب لکھی ہوئی ہے اور مثلہ معہ جو اس کے ساتھ آئیں ان میں چھ لاکھ حدیثیں تو ایک امام بخاری [1] کہتے ہیں کہ میں نے جمع کی تھیں۔ یہ اتنا کچھ ہے اور عقیدہ یہ ہے کہ وہ جو ہے قرآن آپ کا مثلہ معہ، اس کی مثل اس کے ساتھ ہے، اور آگے ہر آیت کے متعلق چلے آئے کہ صاحب! اس کی ایک شانِ نزول ہے۔ یعنی اس کو آپ نے Time & Space (مکان و زمان) کے اندر محدود کر دیا۔ کوئی واقعہ ہوا تھا، اس واقعہ کے اوپر یہ ایک چیز آئی، بس اگر اس قسم کا واقعہ ہو گا تو پھر یہ آیت آپ کے کام آئے گی۔ اگر اس قسم کا واقعہ نہیں ہو گا تو یہ آپ کے کام نہیں آئی۔

قرآنِ حکیم کے معنی کے سلسلہ میں مولانا رومؒ کا فرمان: تیسری چیز

روایات بھی ایک وقت تک جا کر ختم ہو گئیں، آگے بن نہیں سکتی تھیں، اس کے لیے پھر اربابِ معرفت آگے بڑھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ جتنے بھی الفاظ ہیں، یہ تو کوئی شے ہی نہیں ہیں، الفاظ کے اندر ایک باطنی معنی ہیں یعنی وہ نہ زبان کا اعتبار، نہ لغت کا اعتبار، نہ روایت کا، نہ تفسیر کا، سارا ہی کچھ ختم ہو گیا کہ ان کے اندر باطنی معنی ہیں، ان کو الفاظ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بھئی! یہ باطنی معنی کہاں سے آئے؟ کیا کوئی

---

[1] امام محمد اسماعیل بخاریؒ (194-256ھ)

کسی قسم کی سند ہے؟ کہ جی! ہم خدا سے براہِ راست پوچھ آتے ہیں۔ چلیے صاحب! اور پھر اس کو اہمیت اتنی دی گئی کہ وہ مولانا رومؒ (604-672/1207-1273AD ھ) کہتے ہیں کہ

ما زِ قرآں مغز را برداشتیم
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

قرآن کا مغز یہ ہے جو ہم نے لے لیا ہے' یہ باقی جو کچھ تم لوگوں کے پاس ہے یہ تو ہڈیاں ہیں۔

پانچ سو آیات منسوخ ہیں کیوں؟: چوتھی چیز

برادرانِ عزیز! انسان بات نہیں کرسکتا۔ قرآن حکیم قانون کی کتاب تھی اور اس نے یہاں ہی راہنمائی دینی تھی۔ یہ تو ضابطۂ حیات ہے لیکن قانون کے متعلق یہ کچھ کیا گیا کہ پوچھیے ہی نہیں کہ اس کی حیثیت کیا رہ گئی۔ عقیدہ یہ وضع کیا گیا کہ قرآن کی جو احکام کی آیات ہیں' قانون تو احکام میں ہوتا ہے' ان میں ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے۔ ان سے کہا گیا کہ حکم قرآن کے اندر دیکھیے کہ آیا یہ حکم موجود ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! یہ حکم منسوخ ہے۔ اچھا جی! کتنی آیتوں کا حکم منسوخ ہے؟ کہا کہ پانچ سو آیتوں کا حکم منسوخ ہے۔ چلیے صاحب! بہرحال اس نے کتاب نازل کی تھی' کوئی حکم دیا' منسوخ کر دیا۔ ہمارے ہاں بھی تو یہ ہوتا ہے۔ یہ جتنے حکومت کی طرف سے احکام کی کتابیں پیش کی جاتی ہیں' یہ Acts ہوتے ہیں' یہ قوانین کی کتابیں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ان میں Correction Slips آتی ہیں۔ اس کے بعد یوں نہیں' بلکہ ایک بل ہوتا ہے' پھر وہ ایکٹ بنتا ہے' پھر وہ کہتا ہے کہ اس ضابطے کا فلاں دفعہ' فلاں قانون' اس کی رو سے منسوخ کیا جاتا ہے۔ یہ بتانا پڑتا ہے کہ یہ آیت' یہ قانون' اس حکم کی رو سے منسوخ کیا جاتا ہے' فلاں تاریخ سے منسوخ کیا جاتا ہے' اب یہ نافذ العمل نہیں رہے گا' اس کی جگہ یہ نافذ العمل ہوگا۔ آپ ایسی چیزوں کو تصور میں لائیے کہ قانون کی کتاب آپ کو دی ہوئی ہو اور اس میں کہیں کوئی اس قسم کی بعد میں نہ انسٹرکشن آئی ہو' نہ کوئی حکم آیا ہو' نہ کوئی دوسرا بل قانون بنا ہو' نہ کوئی ایکٹ آیا ہو کہ اس کی فلاں دفعہ منسوخ ہے' اس کی بجائے یہ ہے۔ یہ کہیں سے نہ آئے اور عقیدہ یہ ہو کہ اس میں سے پانچ سو احکام منسوخ ہیں۔ کونسے منسوخ ہیں؟ کہ جی! جسے ہم کہیں منسوخ ہیں۔ آپ سوچیے کہ یہ سلسلۂ کائنات تو ایک طرف رہا' انسانیت تو ایک طرف رہی' اس سے یہ چھوٹی سی عدالت بھی نہیں چل سکتی۔ جو آپ کے سامنے Established Law (مسلمہ قانون) ہے' اس کے مطابق آپ اپنا دعویٰ لے کر جاتے ہیں' اس کے مطابق ثابت کر دیتے ہیں۔ آخر میں وہ کہہ دیا جاتا ہے کہ صاحب! وہ تو حکم ہی مسنوخ ہے! اس کے لیے تو کہیں کوئی اس قسم کی انسٹرکشن نہیں ہے' کوئی Law نہیں ہے' کوئی بل پاس نہیں ہوا۔ یہ کیسے منسوخ ہوا؟ کہا کہ ہم جو کہتے ہیں کہ منسوخ ہے۔ برادرانِ

عزیز! یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں ''با تاں نئیں سناندا پیا ❶''۔ یہ چیز آپ کے ہاں ہے۔قرآنِ کریم میں کہیں کسی آیت کے متعلق خدا نے یہ نہیں کہا کہ ہماری یہ آیت فلاں آیت کو منسوخ کرتی ہے۔ یہ تو میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ خدائے علیم وخبیر کے ہاں یہ چیز ہی نہیں ہوسکتی تھی لیکن بہر حال عام عدالت کا تقاضا' قانون کی کتاب کا جو تقاضا ہے' اس کے مطابق تو کچھ ہوتا کہ یہ آیت ہم نے نازل کی ہے' یہ آیت ہمارے فلاں حکم کو منسوخ کرتی ہے' پھر بھی بات صاف ہوجاتی۔ یہ سارے قرآن میں کہیں نہیں ہے۔عقیدہ یہ ہے کہ پانچ سو احکام منسوخ ہیں۔

مختلف فرقوں کی مختلف' فقہ مختلف روایات اور مختلف فیصلے: پانچویں چیز

یہ آپ کے ہاں کی جو فقہ ہے' آپ کے ہاں کی جو روایات ہیں' اس میں آپ کو ایسے احکام ملیں گے جو قرآنِ کریم کے احکام کے صریح خلاف جاتے ہیں۔ یہ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ قرآن کے علی الرغم اس کے خلاف ایک حکم ہے اور آپ کے ہاں جو شریعت ہے' اس میں یہ حکم چلتا ہے' قرآن کا حکم نہیں چل رہا۔ یہ کیوں نہیں چل رہا؟ کہا کہ جی یہ منسوخ ہے۔اس منسوخ کی کوئی سند ہے؟ کہ جی! فلاں امام نے کہہ دیا ہے کہ یہ منسوخ ہے۔آپ دیکھیے گا کہ اس کے بعد قرآن کیا باقی رہا؟ پھر اتنا ہی نہیں کہ قرآن کی ایک آیت نے قرآن کے دوسرے حکم کو منسوخ کردیا ہے۔اتنے تو اس طرح سے منسوخ کیے۔جب بھی کبھی ایسا ہوا کہ کوئی آیت بھی ایسی نہ ملی' کھینچ تان کر ہی کہہ دیں کہ اس نے اس کو منسوخ کیا ہے۔دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ حدیث قرآن کی آیت کو منسوخ کرسکتی ہے۔ پھاٹک کھل گیا۔اس کے بعد آپ کے ہاں فقہ آتی ہے۔فقہا نے جو قانون بنایا' اس کے اندر فقۂ حنفی میں عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے امام کا کوئی فیصلہ اگر آپ کو حدیث یا قرآن کی آیت کے خلاف نظر آئے تو پہلی کوشش تو یہ کیجیے کہ اس آیت کی تاویل ایسی کیجیے کہ وہ اس فیصلے کے مطابق ہوجائے۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اس آیت یا اس حدیث کو منسوخ سمجھیے' جو حکم ہے' وہ اس فیصلے کا ہوگا۔عزیزانِ من! اس کے بعد آپ سوچیے کہ خدا کی یہ کتاب جس کی حفاظت کا اس نے ذمہ لیا تھا' اس کا مصرف کیا باقی رہ گیا۔خم ٹھونک کے اللہ میاں سے کہیے کہ آپ اس کے الفاظ کی حفاظت کرتے رہیے' آپ دیکھیے تو سہی کہ اس کتاب کا ہم کچھ باقی بھی چھوڑتے ہیں؟ یہ کتاب صرف تلاوت کے لیے رہ گئی' صرف ثواب کے لیے رہ گئی۔عمل آپ کا جتنا ہو رہا ہے' وہ ان چیزوں پہ ہو رہا ہے۔

قرآنی آیات کی منسوخی کا یہ سلسلہ کم سے کم ہوتا ہوا' آخر 5 تک محدود ہوگیا: چھٹی چیز

بہر حال وہ بعد میں آتے آتے بیچ میں ایسے لوگ بھی آئے جنہوں نے کہا کہ صاحب! یہ تو بڑی زیادتی ہے' جو اس آیت کو اس سے

---

❶ کہانیاں نہیں سنا رہا۔

منسوخ کہتے ہیں۔ انہوں نے اس میں قطع برید کی، پانچ سو سے کہیں تین سو رہ گئیں یعنی یہ بھی سارا کچھ جو ہو رہا ہے یہ ان کی مرضی کے مطابق ہے، ان کی رائے کے مطابق ہے، کسی اصول کے مطابق نہیں ہو رہا۔ اتنی رہ گئیں، سمٹتی گئیں، سمٹتی گئیں۔ ایسے بھی لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے کہا کہ صاحب! یہ تو عقیدہ ہی اس قسم کا بڑا باطل سا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ (1114-1176ھ) نے اپنے زمانے میں کہا کہ نہیں صاحب! پانچ سو نہیں، پانچ آیتیں منسوخ ہیں یعنی عقیدہ رکھا ہے اگر آپ عقیدہ رکھیے تو پھر ایک بھی آیت کہیے تو بات وہیں ہے لیکن انہوں نے بہر حال پانچ تک ان کو سمٹایا۔ ان کے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی (1865-1935ء) تھے۔ انہوں نے یہ کہا کہ صاحب! یہ زمانہ ایسا نازک تھا کہ اس عقیدے سے قطعاً انکار کرنا بڑی خطرناک چیز تھی۔ امام شاہ ولی اللہؒ (1114-1176ھ) نے ایسی پانچ آیتیں بتائی ہیں جن میں بڑی آسانی سے تطبیق ہو سکتی ہے۔

قرآنی آیات کی منسوخی کے سلسلہ میں معتزلہ کو تختۂ دار پر بھی چڑھنا پڑا: ساتویں چیز

یہ لیجیے! میں پانچ آیتوں کی بھی تطبیق کر دیتا ہوں، ورنہ معتزلہ کا یہ جو عقیدہ بیان کیا جاتا ہے جس بنا پہ ان کو پھانسیاں دی گئیں اور کھالیں کھنچوائی گئیں، یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ خدا کی کتاب میں کوئی حرف منسوخ نہیں ہے۔ آپ سوچتے ہیں کہ جب تھیوکریسی (مذہبی پیشوائیت) ہوتی ہے، جب حکومت ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو پھر ہوتا کیا ہے؟ کبھی یہیں وقت آیا یا کسی اور دور میں آیا تو میں بتاؤں گا کہ ان لوگوں کے ساتھ کیا ہوا تھا❶؟ یہ کہ کھالیں کھنچوا دیں، انہوں نے ان کی کوئی کتاب باقی نہیں چھوڑی تھی، ان معتزلہ کا جرم کیا تھا؟ یہ کہ وہ کہتے تھے کہ خدا کی کتاب ایسی نہیں ہو سکتی۔ وہ کہتے تھے کہ وہ خدا، جو قیامت تک کے حالات کا علم رکھنے والا تھا، اس کے ہاں حکم کی، قانون کی، کیفیت انسانوں کے قانون کی طرح نہیں ہو سکتی، انسان آج ایک قانون بناتا ہے، کل حالات بدل جاتے ہیں، انسانوں کو اس کا علم نہیں ہوتا، اس لیے ان کو حکم تبدیل کرنا پڑتا ہے۔

قرآن حکیم کے سلسلہ میں خالق کائنات کی طرف سے ہر قسم کی حفاظت کائناتی اصولوں کی طرح اٹل ہے

جس خدا نے اپنی آخری کتاب دی، وہ قیامت تک کے احوال سے باخبر ہے۔ جسے ہم Future (مستقبل) کہتے ہیں، خدا کے لیے تو Past, Present & Future (ماضی، حال اور مستقبل) کوئی شے ہی نہیں ہوتی۔ اس کے سامنے تو یہ جو زمان Time کا اختلاف ہے، گذشتہ کل، آج اور آنے والا کل، یہ کوئی شے ہی نہیں ہے۔ اقبالؒ (1877-1935ء) کے الفاظ میں اس کے سامنے تو ایک Eternal Now (ابدی زمانۂ حال) ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہ کہنا کہ اس نے آج ایک حکم دیا، کل حالات بدل گئے، تو اس کو محسوس ہوا کہ نہیں صاحب! یہ حکم صحیح نہیں ہے، اس کو بدل دیا جائے، منسوخ کر دیا جائے، صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات می نہ سزد خدائے را۔ یہ ان

---

❶ ان کی کچھ تفصیل پچھلے 25ویں باب میں دی جا چکی ہے۔ دیکھیے ص-116 کا فٹ نوٹ 1

کی دلیل تھی کہ یہ نہیں ہوسکتا اور انہوں نے، جن پانچ سو آیات کو وہ کہتے تھے کہ منسوخ ہیں، ان تمام کی تطبیق کر کے دکھادی۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن کے اندر زیادہ سے زیادہ کیا چیز ہے؟

قرآنی آیات کو منسوخ کرنے کی دلیل کی نفی

قرآن میں یہ ہے کہ نماز کے لیے کھڑے ہوتو وضو کرلیا کرو۔ دوسری جگہ یہ ہے کہ اگر پانی نہ ملے تو پھر تیمّم کرلیا کرو۔ اب یہ جو صورت ہے کہ پانی نہ ملے تو تیمّم کرلیا کرو، پانی نہ ملنے کی صورت میں وہ جو حکم تھا کہ نماز کے لیے کھڑے ہوتو پانی سے وضو کرلیا کرو، آپ نے دیکھا کہ وہ اس وقت جو حکم ہے، وہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے قابلِ عمل نہیں رہا۔ اس آیت نے وضو کی آیت کو منسوخ نہیں کیا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں کہ پانی ملے تو وضو کی آیت پہ عمل کرو، پانی نہ ملے تو تیمّم کی آیت پہ عمل کرو۔ کیا اسے آپ منسوخ کہتے ہیں؟ نہیں، قطعاً نہیں ہزاروں کی تعداد میں Laws (قوانین) ہوتے ہیں، قانون کی کتابوں کے اندر۔ سینکڑوں ایسے رہ جاتے ہیں جن کے اوپر عمل کرنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی۔ کوئی واقعہ اس قسم کا ہو تو ان کے اوپر عمل ہو۔ اس سے وہ Law (قانون) منسوخ نہیں ہوگیا ہوتا۔ وہ For The Time Being (وقتی طور پر) Inoperative (عمل میں نہیں) ہوتا ہے۔ جب بھی وہ حالات پیدا ہوں، جب بھی اس قسم کی بات پیدا ہو، وہی قانون پھر قابلِ عمل ہوجائے گا۔ خدا کی ایسی کتاب، آخری کتاب، مکمل کتاب، محفوظ کتاب، قیامت تک کے لیے کتاب ہے، اس کتاب کے اندر یہ کیفیت ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر دوسری چیز یہ ہے کہ وہ جو بدلے ہوئے احکام ہیں، وہ کتاب کے اندر موجود ہیں۔ ان کی کہیں نشاندہی نہیں کی ہوئی ہے۔ یہ ہے جو اس کی صورت ہے۔ اور اس سے آگے ایک اور بات ہے۔ عزیزانِ من! کہاں تک باتیں کرتے چلے جائیں۔ یہ بھی عقیدہ ہے کہ قرآن کی بعض آیتیں ایسی بھی ہیں جو قرآن کے اندر اس وقت نہیں ہیں لیکن عمل ان کے اوپر ہی ہونا چاہیے یعنی موجودہ قرآن، غیر مکمل بھی ہے کہ اس میں یہ آیتیں اب نہیں ہیں لیکن ان کے اوپر عمل ہونا ہے اور کہتے ہیں کہ بعض آیتیں اس کے اندر موجود ہیں ان پہ عمل نہیں ہوگا۔

وصیت کے سلسلہ میں دیئے گئے واضح احکام کو منسوخ کردیا گیا

عزیزانِ من! یہ ہے آپ کے ہاں جو عقیدہ چلا آرہا ہے۔ مثالیں تو میں بیسیوں دے سکتا تھا لیکن ضرورت نہیں ہے، وقت بھی نہیں ہے کہ کس کس طرح سے انہوں نے آیات کو منسوخ کیا۔ ایک مثال دیتا ہوں کہ قرآنِ کریم نے بہ نصِ صریح کہا ہے کہ ہم نے ہر مومن پر فرض کیا ہے کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کے لیے اپنے مال کی وصیت کرے۔ یہ دو دفعہ کہا ہے۔ پہلے **كُتِبَ عَلَيْكُمْ** (2:180) کہا ہے کہ یہ فرض کیا گیا ہے، دوسری دفعہ **حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ** (2:180) کہا۔ جہاں (4:11) میں وراثت کے احکام

بیان ہوئے ہیں‘ اس ایک ہی آیت (4:11) میں تین مرتبہ دہرایا گیا ہے کہ مِنۡ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ (4:11) وصیت پوری ہو جانے کے بعد اگر کچھ بچے تو اس کو یوں تقسیم کر لیا کرو‘ اگر وہ جو وصیت ہے اسے Cover (پورا) نہ کرے‘ قرآن کا یہ حکم ہے اور وہ اس لیے ہے کہ ہر شخص یہ خود سمجھ سکتا ہے کہ ان چیزوں کا جو میں چھوڑ چلا ہوں یا دے چلا ہوں‘ کون زیادہ مستحق ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ کوئی مسلک بھی نہ ہو‘ قرآن کا حکم ہے کہ ہم نے مومن کے اوپر فرض قرار دیا ہے۔ آپ کے ہاں کی شریعت یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ کوئی شخص وصیت نہیں کر سکتا‘ بجز ایک تہائی مال میں اور وہ بھی اپنے ورثا کے حق میں نہیں کر سکتا۔ قرآن میں یہ تھا کہ والدین اقربین کے لیے یہ وصیت ہے‘ اور یہ ایسا حکم ہے۔ قرآن میں بہت تھوڑے سے احکام ہیں‘ جن کی کچھ تفصیل بھی دی ہے۔ قرآن میں ایک آیت ہے‘ جس میں سارا طریقہ جزئیات تک دیا ہے کہ یہ وصیت کیسے لکھنی چاہیے‘ کیسی لکھانی چاہیے‘ کس قسم کے شاہد ہونے چاہئیں۔ یہ سارا کچھ اس کے اندر دیا ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے۔

اس آیت کو منسوخ کرنے کے سلسلہ میں ایک روایت جو بیان کی جاتی ہے

اس سے کیا کیا نقصانات پہنچتے ہیں؟ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے کہنا صرف اتنا ہی ہے کہ بقول ان کے یہ آیت منسوخ ہے۔ بھئی! کیسے منسوخ ہے؟ سنیے! ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک صحابیؓ کی عیادت کو گئے‘ انہوں نے کہا: میں تو مر رہا ہوں‘ میرا مال ہے‘ میں چاہتا ہوں کہ سارے کا سارا خدا کی راہ میں دیدوں۔ آپ ﷺ نے کہا کہ نہیں‘ ایسا نہ کرو‘ کچھ ان کے لیے بھی چھوڑو جو بعد میں ہیں۔ انہوںؓ نے کہا کہ میں آدھا دیدوں۔ آپؐ نے کہا کہ اتنے کا بھی نہیں کر دیجیے۔ انہوں نے کہا پھر ایک تہائی تک۔ آپ ﷺ نے کہا: خیر‘ یہ کر دیجیے۔ صرف ایک یہ روایت ہے۔ کوئی حکم نہیں‘ کوئی فیصلہ نہیں‘ صرف ایک Advice (نصیحت) ہے۔ اس کے جو حالات ہوں گے اس کے پیشِ نظر ہو گا‘ کچھ بھی ہے‘ یہ ایک نصیحت ہے۔ کیا یہ رسول اللہ ﷺ کی ہے بھی یا نہیں‘ یہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا۔ یہ تو تین سو سال کے بعد ایک جگہ لکھی گئی۔ اب یہ جو روایت ہے‘ قرآن کے اس قسم کے حکم کو منسوخ کر رہی ہے۔

عقیدہ ناسخ ومنسوخ کی پیدا کردہ الجھنیں

آج آپ کے ہاں‘ جسے آپ پرسنل لا یا قانونِ شریعت کہہ رہے ہیں‘ بہتیری کوشش کی گئی کہ صاحب! یہ قرآن کی آیت کے مطابق ہوں‘ ہنگامے کھڑے کر دیئے گئے۔ عزیزانِ من! یہ ہے عقیدہ کہ قرآن کے احکام منسوخ ہیں۔ صاحب! بقول ان کے سند اس کی کیا ہے؟ سند یہ آیت ہے کہ مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا (2:106)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ’’ہم اسے منسوخ نہیں کرتے یا بھلاتے نہیں ہیں کہ ہم اس سے بہتر یا اس جیسی دوسری آیت لے آتے ہیں۔‘‘ بس اس سے وہ ساری عمارت اس

کے اوپر کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہ ہے کیا؟ عزیزانِ من! اس آیت میں لفظ نسخ آیا ہے۔ اس کا مادہ ''ن س خ'' ہے۔ اس کے معنی ہوتا ہے ''ایک چیز کے بدلے میں یہ جو Originally (اصل) ہوتا تھا۔ دوسری چیز دے دینا'' اس زمانے میں پریس تو ہوتے نہیں تھے۔ ایک کتاب لکھی جاتی تھی۔ اس کے مطابق جب دوسری کتاب لکھتے تھے تو وہ کتاب اس کے بدلے میں اس کے پاس آ جاتی تھی۔ یہ نسخہ (Manuscript) ہوتا تھا۔ یہ چیز تھی۔ یہاں سے گویا یہ چیز ہوئی کہ ایک کے بدلے میں دوسری چیز استعمال میں آئی۔ آگے چل کر یہ ہو گیا کہ ''وہ جو پہلی چیز ہے' اس کو مٹا دینا' اس کے بدلے میں دوسری چیز لے'' آنا''[1] یوں جو اگلے معنی مجازی معنی ہوئے' آگے چل کر آئے۔ بہرحال یہ ہے کہ ''ایک چیز کو مٹا دینا' اس کے بدلے میں دوسری چیز دے دینا''۔ کہا یہ ہے کہ یہ ایَۃٍ (2:106) کوئی قانون' کوئی Law ہے' اس کے بدلے میں ہم جو دوسرا دیتے ہیں تو وہ نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ (2:106) ہے' یعنی اس سے بہتر قانون ہم دے دیتے ہیں' آگے کہا کہ اَوْ نُنْسِهَا (2:106)۔ اب یہاں آ کر ایک دشواری اور پڑ جاتی ہے۔ یہاں یہ ہے کہ یا جو ایَۃٍ فراموش کر دی جاتی تھیں' بھلا دی جاتی تھیں' وہی آتی تھیں۔ ان کی مثل دوسری چیز آ جاتی تھی۔ پہلی چیز یہ کہیے کہ اگر یہ قرآن کی آیت کے متعلق مانا جائے تو یہاں تک تو یہ ہو گیا کہ مَا نَنْسَخْ (2:106) جسے خدا منسوخ کرنا چاہتا تھا' اس سے بہتر دوسرا حکم دے دیتا تھا۔ اس کے لیے بھی دشواری ہے' وہ میں نے پہلے عرض کر دی ہے۔ ٹھیک ہے' اگر ایسا کرنا تھا' تو یہ بتایا تو جاتا کہ یہ آیت' فلاں آیت کو منسوخ کر رہی ہے۔ چلیے! یہاں تک بھی صاحب! کہا ہے کہ اَوْ نُنْسِهَا (2:106) یا جو فراموش ہو جاتی ہے' بھلا دی جاتی ہے' تو اس کی جگہ پھر ہم ویسی لے آتے ہیں تو گویا اس لفظ سے قرآن کے متعلق اب یہ بھی دوسرا عقیدہ پیدا ہو گیا کہ قرآن نازل ہوتا تھا اور اس کا جو کچھ حصہ تھا' وہ بھلا دیا جاتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ موجود ہیں' یہ بعد کی بات نہیں ہے۔ گویا (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ بھی قرآن کی آیتوں کو بھول جاتے تھے اور اس طرح سے وہ آیت بھلائی جاتی تھی کہ خدا کو اس کی مثل پھر دوسری جگہ اتارنی پڑتی تھی۔ اتنی بڑی امت میں قرآن کا اتنا بڑا انتظام' اتنے حفاظِ قرآن وہاں موجود' قرآن کی کتابت کی شہادت قرآن میں' اسے کتاب کہا گیا' محفوظ کہا گیا' اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ قرآن نازل ہوتا تھا' کچھ عرصے کے بعد اس میں سے بھول جاتے تھے' آیات فراموش کر دی جاتی تھیں' اور پھر خدا اسی قسم کی آیت پھر نازل کرتا تھا۔ یہ ہے جو کچھ کہا جاتا ہے۔

---

[1] (اس) دوسری چیز کو اس کے قائم مقام کر دینا (ابن فارس: مقاییس اللغۃ) نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ آفتاب نے سایہ کو ہٹا دیا اور اس کی جگہ روشنی لے آیا۔ یا کسی چیز میں تبدیلی کر دینا۔ نَسَخَتِ الرِّيْحُ آثَارَ الدِّيَارِ. ہوا نے آبادی کے آثار (نشانات وعلامات) کو تبدیل کر دیا (پرویزؒ: لغات القرآن' جلد چہارم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961' ص-1606)۔

وحی کے سلسلہ میں مختلف احکامات کی وضاحت

برادرانِ عزیز! اب سوال یہ ہے کہ یہ بات کیا ہے؟ پھر چلیے جس Context (ضمن) میں ذکر چلا آ رہا تھا' یہودیوں کی طرف سے اعتراض آیا کہ یہاں نبوت کیوں آئی؟ اس کو کیوں رسول چنا گیا؟ اس میں یہ چیز کیوں آئی؟ سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ اسی خدا کی طرف سے رسول ہیں' جس خدا کی طرف سے انبیائے بنی اسرائیل آیا کرتے تھے' حضرتِ موسیٰ علیہ السلام رسول تھے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول تھے' وہ خدا کی طرف سے یہ چیز لاتے تھے تو یہ جو چیز آپ پیش کر رہے ہیں' کہہ رہے ہیں کہ خدا کی طرف سے ہے' اس میں جو فلاں فلاں احکام ہیں' وہ ان احکام کے خلاف ہیں جو ان کی کتابوں کے اندر ہیں تو اگر یہ اسی خدا کی طرف سے ہے' تو یہ تضاد ہے۔ وہ اگر اس خدا کی طرف سے ہے تو وہی ہونے چاہئیں تھے۔ یہ ان کے اس اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے کہ وحی کا سلسلہ یوں چلا آ رہا ہے کہ رسول کو وحی دی جاتی تھی۔ اس میں انداز یہ تھا کہ انسانیت اپنے بچپن سے آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہوئی' ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی' بچپن سے جوانی تک' پہنچتی چلی آ رہی تھی۔ انداز یہ تھا کہ اصول تو وہی دیئے جاتے تھے جو ابدی ہیں لیکن ان اصولوں کی جزئیات ایسی دی جاتی تھیں جو اس زمانے کے ان تقاضوں کو پورا کرتی تھیں' جس لیول (سطح) پہ ابھی انسانیت یا وہ قوم تھی۔ اس زمانے میں تو ابھی کیفیت یہ تھی کہ سلسلۂ رسل و رسائل وسیع نہیں تھا' ایک ایک قریہ میں رسول آتا تھا' ایک ایک بستی میں رسول آتا تھا' ایک ایک قوم (قبیلے) کی طرف رسول آتا تھا' اس دور میں وہ جو اولیں مخاطب ہوتے تھے' جس حالت کے اندر وہ ہوتے تھے' ان کے مطابق ان اصولوں کی جو جزئیات تھیں وہ بھی خدا کی طرف سے دے دی جاتی تھیں' وہ ان کے مطابق ہوتی تھیں۔ اس رسول کے چلے جانے کے بعد' ان کے اندر انسانی تحریفات ہوتی تھیں' آمیزشیں ہوتی تھیں۔ اب پھر اس کا عبد' ایک اور رسول آ جاتا تھا۔

برادرانِ عزیز! اب سوال یہ ہے کہ وہ آ کر کیا کرتا تھا؟ وہ کرتا یہ تھا کہ اگر اس دور میں انسانیت' وہ قوم' وہ ملک' من حیث الکل ترقی کر کے اور آگے آ گئی ہوئی ہے' تو وہ جو اس زمانے کے تقاضے کے مطابق جزئیات دی گئی ہوئی تھیں' ان کی جگہ **نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ** (2:106) ان سے جو بہتر احکام تھے' وہ ان کی جگہ دیئے جاتے تھے اور وہ جو اصلی ابدی قوانین باقی رہنے تھے' جنہیں وہ فراموش کر دیتے تھے' جن میں آمیزش ہو جاتی تھی' جو اپنی جگہ پہ باقی نہیں رہتے تھے' جو ترک کر دیئے جاتے تھے' جنہیں پسِ پشت ڈال دیا جاتا تھا' لفظ نَسِیَ کے سارے معانی عربی زبان میں یہ ہوتے ہیں' تو انہی جیسے جو اصول تھے' اس نئے رسول کی معرفت دے دیئے جاتے تھے۔ اب اس نئے رسول کی طرف سے جو وحی ملتی تھی' اس کی دو صورتیں تھیں: (1) وہ جو وقتی جزئیات ملی ہوئی تھیں' جو خدا نے اب خود طے کیا تھا کہ یہ اس زمانے کے لیے نہیں ہیں' ان کی جگہ ان سے بہتر اور جزئیات ملتیں اور (2) جو ابدی قوانین اور اصول

ہوتے' جن کو اسی طرح سے باقی رکھنا مقصود تھا لیکن دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہے یا انسانی وساوس کاریوں کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکے' ان کو اسی طرح سے پھر Replace کر دیا جاتا تھا۔ یہ اس نئے رسول کی شریعت یا نئے رسول کا ضابطۂ قانون یا وحی بن جاتا تھا اور یہ سلسلہ اسی طرح سے آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

قرآن حکیم نے کس چیز کی منسوخی کی خبر دی؟

عزیزانِ من! اب یہ چیز کہ اس کا پروسیس (طریق کار) تھا' طریق یہ تھا' یہ میرا یا ان لوگوں کا' جو منسوخ نہیں مانتے تھے' فکری استنباط نہیں ہے' یہ چیز قرآن کے اندر موجود ہے۔ میں نے کہا ہے' نبی اکرم ﷺ کی رسالت سے پہلے کی یہ بات چلی آ رہی ہے۔ وہاں یہ ہوتا چلا آ رہا تھا کہ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ (22:52) تجھ سے پہلے' اے رسول! ہم نے جو نبی اور رسول بھیجے ان کے ساتھ یہ ہوتا رہا کہ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ (22:52) جو کچھ وہ تلاوت کر کے جاتا تھا' شیاطین اس کے اندر ملاوٹ کر دیتے تھے۔ شیاطین کا تو آپ کو معلوم ہے کہ یہ جتنے باطل کے احبار و رہبان ہیں' یہ جتنے مفاد پرستوں کے گروہوں کے لیڈرز ہیں' قرآن انہیں یہی کہہ کر پکارتا ہے۔ کہا ہے کہ وہ ان کے اندر یہ ملاوٹ کرتے تھے' ان کے اندر اپنی طرف سے کچھ ملا دیتے تھے۔

پھر کیا ہوتا تھا؟ قرآن سامنے ہے تو لفظوں پہ دھیان دیجیے ورنہ غور سے سنیے۔ یہاں الفاظ آ گئے ہیں کہ فَیَنْسَخُ اللّٰہُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ (22:52)۔ خدا دوسری وحی سے ان چیزوں کو منسوخ کر دیتا تھا جو اس کے اندر ملاوٹ کی جاتی تھیں۔ یہ منسوخ کر کے پھر کرتا کیا تھا؟ کہا کہ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ (22:52) جو اپنی وہ آیات تھیں' جن کو رکھنا مقصود تھا' وہ ان کو مستحکم کر دیتا تھا۔ اس لیے کہ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ (22:52) وہ علم و حکمت والا ہے۔ علم والا ہے کہ اسے معلوم تھا کہ ان لوگوں نے کیا بگاڑ دیا اور کیا اصل میں تھا۔ اس (خدا) نے علم کی بنا پہ یہ کیا ہے۔ حکمت والا ہے کہ اسے یہ معلوم تھا کہ کس زمانے کے تقاضوں کے مطابق کونسی چیز رکھنی مقصود تھی اور اب کونسی بدلنی مقصود ہے۔ کہا ہے کہ یہ چیز تھی جو ہوتی چلی آ رہی تھی یعنی یہ کہ ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم بدل جاتا تھا' دوسرا حکم دے دیا جاتا تھا۔

عزیزانِ من! بات تو یہ ہوئی کہ شیاطین کی طرف سے جو آمیزش کی جاتی تھی ان کو کیسے مٹایا جاتا تھا۔ اب دوسری چیز ابھی باقی رہ گئی ہے کہ "اس کی مثل ہی ہم دے دیتے تھے"۔ یہ تو وہ ہے کہ جس میں آمیزش ہو جاتی تھی' اسی قسم کی وہی بات واپس لے آتے تھے لیکن یہ چیز کہ ایک حکم پہلے دیا گیا تھا' وہ وقتی تھا' اس کو بدل کر اس کی جگہ دوسرا حکم دینا تھا' یہ چیز بھی تو آنی چاہیے اس کے لیے کہا کہ وَ اِذَا بَدَّلْنَآ

اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ (16:101) اور جب ہماری حکمت کا تقاضا ہوتا تھا کہ کسی ایک قانون کو بدل کر اس کی جگہ دوسرا قانون دے دیا جائے وَّ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ (16:101) اور یہ تو خدا سب سے بہتر جانتا ہے کہ کس کی جگہ کیا چیز دینی چاہیے۔ جب ہم یہ کرتے ہیں تو قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ (16:101) یہ کہتے ہیں کہ تو اُفترا پرداز ہے' وہاں تو یہ حکم تھا' تو اس کی جگہ یہ حکم لے آیا ہے' اگر تو خدا کا رسول ہوتا تو وہی حکم کیوں نہ یہاں دیتا' نظر آتا ہے کہ تو اپنی طرف سے یہ سب کچھ کر رہا ہے' خدا کی طرف سے وہی ہونا چاہیے تھا۔ خدا یہ کہہ رہا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ وَّ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ (16:101) وہ جو ایک وقتی حکم تھا' اس کی بدل میں دوسرا جو حکم ہے' یہ دے دیا گیا۔ یہ ارتقائی دور تھا کہ جس میں وحی' ثبات (Permanence) اور تغیر (Change) کے ایک حسین امتزاج سے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ ثبات (Permanence) ان اصولوں کو ہے جو ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہے تھے' تغیر (Change) ان جزئیات میں ہے جو وقتی طور پر دی گئی تھیں۔

مزید وضاحت کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کے دور کی مثال

اگر یہ مزید سمجھنا ہو کہ وحی کے ذریعے سے کیا کیا چیزیں آتی تھیں؟ تو قرآن عجیب و غریب راہنمائی دیتا ہے۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ جب ہم نے نوح علیہ السلام سے کہا کہ ایک بہت بڑا طوفان (Deluge) آنے والا ہے تو بچاؤ کی صورت پیدا کرو۔ اس دور میں انہیں پتہ نہیں تھا کہ کیا کریں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ یوں کشتی بناؤ۔ انسانیت تو اس طرح سے گزرتی چلی آ رہی ہے' جو ذہنِ انسانی ہے' وہ بچپن سے جوانی تک آیا ہے یعنی اس چیز کے لیے بھی وحی دینی پڑتی تھی کہ کشتی کیسی بنائی جائے۔ اس لیے ان جزئیات تک کے لیے خدا کی طرف سے راہنمائی آتی تھی لیکن یہ بچہ بڑھتے بڑھتے جوان ہو گیا' انسانیت عہدِ شباب کو پہنچ گئی۔ جوان بچے کے لیے اب یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ اس کو جب یہاں سے یہ کہیں کہ انارکلی جاؤ' تو اسے بٹھا کر اس کے سامنے نقشہ رکھو کہ یہاں ایف سی کالج گلبرگ لاہور پاکستان' سے یوں جانا ہے' پھر پل آئے گا' وہاں سے دائیں طرف مڑنا' آگے جانا۔ وہ کہے گا ابا جی! روز جاتا ہوں' کیا اب بھی مجھے پتہ نہیں ہے کہ انارکلی بازار کیسے جانا ہے؟ او نہیں بیٹا! احتیاط کا تقاضا ہی ہے۔ باپ کے سامنے احترام سے وہ نہ بھی کچھ کہے تو باہر کہے گا کہ باپ خبطی ہو گیا ہے۔ اس کے لیے ضرورت کیا ہے؟ کہیں نئی جگہ بھی اس نے جانا ہے تو اس کے لیے ضرورت یہ ہے کہ جہاں کہیں کراس بورڈ آئے' وہاں ایک سائن پوسٹ لگا ہونا چاہیے کہ یہ راستہ انارکلی کی طرف جاتا ہے' یہ فیروز پور روڈ کی طرف جاتا ہے۔ باہر روشنی ہونی چاہیے جس سے یہ معلوم ہو جائے۔ اس کی آنکھیں ہونی چاہئیں جس سے یہ پڑھ لے۔ مستقل طور پر وہ سائن پوسٹ ہونا چاہیے۔ اب اس سے زیادہ کسی ہدایت کی ضرورت نہیں رہتی۔ انسانیت عہدِ شباب پہ پہنچی تو خدا کا آخری رسول ﷺ آ گیا۔

قرآنِ حکیم کی عظمت اوراس کے مکمل ہونے کی شہادت خودقرآن حکیم میں ہے

ختم نبوت ﷺ کے معنی یہ تھے کہ اب انسانیت بچپن میں نہیں رہی' جوان ہوگئی ہے۔اب اسے اصولی ہدایات کی ضرورت ہے۔ جس طرح سے بچوں کو اتنی اتنی چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی سکھانی پڑتی ہیں' بڑے ہونے پر انہیں ان کی ضرورت نہیں ہے اور جزئیات تو روز بدلتی رہتی ہیں۔ یہ جتنا پچھلی وحی کے اندر' پچھلی کتابوں کے اندر' پچھلے رسولوں کے اندر' یہ اس قسم کی ہدایات' راہنمائیاں' اصول' قوانین آئے تھے جن کو ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہنا تھا' ایک لفظ میں خدا نے قرآن کے متعلق کہہ دیا کہ قرآن کیا ہے؟ عزیزانِ من! ایک لفظ میں کہا کہ وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ (5:48) تیری طرف یہ مبنی برحقیقت کتاب ہم نے نازل کی۔ جو دعاوی یہ لوگ کرتے چلے آرہے تھے' یہ ان تمام کو سچ کر دکھانے والی ہے۔وَ مُھَیۡمِنًا عَلَیۡہِ (5:48) جتنی تعلیم اس سے پیشتر دی تھی' وہ ساری کی ساری ہم نے اس کے اندر رکھ دی' یہ اُس پر حاوی ہوگئی' وہ اس میں محیط ہوگئی۔ مھیمن کے معنی ہی ہیں ''اپنے اندر لے کر محفوظ کر دینے والی۔'' اس لفظ مھیمن میں دونوں چیزیں ہوتی ہیں: اپنے اندر بھی لے لینا اور اسے محفوظ بھی کر دینا لہٰذا اب فَاحۡکُمۡ بَیۡنَھُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ (5:48) اب تم ان اہلِ کتاب کے بھی اس کے مطابق فیصلے کرو' کیونکہ ان کے ہاں کے جواب غیر متبدل قوانین تھے' وہ اس میں آگئے ہیں' جو عارضی چیزیں تھیں وہ بدل گئیں' جو چیزیں انہوں نے فراموش کر دی تھیں اور جو باقی رکھنی مقصود تھیں' وہ اس کے اندر آگئیں' یہ ان تمام چیزوں کا مھیمن ہے۔ یہ قرآن مھیمن ہوگیا۔ ایک یہ چیز اس کی خصوصیت ہوئی۔

عزیزانِ من! دوسری چیز یہ ہے کہ اس کے بعد اب کسی دوسری وحی کی ضرورت نہیں ہے اور جیسا کہ میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ ختمِ نبوت ﷺ کی سب سے بڑی دلیل یہ آیت ہے۔ وہ جو چیز ہے کہ خاتم ''زبر'' سے ہے یا ''زیر'' سے ہے' کہا ہے کہ آپ ﷺ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (33:40) ہیں۔ یہاں نبوت ختم ہوتی ہے ''لیکن جب اربابِ شریعت نے اس اصول کو مان لیا کہ رسول اللہ کو وحی کے علاوہ الہام بھی ہوتا تھا اور ختم نبوت کے معنی سلسلہ وحی کا ختم ہو جانا ہے' نہ کہ سلسلہ الہام کا تو یہاں وہ زبر زیر ختم ہو جاتی ہے (ماخوذ مطالب القرآن' جلد دوم' ص۔415)۔'' کہا ہے کہ وَ تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا (6:115) تمہارے خدا کی باتیں صدق وعدل کے ساتھ مکمل ہوگئیں۔ یہاں خیال ہوسکتا تھا کہ شاید یہ باتیں عہدِ رسالت مآب ﷺ میں ہی صدق وعدل کے ساتھ مکمل ہوگئی ہوں گی' یہ اس زمانے کی بات ہے۔ یہ اس دور میں مکمل بھی ہوگئی' یہ ٹھیک بات ہے لیکن آگے تبدیلیوں کی ضرورت پیش آئے گی' یہ کچھ بھی تو ہوسکتا ہے' کسی تبدیلی کرنے کے لیے ہی کوئی رسول سہی' جیسے پہلے آیا کرتے تھے' تو کہا کہ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ (6:115) اس میں اب تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی کتاب' مکمل' قیامت تک کے لیے اور غیر متبدل' بہت بڑی چیز ہے۔ کہا کہ تم اپنے

آپ یہ اندازے کر رہے ہو‘ سنو! وَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (6:115) یہ اس خدا کی طرف سے آئی ہوئی چیز ہے۔ جو السمیع بھی ہے اور العلیم بھی۔

ذاتِ خداوندی اپنی ذات میں بے مثل ہے اور ابدیت کی حامل ہے

عزیزانِ من! وقت ہی نہیں ہوتا ورنہ میں عرض کروں کہ یہ جو عربی زبان کے باب ہیں ان میں یہ جو ’’فَعِيلٌ‘‘ کے وزن کے اوپر خدا کی صفات آتی ہیں‘ مثلاً السمیع‘ اس لفظ سے ’’سامع‘‘ بھی ہوتا ہے ’’عالم‘‘ بھی ہوتا ہے۔ اس وزن کے اوپر جتنے فاعل آتے ہیں‘ ان کے معنی وقتی طور کے اوپر بھی ہو سکتا ہے مثلاً ’’سننے والا‘‘ وقتی طور پہ ’’کچھ جاننے والا‘‘ ہوتے ہیں لیکن یہ جو ’’فَعِيلٌ‘‘ کے وزن کے اوپر چیزیں آتی ہیں‘ اس کے معنی ہوتا ہے ’’ہمیشہ سے یہ کرنے والا‘ لازماً یہ کچھ کرتے رہنے والا‘‘۔ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ سمیع نہ ہو‘ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ علیم نہ رہے۔ یہاں کہا ہے کہ وَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (6:115)۔ اس کی یہ کتاب ہے وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (6:115) یہ مہیمن ہو گئی‘ تمام سابقہ سچائیوں‘ مکمل ہو گئی‘ غیر متبدل ہو گئی۔

خداتعالیٰ نے قرآن حکیم کے متعلق آخری خدشے کا ازالہ بھی بڑے جلال کے ساتھ کر دیا

سوال یہ رہ جاتا تھا کہ یہ سارے انتظامات بھی ہو گئے لیکن اس کے باوجود یہ تو ہو سکتا ہے جیسے پہلے ہوتا چلا آیا کہ اس میں تحریف کر دی جائے‘ آمیزش ہو جائے‘ غیر متبدل بھی نہ رہے‘ اس کے اندر محفوظ ہی نہ رہے‘ دست بردِ زمانہ سے کچھ اس کے اندر سے نکل جائے تو پھر بھی کسی رسول کی ضرورت پڑ جاتی ہے یعنی وہ جو طریقہ تھا کہ اگر کوئی چیز ہے جو بھلا دی جاتی ہے‘ فراموش کر دی جاتی ہے‘ نہیں باقی رہتی‘ تو اس کے لیے اس کی مثل لانے کے لیے بھی‘ ایک رسول آتا تھا۔ کہا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) ہم نے اس کو نازل کیا ہے‘ ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

عزیزانِ من! عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ قرآن یہاں کیا کہہ گیا ہے؟ زبان کے اعتبار سے ’’نزلنا‘‘ ہی کافی تھا ’’ہم نے نازل کیا‘‘ اس کے اندر یہ فاعل موجود ہے لیکن قرآن کی شدتِ تاکید پر غور کیجیے کہ کیا کہتا ہے۔ کہا ہے کہ ’’انا‘‘ یہ پہلی چیز ہے اور یہ ’’انا‘‘ ہے الف کے ساتھ‘ اس کے اندر ایک تاکید شامل ہے پھر ’’ہم‘‘ بھی اس کے اندر شامل ہے۔ چلیے صاحب! ’’نزلنا‘‘ کے ساتھ یہ بھی ہے۔ اب آگے ’’نحن‘‘ آیا۔ اور جانتے ہو کہ کس نے نازل کیا ہے؟ یعنی میں کیا عرض کروں اور اس بیان کی کس طرح وضاحت کروں۔ کہا ہے کہ او! سمجھتے ہو کس نے نازل کیا ہے؟ ’’ہم‘‘ نے نازل کیا ہے‘ ہم نے! سمجھے ہو! ’’ہم‘‘ نے نازل کیا ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ (15:9) اور اس کے آگے پھر کہا کہ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) یہ ’’حافظون‘‘ کے اوپر پھر ل دیکھیے۔ کیا زور دے رہا ہے!

برادرانِ عزیز! دیکھ رہے ہیں' اب بات کیا ہوئی اس قرآن کی! کیا کتاب آ گئی ہے یہ مُھیمن ہے' تمام سابقہ سچائیوں کی جو ہمیشہ کے لیے رہنے والی تھیں۔ مکمل ہے' اضافے کی کوئی ضرورت نہیں۔ غیر متبدل ہے' اس کے اندر کسی قسم کی ناسخ منسوخ کی ضرورت نہیں' تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ محفوظ ہے' خدا نے حفاظت کا خود ذمہ لیا ہوا ہے۔ سوچیے' عزیزانِ من! کہ کیا ان چیزوں کے بعد پھر کسی آنے والے رسول کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ وہ کاہے کے لیے آئے گا؟ اس قسم کی کتاب کی موجودگی میں یہ تصور کرنا کہ کوئی اور آئے گا' خدا کے ان سارے دعاوی سے انکار ہے کہ نہیں جی! ضرور کوئی کسر رہ گئی تھی صاحب! بھئی! کوئی کسر نہیں تھی۔ ''نہیں! اللہ میاں نوں او ہدوں پتہ نئیں لگیا[1]۔'' معاذ اللہ معاذ اللہ۔

قرآن حکیم کے نزدیک جن جن چیزوں کا بدل جانا مقصود تھا' وقت کے تقاضوں کے تحت انہیں بدل دیا گیا

عزیزانِ من! ان تشریحات کے بعد آپ اس آیت پہ غور کیجیے۔ کہا ہے کہ مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا (2:106)۔ معنی صاف ہیں۔ ان یہودیوں سے کہا جا رہا ہے کہ اس قرآن میں جو تم دیکھ رہے ہو کہ تمہارے جو بعض احکام ہیں' ان کے خلاف ان کے اندر حکم ملتے ہیں' اور آگے تفصیل آئے گی' جہاں کہا ہوا ہے کہ فلاں فلاں چیز جو یہودیوں کے اوپر حرام تھی' وہ تو اس بنا پر ان پہ حرام کی گئی تھی' ابدی طور پہ وہ حرام نہیں تھی' فلاں چیز ایسی تھی کہ وہ حضرتِ یعقوب علیہ السلام نے اپنے لیے اس کو کہہ دیا تھا کہ میں نہیں کھاتا' وہ اس کو پسند نہیں کرتا' انہوں نے اس کو بھی شریعت ہی بنا لیا۔ قرآن میں یہ چیزیں آتی ہیں۔ کہا کہ یہ چیزیں جو اس انداز کی تھیں' جن کو زمانے کے تقاضے کے ساتھ انسانیت کے عہد شباب میں پہنچنے تک بدلنا مقصود تھا' اس کے لیے ہمارا یہ طریق تھا کہ دوسرے رسول کی معرفت اس سے بہتر دے دیتے تھے۔ جو فراموش کر دی جاتی تھیں' ترک کر دی جاتی تھیں' پسِ پشت ڈال دی جاتی تھیں' ان کی مثل ہم دوبارہ لے آتے تھے اور اس کے بعد آخر میں اب یہ کتاب ایسی دے دی جس کی میں نے یہ خصوصیات آپ کے سامنے پیش کر دیں۔ اب اس کے بعد اس میں کسی ناسخ و منسوخ کا سوال ہی نہیں ہے۔

برادرانِ عزیز! یہ تو قرآن کی آیات کے اندر کا ذکر ہی نہیں ہے' وہ تو پیچھے سے طریق ہی وہی چلا آ رہا تھا' یہاں مِنۡ قَبۡلِكَ (22:52) کہا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ تم سے پہلے کا جو طریق تھا' اس میں یہ کچھ ہم کرتے چلے آ رہے تھے۔ اس میں کچھ سوال ہی نہیں ہے۔ اب جب ان سے یہ چیز کہی جائے تو ان کے پاس ایک ہی جواب ہے اور وہ جواب ہر بات ان سے کہی جائے' کوئی معقول کسی قسم کی Reason (وجہ) پہ مبنی Rationally Explain (استدلال سے بیان) کرنے والی بات نہیں ہے۔

---

[1] نہیں جی! اللہ میاں کو اس وقت پتہ نہیں چلا۔

خدا تعالیٰ قادرِ مطلق ہے لیکن اس کے باوجود اس نے ہر چیز کے لیے قانون اور پیمانے وضع کر رکھے ہیں

اس کے بعد جواب پھر قرآن کی وہی آیتیں ہیں جن کے ایک لفظ کا غلط ترجمہ ہے۔ ہم نے کہا کہ صاحب! یہ سارا کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ کیوں اس نے ایک آیت قرآن میں نازل کر دی؟ ایک حکم تھوڑی دیر کے بعد یاد آیا کہ صاحب نہیں! یہ تو غلط تھا' اس کو تبدیل کر دیا جائے۔ یہ کیوں کیا؟ '' کہ جی اولکھیا ہویا اے ❶۔'' کیا لکھا ہوا ہے؟ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (2:106) اللہ قادرِ مطلق ہے ''او جو جی چاہے کرے' تسی چاچے لگدے او پچھن والے ❷۔'' ٹھیک ہے جی! اس کے قادرِ مطلق ہونے میں کوئی شبہ نہیں' وہ جو جی میں آئے کرے۔ ''وہ جو جی میں آئے کرے'' کے بعد جو ہمیں قدم قدم پر تاکید کرے کہ غور کرو' فکر کرو' تدبر کرو' تفکر کرو' حکمت سے کام لو' عقل سے کام لو' سمجھو جو ہم کہتے ہیں' جو ہم کہہ رہے ہیں' اس پر آنکھیں بند کر کے مت جھکو۔ یعنی اگر وہاں یہ صورت ہے کہ نہ کوئی قاعدہ' نہ کوئی قانون' نہ کوئی حکمت' نہ کوئی علت' نہ کوئی Cause (سبب وعلت) اور وہ جو جی میں آئے بدل دے۔ یہاں کا قانون بھی بدلا جاتا ہے تو اس بل کو Introduce (متعارف) کرنے سے پیشتر اس میں یہ دیا جاتا ہے کہ اس میں کیا سقم رہ گیا تھا' اور کیوں یہ اس کی جگہ دوسری ترمیم آ رہی ہے لیکن وہاں یہ صورت ہے کہ وہ صاحب! قادرِ مطلق ہے' وہ جو جی میں آئے کرے۔ قانون آج بنایا ہے' شام کو اس کو بدل دے' اس کی جگہ دوسرا قانون لے آئے' قادرِ مطلق ہے صاحب!

خدا اگر کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی لم بھی بیان کرتا ہے

میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ وہ جو بدلنے کا طریقہ ہے کہ اس کے اندر بتایا جاتا ہے کہ یہ کیوں والی بات ہے' اس پہ سوچا جاتا ہے' سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے وہ Opinions Invite (آراء مدعو) کرتے ہیں کہ سوچ سمجھ کر ذرا بتایئے لیکن اگر کیفیت ملوکیت کی سی ہو ''ہووے او فیر رنجیت شاہی کہ جو حکم دے دتا ہیگا بس حکم ہے ❸۔'' اس میں تو پھر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ غور کرو' فکر کرو' عقل سے کام لو' اس کی حکمت کو سمجھو' لم کو سمجھو۔ یہاں کہا ہے کہ ہم خود سمجھاتے ہیں' حکم دینے کے بعد' خدا آگے کہتا ہے کہ لعلکم تاکہ یہ ہو۔ ہم نے یہ یوں کہا ہے تاکہ یہ بات یوں ہو جائے اور اپنے رسول کے متعلق کہا کہ یعلمہ الکتب والحکمۃ (2:129) وہ قانون کی تعلیم دیتا ہے اور The Why of It (اس کی لم) جو ہے' اس قانون کی جو لم اور حکمت ہے' اس کی تعلیم دیتا ہے۔ عزیزانِ من! جو قانون حکمت پر مبنی ہوتا

---

❶ کہ جی! یہ ''لکھا ہوا'' ہے۔

❷ وہ جو جی چاہے کرے۔ تم یہ کچھ پوچھنے والے اس کے چچا لگتے ہو۔

❸ ہووہی رنجیت سنگھ شاہی کہ جو حکم دیا سو دے دیا۔

ہے'اس کے متعلق یہ دلیل نہیں دی جاسکتی کہ وہ قادرِ مطلق ہے جو جی میں آئے کرتا پھرے اور یہ چیز تو اس سے پیشتر بھی کئی دفعہ آ چکی ہے۔ ایک لفظ قدیر ہے' بس اس کا ترجمہ قدرت کیا اور مروجہ تصور تقدیر پہ آ بیٹھے' یہاں کہا ہے کہ اَنَّ اللّٰـهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (2:106) خدا ہر شے کے اوپر قادر ہے۔ قادر کے معنی ان کے اپنے ذہن کے اندر ہیں کہ جو جی میں آئے کرے' نہ حکمت' نہ اس میں علت' نہ کوئی Cause (سبب)' نہ کوئی Reason (وجہ جواز)' نہ کوئی Rationale (وجہ تسمیہ)' کچھ نہیں۔ بس قادر مطلق ہے۔

قدرت نے ہر زمانے کے اندر انسانی ظرف کے مطابق انسان کو اقدار سے نوازا ہے

عزیزانِ من! عربی زبان کے اندر اقدار' قدیر یا قدر کے بنیادی معنی ہی ''پیمانے اور اندازے'' کے ہیں۔ اس نے ہر شے کے پیمانے مقرر کیے ہیں۔ یہ Measures ہیں' جنہیں آپ پیمانے کہتے ہیں' اسی کو قانون کہتے ہیں۔ قانون کا تو لفظ ہی قرآن کے اندر نہیں آیا اور اس زمانے میں وہ بھی یہ لفظ ان معنی کے اندر استعمال نہیں کرتے تھے' وہ یہ لفظ قانون ہی نہیں استعمال کیا کرتے تھے۔ ہر وہ شے جو کسی مطابقت کو فٹ کر دے' وہ اسے تقدیر کہتے ہیں' عربی زبان کا لٹریچر (ادب) اس سے بھرا پڑا ہے' سارا قرآن اس سے بھرا ہوا ہے۔ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ (6:91) موجود ہے۔ لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ (97:1-3) ہمارے ہاں آیا ہے۔ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِيۡرًا (25:2) اس کے اندر موجود ہیں۔ یہ جو ساری چیزیں ہیں' اس کے معنی ہی ہیں ''پیمانے مقرر کیے ہیں'' خدا کے یہ پیمانے مقرر کیے ہوئے تھے کہ اس دور کے اندر انسانی ذہن کی سطح یہ ہے' اس پیمانے کے مطابق یہ ملنا چاہیے۔ اس کے مطابق وہ پیمانہ بدل گیا ہے۔ اب یہ کچھ ہونا چاہیے۔ وہ اس لیے یہ سارا کچھ کہا ہے۔ اب اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِيۡرٌ (2:106) کے یہ معنی لے لیجیے تو بات صاف ہو جائے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ صاحب! یہ کیوں طریقہ اختیار کیا گیا؟ پہلے ہی نبی کو ہمیشہ تک کے لیے رہنے کی' یہ ساری غیر متبدل' مکمل' کتاب کیوں نہ دے دی گئی۔ کہا کہ اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ انسانی زندگی کے تقاضے کیا ہیں' اس کے پیمانے کیا ہیں' اس کا ظرف کیا ہے' اس کے تقاضے کیا ہیں۔ قدر کے معنی ہوتا ہے ''کسی شے کے مطابق فٹ کرتے ہوئے کوئی چیز دینا'' یہ درزی جو کپڑے سے کوٹ بنا کر فٹ کرتا ہے' اس کے لیے عربی زبان میں تقدیر کا لفظ آتا ہے۔ یہ باورچی جو پیمانے اور اندازے کے مطابق ٹھیک ہنڈیا پکاتا ہے' اسے کہتے ہیں۔ یہ جسے قدوری کہتے ہیں وہ تو ہے ہی ہنڈیا کے معنی۔ یہ اس کے بعد کا جو معنی ہے قادر یا مقدر' اس کے معنی ہیں' جسے ہم قدرت کہتے ہیں' وہ اس اعتبار سے تھا۔ درزی کپڑے کو اس پیمانے کے مطابق بنانا چاہتا ہے' جس کے لیے اس نے سینا ہے۔ کپڑے کے اوپر اس کو اتنا اقتدار حاصل ہے کہ وہ اس کے مطابق بنا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کو کہتے تھے کہ وہ اس پیمانے کے مطابق اس شے کو کر سکتا ہے۔ اس قادرِ مطلق کے یہ نہیں ہیں کہ وہ گویا بغیر کسی علت کے' بغیر کسی حکمت کے' کرتا ہے۔

قادرِ مطلق ہونے کے باوجود خدا اپنے اوپر پابندیاں عائد کرتا ہے

یہ ٹھیک ہے کہ اس کا ایک دائرہ عالمِ امر ہے، عالمِ مشیت ہے، جہاں وہ اس میں یہ طے کرتا ہے، جو اس کی حکمتیں ہیں۔ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں ہے لیکن جو چیزیں وہ یہاں بھیجتا ہے ان میں ہر شے کے متعلق اس نے کہا ہے کہ **فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا** (25:2) ہاں ہم ہر شے کو پیمانوں اور اندازوں کے مطابق کرتے ہیں، جو کچھ کرتے ہیں۔ اس نے اپنے اندر خود پابندیاں عائد کر لی ہیں۔ جسے ہم قادرِ مطلق کہتے ہیں، اس نے Only ہونے کے باوجود اپنے اوپر پابندیاں عائد کی ہیں کہ ہم یہاں یہ یوں کیا کریں گے۔ یہ کہا ہے کہ یہ جو ہم نے طریق اختیار کیا تھا، ہم جانتے تھے کہ انسانوں کے ظرف کتنے ہیں، ان کے پیمانے کیا ہیں، ان کے تقاضے کیا ہیں، ان کے مطابق ہمیں کس انداز سے راہنمائی دینی چاہیے، اس لیے یہ کچھ کیا گیا ہے۔

عزیزانِ من! اب اگلی آیت میں اگلی بات آ گئی کہ یہ بات انسانوں کی زندگی تک کی دنیا میں نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ** (2:107) یہاں ہی نہیں ہیں، باہر کی کائنات میں بھی تم دیکھو تو سہی، کیا ہر شے وہاں قانون اور پیمانوں کے مطابق چل رہی ہے یا نہیں؟ کہیں وہاں یہ چیز دیکھتے ہو کہ کوئی شے کبھی جس طرح سے جی چاہے، ہو جائے گی۔ ہم نے وہاں جب یہ چیز کہہ دی ہے کہ H_2O سے پانی کا ایک قطرہ بنے گا، یہ ازلی اور ابدی قانون ہے، اس کے مطابق جہاں جس کا جی چاہے ٹیسٹ کرے، ایسا ہی ہوتا چلا جائے گا۔ یہ جو چیز ہے کہ ہم ہر شے پیمانے کے مطابق کرتے ہیں، قانون ہے جو چلتا ہے، اس کے لیے خارجی کائنات کے لیے تصدیق چاہتے ہو، نگاہ دوڑا کے دیکھو، ہر شے قانون کے مطابق چلتی ہے اور پھر قانون دینے والا ایسا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور ایسا نہیں ہے جس کو ان چیزوں کے اوپر اس قسم کا اقتدار حاصل ہو کہ اس کا بھی قانون ساتھ چلے اور اس کا بھی ساتھ چلے اور اس طرح سے ٹکراؤ پیدا ہو، قطعاً یہ بات نہیں ہو سکتی۔

عزیزانِ من! میرا خیال ہے کہ یہ اتنا اہم مسئلہ، اتنا اہم سوال، جو آپ کے ہاں ناسخ و منسوخ کا ہے، اور جس نے آپ کے اس مکمل، غیر متبدل دین کو، یہ کچھ بنا کر رکھ دیا ہوا ہے، آپ سمجھ گئے ہوں گے اور یہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیت واضح ہو گئی ہو گی۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

عزیزانِ من! اس درس میں ہم آیت 107 تک آ گئے۔ ہم آئندہ، اگلی آیت، اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

ستائیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)‘ (آیات 108 تا 118)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۗ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ
سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿١٠٨﴾ وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ
أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا
تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٠﴾ وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا
بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ
عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١١٣﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا ۚ
أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ
عَظِيمٌ ﴿١١٤﴾ وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿١١٥﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ
وَلَدًا ۗ سُبْحَانَهُ ۖ بَلْ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ كُلٌّ لَهُ قَانِتُونَ ﴿١١٦﴾ بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَإِذَا قَضَىٰ
أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿١١٧﴾ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۘ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۗ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿١١٨﴾

عزیزانِ من! آج دسمبر 1968ء کی 29 تاریخ ہے اور سورۃ البقرہ کی آیت 108 سے درس کا آغاز ہوتا ہے: (2:108)۔

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ سوالات کے سلسلہ میں ایک اہم آیت کا مفہوم

اس آیۂ جلیلہ میں دین کے ایک اہم بنیادی گوشے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اسے صحیح طور پر سمجھ لینے کے بعد بہت سی الجھنیں از خود دور ہوجاتی ہیں‘ جو آج ہمیں قدم قدم پر پیش آتی ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے یہاں دین کی جگہ مذہب نے لے لی

ہے۔کہا یہ گیا ہے کہ اَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا رَسُوۡلَکُمۡ کَمَا سُئِلَ مُوۡسٰی مِنۡ قَبۡلُ وَ مَنۡ یَّتَبَدَّلِ الۡکُفۡرَ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ (2:108)- کیا تم چاہتے ہو کہ تم اپنے رسول سے اسی طرح سے سوالات کرتے چلے جاؤ' جس طرح بنی اسرائیل اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا کرتے تھے؟ یاد رکھو! یہ چیز ایمان کو کفر سے بدل لینے کے مترادف ہو جائے گی اور تمہیں دور کی گمراہی میں لے جائے گی۔آپ نے غور فرمایا کہ کتنی اہم چیز ہے' جو یہاں بیان کی گئی ہے۔نظر بظاہر تو بات کچھ چھوٹی سی نظر آتی ہے کہ تم سوالات کرتے ہو یا چاہتے ہو کہ اسی طرح سوالات کریں' جس طرح سے کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کیے تھے اور کہا یہ ہے کہ یہ چیز ایمان کو کفر سے بدل دے گی' تمہیں بڑی ہی دور گمراہیوں میں لے جائے گی۔ یہ بات کیا ہوئی؟ کتنی اہم چیز ہے کہ ایمان کو کفر سے بدل دے گی' تم بہت دور گمراہیوں میں جا پڑو گے۔دوسرے مقام پر اسی کی تفصیل ان الفاظ میں آئی ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡ اَشۡیَآءَ اِنۡ تُبۡدَ لَکُمۡ تَسُؤۡکُمۡ وَ اِنۡ تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡهَا حِیۡنَ یُنَزَّلُ الۡقُرۡاٰنُ تُبۡدَ لَکُمۡ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهَا وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ○ قَدۡ سَاَلَهَا قَوۡمٌ مِّنۡ قَبۡلِکُمۡ ثُمَّ اَصۡبَحُوۡا بِهَا کٰفِرِیۡنَ (5:101-2) اے ایمان والو! جن چیزوں کے متعلق خدا نے خود نہ کچھ فرما دیا ہو' ان کے متعلق خواہ مخواہ کے لیے کرید کرید کر سوالات نہ کیا کرو۔ایسا کرو گے تو جب قرآن نازل ہو رہا ہے' تو اس میں یہ چیزیں بھی بیان کر دی گئیں' تو تم بڑی مشکل میں پھنس جاؤ گے۔ یہ روش اس سے پہلے ایک قوم بنی اسرائیل نے اختیار کی تھی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سرے سے دین کو چھوڑ کر کفر ہی اختیار کر گئی۔پھر آپ نے دیکھا کہ اس بات کی اہمیت کتنی ہوئی کہ وہاں بنی اسرائیل کے متعلق چیز تو اتنی ہی کہی اور یہاں جماعتِ مومنین سے اس کی تاکید کی گئی کہ ایسا نہ کرنا۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم دین کو یکسر چھوڑ کر کفر کی طرف چلے جاؤ گے۔ غور فرمایا آپ نے کہ اس کی اہمیت کتنی ہے! عزیزانِ من! یہی ہے جو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بڑی غور طلب چیز ہے۔

دین کیا ہے؟ پہلے بنیادی اصول کو سمجھ لیجیے کہ انسان کو اختیار و ارادے کی نعمت سے سرفراز کیا گیا ہے۔سب سے بڑی چیز جو انسان کو اس کائنات میں دی گئی ہے' وہ اختیار اور ارادہ ہے۔اس اختیار اور ارادے پر کچھ پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ یہ پابندیاں درحقیقت خود اس کی ذات کی تقویت' اور نشوونما کے لیے ضروری ہیں۔جیسا میں مثال دیا کرتا ہوں کہ نہر میں تھوڑے تھوڑے سے فاصلے پہ جا کر ایک ٹھوکر (Fall) بنانی پڑتی ہے۔وہاں آ کر پانی اس سے ٹکراتا ہے' اس ٹکراؤ سے اس کی روانی اور رفتار میں اور تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم کسی انسان کو کسی کی آزادی سلب کرنے کا حق نہیں دیتا

سوال یہ ہے کہ انسان کی آزادی پر' اس کے اختیار و ارادے پر' اس قسم کی پابندی عائد کرنے کا حق کسے حاصل ہے؟ قرآنِ کریم نے یہ کہہ دیا کہ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّؤۡتِیَهُ اللّٰهُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ کُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّیۡ مِنۡ دُوۡنِ

اللّٰہِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے، خواہ اسے ضابطۂ قوانین دیا جائے، خواہ اسے حقِ حکومت دیا جائے، خواہ اسے نبوت بھی کیوں نہ دی جائے کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم میرے حکم کے فرماں بردار بن جاؤ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن شرفِ انسانیت کو کتنی انتہا تک لے جاتا ہے۔ انسانی آزادی کو سلب کرنے کا حق وہ کسی کو نہیں دیتا۔ اس کے لیے صرف اس نے خدا کو یہ حق دیا ہے کہ وہ یہ جانتا ہے کہ کس قسم کی پابندی عائد کرنے سے اس کی آزادی کی قوت میں اور اضافہ ہو جائے گا اور جو پابندیاں انسانوں کی طرف سے عائد کی جائیں گی، وہ اس کی قوتِ ارادی اور اختیار اور آزادی کو مضمحل کر دیں گی، اس لیے اس نے روک دیا۔ کوئی انسان کسی انسان پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتا۔ پابندیاں ضروری ہیں۔ جو بھی کھیل آپ کھیلیں گے، اس میں آپ کو کھیل کے کچھ قواعد و ضوابط تو ملحوظ رکھنے پڑیں گے، کچھ تو لائنیں Draw (کھینچنی) کرنی پڑیں گی۔ ان کے اندر رہتے ہوئے، آپ کھیلیں گے تو پھر کھیل ہو جائے گا۔ آپ ان کو توڑ دیں گے تو وہ ہرزہ گردی ہو جائے گی، تماشا ہو جائے گا۔

عزیزانِ من! زندگی کا جو اہم کھیل ہے، اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ کچھ باؤنڈری لائنز، کچھ حدود، کچھ قیود کھینچی ہوئی ہوں اور ان کی پابندی کرنا، ان کا ملحوظِ خاطر رکھنا، تمام انسانوں کے اوپر لازم ہو اور اس سے زیادہ کوئی پابندی عائد کر نہ سکے۔ یہ جو پابندیاں عائد کی جاتی تھیں، یہ وحی کی رو سے خدا نے عائد کیں۔ قرآنِ کریم کے اندر یہ چیزیں دے دی گئیں اور ان کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (6:34) ان کلمات اللہ میں، خدا کے ان قوانین میں، ان پابندیوں میں، ان حدود میں، کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ پھر کہہ دیا کہ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (6:115) یہ مکمل ہو گئیں، ان میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ جتنی پابندیاں عائد کی جانی تھیں، وہ عائد کر دی گئیں، بات مکمل ہو گئی۔ جو عائد کر دی گئیں ان میں اب تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے کہتے ہیں کہ دین کا اتمام ہو گیا، دین مکمل ہو گیا۔

انسان اور حیوان میں صرف اقدار کا ہی فرق ہے

عزیزانِ من! یہ جنہیں ہم پابندیاں کہتے ہیں، یہ کچھ اصول ہیں، کچھ اقدار ہیں، کچھ Values ہیں۔ یاد رکھیے! انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز چیز Values (اقدار) کا تصور ہے۔ حیوان اقدار کو نہیں جانتا، وہ صرف اپنی طبعی زندگی کے تقاضوں کو جانتا ہے۔ ایک بیل کے لیے یکساں ہے کہ ایک طرف اس کے مالک کا کھیت ہے، دوسری طرف غیر کا کھیت ہے۔ اس کے لیے یکساں ہے وہ اُدھر سے چر لے یا اِدھر سے چر لے۔ نہ وہ گنہگار ہوتا ہے، نہ وہ مجرم قرار پاتا ہے لیکن ایک انسان کے لیے تمیز کرنا ضروری ہو گیا کہ وہ اپنے ہاں کے کھیت سے چارا کاٹے، دوسرے کے کھیت سے چارا نہ کاٹے۔ یہ جو دیانت کا اصول ہے، اسے Value (قدر) کہتے ہیں۔ حیوان قدر نہیں جانتا۔ جو

انسان ہے‘ وہ اقدار کو جانتا ہے۔ یہ اقدار ہیں‘ جنہیں ہم حدود کہتے ہیں‘ جنہیں ہم پابندیاں کہتے ہیں۔ یہ بارڈر لائنز ہیں‘ یہ بڑی بڑی باہر کی باؤنڈری لائنز ہیں۔ اس کے اندر قرآن نے انسان کو پوری آزادی دے رکھی ہے لیکن اگر صورت یہ ہو کہ ان لائنز کے اندر رہتے ہوئے بھی قدم قدم کے متعلق یہ پوچھا جائے کہ صاحب! فٹ بال اگر میرے ہاں آیا تو کیا دایاں پاؤں لگنا چاہیے یا بایاں لگنا چاہیے؟ یہ پابندی تو تھی کہ ہاتھ نہیں لگنا چاہیے۔ اب اس سے اور آگے چلیے کہ صاحب! جب گیند چلے گا تو میں گیند کے دائیں طرف سے نکلوں یا بائیں طرف سے نکلوں؟ وہ کہہ رہا ہے کہ تمہیں بات اتنی سی کہہ دی کہ یہ باؤنڈری لائنز ہیں‘ لِتَهْتَدُوا بِهَا (6:98) ان کو Transgress (متجاوز) نہ کرنا‘ ان سے راہنمائی حاصل کرنا۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہاتھ نہیں لگانا۔ اس کے بعد یہ کہہ دیا گیا کہ اس گیند کو‘ ایک ٹیم ورک کی حیثیت سے‘ اس گول کے اندر لے جانا۔ اب اس کے اندر اپنی Discretion (صوابدید) برتو‘ خود فیصلہ کرو کہ مجھے اب پاس کرنا چاہیے‘ دوسرے کھلاڑی کو دینا چاہیے‘ کک لگانی چاہیے‘ ہیڈ لگانا چاہیے۔ یہ چیزیں تم خود فیصلہ کرو۔

قرآن حکیم انسانیت کو زندگی گزارنے کے اصول دیتا ہے‘ اسے ان پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کرتا

عزیزانِ من! دین یہ کرتا ہے‘ وہ زندگی کے اصول دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) ان اصولوں کے اندر رہتے ہوئے‘ اجتماعی طور پر اپنے معاملات اپنے زمانے کے تقاضے کے مطابق باہمی مشورے سے طے کیا کرو۔ یہ تھا اصول۔ کہا کہ تم بنی اسرائیل‘ جس کا ذکر یہاں شروع میں کیا گیا ہے‘ کی طرح نہ کرنے لگ جانا۔ اس سے ذرا ہی پہلے تو وہ واقعہ آ چکا ہے۔ وہ اس چیز کی بڑی بیّن مثال ہے کہ اصولی حکم کے بعد اس میں فروعی کرید کر کے‘ جزئیات تک کے لیے متعین نہ کرا لینا۔ خدا نے ان سے کہا تھا کہ ایک بچھڑا ذبح کر دو۔ وہ سیدھا سا حکم تھا‘ اس میں کونسی فلسفیانہ موشگافیوں کی اور منطقیانہ قیاس آرائیوں کی ضرورت تھی۔ ایک بچھڑا ذبح کر دو۔ پوچھ رہے ہیں کہ صاحب! بات صاف نہیں ہوئی۔ بتائیے اس کی عمر کتنی ہونی چاہیے؟ کہا کہ عمر یہ ہونی چاہیے۔ بات صاف نہیں ہوئی جی! وہ کس قسم کا ہونا چاہیے؟ قد کس قسم کا ہونا چاہیے؟ وہ ہل میں جوتا ہوا ہو یا نہ؟ اب ہر سوال کے اوپر جو جواب ملتا ہے‘ وہ پابندیاں عائد کر دیتا ہے۔ پہلے تو یہ صورت تھی کہ جو بچھڑا ملے اس کو لو اور ذبح کر دو‘ حکم کی تعمیل ہو گئی۔ اب صاحب! اس خاص نوعیت کا‘ خاص کیفیت کا‘ ایک خاص علامات کا بچھڑا تلاش کرنا پڑے گا‘ وہی ڈھونڈنا پڑے گا‘ اس کو لانا پڑے گا یعنی یہ پوچھ پوچھ کر آپ نے دیکھا کہ اپنی آزادی کے اوپر کتنی پابندیاں خود عائد کرتے چلے گئے۔

زندگی کے غیر متبدل اصولوں کو اختیار کرتے ہوئے غیر ضروری رسومات پر عمل پیرائی کا نتیجہ

یہ کتنی پابندیاں عائد کی ہوئی تھیں؟ یہ یہودیوں کے ہاں کبھی دیکھیے کہ ان کے ہاں کہیں ایک بکرا ذبح کرنا ہو تو اس کے لیے اتنی

رسومات ادا کرنی پڑتی ہیں کہ اتنے میں وہ بکرا کٹ کٹا کر' پک پکا کر' کھایا بھی جا سکتا ہے' جتنے میں ابھی اس کے گلے پہ چھری بھی نہیں پھر سکتی۔ میں یہ ایک چیز کہہ رہا ہوں۔ زندگی کے ہر گوشے میں ان کے لیے اس قسم کی جزئیات ہیں' فروعات ہیں' احکام ہیں' اتنی اتنی موٹی کتابیں ہیں' جو صرف اتنی سی چیز کے لیے ہیں کہ کھانا کیسے کھانا چاہیے۔ یہ انہوں نے خود عائد کرلیں۔ اب یہ پابندیاں جتنی بھی تھیں' عائد تو کرلیں' ان کا نتیجہ کیا نکلا؟ زمانے کے تقاضے بڑھتے چلے گئے' حالات مختلف ہوتے چلے گئے۔ اصول کی تو یہ صورت ہے کہ وہ ہمیشہ یکساں رہے گا۔ چارا اپنے کھیت سے کاٹو' غیر کے کھیت سے نہ کاٹو' یہ پانچ ہزار سال پہلے بھی اسی طرح سے ایک صداقت تھی' جس طرح آج صداقت ہے' جس طرح آج سے پانچ ہزار سال بعد صداقت ہوگی۔ اس میں کبھی کسی تبدیلی کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی لیکن یہ کہ چارا درانتی سے کاٹو' مشین سے کاٹو' ہاتھ سے کاٹو' اس کے لیے بھی اگر ساتھ حکم آجائے اور آپ کے لیے غیر متبدل ہو تو آپ دیکھیے کہ کس مصیبت میں پھنس گئے۔

اگر اس کھیتی کے کاٹنے کے لیے حکم یہ ہو کہ تم نے کھیتی درانتی سے کاٹنی ہے تو آج جب کہ دس دس ہزار ایکڑ زمین کے اندر آپ کا بویا ہوا ہے' آپ کے ہاں Harvesters' ایجاد ہو چکے ہوئے ہیں' ایک وہ آتا ہے' گھنٹے کے اندر ساری کھیتی کاٹ دیتا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ شریعتِ حقہ کے خلاف ہے' یہ کھیتی تو درانتی سے کٹے گی' پھر اس کے بعد ہوگا کیا؟ یہ کہ درانتی سے کاٹنے والے نقصان میں رہیں گے۔ اب اس حکم کی تعمیل دوبھر ہوگئی۔ تھوڑا سا عرصہ یہ پابندی گراں گزرے گی' اس کے بعد پھر وہ کہیں گے کہ صاحب! چھوڑیں اس کو۔ کہا جائے گا کہ صاحب! یہ تو دینِ خداوندی ہے۔ اب اس کے بعد بے باکی اور سرکشی آئے گی کہ صاحب! اگر یہ دین ہے تو آپ کے اس دین کو سلام۔ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ جو باقی گاؤں والے ہیں' وہ گھنٹے بھر میں فارغ ہو جاتے ہیں اور ہم دو دو مہینے اس پہ لگے رہتے ہیں۔ ہوا یہ کہ وہ جزئیات جن کو تم نے خود کہہ کر متعین کرا لیا' زمانے کے تقاضوں کے بدلنے کے بعد وہ ممکن العمل نہ رہیں' Impracticable (ناقابل عمل) ہوگئیں۔ اب اس کے بعد دشواری ہوگئی' وہ چل سکتی نہیں' چھوڑ سکتے نہیں۔ اب ایک درمیانی جنریشن آیا کرتی ہے' اس میں تذبذب ہوا کرتا ہے' پھر اندر ہی اندر ایک Inhibition (مزاحمت) پیدا ہو جاتی ہے کہ صاحب! ہم نے یہ جو کیا ہے' یہ کچھ ناجائز سا فعل ہوگیا ہے' یہ شریعت کے خلاف ہی ہے۔ جو درانتی سے نہیں کاٹا' اب اللہ ہی فضل کرے' اس سے کوئی تباہی نہ آجائے' کوئی خرابی نہ پیدا ہو جائے یعنی خوامخواہ اپنے اندر ایک Guilt Consciousness (شعورِ جرم) پیدا ہو رہا ہے' مجرم محسوس کر رہے ہیں۔ اسی کا نام نفسیات میں Inhibition[1] ہوتا ہے۔ یہ پیدا ہو رہا ہے اور میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ ایک جو جنریشن (نسل) کے بعد پھر آدمی اس کو سرے سے چھوڑ ہی دیتا ہے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

---

[1] It is the restraint of an instinctive impulse or the condition inducing such restraint.

ارتقائی مراحل کے پیش نظر ثبات اور تغیر کے امتیاز کی اہمیت

عزیزان من! یہ تھی وہ چیز جو قرآن نے کہی کہ اس قوم نے یہ کیا کہ ان اصولوں تک ہی اپنے آپ کو محدود نہ رکھا بلکہ ان کی جزئیات بھی متعین کرانے بیٹھ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ عرصے کے بعد جو جزئیات اس زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتی تھیں' زمانے کے تقاضے بدل جانے سے' وہ جزئیات ناممکن العمل ہو گئیں' تو وہ سرے سے دین ہی کو چھوڑ بیٹھے۔ کہا کہ اے جماعتِ مومنین! تم ایسا نہ کرنا۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن نے دین کی یہ کتنی عجیب چیز کہہ دی' ہمیشہ تک کے لیے ممکن العمل چیز۔ فارمولے کبھی نہیں بدلتے ہیں' اصول غیر متبدل ہوتے ہیں۔ بدلنے والے ہوتے ہیں' وہ طریقے' وہ جزئیات' وہ فروعات جو ان فارمولوں کو' ان اصولوں کو' ان قوانین کو' بروئے کار لانے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ یہ قواعد' یہ طریق' بدلتے رہیں گے' وہ اصول' وہ فارمولے اپنی جگہ پر غیر متبدل رہیں گے۔ اس طرح سے ثبات اور تغیر کے ایک امتیاز سے انسانی زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ نہ تو یہ شتر بے مہار ہو گا' اور نہ ہی یہ ندی ساحلوں کو توڑ کر سیلاب بنے گی کیونکہ وہ ساحل جو اصول ہیں' وہ غیر متبدل ہیں اور نہ ہی اس کی آزادی ایسی گھٹے گی کہ وہ ندی جوہڑ بن کر رہ جائے اور اس میں تعفن پیدا ہو جائے۔ دین یہ کرتا ہے۔

دین کے بالمقابل مذہب زندگی کی ارتقائی منازل کو جمود میں بدل دیتا ہے

اس کے برعکس مذہب میں یہ ہوتا ہے کہ ہر چیز کی جزئیات متعین کر کے ان کو قیامت تک کے لیے غیر متبدل قرار دے لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیے کہ کس مصیبت میں وہ قوم پھنس جاتی ہے؟ یہ دشواریاں ہیں جو کہتے ہیں کہ صاحب! مذہب انسان کا ساتھ نہیں دے سکتا' یہ اس دور میں نہیں چل سکتا۔ یہ ہماری اگلی جنریشن (نسل) آ گئی ہے۔ یہ اس نکتے تک پہنچ گئی ہے اور ہم سے ذرا آگے بھی ہے' ہمارے اندر تو Inhibition (مزاحمت و ممانعت) پیدا ہوئی تھی' کچھ عرصہ تو ہم نے یہ سوچنا شروع کیا کہ صاحب! اس میں بہرحال کچھ مصلحت ہے' اس میں کچھ بہتری ہے' انہوں نے اچھا ہی سوچا ہو گا' یہ درمیانی دور آیا۔ اس کے بعد اگلا دور آیا کہ جب اس کی جو مصلحت تھی' حکمت تھی' وہ سمجھ نہ آئی' وہ کچھ ناممکن العمل ہو گئے' تو ہماری اس آئندہ جنریشن (نسل) نے سرے سے اس لبادے کو ہی اٹھا کر پھینک دیا کہ اگر یہی مذہب ہے' جو چل نہیں سکتا' تو اس کو ہمارا سلام۔ اگر دین کے اوپر رہتے تو یہ صورت کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ قرآن نے یہ کہا تھا کہ اے جماعتِ مومنین! تم ایسا نہ کرنا۔ یاد رکھو! اس سے پہلی قوموں نے یہ کچھ کیا' نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ وہ سرے سے دین ہی کو چھوڑ بیٹھے۔ کہا ہے کہ تم ایسا نہ کرنا لیکن ہم نے ویسا ہی کیا جیسا کہ انہوں نے کہا تھا آج نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

ہمارے ہاں فقہ کے اندر قدم قدم پر جذبات کی گرفت اور حرام وحلال فہرستوں کی بھرمار ہے

یہودیوں کے ''تالمود'' میں جو غیر متبدل ہیں' ان میں زیادہ تفصیل اور جزئیات نہیں ہوں گی جو آج آپ کے ہاں کی فقہ کے اندر موجود ہیں۔ مسائل آپ کے ہاں آئے' آج اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ شریعت کے ان احکام کے مطابق ایک دن بسر کرلے' تو جینا دوبھر ہوجاتا ہے۔ وہ یوں ہے کہ یہ قدم اٹھے تو یہ کرؤ یہ پاؤں رکھا جائے تو یہ پڑھؤ اس انداز سے بیٹھؤ اس سے اٹھؤ اس سے لیٹؤ ایسے کھاؤ' ویسے نہ جاؤ۔ کڑی درکڑی پابندی در پابندی عائد ہے۔ یا ہم میں سے جو اشخاص یہ کہتے بھی ہیں کہ ہم دیندار ہیں' مذہب پرست ہیں' شریعت کے احکام کی پابندی کرتے ہیں' اگر کبھی آپ انہیں دیکھیں تو جزئیات کے طور پر تو وہ بھی نہیں کر رہے ہوتے۔ ان میں سے موٹی موٹی کوئی چار باتیں کرلی جاتی ہیں' باقی ساری چیزیں چھوڑ دی جاتی ہیں۔ یہ کیوں ہوا؟

عزیزانِ من! ہوا یہ کہ یہ چیزیں کسی ایک زمانے کے حالات کے مطابق متعین کی گئی تھیں' انسانوں نے متعین کی تھیں' ان کے زمانے کے تقاضوں کے لیے تھیں' اب وہ ہمیشہ کے لیے غیر متبدل ہوگئیں۔ قرآن نے کہا تھا کہ یہ چار چیزیں حرام ہیں' ان کو نہ کھانا' باقیوں کے متعلق کہا کہ جو طیّب ہیں' خوشگوار ہیں' مزاج کے مطابق ہیں' اچھی لگتی ہیں' کوئی اس میں نقص نہیں ہے' انہیں کھاؤ پیو اور اس کے ساتھ ہی اس نے کہا تھا کہ کون ہے جو ہماری حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیے' آپ کے ہاں حرام اور حلال چیزوں کی جو لسٹیں بنی ہوئی ہیں' وہ اب قیامت تک کے لیے غیر متبدل ہوگئیں۔ آپ کے' وہ قوانین جو قرآن نے دیئے ہوئے ہیں' وہ غیر متبدل ہیں۔ اصول بھی اور جتنی تفاصیل خدا اس میں دینا چاہتا تھا' وہ قرآن کے اندر دیدیں' وہ سب غیر متبدل ہیں لیکن اس کے بعد' انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین' کسی زمانے میں ان کے حالات کے مطابق ہوں گے' وہ بنے ہوئے رکھے ہیں اور غیر متبدل سمجھے جاتے ہیں۔

قانون ساز اداروں کے علاوہ جج صاحبان کی مجبوری کی نوعیت اور پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تخصیص کا معاملہ

عزیزانِ من! آج آپ کے ہاں آپ کی قانون ساز اسمبلی بھی مفلوج اور مجبور ہوکر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ آج کے تقاضوں کے مطابق یہ چیز نہیں چل سکتی' یہ یوں ہونی چاہیے تو شریعت کے اجارہ دار آجاتے ہیں کہ صاحب! نہیں' ''ہدایہ'' میں یہ لکھا ہے' آپ اس کے خلاف نہیں کرسکتے تو وہ قانون سازی آپ کے ہاں ختم ہوجاتی ہے۔ آپ کی عدالتیں مجبور ہیں۔ یہ دیکھتے ہیں کہ حالات کے تقاضوں کے مطابق یہ ہونا چاہیے' وہ ان میں سے یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسلام کے اصولوں کے مطابق یہ بات یوں ہونی چاہیے' آن میرٹ اس کیس کا فیصلہ یوں ہونا چاہیے لیکن وہ ایک وکیل صاحب کھڑے ہوکر بتا دیتے ہیں کہ نہیں صاحب! فتاویٰ عالمگیری میں اس کے متعلق یہ لکھا ہوا ہے۔ وہ سامنے رکھا اور صاحب! وہ معطل ہوکر بیٹھ گئے۔ جج صاحبان خود یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ہم جانتے ہیں کہ یہ جو

چیز ہے' یہ بڑی زیادہ گراں گزرے گی' بڑی غلط ہے' اس صورت میں ایسا نہیں ہونا چاہیے لیکن مجبور ہیں۔ اس لیے کہ وہ کسی وقت کا ایک فیصلہ سامنے لاکر رکھ دیا۔ آپ کے دستور کے اندر یہ چیز سب سے اوپر لکھی ہوئی ہے کہ کوئی فیصلہ کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا' کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں بنے گا۔ اس کے بعد شخصی قوانین ہیں جنہیں آپ Personal Laws کہتے ہیں۔ ان میں یہ ہے کہ فرقے کی جو Interpretation (توضیح) ہے' وہ قانون ہوگی۔ اب آپ مجبور ہوگئے۔

برادرانِ عزیز! دین نے کچھ اصول دیئے تھے۔ یہ ساری چیزیں ہم نے خود متعین کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تو اس کے اوپر عمل رہا اور آج کہتے ہیں کہ سوالات مت کرو۔ آپ سارے قرآن میں دیکھیے یَسْـَٔلُوْنَكَ (2:189) یہاں آتا ہے' کہ تجھ سے پوچھتے ہیں' یہ سارے قرآن میں پندرہ مرتبہ ہے۔ تئیس سال کی مدت میں صحابہ کبارؓ کی' امت کی لاکھوں کی تعداد تھی' یہ پندرہ مقام ہیں اور ان میں بھی آپ دیکھیں تو یہ اس قسم کی جزئیات نہیں ہیں' جیسے ہے کہ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ (2:189) چاند کے معاملے میں' مہینے کی گنتی کے معاملے میں' کیا بات ہے' کہا ہے کہ رمضان کے روزے رکھنے سے لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ بعض مہینے مبارک ہوتے ہیں اور بعض منحوس' اس لیے انہوں نے اے رسول! تم سے اس کی بابت دریافت کیا ہے۔ اسی طرح چند چیزیں اور ہیں مثلاً وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ (2:222)۔ اے رسول! تجھ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کے جواب پر انہوں نے کچھ نہیں پوچھا۔ اس لیے کہ ان کے سامنے یہ حکم تھا مگر بعد والوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں ہے' انہوں نے نہیں پوچھا تو نہ سہی' دیکھیے! ہم پوچھ پوچھ کر بتاتے ہیں۔ اب پوچھ پوچھ کر بتانے کے دریا کھول دیئے' پوچھنے والے آتے چلے آئیں' پوچھتے چلے جائیں گے۔ نہیں بھی پوچھا' تو ہمارے ہاں جو فقہ مرتب ہوئی ہے' وہ قیاسات پہ مرتب ہوئی ہے کہ 'فرض کیجیے' یعنی لوفرضنا سے بات یہاں شروع ہوتی ہے' واقع میں وہ چیز نہیں ہوتی ہے کہ فرض کیجیے۔ یہ چیز یہاں آجاتی ہے اور اس کے اوپر وہاں ایک ڈکٹیشن ہوتی ہے لمبی چوڑی بحث' پھر ایک فیصلہ دے دیا جاتا ہے۔ یہ اتنے اتنے بڑے فقہا ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کسی زمانے میں' کسی وقت میں' ان جزئیات کی ضرورت پڑی ہو' ان کے زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے بات ختم ہوگئی لیکن وہ ابدی طور پر' قیامت تک کے لیے آپ کے لیے غیر متبدل قوانینِ شریعت بن گئے۔

ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں نکاح اور خلع کا معاملہ اور ہماری عدالتوں کی پریشانی اور ان کا حل

عزیزانِ من! آج سارے ان پہ چیخ رہے ہیں مثلاً کہ صاحب! نکاح کا یہ معاملہ بالغ مرد اور عورت کا باہمی رضامندی سے خدا کی بتائی ہوئی حدود کے اندر رہتے ہوئے' ازدواجی زندگی کا ایک معاہدہ ہے' جو کیا جارہا ہے۔ یہ دونوں کی رضامندی سے ہو رہا ہے۔ جب یہ

معاہدہ دونوں کی رضامندی سے ہوا ہے تو اگر کسی وقت اسے کالعدم قرار دینے کی ضرورت پڑ جائے تو ان فریقین میں رضامندی سے یہ چیز ہو جانی چاہیے مگر نہیں صاحب! اس کے متعلق تو اب فتاویٰ کی ایک ضخیم کتاب بنی ہوئی ہے' یہ اس کے تابع ہونا چاہیے' عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے' اس کے لیے خلع کا ایک لفظ ہے' جس کی رو سے اس کے لیے یہ شرائط ہونی چاہئیں' یہ پابندیاں ہونی چاہئیں۔ آج ایک مصیبت پڑی ہوئی ہے۔ ہماری عدالتوں کو ایک اتنا سا مقدمہ فیصل کرنے کے لیے کہ عورت کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ نکاح کا وہ معاہدہ' جو خود اس نے اپنی رضامندی سے کیا تھا' اس کو تڑوا سکے' سو سو صفحے کے فیصلے لکھنے پڑتے ہیں۔ قرآن کی ایک آیت معاملہ صاف کر دیتی ہے۔ کہا ہے کہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (4:19) یہ تمہارے لیے حلال ہی نہیں ہے کہ تم کسی عورت کے زبردستی وارث بنے رہو۔ یہ معاملہ ختم ہوا لیکن ان کی مجبوریاں یہ ہیں کہ وہ جتنے آپ کے ہاں کے فتاوے ہیں' جتنے یہ فقہ کی جزئیات ہیں' ان کو قیامت تک کے لیے غیر متبدل شریعت قرار دے دیا۔ یہ بات چل نہیں سکتی تھی۔ آج الجھنیں پڑی ہوئی ہیں' امت کشمکش میں گرفتار ہے۔ یہ جتنے آپ کے ہاں شور' واویلا' اور فسادات ہوتے ہیں' وہ اتنی سی چیزوں کے اوپر ہیں کہ زمانے کی مصلحت کے مطابق قرآن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے' میں کہتا ہوں کہ وہ ایک چیز طے کی جاتی ہے' مگر ان کی وہ چیز کسی زمانے کے طے شدہ کسی جز کے خلاف جاتی ہے تو شور اُٹھ جاتا ہے کہ یہ سارا عمل شریعت کے خلاف ہو رہا ہے۔

اس کشمکش سے نکلنے کے لیے ایک ہی طریقہ تھا جو قرآن نے یہاں کہہ دیا تھا کہ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ (2:108) کیا تم بھی یہ چاہتے ہو کہ اسی طرح سے سوالات کر کے' کرید کرید کے جزئیات تک معین کراؤ جیسا اس سے پیشتر بنی اسرائیل اپنے رسول' موسیٰ علیہ السلام سے کیا کرتے تھے۔ اس کرید کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ایسی باتوں کو اپنے لیے غیر متبدل شریعت بنا لیا جن کا ہمیشہ کے لیے نبھانا مشکل تھا۔ آخر الامر انہیں اس سے انکار کرنا پڑا سو تم بھی ایسا نہ کرنا۔ عزیزانِ من! اب بات آپ کی سمجھ میں آ جائے گی کہ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ (2:108) اس سے تو ایمان کفر سے بدل جائے گا۔ یاد رکھیے! جو ایک مسئلے کو Genuinely (اصلیت سے) اور Honestly (دیانتداری سے) دیکھتا ہے کہ اس میں یہ بات جو کہہ رہے ہیں یہ تو بڑی غلط ہے' تو پھر اس کے لیے اس کا نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً میں آپ کے ہاں کا فتویٰ پوچھتا ہوں کہ اگر کسی عورت کا شوہر مفقود الخبر ہو جائے' یعنی اس کی خبر نہ ملے کہ وہ کہاں گیا ہے' تو وہ کب تک انتظار کرے؟ آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے ہاں کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ عورت نوے سال تک انتظار کرے۔ آپ ہنس دیئے' وہ کہتے ہیں کہ یہ انتظار نہ کرنا کفر ہے۔ سوچیے کہ پھر اس کے بعد جو پہلی چیز ہے تو اس سے آپ کا پہلا ری ایکشن یہ ہوا ہے۔ پھر آپ کا عملی ری ایکشن بعد میں یہ ہوگا کہ آپ ادھر اُدھر کچھ اور ڈھونڈیں گے۔ قرآن نے کہا تھا کہ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ (2:108) جو بھی ایمان سے بہرہ یاب ہو کر پھر کفر کی روش اختیار کر لے تو فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ

السَّبِیۡلِ (2:108) فلاح و بہبود کی راہ اس سے کم ہو جاتی ہے۔ آپ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اب آپ مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ قرآن کہتا ہے کہ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ (2:108) اس پہ پابندی کرو گے تو یہ ایک قسم کی مجبوری ہے' اس سے فلاح و بہبود کی راہ گم ہو جاتی ہے۔ اس سے اس کے خلاف یہ چیزیں دل میں آئیں گی۔ یہ چیزیں دوسری قسم کی Inhibition (مزاحمت و ممانعت) پیدا کرنے والی ہیں۔ تم نے تو خود ہی یہ اپنی وضع کردہ مصیبتیں اپنے اوپر عائد کر لیں' اب اس کے بعد اندر بیٹھے ہوئے ہیں' کنڈی لگائی ہوئی ہے کہ صاحب! نکلیں کیسے؟ ارے اٹھ کر کنڈی کھول لو مگر یہ کہتے ہیں کہ نہیں جی! یہ تو حکم ہے کہ یہ تو قیامت تک کے لیے لگی رہے گی' تو پھر روتے رہو۔

حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات متعین کرنا ہے

عزیزانِ من! دنیا میں جہاں جہاں دین ہے وہ مذہب سے بدلا ہے اور جب قرآنِ کریم آیا تو ہر دین' مذہب سے بدل چکا تھا۔ دین زندگی کے اصول دیتا تھا' ان کی جزئیات وقتی طور پر رکھنے کے لیے ہوتی تھیں۔ قرآنِ کریم نے آ کر یہی چیز کی اور اس کے بعد نبی اکرم ﷺ سے بھی یہ فرمایا کہ وَ شَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ (3:159) جو چیزیں اصولی طور پہ دی گئی ہیں' ان کے متعلق جزئیات متعین کرنے کے لیے اس کا طریقہ' Procedure یہ ہے کہ آج کے حالات میں' اس اصول پر کیسے عمل کیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ اپنی جماعت کے لوگوں سے مشورہ کرو اور پھر حضور ﷺ کے بعد امت سے یہ کہا گیا کہ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ (42:38) ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ عزیزانِ من! کتنا عظیم غیر متبدل اصول دیا ہے کہ ان کی جزئیات زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے تحت' باہمی مشورے سے طے کرتے چلے جاؤ۔ جو باہمی مشورے سے طے شدہ چیز ہے' جب زمانے کا تقاضا بدلے گا' یہ بدل جائے گی' اصول اپنی جگہ غیر متبدل رہیں گے۔ یہ تھا جو دین نے دیا تھا اور اس کے بعد وہ ہے جو مذہب نے بنا لیا۔ اس کی وجہ سے تو ہمیں دقتیں پیش آ رہی ہیں۔ جس کشمکش میں آج ہماری امت مبتلا ہے' وہ وہی کیفیت ہے جیسے کہ باقی مذاہب کے ساتھ ہوئی تھی۔ ہمارے ہاں بھی دین مذہب میں بدل گیا ہوا ہے۔ یہ خدا کی عائد کردہ پابندیاں نہیں تھیں' انسانوں نے اپنے زمانے میں ان پر عمل کرنے کے لیے کچھ جزئیات تجویز کی تھیں۔ اس کا تو کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ ان کی یہ وضع کردہ پابندیاں قیامت تک کے انسانوں کے اوپر لازمی قرار دی جائیں۔

عزیزانِ من! یہ چیز تھی جو قرآن نے کہی ہے۔ اس سے آگے بات اور تشریحی آ گئی۔ کہا ہے کہ ہم تو تمہیں دین کی یہ بات دیتے ہیں' اس پہ قائم رہو گے۔ یہ تمہارے ہاں کی چیز بڑی قابلِ عمل ہو گی' ترقی کرتے ہوئے تم آگے بڑھتے چلے جاؤ گے لیکن وَدَّ کَثِیۡرٌ مِّنۡ

اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (2:109) یہ جو اہلِ کتاب ہیں' اہلِ کتاب کے معنی مذہب پرست ہیں' یہ چاہیں گے کہ تم یوں ترقی کرتے ہوئے آگے نہ نکل جاؤ' تمہارے پاؤں میں بھی یہ اسی طرح سے جکڑ بندیاں کریں گے' بیڑیاں ڈال دیں گے کہ تم بھی رکو۔ وہ ایسا کرنا چاہیں گے کہ تم اس نظامِ زندگی کی برکات سے فیضیاب نہ ہو' اس ایمان کے بعد وہ تمہیں پھر کفر کی طرف لوٹا دیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ حقیقت ان پر واضح نہیں ہوئی' حقیقت تو ان کے سامنے نکھر کر آ چکی ہے لیکن یہ اپنے قومی تعصب کی بنا پر اس دین کو اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں۔

مسلمانوں کے ہاں یہودیوں کا عمل دخل' تقدیر کا عقیدہ' اور مضمرات

قرآن نے متنبہ کر دیا ہے۔ کہا تھا کہ یہ ایسا کرنا چاہیں گے' یاد رکھو! ان کے فریب میں نہ آ جانا اور آپ کو پتہ ہے کہ پھر ہم نے کیا کیا؟ کیا یہ کہ یہ جتنے آپ کے ہاں' پھر قرآن سے باہر کے عقائد' نظریات' تصورات' جزئیات' فروعات' یہ ساری چیزیں تھیں' وہ باقی مذاہب سے مانگ کر آپ نے لی ہوئی ہیں۔ اس کا پہلا ریلا' آپ کے ہاں ایران کے اہلِ کتاب کا آیا۔ عیسائی مسلمان ہوئے' اُدھر سے یہودی آئے' وہ سارا اپنے ہاں کا جتنا ملغوبہ تھا' وہ آپ کے ہاں لے آئے۔ جزئیات اور فروعات تو ایک طرف رہیں' آپ کے ہاں جو اصولی بنیادی عقائد ہیں' وہ بھی وہ نہیں رہے ہوئے' یہ سارے دوسری جگہ سے مستعار لیے ہوئے ہیں۔ مثلاً آپ کے ہاں شریعت کے مقابلے میں بنیادی چیز طریقت اور معرفت آئی جسے آپ تصوف کہتے ہیں۔ اقبالؒ (1938-1877ء) کے الفاظ میں تو یہ ''تصوف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے''۔ ہم تاریخ سے بتا سکتے ہیں کہ یہ کہاں سے آیا اور کس طرح اسلام کے اندر آ گھسا۔ آج اسلام ہی نہیں' اس کو مغزِ دین قرار دیا جا رہا ہے۔ میں یونہی آپ سے ایک مثال دے رہا ہوں۔ آپ کے ہاں یہ تقدیر کے مسائل خالص ایرانی مجوسیت ہے۔ ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ یہ چیز کب ہمارے ہاں آئی؟ اس چیز کو کون لے آیا؟ وہ بھی تاریخ میں موجود ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ پانچ اجزائے ایمان تو قرآن نے گنائے تھے' یہ چھٹا جزوِ ایمان آپ کے ہاں کے ایمان کے اندر داخل ہو چکا ہے کہ **والقدر خیرہ شرہ من اللہ تعالیٰ** کہیں یہ ٹکڑا قرآن میں نہیں ہے۔ کہا تھا کہ یہ اہلِ کتاب چاہیں گے کہ تم اس دین کے اوپر نہ رہو۔ حسداً عجیب بات کہی۔ انہوں نے کس چیز سے حسد کیا؟ وہ تو جامد ہو کر رہ گئے تھے' ایک مقام پہ کھڑے ہو کر رہ گئے تھے' آگے چل نہیں سکتے تھے۔ دین کا یہ اصول جو قرآن نے دیا تھا اس میں تو پوچھو نہیں کہ امت کس طرح سے ترقی کرتی ہوئی' ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی' آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ اس چیز کو دیکھ نہیں سکیں گے کہ تم دنیا کے اندر اس طرح سے' اقوامِ عالم کے اوپر اتنا بڑا اشرف اور افضلیّت حاصل کر لو۔ وہ یہ کچھ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے کیا کیا؟ کیا یہ کہ جن چیزوں نے ان کی ترقی روکی تھی' وہ تمام چیزیں تمہارے ہاں دین کے اندر داخل کر دیں' تم

اسی کی سطح کے اوپر آ گئے۔

یہودیوں کی یا دیگر قوموں کی ترقی کا راز مذہب سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ہے

عزیزانِ من! اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان اہلِ مذاہب کو اپنا مذہب چھوڑنا پڑا' پھر انہوں نے دنیا میں ترقی کی۔ اسے ساتھ رکھتے ہوئے کوئی ترقی کر ہی نہیں سکتا۔ انہوں نے یہ کیا کہ مذہب کو گرجے کی چار دیواری' مندر کے اندر محدود کیا۔ دنیاوی معاملات کے لیے انہوں نے کہا کہ صاحب! ہم وہ معاملات عقل وفکر کی رو سے طے کریں گے۔ چلیے! جو دنیاوی معاملات ہیں' ان کے لیے تو انہوں نے ایک الگ راستہ تجویز کر لیا۔ یہ ہے وہ چیز جو پھر ایمان کفر سے بدل جاتا ہے۔ زندگی کے اس طرح سے حصے کر لینا' یہ بجائے خویش کفر کی چیز ہے لیکن مجبور تھے' انہوں نے یہ کیا۔ آپ کے ہاں بھی اگر آپ نے دین کو اختیار نہیں کیا تو وہ دن دور نہیں کہ یہی کیفیت آپ کے ہاں پیدا ہو جائے گی۔ یہ خیالات عام ہو رہے ہیں کہ صاحب! جس طرح سے سیکولر انداز سے حکومت کے اور مملکت کے معاملات کو طے کیا جاتا ہے' اسی طرح سے ہمیں کرنا چاہیے۔ یہ مذہب ٹھیک ہے کہ صرف نمازیں پڑھ لینی چاہئیں' روزے رکھ لینے چاہئیں۔ یہ خیال آپ کی طرف بھی آ رہا ہے۔

ملتِ اسلامیہ سیکولر انداز کے تصورات سے کیونکر بچ سکتی ہے؟

عزیزانِ من! آپ تو اس خیال سے بچ سکتے تھے اس لیے کہ دیگر اہلِ مذاہب کے پاس دین کے اپنے اصول کہیں محفوظ نہیں تھے' آپ کے ہاں وہ محفوظ طور پر قرآن کی دفتین کے اندر موجود ہیں۔ آپ کو وہ وقت نہیں پیش آنی چاہیے لیکن آپ کے ہاں کا مذہب پرست طبقہ اس طرف جانے کے لیے آپ کو مجبور کر دے گا کہ آپ اس کو یک سر چھوڑ ہی دیں وہ قرآن کی طرف آنے کی اجازت نہیں دے گا اور یہ محض اس لیے کہ اس سے ان کی اجارہ داری ختم ہو جاتی ہے لیکن اگر مسلمان نے اسلام پر جینا ہے تو اسے یہ کرنا ہوگا کہ یہ جتنی چیزیں خارج از قرآن آپ کے ہاں مذہب کا جز بن چکی ہیں' کھڑے ہو کر قرآن کی روشنی میں اس کو پرکھنا ہوگا۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ جو ان کے مطابق ہیں' ان کو رکھ کر باقی کو چھوڑ دیجیے۔ جو مطابق بھی ہیں' پھر ان کو دیکھو کہ آج کے حالات میں اگر ممکن العمل ہیں' تو رکھ لیا جائے' نہیں ہیں تو ان کو بھی چھوڑ کر ان کی جگہ دوسری چیز تجویز کر لی جائے۔ برادرانِ عزیز! یہ جو جزئیات اور فروعات ہیں' یہ غیر متبدل دین نہیں ہیں۔ غیر متبدل قرآن کے اصول واقدار واحکام ہیں۔ خارج از قرآن کوئی دوسری چیز دین نہیں ہے۔ یہ کیجیے گا قران پہ آپ آ جائیں گے اور پھر آپ دیکھیے گا کس طرح سے آپ ارتقائی منازل طے کر کے آگے چلے جائیں گے۔ آپ نے یہ نہ کیا تو پھر کچھ عرصے کے بعد وہی چیز جو مغرب نے اختیار کی ہے کہ دنیا کے معاملات سیکولر انداز کے اور مذہب چار دیواری مسجد کے اندر' یہاں تک آپ رہ جائیں گے۔ چند

دنوں کے بعد وہ قصہ بھی ختم ہو جائے گا' پھر آپ جائیں گے جہاں کمیونزم آئی ہے کہ مسجد اور گرجا بھی انہوں نے ختم کیا۔ اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ پھر کہا کہ یاد رکھو! یہ لوگ یہ کریں گے' نظر آتا ہے کہ اس دور میں بھی ان لوگوں کی جو اہلِ کتاب تھے' یہ کوشش تھی کہ اس طرح سے مسلمانوں کو ادھر لیجائیں۔ اس لیے کہا کہ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (2:109) ان کو درگزر کر جاؤ' ان سے آگے بڑھ جاؤ۔ ان خار دار جھاڑیوں میں اپنے دامن کو مت الجھاؤ' تمہارا وقت اور توانائیاں ضائع ہو جائیں گی دوسری جگہ کہا ہے کہ واھجرھم ھجرا جمیلاً (2:110) ان کا ساتھ حسن کارانہ انداز سے چھوڑ دو۔ اور جیسا میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ قرآن کا انداز یہ ہے' وہ کہتا یہ ہے کہ کسی کے ساتھ واسطہ یا رابطہ حسن کارانہ انداز سے قائم کرنا چاہیے' وہ کہتا ہے اگر کسی کا ساتھ چھوڑو تو وہ بھی حسن کارانہ انداز سے چھوڑو۔ ان کی بات چھوڑ دو اور چھوڑ کر تم آ بڑھ جاؤ' تم یہاں الجھ کر نہ رہ جانا اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (2:109) خدا نے ہر چیز کے لیے قرآن کے اندر پیمانے مقرر کر دیئے ہوئے ہیں' بس وہ پیمانے اپنے سامنے رکھو اور اس کے لیے یہ ہے کہ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (2:110) صلوٰۃ کا نظام قائم کرو' انسانیت کو نشو و نما دینے کے لیے طریقے اختیار کرو۔ یاد رکھو! اس نظام کے قائم کرنے کے ابتدائی ایام میں یوں نظر آئے گا کہ جو کچھ ہم اس کے لیے دیئے جا رہے ہیں' وہ تو صاحب! ہم دیئے ہی چلے جا رہے ہیں' اس کا تو ہمیں لوٹ کر کچھ نہیں ملتا ہے۔ ابتدائی دور کے اندر بظاہر نظر آئے گا کہ یہ سب کچھ چلا جا رہا ہے۔ کہا ہے کہ جو کچھ بھی تم یہ دیئے جا رہے ہو تم دیکھو گے کہ کس حسن کارانہ انداز سے وہ واپس' لوٹ کر آتا ہے' دس دس گنا ہو کر۔ چند دن ذرا انتظار کر لو' توقف کر لو۔ پھر اس کے بعد جب یہ کھیتی پکے گی' ایک ایک دانے سے سات سات سو دانے' قرآن کی مثال کی رو سے' واپس آئیں گے۔ پاکستان کے قیام کے ابتدائی دور میں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے Pioneers (السابقون الاولون) کے ساتھ ہمیشہ یہی کچھ ہوتا ہے لیکن کہا ہے کہ چند دن کے بعد پھر تم دیکھو گے کہ کتنا کچھ آتا ہے اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (2:110) وہ ایک ایک چیز کو دیکھ رہا ہے' اس کی نگاہ ہے اس کے اوپر' اس کی نگاہوں سے کوئی چیز اوجھل نہیں ہو گئی۔

اہلِ مذاہب نے اپنی مختلف قسم کی جزئیات کو دین بنالیا اور پھر جنت کی خود فریبی میں مبتلا ہو گئے

ان اہلِ مذاہب کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ان جزئیات کو دین بنایا اور اس کے لیے کہا ہے کہ وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (2:11) یہ کہا کہ صاحب! جنت میں تو وہی داخل ہو سکیں گے جو یہود و نصاریٰ ہیں۔ یہودیوں نے کہا جو یہودیوں کے گروہ میں شامل ہو جائیں گے' نصاریٰ نے کہا جو نصاریٰ کے گروہ میں شامل ہو جائیں گے' جنت میں تو وہ جائیں گے۔ وہی

ان کے ہاں کے عقائد بنے، وہی ان کے ہاں کی یہ جزئیات و تفاصیل تھیں، جو دین نہیں تھیں۔ کہا کہ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ (2:11) یہ ان لوگوں کی کتنی بڑی خوش فہمی ہے جو اپنے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ جنت کے ہم ہی حقدار ہیں۔

عزیزانِ من! سوچیے کسی قوم کا محض یہ سمجھ لینا کہ ہم چونکہ اس گھرانے میں پیدا ہو گئے، یہودی بچہ یہودیوں کے ہاں پیدا ہوا، عیسائی بچہ عیسائیوں کے ہاں پیدا ہوا، اس لیے جنت کا حق دار ہے۔ بعینہٖ وہی کیفیت آج ہماری ہے۔ مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے، جنت کے ہم ہی حق دار ہیں۔ کردار و افعال ہزار غلط چلے جائیں، آخر میں خود فریبی کے لیے وہ ایک عقیدہ شفاعت کا بنا لیا۔ حساب کتاب کی رو سے جہنم میں، مگر نبی اکرم ﷺ سارے دوزخ والوں کو نکال کر جنت میں لے جائیں گے۔ اپنی امت کو لے کر جائیں گے، کسی یہودی اور نصرانی کو نہیں۔ تو اب وہی ہو گیا کہ کوئی جنت میں نہیں جا سکے گا، بجز اس کے جو مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گیا ہو۔ قرآن جو ان کے خلاف تحریر کرتا ہے، وہ ہمارے ہاں کا عقیدہ بنا ہوا ہے۔ کہا ہے کہ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ (2:11) خوش فہمیاں ہیں اپنی۔ ٹھیک ہے، مبتلا رکھو ان کو اس کے اندر قُلْ (2:111) عزیزانِ من! کیا بات ہے! فیصلہ اب آپ دیکھیے کس بات پہ ہو رہا ہے۔ فوراً یہ نہیں کہہ دیا کہ وہ یہ نہیں قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:11) کہو کہ اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو دلیل لاؤ، Rationally Prove کرو کہ کیا چیز ہے؟ کہ ایک بچہ عیسائی کے گھر میں پیدا ہوتا ہے، تم کہتے ہو کہ وہ جنت میں چلا جائے گا، اس کے لیے دلیل لاؤ۔ اور برادرانِ عزیز! وہ ہم سے بھی دلیل مانگتا ہے کہ اس کے لیے دلیل لاؤ کہ تم اپنی کردار و افعال اور اعمال نامے کی رو سے تو جہنم کے مستحق ہو گے لیکن اس کے بعد محض اس لیے کہ تم نے فلاں رسول کی طرف اپنی نسبت کر لی، تم جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ اس کے لیے دلیل لاؤ۔ آپ دیکھیں گے کہ دلیل کے مقام کے اوپر یہ عقیدہ فیل ہو جائے گا۔ بات جذبات پہ چلے گی، مذہب جذبات پہ چلتا ہے۔

حصولِ جنت کے لیے دین کے پیمانے مذہب سے مختلف ہوتے ہیں

عزیزانِ من! دین سر تا پا دلیل پہ چلتا ہے۔ کہا ہے کہ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:11)۔ صداقت کا معیار دلیل قرار دینا، قرآن ہی یہ کہہ سکتا ہے۔ آگے بڑھیے، عجیب چیز ہے۔ پہلے بھی ایک دفعہ آئی ہے اور یہاں پھر آئی ہے۔ کہتا ہے کہ بَلٰى (2:112) قطعاً غلط ہے جو کچھ یہ کہتے ہیں، سن لو کہ حقیقت کیا ہے؟ یہ کہ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:112) سن رکھو، اصول سن رکھو! جس نے بھی اپنے آپ کو خدا کے قوانین کے سامنے جھکا دیا اور پھر حسن کارانہ انداز سے پوری زندگی بسر کی، یہ ہے وہ کہ جس کا اجر اس کے خدا کے ہاں ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ کہ جن کے اوپر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا جو ایسا نہیں کرتا ہے، وہ اپنے دل میں فریب مت دے لے کہ میں چونکہ منسوب کر رہا ہوں، اپنے آپ کو

فلاں امت کے ساتھ' فلاں نبی کے ساتھ' اس لیے میں تو جنت میں چلا جاؤں گا' دوسرا نہیں جائے گا۔ کہا کہ یہ ہے اصول جنت میں جانے کا یا نہ جانے کا۔

میں نے جیسا کہ عرض کیا ہے اس سے پیشتر بھی اسی سورۃ میں ذرا پہلے یہ چیز آئی ہے۔ دیکھیے قرآن کا انداز کتنا خوبصورت ہوتا ہے! یہاں یہ چیز تھی کہ وہ کہتے ہیں کہ جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا' بجز ان کے۔ ان سے کہا کہ نہیں! جنت میں داخل ہونے کے لیے یہ چیز ضروری ہے۔ وہاں یہ تھا کہ وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (2:80) یہ کہتے ہیں کہ ہم دوزخ میں بھی یونہی چند دنوں کے لیے جائیں گے' جب تک وہ ہماری شفاعت کرانے والا نہیں آ جائے گا۔ یہاں یہ چیز کہی۔ اس کے بعد کہا کہ بَلٰى (2:81) یہاں بھی وہی چیز ہے کہ نہیں' یہ بات نہیں ہے۔ سن لو کہ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (2:81) جس سے بھی یہ لغزش سرزد ہوئی اور ان لغزشوں نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا' یہ ہیں جو جہنم میں جانے والے ہوں گے۔ یہاں جہنم میں جانے والوں کے متعلق یہی اصول ہے' وہاں جنت میں جانے والوں کے متعلق بھی یہی اصول ''اپنے اعمال و کردار اور کیریکٹر'' کا ہے۔ عزیزانِ من! اس میں جہنم میں خطا کوشیاں ہیں' خطا کاریاں ہیں' کسی گھرانے میں پیدا ہو' کسی رسول کی طرف اپنی نسبت کیوں نہ کرے۔ وہ جو اعمال و کردار کے اس پیمانے پہ پورے اترتے ہیں' اہلِ جنت ہیں۔ کہا کہ خوش فہمی میں مبتلا نہ رہو۔

نبی اکرم ﷺ کے مقابل یہود و نصاریٰ کا باہمی اتحاد لیکن آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت بھی

آگے ایک عجیب چیز آئی۔ کہا کہ یہ تو ان کا معاملہ ہے' جب تمہارے ساتھ باتیں کرتے ہیں۔ آپس میں ان کی کیا کیفیت ہے؟ تمہارے مقابل میں تو ایک متحدہ محاذ بنا کر آ جاتے ہیں اور اپنی یہ حالت ہے کہ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ (2:113) یہودی نصاریٰ سے کہتے ہیں کہ ان کا مذہب کچھ نہیں ہے' نصاریٰ یہودیوں سے کہتے ہیں کہ صاحب! یہ کسی معاملے کے اوپر کچھ بھی نہیں ہے' ان کا مذہب کچھ نہیں ہے۔ دونوں آپس میں ایک دوسرے سے یہ کہتے ہیں اور اگلی چیز یہ ہے کہ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (2:113) اور دونوں مدعی اس کے ہیں کہ خدا کی طرف سے دی ہوئی کتاب کا اتباع کرتے ہیں۔ وہ بھی اس کا دعویٰ کر رہے ہیں اور وہ بھی اس کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ پوری آیت سنیے تو پھر اپنی بات کریں گے۔ کہا کہ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ (2:113)۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ اس قسم کے لوگ' اس قسم کی ذہنیت رکھنے والا مذہب پرست طبقہ' ہمیشہ سے یہی کچھ کرتا رہا ہے' یہی کچھ کرتا چلا جائے گا۔ ذہنیت یہ ہو جاتی ہے۔

سنیے اب' برادرانِ عزیز! روز آپ کے ہاں کے اہلِ حدیث کے اور اہلِ فقہ کے مناظرے ہیں۔ روز دیوبندیوں کے اور بریلویوں

کے مناظرے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ کافر، وہ کہتے ہیں کہ یہ کافر۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یہودی کہتے ہیں نصاریٰ کافر ہیں، نصاریٰ کہتے ہیں یہودی کافر ہیں۔ یہاں ان کی یہی کیفیت آپ کے ہاں کی ہے۔ ہر فرقہ دوسرے فرقے کے متعلق کہہ رہا ہے کہ یہ کافر ہے اور اگلی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ وَّ هُمۡ یَتۡلُوۡنَ الۡکِتٰبَ (2:113) یہ سارے کے سارے الکتاب کی تلاوت کرتے ہیں، اس کو Follow (اتباع) کرنے کے دعوے کر رہے ہیں۔ عزیزانِ من! کیا ہم اسی مقام پہ کھڑے ہیں یا نہیں؟ آج الکتاب کی پیروی کا دعویٰ بھی ہے اور آپس میں ایک فرقہ دوسرے فرقے کی تکفیر اور ارتداد کے لیے دعوے کرتا چلا جا رہا ہے۔ یہ وہی ہے جہاں باقی مذاہب تھے۔ یہاں قرآن نے متعدد مقامات پہ کہا ہے کہ فَاللّٰهُ یَحۡکُمُ بَیۡنَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡهِ یَخۡتَلِفُوۡنَ (2:113) اللہ ان کے ان اختلافی معاملات کا فیصلہ قیامت میں کرے گا تو چونکہ قیامت کا صحیح تصور ہمارے سامنے نہیں، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد جب وہ زندگی آئے گی، اس میں اختلافات کے فیصلے ہو جائیں گے۔ قیامت برحق ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی پہ ہمارا ایمان ہے لیکن سوچیے کہ اگر اس کے یہی معنی لیے جائیں تو وہاں جا کر ان اختلافات کا فیصلہ کرنے سے حاصل کیا ہوگا؟ وہاں تو پھر ہو نہیں سکتا کہ آپ غلط طریقے کو چھوڑ کر صحیح طریقہ اختیار کر لیں، وہاں تو یہ بات ہی ختم ہو گئی ہوگی۔ وہاں جا کر یہ بتانا کہ نہیں! تم غلط کہتے تھے، تم صحیح تھے، کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ وہ تو اس وقت بتانا چاہیے، جب ابھی ان کے پاس مہلت کا وقت ہے کہ غلط راستے کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کر لیں۔ اس لیے قرآن کی رو سے یہ قیامت اور الساعت اور اس قسم کے الفاظ ہیں، یہ مرنے کے بعد ہی کی زندگی سے متعلق نہیں ہیں، اس زندگی کے اندر بھی جب انسانیت خدا کے دیئے ہوئے دین کی اقدار کو لے کر کھڑی ہو جاتی ہے، وہ اس دور کی قیامت ہوتی ہے۔ قیامت کے معنی ہی ہیں ''کھڑے ہو جانا'، اور انقلابی طور پر کھڑے ہو جانا۔'' یہ اس کی آخر کی ''ۃ'' یہ کہتی ہے۔ یہ دور وہ آتا ہے جس میں دین کے علمبردار خدا کے دیئے ہوئے، اصولوں کے جھنڈے لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اس وقت جو یہ اختلافات ہیں، ان کے فیصلے ہو جاتے ہیں، ورنہ اگر مذہب کی سطح پر رہو گے تو قیامت تک یہ فیصلہ ہی نہیں ہو سکے گا۔ آج تک کبھی کسی مناظرے یا مباحثے میں فیصلہ کن بات کی ہی نہیں ہے، بلکہ ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ جو چیز ہے کہ جسے وہ دور کہا گیا کہ جس میں خالص خدا کے قوانین کی اطاعت ہوگی اور اس جھنڈے کو لے کر اٹھیں گے، یہ وہ چیز ہے، جسے قرآن نے سجدہ سے تعبیر کیا ہے۔

سجدہ کا عملی مفہوم: قرآنی ضابطہ حیات کے مطابق کسی معاشرے کا قیام ہے

سجدہ خدا کے قانون کے سامنے جھکنا ہے اور وہ نظام، وہ مراکز، جہاں سے یہ چیزیں ہوتی ہیں، جہاں سے یہ چیزیں نکلیں گی، ان کو قرآن نے مسجد کہا ہے۔ وہ مراکز مساجد کے ہی ہیں، جہاں قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے کے لیے عملی طور پر آپ چیزوں کو طے کریں

گے۔اسی لیے آپ کو معلوم ہے سورۃ شوریٰ میں کہا گیا ہے کہ **وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ** (42:38)صلوٰۃ کا قیام کرواور اپنے معاملات باہمی مشورے سے طے کرو۔آپ دیکھتے ہیں کہ دونوں کے اندر ربط کتنا ہے۔یہ بات میں وہاں بتاؤں گا' آگے مساجد کا ذکر آتا ہے۔میں نے یہاں اس لیے کہا ہے کہ یہ جو کہا ہے کہ اختلافی معاملات یوں طے ہوں گے' آپ کے ہاں بھی کم ازکم یہ جو نماز کی موجودہ شکل ہے' جو حقیقت میں اس نظام کی ایک عملی چیز ہے' ایک وہ چیز جس میں روح تو باقی نہیں رہی' بہر حال کچھ پیکر باقی ہے' کم ازکم ایک مسجد میں ایک امام کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کے جو اختلافات ہیں' وہ تو ختم ہو گئے ہوتے ہیں۔محض اس پیکر کے اندر بھی ہمارے ہاں یہ چیز موجود ہے۔یہ الگ بات ہے کہ وہ حنفی اپنے ہاں اسے الگ طور پہ پڑھتے ہیں اور اہلِ حدیث الگ پڑھتے ہیں لیکن اگر اہلِ حدیث کی جماعت وہاں کھڑی ہوتی ہے تو اس جماعت میں تو اختلاف نہیں ہوتا۔

قرآن حکیم نے مساجد کو امت واحدہ کے تصور سے دور رکھنے والوں کو ظالم کہا ہے

قرآن تو پورے مومنوں کی ایک جماعت بناتا تھا' وہ آج بھی پورے انسانوں کی ایک امت بناتا ہے۔اس اعتبار سے بھی یہ مساجد کو دیکھیے تو اس میں اگر آپ ایک خدا کے سامنے جھکتے ہیں تو پھر تو اختلاف نہیں رہتا۔سنیے اگلی آیت کیا ہے؟ کہا ہے کہ **وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنۡ یُّذۡکَرَ فِیۡھَا اسۡمُہٗ وَ سَعٰی فِیۡ خَرَابِھَا اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَھُمۡ اَنۡ یَّدۡخُلُوۡھَآ اِلَّا خَآئِفِیۡنَ** (2:114)اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو خدا کی مساجد کے راستے میں حائل ہو جائیں کہ اس میں خدا کا قانون سامنے نہ آنے پائے۔کہا ہے کہ ان سے زیادہ ظالم اور کون ہو سکتا ہے؟ کوئی نہیں۔

توحید کے عملی پروگرام کے پیش نظر ہر مسجد کے ماتھے پر صرف مسجد امت واحدہ کندہ کر دیا جائے

عزیزانِ من! دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ **وَّاَنَّ الۡمَسٰجِدَ لِلّٰہِ** (72:18) یاد رکھو! مساجد صرف خدا کے لیے ہونی چاہئیں **فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا** (72:18)اس کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔یہ قرآن ہے' برادرانِ عزیز! غور کیجیے' اس کی یہ معنویت تو آگے چل کر آئے گی کہا ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔مسجد میں داخل ہوئے تو سامنے محراب کے اوپر جلی الفاظ میں لکھا ہوا ہوتا ہے''یا شیخ عبدالقادر جیلانی! دے واسطے اللہ دے''(اے شیخ عبدالقادر جیلانی! کوئی چیز خدا کے لیے دیدو)۔وہ کہتا ہے کہ **لَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا** (72:18)اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔مساجد کے متعلق اس نے کہا ہے کہ انہیں تو اس چیز کے شرک سے پاک رکھو' اس کے ساتھ کسی کو نہ بلاؤ۔ہر فرقے کی مسجد کے اندر آپ دیکھیں گے کہ کوئی نہ کوئی اس قسم کی چیز ہے۔کہیں شریعت کے خلاف آپ نے اپنا اعلان کرنا ہے' تو ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وحیدرؓ سامنے لکھا ہوا ہے۔اس کے نیچے جا کر آپ نے بریلویت اختیار کرنی ہے تو یا شیخ عبدالقادر جیلانی لکھا ہوا ہے۔روز آپ کی سر پھٹول ہوتی ہے' ایک فرقہ یا رسول اللہ ﷺ کہتا ہے' دوسرا فرقہ مسجد میں اس کی گردن مار دیتا ہے۔اب

تو اذانوں کے ساتھ ان چیزوں کے اضافے ہو گئے ہیں۔ اس نے جو کہا تھا کہ **وَّاَنَّ الۡمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا** (72:18) مساجد قوانینِ خداوندی کے لیے ہیں۔ اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو، صرف اسی کے قوانین کی پابندی کرو۔ خدا کے ساتھ کسی اور کو پکارنا کیا چیز ہے؟

عزیزانِ من! دین کی بنیاد توحید ہے کہ ایک خدا کے سامنے جھکنا، اس کے سوا کسی کو صاحبِ اقتدار نہ سمجھنا، یہ ہے لا الٰہ الا اللہ بس یہ ہے دین اور مساجد تو اس توحید کے لیے مراکز تھیں۔ یہاں یہ بات کہی ہے اور دوسری جگہ اس کی وضاحت کی کہ **مَا كَانَ لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ اَنۡ يَّعۡمُرُوۡا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيۡنَ عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ بِالۡكُفۡرِ** (9:17) مشرک کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ مساجد کی آبادکاری کرے۔ یہاں تو صرف ایک خدا کے سامنے جو جھکنے والا ہے، وہ مسجد کی آبادکاری کر سکتا ہے، مشرک کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ برادرانِ عزیز! شرک صرف بتوں کے سامنے جھکنے کا تو نام نہیں ہے۔ خدا کے ساتھ کسی اور کو ان صفات کے اندر شامل کر دینا جو صرف خدا کے لیے مختص ہیں، شرک ہے۔ خدا کے علاوہ کسی اور کے خودساختہ قوانین کی اطاعت اور فرماں پذیری، محکومیت اختیار کرنا، شرک ہے۔ اقتدار صرف اُسی کا ہے، قانون صرف قرآن کا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مشرک کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

مسجدِ نبوی ﷺ کے مقابل مسجدِ ضرار کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد

برادرانِ عزیز! ذرا اور آگے چلیے، سنیے اور کانپ جایئے۔ مدینہ میں جو آپ کے ہاں کے دین کا ایک مرکز تھا، جسے مسجدِ نبوی ﷺ کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ کسی نے ایک اور مسجد بنا لی تھی۔ یہ بت کدہ نہیں بنایا تھا، مسجد بنائی تھی۔ اس مسجد کے متعلق آپ سوچیے، خدا کی طرف سے قرآن میں ایک حکم آیا۔ رسول اللہ ﷺ کو حکم یہ آیا کہ **لَا تَقُمۡ فِيۡهِ اَبَدًا** (9:108) اس مسجد میں قدم نہ دھرنا، یاد رکھو! ارے مسجد ہے اور اس کے متعلق یہ چیز کہی جا رہی ہے کہ اس کے اندر جا کر قطعاً کھڑے نہ ہو جانا۔ کیا ہوا؟ کیا اتنی بڑی بنیادی خرابی ہو گئی اس مسجد کے اندر کہ یہ کچھ قرآن کریم کو، خدا کو اتنی سخت ممانعت کرنا پڑی؟ عزیزانِ من! سنیے! اس کے بعد پیٹیے سر اپنا کہ اس مسجد میں خرابی کیا تھی؟ کہا کہ **وَالَّذِيۡنَ اتَّخَذُوۡا مَسۡجِدًا ضِرَارًا وَّكُفۡرًا** (9:107) انہوں نے مسجد بنائی ہے، ہے تو مسجد لیکن دین کو سخت نقصان پہنچانے والی ہے، وہ اسلام کی نشانی نہیں ہے، کفر کی نشانی ہے۔ ارے کیا کیا اس مسجد نے؟ عزیزانِ من! ہمہ تن توجہ ہو کر بات سنیے گا، دو الفاظ ہیں: **وَتَفۡرِيۡقًا بَيۡنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ** (2:109) یہ مسلمانوں کو فرقوں میں بانٹ دے گی۔ مومنین کے اندر یہ مسجد تفریق پیدا کر دے گی۔ سنتے ہیں، آپ اس مسجد کے متعلق **ضِرَارًا وَّكُفۡرًا** (9:107) کہا ہے کہ مسلمانوں میں تفریق پیدا کر دے گی۔ کہا کہ **اِرۡصَادًا لِّمَنۡ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ مِنۡ قَبۡلُ** (2:107) یہ مسجد نہیں، یہ تو وہ پناہ گاہ ہے جس کے پیچھے بیٹھ کر خدا اور رسول کے دشمن دین کے قلعے کو مسمار کر دیں گے۔ اس میں خرابی یہ ہے کہ یہ **تَفۡرِيۡقًا بَيۡنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ** (2:109) ہے۔ یہ مومنین میں تفریق پیدا کر دے گی۔

مسلمانوں میں تخریب کاری کی بنیادی وجہ مساجد کا باہمی اختلاف اور تضاد ہے

برادرانِ عزیز! سنتے ہیں باز بخویش نگر۔ مسجد کے باہر بڑے فخر سے لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ حنفیوں کی مسجد ہے' اس میں اہلِ حدیث نہیں آ سکتے' یہ اہلِ حدیث کی مسجد ہے' اس میں بدعتی نہیں آ سکتا۔ یہ کچھ جلی حروف میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں کے پھر یہ مسائل ہیں کہ اگر کسی بدعتی کی مسجد میں کوئی اہلِ حدیث جا کر نماز پڑھ لے' تو کم از کم اس فرش کو تین دفعہ دھویا جائے اور زیادہ پاکیزگی کا تقاضا یہ ہے کہ فرش کو ہی اکھیڑ دیا جائے۔ یہ **تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ** (9:107) یہ قرآن نے کہا ہے کہ یہ مسجد نہیں ہے' یہ وہ مقام ہے جس کے اندر بیٹھ کر' پناہ لے کر' دین کے دشمن دین کے قلعے کو مسمار کریں گے کیونکہ اس مسجد سے مسلمانوں میں تفریق پیدا ہو جائے گی۔ یہاں یہ کہا ہے کہ لوگ جو مساجد کی آبادی میں تخریب پیدا کرتے ہیں' عزیزانِ من! اس سے بڑی تخریب اور کیا ہوگی؟ آج آپ کے ہاں مختلف فرقوں کے لیے مختلف مساجد ہیں ''چاہ لاہ لین دیوو اینہاں نوں اپنا اپنا[1]''۔ نتیجہ اس کا کیا ہوگا؟ یہ کہ **لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ** (2:114) اس دنیا کے اندر ذلت و خواری اور قیامت میں عذابِ عظیم۔

عزیزانِ من! اس دنیا کی ذلت و خواری تو صورت ہبیں عالم میرس اور ظاہر ہے کہ **مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى** (7:72) جو کوئی اس دنیا میں اندھا ہے' وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا اور راستہ سے ایک دم بھٹکا ہوا۔ اس کی عاقبت کیسے سنور سکتی ہے؟ قرآن نے اگلی بات اور کہہ دی ہے۔ مسجد کی وحدانیت ہے' ایک مرکز ہے' پوری امت ایک جماعت ہے' اس میں تفرقہ تو شرک ہے۔ آپ سورۃ الروم کی آیت 31,32 کو سامنے رکھیے۔ کہا ہے کہ **وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (30:31) اے جماعتِ مومنین! تم کہیں مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی **مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا** (30:32) جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیے' ان میں سے نہ ہو جانا' وہ مشرکین ہیں' پھر اس کے بعد کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ **كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** (30:32) ہر فرقہ اس بات میں مگن ہوتا ہے کہ ہم حق پر ہیں' باقی سارے جتنے بھی ہیں' وہ جہنم میں جانے والے ہیں۔ کہا ہے کہ کہیں مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔

کشادگی راہ' دین کی طرف سے پیش کردہ آئیڈیالوجی پر عمل پیرا ہو کر اپنا مال دوسروں کو دینے میں ہے

عزیزانِ من! فرقوں میں بٹ جانا تو یہ ہے لیکن ایک مسجد کے اندر جا کر جو کیفیت اس نے کہی ہے وہ دیکھیے گا کہ وہاں جا کر یہ رسم ادا

---

[1] انہیں اپنا اپنا شوق پورا کر لینے دو۔

کر لینا ''منہ طرف قبلے شریف کے اور پاؤں میں یہ اتنا فاصلہ' ہاتھوں میں اتنا فاصلہ' یہ ساری چیزیں وہ سمجھ لو کہ یہی ہے حقیقت میں جو

صلوٰۃ ہے، یہی ہے دین جس کے اوپر پابندی ہے، قرآن حکیم نے کہا ہے کہ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177) اسی کو تم نیکی اور کشادگی کی راہ نہ سمجھ لینا کہ ہم نے اپنا منہ مشرق کی طرف کرلیا یا مغرب کی طرف کرلیا۔ یہ کشادگی کی راہ نہیں ہے۔ کشادگی کی راہ یہ ہے کہ دین کی صحیح آئیڈیالوجی کے اوپر ایمان لانے کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ وَ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی (2:177) مال کی کشش و جاذبیت کے باوجود تم دوسروں کے لیے کتنا دیتے ہو۔ یہ یہی نہیں ہے کہ مشرق کی طرف منہ کرلیا یا مغرب کی طرف منہ کرلیا یہ تو اپنے مال کو دوسروں کو دینا ہے اور یہاں یہی چیز کہی ہے۔

آج نماز کی ادائیگی کے سلسلہ میں صرف اس کی ظاہر پرستی کو ہی ضروری خیال کیا جاتا ہے

برادرانِ عزیز! میں اب پھر اسی آیت پہ آ گیا ہوں کہ وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ (2:115) مشرق اور مغرب سب خدا کے لیے ہیں، فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (2:115) جدھر بھی تم رخ کرو گے خدا سامنے ہوگا۔ یہ عظیم حقیقتیں ہیں۔ کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (2:115) اللہ وسعتوں والا، علم والا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جماعتی زندگی کے اندر بعض چیزیں ڈسپلن کی ہوتی ہیں، یہ بھی بڑی ضروری ہیں۔ یہ جو یک نگہی کے لیے ایک طرف رخ کرنے کی چیز ہے، یہ فارم کے لیے بھی ضروری چیز ہے لیکن اس فارم یعنی اس ظاہرہ رسم کو ہی Spirit (روح) سمجھ لینا، تو یہاں تباہی لاتا ہے۔ مذہب میں سارا زور اس ظواہر پرستی پہ دیا جاتا ہے۔ جسے آپ نماز کی شرائط کہتے ہیں، ان کو آپ دیکھ لیں، یہ ساری اتنی سی چیزیں ہوتی ہیں کہ ہاتھ کہاں بندھتا ہے؟ اٹھتا کیسے ہے؟ رکوع میں جاتے ہوئے اللہ اکبر کہتے ہوئے، ہاتھ اٹھتا ہے یا نہیں اٹھاتا؟ ہزار برس سے اتنے کے اوپر ہی سر پھٹول ہو رہی ہے کہ یہاں باندھتے ہو؟ یہاں باندھتے ہو؟ کھلا رکھتے ہو؟ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ جب جماعت کے اندر کہیں نظم و ضبط پیدا کیا جاتا ہے تو وہاں یہ جو چیزیں ہیں، ان کی پابندی بھی ضروری ہو جاتی ہے لیکن وہ نظم و ضبط کے لیے ہی صرف ہوتا ہے۔ اس کی جو اصل غایت، غرض، حکمت اور روح ہے، نگاہ اس کے اوپر ہونی چاہیے۔ اسی لیے کہہ دیا کہ تم اس فریب میں نہ آ جاؤ کہ ہم نے چونکہ منہ طرف قبلہ شریف کے، پیچھے اس امام کے، اللہ اکبر، کہہ لیا تو نماز ہو گئی۔

رسولوں یا بزرگوں کے مقام کو پیش کرتے وقت غلو سے کام لینا تباہی کا موجب ہے

قرآن کریم کہتا ہے کہ وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (2:115)۔ یہ بڑی عظیم آیت ہے صاحب! اللہ کو پانا چاہتے ہو، تو جدھر رخ کرو گے، وہ مل جائے گا۔ باقی رہا یہ کہ اپنے میں سے جتنے تمہارے رسوم ہیں، وہ ادا کرنا اور یہ جو بڑے ہیں، ان میں غلو پیدا کر کے انہیں وہ مقام عطا کر دینا جو ان کا نہیں ہے، یہ چیز بھی بڑی غلط ہے۔ قرآنِ کریم نے جو ان کے متعلق کہا تھا، کہ اپنے دین میں غلو مت کرو، بڑی عظیم حقیقت ہے۔

عزیزانِ من! یہ جتنے بزرگ ہوتے ہیں' جن کی ہم عزت کرتے ہیں' جن کی عظمت ہمارے دل میں ہوتی ہے' ان کے خلاف کبھی نفرت نہیں پیدا ہوتی' ان کو ان کے مقام سے جو ہلایا جاتا ہے' تو غلو کی وجہ سے ہلایا جاتا ہے اور انہیں ہمیشہ اس مقام سے اونچا رکھا جاتا ہے۔ کسی اہلِ مذہب نے بھی اپنے نبی کو یا اپنے بانیٔ مذہب کو گالی نہیں دی ہے' معاذ اللہ اس سے نفرت نہیں سکھائی ہے۔ ہر اہلِ مذہب نے اس کو اس مقام سے اٹھا کر اونچا رکھا ہے۔ قرآن نے اس سے روکا تھا کہ یاد رکھو! مذہب میں غلو ہے' جو تباہ کیا کرتا ہے۔ گالی تو کوئی بھی نہیں دیا کرتا۔ خدا کو خدا کے مقام پہ رکھو' رسول کو رسول کے مقام پہ رکھو' آئمہ کو آئمہ کے مقام پہ رکھو۔ جونہی آپ نے مقام کو بڑھانا شروع کیا' بس یہ دین کا غلو ہو گیا۔ یہ وہی بات ہو گئی کہ جس مقام پہ انہیں رکھنا چاہیے' اس مقام پہ آپ نے انہیں نہیں رکھا' یہ بھی کفر ہے۔

خدا تعالیٰ کی ذات کا تصور فاطر اور بدیع السموات والارض کا ہے' اس کے ہاں تولید نہیں ہے

برادرانِ عزیز! اسی لیے کہا کہ **وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ** (2:116)۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کے ہاں اولاد بھی ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ اپنے نبی کو نبی کہو' خدا کا رسول کہو' عبد کہو۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ نہیں! اس کی اولاد بھی ہے۔ کہا ہے کہ اولاد کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ بڑھاپے میں کام آئے۔ اللہ تعالیٰ کی تو کیفیت یہ ہے کہ **لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (2:116) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے اس کے پروگرام کی تکمیل میں لگی ہوئی ہے اور **كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ** (2:116) ہر ایک اپنی اپنی صلاحیتوں کو اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے صرف کیے چلا جا رہا ہے۔ اسے کیا ضرورت ہے کہ اس کے ہاں ایک بیٹا بھی پیدا ہونا چاہیے اور پھر وہ خدا عظیم چیز ہے' **بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (2:117) ہے۔ عزیزانِ من! عربی زبان کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ انگریزی زبان میں آپ دیکھیے تو Creation (پیدائش) کا ایک لفظ آپ کو ملتا ہے' ہمارے ہاں تخلیق کا ترجمہ بھی Creation ہی کیا جائے گا' مگر عربی زبان میں فطر اور بدع دو الفاظ ہیں' ان کا بھی انگریزی ترجمہ Creation کیا جائے گا۔ کسی ترجمے میں دیکھیے' وہاں کوئی دوسرا لفظ ہے نہیں۔ یہ قرآن ہے جس نے **بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ** (39:6) **فاطر السَّمٰوٰتِ** (2:117) کہا ہے۔ ان کے معنی ہوتے ہیں ''کسی شے کو پہلی دفعہ' عدم سے وجود میں لانا' جب پہلے اس کا کوئی وجود نہ ہو تو اسے وجود میں لے آنا'' اور تخلیق ہوتا ہے کہ بہت سی چیزیں موجود ہوں' ان میں ایک خاص ترکیب اور Proportion (تناسب) پیدا کر کے ایک نئی چیز پیدا کرنا۔ تخلیق کے لیے پہلے میٹریل (مواد) کی ضرورت ہوتی ہے' بدیع یا فاطر ہونے کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بیٹا پیدا کرنے کے لیے پہلے بیٹا پیدا کرنے کے Instrument (اوزار) کی ضرورت ہوتی ہے' اس کے لیے میٹریل (مواد) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے خدا کے ہاں تولید نہیں ہے' وہاں Reproduction (تولید) نہیں ہے' خدا کے ہاں پہلی چیز تو **بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ**

الْاَرْضِ۔فاطر السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہے۔جو Non Existence (عدم) کو Existence (وجود) بنا سکتا ہے' پہلی بار کسی شے کو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے' وہ ایسی قوتوں کا مالک ہے۔اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ بیٹے جیسی چیز کو پیدا کرتا ہے' اس کے لیے اتنی چیزوں کی کیا ضرورت ہوتی ہے' اس کو بیٹے کی کیا احتیاج ہے؟ پھر اس نے کہا ہے کہ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (13:16) جو بہت سی چیزیں پڑی ہیں' وہ ان کو لے کر نئی نئی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے اور يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (35:1) وہ اپنی تخلیق میں نت نئے اضافے کرتا چلا جاتا ہے۔

کسی شے کے عدم سے وجود میں لانے کو انسانی عقل سمجھ ہی نہیں سکتی

خدا تو یہ ہے' تم یہ بات کیسے سمجھ سکتے ہو کہ جب کوئی شے ہی پہلے نہیں ہے' وہ عدم سے وجود میں کیسے آ جاتی ہے۔ اگر کمہار کے پاس مٹی ہو' تو اس سے ہم سمجھ لیں کہ وہ لوٹا بھی بنا سکتا ہے' تھالی بھی بنا سکتا ہے۔ اگر مٹی نہ ہو اور وہ لوٹے اور تھالیاں بنا لے تو مشکل ہے۔اس کے لیے کہا کہ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (2:117) اس کے لیے بس اتنا ہی سمجھو کہ اس کا ایک ارادہ ہوتا ہے' بس جونہی وہ ارادہ ہوتا ہے اور وہ عمل میں آ کر ایک چیز کو وجود میں لے آتا ہے۔عزیزانِ من! ہم اسے نہیں سمجھ سکتے' انسان نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے کہ یہ اس کے امکان میں نہیں ہے کہ جو شے نہیں ہے' اس کو وجود میں لے آئے۔ کہتا ہے کہ یہ ایک امر ہے اور یہ جو عالمِ امر اور عالمِ خلق ہے یہ خصوصیت بھی قرآن ہی کی ہے۔ وہ فلاسفر ''پرنگل پٹیسن ❶'' ہے۔اس نے یہ چیز کہی ہے کہ یہ مسلمانوں کی قوم بڑی خوش قسمت ہے کہ ان کے ہاں خلق اور امر کے دو الفاظ موجود ہیں۔ ہماری کوتاہ دامنی ہے کہ ہماری زبان میں ان کے لیے دو الفاظ نہیں ہیں' اور ان کا بنیادی فرق بہت عظیم ہے۔اسی لیے یہ کہا ہے کہ وَ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (2:117)۔امر کے معنی ہوتا ہے ''Directive Energy'' کسی شے کو کسی راستے کے اوپر ڈال دینا۔خیر' یہ میٹا فزکس (مابعد الطبیعات) کے متعلق ہے' اس لیے میں زیادہ گہرائی میں نہیں جاتا۔اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کا اندازِ تخلیق یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کو پیدا کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس شے کی تخلیق کا آغاز ہو جاتا ہے۔

---

❶ Pringle- Pattison, Andrew Seth (1856-1931)

خدا کی طرف وحی کے نزولی عمل کو غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتا

کہا ہے کہ وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ (2:118) یہ لوگ جو حقیقت سے باخبر نہیں ہیں' وہ

یہ کہتے ہیں کہ خدا ہم سے براہِ راست کلام کیوں نہیں کرتا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کیا بات ہے کہ صاحب! ایک رسول ہے' اس کی طرف وحی کی جاتی ہے' پھر وہ رسول خدا کی وحی ہمیں پہنچاتا ہے' وہ ہر انسان کے ساتھ براہِ راست بات کیوں نہیں کرتا؟ میں نے وحی کے متعلق عرض کیا کہ خدا نے یہ کہا ہے کہ ہم اپنے منتخب بندوں میں سے کسی کو وہ علم دیتے تھے۔ اس میں اس شخص کی سعی و کاوش کا' ہنرمندی کا' کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہ ایک Objective Reality (خارجی حقیقت) تھی' جو اس کو دی جاتی تھی اور وہ اسے پھر دوسرے انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ یہ کیسے دی جاتی تھی؟ اس کی کنہ و حقیقت کیا تھی؟ کیفیت و ماہیت کیا تھی؟ اسے غیر از نبی جان ہی نہیں سکتا۔ خود نبی کے متعلق کہا ہے کہ اسے نبوت کے ایک دن پہلے بھی یہ علم نہیں ہوتا تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ کتاب کیا ہوتی ہے؟ حضور ﷺ کے متعلق فرمایا ہے کہ تم ایک دن پہلے بھی نہیں جان سکتے۔ اس نے کہا ہے کہ ہمارا طریق یہ ہے کہ ہم ایک انسان کو یہ دیتے ہیں اور وہ دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ یہ ہر انسان کے ساتھ کلام کرنے کی بات نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ (42:51) بڑی اہم آیت ہے' جس کو عام طور پہ غلط فہمیاں پیدا کرنے کے لیے Quote (نقل) کیا جاتا ہے۔ آیت یہ ہے کہ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (42:51)۔ خدا کسی انسان سے بات نہیں کرتا بجز ان طریقوں کے جو یہاں کہے ہیں۔ اس میں تین طریقے ہیں: اس میں دو طریقے تو وہ ہیں جو رسولوں کے ساتھ مختص تھے اور تیسرا طریق عام انسانوں کے لیے۔ انبیائے کرام سے خدا کی ہم کلامی کا طریقہ خدا کی طرف سے جبریل کی وساطت سے کسی انسان کے اوپر وحی کا آنا تھا' یہ ہے ایک طریقہ۔ دوسرا وہ ہے جو صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ضمن میں قرآن نے بیان کیا ہے کہ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (42:51) پردے کے پیچھے سے بات کرنا۔ ہم نہیں جان سکتے کہ وہ کیسے تھی لیکن قرآن نے ہر جگہ یہ کہا ہے کہ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (4:164) موسیٰ سے خدا نے یوں بات کی۔

خدا تعالیٰ کی ہستی تمام انسانی تصورات سے ماورا ہے

عزیزانِ من! مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (42:51) تھا' سامنے آ کر نہیں' پس پردہ' خدا کی باتیں ان کے کان تک پہنچ جاتی تھیں' کیونکہ قرآن میں خود یہ آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا تھا کہ بات تو سناتے ہو' سامنے بھی تو آؤ اور جواب میں کہا تھا کہ تم نہیں دیکھ سکتے۔ تو مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (42:51) تھا' یہ دو طریقے تو وہ ہیں جو خدا کی طرف سے بات ہونے کے لیے رسولوں کے ساتھ مختص ہیں۔ تیسرا طریقہ عام انسانوں کے متعلق کہا ہے کہ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا (42:51) یا ہم دوسرے انسانوں کی طرف رسول بھیجتے ہیں' وہ خدا کی جو وحی ہے' وہ ان انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ خدا ہر انسان سے براہِ راست کلام نہیں کرتا۔ نبی کے سوا کسی سے وہ کلام نہیں کرتا۔

ایک باریک فرق اور بھی دیکھیے گا۔قرآنِ کریم میں جہاں جہاں بھی کلام کا آیا ہے' یہی آیا ہے کہ خدا کلام کرتا ہے' اس کی طرف سے کسی کے ساتھ کلام ہوتی ہے۔ کہیں یہ نہیں آیا کہ کوئی انسان خدا کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ یہ جو روز مدعی ہوتے ہیں کہ ہم تو ہر روز خدا کے ساتھ جا کر باتیں کر آتے ہیں ''پتہ نئیں کہدے نال کراوندے ہیگے ❶''۔خدا نے تو ہر جگہ یہ کہا ہے کہ ہم صرف نبی کے ساتھ بات کرتے ہیں' جو اس کا مدعی ہے کہ میں خدا کے ساتھ باتیں کرتا ہوں یا خدا نے میرے ساتھ بات کی ہے' یاد رکھیے! قرآن کی رو سے وہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ اربابِ معرفت کے سارے دعاوی' جتنے بھی ہیں کہ خدا ہم سے ہمکلام ہوتا ہے' یاد رکھیے! قرآن کی رو سے یہ نبوت کا دعویٰ ہے اور ختمِ نبوتؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ کفر ہے۔ آیت (2:118) میں کہا ہے کہ یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا ہم سے براہِ راست بات کیوں نہیں کرتا؟ اور ان کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ (2:118) یا کوئی کھلا ہوا معجزہ کیوں نہیں دکھا دیتا۔ یہ اعتراضات ہیں۔

اربابِ معرفت کے دعویٰ کی کوئی حقیقت نہیں

عزیزانِ من! آپ دیکھیے کہ اس سے یہ چیز ہے کہ یہ تو شاید ہر ایک ہی چاہتا ہوگا کہ اللہ ہم سے بھی بات کرے اور کھلا ہوا معجزہ دیکھنے کو تو ہر ایک چاہتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں سے انسان کی وہ بڑی آزادی' جو حق اور باطل کا خود امتیاز کر کے' انسان کے لیے ہے کہ وہ یہ خود اختیار کرے' ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29)۔ اے رسولؐ! انہیں بتا دیجیے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا' اب تم خود اپنے غور و فکر سے' عقل و فکر سے' تمیز سے' جس کا جی چاہے حق کو اختیار کر لے' جس کا جی چاہے باطل کو اختیار کر لے' کفر اختیار کر لے۔ اس سے یہ آزادی قائم رہتی ہے۔

دینِ حق عقل و بصیرت پر مبنی ہوتا ہے جب کہ کرامتوں کے تصور سے فہم و فراست اور آزادی سلب ہو کر رہ جاتی ہے

حق جہاں آیا ہے یا وحی جہاں آئی ہے' وہ عقل و بصیرت پر مبنی ہوتی ہے اور اگر آسمان سے لٹکتا ہوا کوئی صحیفہ آ جائے' کوئی کھلی ہوئی کتاب آ جائے تو اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس یہ جو اقرار کیا جاتا ہے یہ انسان اپنی مرضی سے کر رہا ہوتا ہے۔ جو اس طرح سے کرامت دکھائی جاتی ہے' وہ تو انسان کو سامنے ہی مجبور کرا دیتا ہے۔ کرامات کی رو سے' کسی کی عظمت کو ماننے میں' آپ کی آزادی کا کوئی دخل نہیں ہوتا' وہ تو آپ کی آزادی کو مسلوب کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً یہ سڑک پہ کھڑا ہوا' اس کے پھٹے ہوئے کپڑے ہیں' وہ غلیظ ہے' گندہ ہے۔ آپ راستے سے جا رہے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ او کھڑا ہو' دیکھو تو سہی اور اس نے بالوں میں ہاتھ دیا اور کہا کہ دیکھو تو اس میں

---

❶ معلوم نہیں وہ کس کے ساتھ باتیں کر آتے ہیں۔

سے دودھ کے قطرے ٹپکنے لگ گئے ہیں۔ بڑے سے بڑا دانشور بھی اس کا معتقد ہوجاتا ہے اور اس کے بعد وہ جو کہتا ہے کہ تمہیں پھونک دوں یا دیتے ہو کہ نہیں؟ جواب ہوتا ہے کہ یا حضرت! بچا لیجیے۔ وہاں عقل وفکر مفلوج ہوجاتی ہے۔ ''حضرت نوں پہنن نوں آپ کپڑا لبھدا نئیں ہیگا❶''۔ یہ کیا چیز ہوئی ہے؟ یہ زندہ کرامت ہے جو دکھائی جاتی ہے۔ جونہی کوئی خارقِ فطرت' کوئی چیز آپکے سامنے آئے' آپ دیکھیں گے کہ عقل وفکر سے(Rationally)' کسی چیز کو Think کرنا' Reason کی بنا پہ فیصلہ کرنا' دلائل و براہین دینا' یہ سب جتنے بھی ہیں' وہ یہاں گل ہوجاتے ہیں۔

عزیزانِ من! یہی کوئی چیز جو انسانی عقل ودانش کے چراغوں کو گل کرتی ہے' کفر ہے۔ اس کے برعکس دین **يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ** (2:257) تاریکیوں سے روشنی میں لاتا ہے' یا حضرت روشنی سے تاریکیوں میں لے جاتے ہیں۔ کسی سے یہ کہنا کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! چار ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں کہتا ہوں کہ پانچ ہوتے ہیں۔ وہ جواب میں کہتا ہے کہ صاحب! اس کا ثبوت کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ثبوت اس کا یہ ہے کہ میں بالوں میں سے دودھ نکال کر دکھا دیتا ہوں صاحب! ہے کوئی ربط اس کے اندر؟ کوئی ربط تو ذہن کا کام ہوتا ہے۔ وہ ہر وہ بات منواتا ہے جو آپ ذہنی طور پہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے' وہ آپ کے ذہن کو کرامت کے ذریعے سے مفلوج کرکے ہر بات منواتا ہے۔

عزیزانِ من! تصوف کا یہ سارا چکر اس پہ چلتا ہے۔ یہ چیز دین کی ضد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ** (2:111) دو اور دو پانچ ہوتے ہیں' وہ کہتا ہے کہ بھائی! اس کے لیے دلیل لاؤ' کیا کوئی دلیل ہے کہ میں آگ پہ چل دیتا ہوں' اس لیے دو اور دو پانچ ہوتے ہیں؟ یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ عزیزانِ من! یہی وجہ ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ سے' قرآن کریم اس پہ شاہد ہے' بار بار کہتے تھے کہ کوئی معجزہ دکھاؤ تو ہم مانیں۔ بار بار آپ ﷺ کا انکار ہوتا تھا کہ میں تمہاری عقلوں کو جلا دینے کے لیے آیا ہوں' ان کو مفلوج کرنے کے لیے نہیں آیا۔ کتنا عظیم مقام ہے' اس شخص ﷺ کا! حتیٰ کہ بائی چانس (اتفاقاً) ایک واقع ہوا' تاریخ میں وہ جگمگاتے تارے کی طرح ہمارے سامنے روشن ہے۔

---

❶ حضرت کو پہننے کو خود کوئی کپڑا نہیں ملتا۔

حضور ﷺ کے بیٹے کی وفات پر سورج گرہن (Solar Eclipse) ہونا کوئی معجزہ نہ تھا

یہ آپ کے ہاں جتنے بڑے بڑے صاحبِ کرامات بنے پھرتے ہیں' ان میں بڑا حصہ Chances (اتفاقات) کا ہوتا ہے' اتفاق

سے وہ بات ہو جاتی ہے بس حضرت صاحب جو ہیں' وہ قطب بن جاتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہوا یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بیٹے کا انتقال ہو گیا' وہ بچہ تھا۔ سورج کو گرہن لگ گیا۔ وہ تو چودہ سو سال پہلے کی بات ہے اور عرب جیسا جاہلیت کا ملک ہے۔ میں کہتا ہوں اس بیسویں صدی میں جو آپ کے ہاں سب سے بڑا مہذب اور علمی شہر ہو' اس میں بھی اگر یہ بات ہو جائے تو لوگ جوق در جوق آئیں۔ وہاں بھی ہوا یہ کہ بچے کی وفات پر' سورج گرہن لگنے سے لوگ جوق در جوق حضور ﷺ کے پاس آ گئے۔ وہ کفار تھے۔ کہا کہ ہم آپ ﷺ کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ ایمان لے آنا بڑی خوشی کی بات ہے لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کل تک تو تم اتنی مخالفت کرتے تھے' یہ آج بیٹھے بیٹھے شاباش کیا بات ہو گئی کہ سب کے سب ایمان لانے کے لیے آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ کی صداقت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہے کہ آپ ﷺ کے غم میں اجرامِ فلکی بھی سیاہ پوش ہو رہے ہیں۔

حضور ﷺ کی صداقت کا ثبوت آپ ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ تھا

عزیزانِ من! اس مقام پہ کوئی اور ہوتا تو اس Situation (صورتِ حال) کو Exploit (استحصال) کرتا اور اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دے لیتا کہ میں نے دین کے نیک کام کے لیے یہ کچھ کیا ہے مگر کیریکٹر کا تقاضا یہ نہیں تھا۔ عزیزانِ من! آپ ﷺ نے فرمایا۔ سن رکھو' یہاں چاند اور سورج کو گرہن خدا کے طبعی قوانین کی رو سے لگتا ہے' کسی کی موت اور حیات سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کہا کہ آپ ﷺ کی صداقت کا ثبوت کیا ہے کہ آپ ﷺ جو کچھ کہتے ہیں اس میں آپ ﷺ سچے ہیں؟ اس کی صداقت کے ثبوت کے لیے آپ ﷺ نے معجزہ دکھا کر یہ بات نہیں کی۔ کہا کہ میرے سچے ہونے کا ثبوت مانگتے ہو۔ سنو! ثبوت یہ ہے کہ **فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (10:16) میں کہیں باہر سے نہیں آیا' میں نے اپنی ساری عمر تمہارے اندر بسر کی ہے۔ **اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (10:16) عقل و فکر سے کام لے کر سوچو تو سہی کہ ایسی زندگی ایک سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی ہوتی ہے۔ میرا معجزہ میری زندگی' میری سیرت اور میرا کردار ہے۔ یہ معجزہ مخاطبین تک محدود نہیں ہے' قیامت تک کے انسانوں کے لیے جگمگاتے مینار کی طرح روشن ہے صاحب! عزیزانِ من! سب سے بڑی کرامت سیرت اور کردار کی پاکیزگی ہوتی ہے۔ چھو منتر دکھانے والے تو ہر مذہب میں ملتے ہیں۔ جنہیں آپ اپنے ہاں کے بزرگ اور اولیا کہتے ہیں' ہندوؤں کے ہاں کے' مشرک' بت پرست' ان سے کہیں زیادہ کرامات دکھاتے ہیں۔

تصوف اور کرامات کی خیرگی میں علامہ پرویزؒ کے کچھ گزرے ہوئے لمحات کا ذکر

برادرانِ عزیز! بات اگر ذاتی نہ سمجھو تو میں عرض کروں کہ میں نے جو اپنی ان تصوف کی راہوں میں ایک زندگی گزاری ہے' اس میں کرامتیں دیکھی بھی ہیں' کرامتیں دکھائی بھی ہیں۔ وہاں سے جو میری گاڑی دوسری پٹڑی پہ پڑی ہے' تو وہ صرف اس چیز پہ پڑی تھی کہ میں

جب ان سادھوؤں کے ہاں پہنچا ہوں کہ وہ اس قسم کی کرامتیں دکھاتے تھے جو ہمارے ہاں کے بزرگوں نے دکھائیں، وہاں پہنچنے کے بعد اللہ کا یہ احسان تھا، فکر کی قوت مفلوج نہیں ہوئی تھی، یہ سوچا کہ اگر یہ دین اور اسلام ہی کی دلیل ہے، تو یہ شرک اور کفر والے جو ہیں، وہ اس کو کیسے دکھا سکتے ہیں۔ یہاں سے میں نے تحقیق اور ریسرچ شروع کی تھی کہ یہ کوئی دلیلِ صداقت نہیں ہے۔ ہاں تو کہا ہے کہ **هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ** (2:111) نظری طور پہ بات کرتے ہو، دلیل لاؤ۔ عملاً سمجھنا چاہتے ہو کہ سچا ہوں یا جھوٹا ہوں تو میری زندگی تمہارے سامنے کھلے ہوئے اوراق کی طرح ہے، اس سے دیکھو کہ سچا ہوں یا جھوٹا ہوں؟ اور وہ اسی لیے کہا کہ خدا ہر ایک سے نہ کلام کرتا ہے، نہ معجزے دکھایا کرتا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ **كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ** (2:118) شروع سے اس قسم کے جو کرامت پسند لوگ تھے، یہ اس طرح سے کہتے چلے آئے **تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ** (2:118) سب کی ذہنیت ایک جیسی ہے۔

عزیزانِ من! آج بھی اسی قسم کی ذہنیت ہے۔ قرآن چھوڑ دیئے تو آپ معجزات کے اوپر اور کرامات کے اوپر آ جاتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ **قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ** (2:118)۔ اوہم نے تو اپنے احکام روشنی کے جگمگاتے تاروں کی طرح واضح کر دیئے ہیں لیکن **لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ** (2:118) یہ ان کے لیے ہیں جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھنے والے ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ البقرۃ کی آیت 118 تک ہم آ گئے۔ 119 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

اٹھائیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)' (آیات 119 تا 125 کا ابتدائی حصہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ بِالۡحَقِّ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا ۙ وَّلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِيۡمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنۡ تَرۡضٰى عَنۡكَ الۡيَهُوۡدُ
وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ
الَّذِىۡ جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَتۡلُوۡنَهٗ
حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾ يٰبَنِىۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ
اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ
نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ
ابۡتَلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ ؕ قَالَ
لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَيۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ
اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدۡنَآ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ اَنۡ طَهِّرَا بَيۡتِىَ لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡعٰكِفِيۡنَ وَالرُّكَّعِ
السُّجُوۡدِ ﴿۱۲۵﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1969ء کی 5 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 119 سے ہوتا ہے: (2:119)

وحی کے سلسلہ میں مخالفین کا ایک اعتراض اور اس کا جواب

سابقہ آیت میں مخالفین کا یہ اعتراض سامنے لایا گیا تھا کہ خدا ہم میں سے ہر ایک سے براہِ راست کلام کیوں نہیں کرتا؟ اور یہ مدعیٔ نبوت کوئی معجزہ کیوں نہیں دکھاتا؟ اس کے متعلق قرآن کا جواب میں نے عرض کیا تھا کہ انسانوں کی طرف وحی بھیجنے کا سلسلہ یہ نہیں کہ ہر انسان کی طرف خدا انفرادی طور پر وحی بھیجے۔ طریق یہ اختیار کیا گیا ہے کہ کسی ایک منتخب ہستی کی طرف یہ احکام بذریعہ وحی بھیجے جائیں اور وہ اس تعلیم کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے اور دوسری چیز یہ تھی کہ معجزہ کیوں نہیں دکھایا جاتا؟ تو کہا کہ رسول ﷺ اس مقصد کے لیے نہیں

آتے۔اس اگلی آیت میں یہ بتا دیا گیا کہ رسولوں ﷺ کا منصب کیا ہوتا ہے؟ وہ کس مقصد کے لیے آتے ہیں؟ کہا کہ **اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا ۙ وَّ لَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِیۡمِ** (2:119)۔یہ عظیم آیت ہے' جس میں منصبِ رسالت کو واضح کیا گیا ہے۔رسول حقائق لے کر آتا ہے' اس کے پاس صداقتیں ہوتی ہیں اور اس کا منصب بشیر اور نذیر ہونا ہوتا ہے۔وہ لوگوں کو صرف یہ بتاتا ہے کہ اگر تم یہ طریق اختیار کرو گے' یہ روش اختیار کرو گے' تو اس کے یہ خوشگوار نتائج ہوں گے اور اگر تم یہ دوسرا راستہ اختیار کرو گے تو اس سے تمہارا یہ نقصان ہوگا۔آپ دیکھیے کہ یہ کتنی بڑی چیز ہے۔دین کا منشا انسانی آزادی کو زیادہ سے زیادہ حد تک برقرار رکھنا ہے۔دین میں بلند ترین ہستی رسول کی ہوتی ہے۔دوسری جگہ رسول کا منصب یہ بتایا گیا ہے کہ **قُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ۟ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ** (18:29) یہ ایک حقیقت ہے جو تمہارے سامنے رکھ دی گئی' یہ تمہارے خدا کی طرف سے آ گئی۔اب اس کے بعد جس کا جی چاہتا ہے' اس کو قبول کرلے جس کا جی چاہتا ہے' اس سے انکار کر دے۔اب آپ دیکھیے کہ یہ ''جس کا جی چاہتا ہے'' کتنی بڑی آزادی ہے جو دی گئی ہے۔کوئی اوپر سے پابندی عائد نہیں کی گئی۔یہ چیز کہ یہ بتا دیا جائے کہ یہ راستہ تباہی کی طرف جاتا ہے اور یہ راستہ صحیح منزلِ مقصود کی طرف پہنچا دے گا' یہ بات تو رسول کا منصب ہے' وہ آ کر بتاتا ہے جیسا کہ میں ہمیشہ مثال میں کہا کرتا ہوں کہ زندگی کے ہر دوراہے پر ایک سائن پوسٹ لگا دیا جاتا ہے کہ یہ راستہ فلاں سمت کو جاتا ہے اور یہ ادھر کو جاتا ہے۔اب ہر راہروِ حیات کو کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ سائن پوسٹ ہے' اس کو دیکھ کر تم جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرلو۔اب یہ چیز تو اس کی آزادی پہ منحصر ہے کہ وہ جونسا جی چاہے راستہ اختیار کرلے۔آگے جا کر مجبوری ہو جاتی ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ہم یہاں گل برگ لاہور پاکستان سے چل کر یہاں جو سائن پوسٹ لکھا ہوا ہو کہ یہ راستہ مال روڈ (لاہور) کی طرف جاتا ہے اور جانا ہو ہم نے ماڈل ٹاؤن (لاہور)' ہم مال روڈ کی طرف کے راستے پہ چل پڑیں تو اس کے بعد یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں ہے کہ آیا یہ راستہ ہمیں ماڈل ٹاؤن پہنچا دے گا۔

عمل کرنا انسان پر منحصر ہے لیکن مکافاتِ عمل کو بدلنا انسانی اختیار میں نہیں ہے

عزیزانِ من! راستے کا اختیار کرنا ہمارے بس کی بات ہے' ہمارے اختیار میں ہے۔اس اختیار کے استعمال کے بعد وہ راستہ جہاں پہنچاتا ہے' اس منزل کو ہم نہیں بدل سکتے۔اسے ہی اعمال کے نتائج کہتے ہیں' یہ مکافاتِ عمل ہے۔یہ جو مکافاتِ عمل یا اعمال کے نتائج ہیں' ان کے لیے ابتدائی شرط یہ ہے' Primitive Condition یہ ہے کہ مجھے میری آزادی میسر ہو۔مجھے اس کی آزادی حاصل ہو کہ جونسا راستہ میرا جی چاہے' میں اختیار کروں' پھر اس کے بعد اس کے نتائج میں بھگتوں اور اگر ابتداً ہی میرے بس میں یہ بات نہ ہو' مجھے وہاں کسی مقام پہ کھڑا کر کے کسی ایک راستے پہ کسی طرح مجبوراً چلا دیا جائے' اور اس کے بعد مجھے یہ کہا جائے کہ بتاؤ' تم یہاں کیوں پہنچے ہو؟ یہ بات

غلط ہے۔ می نہ سزد خدائے را۔ رسول کا منصب صرف یہ آگاہ کرنا ہوتا ہے‘ وہ بشیر ہوتا ہے‘ وہ نذیر ہوتا ہے اور اسی لیے ابتداً قرآن کی دوسری سورۃ کی دوسری ہی آیت میں بتا دیا گیا کہ یہ **هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ** (2:2) ہے۔ وہ لوگ جو زندگی کے راستوں کی خطرناک گھاٹیوں سے بچنا چاہتے ہیں‘ یہ ان کے لیے راہنمائی دیتا ہے یعنی ایک تو وہ ہے جو بچنا ہی نہیں چاہتا‘ جو خودکشی کرنا چاہتا ہے‘ اس کے لیے تو سوال ہی نہیں ہے کہ صحیح راستہ ہو یا غلط راستہ ہو۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ راستے کے خطرات سے بچنا چاہے اور صحیح منزل تک پہنچنا چاہے۔ پھر اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ جہاں Cross-Roads (چوراہے) آئیں‘ جہاں موڑ آئیں‘ وہاں یہ بتانے کی کوئی نشانی ہونی چاہیے کہ یہ راستہ کدھر جاتا ہے۔ اسے وحی کہتے ہیں‘ اسے منصبِ رسالت کہتے ہیں۔ یہ **بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا** دونوں چیزیں ہیں‘ جو سائن پوسٹ (نشاناتِ راہ) لگا دی گئی ہیں۔ اس راستے پہ جاؤ گے‘ یہ خوشگوار نتائج سامنے آجائیں گے اور اگر غلط روش اختیار کرو گے تمہارا اسی قدر نقصان بھی ہوگا۔

دوسروں کی غلط روش کے باعث نبی اکرم ﷺ کی حسّاس خیالی کی کیفیت

یہ سب کچھ کہنے کے بعد‘ رسول ﷺ سے دوسرے مقام پہ یہ کہا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تُو تو اس غم میں اپنی جان گھلا لیتا ہے کہ یہ لوگ اتنی وضاحت کے بعد صحیح راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے؟ کیوں غلط راستے پہ چل کر اپنی تباہی مول لیتے ہیں؟ کہا کہ ایک مشفق طبیب کی طرح‘ تمہاری یہ غم گساریاں برحق ہیں لیکن تُو انہیں مجبور تو نہیں کرسکتا کہ یہ ضرور وہ راستہ اختیار کریں جو تُو چاہتا ہے۔ نہ ہی تمہاری یہ ذمہ داری ہے کہ تم ان کو پکڑ کر کسی طرح صحیح راستے کے اوپر پہنچا کر آؤ۔ نہ ہی تم سے یہ پوچھا جائے گا کہ اس نے جو یہ غلط راستہ اختیار کیا تھا‘ یہ اس کے تباہ کن نتائج کیوں بھگت رہا ہے۔ کہا ہے کہ **وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ** (2:119)۔ غم نہ کرو‘ یہ جو اپنے آپ کو تباہی کے اندر لے جانے والے راستے پر ڈال رہے ہیں‘ اس کی ذمہ داری تمہارے اوپر عائد نہیں ہوتی۔ تمہارا منصب جو تھا وہ پورا ہوگیا‘ تمہارا فریضہ جو تھا وہ تم نے ادا کر دیا۔ یہ پیغام ان تک پہنچا دیا۔ یہ سائن پوسٹ لگا دیئے۔ اس کے بعد یہ تمہاری ذمہ داری نہیں ہے کہ یہ اس راستے پہ کیوں چلیں اور جہنم میں کیوں پہنچیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اُدھر سے راستہ چلنے والے کی آزادی کو برقرار رکھا گیا ہے اور اِدھر راستہ بتانے والے کی پوزیشن کو بتایا گیا ہے کہ تمہاری ذمہ داری اسی حد تک ہے۔ دوسرے مقام پہ بالکل واضح الفاظ میں کہا کہ **فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ** (13:40) تمہارے ذمے تو صرف اس کا پہنچا دینا ہے اور اس کے بعد پھر جو اس کا حساب ہے تو کہا وہ ہمارے ذمے ہے‘ ان کے ساتھ وہ حساب ہم کرلیں گے‘ تمہارا یہ کام نہیں ہے بلکہ دوسرے مقام پہ تو نبی اکرم ﷺ سے اور واضح انداز میں یہ کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ تیرا جی چاہتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ہلاک نہ ہو لیکن **اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ** (28:56) تُو کتنا ہی

جی سے کیوں نہ چاہے کہ کوئی شخص صحیح راستے پہ چلے لیکن یہ تمہارے اختیار کی بات نہیں ہے کہ بالضرور تم اسے ہدایت کے راستے کے اوپر چلا سکو۔ تُو کتنی ہی محبت کیوں نہ کرے، تمہارا کتنا ہی جی کیوں نہ چاہے کہ یہ ضرور صحیح راستے کے اوپر آ جائے **اِنَّکَ لَا تَهۡدِیۡ** (28:56) یہ یقینی بات ہے، یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے کہ جی چاہتا ہے کہ یہ صحیح راستے پر چلیں تو بالضرور وہ صحیح راستے پہ چلیں۔ **وَ لٰکِنَّ اللّٰهَ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ** (28:56) صحیح راستے کے اوپر تو خدا کا قانون اسے چلاتا ہے جو خود صحیح راستے پہ چلنا چاہتا ہے۔ جو صحیح راستے پہ چلنا ہی نہیں چاہتا، اسے تُو چلا نہیں سکتا اور نہ ہی اس کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہوگی کہ یہ صحیح راستے پہ کیوں نہیں چلا۔ آپ نے غور فرمایا کہ دین کے پروگرام کو کس قدر وضاحت سے بتا دیا گیا۔ پیغام پہنچانے والے کا کام پیغام پہنچانا ہے۔ اس کی ذمہ داری کسی کو صحیح راستے کے اوپر مجبوراً چلانا نہیں ہے۔ مجبوری سے صحیح راستے پہ چلنے والے کا یہ کوئی نیک کام نہیں ہوتا۔ نہ مجبوری کی نیکی، نیکی ہوتی ہے نہ مجبوری کا گناہ، گناہ ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! ضمناً یہ بات سامنے آ گئی۔ آئے دن یہ اعتراض کیا جاتا ہے، مجھ سے کہا جاتا ہے کہ صاحب! ٹھیک ہے قرآن کا درس ہوتا ہے، تم اس پیغام کو لوگوں تک پہنچاتے ہو لیکن دیکھیے ایک درس کے اندر اس قسم کے لوگ آ جاتے ہیں، وہ اس قسم کا جرم کرتے ہیں، اس قسم کے ان کے اخلاق ہیں، اس قسم کا ان کا کیریکٹر ہے تو کیا فائدہ ہوا تمہارا یہ قرآن سنانے کا؟ تم یہ بھی نہیں کر سکتے۔ میں اپنے متعلق خود کوئی بھی Defence (دفاع) نہیں، پیش کرتا، میں تو وہ Defence (دفاع) پیش کر رہا ہوں جو خدا نے رسول اللہ ﷺ کی Defence (دفاع) پیش کی تھی کہ تیرا کتنا ہی جی کیوں نہ چاہے، جو صحیح راستے پہ چلنا نہیں چاہتا تُو اسے صحیح راستے پہ چلا نہیں سکتا۔ وہ تو ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ ان بلندیوں پہ تھی ان کے ساتھ میری نسبت ہی کیا ہے لیکن Defence (دفاع) یہی ہے، پیغام پہنچانے والے کا فریضہ پیغام پہنچا دینا ہوتا ہے، جبراً کسی کو صحیح راستے پر چلا دینا نہیں ہوتا۔ دین اس لیے آتا ہے کہ جبر کو مٹا دے، آزادی کو برقرار رکھے اور آزاد رہنے والا اپنے آپ کو جہنم میں پھینکنا چاہتا ہے تو زبردستی اس کو روک کر، اسے زبردستی جنت میں نہیں پہنچایا جا سکتا۔ وہ جنت ہی نہیں ہوتی، جس میں آزادی سلب کر کے کسی کو پہنچایا جائے۔

یہود و نصاریٰ کا نبی اکرم ﷺ سے مطالبہ

عزیزانِ من! یہ ہے دین۔ اب اس کے بعد پھر اگلی بات قرآن نے کی ہے۔ یہود و نصاریٰ کی باتیں چلی آ رہی ہیں، ان کے اعتراضات سامنے آ رہے ہیں، قرآن جواب دیئے چلے جا رہا ہے۔ اپنے دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں Rationally Discuss کرتا ہے، عقل و فکر کی بنیاد پر ان کے اعتراضات کو Meet کرتا ہے، دلائل و براہین پیش کرتا ہے، لیکن اس کے بعد وہ کہتا یہ

ہے کہ وَ لَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَهُوۡدُ وَ لَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ (2:120) یہ کبھی تجھ سے راضی نہیں ہوں گے تاوقتیکہ تُو ان کا مذہب نہ قبول کر لے۔ اس سے بڑی کوئی شرط ہی نہیں ہے اور کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی' دلائل و براہین کوئی اتنے قوی نہیں ہیں' یہ سب کچھ ہے لیکن وہاں تو ایک ہی چیز ہے کہ ان کی ملت کو قبول کرو' ان کا مذہب اختیار کرو تو پھر تو یہ ٹھیک ہے' وہ تجھ سے راضی ہوں گے' اگر ایسا نہیں کرو گے تو پھر یہ تجھ سے راضی نہیں ہوں گے۔

فرقہ بندی کی بنا پر انسان کی نفسیاتی کیفیت اور اس کا انجام

عزیزانِ من! جو چیز وہاں اہلِ کتاب کے متعلق کہی گئی ہے' آپ دیکھتے ہیں کہ ہماری فرقہ بندی میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ دوسرے فرقے کے آدمی سے آپ کتنی ہی بحث کر لیجیے' کتنے ہی دلائل دے دیجیے' کتنے ہی اسناد بہم پہنچا دیجیے' آپ قرآن کی نصوص صریحہ اس کے سامنے لے آیئے' آپ دیکھیں گے کہ وہ کبھی نہیں مانے گا۔ وہ آپ سے اسی صورت میں راضی ہوگا جب آپ اس کے فرقے سے متعلق ہوں گے۔ یہ ہے Fanaticism (مذہبی و سیاسی پاگل پن) یہ ہے مذہبی تشدد اور عصبیت۔ سوال یہ ہے کہ میں حق پر ہوں' باقی سب جہنم میں جانے والے ہیں' کی سند کیا ہے؟ اس کے لیے وہ ایک روایت لے آتے ہیں' جو ہمارے ہاں آ گئی ہوئی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا' روایت کے اوپر ہی حالانکہ نظر آتا ہے کہ یہ کبھی حضور ﷺ کا ارشاد نہیں ہوسکتا تھا' کہ میری امت میں تہتر (73) فرقے ہوں گے' ایک ان میں سے جنّتی ہوگا' بہتر (72) سارے جہنم میں جانے والے ہوں گے اور قرآن یہ کہتا ہے کہ کُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَیۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ (30:32) پھر اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ وہ جنّتی تو میں ہوں' باقی سارے جہنم والے ہیں۔ اب اگر تہتّر (73) کے تہتر (73) میں سے ہر ایک یہ سمجھے کہ میں جنت میں جانے والا ہوں' باقی سارے جہنم میں جانے والے ہیں' تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے عصبیت کی گرہیں کتنی مضبوط ہو جاتی ہیں حالانکہ اس شے کا سوال ہی نہیں ہے۔ قرآن کی رو سے اسلام میں فرقوں کا وجود شرک ہے۔ کہا ہے کہ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ - مِنَ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ وَ كَانُوۡا شِيَعًا (30:31-32) دیکھنا! کہیں مومن ہونے کے بعد تم پھر مشرک نہ ہو جانا۔ سوال پیدا ہوتا تھا کہ انسان مومن ہونے کے بعد کس طرح مشرک ہو جائے گا؟ کیا وہ بت پرستی شروع کر دے گا؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔ کہا یہ ہے کہ تم ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیے اور خود ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد فرقہ بندی میں نفسیاتی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ كُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ (30:32) پھر ہر گروہ اس میں مگن ہوتا ہے جس کے اوپر وہ چل رہا ہوتا ہے۔ ہر ایک اپنے آپ کو جنت کا حق دار سمجھتا ہے' باقی سب کو جہنم میں جانے والے کہتا ہے لہٰذا یہ سوال ہی نہیں تھا کہ بہتر (72) یا تہتر (73) فرقے ہونے ہیں اور ان میں سے ایک جنت میں جانے والا ہوگا۔ فرقوں

کا وجود قرآن کی رو سے شرک ہے۔قرآنِ کریم نے رسول اللہ ﷺ سے دوسری جگہ کہا ہے کہ لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (6:160) جولوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کرلیں' فرقوں میں بٹ جائیں تو تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔خدا کی میزان میں یہ شرک ہے' رسول اللہ ﷺ کا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔اس لیے کہ وہاں کیفیت یہ ہوجاتی ہے جو میں نے ابھی عرض کیا کہ پھر ہر فرقہ اپنے آپ کو تو جنت کا اجارہ دار سمجھتا ہے اور باقی سب کو جہنم رسید کرتا ہے۔وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (2:120)۔سوال یہ ہے کہ اس مقام پہ پھر فیصلہ کیسے ہو۔ ہر ایک اس بات کا مدعی ہے کہ صحیح راستہ وہی ہے جس پہ میں ہوں۔فیصلہ کیسے ہو؟

مذہبی متضاد خیالی ہو یا سیاسی چالبازی' فیصلہ قرآنِ حکیم کا ہی چلتا ہے

برادرانِ عزیز! قرآن ہے۔یہ بات ان کی کرتا ہے' ہدایت ہمیں دیتا ہے۔کہتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہے وہ فیصلہ جو ہمارے سامنے جلی حروف میں لکھا ہوا ہونا چاہیے۔قُلْ (2:120) ان سے کہہ دو کہ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (2:120) بات نہ تمہاری ہے نہ میری ہے' صحیح راستہ وہ ہے جسے خدا نے صحیح راستہ قرار دیا ہے۔ہدایت کے لیے سند خدا کی ہونی چاہیے' کسی اور کی سند نہیں اور خدا کی سند خدا کی کتاب کے اندر ہے' اس کے باہر کہیں نہیں ہے۔کوئی بات جو کسی کی طرف منسوب کر دی جائے' کوئی قول جو کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا بھی کیوں نہ ہو' بڑے سے بڑے بزرگ بھی کیوں نہ ہوں' اس کے لیے معیار یہ ہے کہ آیا یہ اللہ کی ہدایت ہے یا نہیں؟ اس کے مطابق کوئی چیز کہتا ہے تو وہ صحیح بات ہے کیونکہ وہ اس کے مطابق کہی گئی ہے لیکن اس کے لیے ٹیسٹ' اس کے لیے کسوٹی' اس کے لیے معیار' اس کے لیے اسٹینڈرڈ ایک ہی ہے اور وہ ہے کہ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (2:120) خدا کی دی ہوئی ہدایت' ہی الْهُدٰى ہے۔ الفاظ دیکھیے! اِنَّ نے یہ بات کہہ دی کہ یقینی بات یہ ہے' اس میں شک وشبہ کوئی نہیں ہے' هُدَى اللّٰهِ خدا کی دی ہوئی ہدایت وہی ہے جو الْهُدٰى کہلا سکتی ہے۔

فرقہ بندی کی بنیادی وجہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی ہے

عزیزانِ من! یہ جو الْهُدٰى ہے' یہ ایسی چیز ہے جس میں اس کے سوا کوئی اور ہدایت ہے ہی نہیں۔یہ معیار اگر سامنے رکھ لیا جائے تو سارے تفرقے مٹ جاتے ہیں' فرقے ختم ہوجاتے ہیں۔کہا ہے کہ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (3:102) یہی حبل اللہ ہے جس کے ساتھ قرآن نے ایک اعتصام کا حکم دیا۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اعتصام کرلو گے تو پھر تفرقہ پیدا نہیں ہوگا۔اس لیے پیدا نہیں ہوگا کہ قرآن کے متعلق خود قرآن نے یہ کہا کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مجھ میں

کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔ جس میں کوئی اختلافی بات نہ ہو اور وہ ہو ہمارے لیے سند، حجت، اتھارٹی، دلیل، برہان، تو بتائیے کہ اس کے ماننے والوں میں کیسے اختلاف پیدا ہو جائے گا؟ کیسے افتراق پیدا ہو جائے گا؟ اس میں فرقے کیسے بن جائیں گے؟ آپ کسی فرقے کو لیجیے، آپ دیکھیں گے کہ اس کی سند اور دلیل کسی نہ کسی انسان تک جا کر رک جائے گی، خدا تک نہیں پہنچے گی۔ خدا تک اگر پہنچنے والے ہوں گے تو دو شخصوں کے درمیان اختلاف نہیں ہوگا۔ خدا نہ کردہ اس کی غایت یہ نہیں ہے کہ وہ مجھے اِدھر کا راستہ اور آپ کو اُدھر کا راستہ بتا دے۔ اتنا بڑا جو اختلاف ہے، وہ اگر کسی انسان کے کلام میں ہو، تو اس کو اٹھا کر پھینک دینا چاہیے چہ جائیکہ خدا کے ہاں یہ ایسا اختلاف موجود ہو۔ یہ قطعاً نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہا کہ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (2:120) خدا کی دی ہوئی ہدایت ہی اَلْهُدٰى ہے۔ جو اگلی چیز تھی کہ ان میں سے ہر ایک یہ کہتا ہے کہ صاحب! میرے فرقے کی طرف آ جائیے، اس کو Belong کیجیے، پھر ہدایت ملے گی، کہا کہ یہ چیز خالص جذباتی ہے، اس میں علم اور حقیقت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

فرقہ واریت کا وجود علم وشعور کی بجائے جذباتیت کا رہین منت ہوتا ہے

کیا بات قرآن کہہ جاتا ہے! عزیزانِ من! حقائق کو تو علم کی بنیاد کے اوپر لیا جاتا ہے۔ جذبات وہ چیز ہوتی ہے جس میں آپ کا علم اور دلیل کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا، وہ فکری چیز ہوتی نہیں ہے، جذباتی ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ (2:120) العلم آ جانے کے بعد، العلم قرآن ہے، وحی ہے، اس کے آ جانے کے بعد، اگر تم ان کے جذبات کا اتباع کر جاؤ گے، پھر ان کے فرقے میں تم شامل ہو جاؤ گے، ان کی گروہ بندیوں کی تو تمہیں حمایت ہو جائے گی لیکن مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ (2:120) خدا کی طرف سے تمہارا کوئی والی وارث نہیں ہوگا۔ اس کی طرف سے تمہیں نہ کوئی سرپرست مل سکے گا، پھر نہ کوئی حمایتی مل سکے گا۔ ٹھیک ہے ان کے گروہ میں جا کر ان کے جتھے میں شامل ہو جائیے۔ وہ تو تمہارے بن جائیں گے مگر خدا تمہارا نہیں رہے گا، رسول تمہارا نہیں رہے گا۔ یہاں سے یہ بھی چیز صاف ہو گئی کہ یہ جو گروہ بندیاں ہیں، فرقہ بندیاں ہیں، ان کی بنیاد جذبات پر ہے، حقائق پر نہیں ہے، العلم پر نہیں ہے، حقیقت پر نہیں ہے۔ یہ ساری جذباتی چیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ ذرا سی بات ان کے فرقے کے یا ان کے عقیدے کے خلاف کہیے او ہو! وہ افروختہ برآتش ہو کر مشتعل ہو جاتے ہیں، بھڑک اٹھتے ہیں، چھرا گھونپ دیتے ہیں۔ یہ تو روزمرہ کا مشغلہ ہے، یہ گالیاں ہیں۔

دلیل و برہان کا حامل شخص جذباتی طور پر مشتعل نہیں ہوتا

یہ کیا چیز ہے؟ دلیل و برہان کی بنیاد پہ بات کرنے والا کبھی ایسے مشتعل نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ سوچتا ہے کہ جو اس نے کہا ہے اس میں اگر

وزن ہے تو مجھے قبول کر لینا چاہیے' غلط ہے تو مجھے اس کی دلیل سے تردید کرنا چاہیے۔ اسے غصہ نہیں آتا' غصہ ہمیشہ جذباتی کو آتا ہے۔ مذہب کی بنیاد جذبات پہ ہوتی ہے' دین ہمیشہ دلیل و برہان سے بات کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو دین پہ چلنے والا ہے' وہ جذباتی نہیں ہوتا' ان چیزوں سے مشتعل نہیں ہوتا۔ جو مذہب ہے' اس میں دلیل و برہان وفکر کا دخل ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ ہمیشہ جذبات پہ چلتا ہے اور ہمیشہ مشتعل ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ مَالَکَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ (2:120) اس غیر خداوندی راستے پر چلنے سے جو تباہی آئے گی' اس سے بچانے کے لیے تمہارا کوئی چارہ ساز اور مددگار نہیں ہو سکے گا۔ یہ تو ہے ان کی کیفیت جو گروہ بندیوں میں تمہیں شامل کرنا چاہتے ہیں لیکن اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ (2:121) یہ مومنین کی جماعت جن کو الکتاب دی گئی ہے' جنہیں یہ قرآن دیا گیا ہے' یاد رکھیے! یہاں یہ قرآنِ کریم دیئے جانی والی کتاب ہے' یہاں اہلِ کتاب نہیں ہے۔ بعض لوگوں کو مغالطہ لگ جاتا ہے کہ جہاں اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ ہو' تو کہتے ہیں کہ یہ اہلِ کتاب کی بات ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ جماعتِ مومنین جنہیں ہم نے یہ الکتاب دی ہے' ان کی روش کچھ اور ہے۔ وہ روش کیا ہے؟ یہ کہ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ (2:121)۔ قبل اس کے کہ میں ان دو الفاظ کے معنی بتاؤں' اگلی بات کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (2:121) یہ لوگ ہیں جو حقیقت میں اس پہ ایمان رکھتے ہیں۔ یہ کون ہوئے؟ درمیان میں یہ بات کہی کہ یہ جو یوں کرنے والے ہیں' یہ ہیں ایمان رکھنے والے۔ آگے ہے کہ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (2:121) جو یہ نہیں کرتے' کفر کرتے ہیں اور جو کفر کرتا ہے تو پھر نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ بڑی Important (اہم) بات ہو گئی' صاحب! اس اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ (2:121) میں تو سب شامل ہو گئے' جو کہتے ہیں کہ صاحب! یہ قرآن ہے' اس پہ ہمارا ایمان ہے' یہ الکتاب والے ہو گئے۔ وہ کہتا ہے کہ ان میں سے مومن وہ ہیں جو یہ کرتے ہیں' جو یہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

صدیوں سے ہمارے ہاں قرآن حکیم کے لفظ ''تلاوت'' کو مروّجہ تراجم کے تحت اپنانے کا نتیجہ

اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا ہے۔ کہا ہے کہ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ (2:121)۔ اب اس کے اردو میں معنی آئے ''تلاوتِ قرآن شریف''۔ اس کا تو آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے ہاں ہر جلسے کی ابتدا تلاوتِ قرآن شریف سے ہے' ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ابتدا ''تلاوت قرآن شریف'' سے ہے۔ اس کے بعد دنیا بھر کے خرافات' فواحشات اس کے اندر نشر ہو رہی ہیں۔ خط پر وہ 786 اوپر لکھا ہوا ہے' خواہ اس کے نیچے شراب کا لائسنس ہی کیوں نہ دیا جائے۔ یہ ''تلاوت'' آپ کے ہاں ہو گئی۔ اسے سمجھا جاتا ہے کہ یہ قرآنِ کریم کی آیات کا پڑھ دینا ہے' کہا جاتا ہے کہ تلاوتِ قرآنِ کریم سے ابھی آغاز ہو گا صاحب! اس کا احترام ہو گا' یہ اردو ہے۔ قرآن عربی زبان میں ہے' عربی زبان میں تلاوت کہتے ہیں ''کسی کی پیروی کرنا' کسی کے پیچھے پیچھے چلنا' کسی کی اطاعت کرنا۔'' ان معانی سے بات واضح ہو گئی۔ جنہیں

الکتاب دی گئی ہے'ان میں سے اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ (2:121) یہ لوگ ہیں جو حقیقت میں اس پہ ایمان رکھتے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں؟ کہا ہے کہ یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ (2:121) یہ وہ لوگ ہیں جو اس کی پیروی کرتے ہیں جیسا کہ پیروی کرنے کا حق ہے۔ اس کا اتباع کرتے ہیں جیسا اتباع کرنے کا حق ہے۔ تلاوت کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کو کہتے ہیں اور اسی لیے کہا کہ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِہٖ (2:121) جو یہ نہیں کرتا وہ اس سے کفر کرتا ہے۔

قرآن حکیم کی تلاوت اور اس کے اثرات

عزیزانِ من! یہ قرآن کریم ضابطۂ ہدایت ہے۔ قانون کی کتاب دی جاتی ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے' اس کا اتباع کیا جائے' اس کے مطابق عمل کیا جائے' یہ ماننا ہے لیکن اب اس کے بعد ہمارے ہاں کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ تلاوت کے معنی کیے ''قرآن کا پڑھنا'' اور اس کے بعد پھر وہ کارِ ثواب آیا کہ ایک حرف پہ دس نیکیاں ہیں' ہر صبح اُٹھ کر تلاوت کی جاتی ہے' ایک ایک رات میں قرآن ختم کیا جاتا ہے' صاحب! اور پھر اس کے بعد جو کرامات آتی ہیں' وہ تو پوچھو ہی نہیں کہ جی! فلاں صاحب کو نولکھا اس لیے کہتے ہیں کہ نو لاکھ مرتبہ انہوں نے قرآنِ کریم کا ختم کیا تھا۔ دس ہزار سال کی عمر ہو جائے' جب بھی یہ کسی سے نہیں ہوتا لیکن وہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ تم کس دنیا کی باتیں کر رہے ہو؟ وہ تو وہ تھے جو گھوڑے پر زین کی رکاب میں ایک پاؤں رکھنے سے شروع کرتے اور دوسرا پاؤں رکاب میں رکھنے تک قرآن ختم کر لیتے تھے۔ یا میرے اللہ! تلاوت کے شعبے پھر یہ ہو رہے ہیں اور مقصد ہی وہ ہے جسے ہم تلاوت کہتے ہیں یعنی ان الفاظ کا پڑھ لینا۔ اب پڑھنے میں جو اگلی چیز تھی' چلیے صاحب! وہ عرب تھے' عربی زبان تھی' پڑھ بھی لیا تو کچھ تو سمجھ میں آتا ہی ہوگا۔ اب ہمارے ہاں عربی زبان نہیں ہے۔ اسلامیات کا مضمون نصاب میں داخل ہو گیا۔ کہا کہ صاحب! الحمدللہ۔ پوچھا کہ صاحب! کیا ہوا؟ کہا کہ جی' ناظرہ قرآن پڑھا جائے گا' سات برس میں ختم کیا جائے گا۔ اب یہ ناظرہ قرآن پڑھایا جائے گا!! یعنی اس کے الفاظ پڑھائے جائیں گے جس کے معنی نہیں بتائے جائیں گے۔ گورنمنٹ کا حکم آجاتا ہے کہ صاحب! مدرسوں کے اندر قرآن پڑھایا جائے لیکن انہیں اس کا ترجمہ نہ بتایا جائے اس لیے کہ اس سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہے۔ یا اللہ اس کا ترجمہ نہ بتایا جائے' ناظرہ قرآن پڑھایا جائے۔ اس سے ثواب ہوتا ہے۔ یہ بڑی بوڑھیاں ہیں کہ صاحب! میں کیا کروں مجھے تو بچپن میں ماں باپ نے قرآن حکیم پڑھایا تک نہیں ہے۔ انہیں کہا کہ صبح اٹھ کر اس کے اوپر انگلیاں پھیر لیا کرو۔ عزیزانِ من! وہ کتاب جس نے زندگی میں آپ کی راہنمائی کرنی تھی' جس نے قدم قدم پہ یہ بتایا تھا کہ یہ راستہ کدھر جاتا ہے' جس نے آپ کے ہاں غلط اور صحیح کا' حق اور باطل کا معیار بننا تھا' جس نے قانون و آئین کا ایک ضابطہ دیا تھا جس سے امتوں کی تشکیل ہوتی ہے' جس سے قوموں کی موت و حیات وابستہ ہوتی ہے' اس کے متعلق یہ کہا کہ صبح اٹھ کر اس کے حروف پر انگلیاں

پھیر لیا کرو۔ اسے مدرسوں میں ناظرہ پڑھاؤ' اس کے معانی نہ بتاؤ کیونکہ اس سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہے۔ یاللعجب!! قرآن بہ نصِ صریح کہتا ہے کہ اس پر عمل کرو۔ اب اس یکفربہ کا نتیجہ کیا ہوا؟ کہا کہ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (2:121) یہی تو ہیں تباہ ہونے والے۔

عزیزانِ من! قرآن نے کتنی عظیم دلیل دی ہے! جتنی تلاوت آپ کے ہاں اس قرآن کی' اس کتاب کی ہوتی ہے' دنیا میں کسی اور کتاب کی اتنی تلاوت نہیں ہوتی۔ دنیا کے اندر جتنے تباہ آپ ہوئے ہیں' بدترین قوم بھی اتنی تباہ نہیں ہوئی۔ یہ کیا ہوا؟ یہ کیوں ہوا؟ کہا کہ مَنْ یَّکْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (2:121) یہ قرآن سے کفر ہے' قرآن سے انکار ہے' ایمان تو اس نے بتایا ہے کہ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ (2:121) اس قرآن کا پورا پورا اتباع کیجیے۔ ایسا اتباع کیجیے جیسا اس کا حق ہے۔ یہ کر کے دیکھیے تو پھر نہ فرقے باقی رہتے ہیں' نہ تضادات' نہ اختلافات باقی رہتے ہیں۔ زندگی کے صحیح راستے کے اوپر کاروانِ حیات ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے' خوشگواریاں ان کے پاؤں چومتی ہیں' خوشحالیاں ان کی ہمرکاب ہوتی ہیں اور فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201) کی بشارتیں ان کا استقبال کرتی ہیں۔ یہ زندگی عزت وتکریم کی' خوشحالی اور خوشگواری کی ہوتی ہے اور جس کی یہ زندگی اس قسم کی ہو' اس کی عاقبت بھی اسی انداز کی ہے۔

لفظ تلاوت کے بعد مومن کی برتری کا ذکر' اس کی عظمت کا ذکر

عزیزانِ من! یہ تھا تلاوتِ قرآن کا نتیجہ' یہ تھے قرآن کی زبان میں تلاوت کے معنی اور اس کے برعکس وہ ہے زبوں حالی اور افلاس' تلاوت کا نتیجہ جو ہماری زبان نے یا پھر ہم نے ''تلاوت'' کی ہے۔ برادرانِ عزیز! زبان کی بات نہیں' یہ فریبِ نفس ہے اور جو جانتے ہیں' ابلہ فریبی ہے لیکن دونوں میں سے کوئی شکل بھی ہو' نتیجہ تو ایک ہی ہے۔ کہا ہے کہ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (2:121) ایسے لوگ تباہ و برباد ہو کر رہیں گے' یہاں لانے کے بعد پھر توجہ اُدھر دلائی۔ بات بنی اسرائیل کی چلی آ رہی ہے۔ کہا ہے کہ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (2:122) اے بنی اسرائیل! تم اس انعامِ خداوندی کو یاد کرو۔ کیا ہے انعامِ خداوندی جس کی بار بار قوموں کو یاددہانی کرائی جا رہی ہے؟ کیا ہے انعام خداوندی جس کے لیے قرآن کی سورة الفاتحہ میں یہ دعا سکھائی جاتی ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ . صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ . (1:5-6) صراطِ مستقیم ابھر کر سامنے آ جائے یعنی غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ (1:6) وہ راستہ جس پر چل کر سعادت مندامم سابقہ زندگی کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہوئیں' اس سے انہوں نے کائنات کی قوتوں کو مسخر کر کے' اپنی ہم عصر اقوام میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی۔ عزیزانِ من! انعاماتِ خداوندی کی فہرست تو طول طویل ہو گی' یہاں قرآن نے ایک لفظ میں اس کا ملخص بیان کر دیا ہے۔ اور

وہ یہ ہے کہ وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ (2:122) اقوامِ عالم پر تمہیں ہم نے Superiority (افضلیت) عطا کی تھی۔ یہ ہے انعامِ خداوندی یعنی اپنی ہم عصر اقوام میں افضلیت حاصل ہونا۔ یہ ہے انعامِ خداوندی۔ برادرانِ عزیز! سن رہے ہیں' ان میں افضلیت کا حاصل ہونا!

مومنے بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

دوسروں کے ہم دوش چلنا' برابر چلنا' بھی مومن کا شعار نہیں ہے' اس کی غیرت تو اس کو برداشت ہی نہیں کرتی۔ وہ تو بالائے ہر بالاترے ہے اس لیے کہ قرآن نے کہا ہے کہ وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ (2:122)۔ یہ نہیں کہا کہ ہم نے تمہیں اقوامِ عالم کے برابر کر دیا تھا۔ کہا یہ ہے کہ اقوامِ عالم کے اوپر فضیلت دی تھی۔ یہ ہے انعامِ خداوندی اور جو انعامِ خداوندی کا مستحق نہیں ہوتا یا اس پہ انعام نہیں ہوتا تو اس کے متعلق کہا کہ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ (1:6)۔ وہاں پڑا ہوا ہے' مغضوب علیہ ہوتے ہیں' وہ ضآلین ہوتے ہیں' وہ راستوں سے بھٹکے ہوئے ہوتے ہیں' غضبِ الٰہی ان کے اوپر وارد ہو رہا ہوتا ہے۔ اگر مومن کی قوم' ملتِ اسلامیہ اقوامِ عالم کے اندر Superiority (افضلیت) حاصل نہیں کیے ہوئے' تو یاد رکھیے! وہ خدا کے غضب میں محبوس ہے' وہ انعامِ خداوندی سے محروم ہے۔ یہ تو ایسے ٹیسٹ ہیں' قرآن تو عاقبت پہ چھوڑتا ہی نہیں ہے کہ وہ غیر محسوس حقیقت ہے' وہاں جا کر کوئی دیکھ نہیں سکتا' وہاں سے کوئی واپس نہیں آ سکتا۔ وہ نتائج کو یہاں دکھاتا ہے۔

نوعِ انسانی کے لیے آخری ضابطۂ حیات کی اہمیت اور عقلِ انسانی کے تصورات کی فریب دہی

عزیزانِ من! یہ قرآن اتنا عظیم ضابطۂ حیات ہے جو خدا نے دیا ہے اور خدا نے بھی یوں دیا کہ

تورا کشید و او دست از قلم کشید

تجھے لکھا' تو اس کے بعد اس نے قلم رکھ دیا۔ یہ خدائے ذوالجلال کی آخری تصنیف' پوری نوعِ انسانی کے لیے قیامت تک کے لیے ضابطۂ حیات ہے۔ کیا اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ وہ اس کی ماننے والی اقوامِ عالم کے اندر سر اونچا کرنے کے قابل ہو جائے' اس کے نصیب میں سرفرازیاں ہوں؟ یہ کچھ قرآن نے کہا ہے لیکن یہ چیزیں کس طرح سے نصیب ہوتی ہیں؟ وہ کیا نظام ہے جو قرآن قائم کرتا ہے؟ برادرانِ عزیز! غور فرمائیے اس کی ایک جھلک سامنے آتی ہے۔ کہا ہے کہ وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا (2:123)۔ اب یہ تمہاری دھاندلیاں ہیں' تمہارے یہ اعتقادات ہیں کہ ہمارے سوا کوئی جنت میں نہیں جا سکتا' کیوں نہیں جا سکتا؟ کہتے ہیں ہیں کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں

سے ہیں' اولادِ ابراہیم علیہ السلام ہیں' اگر ہم گناہ کرتے ہیں تو اس کے لیے خدا کی منت مانی ہوئی پوری کر دیتے ہیں' ہمارے فلاں فلاں شفیع ہیں' جو ہماری شفاعت کر دیتے ہیں' ہم جنت کے اندر نہیں جائیں گے بجز دو چار دن کے' جب تک کہ وہ سفارش کرنے والا فارغ ہو کر ادھر ہمیں چھڑانے کے لیے جائے گا۔ یہ سارے اعتقادات تھے۔ اس نے کہا کہ اس سے اقوامِ عالم میں فضیلت نہیں حاصل ہو سکتی۔ یہ نظام نہیں جو خدا کی ہدایت دیتا ہے۔ کیا ہے وہ نظام؟ کہا کہ دیکھو! اب وہ دور آنے والا ہے وَاتَّقُوْا يَوْمًا (2:123)۔ اس کے معنی یہی نہیں ہیں کہ قیامت کے دن یہ بات ہوگی۔ برادرانِ عزیز! یہ بڑی عظیم چیز ہے۔ ہم نے جہاں اپنے آپ کو اور فریب دیئے ہیں' ایک بہت بڑا فریب دیا ہے' 'جہاں کوئی چیز اس قسم کی آئی' ہم نے اسے قیامت پہ اٹھا دیا کہ یہاں بات ہی نہ پتہ چلے۔ کہا کہ اب ڈرو اس دور سے جو یہاں آ رہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے جس نظام کی تشکیل فرمائی' اس میں اب یہ حقیقت تمہارے سامنے آئے گی' کیا اصول ہیں زندگی کے؟ کیا ہوگا' وہ دور' جس میں کیا بات ہوگی؟ کہا کہ يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا (2:123) ہر انسان کا فیصلہ اس کے ذاتی اعمال' کردار' جوہر اور صفات کے مطابق ہوگا۔ کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا' آن میرٹ (حُسن و قبح کی بنیاد پر) ہر چیز کا فیصلہ ہوگا۔ کتنا عظیم اصول ہے!

قرآنی نظامِ حیات کا نفاذ اس کرہ ارض پر ہوگا اور کوئی چھوٹ نہیں سکے گا

برادرانِ عزیز! بات قیامت تک کی نہیں ہے۔ وہاں تو اعمال کے لیے موقع ہی نہیں ہے' وہاں تو صرف حساب کیا ہوا ہوتا ہے کہ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (59:18) ہر انسان کو یہ دیکھنا چاہیے کہ میں مستقبل کے لیے' آج کیا بھیج رہا ہوں۔ وہاں تو اس بھیجے ہوئے کا صرف حساب ہونا ہے۔ یہ یہاں کی بات ہے کہ یہ نظام اس قسم کا نظام ہوگا۔ باطل کے نظام میں تو بھروسہ ہی سارا اشخاص پہ ہوتا ہے:

سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے ہے ❶

اس نظام میں 'سیاں کوتوال' چھوڑ کے صدرِ مملکت بھی کیوں نہ ہو جائے' وہاں تو یہ ہوتا ہے کہ يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا (2:123) یہ وہ دور ہے جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کے جرم کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں ہٹا سکے گا' ہر ایک کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اور یہی وہ چیز تھی جس کے متعلق کہا تھا کہ یہ وہ نظام ہے' جس میں یاد رکھو! کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (6:164) عزیزانِ من! یہ آیہ جلیلہ بھی ہمارے ایوانِ حکومت کے ہر ایوان کے دروازے کے اوپر جلی قلم سے لکھی ہوئی ہونی

---

❶ یہ مثل ہے کہ جس کا رشتہ دار یا واقف کار حاکم ہو' اسے قانون کا ڈر نہیں ہوتا۔

چاہیے۔کہا ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (6:164) کوئی بوجھ اٹھانے والا' کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا' ہر ایک کو اپنا اپنا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کی ذمہ داریاں کس طرح کی ہوتی ہیں؟ لاٹھی کس کے اوپر جاتی ہے؟ کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا صاحب! يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ (2:123)۔ کوئی کچھ دے کر نہیں چھوٹ سکے گا۔اس کا بھی سوال نہیں ہے اور اگلی چیز یہ ہے کہ وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ (2:123) اس کے اندر کسی کی شفاعت' کسی کی کوئی سفارش کام نہیں دے گی' یہی چیزیں ہیں' جس سے مجرم آپ کے باطل نظام میں' اشخاص کے ساتھ تعلقات سے' کچھ دے دلا کر' سفارش پہنچا کر چھوٹ جاتا ہے' قرآن کہتا ہے کہ نہیں! اقوام عالم پہ فضیلت حاصل ہونے کے یہ راستے نہیں ہیں۔اس کے لیے اس قسم کا نظام ہونا چاہیے کہ مجرم کو جرم کی سزا ملے۔جس نے حسنِ کردار کی کوئی چیز کی ہے' اس کی Appreciation (پسندیدگی)' اس کا معاوضہ ہو۔اس میں واسطہ ہی نہ ہو کہ اس کا تعلق کس سے ہے۔اس کے لیے Recommendations (سفارشات) ہونی چاہئیں۔اور دے دلا والی بات تو پھر پوچھیے ہی نہیں۔کسی زمانے میں مقدمے میں چیف کورٹ لگا کرتا تھا' اب اس کی بجائے ہر بات جو آپ نے کہیں درخواست دی ہے' اس کے ساتھ نیچے کہتے ہیں کہ چاندی کے پہیے لگائیے' نہیں تو کاغذ چلتا ہی نہیں ہے۔کیا اس نظام کے اندر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو اقوامِ عالم کی فضیلت حاصل ہو؟

قوموں کا وقار اور ان کی فضیلت اجتمائی کردار کی رہینِ منت ہوتی ہے اور یہی اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام ہے

عزیزانِ من! جو جی میں آئے آپ کر لیجیے' قوموں کی فضیلت ان کے انفرادی اور اجتماعی کردار اور کیریکٹر کی بنا پہ ہوتی ہے۔عزت کیریکٹر سے ہوتی ہے' احترام اسی کا نام ہے' شرفِ انسانیت اسی سے پیدا ہوتا ہے۔کہا ہے کہ یہ تھی وہ چیز اور اگلی بات جو کہہ دی ہے وہ تو صاحب! کپکپا دینے والی ہے۔کہا ہے کہ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (2:123) جن کے ہاں اس قسم کے معیار قائم ہو جائیں گے تو باطل کے نظام کی یہ خرابیاں پیدا ہو جائیں گی' اس لیے یاد رکھو! کوئی ان کی مدد کرنے کے لیے بھی نہیں آئے گا۔یہ ہو سکتا ہے کہ بھیک کا ٹکڑا تو آپ کسی سے مانگ لیں۔مدد اور دوستی تو برابری پہ ہی ہوتی ہے۔کہتے ہیں کہ یہ کیفیت ہو گی لیکن اس سے محفوظ رہنے کے لیے بڑے عزم اور بڑی استقامت کی ضرورت ہے' اس کے لیے بڑی قربانیاں کرنا پڑتی ہیں۔اس کے لیے آپ نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی مثال پیش کی' جس کی طرف نسبت کرنے سے وہ بنی اسرائیل کہتے تھے کہ ہم بغیر کچھ کیے ہوئے جنت میں چلے جائیں گے۔اسی ابراہیم علیہ السلام کی پیش کردہ ہیں' جس ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے پہ تمہیں ناز ہے۔

لفظ ابتلا کا لغوی مفہوم

عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ کیا تمہیں پتہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ مقام کیسے حاصل ہوا تھا؟ بتایا ہے کہ وَ اِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ (2:124)۔ یہ جو عربی زبان میں بلیٰ کا لفظ ہے ہمارے ہاں یہیں سے لفظ ''ابتلا'' نکلا اور ابتلا کے معنی ہوتا ہے کسی کو ''آزمانا' کسی کو آزمائش میں ڈالنا۔ یہ جو آزمانا ہے آپ دیکھیں گے کہ یہ اس کے معنی ہمارے ہاں لیے جاتے ہیں۔ اس بات کو خدا کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیے یہ بڑی غلط بات ہے۔ ہم آزماتے ہیں کسی کو مثلاً دوست ہے اس کے متعلق یہ یقین نہیں ہے کہ وہ وقت پہ ہمارے کام آئے گا یا نہیں؟ کسی مشکل کے وقت ہم اس کو ایک بات کہتے ہیں اور اس کے بعد ہم اس کی دوستی کو آزماتے ہیں اگر وہ اس میں پورا اترتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے۔ یعنی ہمیں پہلے یقین یا پتہ نہیں تھا کہ یہ کیسا نکلے گا' کیا کرے گا؟ پھر اس کے اوپر ہم ایک مشکل ڈالتے ہیں پھر دیکھتے ہیں کہ وہ کیسا نکلے گا؟ خدا کے متعلق تو یہ چیز بڑی غلط ہے۔ وہ تو علیم و سمیع و خبیر ہے اسے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ یہ جانے کہ صاحب! یہ ایسے وقت میں کیسا نکلے گا؟ اس کو تو پتہ ہے۔ اس لیے خدا آزمائشوں میں نہیں ڈالتا۔ اور یہاں تو ہمارے ہاں جتنے بھی مقربین بارگاہِ الٰہی یا بزرگانِ عظام ہیں ان کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ صاحب! اللہ میاں ان کو آزمائشوں میں ڈالتا رہتا ہے۔ ''آچنگا یار لبھا جی ❶''۔

عزیزانِ من! یہ آزمائش نہیں ہوتی۔ بلیٰ کے معنی ہوتا ہے ''کسی کو مختلف مواقع بہم پہنچانا' اپنی ذات کو خود ٹیسٹ کرنے کیلیے کہ میں کس مقام پہ کھڑا ہوں۔'' اس میں خدا اس کو نہیں دیکھتا کہ کیا اس کے اندر صلاحیت بیدار ہوگئی ہے۔ انسان کو اپنے متعلق کچھ پتہ نہیں ہوتا' بعض اوقات غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات اپنے اندر کی صلاحیتوں کا علم ہی نہیں ہوتا جب تک کہ کوئی موقع سامنے نہ آئے۔ موقع سامنے آئے تو اس وقت پھر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ میں کہاں کھڑا ہوں' میرے اندر کیا کیا صلاحیتیں ہیں' کیا کیا کمزوریاں ہیں۔ زندگی میں اس قسم کے مواقع کا بہم پہنچ جانا ابتلا کہلاتا ہے۔ اس قسم کے بڑے مواقع آئے' ان مواقع کے اوپر ابراہیم علیہ السلام نے کیا کیا؟ کہا کہ فَاَتَمَّهُنَّ (2:124) ہر موقعے کے اوپر وہ پورا اترا۔ یہ اسوۂ ابراہیم علیہ السلام بڑی چیز ہے۔ قرآنِ کریم میں دو ہی ہستیاں ہیں' جن کے متعلق کہا ہے کہ ان کی زندگی تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ ایک حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کہ وہ قیامت تک کے لیے سراجِ منیر ہیں۔ شاہراہِ حیات کے اوپر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو نقوشِ قدم آ گئے' قیامت تک کے لیے جگمگاتے تاروں کی طرح' کاروانِ انسانیت کے لیے راہنمائی کا کام دیں گے اور دوسری ذات حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔ ان دو ہی کے متعلق قرآن نے خصوصیت سے کہا ہے۔ پھر نظری طور پر یہ تو نہیں تھا کہ یہ

---

❶ یہ کیا ہی خوب جگری یار ملا جی!

تمہارے لیے ماڈل ہیں، وہ ماڈل بھی سامنے رکھ دیا۔ اگر اسکول میں کوئی ماسٹر بچوں سے یہ کہے کہ اس ماڈل کے مطابق تصویر بناؤ اور ماڈل سامنے نہ رکھے تو وہ تصویر اس ماڈل کے مطابق نہیں بنے گی۔ جو یہ کہے گا کہ یہ ماڈل ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ اس ماڈل کی تفصیل آپ کے سامنے رکھے اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ اور ابراہیم علیہ السلام کی جو زندگی ہے، ان کے اصولی خط و خال، ماڈل کی طرح، سامنے رکھ دیئے ہیں۔ حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ قرآن کے اندر محفوظ ہے، یاد رکھیے گا! اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعاتِ حیات بھی قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کہاں کہا ہے؟ یہ بڑی غور طلب چیز ہے لیکن اس سے ذرا پہلے دیکھ لیجیے کہ یہ کیا کیا مواقع آئے تھے، اس قسم کی جسے ہم آزمائشیں کہتے ہیں کیا کیا آئی تھیں۔

ملوکیت کے دور میں مذہبی پیشوائیت کا کردار اور اس کے اختیارات کی وسعت

سنیے! آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ ایک عظیم سلطنت میں ہیڈ پریسٹ ہے، سب سے بڑا پجاری ہے۔ آج ہم نہیں سمجھ سکتے کہ یہ جو پجاری یا پریسٹ ہے اس کی حیثیت کیا ہوتی ہے؛ پجاری کا لفظ ہو تو مندر کا برہمن سامنے آجاتا ہے، ہمیشہ مانگتا ہے بیچارہ۔ اگر آپ کے ہاں مولوی یا پیر سامنے آجاتے ہیں، وہ بیچارے بھی آپ کے سامنے ہیں، جو ان کی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ تو پاکستان بننے کے بعد آندھی کے پیر ہیں، کوئی صاحب جائیداد ہو رہا ہے، کوئی موٹریں چل رہی ہیں، یہ ٹیلی ویژن لگ رہے ہیں ورنہ آپ کو معلوم ہے کہ جمعرات کی روٹیاں ہوتی تھیں لیکن پہلے زمانے میں جب کہ مذہبی پیشوائیت کے ساتھ ملوکیت کا گٹھ جوڑ ہوتا تھا، مذہبی پیشوائیت بادشاہت اور سلطنت کا سہارا ہوا کرتی تھی۔ اگر فرعون کے ساتھ ہامان نہ ہو تو فرعونیت چل نہیں سکتی تھی۔ قرآن ان کے جنود بتاتا ہے، لشکر ہوتے تھے۔ آپ مصر کی وہ تاریخ پڑھ کر دیکھیے۔ اس زمانے میں دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند وہ بادشاہ نہیں ہوتا تھا، وہ ہیڈ پریسٹ ہوتا تھا۔ سب سے بڑا اقتدار ہیڈ پریسٹ کا ہوتا تھا۔ جب تک یہ اس کو اذن نہ دیدے، اس کے ماتھے کے اوپر تلک نہ لگا دے وہ بادشاہ، بادشاہ نہیں بن سکتا تھا۔ اس بادشاہ کو اس ہیڈ پریسٹ کی اتنی محتاجی ہوتی تھی اور پریسٹ کے اوپر کوئی اور طاقت ہی نہیں ہوتی تھی، وہ خدا کا اوتار ہوتا تھا۔ اس کی اتنی بڑی قوتیں تھیں۔ آپ یورپ کی ہسٹری پڑھ کر دیکھیے اور دیکھیے کہ وہاں چرچ نے کیا قیامت برپا کر رکھی ہوئی تھی۔ انگلستان کے بادشاہ چرچ کے مقروض ہوتے تھے۔ ان کی بڑی قوتیں ہوتی تھیں۔

بیٹا باپ کے سامنے توحید کا پرچم لیے کھڑا ہے

عزیزانِ من! حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ اتنی بڑی عظیم مملکت میں ہیڈ پریسٹ ہے۔ یہ باپ آذر ہے۔ بیٹا وراثتاً اس گدی کا مالک ہے۔ دیکھیے تو سہی کہ کتنی بڑی عظیم چیز ہے۔ اس بیٹے کی کیفیت کیا ہے؟ یہ کہ باپ سے کہہ رہے ہیں کہ ابا جان! یہ کیا واہیاتی ہے کہ اپنے

ہاتھوں سے مورتی گھڑتے ہو اور پھر اس کے سامنے جھکتے ہو اور دوسروں کو بھی جھکاتے ہو' تف ہے تمہاری اس عقل کے اوپر۔" ارے ابراہیم علیہ السلام! کیا کہہ رہے ہو تم"؟ اس کو اس سے واسطہ نہیں تھا کہ یہ پتھر اور اس کی مورتی کیا ہے؟ اسے تو یہ پتہ تھا کہ ہیڈ پریسٹ (اسقفِ اعلیٰ) کا مقام کیا ہے۔ "ارے اتنی بات زبان پہ نہ لاؤ' کوئی تمہیں پریسٹ نہیں بنانے کا" یہ اتنی بڑی چیز چھن رہی ہے۔ باپ خود کہہ رہا ہے کہ تم تو ایک طرف' میں خود اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کرتا ہوں کہ آیا میں تمہیں گھر میں رکھوں یا نہیں۔ "تم نے اگر یہ باتیں نہ چھوڑیں تو یاد رکھو! یہاں سے نکال دوں گا' وطن بدر کرا دوں گا' دیس نکالا کرا دوں گا' یہاں رہنے نہیں دوں گا۔" اس علیہ السلام نے کہا کہ ابا جان! جو نصیحت میرے سامنے آ گئی ہے وہ تمہارے سامنے نہیں ہے۔ تم یہ کرو گے' اس کے باوجود میں تمہارے لیے کوشش کروں گا کہ تم خدا کی ہدایت میں آ جاؤ اور تمہیں حفاظت مل جائے۔ میں جانتا ہوں تم بچ نہیں سکتے۔ وہاں سے نکلتا ہے' قوم کے سامنے آتا ہے۔ ہیڈ پریسٹ (اسقفِ اعلیٰ) کا بیٹا تھا' مندروں کے اندر تو کھلے بندوں جاتا تھا۔ وہ واقعہ آپ کو معلوم ہے کہ جو اتنا بڑا مملکت کا سب سے عظیم معبد ہے' اس میں ان کے ہاں کے جو سب سے عظیم بت اور دیوتا رکھے ہوئے ہیں' وہ ضربِ کلیمی علیہ السلام سے ان کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ ستارہ پرست قوم تھی' ایک ایک ستارے کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مشاہداتی دلائل سے اپنی قوم کے باطل عقائد کا ابطال کرتا تھا مثلاً جب رات کے وقت ستارہ نمودار ہوتا جس کی وہ قوم پرستش کرتی تھی تو ابراہیم علیہ السلام ان سے کہتا کہ اچھا! تم کہتے ہو کہ یہ میرا پروردگار ہے اس کے سامنے جھکنا چاہیے؟ اس کے بعد جب وہ ڈوب جاتا تو وہ ان سے کہتا کہ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (6:77) جو آج چڑھتا ہے کل غروب ہو جاتا ہے' میں اسے پسند نہیں کرتا۔ بھلا ایسی چیز بھی پروردگار ہو سکتی ہے جو ابھی چمکتی ہو اور ابھی غروب ہو جائے۔ جو تغیر پذیر ہو' وہ خدا کیا ہوا؟ کیا فقرے ہیں ابراہیم علیہ السلام کے' صاحب! آپ علیہ السلام بادشاہ کے سامنے جا پہنچے ہیں۔ عزیزانِ من! سوچیے تو سہی "تھانے دا سپاہی مان نئیں ہوندا ہیگا' ذرا مقابلہ کر کے تسی دیکھو❶"۔ اس زمانے کا بادشاہ' جس کو نمرود❷ کہا جاتا ہے' وہ اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے: "میری قوت اور میرے اقتدار سے تم انکار کر رہے ہو! کونسا وہ خدا ہے تمہارا اس قسم کا؟

حقائق کو محسوس انداز میں پیش کرنا زیادہ اثر انداز ہوتا ہے

فرمایا کہ وہ خدا موجود ہے۔ قرآن میں وہ آیتیں موجود ہیں جب آپ وہاں آئیں گے تو میں تفصیل سے بتاؤں گا۔ انہوں علیہ السلام نے کہا تھا کہ میرا خدا وہ ہے' جو مارتا ہے' جو زندہ کرتا ہے۔ اس نے کٹ حجتی کی کہ میرے حکم سے یہاں پھانسی دی جاتی ہے' میرے حکم سے

---

❶ پولیس تھانے کا سپاہی کسی سے کم نہیں ہوتا' آپ ذرا مقابلہ وموازنہ کر کے تو دیکھیں۔

❷ نمرود کے لیے دیکھیے پرویزؒ: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ النور (مدیر پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق)۔ ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007ء ص-216 (فٹ نوٹ 3)

پھانسی پانے والے مجرم کو چھوڑ دیا جاتا ہے' زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں اصول تھے' انہوں نے مناظرہ نہیں شروع کیا' وہ سمجھ گئے کہ اس کا ذہن کس طرف جاتا ہے' وہ محسوس چیز کو سمجھنا چاہتا ہے' Abstract (غیر محسوس) حقائق کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا یا سمجھنا نہیں چاہتا۔ کہا کہ میرا رب وہ ہے جو ہر صبح مشرق سے سورج کو نکالتا ہے' اگر تیری قوت ہے تو مغرب سے نکال کر بتا؟ بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ وہ مقامات ہیں' جن سے ابراہیم علیہ السلام گزر رہا ہے اور اس کے بعد' اتنی بڑی سلطنت میں' اتنا بڑا مقامِ وجاہت' منصبِ عزت و شرف اور دولت انہیں ملنے والی ہے' اور اس طرح یہ اتنی بڑی قوم کا ایک فرد ہے۔ اب اس کے بعد آپ علیہ السلام کی کیفیت یہ ہے کہ جب یہ سارا کچھ کیا ہے کہ پلہ جھاڑ کر اٹھتا ہے اور کہتا ہے اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (37:99) میں چلا اپنے اللہ کی طرف' اپنے نشو ونما دینے والے کی طرف۔ اللہ تو ہر جگہ تھا' یہ سب کچھ چھوڑ کر کہاں جا رہا ہے۔ وہاں پر کہ جہاں خدا کا نظام عملاً متشکل ہو سکے۔ یہاں نہیں ہو سکتا' وہاں ہو سکتا ہے۔ یاد رکھیے' عزیزانِ من! اقدار کے اعتبار سے خدا ہر جگہ موجود ہے' انسانی نقطہ نگاہ سے خدا وہیں ہوتا ہے' جہاں خدا کا نظام کارفرما ہوتا ہے' ورنہ اگر وہاں خدا نہیں ہوتا' تو ابلیس اور شیطان ہوتا ہے' طاغوت ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (37:99)۔ کیا عجیب بات ہے! یہ اسوۂ حسنہ۔

قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ بیان کرنے اور اسے محفوظ کرنے کا مقصد

اب میں وہ مقام سامنے لاتا ہوں جہاں میں نے کہا تھا کہ جو اسوۂ حسنہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی زندگی' والذین معه کی زندگی تمہارے لیے بہترین ماڈل ہے' وہ کہاں ہے؟ کہا کہ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (60:4) ابراہیم علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں میں' تمہارے لیے زندگی کا بہترین' حسین ترین ماڈل ہے کہ ''ایسے بنو''۔ ماڈل کے معنی یہ ہوتے ہیں اور ضمناً یہیں سے یہ سارے آپ کے مسائل ہیں جو آپ کی ساری انرجی کو آج Waste (ضائع) کر رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نور تھے یا بشر تھے۔ میں اس قسم کے نظری مسائل میں نہیں الجھا کرتا لیکن آپ دیکھیے کہ بات کتنی صاف ہو جاتی ہے کہ جس کی زندگی ہمارے لیے ماڈل کہی گئی ہے کہ تم نے ایسا بننا ہے' اگر ہم میں ایسا بننے کا امکان ہی نہیں تو وہ ماڈل ہمارے لیے کس کام آئے گا' ایک جو نور کا پیکر ہے' وہ ایک بشر کے لیے ماڈل ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآنِ مجید نے بتایا ہے کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) حضور صلی اللہ علیہ وسلم بار بار انا بشر کیوں کہتے تھے۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا؟ ہر شخص جانتا تھا کہ ہمارے جیسے انسان ہیں۔ ایک انسان کا یہ کہنا کہ میں تمہارے جیسا انسان ہوں کتنی بڑی چیز ہے۔ وہ اس لیے کہا تھا کہ میری زندگی کو جو تمہارے لیے بطور ماڈل پیش کیا ہے تو یہ نہ کہہ دینا کہ صاحب! وہ تو خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے' ان کا کیا ہے صاحب' کسی کی جرأت ہے کہ اسے اپنائے' بندہ بشر [1] ہے۔ توبہ توبہ توبہ استغفر اللہ' توبہ کر'' کتھے او ذات

کتھے تو کتا'' ❷ ۔خدا کہتا ہے کہ یہ تمہارے لیے ماڈل ہیں ۔ ماڈل بننے والا یہ کہہ رہا ہے کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) میں تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہوں ۔قربان جاؤں اس خدا کے صدقے جاؤں اس رسول ﷺ کے ۔ کہا ہے کہ او بابا! میں تو تمہارے ہی جیسا انسان ہوں ۔ جب میں یہ کچھ بن سکتا ہوں' تو ہر شخص یہ بن سکتا ہے ۔ یہ ہوا ماڈل ہونا' اسی لیے کہا ہے کہ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (60:4) تمہارے لیے ابراہیم علیہ السلام اور اس کے رفقاء کا طرزِ عمل نہایت عمدہ ماڈل (نمونہ) ہے ۔ سنیے! کہاں آیا ہے یہ ماڈل؟ مومن کو کیا بننا ہے جن کے لیے ماڈل یہ بنایا گیا ہے؟ آپ علیہ السلام نے اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ (60:4) اپنی پوری قوم کو للکار کر کہہ دیا کہ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (60:4) میں تم سے اور یہ جو تمہارے معبودانِ باطل ہیں' ان سے اظہارِ نفرت کرتا ہوں' بری الذمہ ہوں میں ان تمام سے' میں ان سے سارے تعلقات منقطع کرتا ہوں ۔

باطل کو باطل اور حق کو حق نہ کہنے والی قومیں ہمیشہ تباہ ہو جاتی ہیں

عزیزانِ من! جن کے لیے ماڈل بنایا گیا تھا' گریبان میں یوں جھانک دیکھیں ۔ کیفیت یہ ہو جاتی ہے یا ہو چکی ہوئی ہے کہ غلط کوش اور غلط کار حاکم تو ایک طرف رہا! حاکم کی تو ہر غلط بات کو بھی کارِ ثواب کہہ کر اس کی تعریف کرتے ہیں کہ سبحان اللہ صاحب! کیا بات ہے آپ کی! اتنی پی کے بھی مدہوش نہیں ہوتے' یہ آپ ہی کا کام تھا ۔ بہت کم دیکھے ہیں ہم نے صاحب! اپنے آپ پہ اتنا کنٹرول رکھنے والے ۔ عزیزانِ من! جن سے محض ملاقات ہوتی ہے' دوستی ہوتی ہے' تعلق ہوتا ہے' اس کی کسی برائی کو بھی برائی کہہ کر اس کو نہیں کہتے ۔ ''کون برا بنتا پھرے' میاں! اس نے اپنی قبر میں جانا ہے' ہم نے اپنی قبر میں جانا ہے ۔'' جب کسی قوم میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے' سمجھ لیجیے کہ ساری قوم قبر میں چلی گئی ۔ ''قبر وی او جیہدے اچ وکھیاں بھندے ہوندے نیں اون والے ❸ ۔'' یہ ایک فرد پوری قوم کو اعلان کر کے کہہ رہا ہے ۔ عزیزانِ من! والذین معہ کی کونسی کوئی اتنی بڑی جماعت تھی ۔ قرآن نے تو کہا ہے کہ ان کے بھتیجے لوطؑ تھے وہ ایمان لائے ہوئے تھے اور وہ تھے ۔ پوری قوم سے للکار کر کہا جا رہا ہے کہ میں تم سے تمہارے معبودوں سے بری الذمہ ہوں' دونوں کے اوپر تف لعنت تم سے والی بات تو برداشت ہو سکتی تھی لیکن یہ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ سے یہ کچھ کہنا!! تو بہت بڑی بات ہے ۔ اور برادرانِ عزیز! یہ تَعْبُدُوْنَ صرف پرستش والی بات نہیں' اس سے محکومت کا بھی تعلق ہے ۔ یہ اور ان کے سارے حاکم' جتنے بھی ہیں' یہ سب اس کے اندر آ جاتے ہیں ۔ کہا کہ كَفَرْنَا بِكُمْ (60:4) ہم تم سے کفر اختیار کرتے ہیں وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ (60:4) تمہارے اور

---

❶ سہو اور خطا انسان کی طبع میں ہے ۔

❷ کہاں وہ ذاتؐ اور کہاں تم ذلیل وحقیر!!

❸ قبر بھی وہ ہے جس میں وہ (گرز لے کر) آنے والے پسلیاں تک توڑ دیتے ہیں ۔

ہمارے درمیان کھلی ہوئی دشمنی ہے۔ یہ شخص کتنا بڑا چیلنج دیئے چلا جا رہا ہے۔ کہا ہے کہ یہ دشمنی ہے۔ بھئی! کیا کوئی صورت بھی Compromise (مفاہمت) کی ہے؟ کیا کوئی شکل بھی اس دشمنی کو دوستی میں بدلنے کی ہے؟ اس شخص کی Conditions (شرائط) سنیے' برادرانِ عزیز! ہاں وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا (60:4) یہ ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہے۔ یہ قرآن ہے' کہتا ہے کہ ایک شرط (Condition) ہے کہ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ (60:4) تاوقتیکہ تم بھی ایک خدا کے قانون کے تابع نہ آ جاؤ۔ اس وقت تک کے تمہارے اور ہمارے درمیان قطعِ تعلق ہے' دشمنی برپا ہے۔ کہا ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ (60:6) جو بھی خدا اور آخرت پہ یقین و ایمان لانے کا امیدوار ہے' ان کے لیے اس میں اسوۂ حسنہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے نوعِ انسانی کی امامت کا یہ مقام اپنے اندر قدم قدم پر کٹھن منازل سے گزرنے کا سبق لیے ہوئے ہے

برادرانِ عزیز! دیکھ رہے ہیں کہ وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ (2:124) اس قسم کے بہت سے مواقع اس کے سامنے آئے۔ وہ ہر موقع کے اوپر اس معیارِ انسانیت پہ پورا اترتا چلا گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کیا وہ نتیجہ آخرت میں جنت تھا؟ ہاں' یقیناً وہ تو ہے۔ بس کیا یہی بات ہے؟ کیا اسی سے ہم مطمئن ہو جائیں؟ سنیے' عزیزانِ من! اس زندگی بسر کرنے کا نتیجہ کیا ہے؟ قَالَ (2:124) اس نے کہا کہ تم اس پر پورے اترے ہو اس لیے اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (2:124) نوعِ انسانی کی امامت تیرے حصے میں آ گئی۔ یہ امامتِ نوعِ انسانی (Leadership of the Entire Nations of The World) ہے' جو تیرے حصے میں آئی ہے۔

عزیزانِ من! زندگی میں' اس قسم کے حیاتِ اجتماعی میں بڑے مواقع آتے ہیں۔ کم از کم یہ خطۂ پاک [1] تو اس نے ہمیں اس لیے دیا تھا کہ تمہیں انسانیت کی امامت مل جائے۔ یہ ہمارے ہاں بھی بہت بڑی Opportunity (موقع) آئی تھی' ہزار برس سے یہ اعلان کسی نے نہیں کیا تھا کہ ہم خدا کا نظام قائم کرنے کے لیے خطۂ زمین مانگتے ہیں۔ اس نے یہ موقع دیا تھا' ایک موقع آیا تھا' امامتِ نوعِ انسانی کی ایک Opportunity آئی تھی' لیکن اس نے جو کہا تھا کہ پھر جو اس سے کفر برتے گا' اس کا مقام اسفل سافلین (95:5) ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ پست سے پست درجہ اقوام کے ہاں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کہا ہے کہ وہ اس پر پورا اترا قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (2:124) انسانیت کی امامتِ کبریٰ تیرے حصے میں آ گئی۔

---

[1] یہ اشارہ پاکستان کی تشکیل کی طرف ہے کہ اس میں خدا کا نظام قائم کریں گے جو ہم اب تک ضائع کرتے چلے آ رہے ہیں۔

برادرانِ عزیز! اب آپ نے دیکھا کہ فرد کے لیے امامت کیسے ملتی ہے؟ اس سے کہ یہ کیریکٹر میں فرد پیدا ہو۔ قوم کو امامت کس طرح ملتی ہے؟ اس طرح سے کہ یہ قوم میں کیریکٹر پیدا ہو۔ یہ ہوتا کیسے ہے؟ یہ اس نظام کے متشکل کرنے سے ہوتا ہے جو پہلی آیت میں کہا گیا ہے کہ لَّا تَـجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ (2:123) اس نظام کے اندر یہ کیریکٹر پیدا ہوتا ہے۔ اس کیریکٹر سے اقوامِ عالم میں اس قوم کو فضیلت ملتی ہے' یہ امامت ان کو حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن ایسا تھا کہ جس کے الفاظ نہیں بدلے جاسکتے۔ اب مسئلہ آ گیا ایسا مشکل' اب کریں کیا؟ اکبر الہ آبادی (1846-1921ء) نے کہا کہ ڈرنے کی بات نہیں:

مری قرآن دانی سے خفا کیوں ہو گئے صاحب!
مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے

''گل کر' چاہنا کی ہیگا ایں ❶'' مجھے تفسیر بھی آتی ہے۔

قرآن کی یہ آیات ہیں' میں پوچھتا یہ ہوں کہ ان میں کہیں کوئی ایسی چیز بھی آتی ہے جو تفسیر طلب بھی ہو لیکن! مجھے تفسیر بھی آتی ہے' اپنا مدعا کہیے ''مدعا ہووے کہ جوتیاں پین ڈیاں ہویاں نیں' تے گل کیویں بنے فیر؟ کہندا اے کوئی گل نئیں ہیگی ❷''۔ پہلی بات تو یہ ہوگئی کہ اِذِ ابْتَـلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ (2:124) بہت سی باتوں میں' بہت سے مواقع' ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے سامنے دیئے۔ اب آپ اسے آزمائش کہہ لیجیے اور وہ قرآن نے بتا دیا کہ وہ کیا کیا مواقع تھے۔

مروّجہ تفاسیر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے پانچ ''مہمات'' کا ذکر

عزیزانِ من! کیا آپ کو پتہ ہے کہ پھر اس آیت کی تفسیر میں آپ کے ہاں کیا کہا گیا؟ غور سے سنیے گا۔ ہمارے ہاں تفسیر ابنِ کثیر ❸ بڑی معتبر تفسیر ہے۔ اس تفسیر میں مفسر کا اپنا قول نہیں ہے' وہ ان چیزوں کو حدیثوں کی رو سے بیان کرتا ہے یعنی یہ جو تفسیر ہوتی ہے یہ کہی یوں جاتی ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر ہے۔ اندازہ لگایئے' برادرانِ عزیز! ان کی جرأت کا کہ یہ تفسیر منسوب کہاں کی گئی۔ جب یہ چیز کسی سے کہہ دی جائے کہ صاحب! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تفسیر فرمائی تو پھر وہ کونسا شخص ہے جو یہ کہنے کی جرأت کر سکے کہ صاحب! یہ تفسیر صحیح نہیں یا میں اس سے بہتر تفسیر کر سکتا ہوں (معاذ اللہ معاذ اللہ) سنیے کہ اس تفسیر کی رو سے وہ کیا چیزیں ہیں' جو خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

---

❶ بات کرو کہ تم چاہتے کیا ہو؟
❷ مدعا ہو کہ جی! جوتیاں پڑ رہی ہیں تو پھر بات کیسے بنے؟ کہتا ہے کہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔
❸ اس تفسیر کی کچھ تفصیل اس سے پہلے باب (ستائیسویں باب) میں آ چکی ہے۔

سامنے پیش کیں اور پھر وہ ان کے اوپر پورے اترے اور یہ اس کا نتیجہ نکلا۔ پانچ چیزیں تھیں: لبیں ترشوانا' کلی کرنا' ناخن کٹوانا' بغلوں کے بال لینا۔ بیٹیاں اور بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں' مجھے معاف کریں۔ ختنہ کرانا۔ ایک روایت میں اضافہ ہے: ناک صاف کرنا' مسواک کرنا' جمعہ کا غسل کرنا۔ آپ نے غور فرمایا' خدا نے ان مقامات پر ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا اور وہ ان پر پورا اترا تو قال ہم نے کہا کہ جاؤ' **اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا** (2:124) تُو نوعِ انسان کی امامت (Leadership) کا مستحق قرار پایا گیا۔ عزیزانِ من! یہ ہنسنے کا مقام نہیں ہے' خون کے آنسو رونے کا مقام ہے کہ جب آپ کے سامنے اس تفسیر کو یہ کہہ کر پیش کیا جائے کہ یہ کچھ حضور ﷺ نے فرمایا تھا' کہیے! کہ اس کے بعد کلیجہ شق ہوگا یا نہیں؟ امامت ان کو ملی۔ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ امامت کیا ہے؟ ''کہن لگے: مسیت دا امام بنادتا سی۔ گل ٹھیک ہوگئی اماماں دا امام' نقشہ سامنے آ گیا نا پئی اے امام بنادتا مسیت دا او ہناں نیں۔ ایہوای چیزاں ہونیاں چاہیدیاں' داڑھی لمبی' لبیں ترشی ہوئیں' ناخن ترشے ہوئے' جمعہ کا غسل' ناک صاف کی ہوئی ہو[1]''۔ وہ اگرچہ آستین سے ہی کرتے ہیں۔

لفظ امام کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! یہ ہے ان آیات کی تفسیر اور وہ تھا جو قرآن نے کہا تھا کہ زندگی میں اس قسم کی مہمات و مسائل اس کے سامنے آئے' اس قسم کی گھاٹیاں اس کے سامنے آئیں۔ وہ ہر ایک میں پورا اترا اور اس کے بعد پھر ہم نے کہا کہ اب تُو اس قابل ہوگیا ہے کہ انسانیت کی امامت تیرے حصے میں آئے' اور عزیزانِ من! امام کے معنی صرف آگے چلنے والا یا لیڈر ہی نہیں ہوتا۔ یہ عربی زبان کی عظیم چیز ہے' اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں' اب پھر بتاتا ہوں۔ یہ جو دیوار بنائی جاتی ہے' اسے سیدھا رکھنے کے لیے معماروں (Masons) کے پاس ایک آلہ سا ہوتا ہے۔ آلہ کیا ہوتا ہے' بس ایک تاگے کے ساتھ' نیچے وہ ایک لٹو باندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو ساہل (Plumb Line) کہتے ہیں۔ وہ ساہل اس لیے رکھتے ہیں تاکہ دیوار کی کجی کا پتہ چل سکے۔ آپ کو پتہ ہے کہ اوپر اینٹ سے باندھ کر انہوں نے نیچے لٹو لٹکا رکھا ہوتا ہے۔ یہ کاہے کے لیے ہوتا ہے؛ اس سے وہ دیکھتے ہیں کہ آیا دیوار سیدھی اٹھتی چلی جارہی ہے۔ وہ اسے عربی زبان میں امام کہتے ہیں جس سے ماپا جائے کہ امت کی دیوار سیدھی جارہی ہے' کہیں ٹیڑھی تو نہیں ہورہی ہے اور نہیں تو صرف امت کے لیے کہا ہے کہ **اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا** (2:124) وہ یہ دیکھتا تھا کہ انسانیت کے لیے جو دیواریں کھڑی کی جارہی ہیں' وہ سیدھی اٹھ رہی ہیں' کہیں غلط تو نہیں اٹھ رہیں۔ یہ تھی وہ امامت اور آپ کے ہاں' آپ کی تفسیروں کے اندر اس کے معنی ہیں' امام مسجد۔ یہاں کہا ہے کہ نوعِ انسانی کی امامت دے کر بڑی چیز دی۔

---

[1] کہنے لگے: مسجد کا امام بنادیا تھا۔ بات ٹھیک ہوگئی کہ اماموں کا امام بنادیا۔ یہ نقشہ سامنے آ گیا کہ انہوں نے انہیں مسجد کا امام بنادیا۔ یہی چیزیں ہونی چاہئیں کہ داڑھی لمبی ہو' لبیں ترشی ہوئی ہوں' ناخن کاٹے ہوئے ہوں' جمعہ کا غسل ہو' ناک صاف کی ہوئی ہو۔

قرآن حکیم کے نزدیک خونی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی

اگلے الفاظ سنیے: قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ (2:124) کہا کہ یہ تجھے عربی میں اِنِّیۡ جَاعِلُکَ کہا تھا' وہاں تم بھی نہیں کہا تھا۔ فرد کے جوہرِ ذاتی ہیں' اسی فرد کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے۔ پوچھا کہ میری اولاد کے متعلق کیا ہوگا؟ غور فرمایا آپ نے' قرآن کتنی عظیم چیز کہہ گیا ہے۔ عزیزانِ من! بڑی خطرناک گھاٹی ہوتی ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ زندگی میں بیوی بچوں کی محبت وجہٴ زینت ہے اور انہی بچوں کے متعلق یہ کہا ہے کہ یاد رکھو! بیوی بچے تمہارے لیے فتنہ ہیں اور دوسرے مقام پہ ہے کہ یہ تمہارے سب سے بڑے دشمن ہو جاتے ہیں۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے دل میں وہ چیز ہے کہ اولاد وجہٴ جاذبیت ہوتی ہے۔ جواب صاف کرنے کے لیے' اور میں سمجھتا ہوں کہ خود اپنی اولاد کو یہ بتانے کے لیے کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں' یہ سارا کچھ وراثت میں یوں مل جائے گا' وہیں پوچھ لیا کہ **قال ومن ذریتی** (2:124) میری نسل کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ کیا یہ امامتِ نوعِ انسانی محض میرے بیٹے ہونے کی جہت سے وراثتاً منتقل ہوتی چلی جائے گی اور اس کو ملتی چلی جائے گی؟ قال (2:124) جواب ملا کہ **لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ** (2:124) ان میں سے جو بھی ظلم پہ اتر آئے گا' ہمارا یہ وعدہ اس کے لیے پورا نہیں ہو سکتا۔ یہاں کسی کا بیٹا ہونے کا یا کسی کے باپ ہونے کا' سوال ہی نہیں ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے متعلق کہا تھا کہ تُو نے' اے خدا! وعدہ کیا تھا کہ تیرے جو اہل سے ہیں' ان کو بچا لوں گا' بیٹا غرق ہو رہا ہے' پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ کہا کہ نوح علیہ السلام! تُو بات سمجھا نہیں ہے کہ اہل کہتے کسے ہیں؟ تیرے ذہن میں یہ تھا کہ جو Biological (حیاتیاتی) بیٹا ہوتا ہے' وہ اہل ہوتا ہے۔ اہل وہ ہوتا ہے جو تیرے متبعین میں سے ہوتا ہے۔ حضرتِ لوط کی جو بیوی ہے' وہ پیچھے رہ جانے والوں میں ہے۔ بیوی اور خاوند کا کتنا تعلق ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو باپ ہے' وہ الگ ہو جاتا ہے' بیٹا الگ ہو جاتا ہے۔

میدان بدر نے ''اہل'' کے مفہوم کی عملی طور پر وضاحت پیش کر دی

بدر کے میدان میں تو یہ جو امتیازی رشتے ہیں' تکمیل میں پہنچ جاتے ہیں۔ باپ ایک طرف بیٹا دوسری طرف[1]' دادا ایک طرف پوتا دوسری طرف' ماما ایک طرف بھانجا[2] دوسری طرف' شوہر ایک طرف' بیوی دوسری طرف[3]۔ وہاں یہ کیفیت ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ** (2:124)۔ ظالمین کا جو عہد ہے وہ ہم پورا نہیں کرتے۔ آپ نے غور فرمایا کہ ابراہیم علیہم السلام کا اسوۂ حسنہ کیا چیز ہے۔ آگے بات بڑی اہم آ گئی ہے۔ کہا ہے کہ **اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا** (2:124)۔ انسانیت کی امامتِ کبریٰ کا مُستحق تو قرار پایا ہے۔

---

1. حضرت ابوبکرؓ کا بیٹا عبدالرحمٰن مدمقابل تھا۔ عتبہ سردار لشکر کے مدمقابل بیٹا حضرت حذیفہؓ تھا۔
2. حضرت عمرؓ کے ماموں عاص مدمقابل تھے۔
3. ابوالعاص (شوہر) اور آپؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ (بیوی) مدمقابل تھے۔

فکرِ قرآنی کا منتہا نوعِ انسانی کو عالم گیر برادری کی مالا میں پرونا ہے

برادرانِ عزیز! یہاں الناس آیا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ مقام بڑا ہی اہم آ گیا ہے‘ شاید اس درس میں‘ میں آپ کے چند منٹ اور زیادہ لے لوں کیونکہ ابھی وقت ہے اور مجھے یہ بات شروع کر دینی ہے۔ قرآن کے سامنے منتہا کیا ہے؟ کہا ہے کہ **كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213) پوری نوعِ انسانی کو ایک برادری بنا دینا‘ جبھی تو ابراہیم علیہ السلام کے حق میں انسانیت کی امامت کہا ہے۔ ایک بردری متشکل کرنے کے لیے‘ امتِ واحدہ بنانے کے لیے‘ ایک مرکز کی ضرورت ہے۔ یہ تنظیمی طور پر یہ نہایت ضروری چیز تھی۔ ہدایت کے لیے ایک ضابطے کی ضرورت ہے۔ تمام انسانیت کے لیے ایک ضابطہ اور اس پوری انسانیت کے اجتماع کے لیے ایک مرکز کی ضرورت ہے۔ جب یہ صورت ہوئی تو اگلا عملی پروگرام ہوا۔ اس عملی پروگرام کے لیے کیا چیز کہی اور کیا چیز کی گئی؟ کہا یہ کہ کعبے کی بنیاد رکھ لیجیے۔ **اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا** (3:96) سب سے پہلا گھر جو انسانوں کے لیے بنایا گیا‘ تمام انسانیت کے لیے اجتماع کا مقام ہے۔ برادرانِ عزیز! آپ شاید یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ سارے قرآن میں جہاں بھی حج کا ذکر آیا ہے اور کعبے کا ذکر آیا ہے‘ اس کے لیے ہر جگہ الناس آیا ہے‘ یہاں وہی 125 ویں آیت ہے اور درس میں ہمارے سامنے ہے۔ کہا کہ **وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ** (2:125) البیت کو ہم نے‘ اس گھر کو ہم نے ’مَثَابَةً لِّلنَّاسِ‘ بنایا۔ ثواب کے معنی ہوتے ہیں ’’پھر پھرا کر‘ لوٹ کر‘ پھر اسی نقطے پر آ جانا جہاں آنا چاہیے‘‘ انسانیت پھرتی رہے‘ پریشان ہوتی رہے‘ جہاں جی چاہے جاتی رہے‘ اسے آنا وہیں ہے۔

اجتماعی پروگرام کے پیشِ نظر قرآنِ حکیم نے کعبے کو نوعِ انسانی کا مرکز قرار دیا ہے

عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ پہ تو انسان کو وجد آ جاتا ہے۔ کہا ہے کہ گھوم پھر کر‘ پریشاں ہو کر‘ ایک نقطے کے اوپر آنا ہے۔ ہم نے یہ البیت بنایا جو ایک نقطے کے اوپر آنے کے لیے ہے۔ یاد رکھیے! یہ البیت ہے‘ اس کو ہم خانۂ خدا کہتے ہیں۔ قرآن میں خدا نے بھی اس کو **بَيْتِىَ** (2:125) [1] کہا ہے کہ یہ میرا گھر ہے۔ ایک لامکاں اپنی کسی چیز کو میرا گھر کہتا ہے تو یہ تو نہیں ہے کہ وہ خدا مکان کی حدود میں گھر گیا۔ قرآن کا ایک اور نکتہ یاد رکھیے! جس جس چیز کو اللہ نے میرا کہا ہے اس کے معنی ہوتا ہے کہ ’’اس پہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی‘ وہ پوری انسانیت کے لیے کھلا رہے گا۔‘‘ افراد کی ذاتی ملکیت کی نفی کے لیے اس نے ان چیزوں کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ جب اس نے کہا ہے کہ زمین میری ہے‘ تو کائنات کا ہر ذرہ اس کا ہے صاحب! اس کے لیے تخصیص کا ہے کی؟ یہ انفرادی ملکیت نہیں ہے۔

---

[1] قرآن کریم میں ’’بیتی‘‘ تین جگہ آیا ہے: (2:125, 22:26,71:28)

ہر وہ چیز جسے خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے' وہ پوری انسانیت کے لیے ہے

دنیا میں ہر گھر کسی نہ کسی فرد کا گھر ہوتا ہے' کسی قوم کا گھر ہوتا ہے۔ کوئی ایسا مقام بھی تو ہو جو انسانیت کا مقام ہو' جو انسانیت کا گھر کہلا سکے جیسے سورج انسانیت کا ہے۔ سوچیے' عزیزانِ من! قرآن کریم نے کتنا عظیم تصور دیا ہے! اور تصور قرآن کا نہیں' یہ دین کا تصور ہے۔ ہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات چلی آ رہی ہے۔ انسانیت خاندانوں میں' قبیلوں میں' شعوب میں' گروہوں میں' نسلوں میں' ممالک میں' وطنوں میں' بٹی ہوئی ہے' ٹکڑے ٹکڑے ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ٹکڑے ٹکڑے ہوئی انسانیت کو جوڑ کر پھر ایک پیکر میں متشکل کرنا' اس کو ایک برادری بنانا' یہ ہے دین کا منتہا۔ اس کے لیے مَثَابَةً لِّلنَّاسِ (2:125) کہا کہ ٹکڑے ٹکڑے ہوئی انسانیت' پھرتی پھراتی' گھومتی گھماتی' پریشان ہوتی ہوئی' ایک مقام کے اوپر آ کر ٹکے گی۔ یہ کہا کہ وہ یہ مقام ہے۔

ہم نے اس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ اس ایک گھر کی بنیاد رکھ دو۔ بنیاد نہیں بلکہ للناس کے لیے دیواریں کھڑی کر دو۔ کیا الناس یہاں بھیڑ بکری کی طرح جمع ہو جائیں گے؟ نہیں ایک لفظ میں کہا ہے کہ وَ اَمۡـنًـا (2:125) اور یوں انہیں امن نصیب ہو جائے گا۔

نوعِ انسانی کے لیے امن و سکون حاصل کرنے کا راز' عالم گیر نظام کی طرف رجوع کرنے میں ہے

انسانیت پہ یہ ساری تباہ کاریاں ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی وجہ سے آ رہی ہیں۔ ایک برادری بنا دیجیے' ایک نظام دے دیجیے' ایک ضابطۂ حیات دے دیجیے' امن قائم ہو جاتا ہے۔ قیامِ امن کے لیے کوئی دوسری شکل ہے ہی نہیں۔

عزیزانِ من! یہ للناس و امنا دو تین مقام ہیں' میں عرض کر دوں' جہاں قرآن نے الناس کہا ہے۔ ایک جگہ ہے کہ اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىۡ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (3:95) پہلا گھر جو بنایا گیا' یہ الناس کے نفع کے لیے ہے۔ آگے کہا کہ وَمَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (3:96) جو شخص بھی اس مرکز میں داخل ہو جائے گا اسے ہر طرف سے امن و سلامتی حاصل ہو جائے گی۔ یہ وہی ہے جو یہاں کہا ہے' یہ نہیں ہے کہ جو اس گھر میں داخل ہو گیا۔ یہ گھر کے اندر داخل ہونا نہیں ہے کہ وہ چار دیواری یا کوٹھا نہیں ہو گا "اوہدے اندر ساری انسانیت آ کیویں سکدی اے' اوتے تھوڑا جیا ہیگا۔ تے نالے او کہندے نیں ایہدا دروازہ بڑا اُچا سارا ہیگا[1]"۔ بہر حال اس کا مصرف یہ نہیں ہے۔ یہ جس نظام کا Symbol (علامت) ہے' جس نظام کی یہ علامت ہے' یہ وہ نظام ہے جیسے یہ پایۂ تخت' یا جھنڈا' اس نظام کی علامتیں ہوتی ہیں۔ جب پاکستان کا یہ جھنڈا سینما ہال میں آپ کے سامنے آتا ہے تو آپ کو کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ وہ لکڑی

---

[1] اس کے اندر یہ ساری انسانیت کیسے آ سکتی ہے' وہ تو تھوڑی سی ہی جگہ ہے اور پھر ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا دروازہ بڑا ہی اونچا سا رہے گا۔

کا ڈنڈا اور کھدر کا ٹکڑا یا کپڑا نہیں ہوتا' وہ آپ کی مملکت کی علامت ہوتا ہے۔ اس کا احترام' آپ کی مملکت کا احترام ہوتا ہے۔ اس لیے **مَنۡ دَخَلَهٗ** کے معنی ہوئے "جو اس نظام میں داخل ہو گیا جس کا مشہور مرکز یہ کعبہ ہے" **كَانَ اٰمِنًا** (3:97) وہ امن میں ہو گیا اور آگے سنیئے کہا کہ **وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ** (3:97) الناس کے لیے اس گھر کا جو حج ہے وہ برائے اللہ ہے' کسی اور مقصد کے لیے نہیں ہے' وہ خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لیے ہے' الناس کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہاں آ کر جمع ہو جائیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ بات کیا بنی۔ الناس کا یہ لفظ پھر یہاں آیا کہ **جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام** (3:97) خدا نے کعبے کو' اس واجب الاحترام گھر کو' کیا بنایا؟ اب سوال یہ ہے کہ یہ کس مقصد کے لیے بنایا؟ کہا کہ **قیما للناس** (3:97)۔ اسے ایک ایسی چیز بنایا جس سے پوری انسانیت اپنے پاؤں پہ کھڑی ہونے کے قابل ہو جائے گی۔ یہ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو جانا بڑی چیز ہے' تا کہ کسی سہارے کی احتیاج نہ رہے۔ یہاں پھر الناس کہا ہے ایک اور جگہ کہا کہ **الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ الَّذِىۡ جَعَلۡنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالۡعَاكِفُ فِيۡهِ وَ الۡبَادِ** (22:25) وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے ہوں' یہ سب کے لیے یکساں طور پر کھلا ہوا مقام' الناس کے لیے ہے۔

انسانیت کے اس کھلے شہر کے متعلق نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث

عزیزانِ من! یہ تصورات اس دور کے اندر دیئے گئے ہیں' آپ دیکھیے تو سہی' یہی تو مقام ہے جہاں نظر آتا ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ یہ ساری انسانیت کے لیے کھلا ہوا شہر ہے' یہ **سَوَآءَ ۨالۡعَاكِفُ فِيۡهِ وَ الۡبَادِ** (22:25) ہے۔ اور یہیں سے ہمارے ہاں شریعت کا مسئلہ آیا جو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ نظر آتا ہے کہ یہ کتنی صحیح حدیث ہے' چمکتی ہوئی موتیوں کی طرح ہے۔ آپ ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ مکے کے مقامات کو کرائے پہ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ خدا نے کہا ہے کہ یہ **سَوَآءَ ۨالۡعَاكِفُ فِيۡهِ وَ الۡبَادِ** (22:25) ہے۔ "ہن اوتھوں تہاڈیاں ہڈیاں ای ویچ کے اوندیاں نیں' او کھل لہا لیندے نیں ساری ❶۔" قرآن نے کہا تھا کہ **وَ اَذِّنۡ فِى النَّاسِ بِالۡحَجِّ** (22:27) الناس میں' انسانیت میں' یہاں اکٹھے ہونے کے لیے اعلان کر دو۔ کاہے کے لیے وہ اعلان کر دے کہ یہاں جمع ہوں؟ اور وہ کاہے کے لیے یہاں جمع ہوں؟ "زم زم دے پانی اچ منہ دھون لئی؟ اوتھوں دی سڑیاں ہویاں کھجوراں لیان لئی ❷؟"

---

❶ اب وہاں سے آپ کی ہڈیاں ہی بیچ کر آتی ہیں۔ وہ آپ کی کھال تک اتار لیتے ہیں۔

❷ کیا یہ زم زم کے پانی میں منہ دھونے کے لیے ہے؟ کیا یہ اس لیے ہے کہ وہاں کی گلی سڑی کھجوریں لائیں؟

حج کے اس موقع پر ملت اسلامیہ کی طرف انسانیت کی منفعت کے لیے ایک اعلانِ عام

کہا ہے کہ لوگوں کو اعلان کر دو کہ وہ یہاں آئیں۔اب سوال یہ ہے کہ وہ یہاں کاہے کے لیے آئیں؛ اس کے لیے کہا کہ وہ اس لیے جائیں لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28) تاکہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ انسانیت کی بہبود کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں۔ یہاں اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ (22:27)۔ جو کچھ کر رہے ہیں' یہ غصب اور سلب ونہب سے نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہاں وہ لفظِ حج ہی بتا رہا ہے کہ یہ تو حجت ہے' یہ دلیل ہے کہ آ کر خود دلیل و برہان کی رو سے دیکھیں کہ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28)۔ تمہاری منفعت کے لیے ہم یہاں کیا چیزیں کر رہے ہیں اور تم ان کی گواہی دو کہ ہاں کر رہے ہیں۔ اس لیے کہا ہے کہ یہاں تم اعلان کرو' انسانیت کو بلاؤ ''اوایدھر آؤ' اوایدھر آؤ۔ کاہدے لئی آؤ؟ تہاڈے کپڑے لہائیے ❶؟ کہا کہ نہیں بلکہ اس لیے کہ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28) عزیزانِ من! قرآن ہے کہ آ کر دیکھو' تمہاری منفعت کی ہم یہاں کیا چیزیں کر رہے ہیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے جہاں جہاں بھی حج اور کعبے کے لیے کہا' وہاں الناس کہا اور یہ قوم جو اس کی کنویز (Convener) تھی' جو اس کا انتظام کرنے والی امت تھی' اس کے متعلق کہا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) تم عوام الناس کے لیے بہترین قوم ہو۔ عربی زبان کا یہ ''ل'' نفع کے لیے آتا ہے۔ تم بہترین قوم ہو جس کو ہم نے اس لیے پیدا کیا کہ انسانیت کے فائدے کے لیے تم کچھ کرو۔ انسانیت کی منفعت کے لیے تمہیں ہم نے ایک بہترین قوم بنایا ہے۔

دوسری جگہ کہا ہے کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143) ہم نے تمہیں ایک امت وسطیٰ بنایا ہے۔ عزیزانِ من! کیا عرض کروں کہ اُمَّةً وَّسَطًا کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی کے لیے انگریزی زبان کا ایک لفظ ہے' Equal Distance جس کو کہتے ہیں کہ جو' ہر ایک سے یکساں فاصلے پر ہو۔'' جیسے دائرے کا جو مرکز (سینٹر) ہوتا ہے اس سے اس کے Circumfrance (محیط) پر کا ہر نقطہ Equal Distance (مساوی فاصلے) پر ہوتا ہے۔ امۃ وسطاً کے معنی یہ ہیں کہ ''دنیا کا ہر فرد' دنیا کی ہر قوم' یہ نہ ہو کہ کوئی تم سے قریب ہو' کوئی تم سے دور ہو' تم سب سے یکساں فاصلے کے اوپر رہو'' کہتے ہیں کہ قرآن کے ترجمے کرو۔ قرآن کہتا ہے کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143)۔ اس کا کیا مقصد ہے؟ تاکہ تم یہ دیکھتے رہو کہ انسانیت کس راستے پہ چل رہی ہے۔ وہ بھیڑ وہاں گئی اسے ادھر واپس لاؤ' یہ اُدھر نکل گئی' یوں اسے واپس لے کر آؤ۔ انسانیت کے لیے تو یہ ہے نگران۔

---

❶ یہاں آؤ اور دیکھو۔ کاہے کے لیے آؤ؟ کیا اس لیے کہ تمہیں کنگال کر دیں؟

ملتِ اسلامیہ کا سالانہ اجتماع یعنی حج اور پھر ضرورت کے مطابق گاہے گاہے چھوٹے اجتماعات یعنی عمرہ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوں گے

اب سوال یہ ہے کہ خود ان کے متعلق کیا صورت ہو؟ ان کے متعلق کہا کہ وَ یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَہِیْدًا (2:143) تمہارے نظام کا سربراہ‘ تمہارے اعمال کا نگران ہے۔ یہ تمہارا نگران ہے اور تم نوعِ انسانی کے لیے یہ کچھ کرو۔ اس نگرانی کے لیے یہ محسوس مرکز کعبہ ہے اور اس کعبے کے یہ اجتماعات ہیں۔ تم کم از کم ایک سالانہ اجتماع تو ضرور رکھو۔ اور اس کے بعد جب بھی Emergency Arise (ہنگامی صورت حال پیدا) ہو‘ جب بھی تمہیں ضرورت ہو‘ وہ سارے کے سارے نہ سہی Selected Gathering (منتخب افراد کا اجتماع) ہی سہی‘ جسے عمرہ کہتے ہیں‘ یہ ضرور رکھو۔ جب ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (2:124) تو اس کے بعد پھر کہا کہ آؤ ہم تمہیں اس کا عملی پروگرام بتائیں کہ کیا کرنا ہے؟ انسانیت کے لیے ایک مرکز محسوس بناؤ۔

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمالیا کہ حج کیا تھا‘ کیا بن کر رہ گیا۔ اب یہ وہی ہے کہ ہمیں تفسیر بھی آتی ہے‘ اپنا مدعا کہیے۔ ہوتا یہ ہے کہ چھپی ہوئی دعاؤں کا ایک ”مرقع“ (کتابچہ) آپ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے‘ وہاں ایک معلم ہوتا ہے‘ آپ کے ناک میں نکیل ڈالی ہوئی ہوتی ہے‘ وہ گھمائے پھر رہا ہے‘ چلائے پھر رہا ہے‘ آپ چل رہے ہیں‘ گھوم رہے ہیں‘ وہ کچھ پڑھتے چلے جاتے ہیں‘ یہ کچھ ہو رہا ہے‘ دھکے پڑ رہے ہیں‘ دھکم پیل ہو رہی ہے۔ جو وہاں حج سے ہو کر آتے ہیں‘ ان سے پوچھیے۔

عزیزانِ من! یہ تھا آپ کا یہ حج‘ یہ تھا آپ کے ہاں کا کعبہ۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ یہ کچھ کرنے کے بعد اس قوم کو امامتِ نوعِ انسانی میسر آجاتی ہے یا نہیں؟ یا لوٹا کر‘ دہرا کر‘ اس کو کہوں کہ یہ کچھ کر ہی وہ قوم سکتی ہے جو نوعِ انسانی کی لیڈرشپ کی حامل ہو لیکن ان کے پیچھے پوری انسانیت آئے گی[1]۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] اس کیسٹ میں ریکارڈنگ یہیں تک ہے۔ وہ مواد یا جو ریکارڈ نہیں ہو سکا تھا‘ یا زیرِ درس نہیں آیا تھا‘ اسے اگلے ہی درس (مورخہ 12 جنوری 1969) میں دیا گیا تھا۔ اس کے لیے قارئین اس کتاب کا انتیسواں باب زیرِ مطالعہ لائیں۔ جہاں (2:125) کا بقیہ حصہ زیرِ درس آیا تھا۔

انتیسواں باب: **سورۃ البقرۃ** (2)' (آیات 125 (مسلسل) تا 134)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ اٰمَنَ مِنۡهُمۡ بِاللّٰهِ
وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنۡ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيۡلًا ثُمَّ اَضۡطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئۡسَ
الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذۡ يَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَيۡتِ وَاِسۡمٰعِيۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ
السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا
مَنَاسِكَنَا وَتُبۡ عَلَيۡنَا ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ
يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ
الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۲۹﴾ وَمَنۡ يَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّةِ اِبۡرٰهٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِهَ نَفۡسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصۡطَفَيۡنٰهُ فِى الدُّنۡيَا ۚ وَاِنَّهٗ
فِى الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذۡ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسۡلِمۡ ۙ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى بِهَاۤ
اِبۡرٰهٖمُ بَنِيۡهِ وَيَعۡقُوۡبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰى لَكُمُ الدِّيۡنَ فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمۡ
كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ ۙ اِذۡ قَالَ لِبَنِيۡهِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ ؕ قَالُوۡا نَعۡبُدُ
اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ
خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۴﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1969ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 125 سے ہوتا ہے: (2:125)۔

سابقہ درس کے سلسلہ میں چند ایک امور کی تجدید یادداشت

تجدیدِ یادداشت کے لیے دہرادوں کہ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کی تعلیم کا اور اس کے پروگرام کا مدعا اور مقصود یہ ہے کہ

پوری انسانیت کی ایک عالمگیر برادری بنادی جائے۔ کہا ہے کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) ٹکڑوں میں بٹی ہوئی انسانیت کو تدریجاً اس منزلِ مقصود کی طرف لے جانا ہے اور اس کے پروگرام کی ہر کڑی درحقیقت ایک قدم ہوتا ہے جو اس منزل کی طرف جانے کے لیے آگے اٹھتا ہے۔ اس ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام موسسِ اعلیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے اس عالمگیر برادری کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔ اس پہلی اینٹ رکھنے والے کی ہمارے ہاں کی طرح کی بات نہیں تھی' بلکہ یہ تھا کہ وَ اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ (2:124) ابراہیم علیہ السلام کو نمو وذات کے بہت سے مواقع بہم پہنچائے گئے اور وہ ہر بات میں پورا اترا۔ اس کے بعد اس سے یہ کہا گیا کہ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (2:124) اب تو نوعِ انسانی کی امامت اور لیڈر شپ کا مستحق ہوا ہے۔ جو اس قسم کی سیرت اور کردار کا حامل ہو' اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اتنی عظیم عمارت کا Foundation Stone (سنگِ تاسیس) رکھے۔ انہیں لِلنَّاسِ اِمَامًا (2:124) کہا گیا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ للناس کہا ہے اور میں نے اس کے بعد یہ عرض کیا تھا کہ کعبے کے متعلق قرآنِ کریم میں جہاں جہاں ذکر آتا ہے' اسے للناس کہا گیا ہے۔ وہ کسی خاص نسل' کسی خاص گروہ' کسی خاص جماعت اور کسی خاص مذہب کا مرکز نہیں ہے' وہ انسانیت کا مرکز ہے۔ اور یہ جسے امتِ وسط کہا گیا ہے' آپ کو یاد ہوگا' میں نے بتایا تھا کہ یہ وہ امت ہے جو دنیا میں ہر قوم اور ہر فرد سے Equal Distance (مساوی فاصلے) پہ ہو۔ اس کے متعلق کہا گیا تھا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) تم وہ بہترین امت ہو جو نوعِ انسانی کے فائدے کے لیے اٹھائی گئی ہے۔ اس امت کا کام صرف ایک کنوینر (Convener) کا ہے یا اس مرکز کے محافظ ہونے کا ہے۔ وہ مرکز اس امت کی ملکیت نہیں ہے' نہ ہی اس کے لیے مخصوص ہے' نہ اس پہ اس کی Monopoly (اجارہ داری) ہے۔ یہ للناس ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' جب خدا کسی چیز کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے جیسے کہ کعبے کو کہا ہے کہ وہ بیتی ہے' میرا گھر ہے' تو اس کے عملی معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ کسی فرد' کسی گروہ' کسی جماعت کی ملکیت نہیں ہوسکتا' وہ پوری انسانیت کے لیے کھلا رہنا چاہیے اور یہی وہ چیز تھی جس کے متعلق سورۃ البقرۃ کی 125 آیت میں کہا تھا کہ ابراہیمؑ کا قائم کردہ یہی وہ نظام تھا' جس کا مرکز کعبہ قرار دیا گیا تھا تا کہ تمام نوعِ انسان اپنے اختلافات دور کر کے' ایک نقطہ پر جمع ہوجائے اور اس طرح ہر قسم کے خطرات سے جو گروہ بندیوں اور قومیت پرستی کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں' محفوظ و مامون ہوجائے)۔

برادرانِ عزیز! اس (2:125) کا ابتدائی حصہ میں نے پچھلی دفعہ پیش کیا تھا' پوری آیت آج سامنے آئے گی۔ کہا ہے کہ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا (2:125) اس مرکزی مقام کو ہم نے منتشر انسانیت کے جمع ہونے کا نقطہ یعنی مرکز قرار دیا۔ عزیزانِ من! مثـــابة اس مقام کو کہتے ہیں' ''جہاں پھر پھرا کر' ادھر اُدھر سے گھوم کر' انتشار کے بعد' پھر سے مجتمع ہوا جائے۔'' انسانیت جہاں جی چاہے' جن وادیوں میں جی چاہے' سرگرداں پھرے' اپنے خودساختہ نظاموں کے ماتحت جس طرح جی چاہے' اپنے لیے گروہ بندیاں اور فرقہ سازیاں بنائے لیکن اسے بالآخر ایک مرکز پر آنا ہے اور وہ ایک سمبل (علامت) کے طور پر یہ جو مرکزِ محسوس ہے' اسے کعبہ کہا

گیا ہے' کہا ہے کہ یہ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ (2:125) ہے۔اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے۔آ گے کہا ہے کہ وَ اَمْنًا (2:125) یہی ہے وہ طریق جس سے پوری انسانیت میں' پوری اقوامِ عالم میں' Peace (امن) قائم ہوسکتا ہے۔امن قائم ہونے کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔

انسانیت کے لیے نسخۂ کیمیا ہونے کے باوجود ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ملت اسلامیہ کی حالت زار

جب تک انسانیت' گروہوں میں' قوموں میں' وطنوں کے دائروں میں' گھری ہوئی ہے' بٹی ہوئی ہے' امن قائم نہیں ہوسکتا۔یہ ایک عالمگیر برادری بنے گی تو پھر ہی اس کو امن نصیب ہوگا۔آپ حضرات کے یہ چیز ذہن نشین ہوگئی' یہ چیز ہمارے سامنے آ گئی اور اس کے بعد اب اس امت کے لیے حکم ہے کہ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (2:125)۔میں نے پچھلی دفعہ عرض ❶ کیا تھا کہ قرآن جو کچھ دیتا ہے وہ تو دین کا نظام ہے' اس کے بعد ہم نے اس دین کو مذہب میں بدل لیا' گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی۔قرآن میں ردوبدل تو نہیں کیا جا سکتا تھا کہ خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے۔الفاظ تو اس کے وہی رہے' الفاظ کا مفہوم بالکل مذہب کے تصور کے مطابق بدل دیا گیا۔اس نے کہا تھا اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (2:124) وہ امامت نوعِ انسانی' اقوامِ عالم کی لیڈر شپ تھی۔ہمارے ہاں پھر یہ امامت مسجد میں نماز پڑھانے کی رہ گئی۔مسجد وہ مقام تھا جہاں انسانیت کو خدا کے قوانین کے سامنے جھکنا تھا۔مذہب میں آ کر وہ صرف پوجا پاٹ (Worship) کے لیے' ایک پرستش گاہ بن گئی۔ابراہیم علیہ السلام کو قرآن نے کہا تھا' آپ کو یاد ہوگا میں نے وہ آیت پیش کی تھی کہ یہ ہے وہ جس کی زندگی تمہارے لیے ایک بہترین نمونہ پیش کرتی ہے' یہ تمہارے لیے ماڈل ہے۔

مروجہ تراجم میں ''مصلیٰ ابراہیمی'' کے معنی اور اس پر عمل کا طریق کار

یہاں قرآن نے یہ کہا کہ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (2:125)۔اس کا قرآنی مفہوم تو بعد میں عرض کروں' عام ترجمہ جو آپ کے سامنے آئے گا وہ یہ ہے کہ مقام ابراہیمی علیہ السلام کو مصلی بناؤ۔''تے مصلیٰ تے تہانوں پتہ اے نا کی ہوندا اے؟ امامتِ انسانیت بدل گئی مسیت دے امام اچ' مسجد ہوگئی مسیت ❷''۔اب یہ جو مقامِ ابراہیمی علیہ السلام کا مصلیٰ ہے' یہ کیا کیا گیا؟ کیا یہ کہ حریم کعبہ میں ایک مقام کے اوپر مصلیٰ بنایا' لائنیں کھینچیں' وہ بنایا مصلیٰ' اسے کہا کہ یہ ہے مقامِ ابراہیم علیہ السلام۔اس پہ عمل یوں ہوا کہ وہاں حریم کعبہ میں ایک خاص مقام کے اوپر جا کر دو نفل پڑھ لینا' حاجیوں کے لیے جنت کی ضمانت ہے۔یہ ہوگئی' اس آیت کی عملی تعبیر۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ پھر مذہب میں آ کر بات کیا ہوتی ہے؟ ابتلائے ابراہیمی علیہ السلام اتنے عظیم مواقع نمو ذات کے تھے کہ جہاں ان کا کیریکٹر اور بلندیٔ سیرت چمکتے

---

❶ سابقہ درس کے آخر میں یہ حصہ ریکارڈ ہونے سے رہ گیا تھا۔یہاں اس کا اعادہ کیا گیا ہے۔

❷ مصلیٰ کا تو آپ کو علم ہے کہ یہ کیا ہوتا ہے؟ امامتِ انسانیت مسجد (مسیت) کے امام کی صورت میں بدل گئی اور مسجد محض مسیت بن کر رہ گئی۔

ستاروں کی طرح سامنے آتی تھی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ وہ جو نمودِ ذات کے مواقع ومقامات تھے ان کے متعلق تو کہا کہ وہ پانچ چیزیں تھیں۔ آپ کو یاد ہوگا جو آپ کے ہاں تفسیر میں آیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے کونسے سے مقام تھے جس میں ان کی آزمائش کی گئی تھی: مونچھیں کتروانا' ناخن کٹوانا' بغلوں کے بال لینا' زیرِ ناف لینا' ختنہ کرنا اور دو اور اس میں جمع کر دیئے گئے: مسواک کرنا' جمعہ کے لیے غسل کرنا۔ یہ تھے وہ اہم ترین مقام جن میں ابراہیم علیہ السلام پورا اترا اور اس سے کہا گیا کہ ہاں! تمہیں ہم نے امامت دی۔ یہ مقامات تھے جو ان کے بقول حضرت ابراہیم علیہ السلام نے طے کی امامتِ نوعِ انسانی' مسجد کی امامت میں بدلی۔ مقامِ ابراہیمی علیہ السلام حریم کعبہ میں ایک نقطہ کے اندر ایک مقام تھا' اس کو کہا گیا کہ یہ ہے جہاں ابراہیم علیہ السلام نے نماز پڑھی تھی۔ مصلیٰ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ کیا ہوتا ہے۔

اب آیئے قرآن کی طرف- ابراہیم علیہ السلام زندگی کے ہر گوشے میں اس معیار پر پورا اترا جو امامتِ نوعِ انسانی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس سے کہا کہ ہاں! اب تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ تم اس مقام کی' اس مرکز کی' جس میں انسانیت کو جمع ہونا ہے' پہلی اینٹ رکھو' اس کی تولیت تمہارے ذمے ہے۔ یہ کرنے کے بعد اب اس امت کو جو اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمی علیہ السلام کی پیرو کہلاتی ہے کہا کہ تمہارے لیے اب کرنے کا کام یہ ہے۔

لفظ مصلیٰ کا مفہوم اور ملتِ ابراہیمی کا فریضہ

اب سنیے مصلیٰ کسے کہتے ہیں؟ آپ کو یاد ہوگا میں نے صلوٰۃ کے متعلق عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں بنیادی طور پر (میں یہ مفہوم جو بیان کر رہا ہوں' خود میرا تراشیدہ نہیں ہے' عربی زبان کا کوئی مستند لغت آپ لے لیجیے' اس میں آپ کو یہ الفاظ ملیں گے) صلیٰ کا معنی ہوتا ہے ریس کورس میں' ریس میں' گھوڑ دوڑ میں' پہلے نمبر کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے جو دوسرے نمبر پہ گھوڑا یوں چلے کہ پہلے گھوڑے کی کنوتیاں دوسرے گھوڑے کی پشت کے ساتھ ساتھ رہیں' یہ اس سے آگے تو نہ بڑھے لیکن ان دونوں کے درمیان بُعد اور فاصلہ بھی نہ ہو۔ اس انداز سے جو اس طرح سے زندگی کے میدان میں سرپٹ چلے جانے والا ہو' یہ جو پچھلا گھوڑا ہوتا ہے' اسے عربی زبان میں مصلیٰ کہتے ہیں۔ خدا نے یہ کہا تھا کہ تم دعا مانگا کرو کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (1:5) اور دوسرے مقام پہ کہا تھا کہ اِنَّ رَبِّىْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (11:56) میرا خدا بھی صراطِ مستقیم پہ جا رہا ہے۔ اب مصلیٰ وہ ہوا کہ آگے آگے تو خدا جا رہا ہے یعنی خدا کا نظام' خدا کا قانون' اس کا پروگرام ہے' اور یہ اس طرح سے اس کو Follow (اتباع) کر رہا ہے' اس طرح سے اس کا اتباع کر رہا ہے کہ اس سے آگے تو نہیں بڑھ سکتا لیکن اُس میں اور اس میں بُعد اور تفاوت باقی نہیں رہتا۔ دیکھتے ہیں زبان کا اعجاز اور قرآن کے الفاظ کا انتخاب۔ یہ جو عمل ہے' یہ جو اس طرح سے چلنا ہے' یہ جو اس طرح سے اتباع کرنا ہے یعنی آپ اس اعجازِ الفاظ کو دیکھیے کہ وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن پیچھے

بھی اتنا نہیں رہ سکتا کہ دونوں میں بُعد اور فصل ہو جائے' اسے کہتے ہیں صلوٰۃ۔ یہ جو ریس کورس ہوتا ہے' جس کے اوپر یہ کیا جاتا ہے' اسے مصلیٰ کہتے ہیں۔ کہا کہ زندگی کی دوڑ میں تم نے چلنا ہے تو مقام ابراہیمی علیہ السلام کو اپنے لیے مصلیٰ بناؤ۔ اس راستے کے اوپر دوڑو جس کے اوپر وہ چلا تھا۔ مقام ابراہیم علیہ السلام کیا تھا؟ یہ تھا امامتِ نوعِ انسانی۔ ابھی وہ ہی الفاظ پہلے تو یہ کہا گیا تھا کہ **اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا** (2:124)۔ مقام کا مفہوم تو آپ سمجھتے ہیں مثلاً یہ کہ اس کا مقام بڑا بلند ہے' صاحب! مقام کے معنی Position کے ہو جاتے ہیں۔

جب دین انسانوں کے خودساختہ مذہب میں بدل جائے تو پھر کیا ہوتا ہے؟

عزیزانِ من! یہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پوزیشن حاصل ہوئی تھی' تمہارے لیے یہ میدانِ عمل ہونا چاہیے جس کے اندر تم اس انداز سے دوڑو اور یہ ہونی چاہیے تمہاری منزلِ مقصود کہ پوری انسانیت کو اپنی امامتِ کبریٰ کے اندر لیتے ہوئے ایک عالمگیر برادری بناؤ' جس کا مرکزِ محسوس' جس کا ایک سمبل یہ کعبہ ہو اور اس سے مقصد یہ امناً ہوگا کہ انسانیت میں امن قائم ہو جائے اس لیے کہا ہے کہ **وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰہٖمَ مُصَلًّی** (2:125) تم بھی مقام ابراہیمیؑ کو حاصل کرنا چاہتے ہو' تو اس کے مسلک و منہاج کے پیچھے پیچھے چلو۔ آپ غور فرما رہے ہیں کہ دین میں کیا چیز ہوتی ہے؟ مذہب میں الفاظ وہی ہوتے ہیں لیکن اس کے اندر روح نہیں رہتی۔

کعبہ کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک وصاف کرنے کا مفہوم مذہب' دین کی ممی شدہ لاش

برادرانِ عزیز! مذہب دین کی ممی شدہ لاش کو کہتے ہیں۔ اب درمیان میں اتنا سا یہ حکم دیتے ہوئے' ملتِ ابراہیمی علیہ السلام کی نسبت اپنی طرف کرنے والی قوم کے لیے کہا کہ **وَ عَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَہِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَ الۡعٰکِفِیۡنَ وَ الرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ** (2:125)۔ عزیزانِ من! یہ عظیم آیات آ رہی ہیں۔ کہا ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام سے کہا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا تذکرۂ جلیلہ جب آگے چل کر آئے گا تو میں وہاں تفصیل بیان کروں گا۔ یہاں باپ بیٹا دونوں کے متعلق یہ کہا گیا ہے۔ ہم نے یہ کہا کہ وہ ہمارے گھر کو پاکیزہ کر دیں' پاک وصاف کر دیں۔ یہ کونسی چیز ہیں جن سے گھر کو پاک اور صاف کیا جا رہا ہے؟ برادرانِ عزیز! گھر میں جھاڑو دینے کے لیے تو کسی آسمانی حکم کی ضرورت نہیں ہے۔ جو بھی کہیں بیٹھنا چاہتا ہے' وہ وہاں سے اپنی جگہ کو صاف کر لیتا ہے۔ یہ جو بیت اللہ کہا ہے' خدا کا گھر کہا ہے' اسے ہر غیر خداوندی اثرات سے پاک وصاف رکھنا ہے۔ یہ تھا جو کہا گیا تھا۔ یہ ہے منزل لا الہ کی کہ کوئی الٰہ باقی نہ رہے' سوائے ایک اللہ تعالیٰ کی ذات کے یہ جو اس کی ایک محسوس شکل تھی' جو کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبے میں داخل ہونے سے پیشتر اس کے اندر جتنے بت رکھے گئے تھے' ان کو نکال باہر کیا تھا' یہ بت بھی غیرِ خداوندی محکومیت کی ایک محسوس سی شکل تھی' ورنہ خود تو اس کی کوئی معنوی حیثیت ہوتی نہیں ہے۔ ان کا نکالنا بھی ایک محسوس عمل تھا۔ اس کی حقیقت یہی تھی کہ

یہاں غیرِ خداوندی نظام کا کوئی عمل اور دخل نہ ہو۔ الٰہ کے معنی تو آپ کو معلوم ہیں کہ یہ وہ ہستی ہے، جس کی محکومی اختیار کی جائے۔ جہاں اللہ کی محکومیت کا تصور بھی نہ ہو۔

اب مرکز بنا کعبہ دو چیزوں کا: (1) عالمِ انسانیت کو ایک مقام پر جمع کرنا اور (2) کہا ہے کہ اسے عالمگیر برادری میں متشکل کرنا اور یہ عالمگیر برادری وہ ہو جو دنیا میں خدا کے قوانین کے علاوہ کسی قانون کے سامنے نہ جھکے اور کسی کی حکومت کو تسلیم نہ کرے **طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ** (2:125) طائفین اور عاکفین کے لیے میرے گھر کو پاک بنائیں۔ آپ نے دیکھا کہ دین میں اس کا مقصد کیا تھا۔ مذہب میں، اب حج کے موقع پر خانۂ کعبہ کو غسل دیا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ اسے مشک اور عنبر اور کیوڑہ اور گلاب سے دھویا جاتا ہے۔ جلالت مآب شہنشاہِ عرب خود جا کر اسے صاف کرتے ہیں۔ بڑے بڑے معززینِ عالم بھی بلائے جاتے ہیں۔ پھر وہ جو اس کا دھون ہوتا ہے، اس کو شیشیوں میں بند کیا جاتا ہے اور پھر سال بھر اعلیٰ ترین تحفہ ہے، جو وہاں ملتا ہے، کسی کسی کو وہ شیشی جو ہوتی ہے، جس میں وہ دھون ہوتا ہے، دیا جاتا ہے۔ وہ جو آپ کے ہاں سال کے بعد مزاروں کو غسل دیا جاتا ہے، وہ اسی کا تتبع ہوتا ہے، وہ گھر بیت ہو گیا **اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ** (2:125)۔ یہ ہو گیا کہ اس گھر کو صاف کرنا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے کہا گیا تھا، جیسا میں نے عرض کیا ہے، کہ کم از کم یہ ایک مقام دنیا میں تو ایسا ہونا چاہیے کہ جس میں خدا کے سوا کسی اور کے سامنے انسان اپنی گردن خم نہ کرے۔ کتنی بڑی سرفرازیاں نصیب ہو جاتی ہیں، اس انسان کو، جو اس آستاں کے علاوہ کسی اور آستانے پہ نہ جھکے۔

قرآن حکیم کے نزدیک طواف اور اعتکاف کے عملی پروگرام کی نوعیت اور ہمارے عمل کا نتیجہ

یہ ہے مقامِ ابراہیمی علیہ السلام۔ کہا یہ گیا ہے کہ **طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ** (2:125) طائفین اور عاکفین کے لیے میرے گھر کو پاک صاف بنائیں۔ اب مذہب میں آ کر یہ طائفین کعبے کے گرد طواف کرنے والے ہو گئے یعنی "اے ست پھیرے لین والے"❶۔ اب یہ دوسرے ہیں، عاکفین۔ وہاں کا تو مجھے معلوم نہیں، لیکن یہاں رمضان شریف کے آخری عشرہ میں، کسی مسجد کے ایک گوشے میں، آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک صاحب وہاں مصلیٰ بچھا کر بیٹھے ہیں، وہ دن رات وہیں بیٹھے رہتے ہیں، صرف ضروریات کے لیے باہر آتے ہیں۔ وہ دس دن کے لیے وہاں بیٹھے رہتے ہیں، کبھی نفل پڑھتے ہیں، کبھی تسبیح پھیرتے ہیں۔ اسے اعتکاف کہا جاتا ہے۔ اور یہ کچھ کرنے والوں کو عاکفین کہتے ہیں۔ تو اب یہ جو تھا کہ تم اس گھر کو طائفین اور عاکفین کے لیے پاکیزہ رکھو۔ تو مذہب میں آ کر یہ بنا کہ تم یہ اس کے گرد گھومنے والوں کے لیے اس کو پاکیزہ رکھو، یا وہ یہاں معتکف ہو کر اعتکاف میں بیٹھ جائیں۔ اب اس کا نام کعبے کے گرد

---

❶ اس کے گرد یہ سات چکر پورا کرنے والے۔

سات چکر لگانا یا مسجد الحرام کے گوشے میں بیٹھ جانا رہ گیا۔ اب یہ دین میں کیا چیز تھی اور قرآن کیا کہتا ہے؟ سنیے! عزیزانِ من! اس نے کہا تھا کہ وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (2:143)۔ ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی قوم بنایا ہے۔ یہ ''بین الاقوامی'' ترجمہ بھی صحیح نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس وسطیٰ کے معنی Equal Distance ہوتا ہے یعنی ہر ایک سے یکساں مقام پر، نہ کسی سے زیادہ دوری، نہ کسی سے زیادہ قرب۔

اُمت مسلمہ کا فریضہ نوع انسانی کی چوکیداری کرتے ہوئے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانا تھا

برادرانِ عزیز! انصاف اور عدل کے لیے اس سے بہتر لفظ نہیں دیا جا سکتا۔ اس سے تمہارا مقصد کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (2:143) پوری نوعِ انسانی کی نگرانی کرنا۔ یہاں اس قوم کا ایک لفظ بتایا یا فریضہ بتایا اور وہ ہے' طائف۔ طائف کہتے ہیں ''رات کا چوکیدار' کوتوال' پہرہ دینے والا' نگرانی کرنے والا' حفاظت کرنے والا' گھروں کے گرد گھومنے والا'' یہ جو آپ کے ہاں کی رات کو چوکیداری ہوتی ہے' عربی میں اس کو طواف کرتے ہیں۔ طائف کہتے ہیں ''رات کو گھوم کر چوکیداری کرنے والا'' کہا ہے کہ تم نے ہمیں اس لیے بنایا ہے کہ پوری انسانیت سکھ کی نیند سوئے اور تم ان کا پہرہ دو۔ یہ جو اس گھر کو' اس نظام کو' کہا تھا اَمنا' یہ امن قائم کرے تو امن قائم کرنے کے لیے آپ کو پہرہ دینے والے کی ضرورت پڑتی ہے۔ عربی زبان میں آج بھی طائف' کوتوال کو' پہرہ دینے والے چوکیدار کو' کہتے ہیں تو کہا کہ یہ ہے تمہارا مقصد کعبے کے متولی بن کر اس طرح سے ہر دوار کے پانڈے بننا مقصد نہیں ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ جو ابراہیم علیہ السلام کا مقام ہے' اس کی وجہ سے اس قوم پر کتنی Responsibilities (ذمہ داریاں) آتی ہیں! تم چوکیداری کرو تا کہ انسانیت سکھ کی نیند سو سکے۔ اس قوم کے لیے ہمارے اس گھر کو ہر قسم کے غیر خداوندی تصور' عقیدہ' اعتقاد' نظریہ سے پاک اور صاف رکھو۔

اس آیت میں دوسرا لفظ والعٰکفین آیا ہے۔ اس کا واحد عاکف ہے' عکف (ع ک ف) کہتے ہیں ''الجھے ہوئے بالوں کو نہایت آرام سے اس طرح سے سلجھانا جس طرح سے بالوں کو کنگھی مشاطگی کرتی ہے۔ بکھرے ہوئے دانوں کو ایک سلک کے تاگے میں پرو کر ایک لڑی بنا دینا'' انسانیت کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کے لیے یہ قوم ہوگی۔ اس کے بکھرے ہوئے دانوں کو ایک سلک میں پرونے کے لیے یہ قوم ہوگی۔ اس گھر کو تم پاک وصاف رکھو' اس قوم کے لیے جو انسانیت کی پہرہ دار بنے' چوکیداری کرے' ان کے الجھے ہوئے بالوں میں مشاطگی کا کام کرے' ان کے بکھرے ہوئے دانوں کو ایک لڑی میں پروئے' ان کے انتشار کو رفع کرے' ان کے الجھے ہوئے مسائل کو سنوارے' ان گتھیوں کا حل تلاش کرے تا کہ انسانیت میں امن قائم ہو جائے۔

یہ کچھ یہ قوم کس طرح سے کرے گی؟ پھر اسی آیت کو لیجیے۔ کہا ہے کہ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ

وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (2:143) تمہارا نظام یہ ہے کہ تمہارا جو مرکزِ ملت ہے' وہ تمہاری نگرانی کرے اور تم انسانیت کی نگرانی کرو۔ اب اس قوم کے لیے یہ نگرانی کیا ہے؟ کہا گیا ہے کہ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (2:125) یہ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے والے ہیں۔

قرآن حکیم کے نزدیک رکوع اور سجود کا مفہوم اور نجات کا عالم گیر تصور

ان دو لفظوں رکوع اور سجدہ کے اندر بڑا لطیف فرق ہے' ہر چند رکوع بھی جھکنے کو کہتے ہیں اور سجدہ بھی جھکنے کو کہتے ہیں لیکن جس مقام پہ ہم آج ہیں' یہاں سے اگر ہم نے اس آخری منزل کے اوپر پہنچنا ہو جو دین کا نظام چاہتا ہے' یعنی نظامِ خداوندی اپنی مکمل شکل میں متشکل ہو' تو وہاں تک بتدریج پہنچا جائے گا۔ راستے کے جو مقامات ہیں ان میں بھی قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا جائے گا لیکن یہ جھکنا' مکمل طور پہ جھکنا' ابھی نہیں ہوگا۔ اس میں بعض چیزیں ایسی ہوں گی جو قابلِ عمل ہیں' وہاں ہم جھکتے جائیں گے مگر بعض چیزیں ابھی ایسی ہوں گی جو پورے طور پر ہمارے کنٹرول میں نہیں آئی ہوں گی۔ ان میں ہم عبوری دور (Interim Period) میں آگے بڑھتے چلے جائیں گے تاکہ ہم مکمل طور پہ جھکیں اور آخر میں جب ہم اس منزل پہ پہنچ جائیں گے تو وہاں ہماری اطاعت کی تکمیل ہو جائے گی' یہ جو نظام کی آخری منزل ہے' اس کو سجدے سے تعبیر کیا ہے اور جو آپ کی درمیانی منزل ہے' اس کو رکوع سے تعبیر کیا ہے۔

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔ کہا ہے کہ وَ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (2:125) یہ طھرا بیتی کا یہیں مفہوم سمجھ میں آ گیا۔ سجدہ جو ہے' جھکنا جو ہے' سرِ تسلیم خم کرنا' اطاعت اختیار کرنا' محکومیت اختیار کرنا' صرف ایک خدا کے نظام اور قوانین کی ہے۔ یہ ہے رکوع و سجود' اور یہ کچھ کرنے والی قوم یہ نہیں کہ اپنی اپنی نجات کی فکر میں لگ رہی ہے' یہاں تو نجات ہو ہی اس کی سکتی ہے جو انسانیت کی نجات کے لیے کچھ کرے۔ فرد کی نجات کے اور کچھ معنی نہیں ہیں۔ یہ قوم قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکے تاکہ یہ نوعِ انسانی کی چوکیداری کرنے اور ان کے الجھے ہوئے معاملات کے حل کرنے کے قابل ہو سکے۔

عزیزانِ من! یہ تھا وہ نظامِ خداوندی جس کا مرکز کعبہ بنتا تھا اور جس کی بنیادی اینٹ موسسِ نظامِ خداوندی' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے لگائی گئی۔ ذرا تصویر میں لائیے اس حسین منظر کو کہ باپ اور بیٹا ہے۔ باپ ابراہیم علیہ السلام جیسا اور بیٹا اسماعیل علیہ السلام جیسا ہے۔ کعبے کی دیواروں کو اٹھا رہے ہیں' ہاتھ اس کام میں مصروف ہیں اور آپ نے مزدوروں کو دیکھا ہوگا' وہ اپنی مشقت میں کمی کرنے کے لیے کچھ گنگناتے رہتے ہیں۔ خیال دوسری طرف بٹ جاتا ہے' محنت میں زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ وہ بھی یہ کر رہے ہیں'

ہاتھ اس کام میں مصروف ہیں اور زبان پہ یہ آرزوئیں مقدس دعائیں بن کر آ رہی ہیں۔ یہ اگلی جو چار آیتیں ہیں' یہ وہی دعا ہے جو یہ ایک معمار اور ایک مزدور مصروفِ کار رہتے ہوئے' گنگناتے ہوئے' اپنا کام کر رہے ہیں **وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا** (2:126)۔ پہلی چیز تو یہ کہی ہے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! اس شہر کو بلدِ امین بنا دے' انسانیت کے لیے امن کا مقام بنا دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مکے کی خصوصیت یہ بتائی تھی کہ **مَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا** (3:97) جو اس میں داخل ہو جائے' اسے امن ملے گا اور میں نے عرض کیا تھا کہ داخل ہو جانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس شہر کی فصیل کے اندر آ جائے۔ مقصد یہ تھا کہ اس نظام کے اندر آ جائے جس نظام کا یہ ایک Symbol (علامت) ہے' جسے ہم کعبہ کہتے ہیں جیسے دارالخلافہ ایک سلطنت کا سمبل ہوتا ہے۔ اس کو امن کی جگہ بنا دے۔

سورۃ النحل کی جو آیت 112 تھی' وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ایک وہ قوم ہے جسے خدا کی انعام یافتہ کہا جاتا ہے' اس کے لیے ہم دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ **صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ** (1:6) بارالٰہا! اس راستے کی طرف راہ نمائی کر جس پر چل کر سعادت مندامم سابقہ زندگی کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہوئیں۔ اس کے لیے قرآن نے دو چیزیں کہی تھیں' کہا ہے کہ **وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرۡيَةً كَانَتۡ اٰمِنَةً مُّطۡمَئِنَّةً يَّاۡتِيۡهَا رِزۡقُهَا رَغَدًا مِّنۡ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتۡ بِاَنۡعُمِ اللّٰهِ** (16:112)۔ مثال دی ہے' کہا ہے کہ قوموں پر تباہیاں کیوں اور کب آتی ہیں' ایک آئیڈیل بستی تھی جسے خارجی خطرات سے امن اور داخلی کشمکش سے اطمینان حاصل تھا' اور رزق کی فراوانیاں اور کہا کہ پھر جب اس قوم نے خدا کے قوانین سے اعراض برتا' انہوں نے خدا کے نظام کو چھوڑ کر خود ساختہ انسانوں کا ایک نظام وضع کیا' نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ **فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الۡجُوۡعِ وَ الۡخَوۡفِ بِمَا كَانُوۡا يَصۡنَعُوۡنَ** (16:112) ان پر بھوک اور خوف کا عذاب مسلط ہو گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نزدیک انسانیت کے لیے روٹی کے مسئلے کی اہمیت

برادرانِ عزیز! ہم سے کہا یہ جاتا ہے کہ صاحب! یہ دیکھیے! یہ لوگ مذہب میں روٹی کا مسئلہ لے آتے ہیں' روٹی تو خالص دنیا داروں کا مقام ہے صاحب! اور یہ کہنے والا' اس وقت کہہ رہا ہوتا ہے' جب وہ ابھی ٹھونس کر' کھا کر' آیا ہوا ہوتا ہے۔ اس سے کہیے کہ ذرا بھوکے رہ کر نماز پڑھ کر بتائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ روٹی کا مسئلہ ہی انسانیت کا سارا مسئلہ نہیں ہے لیکن یہ بڑا اہم مسئلہ ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ کعبے کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام اس کی دیواروں کو اٹھا رہے ہیں۔ دنیا کے بت کدے میں جسے وہ پہلا گھر خدا کا کہا جا رہا ہے' بڑا اہم مقام ہے اور تقریب کتنی عظیم ہے اور خالصتاً ان کے نقطۂ نگاہ سے ایک مذہبی تقریب ہے' جسے ادا کیا جا رہا ہے۔ پہلی دعائیں' کعبے کے بنانے کے بعد تو آپ سمجھتے ہیں کہ وہ انتہائی دعا ہونی چاہیے۔ دعا کیا مانگی جا رہی ہے؟ پہلی چیز تو یہ

مانگی جارہی ہے کہ یااللہ! اس میں امن قائم رکھیےاوراس کے بعد دوسری دعا ہے کہ وَّ ارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (2:126) یہاں کے رہنے والوں کورزق کی فراوانیاں عطا کرنا۔ یہ دعائے ابراہیمی علیہ السلام ہے جو کعبے میں کھڑے ہوکر مانگی جارہی ہے۔ یہ تو پہلی دعا ہے جواس کعبے کی تعمیر کے بعد مانگی جارہی ہے۔ دراصل دو نبی دعا مانگ رہے ہیں کہ یااللہ! یہاں کے رہنے والوں کوامن بھی دینا اور رزق کی فراوانیاں بھی دینا۔ آپ روٹی کے مسئلے کی اہمیت دیکھ رہے ہیں کہ کس قدر ہے!

یہاں ایک بڑی خوبصورت چیز آتی ہے۔ میں اس تک آنے سے پہلے ایک اور چیز عرض کروں۔ کہا ہے کہ لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ . اٖلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیۡفِ . فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَیۡتِ . الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ وَّ اٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ (106:1-4)۔ آپ دیکھتے ہیں' خدا نے خوداس قوم سے' قریش سے' یہ کہا کہ تمہیں چاہیے کہ جواس گھر کا خدا ہے' اس کی محکومیت اختیار کرو۔ یہ وہ خدا ہے کہ جس نے تمہیں بھوک میں روٹی دی' خوف میں امن دیا۔ وہ قرآن توانعام ہی یہ گنا رہا ہے کہ کعبے کی تولیت' جس قوم کے حصے میں ہو' اس میں دوخصوصیات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اسے خوف سے امن نصیب ہواور دوسرا یہ کہ بھوک کی طرف سے مامون ہوکراسے رزق کی فراوانیاں میسر ہوں۔

آج کعبہ کے ساتھ تولیّت رکھنے والی قوم کی حالت زاراوراس کی وجہ جواز

عزیزانِ من! آج ہم جس قوم کواس کعبے کی طرف نسبت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں' وہ قوم دنیا میں ان دونوں انعاماتِ خداوندی سے محروم ہے۔ تعداد کے اعتبار سے دیکھیے' ستر کروڑ کا ایک بحرِ ذخار ہے' جو مراکش سے انڈونیشیا تک موجیں ماررہا ہے۔ اس قوم کوایسا عمدہ بیلٹ' ایسی عمدہ بنیادی جغرافیائی پوزیشن' یوں کہیے کہ انہیں مرکزی پوزیشن حاصل ہے۔ جو کچھ ان کے پاؤں کے نیچے' زمین میں دبا ہوا ہے' وہ دنیا میں کسی دوسری قوموں کونصیب نہیں ہے لیکن اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ خوف اور بھوک' دونوں قسم کے عذابوں کے اندر محصور ہے۔ کیا ہے اور کیوں ہے؟ سنو! **بما كانوا يصنعون** (16:112) یہ ان کے خودساختہ نظام کا نتیجہ ہے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ اگلی بات بڑی اہم آئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ چیز کہی کہ وَّ ارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ اٰمَنَ مِنۡهُمۡ بِاللّٰهِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ (2:126) انہیں فراوانی سے رزق عطا فرما جواللہ اورآخرت پر ایمان لائیں۔ برادرانِ عزیز! یہ بڑا غور طلب مقام آ گیا۔ رزق خدا کے قوانینِ طبعی کے مطابق محنت کرنے سے حاصل ہوتا ہے' کچھ Physical Laws' (طبعی قوانین) ہیں' جن کے مطابق رزق کی پیداوار ہوتی ہے۔ کیا کبھی یہ چیز آپ نے دیکھی ہے کہ ایک زمین پر کوئی ہرنام سنگھ یا رام داس زراعت کے صحیح قاعدوں کے مطابق اہل جوتے' بیج ڈالے' یہ ساری چیزیں کرے لیکن اس کی تو کھیتی ہی نہ اُگے اور میاں عبدالرحمٰن گھر میں بیٹھے رہیں' ان کی

زمین بھرپور فصل دیدے؟ ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا۔ یہ جو طبعی نظام ہے' وہ آدم کے لیے ہے' آدمی کے لیے ہے۔ یہ جو اگلا تمدنی معاشرتی نظام ہے' وہاں ہے جہاں جا کر کفر اور ایمان کا امتیاز ہوتا ہے۔ وہ نظام جب ایمانِ خداوندی کے مطابق' مستقل اقدار کے مطابق' متشکل ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ امنِ عالم اور اجتماعیتِ انسانیہ ہوتا ہے۔ یہ دوسری چیز ہے لیکن یہ جو طبعی امور ہیں' ان میں کفر اور ایمان کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ آگ میں مومن ہاتھ ڈالے' کافر ہاتھ ڈالے' وہ آگ دونوں کو یکساں جلائے گی۔ سنکھیا عبداللہ کھائے' رام داس کھائے' ان دونوں پر ایک جیسا اثر ہوگا۔ اس کا علاج آپ ڈاکٹر ہرنام سنگھ سے کرائیے یا عبدالرحمٰن سے کرائیے اگر وہ صحیح طریقے کے مطابق علاج ہے' تو آپ ان دونوں کو وہ علاج یکساں فائدہ دے گا۔ یہاں رزق کے متعلق یہ چیز تھی' جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے متعلق یہ دعا کی۔

عزیزانِ من! غور کیجیے کہ کس کس گوشے کو قرآن جاتے جاتے سامنے لے آتا ہے۔ انہوں نے یہ شرط لگا دی کہ جو ان میں سے ایمان لانے والا ہو' اس کو یہ رزق کی فراوانیاں ملیں۔ اسی مقام پہ کہا کہ قَالَ وَ مَنۡ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيۡلًا (2:126) جو کفر اختیار کرے گا' متاعِ حیات اس کو بھی طبعی قوانین سے مل جائے گا۔ اگرچہ وہ ان نتائج کے مقابلے میں' وہ جو قوانینِ خداوندی کا دوسرا گوشہ ہے' جس کا تعلق انسانوں کے تمدنی نظام سے ہے' ذاتِ انسانی کی نشوونما سے ہے' اس کے مقابلے میں جو کچھ یہ ملے گا' یہ بہت کم ہوگا لیکن یہ بات نہیں ہے کہ طبعی طور پر کافر جو کوششیں کرے گا' ہم اس کا نتیجہ روک لیں گے' یہاں یہ بات نہیں ہوگی۔ اس لیے ابراہیم علیہ السلام اس کو سمجھ لو۔ اس کے لیے کیا ہوگا؟ کہا کہ ثُمَّ اَضۡطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ‌ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ (2:126) غلط نظامِ زندگی کا جو نتیجہ ہے' وہ جہنم ہوگا لیکن یہ نہیں ہوگا کہ جو نتائج طبعی قوانین کے اتباع سے مترتب ہوتے ہیں' اس میں کفر اور ایمان کا امتزاج کر دیا جائے' امتیاز کر دیا جائے' یہ بات نہیں ہے۔ می نہ سزد خدائے را۔

قوانین خداوندی کے وہ دو گوشے جن میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

برادرانِ عزیز! یہ چیز دوسرے مقام پر بڑی خوبصورتی سے آئی ہے۔ بڑی عظیم آیتیں ہیں۔ دونوں گروہ سامنے لائے گئے: ان اقدارِ خداوندی پر ایمان لانے والے اور ان کا انکار کرنے والے بھی۔ میں پھر عرض کر دوں کہ قوانینِ خداوندی کے دو گوشے ہیں۔ یہ جنہیں آپ Laws of Nature (قوانین فطرت) کہتے ہیں' یہ بھی خدا کے قوانین ہیں اور دوسرے قوانین وہ ہیں' جو وحی کے ذریعے سے انسانوں کے تمدنی نظام کے لیے ملے ہیں۔ قوانینِ خداوندی کا وہ گوشہ جسے ہم Laws of Nature (قوانین فطرت) کہتے ہیں' جو ان کا اتباع کرتا ہے' وہ دوسرے تمدنی گوشے کے قوانین خداوندی کو مانے یا نہ مانے' Natural Laws یا طبعی وفطری قوانین کے جو نتائج ہیں' یہ اس کے مطابق مرتب ہو جاتے ہیں۔ حصولِ دولت کے لیے کوشش' جدوجہد' صحیح طریقوں کے مطابق کی جائے تو جو قوم بھی کرے گی'

اسے یہ حاصل ہو جائے گا۔ یہ مقامِ آدم ہے' یہ صرف آدمی کا مقام ہے۔ مومن کا مقام آگے آتا ہے کہ اس طریقے کے مطابق جو حاصل ہوتا ہے' اس کی تقسیم اور استعمال کس طرح سے کیا جاتا ہے۔ اگر اس کی تقسیم اور استعمال مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق ہے' تو اس کا نتیجہ اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی ہے' آخرت میں بھی جنت کی زندگی ہے۔ اگر اسے غلط نظام کے تابع استعمال کیا جاتا ہے تو وہ چیزیں تو موجود ہوں گی لیکن انسانیت جہنم کی زندگی گزارے گی اور اس کے بعد کی زندگی بھی جہنم کی ہوگی۔

عزیزانِ من! آپ نے دونوں گوشوں پر غور فرما لیا' یہاں پہلے گوشے کے متعلق بات ہوئی تھی' ذہن میں یہ چیز آئی تھی کہ یہ جو دوسرے گوشے کے اوپر ایمان لانے والے ہیں' صرف ان کے لیے رزق کی یہ فراوانیاں ہیں' وہ انہیں ملیں گے۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ رزق خدا کے طبعی قوانین کے تابع جدوجہد اور سعی و کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے' یہ ان کا طبعی نتیجہ ہوتا ہے' اس میں کافر اور مومن کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ **مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا** (17:18) ایک نظریۂ زندگی یہ ہے کہ یہ جو اسی دنیا کے پیش پا افتادہ مفاد ہیں' بس یہ حاصل ہو جائیں' کسی طرح حاصل ہو جائیں' وہ ان کو سمیٹتا چلا جائے۔ کہا ہے کہ **عَجَّلْنَا لَهُ** (17:18) ہمارے قوانینِ طبعی کے مطابق اس کو یہ مفاد حاصل ہو سکتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس کے بعد اس نظام کا جو انجام ہوگا جس میں صرف زندگی کو طبعی زندگی تصور کیا جائے گا' حیوانی زندگی تصور کیا جائے' انسانی سطح پہ نہیں لایا جائے گا' جو اس کا نتیجہ ہے' وہ ایک جہنم ہوگا **وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا** (17:19) دوسری طرف وہ ہوگا کہ جو یہ آخرت کے مفادات بھی چاہتے ہیں' جو یہ کہتے ہیں کہ **رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً** (2:201) اے پروردگار! ہم دنیا کی خوشگواریاں بھی لینا چاہتے ہیں اور مستقبل کی خوشگواریاں بھی لینا چاہتے ہیں۔ کہا ہے کہ جو اس چیز کے اوپر ایمان رکھے گا' **وَ سَعٰى لَهَا** (17:19) اس کے لیے کوشش کرے گا' اسے یہاں بھی یہ کچھ ملے گا' آگے بھی یہ کچھ ملے گا۔ حال بھی اس کا درخشندہ ہوگا' مستقبل بھی اس کا خوشگوار ہوگا۔

برادرانِ عزیز! دو چیزیں آ گئیں۔ ایک وہ جو اس آخرت پہ ایمان نہیں رکھتے' صرف طبعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں اور پیش پا افتادہ مفادات کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو ان قوانین کو بھی مانتے ہیں اور اس کے بعد مستقل اقدارِ خداوندی کو بھی مانتے ہیں۔ کہا کہ جہاں تک طبعی قوانین کا تعلق اور اس کے نتائج مرتب ہونے کا تعلق ہے تو **كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ** (17:20) جہاں تک خدا کی اس بخشش کا نتیجہ ہے جو طبعی قوانین اور محنت کے معاوضے میں ملتی ہے' ہم اِس گروہ کو بھی مدد دیتے جاتے ہیں' اُس گروہ کو بھی مدد دیتے جاتے ہیں۔ ''برادرانِ عزیز! رب بنا تے سجدا ای اینوں سی۔ کسے دے رعی ایتھے نئیں ہوندی' کسے دے خلاف

اے گل نئیں ہوندی ❶۔'' اور اگلے الفاظ تو عجیب ہیں۔ یہاں تک تو یہ کہا کہ مِنْ عَطَآءِ رَبِّکَ (17:20) جو چیزیں یوں ملتی ہیں' اس میں ہم دونوں گروہوں کو دیتے چلے جاتے ہیں مگر سعی لھا شرط ہے یعنی جو کوشش کرتا ہے ہم اسے اس کی کوشش کے مطابق بڑھاتے چلے جاتے ہیں وَ مَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحْظُوْرًا (17:20) یہ نہیں ہوسکتا کہ جو چیزیں اس طرح سے مل سکتی ہیں' اس میں ہم کہیں پھاٹک لگا دیں کہ یہاں سے مومن تو جا سکتا ہے' کافر آگے نہیں جا سکتا۔ یہ نہیں ہوسکتا۔

برادرانِ عزیز! دیکھ رہے ہیں یہ خدا ہے۔ جو ہم نے کہا ہے' اس دعوے کا ثبوت کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اُنْظُرْ کَیْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ (17:21) اقوامِ عالم پر نگاہ ڈال کر دیکھ لیجیے' جو قوم بھی اس طرح سے طبعی قوانین کے تابع صحیح راستے کے اوپر' صحیح طریق کے اوپر' عمل کرتی ہے' آپ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کس طرح سے ایک قوم دوسری قوم پر بڑھی چلی جاتی ہے۔ ہم کسی کے راستے میں یہ رکاوٹیں نہیں ڈالتے۔ فرق یہ ہے کہ وَ لَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا (17:21) جو حال کے ساتھ مستقبل پہ بھی نگاہ رکھتا ہے' مستقبل میں اس کے مدارج ان اقوام کے مقابل میں بلند ہو جاتے ہیں' وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ تھی وہ چیز جو کہی گئی ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں یہ چیز کہی کہ وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ (2:126)- ایمان کی محبت کا تقاضا نظر آتا ہے لیکن ایک انسان کے سینے سے یہ چیز نکلی ہے۔ اس لیے اس میں آپ یہ تھوڑا سا دیکھ رہے ہیں کہ اس چیز کا شائبہ آ گیا۔ اسی وقت اس دعا کو استجابت قرار دیتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا (2:126) نہ بھئی! وہ جو کفر کرے گا' اس کو بھی متاعِ حیات مل جائے گی۔ اگرچہ اس کے مقابلے میں یہ چیز بڑی قلیل ہوتی ہے کہ جس کو یہاں اور وہاں دونوں ملیں اور اس کے مقابلے میں ایک کو جو یہیں ملے تو قلت تو ہوگئی۔ اس کا انجام خراب ہوگا۔ کہا کہ اے ابراہیم علیہ السلام! یہ ہے ساری بات۔

کعبہ کی تعمیر کے دوران حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کہ ہماری پیشانیاں صرف تیرے ہی قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہوں

عزیزانِ من! پھر آگے بات چل پڑی۔ یعنی یوں قرآن ایک تاریخ بیان کر رہا ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تاریخ کی کتاب تو ہے نہیں۔ اس کا مقصد کیا ہے؟ راستے میں جہاں کوئی ایسی چیز آتی ہے' وہیں اس کی تشریح کر دیتا ہے۔ پھر بات آگئی' یہ آئیں آیات۔ یہ آئیں خالصتاً اس نظام کے متعلق۔ متاعِ حیات مل گیا' رزق کی فراوانیاں آ گئیں' کہتا ہے کہ وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ (2:127) اس حسین منظر کو سامنے رکھو۔ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام خدا کے اس گھر کی دیواروں کو اٹھا رہے ہیں اور

---

❶ برادرانِ عزیز! رب بننا تو جچتا ہی اسے ہے۔ یہاں کسی کے لیے رعایت نہیں ہوتی' کسی کے خلاف یہ بات نہیں ہوتی۔

ان کے لب پر یہ حسین دعائیں مچل رہی ہیں کہ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127) اے ہمارے نشو ونما دینے والے! ہمارے اس ناچیز سے تحفے کو قبول کر لے۔ یہ جو ہم تیرے لیے اینٹ اور پتھر کا ایک گھر بنا رہے ہیں' اسے تو قبول کر لے اور قبولیت کے لیے کیا دو شرطیں قرار دیں ہیں؟ کہا کہ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127) یہ تو ہم جانتے ہیں کہ جو کوئی لفظ زبانوں سے نکلتا ہے' اس کو تو تو سنتا ہے' اتنی ہی بات نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ جو سینوں میں ہوتا ہے تو اسے بھی جانتا ہے۔ تجھے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ کس قلب سے نکلے ہیں۔ اس لیے یہ قلب بھی بڑے مخلص ہیں' جن سے یہ دعائیں نکلتی ہیں۔ الفاظ کو سن' نیت پر نگاہ رکھ اور پھر اس ہمارے ناچیز سے ہدیئے کو قبول کر لے۔ کیا حسین منظر ہے! دعا مانگی جا رہی ہے کہ رَبَّنَا وَ اجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ (2:128) دیکھیے کیا دعا ہے! اے ہمارے نشو و نما دینے والے! ایسا کر کہ ہم صرف تیرے قوانین کے سامنے جھکنے والے ہوں' کسی اور آستاں کے اوپر یہ سر نہ جھکے۔ کتنی سرفرازیاں ہیں یہ جو نصیب ہو جاتی ہیں' یہ سچ ہے کہ

تیرے سنگِ در نے بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز میں

اور اب اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

(اقبالؒ)

ایسا کر کہ ہم تیرے سوا کسی آستاں پہ نہ جھکیں۔ یہ کچھ اپنے لیے ہے۔ آگے کہا کہ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ (2:128) اور ہماری اولاد میں سے تو ایسی ہی قوم عطا فرما جو تیرے ہی سامنے جھکنے والی ہو' کسی اور کے سامنے جھکنے والی نہ ہو۔ عزیزانِ من! دیکھتے ہیں کہ ایک مومن' اولاد کے لیے کیا دعا مانگتا ہے اور دعا ہی نہیں' اس کا مقصود تو یہ ہے کہ دنیا کے اندر اولاد کو کیا بنا کر جاتا ہے۔

منزل کا انتخاب اور راستے کا تعین: ان دونوں کا صحیح ہونا لازم ہے

کہا ہے کہ وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَ تُبۡ عَلَیۡنَا اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ (2:128)۔ یہاں لفظ مناسک آیا ہے' آگے چل کر جہاں کعبے میں جانور ذبح کیے جاتے ہیں' جسے ہمارے ہاں قربانی کہتے ہیں' یہ لفظِ قربانی قرآن کا لفظ نہیں ہے' وہاں چل کر بھی مناسک کا یہ لفظ آئے گا تو میں عرض کروں گا۔ مناسک کے معنی میں ایک تو ہوتا ہے مقصد اور ایک ہوتا ہے اس مقصد کے حصول کے طور طریقے۔ عام طور پر میکیاولی سیاست کی عمارت کی بنیاد اس اصول پہ ہے کہ Means are Justified by the ends achieved کہ Ends کو حاصل کرنے کے لیے جو بھی (Means) ذریعہ اختیار کر لیا جائے' وہ ذریعہ (Means) صحیح قرار پا جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے

کہ وہ مقصد (End) حاصل کرلیا جائے۔قرآن اس کی اجازت نہیں دیتا۔اس کے نزدیک غلط راستہ صحیح منزل تک پہنچا ہی نہیں سکتا۔ وہاں Ends (مقاصد) اور Means (ذرائع) میں کوئی فرق نہیں ہے۔منزل جائز اور صحیح ہے تو اس کے لیے جو راستہ اختیار کیا جائے، وہ بھی اسی کے مطابق جائز اور صحیح ہونا چاہیے۔ناجائز راستے سے جائز مقصد حاصل ہی نہیں ہوسکتا۔اس لیے یہاں پہلے یہ مقصود بتایا گیا کہ ہم نے ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے، جس میں عالمگیر انسانیت کو امن اور رزق نصیب ہوجائے، وہ تیرے سوا کسی اور کے سامنے نہ جھکیں۔ اس کے لیے اس کے جو عملی طریقے ہیں، ان کے لیے بھی ہمیں ہر مقام پر ''اَرِنَا'' کہا۔''اَرِنَا'' کا یہ لفظ وہاں آتا ہے، جہاں محسوس طور پہ کوئی چیز سامنے آئے۔طریقے ہمیشہ محسوس ہوتے ہیں، جو مقصد ہوتا ہے، وہ Abstract (غیر محسوس) بھی ہوسکتا ہے، جو اس کے لیے محسوس طریقے ہم نے اختیار کرنے ہوں، وہ بھی ہم کو دکھاتا چلا جا۔کہیں ایسا نہ ہوجائے کہ ہم کسی مقام پہ غلط قدم اٹھالیں، ہم سے کوئی چیز ایسی ہوجائے جو اس معیار کے اوپر پوری نہ اترے۔کہا کہ **وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا** (2:128) اگر کہیں ہمارا قدم، غلط سمت کے اوپر اٹھ جائے، تو اس کے بعد فوراً لپک کر ہم کو لے لینا، ہماری طرف لوٹ آنا تاکہ ہم صحیح راستے کے اوپر آجائیں۔اس لیے کہ **اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ** (2:128)۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ ''توبہ'' کسے کہتے ہیں؟ یہاں چونکہ ''تواب'' آیا ہے اس کو پھر دہرادوں کہ کراس روڈ سے جہاں موڑ آیا، آپ صحیح راستے کی طرف مڑنے کی بجائے غلط راستے پہ مڑ گئے۔تھوڑی دور جانے کے بعد آپ کو احساس ہوا کہ راستہ غلط ہے۔یہ جو اس چیز کا احساس ہے، یہ ہے جسے آپ ندامت کہہ دیں گے، پشیمانی کہیں گے لیکن اس پشیمانی اور ندامت سے تو کچھ نہیں بنتا، اگر آپ وہیں کھڑے رہیں گے۔آپ کو پیچھے کی طرف مڑنا ہوگا، پھر اس مقام پہ آنا ہوگا، جہاں سے آپ نے غلط قدم اٹھایا تھا۔یہ وہاں سے جو اس مقام تک آنا ہے، اس کو ''توبہ'' کہتے تھے۔اب آپ یہاں پہنچ گئے۔کیا یہاں پہنچنے کے بعد پھر مقصد حاصل ہوگیا؟ کہا کہ نہیں جی! یہاں سے پھر آپ کو صحیح راستے پہ چلنا ہوگا۔قرآن میں جہاں ''مَن تاب'' آیا ہے اس کے بعد اصلح ہے، یعنی من تاب و اصلح ہے۔غلط راستے سے لوٹ کر یہاں آیا اور یہاں سے صحیح راستے پر چلا تو کہتا ہے کہ وہ منزل پہ پہنچے گا۔

یہودیوں کی خودساختہ شریعت میں ''توبہ'' کا پلٹ کر آنے کا تصور ہی نہیں

یہ جو وہاں سے لوٹ کر آنا ہے تو اب یہاں وہ چیز شروع ہوجاتی ہے۔یہودی کی شریعت میں وہ پلٹ کر آنا نہیں ہے۔وہاں تو ایک غلط قدم اٹھا تو معاملہ ختم ہوگیا۔یہ تھی ان کی خودساختہ شریعت کی وہ دشواری جس کا حل، اس کے بعد، سینٹ پال یہودی (5-67 AD) نے اس طرح کفارہ دینے کے تصور سے نکالا۔یاد رکھیے! جو میں کہہ رہا ہوں کہ Christianity یا عیسائیت اسے کہتی تو ہے کہ یہ حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم ہے۔ خدا کے نبی کی یہ تعلیم نہیں ہو سکتی۔ ان کے ہاں تعلیم یہ ہوئی کہ جب خدا نے یہ دیکھا کہ یہ جو انسان ہیں' یہ تو سارے کے سارے جہنم میں جانے والے کام کرتے چلے جا رہے ہیں۔ وہاں شریعت میں پلٹ کر صحیح راستے پر آنے کے لیے کوئی امکان نہیں تھا۔ ویسے بھی جب یہ عقیدہ قائم کیا جائے کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے اعتبار سے اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد کر لاتا ہے' جسے دنیا کا کوئی عمل دھو نہیں سکتا' تو راستے بند ہو گئے' اس کے لیے اصلاح کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ اس کا حل کیا دریافت کیا گیا؟ دریافت یہ کیا گیا کہ جب اللہ میاں نے یہ محسوس کیا کہ ہیں' یہ کچھ مجھ سے ہو کیا گیا؟ اب یہ تو سارے کے سارے جہنم میں چلے جائیں گے ''تے اوس نے کہیا پئی جنت کینوں کرائے تے دیاں گا میں؟''[1] ''تو کیا کیا جائے''؟ کہا کہ اس کے لیے باپ بیٹے نے (معاذ اللہ) مل کر تجویز سوچی۔ بیٹے نے کہا کہ بڑے میاں! پھر کیا کیا جائے' جب یہ پریشانی ہے؟ تو اس کے لیے یہ ہے کہ مجھے بھیج دے' وہ مجھے صلیب پہ دے دیں' تو میرے اس قتل کا خوں بہا یہ ہو کہ تو ان سب انسانوں کو بخش دے۔ ''او ہنے کہیا اللہ تیری وڈی عمر کرے[2]۔''

عیسائیت کے اس عقیدے کے برعکس قرآن حکیم کی تعلیم

اس طرح سے' عزیزانِ من! اس الجھن سے نکلنے کے لیے مسیح کے کفارے کا عقیدہ ایجاد ہوا کہ اس نے یہ چیز نہیں کی۔ قرآن ہے' وہ کہتا ہے کہ لغزش ہو سکتی ہے' غلط طرف قدم اٹھ سکتا ہے' ابھی صحیح طرف قدم اٹھانے کا امکان ہے' Possibility ہے' زندگی ہے۔ یاد رکھیے! جب موت سامنے کھڑی ہو جاتی ہے' تو ''توبہ'' کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ زندگی میں ابھی ہر انسان کو موقع ہے' جہاں غلطی کا احساس ہو' وہ وہاں سے پلٹ سکتا ہے اور یہاں وہ چیز ہے' جو خدا کی آتی ہے کہ وہ جو پلٹ رہا ہے اس کو تو کہتے ہیں' تائب یعنی پلٹنے والا۔ ذرا آپ اس کو Calculate (شمار) کیجیے' غلط راستے' پہ ایک مقام پہ میں کھڑا ہوں' ایک قدم میں نے آگے اٹھایا اور اسی طرف چلا' منزل سے اور دور ہوا۔ یہاں سے میں نے پلٹ کر ایک قدم پیچھے اٹھایا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ منزل سے دو قدم میں قریب آ گیا: ایک یہ اس غلط راستے کی طرف قدم اٹھانے سے بچ گیا اور ایک وہ جو میں نے صحیح طرف اٹھایا ہے۔ اٹھایا ایک قدم' نتیجہ اس کا دہرا حاصل ہوا۔ یہ ایک قدم اٹھانے والا ''تائب'' ہوتا ہے۔ یہ جو اس کے بعد دہرا نتیجہ ملتا ہے اسے ''تواب'' کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ اے انسان! جس مقام پہ تو ''تائب'' ہوتا ہے' ہم ''تواب'' ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم رحیم بھی تو ٹھہرے لیکن رحمت اس کے لیے ہے' جو پلٹ کر پیچھے واپس لوٹتا ہے۔ وہ جو آگے چلا جاتا ہے' اس کے لیے بات نہیں ہے۔ آگے تو جہنم ہے' سیدھا اس کے اندر جائے گا' اسی لیے یہ کہا کہ تُبْ عَلَيْنَا

---

[1] اس نے کہا کہ میں جنت کسے کرائے پہ دوں گا؟

[2] اس نے کہا کہ اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔

اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ (2:128) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تیرا ہی قانون وہ قانون ہے کہ جونہی کسی نے اس کی طرف رخ کیا' وہ اپنے سامانِ نشوونما کو لینے خود اس کی طرف بڑھ آیا۔ اور اس کے بعد کہا ہے کہ رَبَّنَا وَ ابۡعَثۡ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ (2:129) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے یہ کہا تھا کہ ہمیں ایسا بنا۔ پھر یہ بات کہی کہ ہماری جو ذریت ہے جو نسل ہے' اس کو ایسا کر دے کہ وہ تیرے ہی نظام کو قائم کرنے والی' تیرے ہی سامنے جھکنے والی ہو جائے اور اس کے بعد یہ ہے کہ پھر اس سلسلۂ دراز کی ایک آخری کڑی' انہی میں ایک ایسا رسول مبعوث فرما۔ برادرانِ عزیز! اب یہاں رسالت کا فریضہ بیان کیا گیا ہے۔ یہی مقام نہیں ہے بلکہ جہاں جہاں بھی نبی اکرم ﷺ کا ذکر بحیثیت رسول آیا ہے' قرآن نے تین چیزیں بیان کی ہیں۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغامِ خداوندی کو جو دوسروں تک پہنچانے والا ہے' اس کا فریضہ کیا ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِکَ (2:129) وہ تیرے قوانین کو ان کے سامنے پیش کرے۔ اب یہاں دو چیزیں ہوتی ہیں: ایک تو حکم نافذ کرنا ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ ایک قانون عطا کرنا ہوتا ہے۔

قرآن حکیم نے اپنے ہاں قانون کے ساتھ علت کو بھی بیان کیا ہے

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ ایک حکم ہوتا ہے اور ایک قانون۔ حکم اور قانون میں فرق ہوتا ہے۔ حکم وہ ہے کہ ''جسے کہا جائے وہ ایسا کرے اور اسے کرنا ہو گا خواہ وہ حکم اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے' اس کی علت کچھ ہو یا نہ ہو مگر اسے یہ کرنا ہو گا۔ یہ ڈکٹیٹر شپ ہے۔ قانون وہ ہے جس کے ساتھ اس کی علت یعنی The Way of It ہو' اس کا فلسفہ ہو کہ ''کیوں ایسا کرایا جا رہا ہے' اور ایسا کرنے سے کیا نتیجہ نکلے گا''۔ قانون اسے کہتے ہیں۔ یہ جسے آپ Law of Nature (قانونِ فطرت) کہتے ہیں' اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ یہ کہ اگر اس کے مطابق کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ مرتب ہو گا۔ یہ جو دوسری چیز ہے' جسے آپ The Why of It کہتے ہیں' یہ ہے کہ اس کی علت وغایت کیا ہے' اس کی مصلحت کیا ہے' اس کا فلسفہ کیا ہے' یہ کیوں ایسا کرایا جاتا ہے' اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ عربی زبان میں اس کے لیے ایک جامع لفظ ہے' جسے حکمت کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ وہ رسول تیرے قوانین کو ان کے سامنے پیش کرے گا اور ان کی حکمت علت وغایت بھی ساتھ سمجھائے گا کہ وہ اطاعت ایک امرِ مطلق کا حکم سمجھ کر نہ کریں کہ

''کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو''

کیا کریں بھئی! اسے ماننا ہو گا۔ یہ بات نہیں ہے۔

برادرانِ عزیز! یہ جو قرآن کی رو سے نظام قائم ہوتا ہے' اس میں ہر حکم کی علت وغایت بتائی جائے گی گو کہ اب حکم تو یہ بھی ہے جو

حکومت کی طرف سے صادر ہوتا ہے' کیا کریں اسے بھی ہم حکم ہی کہتے ہیں۔ قرآن کی رو سے قائم ہونے والے نظام کے لیے یہ بتایا جائے گا کہ اس کے اتباع سے' اس کی اطاعت سے' نتیجہ کیا مرتب ہوگا' اس کے نہ کرنے سے نقصان کیا ہوگا؟ اس ''حکم'' کے ساتھ اس کی حکمت (The Wy of It) بتانی پڑے گی۔ یہ جو Objective (مدعا) ہوتا ہے' آپ کے ہاں جو Bill Introduce کرتے ہیں' اس کے متعلق جو Object بناتے ہیں' یہ ہوتی ہے اس کی حکمت۔ آپ نے دیکھا کہ یہ وہ نظام ہے۔ اب جو اس کی اطاعت کرے گا وہ یہ سمجھ لے گا کہ اس کی اطاعت سے مجھے حاصل کیا ہوگا' اس کے عصیان سے نقصان کیا ہوگا۔ رسول کا منصب یہ ہے کہ وہ کتاب یعنی احکام پیش کرے' کتاب کے معنی قوانین ہوتے ہیں' احکام ہوتے ہیں' اور ساتھ ساتھ اس کی حکمت بھی بتاتے ہیں۔

تصوف کے تصور کے برعکس تزکیہ کا لغوی معنی

عزیزانِ من! یہ دو چیزیں ہوگئیں: کتاب وحکمت اور آگے ہے وَ یُزَكِّيْهِمْ (2:129)۔ یہ وہی لفظ ہے جس سے ہمارے ہاں تزکیۂ نفس کی ایک اصطلاح جاری ہوئی ہے۔ یہ وہی ہے جو تصوف میں' گوشے میں' بیٹھ کر وہ کیا جاتا ہے کہ کم کھاؤ' کم بولو' کم سوؤ اور ''ہوجا لکھ مسیت دا[1]'' یہ جو چیز ہوتی ہے' اس کا نام ہمارے ہاں تزکیۂ نفس ہے۔ یہ زکیٰ تزکیۃ وہی ہے' جس سے آپ کے ہاں لفظ زکوٰۃ ہے' اس کا ترجمہ Growth ہوتا ہے یعنی کسی چیز کا بڑھنا' پھولنا' نشوونما پانا' بیج کا ایک درخت کی شکل میں پیدا ہوکر' اس کا پھل لے آنا' یہ سارا پروسیس جتنا بھی ہے' یہ زکوٰۃ والا ہے' اسے تزکیہ کہتے ہیں۔ کہا کہ وہ قوانین پیش کرے' ان کی مصلحت اور علت اور غایت بیان کرے اور پھر ایک ایسا نظام قائم کرے جس میں انسانیت کی بھرپور نشوونما ہوتی چلی جائے۔ برادرانِ عزیز! یہ فریضہ ہے مملکتِ اسلامیہ کا۔ ہمارے سامنے ضمناً یہ بات آ گئی۔ دین میں یہ سامانِ نشوونما بہم پہنچانا' ایسا نظام قائم کرنا' جس میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جائے' تو وہ صرف جسمانی ہی نہیں بلکہ انسانی صلاحیتوں کی بھی ہے۔ یہ جتنا پروسیس تھا' جو طریقِ کار تھا' جو نظامِ عمل تھا' اس کو زکوٰۃ کہتے تھے۔ اور یہ کچھ کرنا حکومت کا فریضہ تھا۔

تمکن فی الارض کے حصول کے بعد ملتِ اسلامیہ کا فریضہ

کہا ہے کہ یہ جو ایک امت تیار ہورہی ہے' اس کا بیج اسی صورت میں عملاً متشکل ہوگا کہ ان کو تمکن فی الارض حاصل ہوجائے' پاور حاصل ہوگی' حکومت حاصل ہوگی۔ عزیزانِ من! دین کے لیے یہ بنیادی شرط ہے:

عصا نہ ہو تو کلیمیؑ ہے کارِ بے بنیاد

---

[1] مسجد کی صف کا ایک بے جان تنکا بن کر رہ جا۔

اگر یہ تمکن فی الارض نہ ہو یا ور حاصل نہ ہو حکومت کا نظام قائم نہ ہو تو اسے وعظ کہتے ہیں۔

کہا ہے کہ جب ان کو یہ کچھ نصیب ہوگا' یہ تمکن فی الارض ہوگا تو سنیئے! کہ یہ کیا کریں گے اور ان کا فریضہ کیا ہوگا؟ تمکن فی الارض کے بعد کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ (22:41) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں پاور حاصل ہوگی' تمکن حاصل ہوگا' سلطنت حاصل ہوگی' تو یہ کیا کریں گے؟ اس کے لیے کہا کہ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (22:41) یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے۔ پہلی چیز تو یہی دیکھ لیجیے کہ اگر یہ اتنی ہی بات ہے' جسے ہم صرف نماز پڑھنا کہتے ہیں' اگر صرف اتنی بات ہے' تو اس کے لیے یہ شرط کیوں ہے کہ جب ان کو حکومت نصیب ہوگی' تو یہ یہ کچھ کریں گے؟ یہ اس سے کوئی بڑی چیز ہے کہ جس کا تمکن فی الارض کے بغیر امکان ہی نہیں تھا۔ یہ بات تو میں اقامتِ صلوٰۃ میں بتا چکا ہوں۔

میں اگلی بات کہہ رہا ہوں کہ یہ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ کریں گے' اقامتِ صلوٰۃ کریں گے اور اس کے ساتھ ہی یہ ہے کہ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ (22:41) یہ حکومت زکوٰۃ دے گی۔ ہیں! کیا ہے یہ زکوٰۃ؟ یہ کہ حکومت عالمگیر انسانیت کے لیے سامانِ نشوونما بہم پہنچائے گی۔ یہ اقامتِ صلوٰۃ کرے گی ایک ایسا نظام قائم کرے گی' جس میں تمام افرادِ خدا کے قانون کے پیچھے' اس مصلی گھوڑے کی طرح چلتے جائیں' اتباع کرتے چلے جائیں' اور اس کا مقصد یہ ہوگا کہ عالمگیر انسانیت کو سامانِ نشوونما ملتا چلا جائے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہاں آپ نے دیکھ لیا ہے کہ قرآن نے بتایا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ زکوٰۃ دینا ہے۔ یہ ہے زکوٰۃ۔ یہاں یہ کیا ہے؟ یہ یزکیھم آیا ہے' یہیں سے یہ Verb (فعل) آ گیا۔ یہ صرف قانون کو دے دینا اس کی علت و غایت سمجھا دینا نہیں ہے اور یہ کچھ دینے کے بعد یہ چھوڑ دینا ہی نہیں ہے۔ عام انسانوں کے لیے تو صرف اتنا ہی ہوگا کہ یہ ساری چیز سمجھا دی جائے اور اس کے بعد یہ کہہ دیا جائے کہ مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29)۔ یہ ہے ہماری سوسائٹی' یہ ہیں اس کے مقاصد' یہ ہیں اس کے Rules & Regulations (قواعد و ضوابط) جس کا جی چاہے' اس کا ممبر بن جائے' جس کا جی چاہے ممبر نہ بنے لیکن جو ممبر بن جاتا ہے پھر اس کے اوپر یہ جو سارے قواعد ہیں' اس کے اوپر Apply (استعمال) ہو جائیں گے' اس کا اطلاق اس کے اوپر ہوگا۔ یہ یزکیھم ہے کہ یہ ایسا نظام متشکل کرے گا جو ان افراد پر مبنی ہوگا جو افرادِ معاشرہ کے لیے بھی سامانِ نشوونما بہم پہنچائیں گے اور یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا جائے گا تو عالمگیر انسانیت کے لیے سامانِ نشوونما بہم پہنچاتے چلے جائیں گے۔

قرآنِ حکیم کی آیات کے آخر میں خدا تعالیٰ کی دی گئی صفات' پوری آیت کا مفہوم بیان کر دیتی ہیں

عزیزانِ من! اب یہ وَ يُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (2:129) آیا ہے۔ کیا بات ہے! اوپر کتاب اور حکمت کہا

ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کی آیتوں کے آخر میں جو خدا کی صفات بیان ہوتی ہیں' وہ وہاں بڑی برجستہ ہوتی ہیں یعنی وہ اس آیت کے مقصود کی تشریح کر دیتی ہیں۔ کہا ہے کہ کتاب اور حکمت دی۔ کتاب قانون ہے' اٹل ہے' اس کے لیے قوت کی ضرورت ہے۔ حکمت ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے آپ کو ذہنی طور پر مطمئن کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہا کہ ابراہیم علیہ السلام یہ اس لیے دعائیں مانگ رہے ہیں اور آخر میں کہہ رہے ہیں کہ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ (2:129)- عزیز کے معنی ہوتا ہے "صاحبِ قوت"۔ عزت کے معنی ہی "قوت" کے ہوتے ہیں۔ عربی میں ذلت کے مقابلے میں یہ لفظ آتا ہے۔ اس لیے کہ تیرا نظام اور جو تیرا قانون ہے وہ قوت بھی رکھتا ہے' دھاندلی والی قوت نہیں رکھتا' حکیم بھی ہے یعنی اس قوت کے ساتھ حکمت بھی رکھتا ہے۔ اب جو سرچشمۂ عزت و حکمت ہو' اس کا قانون اور نظام تو کتاب اور حکمت کے اوپر مبنی ہوگا۔ آپ نے دیکھا کہ جب صفاتِ خداوندی آیت کے آخر میں آتی ہیں تو وہ کیا کر جاتی ہیں۔

لفظ ملت کے معنی پورے کا پورا نظام اور اس کا طریقِ کار ہوتا ہے

کہا ہے کہ یہ تھا ابراہیم علیہ السلام' یہ تھی اس کی سیرت' یہ تھے اس کے مقاصد' یہ تھا طریقِ کار اور یہ ہے جس کے لیے ایک جامع لفظ ملت آیا ہے۔ ہم تو اب ملت کو امت کے معنی میں عام طور پہ استعمال کرتے ہیں۔ ملت کے معنی ہوتا ہے "یہ سارا طریقہ کہ جتنا بھی ہے پورے کا پورا یہ نظام یا کسی کی روش"۔ کہا کہ یہ ہم نے پیش کیا۔ کیا تم نے سمجھ لیا؟ کہا کہ سمجھنے کے بعد بتایئے کہ وَ مَنۡ یَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّةِ اِبۡرٰهٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِهَ نَفۡسَهٗ (2:130) اس ابراہیمی علیہ السلام طریق سے کون منہ موڑ سکتا ہے سوائے اس کے کوئی منہ نہیں موڑے گا۔ اب یہ دیکھیے کہ یہاں استثنا ہے کہ کون اس سے منہ موڑتا ہے۔ کہا ہے کہ مَنۡ سَفِهَ نَفۡسَهٗ (12:130) سفاہت کے معنی ہمارے ہاں عام طور پہ حماقت بے وقوفی کرتے ہیں۔ ترجمہ اس کا آپ کے ہاں ہوتا ہے کہ "کوئی بے وقوف ہی اس سے اعراض برتے گا"۔ یہ تو کچھ گالی سی ہو جاتی ہے' کچھ مزہ نہیں آتا۔

اس سے کون اعراض برتے گا؟ اس کے معنی میں بڑی عظیم حقیقت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سارے نظام کا' اس سارے طریق کار کا' مقصد کیا تھا؟ اس کے لیے کہا ہے کہ یہ مقصد وَ یُزَکِّیۡهِمۡ (2:129) انسانی ذات' انسانی نفس کی نشوونما' اس کی بہبود' اس کی ترقی' نفسِ انسانی کی نشوونما! یاد رکھیے! یہ سارا نظام' یہ امت کی تشکیل' یہ سارا حیاتِ اجتماعیہ' اس نفس انسانی کی نشوونما کے لیے ہوتا ہے' اس کام کے لیے یہ اسٹیٹ' یہ مملکت' یاد رکھیے! یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ فرد کی ذات کی پوری پوری نشوونما ہو جائے۔ مقصود بالذات فرد کی تکمیلِ ذات ہوتی ہے۔ یہ جو اجتماعی نظام یا مملکت ہے' یہ اس کے لیے Means (ذرائع) ہیں۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ کہا ہے کہ مقصود یہ

ہے کہ ایک فرد کے نفس کی نشوونما ہوتی چلی جائے۔ عربی زبان میں نفس یا جو قرآن نے استعمال کیا ہے وہ ہے جسے ہم ذات (Personality) یا انسان کی Self کہتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اس قسم کے نظام سے تو وہی شخص منہ موڑ سکتا ہے جو اپنی ذات کی حقیقت اور مقام سے ناآشنا ہو اور اسے پست کا پست رکھنا چاہے۔ جسے بھی Self Consciousness (شعورِ ذات) نصیب ہو جائے گی، وہ کبھی اس قسم کے نظام سے منہ نہیں موڑے گا۔ جس میں شعورِ ذات پیدا ہو گا، اس کا مقصد یہ ہو گا کہ وہ اپنے اس نفس اور اپنی اس ذات کو پست نہ کرے، ذلیل نہ کرے، بلندیوں کی طرف لے جائے، وہ کبھی اس طریق سے منہ نہیں موڑے گا۔ اس سے وہی منہ موڑے گا جس کے سامنے اپنی اس ذات کی قیمت نہ ہو۔

صفاتِ خداوندی انسانی زندگی کے لیے ایک معیار مقرر کرتی ہیں

برادرانِ عزیز! قرآن کی تعلیم کا مقصود یہی ہے کہ وہ شعورِ ذات دیتا ہے، انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کرتا ہے اور یہی بات ہے جو میں کہا کرتا ہوں اور میں نے اپنی کتابوں میں بھی لکھی ہے کہ اسلام کا دین Man (انسان) سے God (خدا) کی طرف جاتا ہے، انسان سے خدا کی طرف جاتا ہے۔ وہ انسان کو اپنی ذات پر ایمان لانے کی پہلی تلقین کرتا ہے اور جب وہ اپنی ذات پہ ایمان لاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں اپنی ذات کو نشوونما دینا چاہتا ہوں، تو اس کے لیے ایک Objective Standard (خارجی معیار) ہونا چاہیے، جس کے اوپر وہ اپنے آپ کو ماپ کر دیکھتا چلا جائے کہ میری ترقی ہو رہی ہے یا میں پستی کی طرف جا رہا ہوں۔ خدا کی ذات کی صفات یعنی صفاتِ خداوندی جو اسماء الحسنٰی ہیں، وہ اس کے لیے ایک معیار بنتا ہے۔ خدا پر ایمان اس لیے ضروری ہے کہ وہ The Most Perfect Self ہے، تکمیل یافتہ مکمل ترین ایک نفس جو ہے، وہ خدا کی ذات ہے۔ انسان علیٰ حدِ بشریت اس کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرتا چلا جاتا ہے تاکہ یہ حدِ بشریت کے اندر اس جیسا ہوتا چلا جائے اور جو اپنے آپ پہ ایمان نہیں رکھتا اس کے لیے خدا پہ ایمان بے معنی ہے۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک خدا پہ ایمان کی نوعیّت اور معاشرتی انقلاب کا طریقِ کار

برادران عزیز! اس چیز کے لیے جو کچھ اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہا ہے کہ وہ بڑا ہی عظیم ہے۔ وہ تو بڑی بلندیوں پہ پہنچ کر بات کر جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ

شاخِ نہالِ سدرۂ خار وخسِ چمن مشو

تُو تو سدرہ کے بلند ترین درخت کی ایک شاخ ہے، تُو باغ کا گھاس پھونس کیوں بنتا ہے، تو چمن کا کوڑا کرکٹ نہ بن۔

منکرِ او اگر شدی منکرِ خویشتن مشو

(زبورِ عجم)

اگر تو ابھی مقامِ خداوندی کو نہیں پہچانتا' تو کوئی بات نہیں ہے' یاد رکھ! اپنا منکر نہ ہو جا۔ اگر تُو اپنی ذات سے انکار کرے گا تو آگے قدم ہی نہیں اُٹھ سکے گا۔ اس لیے اگر تُو اپنے خالق کا منکر ہو گیا ہے تو اپنا منکر نہ بن۔ دوسری جگہ وہ اس سے بھی سخت الفاظ میں کہتے ہیں کہ

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است

ملا کی شریعت میں خدا کا منکر کافر ہوتا ہے مگر

منکرِ خود نزدِ من کافر تر است!

(جاوید نامہ)

میرے نزدیک اپنی ذات کا منکر کافر تر ہوتا ہے۔

برادرانِ عزیز! دنیا کی یہ جتنی چیزیں ہیں' ان کی Values' ان کی اقدار' ان کی قدر' ان کی جو قیمت ہے' یہ تو انسان کی نگاہ پر ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے:

تو قدرِ خویش ندانی بہا ز تو گیرد

تُو اپنی قیمت نہیں جانتا' دنیا کی جتنی چیزیں ہیں' اسے تو تُو قیمت عطا کرتا ہے:

تو قدرِ خویش نہ دانی بہا ز تو گیرد
وگرنہ لعلِ درخشندہ تارۂ سنگ است

(اقبال: پیامِ مشرق)

تیری نگاہ میں اس کی قیمت نہ ہو تو ہیرہ وجواہر پتھر کا ٹکڑا ہے۔ اس کی حیثیت کیا ہوتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے بار بار قرآن نے بھی یہ کہا ہے کہ اپنے اندر ایک تبدیلی پیدا کر' باہر کی دنیا میں خود تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ اپنی نگاہ کا زاویہ بدل' باہر کی سب چیزوں کی قیمتیں بدل جائیں گی اور یہی چیز ہے جو اقبالؒ (1938-1877ء) نے قرآن کے متعلق کہا ہے کہ

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

جب یہ قرآن انسان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے تو اس کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے اور

جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

(جاوید نامہ)

جب اس کے اندر تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تو باہر کی دنیا خود بدل جاتی ہے۔

برادرانِ عزیز! یہ جو طریقِ کار ہے اسے انقلاب کہتے ہیں۔ جیسا میں نے کہا تھا' انقلاب تو قلبی ہے' قلب کی تبدیلی کا نام ہے اور قلب کی تبدیلی کے بغیر جتنی تبدیلیاں آپ لاتے ہیں' قرآن انہیں فساد کہتا ہے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ وَ مَنۡ یَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّۃِ اِبۡرٰھٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِہَ نَفۡسَہٗ (2:130) اس قسم کے طریقِ عمل سے' اس قسم کے نظام سے' کون منہ موڑ پائے گا' بجز اس کے کہ جو اپنے آپ کو ذلیل رکھنا چاہے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ کافر کسے کہتے ہیں؟ یہ گالی نہیں ہے۔ اپنے مقام سے جو نا آشنا ہے اور اپنے آپ کو پستی میں رکھنا چاہتا ہے' کہتا ہے کہ وہی ہے جو اس سے منہ موڑ سکتا ہے۔ عزیزانِ من! ہم نے اپنا منہ اس سے موڑا ہوا ہے۔ کیا ہم اپنے مقام سے واقف ہیں؟ نہیں لیکن یہ بات ہم دوسرے موقع پہ اٹھا رکھتے ہیں۔

مقامِ ابراہیمی کے مقابلے میں ہمارے ہاں برگزیدہ افراد کا تصور اور قرآن حکیم کی تعلیم

کہا کیا ہے؟ یہ کہ آؤ' تمہیں بتاؤں جو اپنے مقام سے واقف ہو جاتا ہے' ملتِ ابراہیمی علیہ السلام سے متمسک ہو جاتا ہے' اس راستے کے اوپر چلنے کے لیے ایمان لے آتا ہے' یہ ابراہیمی علیہ السلام کیفیت ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ مقامِ ابراہیمی علیہ السلام کیا تھا؟ کہا کہ وَ لَقَدِ اصۡطَفَیۡنٰہُ (2:130) ہم نے اس کو منتخب کیا۔ مقامِ ابراہیمی سے وہ برگزیدہ ہو جاتا ہے' فرد بھی اور امت بھی۔ اب ہمارے ہاں برگزیدہ افراد کا تو آپ کو پتہ ہے کہ یہ کونوں گوشوں میں بیٹھے ہوئے' روٹی کے محتاج ہیں' پھٹے ہوئے کپڑے ہیں' بس اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں ''نہ اوہدا گھر بار' نہ ایناں دا مقام کوئی' نہ او کھاندا اے' نہ ایناں نوں کھان نوں ملدی ہیگی اے' نہ او کپڑے پوندا ہیگا اے' اے وی ننگے پھردے پئے ہیگے ❶۔'' برادرانِ عزیز! قرآنِ مجید نے اصطفیٰ کہا ہے کہ ہم نے اس کو برگزیدہ کیا' پہلی چیز یہ ہے صاحب! کہ فِی الدُّنۡیَا (2:130) دنیاوی زندگی کے اندر برگزیدہ کیا اور پھر تکمیل ہوتی ہے اور اس کے بعد وَ اِنَّہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ (2:130) آخرت میں بھی وہ ان میں سے ہوگا جن کی ذات کی صلاحیتیں نشو ونما پا چکی ہوں گی۔

دیکھا' عزیزانِ من! مقامِ ابراہیمی علیہ السلام کیا ہے لیکن ابھی پھر کچھ ابہام رہ سکتا تھا۔ رہ تو نہیں سکتا تھا' پیدا کیا جا سکتا تھا۔ قرآن تو کوئی گوشہ چھوڑتا ہی نہیں ہے۔ یہ کہ یہ جو دنیا کا اصطفیٰ ہے یہ کیا ہے؟ کہا کہ اِنَّ اِبۡرٰہِیۡمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیۡفًا (16:121)۔ کیا بات ہے ایک لفظ سامنے آ گیا! بہرحال اس کو تو یونہی ترجمہ کر کے ہی آج بڑھ جاتا ہوں۔ کہا کہ ابراہیم علیہ السلام! کیا اس قسم کی شخصیت تم سمجھتے ہو کہ ایک فرد کی ہوتی ہے؟ یہ تو ایک امت کی ہے' امت اس کے اندر سمائی ہوئی ہوتی ہے۔ کہا یہ کہ اس کو ہم نے برگزیدہ کیا' کسی کو چن لینا' بلند مقام پہ کھڑا کر دینا ہے۔ وَ اٰتَیۡنٰہُ فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً (16:122) دنیا میں ہم نے ان کو خوشگواریاں عطا کیں' دنیا کی

---

❶ نہ اس کا کوئی گھر ہے نہ ان کا ہے' نہ وہ کھاتا ہے' نہ انہیں کھانے کو کچھ ملتا ہے' نہ وہ کپڑا پہنتا ہے اور یہ بھی انہی کی طرح ننگے دھڑ نگے ہی گھومتے ہیں۔

بڑی حسین زندگی عطا کی۔ پھر یہ ہوسکتا تھا کہ صاحب! یہ جو ہماری زندگی ہے' یہ پھٹے ہوئے کپڑے' یہ بھوک اور ننگ' ہم سے پوچھیے' دل کی قناعت ہمیں حاصل ہے' ہم سے زیادہ کوئی امیر دنیا کے اندر نہیں ہے' ہم کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ہوسکتا تھا کہ پھر اسی تصوف کی طرف چلے جائیں' پھر وہی فقر و فاقہ ہو' کہیں کہ یہ ہے حسنہ سے مراد۔ یہ قرآن ہے۔ کہا کہ ابراہیم علیہ السلام اور اس کی ذریت کی کیفیت یہ تھی۔ یہ سنیے کہ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً (2:201) ہم نے دنیا میں فراوانیاں اور خوشگواریاں عطا کیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کچھ کیا ہوتا ہے؟ کہا کہ فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ (4:54) آلِ ابراہیم کو قانون اور حکمت عطا کی۔ نظام کے لیے قانون دیا' دانشوری کے لیے' Intellect کے لیے' حکمت عطا کی۔ وَ اٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا (4:54) اور ہم نے اسے بڑی عظیم مملکت عطا کی تھی۔

زورِ بازو کی قوت اور بصیرت: یہ دونوں چیزیں مومن کی زندگی کا زیور ہوتی ہیں

عزیزانِ من! یہ ہے جو یہ فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً ہے' یہ ہے قرآن کی تفسیر کہ اسے ہم نے ملکِ عظیم عطا کیا تھا۔ یہاں حکمت کہی ہے' ملکِ عظیم ساتھ دیا ہے' خالی ملکِ عظیم نہیں' کتاب و حکمت دی ہے۔ اسی لیے دوسرے مقام پہ ان کے متعلق کہا ہے کہ یہ سب اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ (38:45) ہے اور یہ تو عزیزانِ من! ہر جگہ ہمارے ہاں یہ لکھا ہونا چاہیے کہ یہ کیا تھے؟ یہ دنیا کے حسنہ جنہیں ہم نے کہا ہے' یہ کیا چیز تھی؟ اور پھر آخرت کی صلاحیت کس طرح سے حاصل ہوتی ہے؟ کہا ہے کہ ہم نے ان کو قوتِ بازو بھی عطا کی تھی' ان کی نگاہوں میں انہیں بصیرت بھی دی تھی۔ اگر قوت تنہا ہو اور اس کے ساتھ بصیرت نہ ہو تو وہ خالص فسادِ انسانیت بن جاتی ہے۔ یہ فرعونیت' یہ نمرودیت اور یہ استکبارِ آمریت' یہ کیوں باعثِ فسادِ انسانیت ہیں؟ اس لیے کہ ان میں بغیر بصیرت کے قوت کا استعمال ہوتا ہے' یہ ہے جسے آپ اندھا دھند قوت کہتے ہیں ''سکھا شاہی جنوں اسی کیندے ہوندے آں [1]۔'' اور اگر خالی بصیرت ہی حاصل ہو اور اس کے ساتھ قوت حاصل نہ ہو تو یہ شاعری ہوتی ہے۔ دنیا کی حسنات کے لیے دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں' ان کا حسین امتزاج ضروری ہے۔ یہ ہے اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ (38:45)۔ قوتِ بازو اور نگاہوں میں بصیرت' یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہوتی ہیں تو اس کا نام دین کا نظام ہوتا ہے' جس کے پاس یہ دونوں ہوں اسے مومن کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ جیسے ہم نے کہا ہے کہ ہم نے اسے دنیا میں منتخب کیا' حسنات عطا کیں۔ آپ نے دیکھا کہ ملکِ عظیم عطا کیا' قوت بازو عطا کی' بصیرت عطا کی۔ اب کہا کہ وَ اِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (2:130)۔ یہاں پھر وہ دہرایا کہ جس کی اس قسم کی دنیا ہو' یقیناً اس کا مستقبل درخشاں ہوگا اور اُس میں بھی وہ صالحین میں سے ہوگا۔

---

[1] جیسے ہم سکھا شاہی کہا کرتے ہیں۔

قوانینِ خداوندی انسان کو باوقار زندگی عطا کرنے کی ضمانت مہیا کرتے ہیں

عزیزانِ من! ایک دفعہ پھر اسے دہرا دیں کہ یہ چیز حاصل کیسے ہوئی تھی؟ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسۡلِمۡ (2:131) خدا نے اس سے کہا کہ اے ابراہیم علیہ السلام! ہمارے قوانین کے سامنے جھک جاؤ۔ قَالَ اَسۡلَمۡتُ (2:131) کہا کہ میں تیرے سامنے جھک گیا۔ یہ کس کے سامنے جھکا جا رہا ہے؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ انسانیت کا ذکر ہو رہا ہے۔ قرآن کی سورۃ الفاتحہ کی ابتدا پہلے ان دو الفاظ سے ہوتی ہے کہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (1:1) خدا اس لیے وجہِ حمد و ستائش ہے کہ وہ تمام انسانیت کا نشو و نما دینے والا ہے۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ ہاں! میں جھک گیا۔ کس کے سامنے جھک گیا؟ کہا کہ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (2:131) میں تیری ربوبیتِ عالمینی کو دنیا میں عملاً قائم کرنے کے لیے تیرے قوانین کے سامنے جھک گیا ہوں۔ یہ تھا ابراہیم علیہ السلام! اس کے فوراً بعد کہا کہ وَ وَصّٰی بِهَاۤ اِبۡرٰهٖمُ بَنِیۡهِ وَ یَعۡقُوۡبُ (2:132) اس نے یہ بات اپنی ہی ذات تک نہیں رکھی، اولاد کو بھی اسی کا حکم دیا، بیٹے کو بھی حکم دیا، پوترے تک کو بھی اسی قسم کا حکم دیا کہا کہ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰی لَکُمُ الدِّیۡنَ (2:132) یاد رکھو! تمہارے لیے خدا نے یہ ایک ایسا عظیم نظامِ زندگی تجویز کر دیا ہوا ہے۔ اس نظام کے قیام کے لیے تمہیں یہ مقامِ اصطفیٰ (2:132) اور اجتبیٰ (16:121) ہے، اس کے حصول کے لیے، اس کے استحکام کے لیے، کیا ضروری ہے؟ یہ کہ فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (2:132) تمام زندگی اس کے مطابق بسر کرنا اور مرتے دم تک اس کی اطاعت کرتے رہنا۔

مومن کی زندگی کا ہر قدم، ہر آن زندگی کی بلند اقدار کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ جو جھک جانا ہے، یہ کوئی ایک واقعہ نہیں ہے، کوئی ایمرجنسی نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کسی ایک بات کے اندر ہم جھک گئے۔ یہ تو صرف اس حکم کی فرماں برداری ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ چیز نہیں ہوتی کہ پھر فرمانبرداری نہ کریں۔ یہ تو یوں ہے کہ جب آپ کسی نظام کے اندر رہتے ہیں، تو وہ نظامِ زندگی کے ہر گوشے کے اوپر مستولی ہوتا ہے۔ مومن کی یہ صورت نہیں ہے کہ اس نے نماز جا کر پڑھ لی تو حکمِ خداوندی کا اتباع ہو گیا، مسجد سے باہر نکلا تو دنیا کے باقی معاملات ہیں، اپنی مرضی کے مطابق کرتے چلے گئے۔ پھر خدا کا حکم آیا دوسری نماز کا، جا کر پڑھ لی اور یہ جو درمیان میں کیا اس کے لیے یہ عقیدہ وضع کر لیا کہ نماز ایک دریا ہے، ایک ندی ہے، جو بہہ رہی ہے۔ صبح اٹھنے سے نہائے، میل کچیل دور ہو گئی۔ پھر باہر چلے گئے، پھر سارا گند مند جو ہے، وہ لپٹ گیا "مڑ کے آن کے ایک ڈبکی لائی، پھیر نہا لیا[1]"۔ اور اگر یہ ایسا ہی کوئی دھبہ چپٹ گیا، اس سے نہیں دھل سکتا، تو کسی طرح سے کچھ پیسے اکٹھے کر کے زم زم کے پانی میں جا کر دھو لیا،

---

[1] پھر واپس آ کر ایک ڈبکی لگائی، نہا لیا (اور ہو گئے پاک صاف)

حج کرکے چلے آئے۔اس کے بعد عقیدہ یہ ہے کہ حج کرنے کے بعد انسان ایسا ہوجاتا ہے' جیسا آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ عزیزانِ من! اس نظام کی یہ بات نہیں ہے۔نظام یہ ہے کہ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (2:132) پوری زندگی' موت کے آخری سانس تک' اس نظام میں مسلم رہنا ہوگا۔یادرکھو! پھر یہ مقام ملتا ہے۔گویا

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

ابراہیم علیہ السلام نے بیٹوں کو' پوتوں کو یہ کہا اور پھر اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ (2:133) کیا تمہیں معلوم ہے کہ پوتے یعقوب علیہ السلام نے' اپنی موت کے وقت کیا کہا تھا؟ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ (2:133) اپنے بیٹوں کو جمع کیا اور پوچھا کہ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ' (2:133) میرے بعد' تم کس کی محکومت اختیار کروگے؟ عزیزانِ من! مومن کی وصیتیں دیکھیے۔وہ یہ نہیں کہتا کہ "اے زمیناں او ہنوں' اے کوٹھا او ہدے حصے اچ آ جائے[1]۔" اس کا سوال ہی نہیں ہے۔وہ پوچھتا یہ ہے کہ میرے بعد تم کس کی محکومیت اختیار کروگے؟ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (2:133) انہوں نے کہا کہ اسی صاحبِ اقتدار کی جس کی محکومیت ہمارے دادا' ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کی' اسماعیل علیہ السلام نے کی' اسحاق علیہ السلام نے کی' آپ علیہ السلام نے بھی کی اور اب ہم بھی اسی روش پر چلیں گے۔جس کی محکومیت اختیار کریں گے' وہ اِلٰهًا وَّاحِدًا (2:133) ہی تو ہے' وہ ایک ہی تو ہے جس کے سامنے جھکنا ہے' جس کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔کوئی اور ہو تو اس کے متعلق سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔بات توحید کی ہے۔اب ہم زندگی میں کیا کریں گے؟ یہی کہ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (2:133) بس ہم اس کے سامنے جھکیں گے۔

برادرانِ عزیز! درس کا وقت تو گیا پورا' لیکن میں ایک آیت اور پڑھوں گا۔یہ عظیم آیت ہے۔یہ سب کچھ کہنے کے بعد کہا کہ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ (2:134) یہودیوں نے کہا کہ ہم بنی اسرائیل ہیں' یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں' ہمیں آگ چھو ہی نہیں سکتی۔کیوں؟ ہمارے بزرگوں نے یہ کارنامے کیے ہوئے تھے۔دنیا کی ہر قوم جب پستی میں ہوتی ہے تو ہمیشہ بزرگوں کے کارنامے گنا گنا کر اپنے آپ کو فریب میں رکھتی ہے۔(مثلاً کہتی ہے کہ) ہمارا ماضی تم دیکھو صاحب! یورپ جب ابھی کھالوں سے جسم ڈھانپا کرتا تھا' ہمارے ہاں تہذیب و تمدن کے قمقمے جلا کرتے تھے۔یہ ساری چیزیں ہیں کہ پدرم سلطان بود۔ساری چیز اس قوم میں یہ ہوتی ہے۔دوسری طرف مذہب کے اندر آکر کیا ہوتا ہے؟ معاف رکھیے گا آپ کو معلوم ہے کہ میرا تو تعلق کسی فرقے سے نہیں ہے' فرقہ پرستی تو قرآن کی رو سے شرک ہے' مثال بعض اوقات دینی پڑتی ہے۔اس میں کسی فرقے کے متعلق بات نہیں ہوئی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

---

[1] یہ زمینیں انہیں اور یہ مکان اس کے حصے میں آئے۔

تیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)' (آیات 135 تا 142)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٥﴾ قُولُوا
آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ
وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٦﴾ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ
مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ
الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾ صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿١٣٨﴾ قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا
وَرَبُّكُمْ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ﴿١٣٩﴾ أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ
وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ قُلْ أَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ ۗ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً
عِندَهُ مِنَ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٠﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ
وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا
عَلَيْهَا ۚ قُل لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٤٢﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1969ء کی 19 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 135 سے ہوتا ہے: (2:135)۔

بغیر کسی تخصیص کے پوری انسانیت کے لیے عالمگیر سطح پر نظامِ حیات کا نام دین کہلاتا ہے

ملتِ ابراہیمیہ علیہ السلام کے سلسلے میں ہم بڑے اہم مقامات میں پہنچ رہے ہیں۔ بات مسلسل چلی آ رہی ہے۔ اس میں قرآنِ کریم نے ایک بڑا بنیادی سوال اٹھایا ہے اور وہ یہ ہے کہ دین ایک عالمگیر نظامِ انسانیت کا نام ہے۔ یہ نہ فرقوں کی گروہ بندیوں میں بٹ سکتا ہے' نہ وطن یا نسل کے شعوب اور قبائل کی پابندیوں میں گھر سکتا ہے۔ یہ انسان کے لیے بلا کسی قسم کی تمیز اور تخصیص کے ہے اور اس کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں سے رکھی گئی اور اس کے لیے ایک مرکزِ محسوس کا تعین کیا گیا' جسے کعبہ کہا جاتا ہے۔ وہ انسانیت کے ایک نقطے پر جمع

ہونے پر مرکوز ہونے کا Symbol (علامت) ہے۔

عزیزانِ من! اب اسی سلسلے میں یہ چیز بھی کہی گئی ہے کہ دین کی بنیاد قانونِ مکافاتِ عمل ہے یعنی ہر فرد کے اپنے اعمال کے نتائج اسی کے لیے ہیں۔ اس میں کسی قسم کے حسب اور نسب کی اضافت کوئی کام نہیں دے سکتی اور نہ ہی یہ سوال کسی آنے والی نسل سے پوچھا جائے گا کہ اس کے اسلاف میں سے کون کیسا تھا۔ کہا گیا ہے کہ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2:134)۔ یہ آیت پچھلی دفعہ آ چکی تھی۔ کہا ہے کہ اسلاف یہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے وقت میں اپنے اپنے اعمال کے ساتھ دنیا سے چلے گئے۔ جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لیے تھا، جو تم کرو گے وہ تمہارے لیے ہوگا اور تم سے ہم یہ پوچھیں گے ہی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ اب دیکھیے گا کہ یہ ایک اصول اور یہ ایک آیت، کتنی بڑی کشمکش اور الجھن سے انسان کو بلند لے جاتی ہے۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ ماضی کے ان اسلاف کے ہاں سے کیا ہوا، اور کس نے کیا کیا؟ سوال یہ ہے کہ تمہارے سامنے زندگی کا یہ ایک ضابطہ ہے، تم نے اس کے مطابق زندگی بسر کی یا نہیں کی؟ آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے کتنی وہ توانائیاں، کتنا وہ وقت، جس میں ہماری ساری تگ و دو ضائع ہو جاتی ہے کس طرح اس سے بچا کر انسان کو وہ ایک مقام پہ لے آئے گا کہ ہر شخص اپنے اعمال کا بدلہ پائے گا۔

اس کے بعد کہا ہے کہ وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (2:135) یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم یہودی ہو جاؤ، نصرانی ہو جاؤ، تب سمجھے جائیں گے کہ تم صحیح راستے پہ چل رہے ہو۔ کہا کہ یہ گروہ بندیاں ہیں، یہ نسبتیں غلط ہیں بلکہ ملتِ ابراہیمی، ملت کے معنی طریقہ یا راستہ بھی ہوتے ہیں، لکھا ہوا قانون بھی ہوتے ہیں، املا کرایا ہوا قانون بھی، وہ راستہ جس کا ذکر چلا آ رہا ہے، اختیار کرو، ایک لفظ حنیفاً نے خصوصیتِ کبریٰ بتائی۔ حنیفاً ہر طرف سے کٹ کر یکسو ہو جانے والا ہوتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو لا الہ کے اندر ہے، یہ ہر الہ کی نفی کرنے والا ہے، یہ ہر اقتدار سے منہ موڑتا ہے، ہر بڑی چوکھٹ سے سرفرازی سے گزرتا ہوا ایک چوکھٹ کے اوپر سر جھکانے والا ہے۔

حنیفا کا مفہوم یہ ہے کہ دین خداوندی کے علاوہ کسی اور کی طرف میلان کا تصور کرنا بھی شرک ہے

برادران عزیز! کہا ہے کہ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (2:135) وہ مشرکین میں سے نہیں تھا۔ یہاں آپ نے دیکھا کہ یہ شرک کا لفظ کہاں آ رہا ہے؟ آپ جب کسی ایک کی طرف رخ کرتے ہیں تو آپ کا رخ ہر دوسری طرف سے مڑ جاتا ہے۔ بیک وقت آپ دو طرف اپنا رخ یا منہ کر ہی نہیں سکتے۔ جونہی آپ کا رخ، آپ کا رجحان، آپ کا میلان، اس ہستی سے جو قادرِ مطلق ہے، الگ ہوا، اس کے علاوہ کسی اور کی طرف بھی ہوا، تو یہ شرک ہو گیا۔ شرک محض بتوں کے سامنے جھکنے کا نام ہی نہیں بلکہ کسی اور تک توجہات کا جو جانا بھی ہے، جو مرکوز کر دینا ہے، جو اس کے میلانات ہیں، وہ سارے ہی شرک میں شامل ہیں۔ حنیفاً (2:135) کی تشریح وَ مَا كَانَ مِنَ

الْمُشْرِكِيْنَ (2:135) نے کی۔ ہمارے ہاں ملتِ ابراہیم علیہ السلام یہ ہوئی۔ اب یہاں ایک چیز یہودی یا نصرانی کی نفی کی گئی ہے' یہ نسبتیں ہیں' یا نسلی نسبتیں ہیں اور پھر نصرانی تو کہتے ہیں کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت کرنے سے یہ لوگ اپنے آپ کو عیسائی کہلاتے ہیں۔

اُمت کی تشکیل تو نبی کی نسبت سے ہی وجود میں آتی ہے لیکن دین کا معاملہ تو صرف خدا سے قرار پاتا ہے

عزیزانِ من! یہاں دیکھیے قرآن کتنا بلندی پہ لے جاتا ہے! اس میں شبہ نہیں کہ امت ہمیشہ اپنے اپنے رسول کی نسبت سے بنتی ہے۔ اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کیونکہ یہ دین میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کے پہلے انبیائے کرام علیہم السلام کو مانتے ہیں۔ آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں' اس نسبت سے وہ عیسائی کہلاتے ہیں۔ ایک عیسائی حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام تک کے انبیائے کرام علیہم السلام کو ماننے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خدا کا رسول مان لیتا ہے یعنی اس سلسلہ کی کڑی میں' وہ ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے آگے بڑھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی وہ ایمان لایا' جسے ہم کہتے ہیں کہ مسلمان ہوگیا۔ اس ایمان لانے سے' پیشتر' جیسا میں نے کہا ہے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک وہ تمام انبیائے سابقہ پر ایمان لا چکا ہوا تھا لیکن آخری نبی علیہ السلام کی نسبت سے وہ عیسائی کہلاتا تھا۔ جونہی وہ آگے بڑھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا تو اب وہ اس کے بعد عیسائی نہیں کہلا سکتا حالانکہ وہ جو عیسائی ہونے کے لیے شرط تھی انبیائے سابقہ پر ایمان رکھ کر حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھنا' وہ چیز اب بھی اس کے ہاں موجود ہے۔ اس میں سے اس نے کسی سے انکار نہیں کیا لیکن اس سے آگے جو نبی ہے' اس پہ جب وہ ایمان لایا' تو اب وہ عیسائی نہیں رہا' اب وہ امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہوگیا۔ اس نبی کی نسبت سے ایک نئی امت بنتی ہے۔ جو اس کڑی میں آخری نبی ہوتا ہے' آپ دیکھتے ہیں' اس سے کتنے مسائل حل ہو جاتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو ہمارے ہاں یوں پچاس ساٹھ برس سے طولانی بات کھینچ رہی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو بھی آپ نبی تسلیم کر کے اس نبوت کے اوپر ایمان لے آئیں گے تو جس طرح ایک شخص عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ ایمان لانے سے عیسائی نہیں رہتا' ایک نئی امت کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کے اوپر ایمان لانے سے وہ امتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں رہتا' ایک نئی امت کا فرد ہو جاتا ہے۔ وہ ایک نئی امت بنتی ہے (اور یہی چیز ختمِ نبوت کو توڑ دیتی ہے)۔

کوئی نبی بھی دین کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتا

امت تو ایک چیز ہے جو نظام کے اعتبار سے بنتی ہے۔ جو دین ہے' اس کی نسبت قرآن کسی نبی کی طرف نہیں کرتا۔ یہ ایک بڑی اہم چیز ہے۔ دین کی نسبت صرف خدا کی طرف ہوتی ہے۔ دین اللہ کا دیا ہوا ہوتا ہے' رسول اس دین کو لے کر آتا ہے۔ اب اس نسبت سے مختلف انبیائے کرام علیہم السلام جو دین لے کر آئے' تو اس دین کی نسبت کسی رسول یا نبی کی طرف قرآن نے نہیں کی۔ لہٰذا یہ جو اس نے کسی نبی

کی وساطت سے دین کو ماننے والوں کا نام رکھا ہے' وہ نبی کی نسبت سے نام نہیں رکھا۔ یہ موسوی یا عیسائیت (عیسوی) نام لوگوں نے خود اپنے رکھے۔ یہ جو نسبتیں ہیں' جو دین کی نسبت کی ہیں' یہ بالکل غلط ہے۔

دین اسلام قبول کرنے والوں کا نام قرآن نے صرف مسلم رکھا ہے

قرآنِ کریم نے یہ چیز کہی ہے کہ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا (22:78) خدا نے تمہارا نام مسلم رکھا تھا' اس سے پہلے بھی اور قرآن میں اب بھی۔ نظر آیا کہ شروع سے ہی دین اسلام تھا' جس کے معنی ہیں ''قوانینِ خداوندی کے سامنے جھک جانا'' اور اسلام کو ماننے والوں کا نام مسلم تھا۔ یہ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا (22:78) آیا ہے' یعنی پہلے بھی یہی نام تھا' اب بھی یہی نام ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ اس ایک نام رکھنے سے ساری گروہ بندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ کتنی بڑی چیز ہے کہ وہ دین کا نام بھی اس نبی کی نسبت سے نہیں رکھتا' جو نبی یا رسول آ کر اس دین کو پہنچاتا ہے ورنہ وہ جو دین ہے' وہ بھی گروہوں میں بٹ جاتا۔ دینِ موسوی علیہ السلام' دینِ عیسوی علیہ السلام' دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی رو سے یہ چیز غلط ہے۔ دینِ خداوندی ہے اور صرف اس کا ماننے والا مسلم ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ وہ جوامت کا لفظ ہے' وہ ایک تنظیمی اعتبار سے' ایک قوم کے لیے بولا جائے گا۔ امتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تو آپ کہیں گے' دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہہ سکتے۔ اس کے جو ماننے والے ہیں' اسے آپ مسلم کہیں گے' اس دین کو ماننے والے محمدی نہیں کہلائیں گے۔ دین کی نسبت رسول کی طرف نہیں ہوگی۔ مسلم ہمارے لیے صحیح لفظ تھا۔ یہ جو انگریزوں کے ہاں محمڈن کہا جاتا ہے' وہ غلط ہے۔ یہ مسلم ہی ہونا چاہیے' دین اسلام ہی ہونا چاہیے لیکن ''دہن کا ذکر کیا یہاں تو سر ہی غائب ہے گریباں سے۔'' یہ جو چیز تھی کہ صاحب! اس کو دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہنا چاہیے' مسلمان کو صرف مسلم ہی کہنا چاہیے' وہ آگے چلیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ دونوں ہی چیزیں غائب ہو گئیں۔ اب کوئی آپ سے پوچھے کہ آپ کون ہیں؟ کہ صاحب! مسلمان ہوں' اس کے بعد وہ پوچھتا ہے کہ بھئی' نہیں! میں پوچھتا ہوں کون سا مسلمان؟ یعنی اب اتنی چیز کافی نہیں ہے۔ بالکل نہیں! آگے کہیے؟ کہا کہ جی! سنی مسلمان ہوں۔ او سنی مسلمان تو ہوا' میں پوچھتا ہوں کونسے سنی مسلمان ہو؟ کہ جی! حنفی مسلمان ہوں' صاحب! او حنفی تو ہیں لیکن یہ بتاؤ کہ کیا آپ دیوبندی ہیں' یا بریلوی ہیں؟ چلیے' صاحب آگے چلتے جائیے! بریلوی کہیے اور اگر آپ نے زیادہ خدا پرست بننا ہے تو پھر یہ کہ کیا آپ چشتیہ خانوادہ سے ہیں یا قادریہ سے ہیں؟ کہ جی! الحمدللہ' چشتیہ سے ہوں۔ اور اس کے آگے پھر یہ چشتیہ نظامیہ ہیں یا صابریہ ہیں؟۔ ہم کہہ رہے تھے کہ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (22:78) اس نے تردید کی ہے کہ یہ جو تم اپنے نبی کی طرف بھی اپنی نسبت کر کے دین کو بتا رہے ہو' یہ بھی غلط ہے۔ دین اسلام ہے اور اس کے ماننے والا مسلم ہے۔ اس نے تمہارا نام مسلم رکھا۔ یہ فی هذا (22:78) ہے' یعنی پہلے یہی نام تھا' قرآن میں

بھی یہی نام ہے۔

دین جب مذہب میں بدلتا ہے تو انسان کے تمام تصورات کسی نہ کسی شخصیت تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں

برادران عزیز! آپ دیکھتے ہیں کہ پھر جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو بات کہاں سے کہاں چلی جاتی ہے۔اس نام تک سے اطمینان نہیں ہوتا جو خدا نے تمہارا نام رکھا ہے۔ یہ ساری نسبتیں' جو میں نے ابھی گنائی ہیں' یہ کسی نہ کسی شخصیت پہ جا کر ختم ہو جاتی ہیں' خدا تک نسبت نہیں پہنچتی اور مذہب کی کیفیت یہ ہے کہ پھر مذہب پرست خدا تک اپنی نسبت کرنے سے بھی جھجکتا ہے' شرماتا ہے' اسے کافی نہیں سمجھتا۔ برادرانِ عزیز! خدا تو آتا ہی نہیں ہے' مذہب میں شخصیتیں آتی ہیں۔ خدا صرف دین میں آتا ہے' جہاں شخصیتیں ختم کر لیتا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی شخصیتیں تو ایک طرف رہیں وہاں تو یہ کیفیت ہے کہ وہ ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ جن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر' اس کے متعلق وہ یہ کہہ دیتا ہے کہ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (3:143) محمد ﷺ بھی بجز ایں نیست کہ خدا کا بھیجا ہوا ایک پیغامبر ہے۔اس سے پہلے بھی پیغمبر آئے' چلے گئے۔ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ (3:143) کل کو اگر یہ مر جائے یا ختم کر دیا جائے' تو تم یہ کہو گے کہ چونکہ سارا جو دین تھا وہ تو اس شخصیت کے ساتھ مخصوص ہو گیا تھا' شخصیت باقی نہ رہی' اس لیے دین ختم ہو گیا۔ کیا پھر اس کے بعد تم کفر کی حالت کی طرف مڑ جاؤ گے؟

قرآن یہاں بڑی عظیم چیز کہہ گیا ہے۔ جہاں کوئی چیز' آپ کسی شخصیت کے ساتھ وابستہ کریں گے' جب وہ شخصیت نہ رہے گی تو اس کے بعد وہ چیز ختم ہو جائے گی۔ یہ ساری سلطنتیں' یہ ساری حکومتیں' اس وقت ٹوٹتی ہیں' جب کوئی چیز کسی ایک شخص کے اندر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اگر وہ آئیڈیالوجی کی بنا پر رہے' اگر وہ نظریئے کی بنا پر رہے' کسی فلسفے کی بنا پر رہے' تو جب تک اس نظریہ اور فلسفہ میں چلنے کی قوت ہوتی ہے' وہ اسے برقرار رکھتا ہے' اشخاص اور شخصیتوں کی موت سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہوتا اور یہ وجہ تھی کہ قرآن نے آپ کے نظامِ حکومت کو بھی آئیڈیالوجی کے ساتھ وابستہ رکھا تھا کہ اشخاص آتے رہیں' اشخاص جاتے رہیں' یہ آئیڈیالوجی چونکہ قیامت تک کے لیے دی ہے اور پوری انسانیت کے لیے دی ہے' یہ کبھی ختم ہی نہیں ہونے کی لیکن نظامِ مملکت تو ایک طرف رہا' ہمارے ہاں تو دین بھی اب اللہ کے ساتھ اپنی نسبت نہیں رکھتا' اس کی نسبتیں بھی ہم انسانوں کے ساتھ رکھتے ہیں تو قرآن نے یہاں یہ چیز کہی تھی کہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں! تم ان نسبتوں میں گھر جاؤ' یہودی ہو جاؤ' نصرانی ہو جاؤ' کیا پھر تم راہِ ہدایت پہ سمجھے جاؤ گے؟ کہا کہ یہ غلط ہے۔ ایسا نہیں ہوگا' اس لیے کہا کہ تم ہر طرف سے کٹ کر' نسبتوں سے کٹ کر' حنیفاً ہو کر' یکسو ہو کر رہو۔ یہ ہے ابراہیم علیہ السلام کا راستہ۔ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (2:135) وہ مشرکین میں سے نہیں تھا۔ یہ جو حنیف ہے' یہ وہ چیز ہے جو اب ہمارے ہاں رسمی طور پہ جسے نماز کی نیت کہتے ہیں' کی صورت میں ادا کی جاتی ہے حالانکہ قرآن نے بتایا تھا کہ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ

الْمُشْرِكِيْنَ (6:80)۔ یہ بہت عظیم اعلان ہے۔ اس آیت میں کہا ہے کہ ''میں دنیا کے مرکز سے' ہر رخ سے' کٹ کر خالصتاً ایک نقطے پہ اپنی توجہات کو مرکوز کر رہا ہوں اور ذاتِ بے ہمتا پہ' جو اس کائنات کو عدم سے وجود میں لائی ہے۔'' اور یہ کرنے کے بعد یہ کہا کہ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (2:135) دیکھو مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ اگر کسی اور مرکز کی طرف آپ کی توجہ ہوئی تو شرک ہو گیا۔ یہ تھی ملتِ ابراہیمیہ جسے حنیفا (2:135) کہا یعنی وہ ملتِ ابراہیمیہ جو اپنی تمام توجہات کو تمام اطراف سے ہٹا کر' ایک نقطہ' ایک نصب العین' ایک مرکز پر' مرکوز کر دے اور وہ مرکز ہے دینِ خداوندی۔ یہ ہے وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (2:135)۔

قرآن حکیم اپنے ماننے والوں کو کشادہ نگہی سے ہم کنار کرتے ہوئے تمام انبیائے کرام پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے

برادرانِ عزیز! اب اعلان ہوا کہ سن لیجیے! ہمارا دین کیا ہے' ہم کیا مانتے ہیں؟ سنو! تم صرف کسی ایک نبی کو مانتے ہو اور ہم ان گروہ بندیوں سے بلند ہو چکے ہیں۔ کہا ہے کہ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ (2:136)۔ برادرانِ عزیز! یہ عظیم چیز آئی ہے۔ دنیائے مذاہب میں اتنی کشادہ نگہی اور اتنی وسعتِ ظرف کی یہ چیزیں کسی جگہ آپ کو نہیں ملیں گی۔ کہا ہے کہ ہم ایمان لاتے ہیں' اللہ پر' ہم ایمان لاتے ہیں' اس پہ جو ہماری طرف نازل ہوا' ہم ایمان لاتے ہیں' ان تمام پیغامات پہ جو اس سے پیشتر تمام انبیائے سابقہ کی طرف خدا نے بھیجے۔ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام اور ان کی ذریت اور خاندان میں جو انبیاء علیہم السلام آئے' اور جو کچھ خدا نے دیا موسیٰ علیہ السلام کو اور عیسیٰ علیہ السلام کو' سیدھی بات ہے مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ جو بھی انبیائے کرام علیہم السلام کو دیا' ہم اس بات پہ ایمان لاتے ہیں کہ وہ سب خدا کی طرف سے تھا' اپنے وقت میں وہ سچا تھا۔ ہم اس حقیقت پہ ایمان لاتے ہیں' ہم ان تمام کو خدا کے نبی مانتے ہیں۔ عزیزانِ من! اتنا ہی نہیں' آگے کہا کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ (2:136) ہم بحیثیت نبوت کے ان میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ اندازہ لگائیے! یہ کہاں پہنچتا ہے۔ جہاں تک انبیاء اور رسولوں کا ذکر ہے' کچھ تھوڑے سے ہیں' جن کا ذکر قرآن نے نام لے کر کیا' باقیوں کے متعلق یہ کہہ دیا کہ ہم نے ان کا ذکر تو نہیں کیا لیکن یاد رکھو! کوئی بستی بھی ایسی نہیں تھی جس میں ہم نے اپنا رسول نہ بھیجا ہو۔ اب قرآن حکیم میں ان کا ذکر آیا ہے یا نہیں آیا' کوئی اہلِ مذہب میں اپنے کسی بزرگ کو' بانی مذہب کو' یہ کہہ دے کہ وہ خدا کی طرف سے پیغام لایا تھا' تو قرآن کے اس حکم کی رو سے' ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اس کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم مان لیں اور کہیں کہ وہ بھی اپنے وقت میں خدا کی طرف سے سچا پیغمبر تھا' سچا ہی پیغام لایا تھا' یہ الگ بات ہے کہ اب وہ پیغام کہیں اور باقی نہیں رہا۔

رواداری اور مفاہمت میں ایک بنیادی فرق ہے

آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے کتنی Tolerance (برداشت' رواداری) پیدا ہوتی ہے' کتنی بڑی رواداری پیدا ہوتی ہے لیکن رواداری پیدا ہوتی ہے' اس میں مفاہمت یا Compromise پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ماننا ہوگا کہ اب خدا کا' حقیقی' اصلی' غیر آمیزش شدہ پیغام' قرآن اور صرف قرآن کے اندر ہے' کسی اور جگہ نہیں ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ تمام جتنے بھی دنیا کے مذاہب کے بانی ہیں یا جن کو بھی وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں وہ بانی مذاہب تھے' اس اتنی سی بات سے' ان کا کتنا احترام آپ کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مناظروں میں' مباحثوں میں' ہم نے دیکھا کہ یہ دریدہ دہن اٹھتے تھے اور بڑی گستاخی سے پیش آتے تھے مثلاً نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے متعلق' لیکن مسلمان کی تو کیفیت یہ ہے کہ ایک مسلمان کو ان کے بزرگ یا نبی تو ایک طرف رہا' قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ ان کے معبودانِ باطل کو بھی گالی نہ دو کہ یہ جہالت میں پھر خدا کو گالی دے دیں گے اور یہ اس لیے کہ یہ کوئی خاص فرقہ نہیں بناتا' کوئی خاص گروہ نہیں بناتا' اس کے اندر کسی پروفیشن کی بات نہیں ہے۔ پوری نوعِ انسانی کے لیے عالمگیر صداقتیں ہیں۔ کائنات میں بکھری ہوئی ہیں۔ اس لیے اس میں گروہ بندی کا تو سوال ہی نہیں ہے اور آپ کو پتہ ہے کہ اس نے دین کے اندر فرقہ بنانے کو تو شرک قرار دیا ہے۔ یہی تو شرک ہے کہ کسی نہ کسی انسان' کسی نہ کسی شخصیت کی طرف آپ منسوب کر دیں گے۔ اس طرح کسی کی طرف منسوب کرنے سے وہ بات حنیفاً نہیں رہتی۔ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ دیکھنا! کہیں تم مسلم ہونے کے بعد مشرک نہ ہو جانا یعنی **وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ . مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ** (30:31-32) ان میں سے نہ ہو جانا جو دین میں فرقے پیدا کر لیتے ہیں۔

توحید کی بنیادی لم ہی یہ ہے کہ تمام انبیائے کرام میں کوئی بھی کسی فرقے کا پیروکار نہ تھا

عزیزانِ من! کبھی سمجھ میں ہی بات نہیں آتی کہ ہمارے ہاں ان تمام فرقوں کو اپنی اپنی جگہ رکھنے کے لیے یہ جو اتنا زور دیا جاتا ہے' تو کوئی ان سے نہیں پوچھتا کہ اس قدر واضح نصِ صریح قرآن کا ارشاد موجود ہے کہ فرقوں کی طرف نسبت کرنا شرک ہے' نہ کوئی ان سے پوچھتا ہے نہ یہ کسی کو کچھ بتاتے ہیں۔ پوچھنے والے کو کافر قرار دیدیتے ہیں۔ وہ تو ٹھیک ہے' جب وہ ان میں سے کسی فرقے میں سے نہیں ہے تو ان کے نزدیک تو کافر ہو ہی گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ خدا کے نزدیک وہ موحد ہو گیا اور اب تو ہم اس مقام پہ آ پہنچے ہیں کہ جو صرف خدا کی طرف نسبت کرنے والا ہوتا ہے' وہ ان کے ایمان کی رو سے کافر ہو جاتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ** (2:136) ان میں سے کسی میں ہم فرق نہیں کرتے۔

اب یہاں اگلی بات آ گئی کہ ان انبیائے کرام کا تو بڑا مقام ہوا' ان پہ ایمان لانے کا کہہ دیا' کہا کہ ہم فرق بھی نہیں کرتے تو اب یہاں اس عقیدت کی بنا پر تھوڑی سی گنجائش نکل آتی تھی' اس میں آپ نے ذرا سا غلو تو کر ہی دیا' نبی کو آپ نے کچھ معبود بنا لیا۔ اسی وقت

کہہ دیا کہ یادرکھو! یہ سارا کچھ ہم احترام کے طور پر مانتے ہیں نَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ (2:136) ہم جھکتے اسی کے سامنے ہیں۔ان میں سے کسی کے ساتھ ہم اسلام کی نسبت نہیں کرتے نَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ (2:136) یہ ہے وہ مسلک جس کی رو سے ہم خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں۔

ہندوستان میں برہموسماجی تحریک کی حقیقت اور دین کی نوعیت

اب آگے ایک اور بات آگئی۔کہا کہ فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِہٖ فَقَدِ اھۡتَدَوۡا (2:137)۔یہ بڑا غور طلب نکتہ ہے۔یہ جو ہمارے ہاں ایک برہموسماجی اسلام چلا آتا ہے‘ جس کے آخری مبلغ احمد محی الدین مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم (1958-1882ء) تھے‘ جس میں کہا تھا کہ عالمگیر سچائیاں ہر مذہب میں یکساں پائی جاتی ہیں یعنی اسلام یہ کہتا ہے کہ اگر تم اپنے مذہب کی صداقتوں پر کاربند ہو جاؤ تو میرا کام پورا ہو گیا اور اس کے لیے پھر وہ بڑی ہی ایک پست سی دلیل دیتے ہیں کہ صاحب! یہ تو آپ دیکھیے کہ ہر اہلِ مذہب اپنے ہی مذہب کو سچا کہتا ہے اور اسی لیے تو دنیا میں یہ جنگ وجدل ہو رہی ہے تو اس جنگ وجدل کو مٹانے کے لیے وہ سیدھی سی بات یہی ہے کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ سچا ہے‘ کسی مذہب کو دوسرے مذہب پہ فضیلت نہیں ہے۔یہ تو ٹھیک ہے۔مذاہب کی دنیا میں‘ تو یہ بات نہیں ہوتی کہ کوئی اور مذہب اپنی جگہ سچا ہے یا جھوٹا ہے‘ اس سے ہمیں کیا بحث ہے؟ فضیلت کا سوال ہی نہیں ہوتا حتیٰ کہ اگر آپ اسلام کو بھی مذاہب کی صف میں لے آئیں گے‘ تو جس طرح سے ہر اہلِ مذہب اپنے مذہب کو سچا کہتا ہے‘ آپ بھی کہتے چلے جائیے لیکن دین تو ایک سے دو نہیں ہو سکتے‘ دین ایک ہوتا ہے۔خدا کی طرف سے ملا ہوا نظامِ زندگی تو بیک وقت دو ہو ہی نہیں سکتے‘ وہ ایک ہی ہوتا ہے اور اسی دین پر ایمان لانا ہوتا ہے یا اسے تسلیم کرنا ہوتا ہے۔اور دین اب قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں ہے۔اس لیے آج یہ کہنا کہ ’’ہر مذہب والا اپنے اپنے مذہب کے اوپر کاربند ہو جائے تو اسلام کہتا ہے کہ میرا کام پورا ہو گیا‘‘ یہ بالکل باطل کی طرف دعوت دینے والی بات ہے۔

دیکھیے! قرآن کیا کہتا ہے؟ یہ سارا کچھ کہنے کے بعد‘ یہ تمام لوگ جو ان انبیائے سابقہ کو ماننے والے ہیں‘ ان کے متعلق کہا کہ ان سے کہو کہ فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِہٖ (2:137) اگر یہ لوگ اس طرح سے خدا پر ایمان لائیں جیسے تم ایمان لاتے ہو تو فَقَدِ اھۡتَدَوۡا (2:137) پھر سمجھو کہ یہ ہدایت کے اوپر ہیں۔یہ بات نہیں ہے کہ ہم اپنے اسلام کو کہتے ہیں کہ یہی سچا ہے اور دوسروں کا باطل ہے۔اگر قرآن کو کوئی مانتا ہے تو یہ تو قرآن کا حکم ہے‘ تو یہ اس نے کہہ دیا ہے کہ اگر یہ باقی کے لوگ دوسرے مذاہب والے اس طرح سے خدا کو مانیں جس طرح سے یہاں کہا گیا ہے اور جیسے تم مانتے ہو تو پھر سمجھو کہ یہ سچے راستے پہ ہیں۔ وَ اِنۡ تَوَلَّوۡا (2:137) اور اگر یہ اس سے روگردانی کرتے ہیں‘ اس ایک طریق سے جو قرآن نے بتایا ہے‘ کوئی دوسرا طریق اختیار کرتے ہیں تو

فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ (2:137) سمجھ لیجیے کہ وہ اپوزیشن میں ہیں' وہ حزبِ اختلاف میں ہیں' تمہاری پارٹی میں نہیں ہیں' وہ دین کو تسلیم کرنے والے نہیں ہیں' خدا کو ماننے والے نہیں ہیں' کیونکہ یہاں اٰمَنْتُمْ بِهٖ (2:137) آیا ہے' خدا پر اس طرح سے ایمان لائیں جیسے یہ قرآن کہتا ہے۔ پھر سمجھ لیجیے کہ یہ خدا پر ایمان لانے والے ہیں۔

دنیائے مذاہب میں عالم گیر سطح پر خدا کا تصور' قرآن حکیم کے بیان کردہ تصور کے متضاد ہے

برادرانِ عزیز! مذہب کا سچا ہونا تو ایک طرف رہا' آپ کہتے ہیں کہ ان میں عالمگیر سچائیاں موجود ہیں' وہ ان کو خدا پر ایمان لانے والا تسلیم ہی نہیں کرتا۔ بات بھی تو بڑی صحیح ہے۔ چند دہریوں کو چھوڑ کر دنیا میں ہر شخص خدا کا کوئی نہ کوئی تصور رکھتا ہے۔ یہ ان تصورات کو باطل کیوں قرار دیتا ہے؟ عیسائی بھی خدا کا ایک تصور رکھتے ہیں۔ سارا قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ ہندو بھی خدا کا تصور رکھتے ہیں' یہودی بھی خدا کا تصور رکھتے ہیں۔ قرآن انہیں خدا کو ماننے والا تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتے ہیں ہم خدا کو مانتے ہیں۔ کیوں یہ تسلیم نہیں کرتا؟ وہ خدا کا انکار تو نہیں کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اپنے اپنے ذہن کے تراشیدہ خدا کو مان لینا' خدا پر ایمان نہیں ہے۔ اس خدا کو مانو جس خدا کا تعارف خود خدا نے کرایا ہے کہ میں ایسا ہوں نہ کہ وہ خدا جو تمہارے اپنے ذہن نے تراش لیا ہے اور یہ چیز ہے' جو یہاں کہی گئی کہ اگر یہ لوگ اس طرح خدا پہ ایمان لائیں' جیسے تم ایمان لائے ہو' پھر سمجھو کہ یہ سچے راستے پہ ہیں۔ اگر یہ اس سے روگردانی کرتے ہیں' ہر وہ شخص جو اس طرح خدا کو نہیں مانتا جیسا قرآن نے بتایا ہے' تو وہ روگردانی کرتا ہے یعنی هُمْ فِیْ شِقَاقٍ (2:137) وہ حزبِ مخالف میں ہے' اپوزیشن کے اندر ہے' خواہ اپنا نام مسلمان ہی کیوں نہیں رکھتا ہو۔ مسلمان کے ذہن میں بھی خدا کا تصور اگر غیر قرآنی آ گیا ہے تو فِیْ شِقَاقٍ (2:137) وہ اپوزیشن میں چلا گیا' مسلم نہیں رہا۔ اب یہ چیز ہے کہ صاحب! یہ اتنی بڑی اپوزیشن بن گئی' ساری دنیا ہی تمہارے ہاں مخالفت میں چلی گئی۔ سارا زمانہ ہی حزبِ اختلاف بن گیا۔ کیا اس میں کچھ کرنے کی بات ہے؟

دنیا بھر کی مخالفت کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ایسا جواب کہ جس کا پھر کوئی جواب ہی نہیں ہے

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ (2:137) قطعاً گھبرانے کی بات نہیں ہے کہ یہ سارے ہی ہمارے مخالف ہو گئے۔ تمہارے لیے ان سب کے مقابلے میں خدا کا دین کافی ہے۔ وہ جو کہا کرتا ہوں کہ عربی زبان کے اندر ایک ایجاز ہوتا ہے کہ سمٹا کر Concentrate (مرتکز) کر کے' الفاظ کو بیان کرنا' عربی جاننے والے جانتے ہیں۔ ایک لفظ ہے کہ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ (2:137) ایک لفظ کے اندر آپ دیکھیے' کتنا کچھ جمع ہوا ہے! پھر اس میں Consequences (نتائج) کے لیے ''ف'' ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ تم اس کے لیے گھبراؤ نہیں' عنقریب کے لیے ''س'' ہے۔ یکفی کے معنی ہیں' کفایت کرے گا۔ اگلا ''ک'' ہے' تیرے لیے اگلا

"ھم" ہے کہ ان کے مقابلے میں۔ایک لفظ میں سارا ہی کچھ کہہ گیا۔کہا کہ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (2:137) وہ ایسے نہیں ہے کہ جا کر دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا کہ "او جی! کج کرو" وَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (2:137) سننے والا جاننے والا وہ ہے جو تمہارے لیے ان کے مقابلے میں کافی ہے۔ یہ سارا کچھ کہنے کے بعد کہا کہ صِبْغَةَ اللّٰهِ (2:138) یہ ہے اللہ کا رنگ۔

عزیزانِ من! رنگ کیا کرتا ہے؟ جتنے پہلے رنگ داغ دھبے ہوتے ہیں، سب کو ڈھانپ کر صرف وہ باقی رہتا ہے، نیچے والے پہلے رنگ کوئی باقی نہیں رہتے۔دیکھا اس رنگ نے کیا کیا ہے؟ اگر آپ پہ رنگ ایسا نہیں آیا، پہلے رنگوں میں سے جو کوئی رنگ ہے اس کی نمود ہے تو یہ رنگ نہیں چڑھا۔آپ رنگ کرا کر لائیے اور اسے گھر کے اندر لا کر دکھائیے۔اگر کہیں اس کے اندر نیچے کے رنگ کا کوئی دھبہ، غیر محسوس طور پر بھی نظر آتا ہے، تو کہا جاتا ہے کہ "رنگ چڑھیا نئیں ہیگا[1]"۔یاد رکھیے! اس میں یہ صِبْغَةَ اللّٰهِ (2:138) بڑی اہم چیز ہے۔ یہ جو قرآن نے اس قدر حسین انداز میں، اس کی بات کی ہے کہ یہ اسے شرک کہتا چلا آ رہا ہے، یہ یوں سمجھ میں آ جائے "او ایک ڈوبا ہو ایس نیل اچ کہ پہلے رنگاں دے دھبیاں دا نشان تیکر کتھے باقی نہ رہے[2]۔" یہ لا الٰہ تو پہلے مٹے، تو یہ الا اللہ کا رنگ باقی رہا۔اور پھر رنگ بھی کیسا؟ قرآن کریم نے تو کہا ہے کہ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (2:138) اس کے رنگ سے زیادہ حسین رنگ کون سا ہو سکتا ہے۔ چڑھے بھی ایسا کہ پہلے کسی رنگ کا کوئی آثار تک باقی نہ رہے۔ حسین بھی ایسا ہو کہ احسن اس سے زیادہ اور حسین رنگ بھی کوئی نہ ہو۔

برادرانِ عزیز! حسن تو توازن کو لیے ہوئے ہوتا ہے یعنی صحیح Proportion (تناسب) میں رنگ دیا ہوا۔ یہ رنگ کی بڑی خوبی ہوتی ہے۔کیا ہوتا ہے، جب یہ رنگ چڑھتا ہے؟ کہا کہ وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (2:138) پھر انسان اس کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتا، صبغۃ اللہ کے معنی یہ ہیں، اس کا رنگ چڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ محکومیت کے لائق صرف اس کا نظام و قانون رہ جاتا ہے اور کوئی باقی نہیں رہتا۔ یہ ہے نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (2:138)۔اس کے بعد کہا کہ قُلْ اَتُحَآ جُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ (2:139) اس قسم کے خدا کے ماننے میں تم جھگڑ رہے ہو۔او پاگلو! کوئی گنجائش کہیں اس میں جھگڑے کی باقی نہیں ہے۔

مذہب کے خدا اور دین کے خدا میں فرق

برادرانِ عزیز! آگے دو باتیں کہی ہیں۔ یہودی اور نصاریٰ خاص طور پہ اس میں مخاطب تھے، وہی سب سے زیادہ مخالفت کرتے تھے۔کہا کہ تم اس اللہ کے معاملے میں جو ہم نے پیش کیا ہے، جھگڑتے ہو۔آؤ! ہم تمہیں بتائیں۔تم کہتے ہو کہ صاحب! ہم بھی خدا کو

---

[1] رنگ چڑھا ہی نہیں ہے۔

[2] وہ ایک اس نیل میں ڈوبا ہوا ہے کہ پہلے رنگوں کے دھبوں تک کا نشان نہیں ہے۔

مانتے ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ نہیں' اس خدا کو ماننا ہوگا۔ اب یہاں بات جھگڑے کی نکل آئی۔ کہا کہ آؤ! ہم بتائیں کہ تمہارا خدا کیا ہے اور یہ خدا کونسا ہے۔ یہودیوں کا خدا قومی خدا تھا' صرف بنی اسرائیل کا خدا تھا' غیرِ بنی اسرائیل کا وہ خدا تھا ہی نہیں۔ یہودی غیرِ بنی اسرائیل کو جو بنی اسرائیل کی نسل سے متعلق نہیں ہے مانتا ہی نہیں تھا' یعنی اس کے ہاں خدا تو صرف نسل کا خدا تھا۔ کہا کہ تمہارا خدا تو وہ خدا ہے جو صرف ایک نسل کا خدا ہے۔ تم کہتے ہو کہ ہم اس کی چہیتی اولاد ہیں اور اس نسل سے باہر جو بھی ہے اس کو خدا کے ساتھ اور خدا کو ان کے ساتھ' کوئی تعلق نہیں ہے۔ سنو! ہم کس خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں؟ کہا کہ وَھُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمْ (2:139) وہ صرف ہمارا ہی پرورش کرنے والا نہیں ہے' ہمیں ہی نشو ونما دینے والا نہیں ہے' بلکہ ہمارا خدا تمہیں بھی نشو ونما دینے والا ہے۔ تمہارا خدا صرف تمہارا خدا ہے' ہمارا خدا ہمیں بھی پرورش کرنے والا ہے اور تمہیں بھی نشو ونما دینے والا ہے۔ اب دیکھ لیجیے کہ یہ خدا' اس کے مقابلے میں جو نسلی تمیزات کے اندر گھر کر رہ گیا تھا' یہ خدا کتنا عالمگیر ہوا! پہلی چیز یہودیوں کے متعلق یہ کہہ دی' دوسرے تھے نصرانی۔ ان کے متعلق بھی سنو۔

عیسائیت کے نزدیک اعمالِ حسنہ کی بجائے حضرت مسیح کے کفارے پر ایمان لازم ہے

عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کس طرح چیلنجوں کو Meet (مقابلہ) کرتا ہے۔ ان سے کہا کہ تم یہ چیز کہتے ہو کہ کوئی انسان اپنے اعمال کے صدقے میں' شریعت کی رو سے' نجات پا ہی نہیں سکتا۔ نجات پانے کے لیے حضرتِ مسیح علیہ السلام کے کفارہ پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور جو کفارہ پر ایمان لاتا ہے اس کے لیے اعمال کی ضرورت نہیں رہتی' وہ جنت میں ضرور چلا جائے گا۔ کہا کہ تمہارا یہ عقیدہ ہے۔ سنو! ہمارا کیا عقیدہ ہے؟ وہ یہ ہے کہ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَکُمْ اَعْمَالُکُمْ (2:139) نجات کا مدار اعمال پہ ہے اور اعمال ایک چیز ہے کہ جو ہر Individual (فرد) ہے' اس کی اپنی Individuality (انفرادیت) کے اوپر اثر انداز ہوتی ہے۔ کسی کی قربانی یا کسی کا صلیب پہ چڑھ جانا' کسی کا جان دے دینا' کسی دوسرے کی نجات کا موجب نہیں ہوتا' نہ ہی کسی کا حسنِ عمل کسی دوسرے کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ وہاں تو یہ کہا ہے کہ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَکُمْ اَعْمَالُکُمْ (2:139) تمہارے اعمال کے نتائج تمہارے لیے اور ہمارے اعمال کے ہمارے لیے۔ کہا کہ یہ ہے وہ دین جس کی طرف ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں۔

خدا کی طرف آنے والے کسی نبی کا تعلق بھی گروہ بندیوں سے نہیں تھا' وہ تو دین کو پیش کرنے والے تھے

اب تمہاری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ ہم یہ کیوں کہتے ہیں کہ تم جو کہتے ہو' وہ دینِ خداوندی نہیں ہو سکتا' ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ عالمگیر انسانیت کا دین ہے۔ وَ نَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ (2:139) ہم اس معاملے میں' پورے اخلاص کے ساتھ ہیں' اس میں کسی قسم کی نہ منافقت ہے' نہ آمیزش ہے' نہ کوئی غلو ہے' خالصتاً ہم اس کے لیے' یہ دین ہے' جو مقرر کرتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰھٖمَ

وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطَ کَانُوۡا ہُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی (2:140) یہ انبیائے سابقہؑ جو تھے وہ ہماری گروہ بندیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کوئی ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام اور یہ اور کوئی کہتا ہے وہ یہودی تھے وہ کہتا ہے وہ نصرانی تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ کیا کہتے ہو تم؟ سنو! ان کا تعلق تمہاری خود ساختہ گروہ بندیوں میں سے کسی سے بھی نہیں تھا۔ وہ خالص مسلم تھے، وہ اپنی نسبت ہی کسی گروہ بندی کی طرف نہیں کرتے تھے۔ ان سے کہو کہ قُلۡ ءَ اَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰہُ (2:140) کیا تم زیادہ جانتے ہو یا خدا زیادہ جانتا ہے کہ جس نے ان انبیاءؑ اور رسولوں کو بھیجا تھا۔ اور بات یہ نہیں کہ تم جانتے نہیں ہو، تم جانتے ہو۔ تمہارے ہاں اب بھی اگرچہ یہ صحیفے تحریف شدہ ہیں، ان میں کہیں نہ کہیں پھر بھی بچی کھچی صداقتیں موجود ہیں، جو اس بات کی شہادت دیتی ہیں جو ہم کہہ رہے ہیں لیکن تم کیا کرتے ہو؟ اس کے لیے کہا کہ وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ کَتَمَ شَہَادَۃً عِنۡدَہٗ مِنَ اللّٰہِ (2:140) اللہ کی طرف سے تو گواہی، شہادت تمہارے پاس پہنچ چکی تھی۔ اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اس قسم کی شہادت کو چھپائے اور یہ بات کہے کہ نہیں جی! یہ یہودی تھے یا یہ نصرانی تھے۔ یہ شہادت جو خدا کی طرف سے تمہیں ملی تھی، اس کو تم چھپاتے ہو وَ مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ (2:140) اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے خدا کا قانون مکافاتِ عمل غافل نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کسی طرح سے دھوکا دے کر اس طرح سے بچ جاؤ گے۔ شہادت کو چھپا کر دنیا میں انسانوں کو تو دھوکا دیا جا سکتا ہے خدا کو تو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔

عزیزانِ من! اس کے بعد پھر دہرا دیا اسی آیۂ جلیلہ کو جو پہلے آئی تھی؛ جس سے میں نے آج آغازِ سخن کیا ہے کہ تِلۡکَ اُمَّۃٌ قَدۡ خَلَتۡ (2:141) پھر ہم تمہیں بتا دیں، ایک دفعہ اس حقیقت کو دہرا دیں۔ دیکھیے! یہ کتنی عظیم حقیقت ہے۔ چند ہی آیتوں کے بعد وہ سارے الفاظ پھر دہرا دیئے کہ یاد رکھو! یہ سب کچھ ہم نے تمہیں کہا ہے، ان پر ایمان بھی لانا ہے، ان کا احترام بھی کرنا ہے، ان میں تفریق نہیں کرنی لیکن اس کے باوجود اس سے زیادہ اور کوئی مقام ان کا نہیں ہے کہ تِلۡکَ اُمَّۃٌ قَدۡ خَلَتۡ (2:141) یہ قوم چلی گئی لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَ لَکُمۡ مَّا کَسَبۡتُمۡ (2:141) جو کچھ انہوں نے کیا ان کے ساتھ تھا، جو تم کرو گے تمہارے ساتھ ہے وَ لَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (2:141) ہم تم سے قطعاً نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا؟

قرآن حکیم میں پاروں کی تقسیم اور کعبے کی حیثیت

برادرانِ عزیز! اس آیت (2:141) پہ پہلا پارہ ختم ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں پاروں کی تقسیم مضامین کے اعتبار سے نہیں ہے۔ پاروں کی یہ تقسیم محض تلاوت کی غرض سے، حفظ میں آسانی یا حوالوں (References) کے لیے شروع ہوئی ہے۔ اس لیے پورے قرآن کو تیس حصوں کے اندر بانٹ دیا ہوا ہے، ورنہ پارے کی تخصیص کچھ نہیں۔ یہ یاد رکھیے! کہ چونکہ ہمارے ہاں بالعموم پاروں کے شمار کو بھی ملحوظ

رکھا جاتا ہے' اس لیے میں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ یہاں مسلسل بات چلی جارہی ہے۔ یہاں اب بڑا اہم سوال سامنے آیا ہے' صاحب! کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے دستِ مبارک سے کعبہ کی بنیاد رکھی گئی' ایک گھر بنایا گیا جس کے متعلق کہا گیا کہ اس کی نسبت کسی انسان کی طرف نہیں ہوگی' خدا کی طرف ہوگی' یہ عالمگیر انسانیت کے جمع ہونے کا مقام ہوگا یعنی عالمگیر انسانیت کی برادری بننے کے لیے ایک مرکزِ محسوس۔ یہ تھی کعبے کی حیثیت۔

یہودیوں نے خدا کے دین کو قومی تصور کرتے ہوئے اپنا مرکز بیت المقدس کو بنالیا تھا

عزیزانِ من! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبے کی تعمیر کی' جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ مرکز رہے۔ جب یہودیوں نے دین کو قومی بنایا ہے' تو انہوں نے اس کے لیے بیت المقدس بطور مرکز بھی الگ تجویز کیا' وہ یہودیوں کا قومی مرکز ہے۔ دین عالمگیر تھا' کسی ایک قوم کا مرکز' عالمگیر مرکز نہیں بن سکتا۔ عرب میں اس کے بعد جو یہ سلسلۂ انبیائے کرام تھا' وہ بنی اسماعیلؑ کی طرف نہیں رہا' بنی اسرائیل کی طرف رہا اور وہ انبیائے کرام فلسطین (کنعان) میں مبعوث ہوئے۔ وہ جو بیت المقدس کا ہیکل ہے' اسے حضرتِ سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ یہ وہی ہے جسے یہودیوں کا ٹیمپل کہتے ہیں لیکن فلسطین چونکہ یہودیوں کا شروع سے مسکن تھا' اس لیے یہ وہیں' یروشلم کو ہی' اپنا مرکز تسلیم کرتے تھے اور آخر میں انہوں نے اپنا ہیکل بھی وہیں تعمیر کیا۔ غیر بنی اسرائیل کو وہاں نہ جانے کی اجازت تھی' نہ اس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہوسکتا تھا۔ یہ ساری نوعِ انسان سے الگ ایک مخصوص نسل کا ایک مرکز رہا۔ اسلام کو تو اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوسکتا تھا۔ اسلام تو ان نسبتوں کو مٹانے کے لیے آیا تھا۔

برادرانِ عزیز! ابھی ابھی یہ بات چلی آرہی ہے کہ یہ نسبتیں جو اشخاص کی طرف ہیں یا نسل کی طرف ہیں یا قومیتوں کی طرف ہیں یا وطنیت کی طرف ہیں' کچھ نہیں ہیں۔ قرآن میں کہا ہے کہ یہ سب نسبتیں مٹانے کے لیے میں آیا ہوں۔ جو دین ان نسبتوں کو مٹانے کے لیے آیا ہو' وہ کسی ایک قوم کے مرکز کو' اپنا مرکز کیسے تسلیم کرلے' اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اس دین کا مرکز تو کعبہ ہی کو ہونا چاہیے تھا' جو انسانیت کے لیے بنایا گیا تھا۔

تاریخ اور روایات کا یہ بیان کہ نبی اکرم ﷺ نے تیرہ سال تک بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائے رکھا' صحیح نہیں ہے

یہاں ایک بڑی اہم چیز آتی ہے' اسے اچھی طرح سے سن رکھنا چاہیے۔ ہمارے ہاں تاریخ میں یہ چیز چلی آتی ہے اور روایات کی بنیادوں پر یہ چیز مشہور ہوئی ہے کہ نبی [1] اکرم ﷺ تیرہ سال مکے میں رہے' تو آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے

---

[1] یاد رہے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ نبویؐ کا پہلا دور' جسے مکی دور کہا جاتا ہے' جو تیرہ سال پر محیط ہے' یہ امتِ مسلمہ کے ابتدائی ہیولیٰ کی تشکیل کا دور تھا۔ تیرہ سالہ مکی دور کے بعد' آپؐ اور آپؐ کی جماعت نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور یہاں اسلام کا نظام قائم کیا۔ اس مملکت کا دارالخلافہ تو مدینہ ہی رہا لیکن اس نظام کا مرکز کعبہ ہی قرار پایا۔

تھے۔ جب مدینے میں آئے' تو شروع کے قریباً دو سال یا اٹھارہ ماہ' اسی طرح سے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور اس کے بعد ایک دن یہ حکم آیا کہ نہیں! کعبہ کی طرف رخ کرو۔ پھر اس کے متعلق روایات ہیں۔ جیسا کہ ہر روایت میں ہمارے ہاں اختلاف ہے' ان میں بھی ہے۔ بہر حال! جس پہ عام طور پہ اتفاق ہے وہ یہی ہے کہ آپ ﷺ ایک مسجد میں ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے' دو رکعتیں پڑھ چکے تھے' رخ بیت المقدس کی طرف تھا۔

برادران عزیز! آپ کے ذہن میں شاید یہ نقشہ نہ ہو' اگر ہم مکے میں ہوں تو پھر تو بیت المقدس ایک سمت اوپر کو آتا ہے۔ کعبہ اور بیت المقدس سیدھ میں پڑتے تھے اور مدینہ درمیان میں آجاتا ہے' مدینے میں بیت المقدس اور مکہ دو مخالف سمتوں میں پڑتے ہیں۔ مدینہ میں اگر رخ بیت المقدس کی طرف کرو تو منہ اُدھر ہوتا ہے۔ اور پشت (Back) کعبہ کی طرف۔ اور اگر مدینہ میں کعبے کی طرف رخ کرنا ہو' تو اُدھر بیت المقدس کی طرف پیٹھ (Back) ہو جائے گی' اور رخ اُدھر کعبہ کی طرف کرنا پڑے گا یعنی اس میں رخ کی تبدیلی یوں ہوگی' یہ کوئی ذرا سا یوں نہیں ہے' جیسا ہمارے ہاں' ہم نماز پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ قبلے کی طرف منہ ذرا سا یوں کر دیتے ہیں' تو سمت قبلہ ٹھیک ہو جاتی ہے۔ نہیں' یہاں ایسا نہیں ہے۔ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو کر جو نماز پڑھ رہا ہوگا' اگر اس نے کعبے کی طرف منہ کرنا ہے' تو اس کو ادھر بیت المقدس کو پیٹھ کرنا ہوگی اور اِدھر کعبہ کی طرف رخ کرنا پڑے گا۔ روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے' جماعت کے ساتھ دو رکعتیں پڑھ چکے تھے' تو یہ حکم آیا کہ رخ کعبے کی طرف کرنا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے رخ بدلا اور پھر ساری جماعت نے پیچھے سے رخ بدلا اور ادھر کعبہ کی طرف رخ کر کے باقی دو رکعتیں یوں پڑھیں [1]۔ وہاں اب تک ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے' اس کا نام مسجد قبلتین ہے یعنی دو قبلوں والی مسجد جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ وہ مسجد تھی جس میں یہ واقع پیش آیا۔ روایت میں یہی کہا گیا ہے کہ یہ وہ مسجد ہے جس میں یہ واقع ہوا تھا کہ پہلے دو رکعتوں کا قبلہ اِدھر بیت المقدس کی طرف تھا اور دوسری دو رکعتوں کا قبلہ ادھر کعبہ کی طرف ہو گیا۔

انسانیت کے مرکز کعبۃ اللہ کو نظر انداز کر کے قومی نسبت سے بیت المقدس کی طرف رُخ کرنا کیا توحید کی نفی نہیں تھی؟

عزیزانِ من! اسے آپ اپنے ذہن میں رکھیے کہ نبی اکرم ﷺ مکے میں پیدا ہوئے تھے' کعبہ وہاں موجود تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس

---

[1] رُخ بدلنے کا نقشہ اس طرح ذہن میں لائیے کہ اگر پہلے منہ' شمال کی طرف تھا تو اب منہ جنوب کی طرف کرنا پڑا۔ مقتدیوں نے اپنا رخ کھڑے کھڑے بدل لیا ہوگا لیکن ظاہر ہے کہ امام (حضورؐ) کو مسجد کا نصف چکر کاٹ کر' دوسری جانب' امامت کے لیے جانا پڑا ہوگا۔

زمانے میں کعبہ ان مشرکین کی تولیت میں تھا' توحید کا مرکز نہیں تھا لیکن یہ عربوں کا مرکز تھا' بنی اسماعیل علیہ السلام کا مرکز تھا' خدا کا گھر تھا' وہ کعبۃ اللہ تو یہی تھا۔ حضور ﷺ وہاں مبعوث ہوئے۔ یہاں عربوں کے ہاں یا مکے والوں کے ہاں تاریخ میں کوئی ایسی نظیر ہی نہیں ملتی کہ کسی عرب نے کبھی اپنا رخ بیت المقدس کی طرف کیا ہو۔ ان کے ہاں اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ عرب تو اس زمانے میں بھی ساری دنیا کو کعبے کی طرف آنے کی دعوت دیتے تھے۔ کعبہ اتنا زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہوا تھا کہ آپ کو اصحاب فیل کا واقعہ پتہ ہے کہ یمن کا جو عیسائی گورنر (ابرہہ) تھا' وہ ہاتھیوں کی فوج لے کر چڑھ آیا تھا کہ جب تک خانہ کعبہ کو گرایا نہیں جائے گا' ہمارے ہاں کا جو گرجا ہے وہ لوگوں کی نگاہوں میں جاذبِ توجہ نہیں بنے گا کیونکہ اس کے تعمیر کردہ معبد کے مرکز بننے کے راستے میں کعبہ حائل ہے۔ یعنی کعبے کی اہمیت' مرکزیت قبل از اسلام بھی اتنی تھی کہ وہ سارے عرب والوں کا مرکز تھا اور ان میں یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہ اپنے کعبے کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف توجہ کریں۔ پھر نبی اکرم ﷺ کو تو پہلے دن یہ بتا دیا گیا تھا کہ یہ ملتِ ابراہیمی علیہ السلام ہے جس پر تُو ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اس ملت کے موسس ہیں' وہ اس کعبے کے معمار ہیں۔ خدا نے اس گھر کو اپنے لیے بنایا تھا۔ بعد میں مشرکین نے اس ہیت کو بگاڑ دیا ہے۔ تمہیں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ تم یہاں پھر اس کو اپنی اصلی ہیت کے اوپر لاؤ' جس ہیت و مقصد کے لیے یہ بنا تھا۔ تیرہ سال تک وہاں آپ ﷺ پر قرآن آتا رہا' اس تیرہ سال کے عرصے کے اندر ملتِ ابراہیمی علیہ السلام کی' حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے تمام زندگی کے یہ مقاصد' منتہائے فرائض' جو انہوں نے کیے' جو ان کی غرض و غایت تھی' اس کے ابتدائی ہیولیٰ کی تشکیل ہوتی رہی۔ اب سوال یہ پہ ہے کہ اسلام کاہے کے لیے آیا؟ یہ سارا کچھ تو اس دور میں ہو رہا تھا۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ پہلی چیز تو ایک عرب ہونے کی حیثیت سے' نبی اکرم ﷺ کے نزدیک کعبے کی اہمیت تھی۔ بنی اسماعیل علیہ السلام میں ہونے کی حیثیت سے' قریش میں ہونے کی حیثیت سے' قریش میں بھی ہاشمی ہونے کی حیثیت سے' کعبے کو اتنی اہمیت حاصل تھی۔ پھر تیرہ برس تک ملتِ ابراہیمی علیہ السلام کا پیغامبر ہونے کی حیثیت' تقریباً ساٹھ فیصد تو نبوت کا حصہ یہاں آ جاتا ہے' کل تئیس سالہ ہی تو نبوت ہے' اس میں تیرہ سالہ مکے کے اندر رہے' تیرہ سال مکے کے اندر قرآن آتا رہا اور آپ ﷺ اس نظام کی تشکیل میں لگے رہے۔ کیا حضور ﷺ (معاذ اللہ) اس چیز سے بھی بے بہرہ رہے کہ ملتِ ابراہیمی علیہ السلام کا مرکز یہ کعبہ تھا اور آپ ﷺ بیت المقدس کو اس کا مرکز بنائے رہے؟ عرب کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ کعبہ کس نے بنایا؟ اور کب سے یہ مرکز چلا آ رہا ہے؟ کیا آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ وہاں نبی اکرم ﷺ کعبے کو چھوڑ کر بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہوں گے؟

اس قسم کے خود ساختہ افسانوں کو اور تصورات کو پیش کرنے کا مقصد اور طریقِ کار؟

برادرانِ عزیز! کیا آپ کو پتہ ہے کہ اس کے لیے کیا کہا جاتا ہے؟ سنیے! کہا یہ جاتا ہے (معاذ اللہ) کہ جی! مکے میں رہتے ہوئے

اس کی گنجائش تھی کہ انسان کعبے کی اس سمت پہ کھڑا ہو جائے کہ کعبہ بھی یوں رہے اور اسی رخ میں بیت المقدس بھی رہے، تو رسول اللہ ﷺ ایسے نماز پڑھ لیا کرتے تھے مگر دل میں یہ ہوتا تھا کہ کعبہ مرکز ہونا چاہیے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ جو بیت المقدس ہونا چاہیے وہ کاہے کے لیے تھا؟ حکمِ خداوندی تو کوئی آیا نہیں تھا لیکن بہرحال سوچیے، عزیزانِ من! کہ یہ لوگ دلائل کیا دیتے ہیں کہ وہ منہ بیت المقدس (یروشلم کی طرف) کر لیا کرتے تھے کہ کعبہ بھی بیچ میں آ جائے اور بیت المقدس بھی بیچ میں آ جائے۔ ''گاندھی جی بھی خوش رہیں، راضی رہے سرکار بھی''، قرآن کریم مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ حَنِيۡفًا (2:135) کہتا ہے کہ جس نے کہا ہے کہ ہر طرف سے اپنے رخ کو موڑ کر اس سمت کی طرف رخ کرنے والا ہے۔ اس ملت کا آخری کڑی والا تیرہ برس تک نبوت میں (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ کرتا رہے گا کہ کعبے کا رب بھی راضی رہے اور بیت المقدس والے بھی خوش رہیں اور یوں اپنی نماز کو پڑھتا رہے گا۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ یہودیوں کی سازش سے یہ روایتیں بنیں۔ یہودیوں نے آپ کے ہاں یہ بتا دیا کہ تمہارا نبی پندرہ برس تک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتا رہا۔ اس سے مرکزِ یہود کی اہمیت آپ دیکھ رہے ہیں کہ کتنی ہے؟ کعبہ میں پیدا ہوا، وہاں کا رہنے والا تمہارا نبی، پندرہ برس تک ہمارے قبلے کی طرف نماز پڑھتا رہا۔ وہ تو پھر مدینے میں آ کر سلطنت قائم کی، وہاں یہودیوں کے ساتھ جب مخالفت ہوئی، اس مخالفت کی بنا پر انتقاماً اس نے اس کو چھوڑ کر دوسرا کعبہ تجویز کر لیا، یہودی یہ کہتے ہیں اور اس کے لیے یہ روایات آپ کی کتابوں کے اندر داخل کر دی گئیں اور تیرہ سو برس سے آپ بھی مانتے چلے آ رہے ہیں کہ جی ہاں! سوچیے تو سہی صاحب! تیرہ برس تک، پندرہ برس تک، بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے۔ حکم آتا ہے تو ظہر کی نماز کی دو رکعتیں پڑھ جانے کے بعد، باقی دو رہتی ہیں تو اس وقت حکم آتا ہے وہاں رخ بدلا جاتا ہے۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔

خود ساختہ روایات کے تحت دنیا کے ''بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا'' کے عظیم تصور کی تردید

عزیزانِ من! کعبہ پہلے دن سے نبی اکرم ﷺ کے لیے کعبہ تھا۔ وہی خدا کا گھر تھا، وہی ملتِ ابراہیمی علیہ السلام کی پیروی کرنے والوں کے لیے توجہات کا مرکز تھا۔ اگر نماز کا رخ اُدھر ہے تو پہلے دن سے وہیں تھا۔ کیا کعبے میں پیدا ہونے والا، کعبے میں نماز پڑھنے والا، کعبے کو چھوڑ کر وہ بیت المقدس کی طرف رخ کرے گا؟ کیا یہودیوں کی خود ساختہ شریعت کا پہلے دن سے تردید کرنے والا، ان کی فرقہ بندی کو باطل قرار دینے والا، ان کو مشرک قرار دینے والا، ان کے ہیکل کی طرف رخ کر کے پندرہ سال تک نماز پڑھتا رہے گا؟ نہیں، قطعاً نہیں۔ اب آیئے اس طرف کہ جب پہلے یہ چیزیں بنا لی گئیں، اُدھر روایتوں کے اندر یہ کچھ درج کر دیا گیا تو صاف نظر آتا ہے کہ روایت کہاں سے آئی ہے۔ وہ تو میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ ان روایتوں میں ہمارے ہاں یہ یہود کا عنصر کتنا داخل ہے، کس طرح انہوں نے عجیب طریقوں اور حیلوں سے نبی اکرم ﷺ کو اپنے انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں گھٹیا درجے کے اوپر دکھایا ہے اور وہ ساری روایتیں، یہ سارا

کچھ آپ کی کتابوں میں موجود ہے۔ پہلے انہوں نے یہ تصور دیا۔ اب آیئے قرآن کریم کی طرف۔ مذہبی پیشوا تو بعد میں قرآن کی طرف آتے ہیں یہاں سے وہاں روایات کی طرف جاتے بلکہ اُدھر روایات سے اِدھر قرآنِ کریم کی طرف آتے ہیں۔

دوسرے پارے کی شروع کی آیات کا مروجہ ترجمہ اور تجزیہ

عزیزانِ من! اب دوسرا پارہ شروع ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ **سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا** (2:142)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ جو حقیقت کو نہیں جانتے' وہ یہودی یہ بھی اعتراض کریں گے۔ ان کے ہاں ترجمہ اس روایت کے ماتحت ''یہ یہودی'' کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہیں گے کہ جس قبلے پہ ہم ہیں' اس قبلے سے انہوں نے کیوں رخ موڑا۔ اور رخ موڑنے کی جو بات تھی' وہ یہ کہی کہ یہ بعد میں رخ موڑا۔ یہاں 'بعد میں' کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ یہودیوں کے ساتھ بات ہی مدینے میں آ کر ہو سکتی تھی۔ آپ کو یاد ہے کہ پہلے ان کا اعتراض آ چکا ہے کہ اگر یہ دین' دینِ خداوندی ہے' وہی دین ہے جو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو ملا تھا' تو پھر یہ کیوں ہے کہ ہماری شریعت میں بعض چیزیں حرام ہیں' انہوں نے آن کر ان کو حلال قرار دے دیا ہے؟ اگر یہ وہی ہے تو پھر یہ کیوں ہے؟

برادرانِ عزیز! یہ اعتراضات تھے کہ ان سے تو وہی کچھ کرنا اور کہنا چاہیے جو ہمارے ہاں ہے۔ کہا یہ گیا تھا کہ جو تمہارے ہاں یہ چیزیں ہیں' یہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی نہیں ہیں' وہ خدا کا دیا ہوا دین نہیں ہے' جو ان انبیائے کرام علیہم السلام پہ نازل ہوا تھا' یہ تمہارا خود ساختہ ہے' تم نے تحریف کی ہے۔ اسی طرح سے یہ جو تم نے اپنا قومی مرکز بنایا ہوا ہے' یہ خدا کا تجویز کردہ نہیں ہے۔ تمہارے سب کے مورثِ اعلیٰ بھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام تک کونسا مرکز بنایا ہوا تھا؟ تم خود مانتے ہو کہ کعبہ ہی تھا لیکن وہ تو تمہیں جو حضرتِ اسماعیل علیہ السلام سے ضد تھی' ان کی جگہ تم نے حضرت اسحاق علیہ السلام کو اپنا مورث قرار دیا اور پھر ان کی نسبت تم بنی اسرائیل کی طرف یہ ساری نبوت کو لے آئے۔ اس لیے تم انتقاماً کعبے سے دشمنی رکھتے تھے اور تم نے اس کے بعد اپنا مرکز یہ بنایا تھا ورنہ دینِ خداوندی کا مرکز تو پہلے دن سے کعبہ ہی تھا۔ اس لیے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دین کو لے آئے ہیں' جس دین کے اوپر ابراہیم علیہ السلام تھے' جو خدا نے دیا تھا' یہ پہلے دن سے ہی مرکز تھا' وہ کعبے کو مرکز رکھنا تھا' تمہارا مرکز یہ قبول نہیں کر سکتا تھا۔

انہوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ ہمارا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ جس مرکز بیت المقدس کو ہم نے اپنا مرکز تسلیم کیا ہوا تھا' اس دین کے لانے والے نے اس کو چھوڑ کر کعبے کو اپنا مرکز کیوں تجویز کر لیا تھا؟ یہ نہیں ہے کہ پندرہ برس تک اسے رکھا تھا اور آج اسے چھوڑ دیا ہے۔ پہلے ہی دن سے اعتراض یہ ہے کہ اگر تم یہ کہتے ہو کہ یہ وہی دین ہے' جو پہلے انبیائے کرام علیہ السلام کو دیا گیا اور جس پہ یہ سارے لوگ تھے تو

پہلے انبیائے کرام علیہم السلام کا جو مرکز تھا' وہ یہ مرکز بیت المقدس تھا' اس کو چھوڑ کر تم نے اس نئے دین میں یہ اختراع کیوں کی کہ کعبے کو اپنا مرکز بنا لیا؟ عزیزانِ من! پہلی چیز تو یہ یاد رکھیے! اس میں کَانُوْا عَلَیْهَا (2:142) آیا ہے۔ یہ کَانُوْا عَلَیْهَا (2:142) کا ترجمہ کرتے ہیں کہ جس قبلے کو' مسلمانوں نے' رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کی جماعت نے' اس سے پہلے قبلہ بنا رکھا تھا' اب اس کو کیوں چھوڑ دیا؟ یہ اس کا یہ ترجمہ کرتے ہیں۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جو ہمارا قبلہ ہے' جس قبلے پہ ہم ہیں' انہوں نے اس کو کیوں چھوڑ دیا' اور اپنا نیا قبلہ کیوں بنا لیا؟ یہ نہیں ہے کہ جس پر پندرہ برس تک یہ تھے' اس کو اب انہوں نے کیوں چھوڑ دیا؟ یہاں الفاظ کا ترجمہ غلط ہوتا ہے۔

آپ کے سامنے قرآنِ کریم ہے تو الفاظ دیکھیے یہ بڑی اہم چیز ہے۔ اس میں کَانُوْا عَلَیْهَا (2:142) کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ ان روایات کی بنا پہ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ جس قبلے کے اوپر اس سے پیشتر یہ مسلمان تھے انہوں نے اب اسے کیوں چھوڑ دیا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''یہ لوگ کہیں گے کہ جس قبلے پہ ہم ہیں' جو ہمارا قبلہ ہے' انہوں نے اس قبلے کو چھوڑ کر اسے اپنا قبلہ کیوں تجویز کیا ہے' ہمیں اس کا بھی جواب دو''۔ اب آپ نے بات سمجھ لی۔ یہ درمیان کی تبدیلی نہیں ہے' یہ پہلے دن کی تبدیلی کا ذکر آ رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس قبلے پہ ہم ہیں' انہوں نے اسے چھوڑا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جس پہ یہ پہلے تھے' اسے چھوڑ کر کعبہ کو اپنا قبلہ کیوں بنا لیا۔ یہ ترجمہ بالکل غلط ہے۔ یہ ہے کہ انہوں نے اسے قبلہ کیوں تجویز کر لیا۔ دو لفظوں میں اس کا جواب ہے۔

خدا تعالیٰ کے ہاں مشرق اور مغرب کی نسبتوں کی کوئی حقیقت نہیں

عزیزانِ من! یہ پہلے آ چکا ہے کہ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177) یاد رکھو! پہلی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک سمت کا تعلق ہے' یہ سوال ہی نہیں ہے کہ مشرق کی طرف رخ ہے یا مغرب کی طرف رخ ہے۔ قانون خداوندی کی رو سے وسعت و کشاد کی راہ مشرق یا مغرب کی طرف رخ کرنے میں نہیں ہے۔ وہاں تو قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (2:142) بتا دو کہ سارا مشرق اور مغرب خدا کے لیے ایک ہی ہے' وہاں خدا کے ہاں تو یہ تمیز ہی نہیں ہے۔ مشرق اور مغرب کی تمیز تو ہماری اضافی نسبتوں سے ہوتی ہے' جو ہم Space (مکاں) کے اندر گھرے ہوئے ہیں' جو Space (مکاں) سے بلند ہونے والا ہے' اس کے لیے تو مشرق اور مغرب کوئی شے ہی نہیں رہتی۔ خدا تو زمان و مکان کی نسبتوں سے بلند ہے۔ ہمارے ہاں کے یہ امریکا والے جو خلا باز گئے ہیں' جب یہ یہاں سے اونچے ہوئے ہیں' تو وہاں جا کر ان کے لیے مشرق اور مغرب کی نسبت ختم ہو گئی تھی۔ ذرا اونچا ہو جائیے تو نسبت ختم ہوتی ہے۔ قرآن نے جہاز میں بیٹھ کر اونچے ہونے کے لیے نہیں کہا' بلکہ اس نے نگاہوں کو ذرا بلند کرنے کے لیے کہا کہ یاد رکھو! مشرق و مغرب کی نسبت شے کچھ نہیں رہتی۔ وہ تو یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (2:142) یہ اپنی مشیت کے مطابق اس ملت (جماعت

مومنین) کی راہ نمائی انسانیت کی صحیح راہ کی طرف کر دیتا ہے۔ وہ جس کو یہ قانون دیتا ہے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ بیت المقدس بنی اسرائیل کا قومی مرکز ہے اور اسلام' تمام نوع انسان کو' ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ اس عالمگیر دعوت کا مرکز وہی ہونا چاہیے جو ہر مشرق و مغرب کو محیط ہو' وہ کسی خاص نسل یا قوم کا منتہائے نگاہ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے یہ قبلہ کیوں بیت المقدس کی جگہ تجویز کیا تھا۔

صراطِ مستقیم کی بنا پر عالمگیر انسانیت کے لیے کعبہ کو بیت اللہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے

یہ صِـرَاطٍ مُّسۡتَـقِیۡمٍ ہے اور یہی ہونا چاہیے۔ قومی اور نسلی نسبتوں سے بلند عالمگیر انسانیت کے لیے ایک کعبہ جس کو بیتی یا بیت اللہ کہا جائے گا' یہ ہے صراطِ مستقیم اور یہ ہم نے یہ اس لیے کیا۔ اب دیکھیے جناب! یہ کتاب ہے' یہ حکمت ہے۔ اسے یہ کتاب و حکمت کیوں کیا ہے؟ اس لیے کہ تم تو نسل کے اندر گھر کر' ایک Particular (خاص) قوم' گروہ بن چکے ہوئے ہو اور یہ جواب ہم نے امت تیار کی ہے' یہ امتِ وسطیٰ ہے' عالمگیر انسانیت میں سے ہر ایک سے یکساں فاصلے پر ہے۔

قوم مسلم کو تو عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کا تصور عطا کیا گیا ہے

اس امت کی کیفیت یہ ہے کہ وَ کَـذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (2:143) ہم نے یہ وہ قوم پیدا کی ہے جو پوری عالمگیر انسانیت میں سے ہر ایک سے یکساں فاصلے کے اوپر رہنے والی قوم ہو۔ تم ایک گروہ ہو۔ یہ عالمگیر انسانیت سے برابر رہنے والی ایک قوم ہم نے بنائی جس کو ہم نے بین الملی' بین الاقوامی حیثیت دی تھی۔ اس کے لیے کسی ایک قوم کے قبلے کو قبلہ تجویز کر لینا ہو ہی نہیں سکتا تھا اور نہ یہ بھی قومی بن کر رہ جاتی۔ یہ قومی نہیں ہے' یہ عالمگیر انسانیت کے لیے ہم نے قوم بنائی ہے لِّتَـکُوۡنُـوۡا شُھَـدَآءَ عَـلَی النَّاسِ (2:143) تا کہ وہ پوری عالمگیر انسانیت کے اعمال کی نگرانی کر سکے۔ کہا کہ پھر بہر حال اگر یہ صورت تھی تو پھر اس نسبت کی کیوں ضرورت تھی؟ ایک رسول' ایک دین اور اس کے لیے ایک مرکز محسوس کیوں درکار تھا؟ کہا کہ وہ اس لیے تھا کہ وَیَـکُوۡنَ الـرَّسُـوۡلُ عَـلَیۡـکُمۡ شَھِیۡدًا (2:143) ان کے اوپر بھی تو نگران ہونا چاہیے۔ یہ خدا کا دیا ہوا جو نظام اس کے رسول ﷺ کے مقدس ہاتھوں سے متشکل ہوا' وہ ان کی نگرانی کرے گا اور یہ پوری نوعِ انسانی کے اعمال کی نگرانی کریں گے۔ اس لیے ان کا یہ جو اپنا مرکز ہے' یہ مرکز امت کا ہوا' جو اس حج کی کنو یز ہے۔ عالمگیر انسانیت کے لیے یہ مرکز بنایا گیا۔ اس لیے یہود کا قومی مرکز' ان کا مرکز ہو نہیں سکتا تھا۔

صلوٰۃ کا لفظ تو ایک پورے نظام کے اتباع کا مفہوم اپنے اندر لیے ہوئے ہے

برادرانِ عزیز! یہاں سے ایک بات سامنے آئی۔ اور وہ بات ہے جو پچھلی دفعہ بھی میں نے کہا تھا' آج اس کی توضیح کرتا ہوں۔ میں

نے عرض کیا تھا کہ پہلے صلوٰۃ کے متعلق لیجیے کہ وہ ایک نظام ہے جس میں تمام افراد خدا کے اتباع میں اس کے پیچھے پیچھے چلے جاتے ہیں اس کے قوانین کی اطاعت کیے جاتے ہیں۔سوال یہ پیدا ہوا کہ اس کے بعد یہ جو ایک محسوس شکل ہمارے سامنے ہے جسے نماز کہا جاتا ہے پھر یہ کیا ہے؟ میں نے یہ کہا تھا کہ جو کعبہ ہے وہ اس نظامِ خداوندی کا ایک Symbol (علامت) ہے جیسے تخت مملکت کا Symbol (علامت) ہوتا ہے جھنڈا مملکت کا ایک نشان ہوتا ہے۔کعبے کی یہ کیفیت ہے جس طرح سے دارالسلطنت ہوتا ہے۔وہ ایک شعار ہوتا ہے ایک Symbol (علامت) ہوتا ہے ایک نشان ہوتا ہے۔یہ نشان اور شعار اور سمبل فی ذاتہ تو اپنی کوئی قیمت نہیں رکھتے لیکن اس مملکت اس سلطنت اس حکومت کے احترام کے لیے یہ ایک محسوس Symbol (علامت) ضرور ہوتی ہیں۔یہ ایک بڑا اہم نکتہ ہے۔ یہ جتنی چیزیں Abstract Truth (غیر محسوس صداقتیں) کہلاتی ہیں مثلاً نظام آئیڈیالوجی ایمانیات نظریات معتقدات تصورات تخیلات یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو دیکھی نہیں جاسکتیں۔انہیں Imperceptible Truth (غیر محسوس صداقتیں) کہتے ہیں لیکن انسان تو محسوس کا خوگر ہے۔یہ جتنی غیر محسوس چیزیں ہیں اس کی ایک فارم دی جاتی ہے۔یہ جو فارم ہوتی ہے یہ حقیقت میں ان چیزوں کی Functionary (فعلیت) ہوتی ہے جسے آپ آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔فارم کے بغیر یہ جو Formless (بلا فارم) چیزیں ہیں وہ ذہن میں نہیں آسکتیں۔جب آپ Flag (جھنڈا) کہتے ہیں وہ اصل میں ایک لکڑی ہے اور اس پہ ایک کپڑا ہے اس لکڑی کے ساتھ کپڑا کے معنی نہیں ہوتے۔اسی طرح تخت نشینی جسے کہتے ہیں تو وہ کسی تخت پوش کا نام نہیں ہوتا۔جب وہ تاج کہتے ہیں تو وہ Exactly (ہو بہو) کسی Crown (تاج) کا نام نہیں ہوتا وہ اتھارٹی کا نام ہوتا ہے وہ قوت کا نام ہوتا ہے وہ شوکت کا نام ہوتا ہے لیکن عوام کی نگاہوں میں اس چیز کو لانے کے لیے ایک فارم دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔فارم کے بغیر Indeologies Function (نظریاتِ حیات کام) نہیں کرسکتیں۔اس کو یاد رکھیے گا! اس کی ایک Functional Position (فعلی حیثیت) ہوتی ہے لہٰذا یہ جو آپ کے ہاں چیزیں ہیں مثلاً صلوٰۃ وہ درحقیقت قوانینِ خداوندی کا اتباع تھا۔اس کو جب ایک فارم کی (شکل) دی ہے تو وہ ہے جس میں جھکنا ہے رکوع ہے سجدہ ہے اس کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ یہ ایک فارم ہے۔ پھر سن رکھیے کہ فارم بجائے خویش ذاتی Value (قدر و منزلت) نہیں رکھتی لیکن فارم کے بغیر اس آئیڈیالوجی کے اوپر عمل بھی نہیں ہوسکتا۔یہ اس کی اہمیت ہے یہ اس کی ضرورت ہے۔اگر آپ نے فارم کو مقصود بالذات سمجھ لیا مملکت سے بغاوت کرتے رہے مگر جھنڈے کو سلام کرتے رہے بادشاہ کو قتل کردیا مگر اس کا تخت سر پہ اٹھالیا کہ جی! ہم تو اس کا اتنا احترام کررہے ہیں تو وہ اس کی غیر اہمیت کی چیز ہے۔آپ اسے لیے پھر رہے ہیں مقصد و غایت حاصل نہیں۔

نماز کا فلسفہ اور اہمیت

آپ دیکھتے ہیں یہ فارم اور فعل (بصورت نظام) دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں یعنی غیر محسوس آئیڈیالوجی، نظریئے کے اوپر ایمان ہو اور اس ایمان کا مظاہرہ ایک فارم کے اندر ہو۔ اگر اس کی حیثیت صرف فارم کی ہو، اس نظریہ یعنی نظام پر ایمان نہ ہو، تو اس کے مقصد و غایت حاصل نہیں ہو سکتے۔ اب اس فارم کو اہمیت تو اتنی ہے اور ہماری قوم کی یہ حالت ہے، اگر اسے بیان کروں تو کوئی دوسری جگہ کہیں ذہن میں نہیں آ سکتی۔ اب اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ صاحب! اس نماز کا فلسفہ بیان کیجیے۔ ٹھیک ہے، باتیں کرنے کو تو ہر ایک بات بیان کر سکتا ہے کہ ایک کیفیت ہوتی ہے، وجدانی چیز ہوتی ہے۔ معاذ اللہ میں کوئی Compare (مقابلہ وموازنہ) نہیں کر رہا۔ کبھی گرجے میں جا کر دیکھیے کہ انہوں نے وہاں کیا فضا پیدا کی ہوئی ہوتی ہے۔ خود بخود انسان کا قلب جھکتا ہے صاحب! وہاں اس قدر ایک کیفیت پیدا ہوئی ہوتی ہے، مگر وہاں اس کا کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ صرف ایک فضا ہے جو قائم کی ہوئی ہے۔ فلسفہ تو آپ کے اس نظام کو دینا چاہیے، جس کی ایک محسوس فارم، شکل، شعار کی صورت میں یہ صلوٰۃ ہے۔ اسی فلسفے سے تو اس کی اہمیت ہے کہ وہ فلسفہ ہو اور اس پر قائم رہنے کے لیے وہ فارم ہو، جس سے اس کے مقاصد حاصل ہو سکیں۔

فحاشی کے مرکز میں جھنڈے کے احترام کی ایک مثال

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں، اب میں اگر مثال بھی دینا چاہوں، تو سمجھ میں نہیں آتا، مجھے یہی آپ کے ہاں جھنڈے کی مثال دینی پڑی، National Anthem (قومی ترانے) کی مثال دینا پڑی کہ آج بھی آپ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اگر سینما ہال میں بھی آپ گئے ہیں، فحاشی کا مرکز بھی ہے، اگر اس کے بعد آپ کا جب جھنڈا سامنے آتا ہے، آپ کو وہاں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ جو کھڑا نہیں ہوتا، اس کے خلاف مقدمہ کیوں چل جاتا ہے؟ اس نے کیا جرم کیا؟ وہ یہ نہیں ہے کہ وہاں ایک سکرین کے اوپر ایک تصویر آئی تھی، اس نے اس تصویر کو نہیں دیکھا، وہ جھنڈے کی تصویر تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں مملکتِ پاکستان کا احترام نہیں رہا۔ اتنی سی مثال دے سکتا ہوں لیکن یہ بھی کوئی محسوس بات نہیں ہے۔ مثال آج بھی ہمارے ہاں ملتی ہے تو ملٹری میں جا کر ملتی ہے۔ وہاں انہوں نے اس نظم کو قائم رکھا ہوا ہے۔ وہاں انہوں نے سپاہی کے لیے مقرر کیا ہوا ہے کہ تمہارے بوٹ کے تسمے اس طرح سے ملے ہوئے ہونے چاہئیں، ایسے بندھے ہوئے ہونے چاہئیں۔ صبح ان کا انچارج ان کے اوپر نگاہ دوڑاتا ہے، یَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا جسے کہا گیا ہے، تو وہ نگران یہی نہیں دیکھتا ہے کہ اس کو باقی تمام قواعد وضوابط ازبر ہیں یا نہیں، وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس کے بوٹ کے تسمے صحیح طرح سے بندھے ہوئے ہیں یا نہیں۔ بوٹ کے تسموں کو فوج کے مقصد سے کچھ نسبت نہیں ہوتی، یہ ڈسپلن کا ایک محسوس نشان ہے۔ عزیزانِ من!

اس سے ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔

آپ کبھی فوج کے قدم اٹھتے ہوئے دیکھیے۔ ان قدموں کے اٹھنے میں ایک یونٹ ہوتا ہے' ان میں ایک Harmony (آہنگ) ہوتی ہے' ایک ہم آہنگی ہوتی ہے۔ وہ ہم آہنگی اصل میں ان کے قدموں کی نہیں ہوتی' وہ ان کے مقصد کی ہم آہنگی ہوتی ہے' ان کے ٹارگٹ کی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ جس طرف وہ رخ کر کے جا رہے ہوتے ہیں' فوج کا سپاہی اپنی آنکھ کو بھی ہمیشہ یوں ادھر نہیں کر سکتا تاوقتیکہ اس کو حکم نہیں ملتا۔ آپ کو پتہ ہے ان کو چلتے چلتے ایک حکم ملا کرتا ہے: 'سیلوٹ کر' صرف اس کی نگاہ یوں ہوا کرتی ہے۔ اس کے بغیر تو سپاہی اپنی نگاہ کو بھی دوسری طرف نہیں کر سکتا۔ یہ ہے حنیفا کی کیفیت۔ یہ ہے فارم کی اہمیت لیکن اگر ایک سپاہی فوج سے برخاست ہو کر گاؤں میں آ جائے اور صبح ہی صبح وہ اٹھے' جیسے بگل بجتا تھا' اس وقت اٹھے اور اپنی ساری وردی اسی طرح کس کسا کر وہی اپنے تسمے باندھے' وہی بٹن لگائے' وہی اپنا ڈنڈا یہاں رکھے اور گاؤں کی گلی میں لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ کرتا پھرے' سارا گاؤں مذاق کرے گا کہ یہ کر کیا رہا ہے۔ وہ چیز کہ جس میں ذرا سے تفاوت نے' اس پلٹن کے میدان میں' اس کو سزا دے دی تھی' اس کو جیل میں بھیج دیا تھا' وہ پوری فارم سر سے پاؤں تک درست ہے' لیفٹ رائٹ کر رہا ہے مگر اب گاؤں مذاق کر رہا ہے۔ کیا ہوا؟ یہ کہ فارم باقی رہ گئی' اس میں سے نظام نکل گیا۔ نظام ختم ہوا' فارم باقی رہ گئی۔ وہاں نظام کے اندر رہتے ہوئے فارم میں ذرا سی اِدھر اُدھر کی جو تبدیلی ہے' اس نے سزا کا مستوجب بنا دیا' وہ سپاہی' بخشا ہی نہیں جا سکتا۔ معاف نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ساری فارم' سر سے پاؤں تک ہے' بیچ میں نظام نہیں ہے۔ یہ مذاق بن کر رہ گیا ہے۔

وارکعوا مع الراکعین کا قرآنی اور عملی مفہوم

یہ ہے اس ڈسپلن کا مظاہرہ جو نماز میں آپ کے ہاں ہوتا ہے۔ یہ صفیں سیدھی ہیں' یہاں سے وہاں تک ایک لائن کے اندر کھڑے ہیں۔ اپنے سے منتخب کردہ ایک شخص ہے جسے کہا ہے کہ یہ Lead up (امامت) کرتا ہے۔ دیکھتے ہیں امام کیا ہوتا ہے؟ وہ جو اپنے سے منتخب کردہ ہے۔ یہ جو آپ کے ہاں کا پیشہ ور امام تنخواہ والا ہوتا ہے' اس کا قرآن کے اندر تصور ہی نہیں ہے۔ اسے اپنے سے منتخب کردہ سب سے بہتر ہونا ہے۔ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (49:13)۔ آپ دیکھیے کہ یہ پورے نظام کی فارم آ رہی ہے۔ یہ آج بھی کس طرح سے پوری آ رہی ہے۔ صفیں سیدھی ہیں' انتشار نہیں ہے۔ پہلے انفرادی سے' اجتماعیت اس کے اندر ایک مقام پہ قائم ہوگی۔ یہ جو ہم اپنے اپنے ہاں یہاں نماز پڑھ لیتے ہیں' یہ مذہب کی پوجا پاٹ ہے' دین کی صلوٰۃ نہیں ہے۔ دین کی صلوٰۃ انفرادی ہو ہی نہیں سکتی۔ ایک سپاہی کی انفرادی صلوٰۃ کی پریڈ کیا ہے۔ کہو تو وہ وہاں صبح کو اٹھ کر اکیلا جا کر پریڈ کرے' اس سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس امام کو

دیکھیے ایک اپنے میں سے لیڈ کرنے والا ہو اور اس سے کہا جائے کہ اس کے بعد ہم اقرار کرتے ہیں کہ جو کچھ تو کہے گا' ہم کرتے جائیں گے۔ پہلی آواز اس نے دی' انہوں نے بھی یہ کیا جو وہ کر رہا ہے۔ یہ کھڑے ہو گئے۔ اس نے آواز دی جھک گئے۔ آواز دی' سجدے میں گر گئے۔ آواز دی' اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب ایک وقت میں فوج کے سپاہی کی طرح کر رہے ہیں۔ وہ صحیح نظام ہوتا ہے' جو وہاں پلٹن کا ہے' سارا جہاں نظر آ رہا ہوتا ہے حتیٰ کہ اگر اس سے کسی وقت کوئی اجتہادی غلطی ہو گئی تو پھر بھی ان کو اجازت نہیں ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت اس کو سجدہ نہیں کرنا چاہیے تھا' کھڑا ہونا چاہیے تھا۔ اگر وہ کھڑا ہو گیا ہے' ان کو اجازت نہیں ہے کہ یہ سمجھ کر کہ صاحب! یہ غلطی کر گیا ہے' ہم کیوں غلطی کریں' وہ سجدہ کرے یہ کھڑے ہو جائیں۔ کہا کہ نہیں! تم اس وقت وہی کرو جو وہ کر رہا ہے اور جب اس کو اپنی اجتماعی غلطی کا احساس ہوا تو اس کا خمیازہ وہی نہیں بھگت رہا' ساری جماعت کو وہ سارا کچھ کرنا پڑتا ہے' جو اس کو اس وقت کرنا ہوتا ہے۔ یہ فارم تھی اور اس کے اندر کہا کیا جا رہا تھا؟ یہ کہ اس کے سامنے جھکنا ہے' کسی اور کے سامنے نہیں۔ کھڑے ہوئے ہیں' اپنے میں سے آگے کیا ہوا اعلان کر رہے ہیں کہ تو بڑا نہیں ہو گیا بلکہ اللہ اکبر ہے ''وڈا او ہوا ای ہے یادرکھ [1]'' وہ جو بڑا بنا ہے پہلے وہ کہتا ہے کہ میں بڑا نہیں۔ یہ اللہ اکبر ہے' جنہوں نے بنایا ہے' یہ کہتے ہیں کہ تو بڑا نہیں ہے' یہ اللہ اکبر ہے۔ اور پھر اس کو اتنا بڑھاتے چلے جاتے ہیں کہ کہیں شائبہ تک ذہن میں نہ آ پڑے کہ صاحب! کچھ بڑے ہو گئے۔ بڑا تو ہے۔ جھکنا صرف تیرے سامنے ہے۔ یہ ہے اس نماز کی فارم کی اہمیت۔

کسی نظام یا فارم کی حقیقت سے پیدا ہونے والے تمام تر نتائج ایک آئیڈیالوجی کے رہینِ منت ہوتے ہیں

تیرے سامنے جھکنا ہے۔ یہ فارم ہے۔ تیرے قوانین کے سامنے جھکنا' یہ ایک نظام ہے۔ اس کے بعد یہ ایک مقام کی چیز تھی۔ ساری دنیا میں یہ امت پھیلی ہوئی تھی۔ نگاہ کا رخ کسی ایک طرف ہو اور یہ عالمگیر نظام ہی یہ کر سکتا تھا۔ اب اس کے لیے کیا چیز کی جائے؟ رخ تو آپ کے ہاں' اپنے زاویہ نگاہوں کا ہے' تصور کا ہے' نظریئے کا ہے' عقیدے کا ہے' آئیڈیالوجی کا ہے لیکن ایک محسوس فارم اس کو دے دی جسے کعبہ کہتے ہیں۔ ہماری ساری جو توجہات ہیں' ایک محسوس فارم کے اوپر مرکوز ہو گئیں۔ جسے کعبہ کہا جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب یہ کمیونسٹ اس کو کہتے ہیں تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ یہ Not A Paricular City' یہ ایک شہر کا نام نہیں ہوتا' اس آئیڈیالوجی کا نام ہوتا ہے جہاں جہاں بھی کوئی کمیونسٹ بستا ہے' آپ دیکھیں گے کہ اس کی نگاہ کا رشتہ ماسکو کے ساتھ بندھا ہوا ہوتا ہے۔ یاد رکھیے! یہ نگاہ کا رشتہ ہے۔ یہ نگاہ کا رشتہ بندھنا ہے' اس سے ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے' تمام ان افراد کے اندر جو اس آئیڈیالوجی میں Believe (یقین) کرتے ہیں۔ للہ المشرق والمغرب' وہ East (مشرق) ہو یا West (مغرب) میں ہو' افریقہ کے اندر ہو یا امریکا

---

[1] یادرکھ! بڑا وہی اللہ ہے۔

کے اندر رہو۔ یہ کیا باتیں ہیں! بس اب تو

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی

قرآن حکیم کی طرف سے ایک ایسا سدا بہار محکم نظام ہے کہ جس پر کبھی خزاں نہ آئے

برادرانِ عزیز! قرآن کا نظام کتنا عجیب نظام تھا۔ اس نظام میں ہر فرد، ہر وقت ذہن میں رکھنے والا ہے کہ تمہارا مرکز، تمہاری نگاہ کا رشتہ اس مرکز کے ساتھ وابستہ ہونا ہے جو تمہارے اس نظام کا مرکز ہے، تم دنیا میں کہیں بھی کیوں نہ ہو، جونہی وہ وقت آیا، ایک کال آئی اور آپ نے کہا کہ اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ(6:80) میں نے اپنی تمام توجہات کا رخ ایک مرکز کی طرف موڑ لیا جو خدا ہے، جو اس تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے اور جس کا قانون یہاں اس طرح نافذ العمل ہے کہ اس سے نہ ستاروں کو مفر، نہ چاند اور سورج کو مجال سرتابی، اس لیے میں اس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ میرا دوٹوک فیصلہ ہے۔ یہ تو دل کے اندر عقیدہ بیدار ہوا ہے۔ یہ اس کی محسوس شکل ہے، جو آپ کے ہاں کی ہے۔ جونہی وہ کال (Call) آئی آپ نے، ساری دنیا کے ایسا ماننے والوں نے، فوراً ایک طرف اپنا رخ کر لیا۔ قبلہ کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو ہر وقت پیشِ نظر رہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر وقت مقصد ہی پیشِ نظر رکھنا چاہیے لیکن وہ غیر محسوس ہوتا ہے۔ اس کے لیے اگر ایک فارم دے دی جائے تو آسانی سے توجہ ایک طرف ہو جاتی ہے۔ محبوب کا گھر تو آپ کے ذہن میں آ سکتا ہے، کعبہ تو آج ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا، دوست جہاں رہتا ہے وہ تو ذہن میں آتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دل میں دوست کا تصور آتا ہے تو اس کے گھر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ قبلہ کہتے ہی ہر اس شے کو ہیں جو ہر وقت پیشِ نظر رہے۔ مقصد تو وہ تھا، فارم اس کو اس طرح سے دی کہ وہ جو پہلا گھر تھا جس کی طرف کسی انسان کی نسبت نہیں تھی، صرف خدا کی نسبت تھی، اس کو محسوس مرکز بنا دیا۔ کہا ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی تم بستے ہو اپنا رخ اسی طرف کرو۔ اب دیکھیے کہ قرآن کا حکم یہ ہے کہ تم دنیا میں جہاں کہیں بھی ہو وَ حَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَہٗ (2:144) تم دنیا میں کہیں بھی ہو، دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہو، زندگی کے کسی بھی شعبہ میں مصروفِ تگ و تاز ہو، اپنی توجہات اسی رخ کو کرو۔

ملت اسلامیہ کی عظمت کا راز عملی طور پر اپنا رخ کعبہ کی طرف کرنے میں ہی ہے

یہ ہے وہ حیثیت جو سپاہی کے لیے وردی کی حیثیت میں نے کہی، فارم کی حیثیت میں نے کہی۔ جہاں بھی فارم کو ہم نے مقصود بالذات سمجھنا چاہا تو فوراً کہہ دیا کہ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ(2:177) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم

نے اپنا رخ قبلے کی طرف کرلیا۔مشرق کی طرف کرلیا یا مغرب کی طرف۔عزیزانِ من! یہ قرآن عجیب ہے۔اب ہمارے ہاں وہ کہتے ہیں کہ تیری نماز ہوگئی۔تو اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ منہ طرف قبلے شریف کے ہو۔اب اسی چیز پہ انسان چلا ہوا ہے۔قبلے کا رخ ہے۔ سب سے پہلے آپ کو جو یہ مملکت ملی ہے' تو اس کو مسلمان کرنے کے لیے یہاں پہلا کام یہ ہوا تھا کہ ریلوے اسٹیشنوں کے اوپر قبلے کی طرف رخ کرنے والے تیر لگائے گئے تھے۔''ادھی مسلمان تے ہوگئی اوس دن ای[1]'' ٹھیک ہے میں نے کہا ہے کہ فارم کی بھی نہایت ضرورت تھی۔ہمارے ہاں بحثیں چلی ہوئی ہیں کہ ریل گاڑی میں سفر کیجیے تو قبلے کا تعین کیسے ہو؟ ہوائی جہاز میں سفر کیجیے تو یہ تعین کیسے ہو؟ اور اب آگے یہ آئے گا کہ جب یہ خلا میں اوپر پہنچیں'' تے فیر کتھے نوں رخ کرن کیونکہ کعبہ تے زمین تے ہونا اے نا[2]۔'' یعنی فارم کو مقصود بالذات سمجھ لینے سے مسائل ہی یہ رہ گئے اور ہزار برس میں کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس مرکز سے مقصد یہ تھا کہ ساری دنیا کی امتِ مسلمہ' ایک امت کی حیثیت سے جیے اور ان کا ایک مقصودِ نگاہ ہو' ایک مرکزِ محسوس ہو' کسی نگاہ میں یہ بات نہیں آئی۔آپ کی ساری اہمیت اور توجہات' فارم کے اوپر سمٹ کر رہ گئیں' حقیقت دل سے نکل گئی۔برادرانِ عزیز! حقیقت یہ تھی کہ دنیا میں جہاں جی چاہے چلو پھرو' پھر اقبالؒ (1877-1938ء) یاد آگیا۔کیا کہا گیا ہے وہ کہ اس امت کی کیفیت یہ ہے کہ

پرد در وستِ گردوں یگانہ

فضا کی ان پہنائیوں کے اندر یہ جو امت ہے' یہ Unique (یگانہ و یکتا) حیثیت سے اڑتی چلی جاتی ہے' وہاں اس اڑان میں بھی یہ کسی دوسرے کے ساتھ نہیں جاتی ہے' جہاں جی چاہے وہاں سمتوں کا تعین کچھ نہیں ہوتا اس اڑان کو پرندے کی زندگی سے تشبیہ دے کر کہا ہے کہ وہ فضا کی پہنائیوں میں دن بھر اڑتا رہتا ہے لیکن

نگاہِ اُو بشاخِ آشیانہ

اپنے آشیاں کو ہمیشہ نگاہ میں رکھتا ہے اور شام کے وقت سفر سے فارغ ہونے کے بعد' پھر اپنے نشیمن کی طرف جاتا ہے' اسی طرح یہ امت جہاں جی چاہے' اڑتی ہوئی چلی جائے' اس کا فریضہ حیات شہد کی مکھی کی طرح یہ ہے کہ ہر وقت نگاہ کا رشتہ آشیانے کے ساتھ بندھا رہے۔

آج کا مسلمان تو کعبہ کے اندر پہنچ کر بھی فرقہ پرستی کے بُت کو علیحدہ نہیں کرتا

برادرانِ عزیز! یہ تھی اس مرکزِ محسوس کی اہمیت' آج آپ کو پتہ ہے کہ اس کعبے کی کیا کیفیت ہے۔کعبے کے اندر پہنچ کر بھی آپ کی فرقہ پرستیاں باقی رہتی ہیں' جاتی نہیں ہیں۔فارم دینے والے نے تو وہاں اتنا کہا کہ جیسے سپاہی کی وردی کا رنگ ایک ہوتا ہے' وہاں انہوں

---

[1] آدھی آبادی تو اسی دن مسلمان ہوگئی۔

[2] تو پھر کس سمت اپنا رخ کریں کیونکہ کعبہ تو زمین پر ہوگا۔

نے کہا کہ لباس کی ساری نسبتیں بھی ترک کردو' سب ایک بن سلی چادر میں آ جاؤ۔ فارم کی کتنی بڑی چیز تھی۔ اب وہ فارم ہی رہ گئی کہ وہ وہاں کا احرام کا ہونا چاہیے۔ اب کوئی اسے زم زم کے پانی میں ڈبو رہا ہے اور وہ دیکھو! جو دو آپس میں کھڑے ہوئے ہیں وہ یہی کام کر رہے اور ان میں گروہ بندیاں بھی ہیں۔ قرآن نے بتایا تھا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ جمعیت کسے کہتے ہیں اور بھیڑ کسے کہتے ہیں۔ ان کے لیے کہا ہے مگر **فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ** (3:103) ہم نے تمہارے دل جوڑ دیئے۔ کہا کہ ایک یہ دیکھو کہ یہود کھڑے ہیں قرآن بتاتا ہے کہ **تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى** (59:14) دیکھنے کو دیکھو گے تو کروڑوں کی بھیڑ ہے' ایک کا دل دوسرے سے ملتا نہیں۔

برادرانِ عزیز! اب یہ ہے کعبے میں پہنچ کر آپ کی کیفیت۔ جب مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں' فارم مقصود بالذات بن جاتی ہے تو دین مذہب کی سطح پہ آ جاتا ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ پوری وردی پہن کر ٹھیک انداز سے رائٹ لیفٹ کر کے گاؤں کی گلی میں پریڈ کرنے والا سپاہی' کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔ یہ اپنی Satisfaction (طمانیت) ہے جو وہ صبح اٹھ کر کر لے۔ وہ تو اپنے آپ کو لیفٹیننٹ جنرل سمجھتا ہو' کمانڈنگ آفیسر سمجھ رہا ہے' سمجھتا رہے' وہاں اس کو کوئی نہیں پوچھتا لیکن عزیزانِ من! بات مقصد کی تھی' یہ بڑا ضروری تھا کہ پچھلی دفعہ کے اس کہنے سے یہ ذہن میں نہ آ جائے کہ یہ جو محسوسات کی چیزیں ہیں' ان کی اہمیت نہیں ہے۔ نظام کے اندر چھوٹی سے چھوٹی جزئی محسوس شکل بھی اپنا مقام' اپنی حیثیت' اپنی پوزیشن' اپنا مقصد رکھتی ہے۔ اگر نظام باقی نہ رہے' تو فارم کا جو پورے کا پورا تمسک بھی ہے' وہ بے نتیجہ اور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ وہ فرق ہے جو اس ❶ نے کہا تھا کہ

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

(بالِ جبریل)

الفاظ و معنی تو وہی رکھے ہیں' نمازیں تو وہی ہیں مگر
صفیں کج' دل پریشاں' سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

(بالِ جبریل)

وہ آئیڈلوجی کا ایمان باقی نہیں' نظام باقی نہیں' وہ روح باقی نہیں ❷۔

---

❶ یہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف اشارہ ہے۔

❷ رگوں میں وہ لہو باقی نہیں　　وہ دل' وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج　　یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے　　(بالِ جبریل)

یہ تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں تعمیر ہونے والے قبلے اور یروشلم کے قبلے میں بنیادی فرق

عزیزانِ من! یہ تھا قبلے کا تعین' اور یہ ہے کہ اس کعبے کو ہمارا قبلہ کیوں بنایا گیا تھا اور یہ تھا وہ مقصد کہ وہ جو یہودیوں کا یروشلم کا' بیت المقدس کا قبلہ تھا' وہ ان کا قبلہ کیوں نہیں بن سکتا تھا اور یہ تھی وہ چیز کہ پہلے ہی دن سے جو پیغام رسول اللہ ﷺ نے اس نظامِ خداوندی کا' عالمگیر انسانیت کا دیا ہے تو اسی کو اپنا قبلہ بنایا ہے جسے عالمگیر انسانیت کا مرکز بننے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ نہیں ہے کہ پندرہ سال تک اس نظام کا پیغام دینے والا ایک قومی مرکز کو اپنا قبلہ تصور کرتا رہے اور بعد میں کعبے کو اپنا قبلہ (مرکزِ محسوس) قرار دے۔

برادرانِ عزیز! یہ تو توحید کے متضاد ہو جاتا ہے۔ اب آپ نے سمجھا کہ قبلہ کے معنی کیا ہیں۔ سوال یہ نہیں تھا کہ جب مکے میں حضور ﷺ تھے' تو یوں رخ کر لیا کرتے تھے کہ سامنے کعبے کا بھی وہ جو مقام ہے وہ ہو' اور ادھر وہ بیت المقدس کا شہر بھی ہو۔ وہاں مکان اور شہر کی تو بات ہی نہیں تھی۔ اس کے تو معنی ہی یہ تھے کہ یہ جو میرا نظام ہے' اس نظام کا نقطۂ ماسکہ کونسا ہے۔ یہ نقطۂ ماسکہ عالمگیر انسانیت کی برادری بنانا ہے۔ اس کے لیے تو پہلے ہی دن سے یہ کعبہ ہی قبلہ ہونا چاہیے تھا۔ اور یہ کعبہ تھا ہی قبلہ اور اب جب کہ مدینہ میں یہ وہ مملکت قائم ہوگئی تھی جس میں نظامِ خداوندی کو مشہود انداز سے دنیا کے سامنے آنا تھا' اس نظام کا مرکز کعبہ تھا اور وہ قریش کے قبضہ میں تھا۔ اس تصور سے حضور ﷺ کے قلب مطہر کی کیا کیفیت تھی، اسے محاکاتی انداز میں یوں بیان کیا کہ **قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡهِکَ فِی السَّمَآءِ** (2:144) لیکن عزیزانِ من! آج درس کا وقت ختم ہو گیا' اسے ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

❀......❀......❀

اکتیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2) (آیات 143 تا 152)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ كَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا ؕ
وَمَا جَعَلۡنَا الۡقِبۡلَةَ الَّتِىۡ كُنۡتَ عَلَيۡهَآ اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ يَّتَّبِعُ الرَّسُوۡلَ مِمَّنۡ يَّنۡقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيۡهِ ؕ وَاِنۡ
كَانَتۡ لَكَبِيۡرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيۡنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيۡعَ اِيۡمَانَكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ
رَّحِيۡمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدۡ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰٮهَا ۖ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ
الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ ؕ وَحَيۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ لَيَـعۡلَمُوۡنَ
اَنَّهُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنۡ اَتَيۡتَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ
مَّا تَبِعُوۡا قِبۡلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنۡتَ بِتَابِعٍ قِبۡلَتَهُمۡ ۚ وَمَا بَعۡضُهُمۡ بِتَابِعٍ قِبۡلَةَ بَعۡضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ
اَهۡوَآءَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ
يَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ؕ وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنۡهُمۡ لَيَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلۡحَقُّ مِنۡ
رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ﴿۱۴۷﴾ وَلِكُلٍّ وِّجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّيۡهَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ ؕ اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا
يَاۡتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيۡعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ
الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ
وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ ؕ وَحَيۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ
عَلَيۡكُمۡ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ ۚ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِىۡ ۚ وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِىۡ عَلَيۡكُمۡ
وَلَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۰﴾ كَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيۡكُمۡ
وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۵۱﴾ فَاذۡكُرُوۡنِىۡۤ اَذۡكُرۡكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا
لِىۡ وَلَا تَكۡفُرُوۡنِ ﴿۱۵۲﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1969ء کی 26 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 143 سے ہوتا ہے: (2:143)۔

کعبہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ایک ایسا سمبل ہے جو اپنے اندر اجتماعیّت کا پیغام لیے ہوئے ہے

موضوع مسلسل چلا آرہا ہے۔ سابقہ درس میں' میں نے تفصیلاً عرض کیا تھا کہ قبلہ درحقیقت قرآنی نظامِ مملکت کی Symbol (علامت) ہے' حکومت خداوندی کی ایک علامت ہے' ایک شعار ہے۔ جس طرح سے اب جب ماسکو کہا جاتا ہے تو وہ ایک مملکت ہی نہیں' ایک نظام جو ہے ان کے ہاں کا اس کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح قبلہ نظامِ خداوندی کی علامت ہے۔ نظامِ خداوندی کسی خاص گروہ' جماعت' فرقے یا مذہب کا نظام نہیں' عالمگیر انسانیت کے لیے نظام ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے پہلے یہودیوں کا اسی قسم کا قبلہ ان کے نظام کی علامت بیت المقدس تھا لیکن یہودیوں کا مذہب بھی قومی تھا' ان کا نظام بھی قومی تھا' اس لیے ان کا قبلہ بھی قومی تھا۔ اور قوم بھی وہ تھی جو نسل پر مبنی تھی' جو بنی اسرائیل کی نسل سے نہیں تھا وہ یہودی مذہب بھی اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ اور جو یہودی نہیں تھا اس کا قبلہ بیت المقدس ہو نہیں سکتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جس نظام کو عالمگیر انسانیت کا نظام بننا تھا وہ کبھی اس مرکز کو اپنی علامت یا مرکز نہیں قرار دے سکتا تھا جس کی نسبت ایک خاص قوم کی طرف ہو چکی تھی۔ اس کے برعکس کعبہ کی بنیاد ہی اس بنا پر رکھی گئی تھی۔ جیسا کہ میں نے اس سے پہلے عرض کیا تھا' کہا کہ وُضِعَ لِلنَّاسِ (3:96) یہ نوعِ انسانی کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اگرچہ حضرتِ ابراہیمؑ کے بعد اس کی یہ مرکزیت باقی نہ رہی لیکن اس کے بعد پھر نبی اکرم ﷺ اسی ملتِ ابراہیمیؑ کی تجدید کے لیے جب تشریف لائے تو کعبے کی جو Original Position یعنی جو پہلا مقام تھا' وہ اسے حاصل ہو گیا۔ اور یہ وجہ تھی کہ اسلامی نظام میں کعبے ہی کو اپنا مرکز قرار دیا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک عام خیال پایا جاتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ مکے کی زندگی کے تیرہ سال اور مدینے کی زندگی کے بھی دو اڑھائی سال بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے اور اس کے بعد یہ یکا یک تبدیلی ہوئی تھی اور آپ ﷺ نے اپنا رخ کعبے کی طرف کیا تھا' صحیح نہیں ہے۔ قرآن کی رو سے اس نظام کا مرکز پہلے دن سے کعبہ ہی تھا' کعبہ ہی رہا ہے۔

برادرانِ عزیز! اب یہ چیز کہ پہلی آیت 142 میں یہ آ گیا تھا کہ یہ یہودی جو حقیقت سے ناآشنا ہیں' وہ یہ اعتراض کریں گے کہ اچھا بھلا یہ بیت المقدس قبلہ چلا آ رہا تھا' اگر یہ رسول ﷺ اسی دین کو لے کر آیا ہے جو پہلے سے انبیائے کرامؑ کی طرف چلا آ رہا تھا تو اس نے اپنے لیے کعبے کو اپنا مرکز یا قبلہ کیوں تجویز کیا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا تھا کہ یہ جو تمہارا قبلہ ہے' یہ ایک قومی قبلہ بن گیا تھا۔ یہ نوعِ انسانی کے لیے ایک نظامِ زندگی لایا ہے اس لیے یہ اسے اپنا قبلہ نہیں بنا سکتا تھا۔ اور آپ دیکھیے کہ قرآنِ کریم اس کی دلیل کس قدر واضح الفاظ میں دیتا ہے۔ اگلی ہی آیت میں یہ کہا کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ

شَهِيدًا (2:143) اس طرح سے ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا ہے تا کہ تم تمام نوعِ انسانی کے اعمال کی نگرانی کر سکو۔

کعبہ کی طرف صرف منہ کر لینا ہی کافی نہیں' وہاں سے اٹھنے والی آواز کے سامنے جھکنا بھی ہے

عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ آج تو ہمارے نزدیک قبلے کی حیثیت صرف اتنی ہی رہ گئی ہے کہ ہم اپنی نماز میں منہ طرف قبلہ شریف کرتے ہیں' اپنا رخ ادھر رکھتے ہیں' یہ بھی نہایت ضروری چیز ہے لیکن مقصود بالذات نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (2:143) اس طرح سے ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی قوم بنا دیا ہے۔ یہ کعبے کا تعین تو اس قوم کی تشکیل کے لیے تھا کہ یہ بین الاقوامی حیثیت اختیار کرے۔ لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143) اور تم تمام عالمگیر انسانیت کے اعمال کی نگران ہو۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں Universalism (عالمگیریت) کا تصور آ گیا' اس میں گروہ بندی نہیں ہے۔ اس طرح سے تعینِ قبلہ سے مقصود یہ تھا کہ عالمگیر نظام کی تشکیل ہو اور تم یوں ایک اُمَّةً وَّسَطًا (امتِ وسط) بن جاؤ تا کہ تمام نوعِ انسانی کے اعمال کی نگرانی کر سکو۔ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (2:143) اور تمہارے رسول ﷺ تمہارے اعمال کے نگران ہوں۔

اب یہ جو ان کی طرف یہ اعتراض ہے کہ یہ قبلہ کیوں رکھا گیا؟ کہا کہ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ (2:143)۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ پہلے قبلہ اور تھا تو کہا کہ ''ہم نے یہ قبلہ اس لیے بنایا ہے تا کہ دونوں قسم کی ذہنیتیں الگ الگ ہو جائیں اور یہ واضح ہو جائے کہ وہ کون ہے جو رسول کے اتباع میں اپنا رخ پھیر کر ہر قسم کی قومی نسبتوں کو چھوڑ کر' خالص انسانیت کی نسبت اختیار کرتا ہے اور وہ کون ہے جو قومی نسبت کی طرف لوٹ جاتا ہے''۔ یہ بات یہاں قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ پہلے یہ بیت المقدس قبلہ تھا اور اس کی جگہ یہ کعبہ قبلہ بنایا ہے بلکہ کہا یہ ہے کہ جس قبلے کے اوپر تُو ہے اُسے ہم نے قبلہ بنایا ہے اور اگر بیت المقدس کے متعلق کہا جائے کہ خدا نے مسلمانوں کے لیے اسے قبلہ قرار دیا تھا تو اس کے لیے تو قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں آیا ہے۔ کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ بیت المقدس کو خدا نے قبلہ قرار دیا تھا۔ اس موجودہ قبلے یعنی خانہ کعبہ کے متعلق تو قرآن میں متعدد آیات ہمارے سامنے ہیں جن میں کہا تھا کہ یہ ہے تمہارا قبلہ۔ اس لیے کہا کہ یہ جو قبلہ ہے' یہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ دور وہ آ گیا جس میں یہ دیکھا جائے گا کہ کون اپنی گروہ بندیوں کی تنگ ناؤں کو چھوڑ کر' عالمگیر انسانیت کی ناپیدا کنار وسعتوں کو اپنا تصور بناتا ہے۔ ہم نے یہ دیکھنا ہے۔

آج کرہ ارض کا گوشہ گوشہ قومیت کے تصور میں غسلِ خون کی ہولی کھیل رہا ہے

آپ دیکھ رہے ہیں کہ چودہ سو سال پہلے کی بات تو ایک طرف رہی' آج انسان اپنے ذہن میں یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے بڑی ترقی

کی اس کے ذہن کا افق بہت بلند ہو گیا حتیٰ کہ وہ اس زمین سے اڑ کر آسمان تک‘ چاند اور تاروں تک‘ پہنچ رہا ہے لیکن قومیت کا تعصب اتنا گہرا ہے کہ اسے یہ کسی طرح سے چھوڑنے کو تیار ہی نہیں‘ ایسا نظر آ رہا ہے کہ چھوڑ سکتا نہیں۔ یہ بڑی گہری چیز تھی۔ یہ جو کہا ہے کہ قبلے کا تعین‘ بظاہر تو یوں نظر آتا ہے کہ اُدھر رخ نہ کر لیا‘ اِدھر رخ کر لیا۔ اس نے کہا ہے کہ یہ رخ کرنے کی بات نہیں ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ تم اپنی گروہ بندی کی تنگ ناؤں سے‘ تنگ دائرے سے‘ قومیت کے تنگ تصور سے‘ نکل کر عالمگیر تصور کو اپناتے ہو یا نہیں؟ یہ ہے جس کے لیے قومی مرکز کو چھوڑ کر ایک عالمگیر انسانیت کا مرکز تمہارے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کون قومیت کی تنگ ناؤں سے نکل کر عالمگیر انسانیت کے تصور کو اپناتا ہے اور کون اسی پرانی جہالت کی طرف چلا جاتا ہے جس میں انسان گروہوں میں‘ قبیلوں میں‘ بٹا ہوا تھا‘ نسلوں میں بٹا ہوا تھا۔ آگے کہا کہ **وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ** (2:143) یہ تنگ ناؤں سے نکل کر عالمگیر تصور میں آنے کی بات بڑی مشکل سی ہے‘ یاد رکھیے! یہ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ آپ غور کیجیے کہ محض نماز میں رخ ایک طرف کرنا یا دوسری طرف کرنا‘ اور وہ آیت ابھی آتی ہے جس میں یہ کہا جائے‘ کوئی ایسی اہم چیز نہیں تھی‘ یہ تو رخ ہی بدلنے کی بات ہے۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ یہ بڑی گراں چیز ہے یاد رکھو! یہ بڑی دشوار گزار چیز ہے‘ یہ دل پہ گراں گزرنے والی چیز ہے۔ رخ کی تبدیلی تو کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اتنی گراں گزرے۔

کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حقیقی مقصد تو اپنے زاویہ نگاہ کو بدلنا تھا

یہ آئیڈیالوجی کا بدلنا ہے‘ اس تصور کا بدلنا ہے جس میں نسل اور قوم کی‘ اور وطن کی‘ تنگ ناؤں سے نکل کر‘ عالمگیر فضاؤں کے اندر اٹھنا ہے۔ یہ ہے وہ چیز جو اصل Change (تغیر) ہے‘ جو اصل انقلاب ہے۔ کہا ہے کہ یہ بات بڑی گراں گزرے گی۔ عزیزانِ من! یہ بات تو آج بھی بڑی گراں گزرتی ہے‘ اُس زمانے کی تو بات ایک طرف رہی۔ اس قومیت کی لکیروں نے‘ ان تعصّبات نے‘ اس دنیا کو اتنی سائنٹفک ترقیوں کے باوجود جہنم بنا رکھا ہے۔ کہا ہے کہ **اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ** (2:143) اس گراں گزرنے والی تبدیلی کے اندر یہ چیز نظر آئے گی کہ صاحب! یہ ساری دنیا سے کٹ کر‘ ایک نئی امت کی تشکیل کرنا ہے‘ ایک نئے کعبے کی تعمیر کرنا ہے‘ ایک نئی آئیڈیالوجی کو اپنانا ہے۔ یہ بڑا چھوٹا سا گروہ تھا‘ بڑی مختصر سی جماعت تھی۔ ان کے دل میں یہ خیال آ سکتا تھا کہ ساری دنیا سے کٹ کر‘ ساری دنیا سے لڑائی مول لے کر‘ یہ چیز تو شاید نقصان کا باعث ہو جائے۔ وہیں کہہ دیا گیا کہ اس میں گھبرانے کی بات نہیں ہے‘ خدا تمہاری اس ایمانی قوت کو ضائع نہیں کرے گا۔

قرآن حکیم کی آئیڈیالوجی اتنی بارآور ہوگی کہ اس کی خوشبو سے کرہ ارض مہک اُٹھے گا

قرآنِ حکیم کی آئیڈیالوجی کا یہ تخمِ صالح بڑھے گا' پھولے گا' پھلے گا' بارآور ہوگا۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ بالکل ایک نیا خیال' نیا آئیڈیا' نیا نظام ہے' ساری دنیا سے الگ ہے جسے ہم ساری دنیا سے مخالفت مول لے کر اپنا رہے ہیں۔ اس کے نتائج کیا ہونگے؟ کہا کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (2:143) یہ اس لیے کہا گیا ہے۔ یہاں پھر دیکھیے! الناس آیا ہے کہ اس تبدیلی کے اندر تو نوعِ انسانی کی نشو ونما کا سامان پوشیدہ ہے۔ اس لیے یہ چیز تمہارے لیے کیسے نقصان کا باعث ہوجائے گی۔ اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو! بقا اور فلاح کا ایک ہی معیار ہے کہ وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (13:17) جو شے پوری نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہوگی' وہی باقی رہے گی۔ تمہارا یہ نظام' اس نظام کا یہ مرکزِ محسوس' یہ قبلہ تو نوع انسانی کی منفعت کے لیے وجود میں آیا ہے۔ اس لیے اسے نقصان کیسے ہوسکے گا؟ تم اگر اس کا اتباع نہیں کرو گے تو نقصان میں رہو گے۔ اس کا اتباع کرو' گھبرانے کی بات نہیں۔ اب دیکھیے کہ اگلی آیت میں قرآن نے کیا بات کہی؟ کعبہ اس نظام کا مرکزِ محسوس قرار پا گیا۔ نبی اکرم ﷺ اپنی جماعت کو لے کر کعبہ ہی کو نہیں' مکے ہی کو چھوڑ کر مدینے تشریف لے آئے۔ کعبے پر مشرکین کا تسلط تھا۔ اب آپ دیکھیے کہ نظام کا مرکز کعبہ ہے اور اس کی تولیت ابھی مشرکین کے پاس ہے۔ رہ رہ کر دل میں یہ خیال آسکے گا کہ یہ کیا بات ہوئی کہ ہمارے نظام کا مرکز کعبہ ہے اور اس پر' تسلط ہمارے مخالفین کا ہے۔ نظام کا مرکز تو ایسا ہونا چاہیے جس پہ تسلط بھی ہمارا ہو۔ کہا کہ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِکَ فِی السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا (2:144) ہم دیکھتے تھے کہ کس طرح رہ رہ کر تیری نگاہیں آسمان کی طرف اٹھتی ہیں کہ وہی قبلہ ہمارا قبلہ ہونا چاہیے۔ اس کے علی الرغم آج بھی ہمارا خیال اس عقیدے کے مطابق' جو میں نے کہا ہے چلا آرہا ہے کہ وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔

بیت المقدس کو قبلہ تسلیم کرنے سے کیسی پوزیشن سامنے آتی ہے؟

اب آپ یہ دیکھیے اور یہ چیز ذہن میں رکھیے کہ یہاں بیت المقدس کو قبلہ تسلیم کرنے میں ایک کتنا اشتباہ پڑتا ہے اور ایک ایسی پوزیشن سامنے آتی ہے جس کو انسان کبھی Accept (قبول) نہیں کرسکتا کہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے حضور ﷺ نماز پڑھتے تھے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی خدا کا مقرر کیا ہوا کعبہ تھا' خدا نے اسے کعبہ مقرر کیا ہے' رسول اللہ ﷺ خدا کے اس فیصلے کے مطابق اس طرف رخ کرتے ہیں' نماز پڑھتے ہیں اور اُدھر قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ رہ رہ کر آپؐ کے دل میں یہ آرزو مچلتی ہے کہ یہ تو قبلہ نہیں ہونا چاہیے' میرا قبلہ تو کعبہ ہونا چاہیے۔ گویا رسول کی بھی یہ کیفیت ہے کہ خدا کا ایک حکم ہے' اس کی تعمیل کر رہا ہے' اور یہ تعمیل طوعاً و کرہاً کر رہا ہے اور بار بار آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ رہی ہیں کہ یا اللہ! ٹھیک ہے' تیرا حکم تیرا حکم ہے' میں اس پر عمل کر رہا ہوں لیکن قبلہ تو وہی ہونا چاہیے۔

ہجرت کے بعد کعبہ پر مشرکین کا کنٹرول' آپؐ کے دل میں گزرنے والے خیالات کی کیفیت اور خدا کا فیصلہ

برادرانِ عزیز! بات یہ تھی کہ اس وقت تک ابھی کعبہ پہ تسلط وتولیت مخالفین کی تھی' اس کی تولیت مشرکین کے پاس تھی۔ اور دل کے اندر واقعی یہ آرزو مچلنی چاہیے کہ جو ہمارا نظام ہے اس نظام کا جو مرکز ٹھہرایا گیا ہے وہ مرکز ہمارے تسلط میں ہونا چاہیے۔ یہ جو تمنا' یہ جو آرزو ہے' یہ بالکل نیچرل ہے لیکن یہ چیز ہے کہ حکم کے مارے رخ تو ادھر بیت المقدس کی طرف کیا جا رہا ہے اور دل میں یہ آرزو آ رہی ہے کہ صاحب! یہ تو قبلہ نہیں ہے' یہ تو وہی خانہ کعبہ ہونا چاہیے۔ نہیں' میرے بھائی! یہ ایسا نہیں ہے۔ یہ ساری باتیں یہودیوں کے اعتراض کی بنیاد پہ بنائی گئی ہیں اور قرآنِ کریم نے ان کا یہ اعتراض Quote (نقل) کیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن پہ اگر آپ رہیں گے تو بات بڑی صاف ہوتی چلی جائے گی۔ ایک شانِ نزول کی روایت نے یہ سارے معنی کس طرح سے بدل کر رکھ دیئے۔ جی ہاں! قرآنِ کریم میں کہا یہ گیا ہے کہ ہم یہ تمنا اور آرزو دیکھ رہے تھے۔ یہ کہنے کا بھی کتنا حسین انداز ہے کہ تیری نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں کہ جو ہمارے نظام کا مرکز ہے' وہ ہماری ہی تولیت میں ہونا چاہیے۔ اور یہ بڑی نیچرل چیز ہے۔ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا (2:144) گھبرانے کی بات نہیں ہے یہ قبلہ جو تجھے پسند ہے' جو ہم نے مقرر کیا ہے' اس پر تمہاری تولیت ہو کر رہے گی۔ ہم نے یونہی اس کو تمہارا مرکز نہیں مقرر کر دیا کہ تمہارا نظام جو ہے' اس کا مرکز غیروں کے قبضے میں رہے۔ یہ نہیں ہوگا۔ یقیناً اس کے اوپر تمہارا قبضہ ہوگا۔

عزیزانِ من! مدینے کی ابتدائی زندگی میں یہ چیز کہی جا رہی ہے کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے' اس پر تمہارا قبضہ ہو کر رہے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس دوران میں تمہیں کرنا کیا چاہیے؟ اس کے لیے کہا کہ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (2:144) ٹھیک ہے کہ اگرچہ اس وقت اس پر دوسروں کا ہی قبضہ ہے مگر تم اپنی تمام توجہات کو اس بات کے اوپر مرکوز کر دو کہ اس پر ہمارا قبضہ ہو کر رہے گا۔ دل میں عزم پیدا کرنے کے لیے یہ بڑی چیز ہے کہ ہر وقت اس چیز کو دہراتے چلے جاؤ کہ کوئی بات نہیں' یہ زمانے کا حادثہ ہے جو آج یہ ابھی غیروں کے قبضے میں ہے' اس پہ ہمارا قبضہ ہو کر رہے گا' وہ ہماری تولیت میں آ کر رہے گا۔ کہا کہ تم یہ کرو۔ ٹھیک ہے' اس کا ایک محسوس طریق یہ بھی ہے کہ اپنے رخ اُدھر رکھو تا کہ جماعت کو ہر وقت یاد دہانی ہوتی رہے کہ وہ ہمارا قبلہ ہے' اسی کو ہم نے حاصل کرنا ہے' اور یہ حاصل ہو کر رہے گا۔ آپ نے دیکھا کہ ایمان اور نظریئے کا یقین' عمل کے لیے کس طرح قلب کے اندر تحریک پیدا کرتا ہے اور بالآخر ویسا ہو کر رہتا ہے۔

صرف کعبہ کی طرف رخ کیے رکھنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد

عزیزانِ من! کہا ہے کہ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (2:144)۔ یہ چیز یہاں بڑی خوبصورت آ رہی ہے

اور اگلی آیت میں بڑی نمایاں ہو جائے گی۔ کہا ہے کہ **فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ**(2:144)۔ اس آیت میں یہ ''ک'' آپ نے دیکھا ہے کہ اس میں واحد مخاطب کا صیغہ صرف رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے کہ تُو اپنا رخ اس طرف رکھ۔ سوال یہ ہے کہ یہ حکم رسول اللہ ﷺ کے لیے مخصوص ہوا کہ صرف رسول ﷺ سے کہا کہ تُو اپنی توجہ اس طرف رکھ۔ پہلے یہ کہا۔ یقیناً سب سے پہلے جو سربراہ ہے، جو لیڈر ہے، سب سے پہلے اسے ایک چیز اپنے ذمے رکھنی چاہیے، ابتدا اس کو کرنی چاہیے، Initiative (پہل) اس کی طرف سے ہونا چاہیے لیکن اگر اتنی سی بات کہہ کر چھوڑ دی جاتی تو نظر آتا کہ یہ فرق حضور ﷺ ہی کے لیے تھا۔ ساتھ ہی کہا کہ **وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ** (2:144) اے جماعتِ مومنین! تم جہاں کہیں بھی دنیا میں ہو، یاد رکھو! **فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ** (2:144) اپنی نگاہوں کا رخ اسی طرف رکھو۔ اب یہ ہے وہ ہم آہنگی، جو لیڈر میں اور اس کے متبعین میں، پیدا ہوتی ہے۔ یاد رکھیے! ابتدا اسی کی طرف سے ہوتی ہے۔ پوری کی پوری قوم اپنا رخ کسی طرف کیے ہو، اور ان کا سربراہ اپنا رخ دوسری طرف کیے ہوئے ہو تو اس سے بڑا تشکک وافتراق کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ سربراہ اپنا رخ کسی ایک طرف کیے ہوئے ہو اور قوم کا رخ کسی دوسری طرف مڑ جائے تو انارکی پھیل جاتی ہے۔ یہ قرآن نے اپنا نظام بتایا ہے کہ سب سے پہلے جو سربراہ اور لیڈر اور امام ہے، اس کو اپنا رخ ایک سمت رکھنا چاہیے اور اس کے پیچھے جو جماعت ہے اس کو اس کے اتباع میں اسی طرف اپنا رخ رکھنا چاہیے۔ کہا ہے کہ یہ طریقہ ہے جس سے یہ کعبہ جو تمہارے نظام کا مرکز ہے اور جو آج غیروں کے تسلط میں ہے، یقیناً تمہارے تسلط میں آ کر رہے گا۔ کرنے کی بات یہ ہے: امام یعنی لیڈر سے کہا کہ تم بھی اپنی توجہات کا مرکز اسے بناؤ، جماعت کے افراد سے کہا کہ تم بھی دنیا میں جہاں کہیں بھی ہو، اسی کو اپنی نگاہوں کا نصب العین بناؤ، باقی رہے، ان کے اعتراضات تو ان کی پرواہ نہ کرو۔

قرآن حکیم کا فرمان ہے کہ کعبہ کو تعمیر کرنے والی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم شخصیت نہ یہودی تھی، نہ نصرانی

قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ **اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ** (2:144)۔ یہ جانتے ہیں کہ ابراہیمؑ نے اسی کو کعبہ بنایا تھا، انہیں اس کا پتہ ہے۔ ان کا یہ اعتراض اس گروہ بندی کے تعصب کے تاثرات کی بنا پر ہے جو بعد میں انہوں نے از خود پیدا کیا تھا، ابراہیمؑ تو کسی گروہ بندی کا نہیں تھا۔ قرآن میں کہا ہے کہ ابراہیمؑ نہ یہودی تھا، نہ نصرانی تھا، وہ عالمگیر انسانیت کے دین کا پیامبر تھا۔ کہا ہے کہ یہ لوگ یہ جانتے ہیں۔

عزیزانِ من! اور کتنی ہی چیزیں ہیں کہ قومی نسبتیں انسان کو ہٹنے نہیں دیتیں، ان کے دل میں یقین ہوتا ہے کہ ہم غلط بات کہہ رہے ہیں اور غلط کر رہے ہیں۔ قرآن کیا چیز کہہ گیا ہے؟ یہ کہ یہ جانتے ہیں کہ حقیقت یہی ہے کہ ابراہیمؑ نے اسی کعبہ کو قبلہ بنایا تھا، اس کے باوجود

اعتراض کیے جا رہے ہیں اور اسے اپنا نہیں رہے۔ اگلی چیز کہی کہ وَ لَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ (2:145) تم ان کو دلائل و براہین سے ہی سمجھا سکتے ہو لیکن تعصب ایک ایسی چیز ہے جو دلائل و براہین کو تسلیم ہی نہیں کیا کرتی۔ ان کو لاکھ دلیلیں دیتے چلے جاؤ' یہ کبھی تمہارے قبلے کا اتباع نہیں کریں گے۔ میں یہ کہتا چلا آ رہا ہوں کہ جو قبلہ ہے' درحقیقت وہ جو نظام ہے یہ اس کا سمبل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہاں کہا ہے کہ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ وَ مَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ (2:145) اور تم بھی ان کے قبلہ کا اتباع کرنے والے نہیں اور آگے ہے کہ وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ (2:145) ان کی کیفیت یہ ہے کہ تمہاری مخالفت میں تو ایک محاذ بنائے ہوئے ہیں لیکن آپس میں بھی ان کی یہ کیفیت ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے قبلے کا اتباع نہیں کرنا۔ تو یہ جو اتباعِ قبلہ ہے' یہاں یہی لفظ میں نے کہا ہے۔

قرآن حکیم نے قبلے کا لفظ ملت' ملک اور نظام کے معنوں میں لیا ہے

اگلی ہی آیت میں اس کی تفسیر کر دی ہے کہ وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (2:120) یہ یہود اور نصاریٰ تم سے کبھی راضی نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ تم ان کی ملت کا اتباع نہ کرو۔ یہاں لفظ ملت ہے' یہاں (2:145) میں اتباعِ قبلہ ہے لہٰذا قبلہ کے معنی ملت ہی ہے۔ یہی میں کہہ رہا تھا کہ قبلہ کسی مقام کا نام نہیں' کسی سمت کا نام نہیں' کسی رخ کا نام نہیں' یہ ملت کا نام ہے' یہ مسلک کا نام ہے' یہ نظام کا نام ہے' یہ کعبہ اس کی مرکزِ محسوس شکل ہے' صرف علامت ہے' سمبل ہے۔ کہا کہ یہ دلائل کی بات نہیں ہے' یہ جانتے ہیں کہ تُو یہ سچ کہتا ہے مگر گروہ بندیوں کا جو تعصب ہے وہ اس طرف آنے نہیں دیتا۔ اس لیے ان کو لاکھ دلیلیں دیتے چلے جایئے' یہ نہیں مانیں گے۔ اگر تعصب کو چھوڑ کر بات پہ آئیں گے تو پھر یہ مان سکتے ہیں۔ اور پھر تم بھی یاد رکھو کہ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (2:145) جب یہ تمہاری طرف العلم آ گیا' وہ حقیقت تمہاری طرف آ گئی تو محض اس لیے کہ یہ اتنی بڑی جماعت ہے' یہ اتنی بڑی قوم (Nation) ہے' یہ ہم سے کٹ جائیں گے تو تم یہ چھوٹی سی بات ہے کہ اس سے Compromise (مفاہمت) کر لو' ان کی خواہشات کا اتباع کرنے پہ آمادہ ہو جاؤ تو تمہارا شمار انہی میں سے ہو گا جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کرتے ہیں۔ کہا ہے کہ اگر تم نے کسی اور خیال سے یہ کیا کہ یہ مفاہمت کرنے والی بات ہے' تو صورت یہ نہیں ہے کہ تم نے قبلے کا رخ اپنی نمازوں میں بدل لینا ہے وہ تو سارا نظام بدل جائے گا' نظام کا مرکز بدل جائے گا تو اس وقت اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (2:145) جیسے ظالمین یہ ہیں' تُو بھی وہی کچھ ہو جائے گا۔

قبلے کا مفہوم متعین کرنے کا مقصد اور اہل کتاب کی مفاد پرستی کا نتیجہ

عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں تعینِ قبلہ کو کتنی اہمیت ہے۔ اس اہمیت کے باوجود حقیقت کیا ہے؟ یہ بات ایک آیت کے بعد آتی ہے کہ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ (2:146) یہ جو حقیقت ہم نے کہی ہے کہ ابراہیمؑ کا قبلہ قومی قبلہ نہیں تھا' یہ عالمگیر تھا' یہ درحقیقت قومیت کی تشکیل کا ایک نیا معیار تھا' ایک نیا نظریہ زندگی تھا۔ کہا کہ یہ ایک ایسی عظیم حقیقت ہے' واضح کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یہ اہلِ کتاب اس حقیقت کو یوں پہچانتے ہیں جیسے انسان اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے۔ اس میں کسی شبے والی بات ہی نہیں ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ (2:146) ان کا یہ مذہبی پیشوائیت کا جو گروہ ہے اس کے مفاد کا تقاضا ہے کہ تمہاری گروہ بندی الگ رہے۔ یہ جانتے بوجھتے تمہیں اس طرف نہیں جانے دیتے کہ جب یہ قوم عالمگیر انسانیت کے اندر آ جاتی ہے تو پھر اپنی گروہ بندی باقی نہیں رہتی۔ یاد رکھیے! یہ مذہبی پیشوا جب مذہب کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں تو ان کا وجود اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ ان کے فرقے قائم رہیں' ان کی گروہ بندیاں قائم رہیں۔ جب گروہ مٹ جاتے ہیں تو امت بن جاتی ہے۔ امت تو ایک ہوتی ہے' اس کا نظام ایک ہوتا ہے' اس کا سربراہ ایک ہوتا ہے۔ یہ الگ الگ لیڈر' یہ الگ الگ مذہبی پیشوا تو صرف گروہ بندیوں میں باقی رہ جاتے ہیں۔ یہ اپنی گروہ بندیوں کی گرہوں کو اس لیے مضبوط کرتے ہیں: بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم [1]' یہ اپنے وجود کے تحفظ کے لیے یہ کچھ کرتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ ہم یہ سب کچھ خدا کے لیے کر رہے ہیں۔ کہا کہ یہ چیز ہے کہ ان کا ایک فریق یہ جانتے ہوئے لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ (2:146) حقیقت کو چھپاتا ہے کہ یہ بات عوام کے سامنے آنے نہ پائے حالانکہ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ (2:146) یہ سب کچھ جانتے بوجھتے دیدہ دانستہ کرتا ہے۔ کہا ہے کہ تمہیں اس کی پرواہ نہیں ہونی چاہیے۔ یاد رکھیے! اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (2:147) یہ الحق (The Truth) حقیقت ہے اور وہی ایک حقیقت ہے' جو تیرے رب کی طرف سے آ گئی ہے۔ اب اس بارے میں تمہیں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ پورے یقین کے ساتھ اس چیز کے اوپر آ جاؤ۔

قبلے کے قرآنی مفہوم کو صرف نماز کی حد تک محدود کرنے کا نتیجہ

عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ تعینِ قبلہ کی اہمیت کس قدر ہے! قبلہ کی طرف رخ کرنے کی اہمیت کتنی ہے اور کتنے زوروں سے قرآن میں دی ہے۔ یہ قرآن ہے' اس کے ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا (2:148) یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم نے اپنا قبلہ یہ مقرر کر لیا اور نمازوں میں منہ اس کی طرف کر لیا تو بڑا کام کر لیا' بہت بڑی چیز ہو گئی۔ اور یہ کہ اسلام کی

---

[1] حکایت قدآں یار دلنواز کنم   بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

خصوصیتِ کبریٰ یہ ہے اور اسی بنا پر یہ تمام مذاہبِ عالم پر افضلیت رکھتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔ ہر قوم میں، ہر مذہب میں، ہر گروہ میں اپنا اپنا ایک قبلہ مقرر کیا ہوا ہے، تم نے بھی یہ مقرر کر لیا، یہ کونسی ایسی چیز ہے جس کے اوپر تم کہو کہ ساری دنیا کے اوپر ہمیں فخر اور افضیلت حاصل ہو گئی۔ یہ بات نہیں ہے۔

کعبے کو کعبے کا مقام عطا کرنے کا پیمانہ اور اس کا محسوس معیار

اس کی تو اتنی اہمیت ہے کہ جہاں کہیں بھی تم ہو یعنی حَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (2:144) دنیا کے کسی گوشے میں بھی ہو، اپنا رخ، اپنی نگاہوں کا مرکز، اسی کو بناؤ۔ قبلہ کی اہمیت تو اتنی بڑی اہمیت ہے لیکن یہ خیال دل سے نکالنے کے لیے کہا کہ کہیں اسی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا کہ یہ اینٹ اور پتھر کا ایک مکان، عرب کی سرزمین میں، ایک گوشہ، اپنی نمازوں میں ہم اپنا رخ اُدھر کر لیتے ہیں اور اس کی اتنی اہمیت حاصل ہو جائے صاحب! کہ بس باقی اقوامِ عالم باقی مذاہب کے اوپر تمہاری افضیلت یہ ہے کہ صاحب! ہمارا جو قبلہ ہے وہ کعبہ ہے۔ کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔ ہر قوم نے اپنے لیے ایک ایک مرکز تجویز کر رکھا ہے، اس کی حیثیت اتنی ہی ہے اس سے زیادہ نہیں۔

سنیے کہ حیثیت کس چیز کی ہے؟ مقصد کیا ہے؟ یہ کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (2:148) دیکھنا یہ ہے کہ تم نوعِ انسانی کے بھلائی کے کاموں میں کتنا آگے بڑھتے جاتے ہو۔ کعبے کو اپنا قبلہ بنا لیا اور اس کی ساری اہمیت یہ کہ صاحب! ذرا سا رخ ادھر ہوا تو دہائی مچ گئی کہ صاحب! نماز نہیں ہوئی۔ وہ صحیح تعین کیا گیا تو سمجھ لیا کہ ہم نے بہت بڑا نیکی کا کام کر لیا۔ یاد رکھیے! پچھلے درس کو فراموش نہ ہونے دیجیے جس میں، میں نے کہا تھا کہ ان چیزوں کی اہمیت اپنے مقام پہ ہے اور بڑی اہمیت ہے۔ اور وہ اہمیت میں نے مثال کے ذریعے سے بتائی تھی کہ فوج میں ایک سپاہی کے لیے یہ چیز کہ اس کے بوٹ کے تسمے کی گرہ کیسے لگے گی؟ وہ اسے کیسے باندھے گا؟ کس مقام کے اوپر اسے آنا چاہیے؟ اس کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ اگر اس میں ذرا سا فرق آتا ہے تو اس کے اوپر اس کو سزا مل جاتی ہے۔ ایک نظام کے اندر چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی اپنی اہمیت رکھتی ہیں لیکن یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں مقصود بالذات نہیں ہوتیں، مقصود بالذات اس نظام کا استحکام ہوتا ہے۔ اگر وہ نظام باقی نہ رہے تو ان جزئیات کی کتنی ہی آپ پابندی کرتے چلے جائیں، وہ بے معنی ہو جاتی ہیں، بلا نتیجہ رہ جاتی ہیں۔ جیسا میں نے مثال میں کہا تھا کہ یہی سپاہی فوج سے الگ ہو کر، برخاست ہو کر، فوج باقی نہیں، مملکت بھی باقی نہیں، اس کے پاس اس کی وردی موجود ہے، گھر میں آ گیا ہے، صبح اسی طرح سے اٹھتا ہے جیسے وہاں اٹھتا تھا، اٹھنے کے بعد اسی طرح سے وردی پہنتا ہے، ہر چیز اپنی اپنی جگہ فٹ ہوتی ہے، تسمے بھی ٹھیک ہیں، بٹن بھی وہیں ملے ہوئے ہیں، نکلتا ہے اور گاؤں کی گلیوں میں لیفٹ رائٹ کرتا ہوا دو گھنٹے پریڈ کر کے گھر میں لوٹتا ہے، جزئیات کی پابندی اب بھی ویسی ہی ہو رہی ہے، نتیجہ اس کا نہیں نکل سکتا۔ وہاں اگر کھڑا ہے تو ان جزئیات میں سے کسی ایک

کے اندر ذرا سی بھی تبدیلی آ جائے گی تو وہاں ٹکراؤ ہو جائے گا۔ وہاں تو اہمیت اتنی ہے اور ان ساری چیزوں کی اہمیت برقرار رکھتے ہوئے نتیجہ نکل رہا ہے۔

قوموں کی عظمت اور انکی فضیلت کا معیار ان کے اختیار کردہ نظام کا ہی رہینِ منت ہوتا ہے

عزیزانِ من! قرآن ہے۔ پچھلی آیتوں کے اندر آپ دیکھیے تو نظر آتا ہے قبلے کی اتنی بڑی اہمیت ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں تم ہو اپنا رخ ادھر رکھو لیکن کہا یہ ہے کہ **وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا** (2:148) صاحب! تمہاری خصوصیت یہ نہیں۔ ہر ملک کی آرمی نے اپنے لیے کچھ جزئیات رکھی ہوئی ہیں۔ یہیں بارڈر کے پار جا رہا ہے' وہاں کا سپاہی بھی یہ کچھ کر رہا ہے۔ اس میں تو کوئی خاص بات نہیں کہ تم کہو کہ ہماری وردی کا جو رنگ ہے' وہ اس قسم کا کچھ گرین ہے ان کی وردی کا رنگ زرد ہے' لہٰذا ہماری قوم کو اس قوم کے اوپر فضیلت حاصل ہے۔ بات یہ نہیں ہے۔ ہمارا سپاہی ٹوپی ٹھیک رکھتا ہے ان کے سپاہیوں کی ٹوپی بگڑی ہوئی ہے۔ کہا کہ اتنی بات نہیں۔ مقصود تو یہ **فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ** (2:148) ہے۔

پھر میں نے عرض کیا تھا کہ یہ خیر کا لفظ جس کی جمع خیرات آتی ہے' اس کا جو ترجمہ نیکیاں ہے یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ خیر اور اختیار کا تو مادہ ہی ایک ''خ ی ر'' ہے۔ ہر وہ کام جو انسانی اختیارات اور Freedom (آزادیوں) میں زیادتی کرتا چلا جاتا ہے' وہ ہے جو کچھ کہا گیا ہے۔ غلامی کی زنجیروں کو توڑتے ہوئے' آزادیاں برقرار رکھتے ہوئے' **فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ** آگے بڑھنا ہے' تو اس میں تم آگے بڑھو۔ عزیزانِ من! یہی وہ چیز ہے جو اس سے پیشتر بھی آ گئی اور پھر دہرا دوں۔ کہا کہ **لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ** (2:177) کشادگی کی راہ اور نیکی کی راہ یہ نہیں ہے کہ میں اپنا منہ مشرق کی طرف کر لیتا ہوں یا مغرب کی طرف کر لیتا ہوں۔ نہیں' یہ نہیں ہے۔ یاد رکھو! یہ بھی ضروری ہے۔ دیکھیے! دونوں چیزیں ہیں۔ کہا ہے کہ **حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ** (2:144) جہاں کہیں بھی ہو' اپنا رخ ادھر رکھو۔

نیکی کا قرآنی مفہوم اور اُسے اختیار کرنے کی بنیادی شرط

برادران عزیز! جہاں رخ کو ادھر رکھنے کی تاکید ہے' ساتھ یہ بھی چیز ہے کہ کہیں اسی کو نیکی نہ سمجھ لینا کہ میں نے اپنا رخ مشرق کی طرف کر لیا یا مغرب کی طرف کر لیا۔ یہ بات نہیں ہے۔ **وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ** (2:177) کشادگی اور نیکی اور خیرات کی راہ یہ ہے کہ اس آئیڈیالوجی کے اوپر ایمان رکھو جو قرآن نے دی ہے۔ اور اس کے بعد پھر بات یہ ہے کہ **وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ** (2:177) پھر تم اپنا مال جاذبیت اور محبت کے باوجود کھلا دیتے ہو۔ **وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَ الصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ**

الْبَــــأْسِ (2:177) یہ چیز ہے کہ تم اپنے عہد کی پابندی کتنی کرتے ہو' مشکلات کا سامنا کیسے کرتے ہو' تم میں استقلال کتنا ہے' تم میں استقامت کتنی ہے۔ بس یہ وہ چیزیں ہیں جو درحقیقت ہیں جسے تم نیکی کہہ سکتے ہو۔ اتنی سی بات کر کے کہ میں نے اپنا رخ اُدھر کر لیا ہے اور مطمئن ہو کر بیٹھ گئے کہ میں نے بڑا نیکی کا کام کر لیا' صحیح نہیں ہے۔ یہ نہایت واضح آیت ہے کہ آگے بڑھو' ایک دوسرے سے آگے نکلو۔

انسانی ضروریات کا تعین اور انسانی ہوس گیری کا نتیجہ

اب سوال یہ ہے کہ کس چیز میں آگے بڑھو؟ ایک آگے بڑھنا غلط نظام میں ہے یعنی یہ ہمارا آج کا آگے بڑھنا ہے۔ اس کے متعلق کہا کہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (102:1) تمہاری یہ جو ریس ہے کہ اس دنیا کے مفاد کے اندر ایک دوسرے سے آگے نکل جاؤ' اس سے میرا بینک کا بیلنس بڑھ جائے' اس کے پاس ایک موٹر ہے میرے پاس دو ہونی چاہئیں' وہ ایک مل لگاتا ہے میرے پاس چار لگنی چاہئیں' اس کو ایک لائسنس ملا ہے مجھے دس ملنے چاہئیں' اس کا ایک مکان ہے میرے پاس چار کوٹھیاں ہونی چاہئیں یہ تکاثر ہے۔ دیکھیے! یہ ''ک ث ر'' کس انداز سے قرآن یہاں لایا ہے۔ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی جو ہوس ہے' اَلْهٰكُمْ ' وہی تو تمہیں تباہ کرنے والی چیز ہے۔ یہ کہ اس کے نزدیک انسانی جسم یا فزیکل لائف ہے اس کے تقاضوں کا پورا کرنا ضروری ہے لیکن صرف اس کی ضروریات کا پورا کرنا ہے۔ مقصود بالذات یہ نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ میں دوسروں سے اس معاملے میں کتنا بڑھ جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ جو ضروریات ہیں ان کی تو ایک حد ہوتی ہے ''بالآخر کنیاں روٹیاں کھالو گے؟ [1]''۔ اور اگر اس میں تم نے بڑھنا شروع کیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ جو دوسرا کھانے والا ہے وہ پانچ سات کھالے۔ اور اگر تم نے کہا کہ صاحب! میں آٹھ نو کھاؤں گا ''بس اس وقت کھالیں' اگلا وقت تو آپ پہ نہ آیا''۔ ضروریات کی ایک حد ہوتی ہے' اس سے آگے آپ نہیں جا سکتے۔ کتنے کپڑے پہن لو گے؟ یعنی بالآخر تم اپنے رہنے کے لیے کتنے مکان بنا لو گے؟ یہ ٹھیک ہے کہ مکان بنا کر اس نے آ کر پوچھا تھا کہ صاحب! یہ کس کس کے لیے ہے؟ تو اس نے بتایا تھا '' کہ جی! اے کمرہ تہاڈے بیٹھن والا' اے کمرہ تہاڈے کھان والا' اے کمرہ تہاڈے سَون والا' تے کہن لگا میرے اٹھن والا کمرہ کیہڑا اہووے گا''۔ ''او سردار ہوراں نے بنایا ہیگا سی جی مکان دے اندر نہان والے حوض۔ تین حوض بنے ہوئے سی دویاں اچ پانی ہیگا سی تے اک خالی ہیگا سی پیا ہویا۔ تے انجینئر نوں پوچھیا اے کی اے؟ سردار ہوراں نوں دسدے پئے نیں کہ جی! اے جیہڑا اے نا اے جدوں تہانوں ٹھنڈے پانی نال نہان نوں جی کرے تے ایہدے اچ نہاؤ۔ کہن لگا ٹھیک اے۔ کہن لگا اے جدوں گرم پانی نال نہان نوں جی کرے تے ایہدے اچ نہاؤ۔ کہن لگا اے تیسرا؟

---

[1] آخر کار کتنی چپاتیاں کھاؤ گے؟

اے خالی آ جدوں نہ نہان نوں جی کرے ❶''۔

عزیزانِ من! انسانی زندگی کی ضروریات کی ایک حد ہوتی ہے' آپ اس سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتے لیکن ہوس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ o حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1-2) یہ تکاثر تو قبر تک جاتے ہوئے بھی ختم نہیں ہوتی۔ اب ایک تو یہ چیز تھی کہ اس کا علاج کیا جائے کہ جی! نہ رہے سر' نہ رہے سر درد۔ یہ سیدھی سی بات ہے کہ سر درد کا علاج ہے کہ سر ہی کاٹ دیا جائے'' واقعی نئیں سر درد اوہدے بعد ہووے گا ❷''۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے' جیسے کہ آپ کے تصوف اور رہبانیت نے کہا ہے کہ یہ جذبہ ہی نکال دیجیے۔ یہ جذبہ نکال دیجیے تو آپ پتھر بن کر رہ گئے' انسانیت ختم ہوگئی۔

یہ قرآن ہے' یہ جذبات کو باقی رکھتا ہے۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ زندگی کی علامت ہے۔ یہ میدان بدل دیتا ہے۔ یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ یہ بینک بیلنس اور موٹر کاریں اور مکان اور یہ ملیں اور یہ کارخانے اور یہ جو چیزیں ہیں' یہ تمہارے لیے میدان ہیں جو تم اپنے لیے تجویز کرتے ہو۔ سنیے! یہ میدان غلط ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! کہ انسانیت کے جو صحیح جذبات ہیں وہ ان کو مٹاتا نہیں ہے' یہ مٹ سکتے ہی نہیں ہیں۔ جسے یہ آپ کے ہاں نفس کشی کہتے ہیں' وہ فریبِ نفس ہے۔ انسانی جذبات کو مٹایا نہیں جا سکتا' یہ چیز ناممکن ہے' یہ فریب ہے۔ اب اگر آپ ایک قسم کے جذبات کو' کسی طرح سے دبائیں گے' مٹائیں گے تو اس سے Perversion (بدنہادی) پیدا ہو جائے گی' وہ جذبات نکلنے کے لیے کوئی دوسرا رخ اختیار کر لیں گے اور وہ Un-Natural (غیر فطری) رخ ہوگا۔ کیا ہی خوب کہا گیا ہے کہ

پری رو تابِ مستوری ندارند

جن کے دل میں نمود کا جذبہ ہوتا ہے تُو انہیں چھپا کر بھی رکھے تو بھی یہ چھپتے نہیں ہیں

چوں در بندی زِ روزن سر برآرند

---

❶ کہ جناب! یہ کمرہ آپ کے لیے ڈرائنگ روم ہے' یہ کمرہ آپ کے لیے ڈائننگ روم (کھانے کا کمرہ) ہے' یہ کمرہ آپ کا سونے والا ہے۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ میرا نیند سے بیدار ہونے والا کونسا کمرہ ہوگا؟ وہ سردار جی نے مکان کے اندر غسل کرنے کا حوض بنانا تھا جی! وہ تین حوض بنے تھے' دو پانی سے بھرے تھے اور ایک خالی تھا۔ انہوں نے انجینئر صاحب سے پوچھا کہ یہ کس لیے ہے؟ سردار جی کو بتا رہے ہیں کہ یہ جو ہے یہ اس لیے ہے کہ جب سردار جی کا ٹھنڈے پانی سے نہانے کو دل چاہے تو اس میں نہائیں۔ سردار جی نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ (انجینئر صاحب نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ) یہ جو ہے یہ اس لیے ہے کہ جب سردار جی کا گرم پانی سے نہانے کو دل چاہے تو اس میں نہائیں۔ (سردار جی) کہنے لگے کہ یہ تیسرا کس کام کا؟ (انہیں بتایا کہ) یہ خالی ہے اس لیے کہ جب نہانے کو دل نہ چاہے۔ تو یہاں تشریف رکھو۔

❷ اس کے بعد یقیناً سر درد نہیں ہوگا۔

دروازہ بند کیجیے تو روشن دان سے منہ نکال لیتے ہیں۔انسانی جذبات کی تو یہ کیفیت ہے۔ جسے آپ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے جذبات کو فنا کرلیا ہے‘ نفس کشی کرلی ہے‘ یہ فریبِ نفس ہے۔جیسا میں نے کہا ہے کہ سائیکولوجی جاننے والے یہ جانتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ انسان ان کو مٹادے۔ایک طرف سے آپ انہیں مٹائیں گے‘ آپ نے فریب کھایا‘ وہ دوسری طرف سے رخ نکال لیں گے۔اور جب یہ دوسری طرف سے رخ نکالتے ہیں تو اسے Perversion (بدنہادی) کہتے ہیں۔یاد رکھیے! یہ بدنہادی ہوتی ہے۔یہ ساری قباحتیں اس طرح سے آتی ہیں کہ آپ کے ہاں‘ ان جذبات کے لیے صحیح میدان تو دیتے نہیں ہیں‘ ان جذبات کو دبانے کے لیے صرف وعظ نصیحت کرتے رہتے ہیں۔یہ ساری Perversion (بدنہادی) اس سے ہوتی ہے کہ پھر آدمی نگاہیں بھر کر نہیں دیکھتا‘ کن اکھیوں سے دیکھتا ہے۔اور اسی سے قوم میں منافقت آجاتی ہے۔

برادرانِ عزیز! قرآن جذبات کو دباتا نہیں ہے‘ ان کی تسکین کے لیے دوسرا میدان تجویز کرتا ہے۔یہاں یہ کہا ہے کہ آگے بڑھنا ہے تو تکاثر کی طرف کیوں جاتے ہو؟ تـکاثر کیوں چاہتے ہو؟ **فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ** (2:148) چلو‘ بڑھو‘ ایک دوسرے سے آگے اس بات میں بڑھو کہ تم دوسروں سے نوعِ انسانی کی ہمدردی کے لیے‘ نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے‘ دوسروں کی غم خواری کے لیے‘ کتنا آگے بڑھتے ہو بڑھو۔تم نے یہ جذبہ ہی پورا کرنا ہے۔اس انداز میں قرآن یہ بات کہتا ہے۔ایک دوسری جگہ کہا ہے کہ **اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا لَعِبٌ وَّلَهۡوٌ وَزِيۡنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيۡنَكُمۡ وَتَكَاثُرٌ فِى الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَوۡلَادِ** (57:20)۔محض اس دنیا کی زندگی کی ان چیزوں کو مقصود بالذات بنالو تو اس کا انجام ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کسی نے کسی تھیٹر کے کھیل کے تماشے کی زندگی کا نصب العین بنالیا ہو۔ان کی حیثیت ٹھیک ہے کہ زینت ہوئی‘ یہ چیزیں وجہِ جاذبیت ہوتی ہیں‘ یہ **تَفَاخُرٌۢ بَيۡنَكُمۡ** (57:20) ہیں یعنی ان سے ایک دوسرے کے مقابلے میں وجہِ فخر ہوتا ہے۔کیا آپ کو پتہ ہے کہ عربی زبان میں فخر کس کو کہتے ہیں؟ فخر کہتے ہیں کہ ”مینہہ دا ہوانہ تے ہووے ایہڈا اوڈاتے دودھ دیوے ایناں کو جناں ❶“ عرب اس کو فخر کہتے ہیں۔یہ بڑی عجیب چیز تھی: اندر سے ہو وہ کھوکھلا‘ اور باہر سے بنا ہوا ہو بہت بڑا۔

کیا بات ہے! عزیزانِ من! یہ آپ کو جتنی اضافی چیزیں دنیا کے اندر ملتی ہیں‘ یہ کتنے بڑے بینک بیلنسز (Balances) ہوجائیں‘ کتنے بڑے کارخانے کے مالک ہوجائیں‘ اندر کتنے ہی مکانات اور کوٹھیاں ہوں اگر یہ سب کچھ Solid (ٹھوس‘ مستحکم) نہیں ہے تو ساری چیز‘ جتنی بھی ہے‘ یہ تفاخر ہوگئیں۔کہتا ہے کہ اس موٹے ہونے کے اندر دوسرے سے بڑھنا چاہتے ہو‘ یہ ٹھیک ہے‘ بڑھتے چلے جاؤ۔سوال تو یہ ہے کہ اندر Solid (ٹھوس‘ مستحکم) کتنا ہے؟ **وَتَكَاثُرٌ فِى الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَوۡلَادِ** (57:20)۔یہاں پھر وہی تکاثر کا لفظ

---

❶ بھینس کا ”ہوانہ“ لیوا تو بڑا ہو مگر دودھ تھوڑا سا دے۔ (”ہوانہ“ وہ مقام جہاں سے گائے‘ بھینس‘ بکری وغیرہ کے پستان (تھن) نکلتے ہیں)۔

آ گیا۔ یہ ایک دوسرے سے بڑھنے کی چیز ہے۔ کہتا ہے کہ یہ جو چیز ہے مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (57:20) یہ ساری چیزیں جتنی بھی ہیں' اگر انہیں مقصود بالذات بنالو گے تو یہ ایک قسم کے فریب کی' ایک ایسی قوت ایسی عزت' ہوگی جو فریب کی بنیادوں کے اوپر قائم ہوگی۔ چلیے! یہاں کچھ نظر آ گیا کہ صاحب! یہاں شاید یہ رہبانیت ہے جس کی طرف لا رہا ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ قرآن نے خود کہا ہے کہ ہم نے تمہارے لیے ان کو وجہ ٔ زینت بنایا ہے۔ دوسری جگہ یہ ہے کہ وہ کون ہیں جو خدا کی ان چیزوں کو جو اس نے وجہ ٔ زینت بنائی ہیں' حرام قرار دے۔ یعنی یہ دوسری طرف ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ مقصود بالذات نہیں ہے۔ اگلی ہی آیت میں بات صاف کردی کہ سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ (57:21) آگے بڑھنا ہے تو خدا کی حفاظت کے اندر اس جنت کی طرف آگے بڑھو۔

عزیزانِ من! سنیے اور وجد میں آجایئے کہ کیا کہہ گیا ہے قرآن! تکاثر کے لیے' تفاخر کے لیے' مسابقت کے لیے' ایک میدان کی ضرورت ہوتی ہے' ایک ریس کورس ہوتا ہے جس میں آپ آگے بڑھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس آگے بڑھنے کے لیے اور کچھ نہیں تو قبر تو ایک حد ہے' اس کی وسعت تو پھر بھی محدود ہے۔ کہتا ہے کہ آؤ تمہیں میں بتاؤں ایک ایسا میدان جس کی کیفیت کیا ہے؟ عزیزانِ من! دیکھیے کہاں یہ لفظ آئے ہیں؟ آگے بڑھنا ہے تو جنت کی زندگی کی طرف آگے بڑھو۔ ذہن میں آیا کہ وہ بھی تو وہاں پہنچے کوئی مقام ہے تو وہ بھی تو پھر محدود ہوگئی۔ سنیے صاحب! کہا کہ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (57:21) اس کی وسعتیں اس ساری کائنات کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ ہر میدان محدود رہے گا جس میں تم جانا چاہو۔ ہم ایسا میدان بتاتے ہیں' چلو اس کے اندر' دوڑ' نکلو ایک دوسرے سے آگے۔ اور یہ نہیں ہوگا کہ پہنچ کر کہے کہ صاحب! اس کے بعد تو آگے میدان ہی ختم ہوگیا۔ یہ میدان وہ ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جنت کے متعلق یہاں کیا بات کہہ گیا ہے!

تکاثر اور تفاخر میں ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ تھا۔ یہ بھی نہیں ہے کہ یہاں پہنچ کر آگے کہیں جا کر یہ حد ختم ہوجائے گی۔ یہ وہ جنت ہے' جس کی وسعتیں ارض اور سما کے اوپر چھائی ہوئی ہیں۔ آگے بڑھنا ہے تو اس میں آکر آگے بڑھو۔ دوسری جگہ (83:26) ہے جنت کی تفصیلات جزئیات اوپر سے چلی آرہی ہیں۔ اور یہ سارا کچھ کہنے کے لیے کہا ہے کہ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ (83:19) جن کے بلند مدارج ہیں' جو اوپر کی طرف چڑھنے والے ہیں' تمہیں کیا پتہ ہے کہ وہ کہاں پہنچنے والے ہیں! کیا چیزیں حاصل ہونگی! کہا کہ وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (83:26) جو اپنے ان جذبات کی تسکین چاہتے ہیں کہ ہم دوسروں سے آگے بڑھیں تو وہ اس میدان کے اندر آگے بڑھنے کے لیے اپنے جذبات کی تسکین کریں۔ انہیں کہا ہے کہ اگر تم نے آگے بڑھنا ہے تو یہاں آگے بڑھو' اور یوں اپنے ان جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرو۔

قدرت کی طرف سے انسانی جذبات ایک بہت بڑی نعمت ہیں' اِن کو تباہ کیا ہی نہیں جا سکتا

عزیزانِ من! قرآن جذبات کشی نہیں سکھاتا' وہ ان کو دباتا نہیں ہے۔ جذبات کشی کے معنی تو ان کے ہاں یہ ہونگے عزیزانِ من! کہ جسے یہ مغزِ دین کہتے ہیں کہ انہیں ہی دبادو' فنا کردو' نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ یہ جذبات تو خدا نے پیدا کیے ہیں۔ وہ پیدا کرتا ہے۔ ہر نیا بچہ جو وہ دنیا میں بھیجتا ہے' اس کے سینے میں جذبات پیدا کرتا ہے۔ اور آپ ان کو ذبح کرنے کے لیے لگے ہوئے ہیں کہ تُو یہ کچھ کرتا چلا جا' ہم یہ کرتے چلے جائیں گے یعنی تُو پیدا کیے چلے جا' ہم انہیں مارتے چلے جائیں گے:

اِدھر آ پیارے' ہنر آزمائیں
تُو تیر آزما' ہم جگر آزمائیں

چل کتھے چلنا ایں' چلو تو کہاں تک چلنا ہے۔

خدا جذبات پیدا کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے انسان کے اندر وہ چیزیں پیدا کی ہیں جو درحقیقت فنا کر دینے کے قابل تھیں (معاذ اللہ) می نہ سزد خدائے را۔ یعنی کسی Creator (خالق) کی Creation (مخلوق) کو ایسا قرار دینا کہ جتنی جلدی ہو سکے اس کو فنا کردو اور اس کے بعد کہنا کہ ہم اس Creator (خالق) کی حمد وثنا کر رہے ہیں' ہم اس کے مقرب بن رہے ہیں۔ فنا کرنا تو ایک طرف رہا' کسی مصور کی تصویر کے متعلق اسے کہہ دیجیے کہ یہ کیا بنایا ہے تم نے؟ پھر دیکھیے آپ اس کے کتنے مقرب بنتے ہیں؟ چہ جائیکہ اس کی تصویر کو لے کر آپ پھاڑ کر چولہے میں جلا دیں اور اس کے بعد یہ کہیں کہ ایسا کرنے سے ہم نے اس مصور کا بہت قرب حاصل کر لیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ بڑا غلط خیال ہے کہ خدا نے انسان کے سینے کے اندر وہ جذبات پیدا کیے ہیں جن کا فنا کرنا مقصودِ زندگی ہے۔ یہ تو خدا کے خلاف انداد ہے' خدا کو چیلنج دینے والی بات ہے' یہ تو اس کی Creation (تخلیق) کو اس طرح نفرت کی نگاہ سے دیکھنا ہے' خدا' خدا کی Creation (تخلیق) سے Condemn (موردالزام) کرنا ہے' یہ غلط ہے۔

قدرت کی طرف سے عطا کردہ کوئی قوت شر پیدا نہیں کرتی: بات ان کے صحیح استعمال کی ہے

یہ تمام کی تمام چیزیں' جتنی بھی ہیں جتنی بھی خدا نے انسان کے اندر صلاحیتیں جذبات دیئے ہیں' یہ قوتیں ہیں جو اس نے عطا کی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم ان کو استعمال کس طرح سے کرتے ہیں؟ یہ ان جذبات کا استعمال ہے جو ان کو خیر اور شر بنا دیتا ہے۔ فی ذاتہٖ کوئی جذبہ' کوئی قوت' کوئی صلاحیت' نہ خیر ہوتی ہے نہ شر ہوتی ہے۔ ان کو خدا کے قوانین کے مطابق استعمال کیجیے تو یہی خیر ہے' اس کی خلاف ورزی کیجیے تو یہی شر ہے۔ تلوار کو ظالم کا ہاتھ روکنے کے لیے استعمال کیجیے تو یہ عینِ جہاد ہے' اسے مظلوم کے سینے میں گھونپ دیجیے تو یہ سب

سے بڑا ظلم ہے۔تلوار بھی وہی ہے آپ کا ہاتھ بھی وہی ہے۔قرآن تلوار کو ٹکڑے نہیں کرتا وہ تلوار کے استعمال کے قاعدے اور قانون بتاتا ہے۔اس لیے یہ کہا کہ اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یَاۡتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا (2:148) یونہی قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کے بعد مطمئن نہ ہو جاؤ کہ فریضۂ خداوندی ادا ہو گیا۔یہ جو کام ہیں' یہ جو نظام ہے جس میں بھلائیاں ہیں' ان میں اختیارات کی وسعتیں زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے۔اس میدان کے اندر آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یَاۡتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (2:148) اگر یہ نصب العین اپنے سامنے رکھ لو گے' دنیا میں جہاں کہیں تمہارا جی چاہے جاؤ' تمہاری جمعیت قائم ہو گی' مرکزیت قائم ہو گی' تم ایک امت بن کر رہو گے۔اور پھر وہی بات ہے کہ ہم نے جو یہ چیز کہہ دی ہے کہ ہر ایک کا اپنا اپنا قبلہ ہے' اس کے اس قبلے کی اہمیت تمہارے دماغ سے نہ نکلے۔

انسان کا قبلہ' نصب العین اور مرکز نگاہ قرآن حکیم متعین کرتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کیا عجیب چیز کہہ رہا ہے! کہا ہے کہ وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡہَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ (2:149)۔یہ پھر وہی بات ہے کہ پھر اس کو بھی یاد رکھ لینا' کہیں یہ نہ سمجھ لینا جو ہم نے یہ کہا ہے کہ ہر ایک کا ایک قبلہ ہوتا ہے' تم کہو کہ پھر کیا بات ہے؟ اِدھر نہ سہی' اُدھر سہی۔تصوف آپ کو یہی سکھاتا ہے:

گنگا ایک گھاٹ بہتیرے
کہت کبیر عقل کے پھیرے

یہ گنگا ہے صاحب! یہاں رام بھی وہی ہے رحیم بھی وہی ہے۔مسجد میں بھی تُو ہے' مندر میں بھی تُو ہے۔یہاں (2:149) میں کہا ہے کہ کہیں یہاں نہ پہنچ جانا۔یہ جو ہم نے کہہ دیا کہ ہر ایک نے اپنا اپنا قبلہ مقرر کیا ہوا ہے' اس کی کچھ اہمیت نہیں' کہیں یہاں نہ پہنچ جانا۔اگر ایک نظام کے تحت ایک امت کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو تمہارا ایک قبلہ' ایک مرکزِ نگاہ' ایک نصب العینِ حیات ہونا چاہیے۔اس لیے کہ وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡہَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ وَ اِنَّہٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ (2:149)۔الحق' یعنی حقیقتِ کبریٰ یہی ہے جو ہم تمہیں بتا رہے ہیں۔یاد رکھو! وَ مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ (2:149) خدا تمہارے اعمال سے بالکل واقف ہے۔وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡہَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ (2:150)۔یہ پھر وہی چیز ہے کہ وحیث ما کنتم (2:150)۔دیکھیے' بار بار یہ ہے۔پہلے ایک امام کو' رسول کو' حکم دیتا ہے' اس کے ساتھ ہی پھر پوری جماعت کو حکم دیتا ہے۔اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ اگر یہ نظام صرف نبی اکرم ﷺ کی ذات تک محدود ہوتا تو پھر ٹھیک ہے' یہ صیغے واحد متکلم کے

ہونے چاہئیں کہ اے رسول! تیرے لیے یہ چیز ہے' تیرے لیے یہ چیز ہے۔

شخصیتوں سے وابستہ نظام کو دوام حاصل نہیں ہوسکتا

عزیزانِ من! یہاں قرآن نے واحد متکلم کہا ہے اور پھر اس کے بعد فوراً جمع کے صیغے لے آیا ہے کہ پوری قوم کے لیے' پوری امت کے لیے' یہ چیز ہے۔ اور اس کی وضاحت قرآن نے یہ کہہ کر کردی کہ **وما محمد الا رسول** (3:144) محمدؐ بجز این نیست کہ اللہ کے رسول ہیں۔ یہ ٹھیک ہے نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں اس نظام کی مرکزی شخصیت کی حیثیت سے بھی حضور ﷺ کو ایک بڑی بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ جو نظام صرف شخصیتوں سے وابستہ ہوتے ہیں' وہ شخصیتوں کی زندگی تک رہتے ہیں۔ مذہب کی دنیا میں اہمیت شخصیت کو ہوتی ہے' ان کے ہاں آئیڈیالوجی نہیں ہوتی لیکن جو نظام ہے اس میں شخصیت کی اہمیت اتنی ہی ہوتی ہے کہ اتنے وقت کے لیے وہ آپ کا سربراہ یا مرکز ہوتا ہے۔ اشخاص آتے رہیں' اشخاص جاتے رہیں' نظام یعنی آپ کی آئیڈیالوجی اگر قائم ہے' تو وہ اسی طرح سے آپ کا نظام اور سلسلہ آگے چلا جاتا رہے گا۔ یہ کہا کہ اس نظام کے متعلق یہ نہ کہنا کہ یہ نظام صرف محمد ﷺ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ **وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ** (3:144) محمد ﷺ کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ خدا کا ایک پیغامبر ہے۔ پیغام اگر دے گیا ہے تو پیغام لانے والا نہ بھی درمیان میں رہے تو کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ بھی تو پیغام دینے کے لیے ہی آیا تھا۔ **وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ** (3:144) اس سے پہلے بھی پیغامبر آتے رہے' پیغام پہنچاتے رہے' نظام قائم کرتے رہے' پھر چلے جاتے رہے اور **اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ** (3:144) اگر کل کو یہ مرجائے یا قتل کردیا جائے تو تم یہ سمجھ کر کہ صاحب! جس شخصیت کے سہارے یہ نظام قائم تھا' وہ تو اب نہیں رہی' اس لیے چلو اپنی اسی پہلی انارکی کی حیثیت کے اوپر' جو پہلے ہماری زندگی تھی تو کیا تم یہ کرو گے؟ اور سنو! کہ **وَ مَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْهِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْئًا** (3:144) جو یہ کرے گا اور یہ سمجھے گا' وہ اپنا ہی نقصان کرے گا' خدا کا اس میں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ **وَسَیَجْزِی اللّٰهُ الشّٰکِرِیْنَ** (3:144) اور جو اس کے مطابق چلتے رہیں گے' ان کے اعمال کے نتائج سامنے آتے جائیں گے۔ برادرانِ عزیز! یہ ایک دوسری بات ہے۔

آخر قبلے کی اس قدر اہمیت کیوں؟

میں کہہ یہ رہا تھا کہ نظام کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ بتا دیا کہ یہ آئیڈیالوجی کی بنیادوں کے اوپر' اس پیغام کے اوپر ہے' جو خدا نے رسول کی وساطت سے بھیجا تھا۔ رسول کی ذات کے ساتھ یہ نہیں ہے کہ وہاں تک رہے اور رسول درمیان میں نہ رہے تو آپ کا نظام ختم ہو جائے۔ اس لیے جہاں پہلے **خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَکَ** (2:149,150) واحد کے صیغے آئے ہیں' ساتھ ہی کہا ہے کہ **وَ حَیْثُ مَا**

كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ (2:150)۔اب یہاں قرآن دو الفاظ لایا ہے جس سے یہ پتہ چلا کہ پھر قبلے کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے۔ کہا کہ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ (2:150) یاد رکھو! اگر تم نے قبلے کی اہمیت کو سمجھ لیا ہے' اگر تم نے اسے یہ پوزیشن دے دی ہے تو پھر یاد رکھو! دنیا میں کسی شخص کو تمہارے خلاف کوئی اعتراض کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

صدیوں سے ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کا سبب

عزیزانِ من! آج بھی قبلۂ قبلہ ہی ہے ہمارا۔ مراکش سے لے کے انڈونیشیا تک ایک بحرِ ذخار ہے' ایسا جغرافیائی بیلٹ ہے جو دنیا میں کسی قوم کو نصیب نہیں ہے۔ یہ جغرافیائی پوزیشن بھی کسی قوم کے حصے میں نہیں آئی۔ اور پھر یہ کہ یہاں سے لے کر وہاں تک ہر مسلمان قبلے ہی کی طرف رخ کر رہا ہے۔ اگر مقصود صرف نماز میں قبلے کی طرف منہ کرنا ہوتا تو وہ فریضہ تو ہم پورا کر رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا' جو ہم تمہیں کہہ رہے ہیں' کہ دنیا میں کسی شخص کو تمہارے خلاف کوئی اعتراض کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ ایسی قوم ایسا نظام ہے کہ کسی کو اعتراض کی گنجائش ہی نہ رہے۔ اور وہی قوم ہے' وہی ان کا قبلہ ہے' اسی طرف ہم رخ کر رہے ہیں مگر صد افسوس کہ کیفیت یہ ہے کہ

سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

کوئی شعبہ اور گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے اوپر اعتراض نہ کیا جا سکے۔ غیر تو ایک طرف رہے' صبح سے شام تک دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں تو مرثیہ پڑھتے ہیں۔ غیروں کے لیے مقامِ تنقید یا اعتراض کی گنجائش تو میں نے کہا ایک طرف رہی' ہماری اپنوں کی' یہ کیفیت ہے کہ صبح سے شام تک تنقید اور اعتراض سے ہمیں فرصت نہیں ملتی۔ بات واضح ہوگئی کہ مقصود اگر نمازوں میں ایک طرف رخ کرنا ہوتا اور بس تو یہ تو آج بھی یہ قوم کر رہی ہے' اس سے تو یہ نتیجہ نکل رہا کہ تمہارا کوئی عمل انسانوں کی نگاہوں میں قابلِ اعتراض نہ ہو۔ یہ نتیجہ تو نہیں نتیجہ نکل رہا تو پھر کیا بات ہوئی؟ معاذ اللہ کیا خدا کا وعدہ جھوٹا ہے؟ یہ تو ہو نہیں سکتا' وہ تو سچا ہے۔ تو بات یہی ہوئی جو وہ بار بار کہتا تھا کہ کہیں نماز میں اپنا اُدھر رخ کر لینا مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔ اسے اپنے نظام کا مرکزِ محسوس سمجھنا: ایک امت' ایک نظام اور اس کا ایک نصب العین۔ ہمارے ہاں یہ ہوا کہ اس کی جو محسوس شکل تھی' وہ تو ہم نے اسی طرح باقی رکھی مگر اس کا مقصود' اس کے جو معنی تھے' وہ ہم نے ختم کر دیئے۔

قرآن حکیم کے ایک لفظ کی روح کو مفلوج اور محدود کرنے کا نتیجہ

برادران عزیز! جب دین مذہب میں تبدیل ہوتا ہے تو ہوتا ہی یہ ہے۔ دین کے تمام ارکان' اس کے اعتقادات کے الفاظ' وہ سارے اسی شکل میں باقی رہتے ہیں لیکن اس کی روح' اس کا مقصود مطلوب' نصب العین' وہ باقی نہیں رہتا' وہ بدل جاتا ہے۔ اب یہ جتنی

چیزیں' اس شکل میں' آپ کے سامنے آتی ہیں' یہ جو فارم ہوتی ہیں' ان کی پرستش شروع ہو جاتی ہے' مقصود باقی نہیں رہتا۔ پھر جب اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تو اس کے لیے یہ عقیدہ وضع کیا جاتا ہے کہ یہ دنیا دارالعمل ہے' دارالجزا اگلی دنیا ہے۔ یعنی یہاں ہمیں کرتے ہی رہنا ہے' اس کا نتیجہ آگے چل کر نکلے گا۔ یہ بہت بڑا فریب ہے۔ آپ کسی وقت ٹیسٹ ہی نہیں کر سکتے کہ صحیح عمل ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا۔ اگر یہ چیز ہو کہ یہاں بھی نتیجہ نکلنا ہے اور ''بھی'' پہ میں نے زور اس لیے دیا ہے کہ یہ نہ کہہ لیجیے گا کہ وہ غلط ہے لیکن یہ کہ اس کا نتیجہ یہاں بھی نکلنا ہے۔ اگر یہ چیز ہو تو پھر ہم ہر وقت دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری نمازیں' ہمارے روزے' ہمارے حج وہ نتائج پیدا کر رہے ہیں جو قرآن نے کہا تھا؟ اگر نہیں کر رہے تو پھر ہمیں کھڑے ہو کر سوچنا پڑتا تھا کہ کہیں نہ کہیں تو ہم سے غلطی ہو گئی ہے کہ وہ نتیجہ پیدا نہیں ہو رہا۔ کوئی مشین آپ چلائیں' کوئی کارخانہ آپ چلائیں' کسی قسم کی کوئی ایسی چیز کریں گے تو وہ اپنا نتیجہ آپ کے سامنے دے۔ وہ اگر چل رہی ہو' نتیجہ نہ نکل رہا ہو تو آپ اس کو کبھی اسی طرح نہیں چلاتے رہتے۔ کھڑے ہو کر سوچتے ہیں کہ بھئی! اس میں کہیں کوئی نقص آ گیا ہے' کہیں کوئی بنیادی غلطی ہے۔ یہ سارا کچھ' یہ حرکت تو اسی قسم کی ہو رہی ہے مثلاً کولر چل رہا ہے' کمرہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا۔ پھر کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے بعد آپ صبح اٹھیں اور کولر چلاتے چلے جائیں۔ ''اے ٹھنڈا نئیں ہوندا' کولر تے چلدا اے ناپیا؟ اوئے ٹھنڈک نئیں پہنچدی۔ مرن دے بعد تینوں ٹھنڈ پہنچے گی۔ کولر ایتھے چلدا اے ٹھنڈ اوتھے پہنچے گی۔ اوراوہدے متعلق سیدھی جئی گل کہ آ جگ مٹھا اوکن ڈٹھا❶''۔

دین جب بھی مذہب میں بدلتا جائے تو اس کا پھر یہی نتیجہ نکلتا ہے

نہیں' میرے عزیزو! دین میں یہ نہیں ہوتا' مذہب میں یہ فریب ہوتا ہے۔ دین اپنے Pragmatic Test (استنتاجی امتحان) کے یہاں نتائج مرتب کرتا ہے۔ دیکھتے ہیں تعینِ قبلہ کا نتیجہ! **لِـئَلَّا یَـكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ** (2:150)۔ عزیزانِ من! یہ بڑی عظیم چیز ہے کہ ایسی قوم ہو جس کے کسی عمل کے خلاف کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ ہو۔ اور یہی قوم تھی جس کو یہ حق تھا کہ **لِّتَـكُـوْنُـوْا شُهَـدَآءَ عَـلَـى النَّاسِ** (2:143) تم نوعِ انسانی کے تمام اعمال کی نگرانی کر سکو۔ نگرانِ اعمال وہی ہو سکتا ہے جس کے اپنے عمل کے اندر اعتراض کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ جس کے اپنے عمل میں اعتراض وتنقید کی گنجائش ہے' وہ دوسرے کے اعمال کی نگرانی کیا کرے گا۔ غیر تو ایک طرف رہے' باپ بیٹے کے اعمال کی نگرانی نہیں کرتا اگر اس کے عمل کے اندر نقص موجود ہو۔ اس نظام کا نتیجہ یہ ہونا تھا کہ **لِـــئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ**(2:150)۔ یہ بڑی عظیم چیز ہے۔ جنہوں نے اسے قبلہ بنایا تھا' جنہوں نے اسے اس نظام کا مرکز قائم

---

❶ یہ کمرہ ٹھنڈا نہیں ہوتا' کیا کولر تو چل رہا ہے؟ ارے بھائی! ٹھنڈک نہیں پہنچ رہی۔ مرنے کے بعد تجھے ٹھنڈک پہنچے گی۔ کولر یہاں چل رہا ہے' ٹھنڈک اس جہاں میں پہنچے گی۔ اس کے متعلق تو سیدھی سی بات ہے کہ یہ دنیا بڑی پر لطف ہے' وہ کس نے دیکھی!

کیا تھا' آج بھی ہم سے نہیں غیروں کے ہاں جو اس دور کی تاریخ موجود ہے' اس میں آپ دیکھ لیجیے گا کہ ان کی کسی روش کے اوپر کہیں انگلی رکھنے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ اور پھر انہیں یہ حق حاصل تھا کہ وہ پھر ایران کے کسریٰ کو بھی لکھتے اور بازنطین کے قیصر کو بھی یہ لکھتے کہ یاد رکھ کسریٰ! تیرے کسانوں کے اوپر جو زمینداروں کی طرف سے ظلم ہو رہا ہے' اگر تم نے اس کو نہ روکا تو اس جرم کی سزا تجھے بھگتنی پڑے گی۔ وہ مقابل میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے ہاں کے کسانوں سے ہمدردی کرنے والو! اپنے ہاں کے کسانوں کو تو دیکھو' تمہارے ہاں کیا ہو گیا ہے؟ پہلے انہوں نے ان کسانوں سے ہمدردی کر کے' ان کے دکھوں کو مٹایا تھا' پھر ان سے یہ بات کہی تھی۔ **لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ** (2:150) تا کہ دنیا میں کسی کو گنجائش نہ ہو تمہارے خلاف اعتراض کرنے کی۔

کاش ہماری نگاہِ بصیرت قرآن حکیم کے عطا کردہ نور سے منور ہو چکی ہوتی

عزیزانِ من! یہ ہے تعینِ قبلہ! کہتا ہے یہ الگ بات ہے کہ **اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ** (2:150) جو اپنی روش ہی ظلم کی اختیار کریں' وہ تو ٹھیک ہے' کہہ سکیں گے کہ صاحب! یہ کیا بات ہوئی کہ دوسروں کی خاطر سب کچھ کرتے چلے جاؤ اور یہ کرتے چلے جاؤ۔ کہنے لگے کہ یہ ان کی بات نہیں ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! یہاں استثنا کیسے کیا ہے ورنہ یہ ہو سکتا تھا کہ صاحب! دیکھیے! وہ اعتراض کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جو Capitalistic System (نظامِ سرمایہ داری) والا ہے' وہ آپ کے اس سسٹم پر اعتراض کرے گا جس میں آپ کہتے ہیں کہ ہر ایک کی ضروریات پوری ہونی چاہئیں۔ فیوڈل سسٹم والا' جاگیرداری وزمینداری نظام والا' اس پر تنقید کرے گا' اعتراض کرے گا' مخالفت کرے گا کہ تم ان زمینوں کو کس طرح سے عوام کے اندر بانٹتے چلے جاتے ہو۔ کہا کہ **اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ** (2:150) وہ ظلم کرنے والے اعتراض کریں گے۔ عزیزانِ من! جس نظام پہ ظلم کرنے والا اعتراض کرے آپ سمجھ لیجیے کہ وہ نظام کتنا مبنی بر عدل اور انصاف ہو سکتا ہے؟ سوال یہ پیدا ہوا کہ صاحب! جب یہ ظلم کرنے والے مخالفت کریں گے' یہ اعتراض کریں گے تو ان کا تو بڑا ہجوم ہے' دنیا میں انہی لوگوں کی اکثریت ہے یہ تو بڑے ڈر کی بات ہے۔ اس پہ کہا کہ **فَلَا تَخْشَوْهُمْ** (2:150) ان سے قطعاً ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ جس جتھے کی' جس گروہ کی' جس قوت کی' بنیاد ظلم پر ہے' عدل اور انصاف کرنے والا بھلا ان سے کیوں ڈرے؟

یہ بڑی عجیب چیز کہی ہے صاحب! کہ انصاف کرنے والے کو ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اور یہ بھی نہیں ہے کہ پھر کسی چیز کا بھی خوف نہ رہے۔ کہا کہ **وَاخْشَوْنِيْ** (2:150) صرف اس سے ڈرو کہ تم سے میرے قوانین کی کہیں خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ ڈرو اس سے کہ تم بے انصافی نہ کرو۔ انصاف کرتے ہوئے بے انصافوں سے ڈرنے کی بات ہی کچھ نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا

نتیجہ کیا ہوگا؟ ہر نماز میں دعائیں مانگتے ہو کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ o صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (6-2:5)اس متوازن راستے کی طرف رہنمائی عطا فرما جن پہ تم نے نعمتیں فرمائیں۔ کہا کہ یہ کچھ کرو جو میں کہتا ہوں تو وَ لِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ (2:150)اس طرح سے اتمامِ نعمت ہو جائے گا' ساری آسائشیں اور نعمتیں تمہیں مل جائیں گی۔ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (2:150) یہ کرو گے تو پھر تم ہدایت کے راستے پر ہو گے یاد رکھو! اب دیکھ لیا وہ جو دعا مانگی جاتی ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (2:5) کی۔ وہ یہ نہیں ہے کہ آپ نے کھڑے ہو کر وہ دعا مانگ لی اور اس کے بعد سمجھ لیا کہ ہم صحیح راستے پر ہیں۔

عزیزانِ من! صحیح راستہ تو وہ ہوتا ہے جو منزل تک پہنچائے۔ اور جو منزل ہی آپ کے سامنے نہ ہو تو آپ کیا کہہ سکتے ہیں کہ راستہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ اس کے لیے ایک امت' ایک نظام کا یہ عملی پروگرام دیا۔ نظام وہ ہے جس میں خدا کے قوانین کے توڑنے سے کچھ ڈر پیدا ہو۔ عدل و انصاف پر مبنی اس قسم کا نظام ہے کہ جس میں سوائے ظالمین کے کسی شخص کو اعتراض کی گنجائش نہ ہو۔ کہا کہ یہ کرو گے تو پھر سمجھا جائے گا کہ تم صراطِ مستقیم پہ جا رہے ہو۔ یہ ہے وہ صراطِ مستقیم جس کی دعا مانگتے ہو۔

وحی کا علم مادّیت کے علم کے برابر نہیں ہو سکتا

عزیزانِ من! یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے کہا کہ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَ يُزَكِّيكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (2:151) جس کے لیے ہم نے تمہارے پاس رسول بھیجا ہے۔ وہ تمہیں قانونِ خداوندی کی تعلیم دیتا ہے' تمہیں یہ بتاتا ہے کہ ان قوانین کے اتباع سے نتائج کیا نکلیں گے۔ حکمت کے یہ معنی The Why of it ہوتے ہیں کہ ایسا کیوں کیا جائے۔ اور یہ ایک لفظ نے بتا دیا۔ آگے کہا کہ يُزَكِّيكُمْ (2:151) تمہاری تمام کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچاتا ہے' تمہیں یہ علم دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ تمہیں کن چیزوں کا علم دیتا ہے؟ علم تو رسول کے بغیر بھی دنیا حاصل کر رہی ہے یہ علم Scientific Discoveries (سائنسی انکشافات) ہیں' عام علومِ انسانی کے لیے تو وحی کی ضرورت نہیں ہے' اس کے لیے تو کسی رسول کی ضرورت نہیں ہے۔ کہا کہ اس کے علاوہ ایسی بھی چیزیں ہو سکتی ہیں جن کا علم انسان اس طرح سے حاصل نہ کر سکے۔ وحی کے ذریعے سے وہ چیزیں دیتا ہے کہ يُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (2:151) جن کا علم یوں حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ یعنی یہ مستقل اقدار ہیں جنہیں آپ Values کہتے ہیں جنہیں آپ کہتے ہیں کہ ان کا تعلق انسان کی ذات سے ہے' اس کی نشو و نما سے ہے۔ کہا کہ تم یہ چیزیں یوں نہیں معلوم کر سکتے تھے' اس مقصد کے لیے رسول تمہارے پاس آیا ہے۔

قرآن حکیم کی پوری تعلیم ''ذکر'' کے لفظ میں سمٹا دی گئی ہے جس کو تصوف نے بدل کر رکھ دیا

عزیزانِ من! اس کے بعد آخر میں قرآن ایک بڑی چیز کہہ گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

تفصیلِ معنیٔ غمِ الفت طویل ہے
اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے
ان ہجر کے ماروں کا اتنا سا فسانہ ہے
سمٹے تو مرا دل ہے پھیلے تو زمانہ ہے

''سمٹے تو میرا دل ہے' پھیلے تو زمانہ ہے''۔ پھیلایا جائے تو پورا قرآن ہے' سمٹایا جائے تو دو الفاظ ہیں۔ اور وہ الفاظ کیا ہیں؟ کہا کہ فَاذْكُرُونِيٓ اَذْكُرْكُمْ (2:152)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ تم میرا ذکر کرو' میں تمہارا ذکر کروں گا۔ ''پھر اور ذکر کیا ہے؟ یہی ھوحق ھو حق''، حجروں کے اندر سارے اکٹھے ہوئے ہیں اور اس کے بعد پھر قلب پر جو ضربیں لگ رہی ہیں۔ میں اس پہ یوں تنقید نہیں کرتا۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن کے ان الفاظ کو سامنے رکھیے۔ کہا ہے کہ فَاذْكُرُونِيٓ (2:152) تم میرا ذکر کرو۔ ان کے ہاں وہ یہ ہوا کہ بیٹھو اور قلب پہ ضربیں لگاؤ اور ھو اور ھو کرو۔ آگے ہے کہ اَذْكُرْكُمْ (2:152) میں تمہارا ذکر کرونگا' 'یعنی ایتھے ھوحق اے کرے گا او تھے ھوحق او کرن ڈیا ہے ❶''۔

برادرانِ عزیز! یہ لفظ وہی ہے' اس میں تو ہنسی کی بات نہیں ہے' میں تو قرآن کے الفاظ کہہ رہا ہوں۔ کیا کبھی ہم نے کھڑے ہو کر سوچا ہے کہ ہم یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ فَاذْكُرُونِيٓ اَذْكُرْكُمْ (2:152) انہی لفظوں میں کہا ہے' وہیں کہا ہے۔ ذکر اگر یہ ہے' تو پھر تو دوسرے لفظوں میں خدا نے کہا ہے کہ میں یہ کرونگا۔ اگر یہ ذکر ہے تو وہ تمہارا ذکر کر رہا ہوگا۔ کیا یہی چیز ہو سکتی ہے؟ مصیبت یہ ہے کہ عربی کے یہ الفاظ تھے' قرآن کی یہ اصطلاحیں تھیں' ہم نے ان کا مفہوم اپنی زبان میں لے لیا۔ ہم نے تصوف میں آ کر ذکر کا ایک مفہوم وضع کیا' اب قرآن میں جہاں ذکر آتا ہے اس کا ترجمہ ہم نے اس کی رو سے کیا' قرآن کی رو سے نہیں کیا تو اس تصوف نے اس کے معنی و مفہوم کو بدل کر رکھ دیا۔

عربی زبان کے تحت ذکر کا مفہوم ''خدا کے دیئے گئے نظامِ زندگی کو بلند کرنا ہے''

عزیزانِ من! عربی زبان کی رو سے' عربوں کے محاورے کی رو سے' قرآن میں استعمال کی رو سے' ذکر کے معنی ''شرفِ انسانیت''

---

❶ یعنی یہاں اس دنیا میں ''ھوحق'' یہ کرے گا اور وہاں وہ کر رہا ہے۔

ہے۔ اب خدا کا شرف بلند کرنا' یا جسے خدا نے فَکَبِّرۡ کہا ہے' جسے کہتے ہیں کہ میری بڑائی کرو' (معاذ اللہ) خدا تو شرف کے بلند ترین مقام پہ ہے' ساری دنیا کا شرف اسے حاصل ہے۔ جسے آپ بڑائی کہتے ہیں ساری کبریائی اس کے لیے ہے۔ وہ یہ کیا کہتا ہے کہ میری بڑائی اور بلندی کرو؟ یہ کیا چیز ہے؟ یہ کیا اعلان ہے جسے آپ اللہ اکبر کہتے ہیں؟ وہ یہ ہے کہ خدا کے نظام کو دنیا کے اندر غالب اور بڑا کرو۔ یہ ہے **فَاذۡكُرُوۡنِیۡۤ** (2:152) اس نظام کو وجہِ شرفِ انسانیت بناؤ۔

اب مذہب میں تو یہ ہوتا ہے کہ ہم خدا کے یہ جو حقوق ہیں' وہ پورا کرتے چلے جاتے ہیں' اس سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یعنی نماز پڑھی' یہ کیا ہے جی؟ یہ حقوق اللہ ہیں۔ گویا کچھ خدا کے بھی حقوق ہیں۔ یہ کردیا' جیسے کسی افسر کا ایک حکم آئے' ہمارا اس سے کوئی تعلق نہ ہو اور ہم اس کو سرانجام دیں۔ وہ ہمیں کہے کہ یہ چٹھی فلاں تک پہنچا دو' ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ چٹھی میں کیا لکھا ہے' کیوں پہنچائی گئی ہے' مقصد کیا تھا؟ یہ تعمیل ہوئی۔ ہم تو احکام کی یوں تعمیل کررہے ہیں۔ اسی طرح سے اگر یہ ہو کہ ہمارے نظام کو یہاں کبریائی اور شرف کا موجب بنا' تا کہ دنیا کی نگاہیں اس کے احترام کے اندر جھک جائیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ **واذکرکم** (2:152) تمہارا شرف بلند ہو جائے گا۔ ''اے کوئی ساہڈا کام نئیں جیہڑا تسی کرن ڈیے ہو❶'' یہ تمہارے اپنے شرف کے بلند کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ ہے **فَاذۡكُرُوۡنِیۡۤ اَذۡكُرۡكُمۡ** (2:152)۔

عزیزانِ من! یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ (معاذ اللہ معاذ اللہ) قرآن کو ہاتھ میں لے کر اپنی طرف سے کچھ کہنا تو شرک ہے۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ عربی زبان کا قرآن ہے' عربی زبان میں اس چیز کی سند ہونی چاہیے جو میں کہتا ہوں۔ میرا ''لغات القرآن'' اٹھا کر دیکھیے' عربی زبان کے جو مستند لغت ہیں' جو محاورۂ عرب ہے' اس کی سندیں دے کر میں نے وہاں بتایا ہے کہ ذکر کے معنی عربوں کے ہاں ''شرف' احترام' مجد'' ہوتا ہے۔ اور دوسری اس کی سند یہ ہے کہ قرآن کے اندر یہ چیز کیسے دی گئی ہے' کیسے اس کا استعمال ہوا ہے؟ خود قرآن کریم کے متعلق ہے کہ **لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكُمۡ كِتٰبًا** (21:10) ہم نے تمہاری طرف یہ ایک کتاب نازل کی ہے۔ **فِیۡهِ ذِكۡرُكُمۡ** (21:10) یہ ہمارا نہیں' اس میں یہ تمہارے ہی ''شرف'' کا راز پوشیدہ ہے۔ **اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ** (21:10) ''او تہاڈی مت ماری گئی ذرا سمجھ دے نال کم لو❷''۔ یہ تو تمہارا ہی شرف ہے جس کے لیے ہم نے دیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ **وَاِنَّهٗ لَذِكۡرٌ لَّكَ وَلِقَوۡمِكَ** (43:44) اس قرآن کے اندر' اے رسول! تیرا ''ذکر'' ہے اور تیری قوم ''کا'' ''ذکر'' ہے۔ تیرے لیے' تیری قوم کے لیے' اس کے اندر ''شرف'' پوشیدہ ہے' عزت احترام کی چیزیں پوشیدہ ہیں' تیرے لیے بھی اور یہ قوم جو تیرا اتباع کرے گی' ان کے لیے بھی۔ کہتا ہے کہ

---

❶ یہ کوئی ہمارا کام نہیں ہے جو تم کررہے ہو۔ (یہ تمہارا اپنا ہی ہے)۔

❷ ارے بھئی! تمہاری مت ماری گئی ہے' ذرا سمجھ بوجھ سے کام لو۔

اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِـهَةً (21:24) یہ ایک خدا کے سامنے جھکنے کی بجائے اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے خدا' اپنے ذہنوں کے تراشیدہ معبود کے سامنے جھکتے ہیں۔

اب آپ دیکھ لیجیے کہ شرفِ انسانیت کو کہاں ٹھیس لگ رہی ہے؟ اور کیا چیز ہے جو قرآن شرفِ انسانیت بتا رہا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ یہ یاد رکھو! یہ لوگ اس ایک آستاں کو چھوڑ کر دنیا میں اور انسانوں کے آستانوں پر جھکتے چلے جاتے ہیں۔ قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ (21:24) کہتا ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل لاؤ کہ کیا یہ کسی انسان کے لیے وجۂ شرف ہے کہ وہ دوسرے انسان کے سامنے جھکے؟ یا اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی مورتیوں کے سامنے جھکے؟ یا فطرت کی قوتوں میں سے کسی قوت کے سامنے جھکے' اسے دیوی دیوتا بنائے۔ لَوۡ كَانَ فِيۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ (21:22) کائنات میں اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کے لیے ہے۔ اگر اس کے سوا کسی دوسرے کا ہوتا تو فساد ہی فساد برپا ہوتا۔ کہتا ہے کہ یہ عقیدے کی بات نہیں ہے' ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا اس کے لیے کوئی عقلی دلیل ہوسکتی ہے کہ یہ کرو؟ کہا کہ اس کے مقابلے میں ہم جو تمہیں کہتے ہیں کہ صرف ایک خدا کا قانون ہے جس کے سامنے جھکنا ہے' کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کے سامنے جھکنا نہیں ہے۔ یہ کیا ہے؟ کہا کہ هٰذَا ذِكۡرُ مَنۡ مَّعِىَ وَ ذِكۡرُ مَنۡ قَبۡلِىۡ (21:24) یہ چیز تھی باعثِ شرف ان کے لیے ہے جنہوں نے پہلے اسے اختیار کیا اور تمہارے لیے بھی ہے اگر تم بھی یہ مسلک اختیار کرلو۔

عزیزانِ من! شرفِ انسانیت توحید میں ہے۔ شرک کو اس لیے قرآن نے ظلمِ عظیم کہا ہے کہ اس میں شرفِ انسانیت سے انکار ہوتا ہے' کسی دوسرے کے سامنے جھکنا تذلیلِ انسانیت ہے انسان کے لیے۔ کہا کہ اس میں تمہارے لیے شرف ہے کہ کسی اور کے سامنے نہ جھکو۔ هٰذَا ذِكۡرُ مَنۡ مَّعِىَ وَ ذِكۡرُ مَنۡ قَبۡلِىۡ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (21:24) تم الحق اور حقیقتیں ان کے سامنے لاتے ہو لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں سے اکثریت اس بات کو علم کے ذریعے سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی۔

انسان کا اپنے جذبات کے تحت عمل کرنا' سب سے بڑا شرک ہے

برادرانِ عزیز! دوسری جگہ تو بڑی دلچسپ چیز کہی کہ وَلَوِ اتَّبَعَ الۡحَـقُّ اَهۡوَآءَهُمۡ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهِنَّ (23:71) کہتا ہے یہ جو چیز کہہ رہے ہیں کہ انسان اپنی ہی خواہشات کو اپنا معبود بنالے' اپنے ہی جذبات کے پیچھے چلنا شروع کردے تو اس سے بڑا شرک ہی اور کوئی نہیں ہے۔ کہا کہ سوچو تو سہی کہ اگر اس کائنات کا جو خدا ہے' وہ انسانوں کی خواہشات اور آرزوؤں کے پیچھے چلنا شروع کردے تو سارا سلسلہ تہس نہس ہوکر رہ جائے۔ ''جیہڑا دووجے سوندا اے افیم کھان توں بعد' او کدی چاہے گا کہ پنج

و جے سورج نکلے ❶؟''۔اور چمگادڑ تو یہ چاہے گا ہی نہیں کہ کبھی بھی سورج نکلے۔کہتا ہے کہ اگر الحق لوگوں کی آرزوؤں کے پیچھے چلنا شروع کر دے تو فساد ہی فساد برپا ہو جائے۔اس لیے اور معبود تو ایک طرف رہا' اپنے جذبات کو بدلگام کر کے' ان کے پیچھے نہ چلو' اس سے بھی شرفِ انسانیت قائم نہیں رہے گا۔کہا ہے کہ **بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ** (23:71) لیکن کیا کیا جائے' ہم بار بار ان کے شرف اور احترام کی چیزیں ان کے پاس لا رہے ہیں اور دیکھو **فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ** (23:71) ان کی مت ماری گئی' اپنے ہی ''شرف'' سے اعراض برتتے چلے جا رہے ہیں۔کیا بات ہے! فوراً ہی کہا کہ **فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ** (23:71)۔ذکر کے معنی اگر کسی کی باتیں کرنا ہو' کسی کی یاد دلانا ہو' تو اس سے کوئی اعراض نہیں برتتا بلکہ اس کو تو وہ پسند کرتا ہے کہ

''ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے' جو اس محفل میں ہے''۔

اس سے تو کوئی اعراض نہیں برتتا۔یہ کیا کہا ہے قرآن نے؟ وہ یہ چیز ہے کہ ہم اس کی عزت' اس کے شرف' اس کے مجد' اس کے احترام' کا راستہ بتاتے ہیں اور ان کو دیکھیے کہ یہ اسی سے اعراض برت رہے ہیں۔دیکھیے! ان کی عقل کہاں چلی گئی۔کہا ہے کہ **فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ** (2:152) تم میرے اس نظام کو جس کا مرکز یہ قبلہ ہے' دنیا کے اندر وجہ' شرف اور احترام بناؤ' دنیا کی نگاہیں اس نظام کے سامنے جھکیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نظام کے سامنے تو کیا تمہارے سامنے لوگوں کی نگاہیں جھکیں گی' تمہیں شرف حاصل ہو جائے گا۔یہ سارا کچھ ہم نے اس لیے کیا ہے۔

عزیزانِ من! اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ **وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ** (2:152) جتنی یہ نعمتیں میں نے تمہیں دی ہیں' میرے بتائے ہوئے طریق کے مطابق ان کو صرف کرو گے تو بھرپور نتائج نکلیں گے اور اگر تم نے ان کو دبا کر' چھپا کر' ڈھانپ کر' لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کر کے' اپنی ہی ذات لیے رکھ لیا تو یہ کفر ہوگا' پھر یہ چیز یوں نہیں ہو سکتی۔یہ شرف یوں نہیں حاصل ہو سکتا' یوں حاصل ہو سکتا ہے۔''شکر'' آپ کو معلوم ہے' اس انداز کو کہتے ہیں کہ ''بکری کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہوں' وہ بغیر دوہنے کے چلتی جائے اور ان میں سے دودھ ٹپک رہا ہو''۔آپ کو معلوم ہے جنت کے کنویں کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ وہاں تمہیں کنواں کھود کر پانی نہیں نکالنا پڑے گا' پانی ابھر کر اوپر آ جائے گا۔اسے شکر کہتے ہیں۔ہماری نعمتیں یوں رکھو۔آگے کہا کہ **وَلَا تَكْفُرُوْنِ** (2:152) کفر نہ برتو۔کفر کے معنی ہوتا ہے ''ڈھانپ کر' چھپا کر' کسی چیز کو رکھنا''۔کہا کہ یہ نہ کرو۔اب کہا یہ ہے کہ **اشْكُرُوْا** تمہیں جو ایسی عظیم نعمت دی ہے اس کی قدر کرو۔ایسا کرو گے تو **اَذْكُرْكُمْ** میں تمہارا شرف بڑھاتا جاؤں گا' دنیا کے اندر تمہارا احترام بڑھاتا جاؤں گا۔

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ البقرۃ کی آیت 152 تک آ گئے اور قبلے سے متعلق جو قرآن نے بحث شروع کی تھی' یہاں تک سرِ دست

---

❶ جو افیون کھانے کے بعد 2 بجے سوتا ہے کیا وہ چاہے گا کہ سورج 5 بجے طلوع ہو؟

اس کو ختم کیا‘ اب آگے یہ بات آئی کہ پھر یہ نظام وجۂ شرف کس طرح سے بنتا ہے‘ اس میں تمہیں کیا کچھ کرنا ہوگا؟ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ اس تعینِ قبلہ کے ساتھ‘ پورے ارکان کے ساتھ نماز پڑھ لی تو یہ فریضہ ادا ہوا۔ اگلی آیات میں یہ دیکھیے گا کہ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے کرنا کیا کچھ پڑتا ہے:

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

یہ میں اگلی آیتوں میں لوں گا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

بتیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)' (آیات 153 تا156)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿153﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿154﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿155﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿156﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1969ء کی 2 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 153 سے ہو رہا ہے: (2:153)۔

قبلے کا تعین کرنا قرآنی نظامِ حیات کا تعین کرنا ہے

جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا' سابقہ آیات میں تعینِ قبلہ کے متعلق بات ہو رہی تھی۔ یہ سوال ایسا اہم تھا کہ قرآنِ کریم نے اسے اچھی خاصی تفصیل سے طے کیا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ تعینِ قبلہ سے مقصود اگر اتنا ہی ہوتا کہ تم اپنی نمازوں میں اس طرف رخ کر لیا کرو' تو یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ جس پر غیر مسلموں کو کوئی اعتراض ہوتا۔ اس پر تو کبھی بھی کسی کو اعتراض نہیں ہوا۔ اور جیسا کہ قرآن نے خود بتا دیا تھا کہ ہر قوم نے اپنے لیے کوئی نہ کوئی قبلہ تجویز کر ہی رکھا ہے۔ صرف یہ جو اتنی سی چیز ہے کہ آپ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیا کریں' یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ جس کے لیے اتنی تفصیل اور کاوش سے کسی کو کہنے کی ضرورت پیش آتی۔ تعینِ قبلہ درحقیقت ایک نئی آئیڈیالوجی اور ایک نئی پارٹی کی تفصیل کا اعلان تھا۔ یہ ایک ایسے نظام کا اعلان تھا' ایک ایسی پارٹی کی تفصیل کا اعلان تھا جو باقی دنیا سے بالکل الگ تھی۔ یہ حنیفاً یعنی ایک خاص مرکز کو' اپنے سامنے رکھ کر' اس کی طرف جانے والی چیز تھی اور ہے۔ باقی سب سے کٹ کر' ایک متعین مقصدِ حیات اپنے سامنے رکھ کر' اور اس مقصد کے حصول کے لیے اپنے آپ کو وقف کر کے اس کی طرف جانے والی ایک چیز تھی اور ہے۔ قبلہ' اس نئی آئیڈیالوجی' اس جدید مرکز' اس نظام' اس امت کا شعار تھا' ایک سمبل تھا۔ اور مخالفین اسے جانتے تھے کہ تعینِ قبلہ سے مراد

جس کے لیے یہ کہا گیا کہ اس کعبہ کا تمہارے لیے بطور قبلہ تعین کر دیا گیا ہے' وہ بھی یہ جانتے تھے کہ اس کے صرف نماز میں اس طرف رخ کرنے کے معنی نہیں ہیں' یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ اب پوری دنیا سے ٹکراؤ ہونے والا ہے۔

آپ دیکھیے کہ بات تعینِ قبلہ کی ہو رہی ہے' اور اس میں فوراً اس کے بعد کہا گیا ہے کہ **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ** (2:153) تمہارے سامنے بہت بڑی مہم ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کس انداز سے قرآن خود بات واضح کر جاتا ہے۔ تعینِ قبلہ کے اندر اتنی بڑی مہم کونسی آ گئی تھی؟ کہا کہ بہت بڑی مہم تمہارے سامنے درپیش ہے' اس میں تو اپنی تمام قوتوں کو تمہیں مجتمع کرنا ہوگا۔ اور اس کے لیے تمہیں بڑی اعانت کی ضرورت ہوگی۔ تم اعانت طلب کرو۔ آپ نے سورۃ الفاتحہ کے پہلے الفاظ دیکھے تھے جن میں کہا تھا کہ **اِیَّاکَ نَعْبُدُ** (2:4)۔ جب یہ کہا تو اس کے ساتھ' اسی سانس میں کہنا پڑا کہ **اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ** (2:4)۔ گویا یہ **نَعْبُدُ** (2:4) ایک ایسی چیز تھی جس کے بعد کہیں بہت بڑی مدد طلب کرنے کی ضرورت پڑ گئی ورنہ اگر یہ **نَعْبُدُ** پرستش ہوتی' پوجا پاٹ ہوتی' محض آج مذہب کی اصطلاح میں نماز ہوتی' دین کی صلوٰۃ نہیں کہہ رہا' اس کے لیے کسی کی اتنی بڑی مدد مانگنے کی ضرورت نہ پیش آتی۔ یہ جو ایاک (2:4) تھا یہ تو تھی توحید یعنی صرف ایک۔ اور **نَعْبُدُ** (2:4) تھا' محکومیت اختیار کرنا۔ صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں اور دنیا میں کسی کو ہم اپنا حاکم تصور نہیں کرتے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ کتنا بڑا اعلان تھا اور اس کے لیے پھر مدد کی کتنی بڑی ضرورت تھی۔ اس لیے ساتھ ہی " **نستعین** " (2:4) آیا۔ بعینہٖ یہاں جب تعینِ قبلہ آیا ہے تو اس کے لیے بتایا گیا کہ **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ** (2:153) اعانت طلب کرو' ضرورت پڑے گی تمہیں اس چیز کی۔ کیا کرو؟ کیا بیٹھ کر دعائیں مانگتے رہا کرو؟ آپ دیکھتے ہیں کہ اعانت طلب کرنے کے لیے پہلی چیز **بِالصَّبْرِ** (2:153) کہی۔ ہمارا آج کا مفہوم اگر لیا جائے تو سیدھی سی بات ہے کہ صبر اور صلوٰۃ سے اعانت طلب کرو کہ جب کوئی مشکل پیش آئے" تے اوہدے تے صبر شکر کر لیا کرو کہ یا اللہ! آج میرا اے کم ہو یا تے سو نفل پڑھاں گا نہ ہویا تے صبر کر چھڈیا[1] "

قرآن حکیم کو اپنی اپنی زبان میں پڑھنے کی بجائے قرآن کی زبان میں اس کا مطالعہ کریں: صلوٰۃ و استعانت کی ایک مثال

عزیزانِ من! اپنی زبان میں قرآن نہ پڑھیے' قرآن قرآن کی زبان میں پڑھیے۔ کہا ہے کہ استعانت طلب کرو۔ کس چیز سے طلب کرو' کہا کہ صبر سے' استقامت سے' استقلال سے' ثابت قدمی سے۔ دیکھتے ہیں کتنی بڑی مہم آ رہی ہے! یہ ہے ضرورت۔ اور پھر دوسری چیز صلوٰۃ ہے۔ اس کے لیے کوئی اور راستے تجویز نہ کرو۔ یہ جو تمہیں بتایا ہے کہ قوانینِ خداوندی کے پیچھے سرپٹ چلے جاؤ۔ یہی راہ ہے جس

---

[1] اس پہ صبر شکر کر لیا کرو کہ یا اللہ! آج میرا یہ کام ہو جائے تو میں سو نفل ادا کروں گا' اگر نہ ہوا تو صبر کر لیا۔

کے اوپر چلتے جاؤ اور استقامت سے چلتے جاؤ۔ بڑی مدد ملے گی' ملائکہ کا نزول ہوگا۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30) جنہوں نے یہ کہہ دیا کہ ہمارا رب صرف خدا ہے' اس کے سوا دنیا کے اندر کوئی اور نشوونما دینے والا' اَن داتا نہیں ہے۔ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30) پھر اس پر جم کر کھڑے ہوگئے۔ دیکھا یہ اتنی سی بات یوں کہنے کی! اس کے لیے جم کر کھڑا ہونا کیا معنی؟ ہزار ہزار دانے کی تسبیح ہم نے رکھی ہوئی ہوتی ہے اس کے اوپر ربنا اللہ ربنا اللہ ربنا اللہ گنتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں کہا کہ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا جم کر کھڑے ہوگئے' اپنے اس اعلان کے اوپر کہ رزق صرف اس نظام کے ہاتھ میں ہونا چاہیے' کسی اور نظام کے ہاتھ میں نہیں ہونا چاہیے۔ پھر اس پر جم کر کھڑے ہوگئے تو کیا ہوگیا؟ اس کے لیے کہا کہ تتنزل علیهم الملئكة (41:30) ان کے اوپر ملائکہ کا نزول شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ہے جسے استعانت کہا ہے' اعانت کہا ہے۔ یوں صبر اور صلٰوۃ سے اعانت ملتی ہے۔ اس نظام کا اتباع کرتے چلے جاؤ این و آں سے بے خبر' بے گانہ ہو کر اور استقامت سے اس کے اوپر چلتے چلے جاؤ۔ اور یہ اتنی بڑی چیز تھی کہ جس کے لیے کہا کہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ (2:153) خدا کی معیت چاہتے ہو' چاہتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ ہو تو اپنے ان عزائم کے اوپر مستقل مزاجی کے ساتھ جم کر کھڑے ہو جاؤ' اللہ ساتھ ہو جائے گا۔ مقام دیکھیے کونسا آ رہا ہے! غور فرمایئے تعینِ قبلہ کا موضوع ہے اور اس میں یہ صبر اور صلٰوۃ کی چیز آ رہی ہے۔ یہ کچھ اپنے مکان کے کمرے کے گوشے میں بیٹھ کر مصلے پہ نہیں ہے۔

زندگی سانس لینے کا نام نہیں بلکہ ہر آن سر بکف رہنے کا نام ہے

آگے کہا کہ وَ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ یُّقۡتَلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتٌ (2:154) اس راستے کے اندر یونہی بیٹھے ہوئے تسبیح پھیرنے کی بات نہیں ہوگی۔ یہ تو میدانِ جنگ ہوگا۔ اور اس میدان کے اندر جو سر بکف اور کفن بدوش نکل آئے' اگر وہ وہاں جان دے دیتا ہے تو اس جان دینے والے کے متعلق یہ نہ کہو کہ مر گیا' اسے موت آ گئی' اس کے متعلق یہ نہ کہو۔ بَلۡ اَحۡیَآءٌ وَّ لٰکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ (2:154) یہ ان کے لیے ہے جو زندگی کو نفس شماری سمجھتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ سانس آنے کا نام زندگی ہے' تمہیں کیا پتہ ہے کہ تمہاری دانست میں' تمہاری میڈیکل رپورٹ کے ماتحت' جسے تم مردہ کہتے ہو' زندہ تو وہی ہے' مردہ تو تم ہو۔ وَّ لٰکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ (2:154) بات یہ ہے کہ اگر خالص Intellectually (عقلی طور پر) اپنے شعور کی موجودہ سطح پر' اس بات کو سمجھنا چاہو' تو بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کے لیے ذرا گہرا جانا پڑے گا کہ ایک بلند مقصد کے حصول کے لیے جان دینے کے اندر کس طرح سے زندگی مضمر ہوتی ہے۔ رازِ حیات ہی یہ ہے۔ جو مرنا نہیں جانتا اسے پتہ نہیں ہے کہ زندگی ہوتی کیا ہے؟ یہ جو مرگ ہوتی ہے' یہ حیاتِ باشرف ہوتی ہے۔ یہاں وَّلٰکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ (2:154) کہہ کر قرآن نے کیا بات کہہ دی ہے؟ کہ زندہ تو یہی ہیں درحقیقت۔

قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں لفظ شہید کا مفہوم اور ہمارے ہاں پایا جانے والا تصور

عزیزانِ من! یہاں سے ایک بڑا اہم سوال سامنے آتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ یہ ایک موقع سامنے آ گیا ہے' آیت سامنے آ گئی ہے' اسے ذرا وضاحت سے بیان کر دوں۔ یہ جو خدا کی راہ میں قتل ہو جانے والے ہیں' انہیں ہمارے ہاں اصطلاح میں شہید کہا جاتا ہے۔ یہ اس معنی میں قرآنِ کریم کی اصطلاح نہیں ہے۔ اور اسے شہادت کہا جاتا ہے۔ جہاں سے یہ صحیح اصطلاح ہوئی تھی' بات بہت بڑی تھی جو کسی نے کہہ دی۔ یہ درحقیقت اپنے ایمان کی جان دے کر خدا پر یقین کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ یہ کتنی بڑی گواہی ہے' کتنی بڑی تصدیق ہے کہ ہم جو کہتے تھے! آپ کو میں نے قرآن کی آیت بتائی تھی کہ مسلمان ہونے کے لیے یہ نہیں ہے کہ ہم نے **اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ** پڑھ لیا' مسلمان ہو گئے۔ یہ ایک عہد نامہ ہے' یہ ایک اقرار نامہ ہے' جس پہ دستخط کرنے پڑتے ہیں' یہ معاہدہ ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ** (9:111) یہ جو معاہدہ ہے' اس پہ دستخط کرنے پڑتے ہیں کہ میں نے اپنے مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھوں بیچ دی ہے۔ یہ تو معاہدہ ہو گیا۔ اب اس کی شہادت کیا ہے؟ اس کی گواہی کیا ہے؟ اس کی تصدیق کس طرح سے ہوتی ہے؟ یہ ہوتی ہے میدانِ جنگ میں جان دے دینے سے۔ اس لیے اس کو جب کسی نے شہادت کہا تھا تو اس معنی میں بات کی تھی۔ بہرحال میں کہہ رہا تھا کہ انہیں شہید کہا جاتا ہے۔ اور شہداء کے متعلق ہمارے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ وہ اسی دنیا میں زندہ رہتے ہیں' مرتے نہیں ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔

برادرانِ عزیز! اس میں پہلی چیز تو یہ لیجیے کہ یہاں موت سے مراد یہ طبعی موت (Physical Death, Disintegration of Physical Body) ہے' اسے موت کہہ لیجیے۔ اس دنیا کے اندر زندہ رہنا' صرف Physical Body (طبعی جسم) کے ساتھ ممکن ہے۔ یہ طبعی زندگی ہی ہے جسے آپ کہتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں زندہ رہتا ہے۔ اب زندہ رہنا اس معنی میں لے لیجیے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ شہدا مرتے نہیں' اسی دنیا میں رہتے ہیں' البتہ ہمیں نظر نہیں آتے' وہ زندہ ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ خیال قرآن کی رو سے صحیح نہیں ہے۔ جہاں تک اس دنیا میں طبعی طور پر مر جانے کا تعلق ہے قرآن حتمی طور پر یہ کہتا ہے کہ **کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ** (3:185) یہ جو ہر ذی حیات' ہر متنفس ہے' اسے موت کا مزا چکھنا ہے۔ لہٰذا یہ سوال ہی نہیں ہے کہ اس دنیا میں کوئی حیاتِ ابدی حاصل کر سکتا ہے۔ یہاں تو ہر ایک کو مرنا ہے حتیٰ کہ وہ ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ جو شرفِ انسانیت کے معراجِ کبریٰ پر فائز تھیں' آپ ﷺ کے متعلق قرآنِ کریم میں خدا نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ **اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّہُمۡ مَّیِّتُوۡنَ** (39:31) ان لوگوں نے بھی مر جانا ہے تمہارے مخالفین نے' تم نے بھی مر جانا ہے۔ موت سے تو اتنی جلیل القدر ہستی ﷺ بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ اور قرآن کے کئی مقامات ہیں

جہاں نبی اکرم ﷺ کو کہا گیا ہے کہ **وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ** (3:144) محمد بجز ایں نیست کہ خدا کا ایک پیامبر ہے۔ اس سے پیشتر اس قسم کے پیامبر آئے چلے گئے۔ کیا کل کو اگر یہ مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم کہو گے کہ وہ نظام تو شخصیتوں کے ساتھ وابستہ تھا' نظام ختم ہو گیا' تم پھر اپنے نظامِ کہن کے اوپر چلے جاؤ گے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ خود حضور ﷺ کے متعلق قرآنِ کریم میں بھی یہ بات ہے کہ موت آپ ﷺ کو بھی آئے گی۔ میں بات یہ کہہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم کی رو سے اس صفحۂ ارض پر جس کو ہم زندگی کہتے ہیں اور جسے ہم موت کہتے ہیں' موت ہر ایک کو آئے گی' ان معنی میں کوئی بھی یہاں زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا یہ جو چیز ہے کہ کوئی متنفس ہو' اسے ہم شہید ہی کیوں نہ کہیں' وہ بظاہر ہماری نظروں میں مر جاتا ہے' بباطن اسی دنیا کے اوپر زندہ رہتا ہے' یہ تصور قرآن کے ان حقائق کے خلاف ہے۔ قرآن ہر ایک کے لیے کہتا ہے کہ ان کو موت آنی ہے۔ اب اگلی چیز یہ ہے کہ شہید مرنے کے بعد زندہ ہوتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ وہ شہدا کے لیے ہی ہو' وہ کسی خاص کیٹگری (شق) کے لیے ہو' کسی خاص گروہ کے لیے ہو۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک ''زندگی اور زندگی میں'' ایک بنیادی فرق ہے

قرآنِ کریم تو یہ بتاتا ہے کہ موت کے بعد کی زندگی ہر ذی شعور انسان کے لیے ہے' ہر ایک کے لیے ہے۔ کہا ہے کہ **كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا** (2:28) تم خدا کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟ تمہیں زندگی میسر نہیں تھی' مردہ تھے **فَاَحْيَاكُمْ** (2:28) اس نے تمہیں زندگی دی **ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ** (2:28) پھر وہ تمہیں مار دے گا' تمہیں موت آ جائے گی **ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ** (2:28) پھر وہ تمہیں زندگی عطا کرے گا۔ یہ تو تمام انسانوں کے لیے ہے۔ یہ بھی جو چیز ہوئی کہ یہاں خاص طور پہ کہا گیا ہے کہ انہیں مردہ نہ کہو' یہ زندہ ہیں تو میں نے کہا کہ یہ جو چیز ہے کہ یہ اسی دنیا میں زندہ ہیں' یہ تو قرآنِ کریم کی ان آیات کے خلاف بات گئی۔ اس لیے یہاں زندہ نہیں ہیں۔ مرنے کے بعد یہی زندہ ہیں یا اور کوئی زندہ نہیں ہے یہ چیز بھی غلط ہے۔ قرآنِ کریم تو مرنے کے بعد زندگی ان سب کے لیے بتاتا ہے۔ پھر یہ فرق کیا ہے؟ فرق وہی زندگی اور زندگی کے تصور میں ہے۔ مرنے کے بعد زندگی تو ہر ایک کے لیے ہے۔ آیئے دیکھیں کہ قرآن زندگی اور زندگی میں کیا فرق بتاتا ہے؟ ایک زندگی اہلِ جہنم کی زندگی ہے۔ اس زندگی کے متعلق کہا' یہ بڑے غور سے سننے والے الفاظ ہیں' کہ **لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى** (20:74) اس میں نہ وہ مردہ ہوں گے' نہ وہ زندہ ہوں گے۔ بات اگر طبعی زندگی کی ہو تو اس میں تو آپ متعین طور پہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ زندہ ہے' یہ مردہ ہے لیکن ایک زندگی اس نے ایسی بتائی ہے کہ نہ وہ موت ہوگی' نہ وہ حیات ہوگی۔ موت تو اس لیے نہیں ہوگی کہ طبعی طور پر زندہ رہنے کے لیے جو کچھ بھی آپ معیار مقرر کرتے ہیں اس اعتبار سے تو وہ زندہ ہے۔ (لیکن یہ حیاتِ بے شرف ہے)۔

قرآن حیاتِ باشرف کوزندگی کا نام دیتا ہے اور حیات بے شرف کو موت

برادران عزیز! قرآن کی رو سے زندگی تو حیاتِ باشرف کا نام ہے' حیاتِ بے شرف کو وہ موت کہتا ہے۔ اس لیے وہ یہ کہتا ہے کہ وہاں لَا یَمُوْتُ فِیْھَا (20:74) یوں موت تو نہیں آئے گی۔ اور اس لیے قرآن کے دوسرے مقامات میں ہے کہ اہلِ جہنم بار بار چیخیں گے کہ اے کاش! ہمیں کسی طرح سے موت آجائے۔ لہٰذا کہا ہے کہ وہاں موت تو نہیں ہوگی۔ ذہن میں آ گیا کہ پھر تو ان کو زندگی میسر ہوگی' ساتھ ہی کہا کہ وَ لَا یَحْیٰی (20:74) لیکن جسے زندگی کہا جاتا ہے وہ بھی ان کو نصیب نہیں ہوگی' اُن کے متعلق کہا کہ بل احیاءٌ (2:154) وہ ہیں جن کو زندگی نصیب ہوگی۔ دوسرے مقام پہ اس کی اور وضاحت کی ہے۔ یہاں اہلِ جہنم کے متعلق کہا ہے۔ یہاں الفاظ اور بھی زیادہ معنی خیز ہو گئے بلکہ میں کہوں گا کہ جو اس کے سامنے تصور یا نقشہ کھینچا گیا ہے' وہ بڑا ہی Graphic (گرافیائی) ہو گیا ہے۔ کہا یہ ہے کہ وَ یَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ (14:17) وہ بار بار کہیں گے کہ اے کاش! ہمیں موت ہی آجائے' موت ان کی طرف چاروں طرف سے آئے گی اس کے باوجود وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ (14:17) وہ مریں گے نہیں۔ جہنم میں موت کیسے آئے گی اور اس کے باوجود مریں گے نہیں' یہ تو وہاں جا کر دیکھنے کی بات ہے لیکن برادرانِ عزیز! اس دنیا کے اندر محکوم اور ذلیل قومیں' جو دوسروں کے سہارے پہ جیتی ہیں' ہر آن ہر طرف سے موت ان کی طرف آتی ہے۔ ڈری ہوئی' سہمی ہوئی ہیں' پتا کھڑ کا جان نکل گئی۔ کہیں کسی پریزیڈنٹ کا الیکشن ہو رہا ہے ساری قومیں گوش بر آواز ہو رہی ہیں کہ کونسی پارٹی In Power (اقتدار) میں آ رہی ہے' یہ قومیں بدک رہی ہیں' سہمی ہوئی ہیں' موت آتی دکھائی دے رہی ہے۔ ان کے درمیان اعلانِ جنگ ہو رہا ہے' یہاں کپکپی طاری ہو رہی ہے۔ فلاں نے ایٹم بم کا ایک Explosion (دھماکا) کیا ہوا ہے' یہاں گردش آ گئی ہے۔ کیا بات ہے قرآنِ کریم کی! کہا کہ یَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ (14:17) محکوم پہ تو ہر آن' ہر طرف سے موت آتی چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد مصیبت یہ ہے کہ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ (14:17) یہ کم بخت مرتا بھی تو نہیں ہے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کیا باتیں کہہ جاتا ہے! ہر طرف سے موت آ رہی ہے مگر مرتا نہیں ہے۔ مرتا بھی نہیں اور زندگی بھی نصیب نہیں ہو رہی۔ یہاں تو اس کی جھلک ہے جو میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ حیاتِ بے شرف کی یہ زندگی آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ زندگی کیا زندگی ہے؟ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اسے موت بھی تو نہیں کہا جا سکتا۔ مردم شماری کے رجسٹر کے اندر دیکھو تو کروڑوں تک پہنچتے ہیں۔ اب ہمارے سامنے یہ حقیقت آ گئی کہ ایک زندگی اہلِ جہنم کی زندگی ہے کہ جسے آپ زندگی کہہ نہیں سکتے' موت وہ ہوتی نہیں۔ موت آتی ہے چاروں طرف سے' مرتے نہیں ہیں لیکن زندوں میں شمار بھی نہیں ہو سکتے۔ اور ایک زندگی اس کے مقابلے میں اہلِ جنت کی زندگی بتائی

ہے۔ان کے لیے کہا کہ ان کی زندگی یہ ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (3:170) کسی قسم کا نہ کسی بیرونی خطرے کا ان کو ڈر ہوگا' نہ اندرونی قلب کی افسردگی ہوگی۔ یہ زندگی وہ ہے جس میں يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ (3:171) نعمائے خداوندی کی انہیں بشارتیں اور خوش خبریاں ہر طرف سے ملیں گی اور اس کے فضل ورحمت کی۔ کہا کہ ایک زندگی یہ زندگی ہے۔ اور یہ ہے وہ زندگی جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہا ہے کہ بل احیآء (2:154) یہ زندہ ہیں' انہیں کوئی مردہ نہیں کہہ سکتا۔

کچھ ذکر مقتولین فی سبیل اللہ کے مقامِ بلند کا اور انکی جدوجہد کا

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جو مقتولینِ فی سبیل اللہ ہوئے یعنی خدا کے راستے میں قتل ہو جانے والے' یہ چیز انہی کے لیے کہی گئی ہے لیکن اگر ایسی صورت ہو کہ کسی کے لیے یہ موقع ہی نہ آئے' وہ قرآن کے نظام کے لیے عمر بھر جدوجہد کرتے رہیں' اپنے آپ کو وقف کیے ہوئے ہوں' جان و مال کو بیچے ہوئے ہوں ہتھیلی پہ سر رکھ کر پھر رہے ہوں لیکن ضروری تو نہیں کہ مقتولِ فی سبیل اللہ ہو جائیں۔ جنگ ہی نہیں ہوئی یا جنگ کے اندر گئے فاتح اور منصور آ گئے' غالب ہو کر آ گئے' وہاں قتل نہیں ہوئے' وہاں شہید نہیں ہوئے تو کیا یہ پھر اس درجے سے' ان مدارج سے' محروم رہ گئے؟ اور یہاں بات آیا کرتی ہے خود نبی اکرم ﷺ کی کہ حضور ﷺ تو شہید نہیں ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کی جماعت میں سے' آپ ﷺ کے ساتھیوں میں سے' صحابہؓ میں سے' تو بہت سے ان جنگوں میں شہید ہوئے۔ تو اگر یہ جو ایک سوال ہے' اسے آپ صرف اس کے لیے مختص کر دیتے ہیں جو میدانِ جنگ میں قتل ہو جائے تو اس سے تو پھر رسول اللہ ﷺ بھی محروم رہ گئے (معاذ اللہ)۔

ہمارے ہاں عجیب عجیب بحثیں چلتی ہیں۔ پہلے ایک مفروضہ قائم کیا جاتا ہے پھر اس کے اوپر دیکھتے ہیں کہ کس قسم کے اعتراضات پڑتے ہیں' کشیدگیاں ہوتی ہیں' پھر ان کا حل شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں بڑا پیچیدہ مسئلہ بنا ہوا ہے کہ شہید کا مقام بڑا ہے یا نبی کا مقام بڑا ہے؟ بات ساری یہی ہے کہ خود ہی ہم مفروضات کو تراشتے ہیں اور پھر اپنے ذہن سے ان کو حل کرتے ہیں۔ خدا کی کتاب سے بات دیکھی جائے تو نہ مشکل پیدا ہوتی ہے' پیدا ہونے کے بعد نہ وہ مشکل رہتی ہے۔ اور پھر رسول اللہ ﷺ کو شہادت کا درجہ دینے کے لیے' میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا' کہ پھر کیا کیا اور کیا کیا عقائد اس کے لیے وضع کیے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ اپنے ذہن ہی کی ایک پیدا کردہ مشکل ہے۔ قرآن سے پوچھ لیتے تو قرآن تو بات صاف کر دیتا کہ ایک مردِ مومن' جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے' خدا کی راہ میں جان دینے کے لیے' جان ہتھیلی پہ لے کر' پھرتا ہے۔ زندگی بھر وہ یہ کچھ کرتا ہے Opportunity (موقع) بھی آتی ہے' اس قسم کی جنگ بھی ہوتی ہے' تو اس میں فاتح منصور واپس آ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم ان گوشوں کو بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں رکھتا۔ اوپر سے میدانِ جنگ کا نقشہ

چلا آ رہا ہے۔ کہا ہے کہ وَ لَئِنۡ قُتِلۡتُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَوۡ مُتُّمۡ لَمَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَحۡمَۃٌ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ (3:157) جو اس طرح سے اس نظام کے لیے جان دینے کے لیے مستعد پھر رہا ہے وہ قتل ہو جائے یا طبعی موت مر جائے' اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کے لیے اللہ کے ہاں سے مغفرت اور رحمت اور یہ جو ساری چیزیں ہیں یہ یکساں طور پہ ملیں گی ورنہ آپ دیکھیے کہ وہ تو محض ایک Opportunity (موقع) ہے۔

جیسے ہمارے سابقہ جنگ میں ❶ یہ چیز ہوئی تھی۔ ٹھیک ہے میدانِ جنگ میں جنہوں نے شجاعت کا ثبوت دیا' بہادری کا ثبوت دیا' جانیں بھی انہوں نے دیں' ان کو بڑے بڑے ایوارڈ ملے' ٹھیک ہے وہ مستحق ہے لیکن انہی میں سے اگر کسی کو انہوں نے جی ایچ کیو میں یا پیچھے کیمپ کے اندر رکھا ہوا تھا' وہ بھی اسی طرح سے سپاہی تھا' ویسے ہی جان دینے کے لیے آمادہ تھا' وہ وہاں تڑپ رہا تھا' لیکن اس کو ایسی ڈیوٹی Assign (دی) کی گئی کہ دشمن کی گولی وہاں تک آئی نہیں یا میدانِ جنگ کے اندر سترہ دن تک لڑتے لڑتے بھی جو بچ کر واپس آ گئے اور میدان جنگ سے جو فاتح منصور واپس آنا ہے' اس کی تو پہلے تلقین کی جاتی ہے۔ جان دینا تو آخری حالت کی بات وہاں ہوتی ہے۔ جو وہاں سے بچ کر واپس آ گئے ہیں' انہیں بھی کم دادِ شجاعت نہیں دی' ان کا بھی حق تھا کہ ان کے لیے بھی اس کو Recognze (تسلیم) کیا جاتا ہے۔ آج یہ سوال ہمارے سامنے آیا ہے' قرآن کے سامنے یہ سوال تھا۔ دیکھیے! کس انداز سے اس نے یہ کہا ہے کہ یہ کوئی بات نہیں ہے کہ صرف جو وہاں جان دینے والے تھے' انہی کے متعلق تم کہو کہ وہ ان انعاماتِ خداوندی کے مستحق ٹھہرے جو بچ کر چلے آئے وہ یہ نہیں بلکہ دوسری جگہ تو اور بھی بات کہہ دی۔ کہا کہ فَلۡیُقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یَشۡرُوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا بِالۡاٰخِرَۃِ (4:74)۔ کیا کہوں! آیت کو میں ایک خاص پوائنٹ کے لیے سامنے لاتا ہوں اس میں اور ایسی چیزیں آ جاتی ہیں جن کو چھوڑ کر آگے نہیں جایا جا سکتا۔ آپ نے دیکھا ہے کہ یہاں کن لوگوں کے خلاف جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے؟ ان کے لیے جنگ کرنا جو اس دنیا کے مفاد کو مستقبل کے مفاد کے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ غور فرمایا جو کہا کرتے ہیں کہ صاحب! کن کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے؟ ادھر آنے نہیں دیتے' ہر ایک کے من میں تو چور ہے۔ یہ جتنے دنیاوی مفاد طلبی کے پیچھے چلے ہوئے' اقدارِ خداوندی کو پسِ پشت ڈالنے والے ہیں' ان سب کے خلاف قرآن جہاد کا حکم دیتا ہے۔ بات دوسری طرف چلی گئی۔

قرآن حکیم نے میدان جنگ میں شہید ہونے والوں اور بچ جانے والوں دونوں کو حیات ابدی کی بشارت دی ہے

برادران عزیز! میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس کے بعد کہا ہے کہ وَ مَنۡ یُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ (4:74) جو اللہ کی راہ میں جنگ کرتا

---

❶ یہ 1965ء کی پاک و ہند جنگ کی طرف اشارہ ہے۔

ہے اَوْ یُقْتَلْ (4:74) یا پھر وہاں وہ مارا جاتا ہے جان دے دیتا ہے اَوْ یَغْلِبْ (4:74) یا غالب اور فاتح بن کر واپس لوٹتا ہے فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا (4:74) دونوں کو اجرِ عظیم ملے گا ورنہ میدانِ جنگ سے فاتح زندہ آنے والا تو مغموم اور افسردہ رہے گا کہ صاحب! وہ حیاتِ ابدی کی بشارتیں تو ان کے لیے ہوگئیں اور ہم کیوں بچ کر آگئے؟ یہ بچ کر آنے والا جو ہے اس کو اس پہ افسوس ہوگا۔ عزیزانِ من! آپ دیکھیے یہ کتابِ عظیم کتنی جامع' کتنی Unique (انوکھی) ہے کہ کوئی ذرا سی بات بھی ذہن کے اندر آپ کے آتی ہے تو اس کے متعلق اس کے اندر آپ کو ہدایت ملتی ہے۔ یہ ایسا پوائنٹ تھا جو ذہن میں پیدا ہوتا کہ صرف یقتل فی سبیل الله کے متعلق کہا گیا ہے کہ جنہوں نے جان دے دی ہے' ان کو مردہ مت کہو' وہ زندہ ہیں' حیاتِ ابدی ملے گی' نعمائے خداوندی ملیں گے۔ تو زندہ آنے والوں کے دلوں کے اندر یہ خیال پیدا ہونا تھا۔ فوراً قرآن نے اس چیز کی تردید کردی کہ یہ نہ بات سمجھ لی جائے۔ اگلی بات یہ ہوئی کہ ان شہدا کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ زندہ ہوتے ہیں ہماری دعاؤں کو سنتے ہیں ہماری مرادوں کو پورا کرتے ہیں۔

مرنے کے بعد انسان کا' اس دنیا والوں کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہتا

عزیزانِ من! شہدا ہوں یا کچھ اور ہوں' قرآنِ کریم نے واضح کردیا ہے کہ اس دنیا سے جو مرجاتا ہے اس کا اس دنیا والوں کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہتا' وہ ان کی کوئی آواز نہیں سنتا۔ بفرضِ محال اگر کوئی سن بھی لیتا تو ان کا جواب دے ہی نہیں سکتا۔ اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ یاد رکھو! مردوں کا یہاں کے زندہ رہنے والوں کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہاں ان کو وہ علم ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے جب میں یہاں حیاتِ آخرت پہ آؤں گا تو وہاں یہ تفصیل بیان کرونگا لیکن میں اس وقت صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں کا تصور ہے کہ مرنے کے بعد ہم نے زیرِ زمین ایک نئی مملکت بسا رکھی ہوتی ہے کہ زمین کے اوپر کا گورنر کہتے ہیں وہ تو یونہی سا ہوتا ہے' اصل میں وہ نیچے ہوتا ہے' اس کی بھی وہاں کیبنٹ ہوتی ہے' سارے معاملات کے فیصلے تو وہاں ہوتے ہیں۔ پھر وہ ہماری دعاؤں کو سنتا ہے' ہماری مرادوں کو پورا کرتا ہے۔ یہ سارا نیچے ایک تخت بچھا ہوا ہے' ہم نے پوری کی پوری دنیا بسا رکھی ہے کہ وہ جو اوپر قبر شریف ہے' وہ تو خیر یونہی علامت ہے صاحب! اصل میں تو یہ جو سارا کچھ ہوتا ہے' اوپر کے جتنے بھی فیصلے ہیں' وہ کرتے ہیں' قضا و قدر ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ اوپر تو بیچارے یونہی تھیٹر کے ایکٹر ہوتے ہیں' پندرہ روپے کا ملازم ہے' اسے بادشاہ بنا کر بٹھا دیا جاتا ہے' جب وہ ڈراما ختم ہوجاتا ہے پھر وہ بھنگی کا بھنگی رہ جاتا ہے۔ اصل میں تو جو صاحبِ اختیار و اقتدار ہے' قضا و قدر کے مالک ہیں' وہ یہ سارے زمین کے نیچے چھپے ہوئے ہیں۔

انسان کی خوش فہمی اور غلط سوچ، انسان کو کئی قسم کی خوش عقیدگیوں کے جال میں الجھائے رکھتی ہے

عزیزانِ من! اپنی خوش فہمیوں کے ماتحت ہم کتنی خوش عقیدگیاں کیوں نہ پیدا کرلیں، قرآنِ کریم اس تصور کے بالکل خلاف جاتا ہے۔ ان کے متعلق جن کو معبود تصور کرلیتے ہیں، یہ معبود ہی بنائے ہوئے ہیں جن کے درباروں پر جا کر سجدے کرتے ہیں، جن سے مرادیں مانگی جاتی ہیں اور یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ مرادیں پوری کرتے ہیں، اس سے بڑا معبود اور کون ہوتا ہے۔ کہا کہ اِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ (35:14) اگر تم ان کو پکارو تو لَا یَسۡمَعُوۡا دُعَآءَكُمۡ (35:14) یہ تمہاری پکار کو سن ہی نہیں سکتے۔ اس سے زیادہ اور واضح الفاظ میں کیا کہا جاتا۔ اِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡا دُعَآءَكُمۡ (35:14) ان کو پکارو گے، ان کو بلاؤ گے تو وہ تمہاری پکار کو سن ہی نہیں سکتے۔ وَ لَوۡ سَمِعُوۡا (35:14) بفرضِ محال اگر کوئی سن بھی لیتا ہے تو ان میں سے مَا اسۡتَجَابُوۡا لَكُمۡ (35:14) تو وہ تمہارا جواب نہیں دے سکتے۔ باقی رہا یہ کہ اس وقت اس کو پھر وہ ایسا کرنے والوں کو چپت کیوں نہیں مارتے۔ اس وقت تو ان کے اندر وہ بات نہیں ہے، ہمت نہیں، اس کی استطاعت نہیں، دنیا میں اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ یَكۡفُرُوۡنَ بِشِرۡكِكُمۡ (35:14) یہ جو تم ان کے سرہانے کھڑے ہوئے مشرکانہ چیزیں کرتے ہو، قیامت میں دیکھنا تمہاری شراکت سے کس طرح سے انکار کرتے ہیں۔ تمہاری سن نہیں سکتے، اگر سن سکتے تو جواب نہ دے سکتے۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں "روحانیت" کا لفظ ہی استعمال نہیں کیا

عزیزانِ من! آپ دیکھیے تو سہی، اس کے بعد قیامت در قیامت یہ عقائد ہیں کہ اس قسم کی توہم پرستیوں کے عقائد رکھنے والے کو بڑا پکا اور سچا مومن سمجھا جاتا ہے۔ اس کا انکار کرنے والا مغرب زدہ ہے، مادہ پرست ہے کہ روحانیت کے ہی قائل نہیں ہیں۔ روحانیت کا یہ لفظ ہی قرآن میں نہیں ہے۔ قرآن میں ان کے متعلق بہت سی آیات ہیں۔ درس میں تو صرف چند ایک آیات پیش کرتا ہوں۔ کہا کہ وَمَنۡ اَضَلُّ (46:5) اس سے زیادہ گمراہ کون ہوسکتا ہے مِمَّنۡ یَّدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (46:5) جو خدائے زندہ کو چھوڑ کر، ان مردوں کو آوازیں دیتا پھرتا ہے کہ مَنۡ لَّا یَسۡتَجِیۡبُ لَهٗۤ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَةِ (46:5) پکارتا رہے، قیامت تک پکارتا ہے، وہ جواب نہیں دے سکتے اور یہاں اگلی بات یہ کہہ دی۔ بفرضِ محال کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ ہوتا نہیں ہے۔ یہاں کہہ دیا کہ وَهُمۡ عَنۡ دُعَآئِهِمۡ غٰفِلُوۡنَ (46:5) ان بیچاروں کو تو خبر تک نہیں ہوتی کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ وَهُمۡ عَنۡ دُعَآئِهِمۡ غٰفِلُوۡنَ (46:5) وہ تو ان کی پکار سے بے خبر ہوتے ہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ یہ جو عقیدہ ہمارے ہاں ہے، کسے باشد، جو بھی اس دنیا سے چلا گیا ہے، اس کا نام آپ کچھ رکھ لیجئے، شہید ہی کہہ لیجئے، یہ عقیدہ کہ وہ زندہ ہیں، ہماری سنتے ہیں، ہماری پکار کا جواب دیتے ہیں، مرادیں بر لاتے ہیں، قرآنِ کریم کی نصِ صریح کے خلاف ہے۔

میدان جنگ کے سلسلہ میں منافقین کا تذکرہ

بات اب یہاں پھر آ گئی جو میں نے کہا تھا کہ اس کے کہنے کی خاص طور ضرورت کیا پیش آئی کہ یہ جو اس طرح سے خدا کی راہ کے اندر جان دے دیتے ہیں، انہیں مردہ نہ کہو، زندہ تو یہی ہیں حقیقت میں۔ مردہ تو تم ہو کہ جو اس طرح سے اپنی جان کو چھپائے چھپائے پھر رہے ہو۔ مخالفینِ کفار کا ذکر آ رہا ہے بلکہ منافقین کا ذکر آ رہا ہے۔ کہا ہے کہ اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡا لِاِخۡوَانِهِمۡ وَ قَعَدُوۡا (3:168) میدانِ جنگ میں گئے نہیں، خود چوڑیاں پہن کر گھروں میں بیٹھے رہے۔ منافقین کا ذکر آ رہا ہے۔ اور وہ جو گئے ہیں ان کے متعلق کہتے ہیں کہ لَوۡ اَطَاعُوۡنَا مَا قُتِلُوۡا (3:168) اگر وہ ہماری بات مانتے تو کیوں وہاں مارے جاتے۔ آپ نے غور فرمایا۔ ان سے تو کہا کہ قُلۡ فَادۡرَءُوۡا عَنۡ اَنۡفُسِکُمُ الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (3:168) اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ وہاں نہ جانے سے آدمی مرتا نہیں تو پھر ذرا اپنے آپ پہ موت جو آنے والی ہے، اس کو ہٹا کر ذرا ہمیں بتا دینا کہ یہاں بیٹھنے والے کو نہیں آیا کرتی۔ یعنی انہیں تو یہ کہا کہ تم جو سمجھتے ہو کہ وہاں نہ جاتے تو وہاں مرتے نہیں، کیوں گئے؟ ہماری بات مان لیتے تو کیوں مرتے۔ تو پہلے تو یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو موت سے ذرا بچا لینا۔ انہیں تو یہ کہا۔ باقی رہا وہ۔ کہنے لگے ان کے متعلق تم کہتے ہو کہ مر گئے۔ وَ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا (3:169) جو جان کو بچا بچا کر رکھنے والا ہے وہ مرتا ہے۔ اس طرح سے جو خدا کی راہ میں جان دینے والا ہے اس کے متعلق تو گمان تک بھی نہ کرو کہ وہ مرتا ہے۔ یہ تھی وہ وجہ جس کے لیے یوں کہنا پڑا۔

جس طرح زندگی اور زندگی میں فرق ہے اسی طرح موت اور موت میں بھی فرق ہے

قرآن نے یہاں موت اور موت کے اندر فرق کر کے بتایا ہے۔ ایک موت تو وہ ہے جو اسے آتی ہے جو موت سے ڈر کر، دبک کر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک موت اسے آتی ہے جو موت کو آگے بڑھ کر گلے لگانے کے لیے میدان میں چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ مرتا وہ ہے، زندہ یہ رہتا ہے۔ کیا انداز ہیں قرآن کے بات کہنے کے! وَ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا (3:169) مرتے تم ہو، یہ نہیں مرتے ہیں۔ ان کے متعلق گمان بھی نہ کرو کہ یہ مرتے ہیں۔ بَلۡ اَحۡیَآءٌ (3:169) یہی تو زندہ ہیں۔ پھر وہ بات ذہن میں آئی کہ زندہ ہیں تو پھر کہاں ہیں؟ کہا کہ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ (3:169) اپنے اللہ کے ہاں زندہ ہیں۔ برادرانِ عزیز! بات صاف ہو گئی۔ زندگی عِنۡدَ رَبِّهِمۡ (اپنے خدا کے ہاں) ہے۔ تم جو سانس لینے کے لیے زندہ ہو، خدا کے نزدیک تو تم مردہ ہو۔ وہ جو تمہارے نزدیک مر گئے ہیں، اس کے نزدیک وہ زندہ ہیں۔ عند ربهم نے بات صاف کر دی۔ زندہ ہی نہیں ہیں، صرف سانس ہی نہیں لیتے بلکہ یرزقون (3:169) وہاں سامانِ نشوونما ملتا ہے۔ نظر آ گیا کہ وہاں بھی جو زندگی ہے، اس میں Development (نشوونما) کی Further (مزید) نشوونما کے

لیے وہاں سامان ملتا ہے۔ فَرِحِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ (3:170) تم جان بچا کر خوش ہوتے ہو، وہ وہاں جان دے کر اتنے خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے اوپر خدا کا کتنا فضل اور رحمت ہے۔ اس پہ خوش ہوتے ہیں۔ وَ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِيۡنَ لَمۡ يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ مِّنۡ خَلۡفِهِمۡ (3:170) کہتے ہیں کیا بات ہے ان کے لیے خوشی کی!

مومن کی زندگی کا وہ اجر عظیم کہ جس کو بیان ہی نہیں کیا جا سکتا

کس چیز سے وہ اس قدر خوش ہوتے ہیں؟ اس چیز سے خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے اپنی جان دے کر، اپنے ساتھی جو پچھلے تھے، ان کو زندگی عطا کر دی، ہم نے کتنا اچھا سودا کیا! بات تو ساری یہ ہے کہ تم نے انسانی ذات کی نشوونما کی اور اس کے لیے تم دوسرے کے لیے کتنا کرتے ہو۔ جو زندہ رہتا ہے، وہ دوسرے کے لیے کتنا سامانِ نشوونما بہم پہنچاتا ہے، اموال دیتا ہے، انفاق کرتا ہے، یہ بھی کچھ کرتا ہے۔ جو جان دیتا ہے، کہتا ہے کہ اس احساس سے کہ ہمارے خون کا خوں بہا ہمارے ساتھی وہاں وصول کر رہے ہیں، اس سے بڑے خوش ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اس چیز سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ واہ واہ کیا جان دینا ہے صاحب! خود نہیں اس کا خوں بہا مانگ رہے وہ تو اتنا کچھ مل گیا، خوں بہا یہ پچھلے وصول کر رہے ہیں۔ اس خوں بہا میں کیا مل رہا ہے ان کو؟ کہتا ہے کہ ہم نے جانیں دیں تو اَلَّا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (3:170) وہ خوف اور حزن سے مامون ہو گئے۔ کتنی بڑی چیز ہے جو ہم نے کی ہے! يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضۡلٍ (3:171) خدا کے فضل اور نعمت پر ان کو خوش خبریاں ملتی ہیں۔ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (3:171) یہی تو وہ مومن ہیں اور دیکھو! خدا ان کے عمل کا اجر بالکل ضائع نہیں کرتا۔ بظاہر تم سمجھتے ہو کہ مر گئے صاحب! ملا کیا؟ تمہیں کیا پتہ ہے کہ کیا کچھ ملا ہے! انہیں یہ کچھ ملا، ان کے خون کا خوں بہا انہیں یہ کچھ ملا۔ ہم مومن کے کام کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔

برادرانِ عزیز! مومن کی Definition (تعریف) بھی ہم نے دیکھ لی۔ اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَ اَمۡوَالَهُمۡ (9:111) یہ ہے قرآن کے نزدیک مقتولین فی سبیل اللہ۔ زندگی کیا ہے؟ ان کا ہمارے ساتھ تعلق کیا ہے؟ انہوں نے جو اپنی جان دی ہے، اس کا انہیں بدلہ کیا ملا ہے، ہمیں کیا ملا ہے؟ ہمارا ان کے ساتھ تعلق کیا ہے؟ یہاں یہ سارے مقامات واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ قرآن کہتا ہے اور ہم اپنے ذہن سے تراشیدہ عقائد، اپنے ذہن میں رکھتے ہیں، وہ آپ کے سامنے ہیں جو کچھ بھی ہیں۔

مومن کی زندگی میں صبر و استقامت کی نوعیت

کہا کہ یاد رکھو! مرحلہ بڑا استقامت اور صبر آزما آ گیا ہے، اس میں کہا کہ وَ لَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَىۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ

وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ (2:155)۔ہم پہلو بدل بدل کرتمہیں مختلف مواقع بہم پہنچائیں گے۔جس میں کیا ہوگا؟ خوف' بھوک' مال ومتاع کا ضائع ہونا' جانوں کا تلف ہو جانا' کھیتیوں کے ثمرات کا بلکہ جتنے کچھ تم کام کر رہے ہوان کا ماحصل جو کچھ تھا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ سب اس میں تباہ ہو جائے۔ یہ مقام اب آنے والا ہے۔اس لیے کہ تمہارا قبلہ متعین ہو گیا ہے۔ برادرانِ عزیز! قبلے کا تعین اوراس کے عواقب میں یہ چیزیں آرہی ہیں کہ اب یہ کچھ ہونے والا ہے' یاد رکھو۔الگ قبلے کا تعین کر لینا' منہ طرف قبلے شریف والی بات نہیں ہے۔کہا کہ یہ کچھ ہوگا مگر وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ (2:155) جوان حالات میں ثابت قدم رہنے والے ہیں' ان کو بشارتیں دے دو' ان کو خوش خبریاں دے دو۔صحیح راستہ ہواوراس پران جاں فشانیوں سے چلنے والے ہوں تو انہیں چلنے سے پہلے بشارتیں مل جاتی ہیں۔بات سیدھی سی ہے۔صحیح فارمولا ہو' اس کے مطابق دیانت کے ساتھ اس کے اوپر عمل پیرا ہوں' تو پہلے ہی بتا دیا جاسکتا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔اس لیے کہ یہاں ہر چیز قانون کے مطابق ہوتی ہے۔جو چیز قانون کے مطابق ہوتی ہے اس میں جو ہر مرحلہ ہے اس میں کوئی الجھاؤ والی بات نہیں ہوتی وہ تو ایک حقیقت ہوتی ہے' جس کا اعلان کرنا ہوتا ہے۔کہا ہے کہ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ (2:155) ان کو خوش خبریاں دے دو۔یہ صابرین کون ہیں؟ میں نے کہا تھا کہ صبر ایک تو وہ ہے جو ہمارے ہاں ہے اور صابرین یہ ہیں جو الَّذِیْنَ (2:156) یعنی وہ لوگ ہیں کہ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ (2:156)۔عام الفاظ میں تو یہ ہے کہ جب ان پہ کوئی مصیبت آتی ہے۔لیکن عربی قاعدے کی رو سے اَصَابَ مُّصِیْبَةٌ کے معنی جو کچھ بھی ان کے اوپر بیتتی ہے' جو حادثہ بھی ان کے اوپر گزرتا ہے' جس چیز کا بھی انہیں سامنا کرنا پڑتا ہے' جو کچھ بھی ان کے ساتھ واقع ہوتا ہے' کچھ بھی ہو۔اس میں ان کا ردِعمل کیا ہوتا ہے؟ ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ کیا ان مصائب' ان تکالیف' اس قسم کے امتحانوں سے' ہم اپنا رخ کسی دوسری طرف موڑ لیں گے؟ کیا اس سے یہ ہوگا کہ جس طرف ہم جارہے ہیں' اب ہمارا اگلا قدم اس طرف نہیں اٹھے گا' ہمارا قدم اب کسی دوسری طرف اٹھ جائے گا۔کیا یہ ہوگا؟ اس نے کہا کہ صابرا سے نہیں کہتے۔ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا (2:156) وہ کہتے کیا ہیں؟

انا للہ وانا الیہ راجعون کا قرآنی مفہوم اور ہمارے ہاں کے تراجم اور تصورات

عزیزانِ من! اگلے الفاظ وہ ہیں کہ بدقسمتی سے جب دین مذہب میں تبدیل ہوا' اور ہمارے ہاں یہ چیز ہوئی' انتہائی بے چارگی کے عالم میں' بے بسی کے عالم میں' جب علاج کرتے کرتے ناکامیاں ہو جائیں' اوراس کے بعد مر جائے تو اس کے بعد ہوتا ہے کہ جی! پھر کیا ہوا وہ تو مر گئے؟ کہا کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156)۔آپ دیکھتے ہیں کہ ہر موقع پر جس میں انتہائی مصیبت ہو' آنکھوں میں آنسو ہوں' کپکپی چھائی ہوئی ہواس کے بعد اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156) کہا جاتا ہے۔آپ دیکھیے کہ یہاں قرآن کس

مقام پہ کہتا ہے کہ یہ جوان مواقع میں ثابت قدم رہتے ہیں، ہر مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں، جو حادثہ گزرتا ہے اس میں قدم بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایسے وقت میں جب ان کے اوپر انتہا درجے کا صبر آزما مرحلہ آتا ہے تو وہاں بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ اِنَّـا لِـلّٰـهِ وَ اِنَّـآ اِلَيْـهِ رٰجِـعُـوْنَ (2:156)۔ کیا وہ ہمیں ان چیزوں سے ڈراتا ہے؟ نہیں، ہم نے تو اپنے آپ کو خدا کے لیے وقف کیا ہوا ہے، ہر قدم اسی کی طرف اٹھے گا، اِدھر اُدھر قدم جا نہیں سکتا۔ اس میں پہلا ہی فقرہ انا للہ ہے۔ اے بابا! ڈرے تو وہ جس کا کچھ اپنا ہو، ہمارا اپنا تو ہے ہی کچھ نہیں، اس لیے اس میں ہمارا کیا بگڑنا ہے۔ ہم نے تو یہ دونوں چیزیں بیچ دی ہوئی ہے۔ مال اس وقت ہے نہیں، وہ پہلے دے آئے، باقی رہی جان وہ ہم نے پہلے ہی بیچ رکھی ہوئی ہے، وہ ہمارے پاس امانت ہے، مانگتا ہے، جا کر حاضر کر دیتے ہیں۔ ''سگوں چھٹی ہوئی، اینوں سانبھنا پیا ہویا ہیگا سی ایناں چر[1]''۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ (2:156)۔ کیا لفظ ہے یہ! اللہ نے اس میں قیامتیں بھر دی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ یعنی ہم ہیں ہی اس کے۔ ہم نے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہوا ہے۔ یہ اس کے لیے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ للہ ہے۔ یہ اس کے پروگرام کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔ اس کے متعین کردہ مقصد کے حصول کے لیے ہم نے اپنے آپ کو وقف کیا ہوا ہے۔ اس لیے ہمارا جو سب کچھ ہے، وہ اس کے لیے وقف ہو چکا ہوا ہے:

اک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

وہ امانت تھی۔ مجھے تو ایک ایک قطرے کا حساب دینا پڑتا ہے۔ لِلّٰه۔ ایک وہ اپنا۔

عشق میں ایک تم ہمارے ہو
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

یہ انا للہ (2:156) کیا بات ہے کتنی بڑی متاع اپنے لیے مختص کی ہے! اللہ اپنے لیے رکھ لیا اور باقی جو سب کچھ ہے وہ کہتا ہے کہ بے شک لے جاؤ یہ انا للہ ہے اور کس انداز سے یہ انا للہ ہے! قرآن دوسرے مقام پہ رسول اللہ ﷺ کی زبانی کہتا ہے کہ جس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ نے اپنی سیرتِ طیبہ ﷺ سے بتا دیا تھا کہ کس طرح سے انسان اور اس کا سب کچھ اس کے لیے وقف ہوتا ہے، کہا کہ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (6:162) اعلان کر دو کہ مجھے جو یہ خدا نے صراطِ مستقیم کا راستہ دکھا دیا ہوا ہے، سنو! یہ صراطِ مستقیم کا راستہ کیا ہے؟ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا (6:162) یہ وہ راستہ ہے کہ جس پر ہمارا موسسِ اعلیٰ ابراہیمؑ یکسو ہو کر چلا تھا، یہ چاروں طرف سے سیدھ میں، ایک طرف جانے والا راستہ ہے اور یہ کہ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (6:162) اس نے

---

[1] چلو! چھٹی ہوئی۔ اسے اتنا عرصہ سنبھالنا پڑا تھا۔

اس کے اندر شرک نہیں کیا۔

لفظ توحید کی وضاحت اور اس پر عمل پیرا ہونے کا طریق

اب سنیے کہ توحید کی تفصیل کیا ہے؟ Definition کیا ہے؟ وضاحت کیا ہے؟ کہا ہے کہ شرک نہ کرنا۔ قُلْ (6:163) ان سے کہہ دو کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (6:163) میرے تمام فرائض زندگی اور ان کے ادا کرنے کے طور طریقے، میرا مرنا اور جینا خدا کے تجویز کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے وقف ہے۔ لَا شَرِیْکَ لَہٗ (6:164) میں اس میں کسی اور مقصد، جذبہ، یا خواہش کو شریک نہیں کرتا، اسی کا نام توحید ہے۔ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ (6:164) اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ یہ ہونا ہے۔ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:164) اور میں ہی سب سے پہلے اس کے سامنے جھکا اور جھکو میرے ساتھ جس نے جھکنا ہے۔ یہ کچھ کہنے والا اپنے آپ کو اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:164) کہتا ہے۔

عزیزانِ من! یاد رکھیے، قومیں، جماعتیں، پارٹیاں، گروہ، مسجد کے اعلان کی طرح اسی کا اتباع کرتی ہیں جو پہلے یہ کہتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:164)۔ جو یہ نہیں کرتا، اس کے پیچھے کوئی نہیں جھکتا۔ یہ بات دوسری ہے۔ میں یہاں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ جو کہا ہے کہ اِنَّا لِلّٰہِ (2:156) اس اِنَّا لِلّٰہِ کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ (6:163) خدا کے پروگرام کے لیے ہم نے یہ سب کچھ، یہ تمام فرائض زندگی اور ان کے ادا کرنے کے طریقے، میرا مرنا اور جینا، وقف کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ پروگرام کیا ہے؟ وہ ہے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (6:163) ربوبیتِ عالمینی یعنی تمام نوعِ انسانی کے لیے سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ سوچیے تو سہی میں نے کہا تھا کہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ انسان کی طبعی زندگی کی نشوونما، ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ خود لیتا ہے، کھاتا ہے لیکن اس کی ذات کی نشوونما اس چیز سے ہوتی ہے جو وہ دوسرے کے لیے دیتا ہے۔ زندگی میں آدمی اپنی محنت کا ماحصل، یہ سب مال و دولت، دیتا چلا جاتا ہے۔ یہ بھی بڑی چیز ہے۔ آخری ایک اور چیز ہے، جسے محفوظ رکھنے کے لیے، جس کی حفاظت کے لیے جسے Preservation of Self (اپنی جان کو محفوظ رکھنے کے لیے) کہتے ہیں، اس کے لیے زندگی بھر سب کچھ کرتا ہے، اور جب دوسروں کی نشوونما کے لیے ضرورت پڑے تو وہ شخص جان بھی دے دیتا ہے۔ اگر یہ زندہ نہیں ہے تو اور زندہ کون ہوگا؟ اسی لیے کہا کہ بَلْ اَحْیَآءٌ (2:154) وہ زندہ ہے، وہ حیاتِ جاوداں سے بہرہ یاب ہے۔ یہ جو کہا گیا تھا یہ ان کے لیے ہے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (2:156)۔

یہاں ایک اور آخری اہم بات آ گئی ہے۔ کیا عرض کیا جائے قدم قدم پر غیر قرآنی تصورات ہیں جو مروج ہو کر عینِ اسلام بن گئے ہیں۔ وہ قدم قدم پر راستہ روکتے ہیں۔ کہا ہے کہ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (2:156) اس کی طرف ہم جانے والے ہیں۔ دیکھا آپ نے!

ذہن میں یہی آتا ہے کہ اللہ میاں کہیں اور ہے' ہم کہیں اور ہیں۔ وہ ایسی جگہ میں ہے کہ وہ تو کہیں دور ہے' مرنے کے بعد البتہ ہم ان کے پاس چلے جائیں۔ عزیزانِ من! یہاں یہ صورت نہیں ہے' یہاں تو ساری عمر بھی یہی کرتے رہیں تو بھی یہ صورت نہیں ہے۔ وہاں تو بس اشارتاً یوں کہیے کہ

''راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں''؟

''بلاوا ہونا تے موت ہوندی اے[1]''۔ اور وہ خدا ہے جو کہتا ہے کہ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (57:4) جہاں بھی تم ہو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ نہیں! اِنَّآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) مرنے کے بعد ہم اس کی طرف جائیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہم تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں''اے کیندے نیں شہ رگ کٹیا ہووئے تاں رب ملدا اہیگا[2]''۔ اور تصور یہ ہے کہ سارے وہاں ہوں تو وہاں خدا ملتا ہے یعنی Space (مکاں) کا ایک تصور ہوتا ہے کہ اس طرح سے وہ ہے۔

خدا کے پاس جانے کے سلسلہ میں شریعت اور طریقت کا موجودہ تصور

عزیزانِ من! ذہن میں یہ ہے کہ کوئی خاص مقام ہے' وہاں ہم نے مرنے کے بعد جانا ہے۔ وہاں خدا ملے گا۔ میں نے عرض کیا کہ خدا تو اس وقت بھی کہتا ہے کہ جہاں بھی تم ہو وہ تو تمہارے ساتھ ہے' شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ یہ جو کسی جگہ جانا ہے اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے اہلِ شریعت ہیں جو کہتے ہیں۔ اہلِ طریقت تو ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ رٰجعون کے معنی ہوتے ہیں''پھر سے لوٹ کر وہیں جانا' جہاں سے آئے تھے''۔ اچھا جی!!! اب انہوں نے یہ ایک قدم اور بڑھ کر پہلے بتا دیا کہ پہلے وہاں اس کے پاس تھے' پھر یہاں آ گئے' یہ بُعد ہو گیا' یہ ہجر ہو گیا۔ پھر اس کے بعد جو موت آئے گی تو پھر وہیں چلے جائیں گے۔ یہ کیا چیز ہے؟ عزیزانِ من! یہ بڑی گہری چیز ہے' غور طلب ہے۔ ویدانت کا جو تصور ہے' اس کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ جو روح تھی' وہ پرم آتما ہے' پرم آتما مکمل بڑھی ہوئی ہے' اس پرم آتما کے حصے ہیں' یہ جو انسانوں کی روح ہے' اسے آتما کہتے ہیں' اس پرم آتما میں سے نکل نکل کر' انسانوں کی یہ روح بنی' اس طرح روحِ انسانی یہاں آ گئی۔ یہاں آ کر وہ مادے کی دلدل میں پھنس گئی۔ اب اس روح کے لیے مقصدِ زندگی یہ ہے کہ اس مادے کی دلدل سے اپنے آپ کو نکال کر' پاک صاف ہو کر' پھر جا کر اسی پرم آتما میں مل جائے جہاں سے یہ آئی تھی۔

وحدت الوجود اور رجعت الی اللہ کے تصور کے علاوہ ہندوؤں میں آواگون کے چکر اور ہمارے ہاں کی شاعری

یہ اسے رجعت الی اللہ' خدا کی طرف لوٹ کر پھر چلے جانا کہتے ہیں۔ ویدانت کا عقیدہ ہے' جسے ہندوؤں کا تصوف کہتے ہیں۔ ان

---

[1] بلاوا آنا تو موت کا دوسرا نام ہے۔

[2] یہ کہتے ہیں کہ شہ رگ کٹا ہو یعنی جذبات فنا کر دیں تو خدا ملتا ہے۔

کے ہاں یہ ہے کہ آوا گون کا چکر اس لیے ہے کہ یہ جو پرم آتما کی روح کا حصہ یہاں آ گیا ہے' مادے میں اس کو چکر دیا جائے۔ ایک زندگی کے چکر میں اگر یہ مادے کے دلدل سے نہیں نکلی یا آلائشیں باقی ہیں' پھر چکر دیا جائے' پھر چکر دیا جائے اور اس کو کروڑوں چکر دیتے ہیں تا آنکہ یہ اتنے بڑے چکروں سے جسے وہ گھن چکر کہتے ہیں' پھر اس میں سے یہ مادے کی آلائش سے بالکل پاک اور صاف ہو کر اپنی اصل سے جا ملے۔ یہ ذرا پروگرام دیکھیے کہ خدا کے ہاں کا کتنا عظیم ہے!!! یعنی جیسی وہ روح تھی' پہلے اس کو وہاں سے الگ کر کے گیان دیئے' کروڑوں عربوں چکر۔ چکر دینے کے بعد یہ بنا کیا؟ یہ کہ As You Were ''جیس طراں پہلاں سی اوس طراں دا ہو گیا❶''۔ اور اس سے کرنا کیا پڑا؟ یہ اتنی اتنی بڑی ریاضتیں کرنا پڑیں' چِلّے کاٹنے پڑے' پہاڑیوں پہ کھڑے ہیں' ہاتھ اوپر کیا ہوا ہے' ٹانگ اٹھائی ہوئی ہے' کیلوں کے بستر پہ پڑے ہوئے' چالیس چالیس دن کے فاقے کاٹ رہے ہیں' ندیوں میں کھڑے ہیں۔ یہ سب کا ہے کے لیے ہے؟ کہ جی! پھر ایسے بن جائیں جیسے پہلے تھے۔ برادرانِ عزیز! بعینہٖ آپ کے ہاں یہی تصوف آیا اور وحدت الوجود کہلایا۔ اور اس کے بعد پھر شاعری کے ہتھے چڑھا۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائیہا شکایت می کند

(رومیؒ)

بنسری کی لے کو سنو' اصل سے کٹ کر یہاں آ گئی۔ کہتا ہے کہ یہ جو بنسری کی لے میں سے رونے کی آوازیں نکلتی ہیں یہ رونا اس کا ہے کہ اپنی اصل سے کٹ کر یہ یہاں آ گئی۔ یہ جو فراق ہے' یہ جو اپنی اصل سے الگ ہونے کا ہجر ہے' یہ اس فراق کے نالے ہیں جو بنسری سے سن رہے ہو۔ اور پھر تشریح کی کہ یہ جسمِ انسانی بنسری ہے'' آسارے چھیدای ہیگے نیں' جیہڑے وال نکلے ہوئے نیں۔ وارث شاہ کہہ گیا ہیگا❷''۔ جسے یاد ہے' وہ کہتے نہیں ہیں کہ لوگ ہنسیں گے۔ جی ہاں! اس وجودِ انسانی میں چھید ہیں'' مولانا رومؒ کہہ گئے نیں' وارث شاہ کہہ گئے نیں''❸۔

قرآن حکیم کے متعلق مولانا رومؒ کا فرمان

عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ غیر قرآنی تصورات نے کس طرح آ کر آپ پہ چھاپ ہی نہیں لگائی' بلکہ یہ عینِ اسلام بن

---

❶ جیسے پہلے تھا' ویسے ہی ہو گیا۔ (اسی لیے کہتے ہیں کہ Death is only to be what you were before your birth)

❷ یہ تمام تر سوراخ ہی ہیں جو بال نکلے ہوئے ہیں۔ یہ وارث شاہ کہہ گیا ہے۔

❸ مولانا رومؒ کہہ گئے ہیں' وارث شاہ کہہ گئے ہیں۔

گئے۔ عینِ اسلام کہا ہے' یہی مولانا روم فرماتے ہیں کہ

ما زِقرآں مغز را برداشتیم
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

قرآن کا مغز ہم نے لے لیا ہے' یہ جو ان لوگوں کے پاس قرآن ہے (معاذ اللہ) یہ تو ہماری چھوڑی ہوئی ہڈیاں ہیں جو ہم نے کتوں کے آگے پھینک دی ہیں۔ کہو تو گستاخی ہو جاتی ہے۔ آوازیں آنے لگتی ہیں کہ پھانسی دے دو اس کو' بزرگان کے حق میں یہ کچھ کہتا ہے۔ قرآن کو کہاں لے جاؤ گے۔ وہ گستاخی نہیں ہے کہ اس قرآن سے مغز ہم نے نکال لیا ہے اور یہ چھوڑی ہوئی ہڈیاں ہیں وہ ہم نے کتوں کے آگے پھینک دی ہیں۔ بہر حال اس کو یہ لوگ رجعت الی اللہ کہتے ہیں' یعنی پھر خدا کی طرف لوٹ کر جانا۔ وہاں سے آئے تھے' پھر وہاں لوٹ کے جانے والی بات' یہ تصور' عزیزانِ من! ویدانت کا تصور ہے جو آپ کے ہاں آ کر وحدت الوجود بنا۔ پھر یہ مغزِ قرآن بنا' یہ عینِ دین بنا' یہ معرفت کی باتیں ہوئیں۔ یہ سنی ہوئی نہیں ہیں' دیکھی ہوئی باتیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم خدا سے پوچھ آتے ہیں' یہ سارا کچھ جو کچھ بھی ہے۔ سند کیا ہے؟ یہ کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) ۔ اول تو یہ دیکھیے کہ یہ آیا کس مقام پہ ہے؟ اتنے بڑے بڑے امتحانات ہیں' خوف ہے' بھوک ہے' جان و مال کی تباہی ہے' میدانِ جنگ میں جانیں لے کر گئے ہوئے ہیں' مقتولینِ فی سبیل اللہ ہیں' استقامت سے یہاں کھڑے ہیں' یہ سارا کچھ ہو رہا ہے اور مل کن کو رہا ہے؟ پہلے بھی میں نے شاید آپ کو بتایا تھا کہ کس قسم کے یہ مراقبے اور ریاضتیں ہوتی ہیں۔ یہ کچھ میں نے بھی کی ہوئی ہیں' میں بتایا کرتا ہوں کہ یہ جہاد میدانِ جنگ میں جانا اور تلوار لے کر گردن کٹانا ہے۔ کہتے ہیں یہ جہادِ اصغر ہے' چھوٹا سا جہاد ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ نے جو اتنے جہاد کیے ہیں' یہ سارے جہادِ اصغر تھے۔ جہادِ اکبر کیا ہے؟ اپنے نفس کے ساتھ جو جہاد کیا جاتا ہے "کمرے اچ بیہہ کے جہاد کرن ڈئے ہوئے ہیگے ❶"۔ اور اُدھر وہ ہماری چھوٹی سی بچی اور بچے تیر کمان لیے پھرتے ہیں اور ادھر کمرے میں بیٹھے ہوئے' وہ نفس کشی ہو رہی ہے اور اس کا نام جہادِ اکبر رکھا جا رہا ہے۔ اس پہ چلّے ہو رہے ہیں۔

تسخیر کائنات کے سلسلہ میں ہونے والی گہری سازش کا نتیجہ

برادرانِ عزیز! میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کریم میں یہ حکم ہے کہ قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ (6:11) جاؤ نکلو چلو پھرو سیاحت کرو زمین کی۔ سَخَّرَ لَکُمۡ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ (45:13) اسی زمین کی سیاحت نہیں' آسمانوں

---

❶ کمرے میں بیٹھ کر جہاد کر رہے ہیں۔

سے بھی آ گے' اجرامِ فلکی میں بھی پہنچو۔ یہ قرآنِ کریم کی اتنی بڑی چیز تھی۔ حضرت صاحب کو ملنے کے لیے گئے' باہر سے ہی خلیفہ صاحب نے یہ کہہ دیا کہ صاحب! وہ تو نہیں مل سکتے۔ انہوں نے کہا کہ انتظار کرلیں گے۔ کہنے لگے کہ صاحب! کتنے دن انتظار کرو گے؟ ضرور انتظار کریں گے۔ کیوں کیا بات ہے؟ کہنے لگے کہ وہ تو صاحب! چالیس دن کے بعد آپ تشریف لائیں گے۔ کیا ہے؟ کہ جی حضرت صاحب! سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ کا چلّہ کررہے ہیں۔ ''یعنی کمرے اوں باہر آن گے چالیاں دناں پچھوں' تے سیروافی الارض تے چڑھے ہوئے ہیگے نیں۔ اوئے اے کی ہون ڈیا ہے؟ جی! جہادِ اکبر ہون ڈیا اے ❶ ''۔ عزیزانِ من! اس قسم کی شمشیرِ برہنہ قوم کو اس مقام پہ لانے کے لیے اتنی بڑی سازشوں کی ضرورت تھی' اس سے چھوٹی سازش سے یہ قوم مرنہیں سکتی تھی۔ جس قوم کے جہاد نے قیصر وکسریٰ کے تختوں کو ہلا دیا تھا' اس قوم کو ایسا بنا دینا کہ قیصر وکسریٰ کے تختوں کو اپنے صفوں میں سر کے اوپر اٹھائے اٹھائے پھریں۔ وہ اتنی بڑی سازشوں سے ہی یہ قوم مرسکتی تھی' اس سے کم سازش میں یہ مرنہیں سکتی تھی۔

ہم نے قرآنِ حکیم کو چیستاں بنا دیا

وہ کتابِ عظیم جو قیامت تک کے لیے زندہ تھی وہ اسی صورت میں غیر مؤثر ہوکر رہ سکتی تھی کہ اس کی آیتوں کے یہ معنی کیے جاتے اور یہ مفہوم ان کو پہنایا جاتا۔ اب اِنَّـا لِـلّٰـهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156) کے یہ معنی رہ گئے کہ ہاں صاحب! یہ چیز موت کے بعد وہاں جانے کی ہے۔ ہو یہ گیا کہ کوئی حادثہ جو اتنا بڑا آ جائے' جس کی تلافی نہ ہوسکے اور غم کے پہاڑ الٹ آئیں' جونہی آپ سنتے ہیں بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ کسی جگہ کوئی فون کرتا ہے' اس سے پوچھتا ہے کہ کیوں بھئی! خیر خیریت ہے' کیا بات ہوئی صاحب؟ قرآن کی آیت کا یہ معنی ہوگیا' ہماری یہ صورت ہوگئی۔ اس سے پیشتر یہ ہوا کرتا تھا کہ وہ بڑے بڑے پوسٹر لگا کرتے تھے کہ وہ خادمِ روضۂ طیبہ شیخ احمد نے یہ کہا ہے کہ وہ زلزلے آئیں گے اور یہ طوفان آئے گا اور یہ سیلاب آرہا ہے' تو نمازیں پڑھا کرو' اذانیں دیا کرو' یہ سب کچھ کیا کرو۔ آپ کو یاد ہے کہ یہ قدِ آدم پوسٹر ہر جگہ لگا کرتے تھے۔ اس وقت تو لگا ہوا یوں تھا کہ لوگ پڑھ رہے تھے ''اک مراثی آ گیا۔ کہن لگا: اے کی ہیگا اے؟ کہن لگا: اے مکے وچوں آیا ہیگا اے اشتہار۔ کی ہیگا اے ایہدے وچ؟ کہن لگا: ایہدے وچ لکھیا ہیگا کہ طوفان آئے گا' زلزلے آن گے' نمازاں پڑھو' روزے رکھو' سب کچھ کرو۔ کہن لگا: مکے اوں کدی خیر دی خبر نہ آئی ❷ ''۔ جہاں بھی آپ کے کان میں آواز پڑھی ''اناللہ'' آپ نے سمجھ لیا ''پئی مکے اوں آئی خبر''۔ (کہ مکے سے پھر آئی خبر)

---

❶ کمرے سے چالیس دن بعد باہر تشریف لائیں گے' سیروافی الارض پر چڑھ بیٹھے ہیں۔ ارے بھئی! یہ کیا ہورہا ہے؟ جی! جہادِ اکبر ہورہا ہے۔

❷ کہنے لگا: یہ کیا ہے؟ اسے بتایا کہ یہ اشتہار مکے سے آیا ہے۔ (اس نے پوچھا کہ) اس میں کیا لکھا ہے؟ اسے بتایا کہ اس میں لکھا ہے کہ طوفان آئے گا' زلزلے آئیں گے (اسلیے) نمازیں پڑھا کرو' روزے رکھا کرو' یہ سب کچھ کیا کرو۔ وہ کہنے لگا: مکے سے کبھی خیر کی خبر نہ آئی۔

آج کا مسلمان توانا اللہ کی آواز پر افسردہ ہو کر رہ جاتا ہے

عزیزانِ من! میں کہتا ہوں کہ اتنا عظیم، اتنے بڑے انقلاب کا اور کوئی نعرہ دنیا کے اندر نہیں ہوسکتا۔ یہاں کہا ہے کہ **الَّـذِيْـنَ اِذَآ اَصَـابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ** (2:156) یہ ہیں وہ لوگ کہ بڑے سے بڑا حادثہ بھی ان کے سامنے آجاتا ہے، اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا کہتے ہو تم؟ کہ ہم اس سے ڈر جائیں گے؟ اور ہمارے قدم دوسری طرف اٹھ جائیں گے، اس لیے تم ہمیں ڈراتے ہو کہ ہم یہ راستہ چھوڑ دیں گے، ہم اس منزل کو چھوڑ دیں گے، ہم اپنے اس قبلے کو چھوڑ دیں گے۔ کیا کہتے ہو تم؟ سنو! تمہیں پتہ نہیں ہے کہ ہم کون ہیں؟ سنو! **اِنَّا لِلّٰهِ** (2:156) ہم نے تو اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔ آئے جتنا بڑا حادثہ آتا ہے۔ اور ہمیں دیکھو کہ **اِلَيْهِ رٰجِـعُـوْنَ** (2:156) ہم چلے اپنی منزل کی طرف، روک کے دیکھے جو روکنے والا ہے "آ، ناماں دا لعل، جیہڑا ہیگا ائے ساہڈے سامنے اونڈا[1]"۔ برادرانِ عزیز! یہ تھا **اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ** (2:156)۔

وقت ہو گیا اور کچھ آج سینے میں مرے درد سوا ہوتا ہے، آگے ہمت ہی نظر نہیں آتی۔ اس لیے بھی کہ آگے جو کچھ کہا گیا ہے، بس اللہ اکبر، میں تو "جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں"۔ یہ اگلی آیت ہے، ان کے متعلق ایسے مقام پہ یہ کہتے ہیں کہ **اُولٰٓـئِکَ عَـلَيْهِـمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ** (2:157) "اوصدقے او تہاڈے، جتاں آ کچھ کہیا ہیگا: خدا تے اوہدے فرشتے تہاڈے تے درودوسلام بھیجدے پئے ہیگے[2]"۔

او ایسا کہنے والو! تم پہ درودوسلام بھیجتے ہیں۔ لیکن یہ بات اگلے درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے جسے کہا ہے کہ درود بھیجتے ہیں؟ یہ کیا چیز ہے جسے درود کہا جاتا ہے؟ یہ کیسے بھیجا جاتا ہے؟ اور آج یہ چیز کیا بن کر رہ گئی؟ برادران عزیز! اسے ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

---

1. آؤ ذرا! اگر کوئی ماں کا لعل ہے تو ہمارے سامنے آؤ۔
2. تمہارے صد تحسین و آفریں! کہ جن پہ اتنا کچھ کہا کہ خدا اور اس کے فرشتے تم پہ درودوسلام بھیجتے ہیں۔

تینتیسواں باب: **سورۃ البقرۃ** (2)' (آیات 157 تا 163)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾ اِنَّ الصَّفَا وَالۡمَرۡوَةَ
مِنۡ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنۡ حَجَّ الۡبَيۡتَ اَوِ اعۡتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِ اَنۡ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنۡ تَطَوَّعَ
خَيۡرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡتُمُوۡنَ مَآ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَيِّنٰتِ وَالۡهُدٰى مِنۡۢ بَعۡدِ
مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الۡكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلۡعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلۡعَنُهُمُ اللّٰعِنُوۡنَ ۙ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا
وَاَصۡلَحُوۡا وَبَيَّنُوۡا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوۡبُ عَلَيۡهِمۡ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَمَاتُوۡا
وَهُمۡ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ لَعۡنَةُ اللّٰهِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ ۙ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ
عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ ﴿۱۶۲﴾ وَاِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۶۳﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1969ء کی 9 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 157 سے ہوتا ہے: (2:157)۔

آج معذرت خواہ ہوں کہ لاہور کی فضا میں جو ایک عمومی وبا پھیل رہی ہے' کچھ اس کا اثر مجھ پہ نظر آرہا ہے' نزلے کی تحریک ہے' اس لیے آواز پر کچھ اس کا اثر نمایاں ہوگا۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

صلوٰت کے سلسلہ میں پیش کی جانے والی آیت کی اہمیت پر ایک اہم درس

بات یہ چلی آرہی تھی کہ تعینِ قبلہ سے مقصود نظامِ خداوندی کی تشکیل' قیام اور استحکام ہے۔ اور یہ وہ نظام ہے جس کا ٹکراؤ دنیا کی ہر قوت سے ہوگا۔ اس نظام کی داعی قوم کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ ان تصادمات کا مقابلہ کرے۔ اس میں بڑی بڑی مشکلات' دشواریاں'

تکالیف اور مصائب کا سامنا ہوگا لیکن ان کا انداز یہ ہوگا کہ جہاں کوئی مصیبت ان کے سامنے آئے' کہیں کوئی مقابلہ ہو' وہ خندہ پیشانی سے اسے برداشت کریں گے اور للکار کر کہہ دیں گے کہ ہو نہیں سکتا کہ ان مشکلات اور موانعات سے ہمارا قدم رک جائے یا کسی دوسری طرف اٹھ جائے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس مقصد کی کامیابی کے لیے وقف کر رکھا ہے اور ہمارا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھے گا کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) لو چلے ہم اس کی طرف۔ اور یہاں پہنچ کر قرآن کریم نے کہا کہ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ رَحۡمَۃٌ ۟ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ (2:157) یہ وہ ہیں جن پر ان کے خدا کی طرف سے صلوٰت اور رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ یہی ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ صحیح راستے پر گامزن ہیں۔ یہ جو ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ (2:157) آیا ہے یہ آج کے درس کا خصوصی موضوع ہوگا اور اس اعتبار سے یہ ایک بڑا اہم نکتہ ہے جس کی وضاحت سامنے آ جائے گی۔ سورۃ الاحزاب کی آیت 56 بڑی اہم آیت سامنے آئے گی اس لیے اس درس کے References (حوالہ جات) کو اچھی طرح دیکھیے' لکھ بھی لیجیے' نسخے پاس ہیں تو انہیں نکال لیجیے۔

''درود'' کا لفظ عربی زبان کا ہے ہی نہیں' یہ تو پہلوی زبان کا ہے

عزیزانِ من! یہ مشہور آیت ہے' کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا (33:56)۔ آپ یہ دیکھیں کے کہ اس میں وہی صَلُّوۡا عَلَیۡہِ کا لفظ آیا ہے جو یہاں عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ (2:157) ہے۔ اس آیت کا ترجمہ ہمارے ہاں یہ کیا جاتا ہے کہ ''اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اے جماعتِ مومنین! تم بھی نبی پر درود بھیجو' سلام بھیجو''۔ یہ ہے عام ترجمہ جو کیا جاتا ہے۔ درود کا لفظ ہمارے ہاں اتنا عام ہے کہ اس سے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ دراصل اس کے متعلق اتنا کچھ کہنے کی ضرورت ہے کہ شاید ایک درس میں بھی بات ختم نہ ہو۔

درود کا لفظ نماز کے لفظ کی طرح عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ اہلِ ایران کی قدیم پہلوی زبان میں یہ دونوں الفاظ تھے اور مجوسیوں کے ہاں رائج تھے' آج بھی وہ جو اپنی پرستش ہے' اسے نماز کہتے ہیں اور اس میں کچھ دعائیں سی مانگتے ہیں' اسے درود کہتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ الفاظ کے اعتبار سے یہ لفظ' بلکہ یہ دونوں الفاظ عربی زبان کے نہیں ہیں' پہلوی زبان کے ہیں۔ لہٰذا پہلی بات تو یہی ہوئی کہ ہم نے عربی زبان کے ''صلوا علیہ'' کو پہلوی زبان کے ''درود'' سے بدلا اور آج یہ لفظ ہمارے ہاں اتنا عام ہے کہ شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہوگا کہ درود شریف کے متعلق ہمارے کان میں کوئی آواز نہ پڑتی ہو۔ درود شریف کی برکات' اس کے فوائد' اس کے محاصل' اس سے جو نیکیاں ملتی ہیں' اس سے جو ثواب حاصل ہوتا ہے' اس کا چرچا ایک ایک زبان پر ہے' ان چیزوں سے ہماری فضا گونج اٹھتی ہے۔ غور طلب چیز یہ ہے کہ یہ بات کیا ہے؟

ہمارے ہاں درود شریف کی عظمت اور فضیلت

عزیزانِ من! بعض مقامات ذرا نازک سے آجاتے ہیں، یہ بھی انہی مقامات میں سے ایک مقام ہے کہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں، تحت الشعور کے اندر، درود شریف کی عظمت، رفعت، عزت اور فضیلت جاگزیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی اس سے پہلے آپ احباب نے اس پہ کبھی غور کیا ہو کہ یہ بات کیا ہے؟ مجھے قرآن کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے، آپ کو قرآنِ کریم کے ان مقامات کو سمجھانا ہوتا ہے۔ انہیں سمجھنے کے لیے ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم قرآنِ کریم سے دیکھیں کہ یہ بات کیا ہے؟ کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ** (33:56)۔ میں نے کہا ہے کہ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ''اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر''۔ اس کے بعد یہ کہا ہے کہ **یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ** (33:56) مومنوں کو یہ حکم دیا جارہا ہے کہ تم بھی درود بھیجو۔ اب اس کے بعد ہم اس حکم کی تعمیل کس طرح سے کرتے ہیں؟ عام طور پر بھی اور ہر نماز کے آخر میں تشہد کے بعد ہم درود پڑھتے ہیں۔ وہ درود کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ **اللھم صلی علیٰ محمد**......الخ اے اللہ تو درود بھیج محمد ﷺ پر......۔

خدا ''درود'' بھیجنے کے لیے تو ہمیں کہہ رہا ہے لیکن ہم یہاں خدا کو یہ کہہ رہے ہیں کہ ''تم درود بھیجو''

مجھے معلوم نہیں کہ آیا آپ کی نگاہ کا رخ اس طرف گیا ہے یا نہیں جو بات میں نے کہی ہے۔ مومنین کو حکم ہوتا ہے کہ **یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ** (33:56) اس سے پہلے کہا گیا ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ** (33:56) اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں رسول پر؛ اے مومنو تم بھی درود بھیجو۔ ہم کہتے ہیں کہ **اللھم صلی علیٰ محمد** اے اللہ! درود بھیج محمد ﷺ پر۔ وہ کہتا ہے کہ میں اور میرے فرشتے درود بھیج رہے ہیں، تم بھی بھیجو۔ ہم کہتے ہیں کہ اے اللہ! درود بھیج۔ وہ کہتا ہے کہ میں تو کہہ رہا ہوں کہ میں بھیج رہا ہوں اور میرے فرشتے بھی۔ تمہیں یہ کچھ کہا گیا ہے مگر ہم کہتے ہیں کہ **اللھم صلی علیٰ محمد** اے اللہ! درود بھیج۔ پھر اس کے بعد ہم سوا سوا لاکھ مرتبہ یہ کہتے ہیں، اس کی تسبیحوں پہ تسبیحاں پوری کرتے ہیں۔ یہ کیا کہتے ہوئے کرتے ہیں؟ یہ کہ اے اللہ! درود بھیج۔ وہ بات شروع کرتا ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ** (22:56) اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں۔ ہم سے کہا گیا کہ تم بھی یہ کچھ کرو۔ ہم کہتے ہیں کہ **اللھم صلی علیٰ محمد** یا اللہ! بھیج درود۔

برادرانِ عزیز! غور طلب چیز یہ ہے کہ ہم یہ کرتے کیا ہیں۔ یہ خود کہہ رہا ہے کہ میں اور میرے فرشتے یہ کچھ کرتے ہیں، تم بھی یہ کچھ کرو۔ ہم کہتے ہیں کہ **اللھم صلی علیٰ محمد** عزیزانِ من! پہلے ہی مقام پہ آپ نے دیکھا کہ جب کوئی چیز اس طرح کی آجائے تو اس پہ غور کیا جائے۔ غور کرنے کے بعد کس طرح آدمی ٹھٹک کر رہ جاتا ہے کہ یہ بات کیا ہوئی؟ یہی ہے وہ درود شریف جس کی اتنی عظمت

اور فضیلت ہمیں بتائی جاتی ہے۔اس سے اگلی چیز اور لیجیے۔ہمیں تو اتنا ہی پتہ ہے کہ قرآنِ کریم میں یہ آیا ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ** (33:56)۔یہی سورۃ الاحزاب سے اور چند آیات پہلے (33:43) ہے۔(33:56) میں تو کہا گیا تھا کہ اللہ اور فرشتے یہ کرتے ہیں۔میں ترجمہ وہی ابھی کیے جا رہا ہوں کہ ''درود بھیجتے ہیں' نبی پر درود بھیجتے ہیں۔

خداتعالیٰ کی ذات اور اس کے ملائکہ مومنین پر بھی ''درود'' بھیجتے ہیں

قرآن میں آیا ہے کہ **هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ** (33:43) خدا اور فرشتے' اے جماعتِ مومنین! تم پر بھی درود بھیجتے ہیں۔یعنی یہ صرف نبی اکرم ﷺ کے ہی متعلق نہیں ہے' یہاں تو پوری جماعتِ مومنین کے متعلق ہے کہ **هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ** (33:43) اللہ اور اس کے فرشتے تم پر بھی درود بھیجتے ہیں لیکن یہاں ایک اضافہ ہے اور وہ اضافہ نہیں بلکہ اس نے تشریح کر دی کہ یہ بات کیا ہے؟ اللہ اور اس کے فرشتے کیا کرتے ہیں؟ عزیزانِ من! اگر درود بھیجتے ہیں اور اس کا مفہوم وہی ہے جو ہم کرتے ہیں کہ ''درود بھیجتے ہیں'' تو اس کے تو معنی ہوئے کہ وہ بھی تسبیح لے کر بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ کچھ جو الفاظ **اللھم صلی علیٰ محمد** ہم دہراتے ہیں اور وہی کچھ وہ کرتے رہتے ہونگے۔یہ بات جچتی نہیں ہے۔اس نے یہ چیز بتائی ہے جو وہ کرتے ہیں۔اب میں بتاؤں گا کہ یہ بات کیا ہے؟

خدا اور اس کے فرشتے' انسانوں کو' مومنین کو' ظلمات سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتے ہیں

اب آپ درود کا لفظ ذہن سے نکال دیجیے گا' اب قرآن کے الفاظ لائیے گا اور قرآن کے الفاظ کا مفہوم عربی زبان کی رو سے خود قرآنِ کریم سے متعین کیجیے گا تو بات صاف ہو جائے گی۔لیکن پہلے اس نے یہ بتایا کہ جو کچھ خدا اور اس کے فرشتے کرتے ہیں' اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ کیوں یہ کچھ کرتے ہیں؟ جو کچھ کرتے ہیں وہ تو میں بعد میں عرض کروں گا کہ یہ بات ہے لیکن جو کچھ کرتے ہیں اس کے متعلق یہیں کہہ دیا کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس سے مقصد کیا ہے؟ جو کچھ وہ کرتے ہیں' وہ یہ ہے کہ **لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ** (33:43) تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے جائیں۔گویا یہ کوئی ایسی بات ہے جو خدا اور اس کے ملائکہ مومنین کے ساتھ یہ کرتے ہیں تاکہ جماعتِ مومنین کو وہ تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے جائیں۔یہ ''تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے جانا'' قرآن کی بڑی جامع اصطلاح ہے اور سب سے بڑی نعمت ہے صاحب! کہ کوئی شخص یا کوئی جماعت یا کوئی قوم زندگی کی تاریکیوں سے نکل کر روشنی کی وادیوں میں جا پہنچے۔

ظلمات میں ہر قسم کی توہم پرستیاں' غلط نظریات' غلط معتقدات اور باطل نظام شامل ہوتے ہیں

قرآنِ کریم نے تاریکی کو جہاں کہا ہے ''تاریکیاں'' کہا ہے' ظلمات کا جمع کا صیغہ ہے۔ روشنی جہاں بھی کہا ہے' واحد کے صیغے میں کہا ہے' الی النور کہا ہے۔ غلط اعتقادات' توہم پرستیاں' غلط معتقدات' غلط نظریات اور خیالات' غلط اور باطل نظام' یہ سب تاریکیاں ہیں اور متعدد قسم کی ہوسکتی ہیں' جیسے کہ میں کہا کرتا ہوں کہ غلط جوابات سینکڑوں ہوسکتے ہیں' صحیح جواب ایک ہی ہوتا ہے۔ اس لیے جب نور کہا ہے تو اس کو ایک ہی روشنی کہا ہے۔ اور روشنی کا تو خاصا یہ ہے کہ تاریکیاں کتنی ہی گھٹا ٹوپ کیوں نہ ہوں' ایک دیا سلائی کی ذرا سی روشنی تاریکیوں کو ختم کر دیتی ہے۔ بہر حال یہاں یہ کہا تھا کہ خدا اور اس کے فرشتے کچھ کرتے ہیں تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نور کی طرف لے جائیں۔

ظلمات سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریق اور ایام اللہ کی اصطلاح کا مفہوم

''تاریکیوں سے نور کی طرف لے جانا'' ہم قرآن ہی سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیا چیز تھی؟ کہا ہے **الٓـرٰ کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ** (14:1) خدائے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ اے رسول! یہ کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی۔ **لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ** (14:1) تاکہ تُو اس کتاب کے ذریعے نوعِ انسانی کو ظلمات سے نور کی طرف لے جائے۔ گویا یہاں معلوم ہوا کہ خود قرآنِ کریم کا جو نزول ہے' اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے جائے۔ بات اب بھی Abstract (غیر محسوس) رہی' Concrete (ٹھوس' محسوس) سامنے نہیں آئی' ٹھوس بات ابھی بھی سامنے نہیں آئی' ابھی بات نظری حیثیت سے ہی آئی ہے۔

اسے حضرت موسیٰؑ کی مثال سے سمجھیے۔ کہا کہ **وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ** (14:5) ہم نے موسیٰؑ کو بھی اپنے قوانین دے کر بھیجا۔ **اَنۡ اَخۡرِجۡ قَوۡمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ** (14:5) اس سے کہا کہ تُو اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف لے جا۔ دیکھتے ہیں آپ کس طرح سے بات واقعاتی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ پہلے ایک اصول دیا ہے' ایک Abstract Truth (بسیط' غیر محسوس سچ) دیا ہے' تاریخ کی شہادت پیش کی ہے' یہ وہ تصادم ہے جو صاحبِ ضربِ کلیمؑ' فرعون' اس کے لشکر' ہامان اور قارون کے ساتھ ہوا۔ یہ ملوکیت' سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے خلاف ٹکراؤ ہوا ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ اپنی قوم کو ان ساری تاریکیوں سے نکال کر یدِ بیضا کی راہنمائی میں' سینا کی وادیوں کے اندر لے گئے۔ اور یہیں قرآن نے کہا ہے کہ **وَ ذَكِّرۡهُمۡ بِاَيّٰٮمِ اللّٰهِ** (14:5)۔ یہاں یہ ایام اللہ کہا ہے' یہ اللہ کے ایام ہیں۔ ہر دن خدا ہی کا دن ہوتا ہے لیکن قرآن میں ہم نے یہ دیکھا ہے کہ جہاں حق اور باطل کا ٹکراؤ ہوتا ہے' اسے خدا نے ایام اللہ کہہ کر پکارا ہے کہ اے رسول! یہ ہمارے دن ہماری تاریخ ہے۔ یہ ہمارے دن اور ہماری تاریخ ان کے سامنے پیش کرو۔ **اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّـكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ** (14:5) اور اس لیے پیش کرو کہ ہر وہ قوم جو اپنے نصب العینِ حیات پر استقامت سے جم کر کھڑی رہے' اور اس

کی محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں تو انہیں معلوم ہو کہ یہ چیز کیسے ہوا کرتی ہے؟ **وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہِ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ** (14:6) موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا کی ان نعمتوں کو یاد کرو۔ **اِذۡ اَنۡجٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ** (14:6) جب اس نے تمہیں قومِ فرعون سے نجات دی۔ معلوم ہوا کہ قومِ فرعون کے پنجے میں یہ جو قوم محکومیت کے اندر گرفتار تھی' یہ ظلمات تھی۔ اس سے نجات دلانا پہلا مرحلہ تھا۔ اور پھر سینا کی وادیوں میں' وہاں یہ حکومتِ خداوندی کا قیام نور تھا۔ اور یہ ہیں وہ ایام اللہ جن کی یہاں یاد دہانی کرائی گئی۔ اور یہ ہے وہ چیز جس کے لیے کہا کہ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے تاکہ تُو اے رسول! اس کے ذریعے اس قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے۔

برادرانِ عزیز! اب پھر آجایئے اسی (33:43) کے اوپر۔ کہا ہے کہ **ھُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ لِیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ** (33:43)۔ خدا اور اس کے ملائکہ کچھ کرتے ہیں۔ ذرا آگے چل کر معنی متعین ہو جائیں گے۔ ابھی یہی سمجھو کہ وہ کچھ کرتے ہیں تاکہ اے جماعتِ مومنین! تمہیں دنیا میں سے ہر قسم کی محکومی اور محتاجی سے نکال کر' حقیقی آزادی سے سرفراز فرما دیں۔ یہ ہے کسی قوم کا چلے جانا ظلمات سے نور کی طرف۔ ذہنی تاریکیاں دراصل نظریات' تخیلات' اعتقادات' تصورات کی ہیں اور عملی تاریکیاں طاغوتی قوتوں کی محکومی' انسانوں کی محتاجی کی ہیں۔ اور یہ ان سب سے نکال کر' روشنی کی طرف لے جانا ہے۔ دل اور دماغ میں زندگی کے صحیح تصورات اور نظریات قائم کر دینا ہے۔ اور عملی طور پر یہ کیفیت کہ خدا کے قوانین کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکنے کے قابل نہ رہنے دینا۔ کہا ہے کہ اے جماعتِ مومنین! خدا اور اس کے فرشتے کچھ کرتے ہیں' اس کے ملائکہ کچھ کرتے ہیں تاکہ تمہیں یہ کیفیت نصیب ہو جائے۔

جو کچھ انسانوں کے لیے خدا اور ان کے فرشتے کرتے ہیں وہی کچھ کرنے کا حکم مومنین کو دیا گیا ہے

عزیزانِ من! یہیں سے ہم نے دیکھا کہ خدا اور فرشتوں کا تسبیح کرنے کا یہاں کوئی ذکر نہیں ہو سکتا' یہ تو کچھ کرنے کی بات ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی جب ہم نے دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق بھی یہی کہا گیا تھا کہ **اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ** (33:56) اے جماعتِ مومنین! تم بھی یہ کچھ کرو۔ تو یہاں کچھ کرنے کی بات ہے۔ یہ کچھ کرو تاکہ تم ظلمات سے نور کی طرف نکل جاؤ' تاکہ تم ان محکومیوں اور محتاجیوں' باطل کے اعتقادات' نظریات اور آئیڈیالوجی سے نکل کر صحیح روشنی کی طرف آجاؤ۔ ''خدا اور اس کے فرشتے کچھ کرتے ہیں' اے جماعتِ مومنین! تم بھی وہی کچھ کرو تاکہ تمہاری یہ کیفیت پیدا ہو جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے اور اس جماعتِ مومنین نے' جن کو یہ حکم دیا گیا تھا' یہ کچھ کیسے کیا تھا؟ عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے صفحات اس پہ شاہد ہیں' تاریخ کے اوراق اس پر گواہ ہیں۔ مسلسل جدوجہد' پیہم جہاد کی زندگی اس پہ شاہد ہے۔ آپ ﷺ کے عہد مبارک میں بڑے بڑے معرکوں کے علاوہ' چھوٹی چھوٹی مہمات کو بھی

گنائیں؛ تو مدنی زندگی کے پانچ سات سال کے اندر کم از کم بیاسی لڑائیاں آجاتی ہیں۔ اور جب ٹکراؤ لیا گیا ہے تو قیصر اور کسریٰ سے بھی ٹکراؤ لیا گیا ہے تاکہ یہ قوم ظلمات سے نور کی طرف آجائے۔ یہ مسلسل جہاد کی ایک زندگی تھی۔

میدان جنگ میں، مومنین کے جم کر کھڑے ہو جانے کے باعث اُن کے دلوں میں استقامت کا پیدا ہو جانا ملائکہ کا نزول ہی تو ہے

عزیزانِ من! یہ تھی وہ جہاد کی زندگی جس میں قرآنِ کریم نے بتایا کہ خدا ملائکہ کی مدد سے کیا کرتا ہے؟ کہا کہ **اِذۡ یُوۡحِیۡ رَبُّکَ اِلَی الۡمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیۡ مَعَکُمۡ** (8:12) جب خدا نے ملائکہ کو حکم دیا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، حکم دیا کہ تم یہ کرو، میں بھی یہ کچھ کرنے کے لیے تمہارے ساتھ ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کرو؟ کہا کہ **فَثَبِّتُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا** (8:12) یہ جو میدانِ جنگ میں جماعتِ مومنین آکر کھڑی ہو گئی ہے، ان میں استقامت پیدا کرو تاکہ یہ جم کر کھڑے ہو جائیں، ان کے ہاں تقویت پیدا کرو۔ یہ ملائکہ کو حکم دیا جاتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ یہ کچھ کرونگا، تم بھی یہ کچھ کرو۔ **فَثَبِّتُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا** (8:12) یہ جو مجاہدین میدانِ جنگ میں نکل آئے ہیں، ان کے قدموں کے اندر استقامت پیدا کرو۔ یہ تو میں جب دوسرے مقام پہ یہ عرض کرونگا کہ یہ ملائکہ یوں کیا کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، میں اس وقت صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتے یہ کرتے ہیں تو وہ کیا بات تھی جو وہ کرتے تھے؟

برادرانِ عزیز! میدانِ جنگ میں جماعتِ مومنین مقابلے کے لیے نکلی ہوئی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ایسا کچھ کرو کہ ان کے پاؤں میں استقامت آئے۔ تم دیکھو گے کہ **سَاُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الرُّعۡبَ** (8:12) اس کے بعد یہ جو مخالف میں جماعتیں آئی ہیں، ان کے دلوں کے اندر میں ان کا رعب پیدا کر دوں گا، اس قوم کا ڈر پیدا ہو جائے گا۔ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے یہ بہت کم ہیں، سامانِ حرب وضرب کی بھی بڑی کمی ہے لیکن ان کے قلوب میں تقویت پیدا کرو، ان کے پاؤں میں استقامت پیدا کرو۔ اور میدانِ جنگ میں جس جماعت کو یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے یقیناً، اس کا مخالفین کے اندر رعب طاری ہو جاتا ہے خواہ وہ تعداد کے اعتبار سے کتنے ہی زیادہ اور سامانِ حرب وضرب کے اعتبار سے بھی کتنے ہی ان سے آگے کیوں نہ ہوں۔ کہا کہ ان کے دلوں کے اندر ان کا رعب پیدا ہو جائے گا۔ یہ وہ چیز ہے جسے ملائکہ کا، خدا اور اس کے فرشتوں کا 'درود پڑھنا' میں وہ لفظ لا رہا ہوں' کہا گیا ہے۔ میدانِ جنگ میں مومنین نکلے ہوئے ہیں اور وہاں یہ چیز پیدا ہو رہی ہے۔ دوسری جگہ، آپ کو معلوم ہے، قرآنِ کریم نے یہ کہا کہ **اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ** (41:30) وہ لوگ جو اپنے اس یقین سے اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر جم کر کھڑے

ہو جاتے ہیں' ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے اوپر نزولِ ملائکہ ہوتا ہے جو ایک محکم یقین کے ساتھ' التزاماً اس قسم کے جہاد کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ یہ قرآن نے بتایا ہے۔

حق کی آئیڈیالوجی پر مبنی نظامِ حیات میں کائناتی قوتیں آدم کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں

عزیزانِ من! اب اس مقام پہ ہمارے سامنے یہ لفظ صلی علیٰ آ گیا۔ عربی زبان کی رو سے صلی کے بعد جب علیٰ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''پروان چڑھانا' نشوونما دینا' کامیاب بنانا' حوصلہ افزائی کرنا' Appreciation کرنا' تحسین کرنا' شاباش دینا''۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر لفظ کا صحیح معنی سامنے آ جائے تو کتنی ہی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ یہ حق کی آئیڈیالوجی پر مبنی ایک نظام ہے جس کی تشکیل و قیام و استحکام کے لیے یہ جماعت میدان میں آئی ہے۔ قوانینِ خداوندی کی مطابقت میں یہ جماعتِ مومنین سب قدم اٹھا رہی ہے۔ لہٰذا صحیح قانون کی اطاعت سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں' وہ سب ان کو حاصل ہونگے۔ اور اس کے ساتھ یہ کائناتی قوتیں بھی ان کے ہم رکاب ہونگی یعنی نفسیاتی قوتیں ان کے قلوب کے اندر ایک تبدیلی پیدا کریں گی' خدا کی کائناتی قوتیں (Cosmic Forces) ان کے ساتھ ہونگی۔ یہ اس کے قانون کے مطابق قدم اٹھا رہے ہیں۔ لہٰذا اس قانون کی ساری تقویتیں' برکتیں اور قوتیں ان کے ساتھ ہونگی۔ اور اس طرح سے ان کا یہ مشن پروان چڑھے گا۔ صلی علیٰ کا یہ لفظ ہمارے سامنے آ گیا کہ کامیاب ہونگے' ان کی نشوونما ہوگی اور جب یہ کچھ کرتے ہوئے آگے چلیں گے تو خدا اور اس کے فرشتے ان کے اوپر تحسین و آفرین کے پھول برسائیں گے۔ عام زبان کے اعتبار سے یہ چیز Appreciation کرنا' حوصلہ افزائی کرنا آئی۔ وہی چیز جو میں پچھلی دفعہ کہہ رہا تھا کہ جب یہ مصائب اور مشکلات کا ہجوم سامنے آتا ہے' وہ مردانہ وار آگے بڑھتے ہیں۔ اور وہ کہہ دیتے ہیں کہ تمہاری اس قسم کی تخویف اور ترغیب سے کیا یہ جنونِ عشق کے انداز رک جائیں گے؟ نہیں بلکہ ہمارا قدم آگے بڑھے گا۔ اور جو یہ کچھ کرنے والے ہیں ان کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ ''اللہ تے اوہدے فرشتے کہن گے: آفرین اے تہاڈے! کیا کر وکھاندے ہیگے خدا خوش رکھے تہانوں ❶''۔ یہ ہے جس کو عربی زبان میں صلی علیٰ کہا جاتا ہے۔ اور یہ چیز جس کے ساتھ ہوتی ہے یہ وہ ہے جسے آپ Moral Support (اخلاقی مدد) کہتے ہیں۔ وہ کیا ہوتی ہے؟ یہ کہ آپ ان کی تائید کرتے ہیں' آپ ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اور اگلا قدم یہ اٹھاتے ہیں تو ان کی کامیابی کے لیے' ان کے اس مشن کو پروان چڑھانے کے لیے' یہ لفظی ترجمہ ہے صلی علیٰ کا' اس کی نشوونما کے لیے' جو کچھ بھی آپ کر سکتے ہیں پھر اس کے بعد آپ کرتے ہیں۔ پہلا قدم تو یہ ہے کہ کسی کے کسی فیصلے اور اقدام کو آپ Approve (منظور) کریں' پسند کریں۔ پھر اس کے بعد تحسین و آفرین کریں' شاباش دیں' اس

---

❶ اللہ اور اس کے فرشتے کہیں گے: تحسین و آفریں ہو تم پر! یہ کیا کچھ کر دکھائیں گے! خدا تمہیں خوش و خرم رکھے۔

سے حوصلہ افزائی ہوگی۔ اس کے بعد یہ کہ آپ عملاً ان کا ساتھ دیں' اس سے وہ پروان چڑھے گا' ان کو کامیابیاں حاصل ہونگی۔ یہ تھے اس لفظ صلی علیٰ کے معنی۔

ذاتِ خداوندی اور اُسکے فرشتے' جماعت مومنین کے لیے کس طرح ممدومعاون بنتے ہیں؟

عزیزانِ من! خدا جو کچھ کرتا ہے اس کے متعلق تو میں نے عرض کیا ہے کہ وہ ایک Abstract (غیر محسوس) سی چیز ہے' بعد میں عرض کرونگا۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56) اے جماعتِ مومنین! تم بھی ایسا کچھ کرو کہ تمہاری ہی قوتِ بازو سے اس نے پروان چڑھنا ہے' اس نے کامیابی حاصل کرنی ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاؤ جو یہ قدم اٹھاتا ہے' اس میں کہو کہ کتنا عظیم قدم ہے' پھر اس کا ساتھ دو۔

''وسلموا تسلیما'' کا عملی مفہوم' اہمیت اور طریقِ کار

برادرانِ عزیز! اب اگلے لفظ میں جن میں یہ بات بتادی کہ تم کیا کرو۔ کہا کہ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56)۔ ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ درود و سلام بھیجو۔ صَلُّوْا عَلَیْہِ کے معنی درود بھیجو کر لیا سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کے معنی سلام بھیجو کر دیا۔ حالانکہ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56) کے معنی ہیں ''اس کی کامل اطاعت کرو جیسی اطاعت کرنے کا حق ہے''۔ یہ ہے جسے درود کہا جاتا ہے کہ اے جماعتِ مومنین! یہ حق کی آواز لے کر کھڑا ہوا ہے' اس لیے خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید اُسے حاصل ہے' تم اٹھو اور اُس کا ساتھ دو' اِس مشن کو کامیاب بنانے کے لیے پوری جدوجہد کرو' اور اُس کا طریقہ یہ ہے کہ یہ جو تمہارا امیر ہے' یہ جو تمہارا سربراہ ہے' یہ جو تمہارا ہیڈ ہے' سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56) اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔ یہ اطاعت کیا ہے؟ برادرانِ عزیز! یہی الفاظ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ہیں جن کا آپ کو معلوم ہے کہ اب ترجمہ سلام کیا جاتا ہے' درود و سلام تو ہمارے ہاں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اس میں ہم درود کے لیے پڑھتے بھی اللھم صلی علیٰ محمد ہے' سلام کی جگہ کہتے ہیں یا نبی سلام علیک۔ وہ درود ہوا' یہ سلام ہوا۔ قرآن کی رو سے وہ درود نہیں ہوا' اور عملاً کیا کرو؟ کہا کہ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56) اپنے اس امیر کی پوری پوری اطاعت کرو۔

مملکتِ اسلامیہ میں ایک مرکز کی اطاعت کی اہمیت

عزیزانِ من! دیکھیے' یہ الفاظ دوسرے مقام پہ کہاں آئے ہیں' غور سے سنیے گا۔ کہا ہے کہ فَلَا وَ رَبِّکَ (4:65) خدا خود یعنی جسے آپ خود کہتے ہیں وہ قسم کھاتے ہوئے کہتا ہے کہ خدا خود اس حقیقت پر شاہد ہے۔ کس حقیقت پر؟ یہ بڑی عظیم شہادت ہے جو پیش کی جارہی ہے' یہ خود خدا کی شہادت ہے۔ اور جس بات کے سچے ہونے کی شہادت خدا دیدے اس سے بڑی شہادت اور کونسی ہوسکتی ہے۔ خدا خود اس

حقیقت پر شاہد ہے کہ لَا یُؤْمِنُوْنَ (4:65) یہ ایمان کا کتنا ہی کیوں نہ دعویٰ کریں' کبھی یہ ایمان والے نہیں ہو سکتے حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ (4:65) تاوقتیکہ اپنے تمام اختلافی معاملات میں تمہیں اپنا قاضی یا فیصلہ دینے والا یا حاکم تصور نہ کریں۔ یہ رسول کو حکم یا فیصلہ کرنے والا تسلیم کرنا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہی چیز دوسری جگہ سورۃ المائدۃ میں ہے۔ کہا گیا تھا کہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون (5:44) جو لوگ کتابِ خداوندی کے علاوہ کسی اور طرح سے بھی اپنے معاملات کے فیصلے کراتے ہیں یہی ہیں جن کو کافر کہا جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے رسول کی طرف آنے کی کہ اس میں فیصلے از خود نہیں لیے جاتے۔ اسلام انفرادی چیز نہیں ہے کہ میں اپنے طور پہ فیصلے لے لوں' آپ اپنے طور پہ فیصلہ لیں۔ یہ ایک نظام کی تشکیل ہے' اس نظام کے اندر جو آپ نے اپنا امیر یا سربراہ چنا ہے اور اس کا پہلا سربراہ یا امیر خدا کی طرف سے خدا کا رسول ﷺ تھا۔ اپنے اختلافی معاملات کو اس کی طرف لے جاؤ تا کہ وہ قرآنِ کریم کے مطابق اس میں فیصلہ دیدے۔ اور کہا کہ تیرا رب اس پر شاہد ہے کہ کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اپنے اختلافی معاملات میں تجھ سے فیصلہ نہ چاہیں۔ اور اس کے بعد کہ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ (4:65) جو فیصلہ اس کے مطابق ملے' ظاہراً طور پر اس کی تعمیل کرنا تو ایک طرف رہا' دل میں بھی اس کے خلاف گرانی محسوس نہ کریں۔ ایمان یہ ہے۔ اس لیے کہ ایمان تو نام تھا پوری پوری قلب اور نگاہ کی رضامندی سے قرآن کو اپنا حکم مان لینے کا' جب ہم نے دل کی رضامندی سے یہ مان لیا کہ قرآنِ کریم ہمارا فیصلہ کرنے والا ہے تو جو فیصلہ قرآن کے مطابق آئے' مومن کے دل میں اس کے خلاف کبھی کبیدگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور اس کے آگے وہ الفاظ ہیں وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (4:65) یہ ہے اطاعت کرانا جسے ہم کہتے ہیں۔ سرِ تسلیم خم کرنا' جیسا کہ حق ہے خم کرنے کا۔ یہ ہوتا ہے عربی کا یہ قاعدہ جہاں یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کہا جاتا ہے۔ اور یہی وہ الفاظ یہاں ہیں کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56) اے جماعتِ مومنین! تم بھی اس کے Cause (علتِ غائی) کی' اس مشن کی تائید کرو' اس کی حوصلہ افزائی کرو' عملاً ساتھ دو' اسے پروان چڑھاؤ' اسے کامیاب بناؤ۔

نبی اکرم ﷺ کی حقیقی تعظیم کس طرح ممکن ہوگی؟

اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی پوری پوری اطاعت کرو جیسا کہ اطاعت کرنے کا حق ہے۔ اس جماعتِ مومنین کو دیگر مقامات میں بھی یہ کہا گیا کہ ایمان کے معنی کیا ہیں؟ رسول پر ایمان کے معنی کیا ہیں؟ کہا ہے کہ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ (7:157) یہ وہ لوگ ہیں جو اس پہ ایمان لانے والے ہیں۔ ان کی کیفیت کیا ہے؟ کہ وَ عَزَّرُوْہُ وَ نَصَرُوْہُ (7:157) وہ اس رسول کی تائید کرتے ہیں' اس کا ساتھ دیتے ہیں' اور اس کی مدد کرتے ہیں۔ اس مشن کی کامیابی میں اس کی تائید کرتے ہیں' اس کی تعظیم کرتے ہیں' اس کی مدد کرتے ہیں۔ اور

بات پھر واضح کر دی کہ یہ تعظیم کیا ہے؟ کیا یہ اتنا ہی ہے کہ حضورﷺ کا اسمِ گرامی کان میں پڑے تو ہم انگوٹھوں کو چوم لیں۔ کہا کہ نہیں۔ آؤ! تمہیں بتائیں کہ یہ توقیر اور یہ نصرت دینا' یہ مدد دینا کیا ہے؟ کہا کہ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ (7:157) اس کے ساتھ جو ہم نے یہ روشن کتاب نازل کی ہے' وہ اس کا اتباع کرتے ہیں۔ اس کے اتباع سے درحقیقت رسول کی مدد ہوتی ہے۔ دوسری جگہ بھی مومنین کے متعلق یہ کہا ہے کہ وَتُعَزِّرُوْہُ وَتُوَقِّرُوْہُ (48:9) اس رسول کی تم تعظیم کرو' تقویت کا سامان بہم پہنچاؤ۔ جماعتِ مومنین اس رسول کے لیے دست و بازو بنتے تھے۔ اُدھر سے خدا کے قوانین کی جتنی قوتیں ہیں' وہ اس کے ساتھ شریک ہیں' رسول خود بنفسِ نفیس اس کے ساتھ شریک ہے' اس کی جماعت اس رسول کی تائید و نصرت میں اس کے ساتھ شریک ہے تاکہ یہ مشن کامیاب ہو جائے' پروان چڑھ جائے۔

عزیزانِ من! آپ نے یہ دیکھ لیا کہ صلی علیٰ کے معنی کیا ہیں۔ اب آیئے قرآن کا یہ جو ارشاد تھا کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (33:56) اے جماعتِ مومنین! اس رسول کا ساتھ دو جو کچھ یہ کر رہا ہے اس کی تائید کرو' اس کے لیے تقویت کا سامان بہم پہنچاؤ' اس کے مشن کی کامیابی کے لیے سب کچھ کرو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس رسول کی وساطت سے کتابِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نظام نبی اکرمﷺ کی ذات تک تو محدود نہیں تھا۔ قرآنِ کریم نے تو خود یہ بات بتا دی تھی کہ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ وَ مَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا (3:144) یہ محمدﷺ تو نیست بجز اس کہ یہ خدا کا پیغام پہنچانے والا ہے' اس سے پیشتر بھی اس قسم کے پیغامبران آئے' اپنے وقت میں یہاں سے تشریف لے گئے۔ کیا کل کو اگر یہ بھی مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو پھر تم کہو گے کہ یہ نظام تو اس کی ذات سے وابستہ تھا' وہی نہیں رہا' نظام ختم ہوا۔ یہ نہ کہیں سمجھ لینا کہ پھر پلٹ کر اپنی روشِ کہن کی طرف آ جاؤ۔ جو ایسا کرے گا اپنا ہی نقصان کرے گا۔

رسول ﷺ اکرم کی اطاعت ایک مرکزِ ملت کی حیثیت سے تھی

قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ گویا یہ وہ نظام ہے جو رسول اللہﷺ کے بعد بھی جاری رہنا تھا۔ اب یہاں جو چیز ہے کہ رسول کی اطاعت کرو کہ وہ جو ایک مرکزِ ملت کی حیثیت تھی' ایک سربراہ کی حیثیت تھی' قرآن کے مطابق فیصلہ دینے والے کی حیثیت تھی' وہ حیثیت حضورﷺ کے بعد بھی برقرار رہے گی۔ حضورﷺ کے جانشین اس نظام کے سربراہ' یہی فریضہ سرانجام دیں گے۔ اب اس کے بعد یہی جسے ہم نے یہ صلی علیٰ کہا ہے' کیا ہوگا؟ یہ پوری جماعتِ مومنین اس نظام اور اس مشن کو تقویت کا سامان بہم پہنچائے گی' اسے پروان

چڑھانے کے لیے ہر قسم کی کوشش کرے گی' ہر قسم کی قربانی دے گی۔اور یہ ہے اس نظام کی سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (33:56)۔اور یہ تھی وہ چیز اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (33:56) قوانینِ خداوندی اور اس کی سب کی سب کائناتی قوتیں اس نظام کی تائید اور تقویت کرتی ہیں جو رسول کی وساطت سے یہاں قائم ہو رہا ہے۔اے جماعتِ مومنین! تم بھی اس کی تائید کرو' تقویت کا سامان بہم پہنچاؤ' اس کو کامیاب کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دو۔اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پوری پوری اطاعت کرو جیسے اطاعت کرنے کا حق ہے۔

اموال اور انفس کے متعلق ارشاد خداوندی

عزیزانِ من! قرآن کی آیات آپ کے سامنے آگئیں۔ادھر تھا کہ خدا اور اس کے فرشتے یہ کچھ کرتے ہیں۔نبی اکرم ﷺ کے متعلق حضور ﷺ کو جماعتِ مومنین سے جہاد کے متعلق ایک حکم دیا گیا ہے تو یہ کہا تھا کہ اموال اور انفس دونوں کا جہاد ہوتا ہے۔ضمناً یہ آیت آگئی سورۃ التوبۃ کی آیت 112 ہے۔کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111)۔ آج کل جو بڑا چرچا ہو رہا ہے کہ صاحب! قرآنِ کریم یا اسلام جو پرائیویٹ پراپرٹی ہے' اس کی اجازت دیتا ہے' اس کو تسلیم کرتا ہے۔اس لیے کوئی ایسا نظام جس میں پرائیوٹ پراپرٹی نہ رہے' نہ کسی کی ذاتی ملکیت رہے' وہ اسلامی ہو ہی نہیں سکتا۔لمبی چوڑی بحث کو تو چھوڑ دیجیے' اس ایک آیت کو لیجیے کہ مومن وہ ہے جو اپنی جان اور مال دونوں خدا کے ہاتھ بیچ دے۔سوچیے کہ جو چیز دوسرے کے ہاتھ میں بیچ دی جائے' فروخت کر دی جائے' اس کے اوپر پھر کسی کی ذاتی ملکیت بھی رہتی ہے؟ یہ کتنا Simple سا معاملہ ہے' کتنی آسان سی بات ہے' اس میں تو کوئی لمبی چوڑی بحثوں میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔مومن تو وہ ہوتا ہے جو پہلے دن یہ اقرار کرتا ہے۔تم ذاتی ملکیت' پرائیویٹ پراپرٹی کہتے ہو' یہاں تو جان کے اوپر بھی انسان کی ملکیت نہیں ہے۔اس نے تو وہ بھی بیچی ہوئی ہوتی ہے۔اور مال کا تو اس کے ساتھ یہاں لفظ موجود ہے۔بیچی ہوئی چیز جب تک ضرورت نہ پڑے اس وقت تک As Trust (بطور ضمانت) تو کسی کے پاس رہ سکتی ہے۔خرید کے وہ لے گیا ہے اور اس نے کہا ہے کہ ابھی رہنے دو' میں آگے سے ہو آؤں' پھر آتے ہوئے لے جاؤں گا' اتنے میں رکھو تم اپنے پاس۔اور تم کہو کہ یہ میری ذاتی ملکیت ہے جی!

مذہب خود ساختہ ذاتی عقائد کا نام ہے اور دین کی عمارت قرآنِ حکیم کے غیر متبدل اصولوں پر استوار ہوتی ہے

عزیزانِ من! جب بات مذہب میں آجائے تو ہر چیز عقیدے میں آجاتی ہے کہ جی! ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ صاحب! جان اور مال خدا کے ہاں بیچی ہوئی ہوتی ہے۔ہوتی اپنی ملکیت ہے' مرنے کے بعد اپنوں میں بانٹی جاتی ہے اور وہ بیچی ہوئی ہوتی ہے خدا کے ہاں۔

دین یہ نہیں ہے۔ دین تو ایک عملی پروگرام کا نام ہے۔ جب مومن اس چیز کا اقرار کرتا ہے' یہ معاہدہ کرتا ہے کہ میں نے بیچ دیا ہے تو سچ مچ بک گئی ہوئی چیز ہوتی ہے' اس کی ذاتی ملکیت اس پہ نہیں ہوتی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس نظام میں مال جان دونوں بیچے ہوئے ہوتے ہیں۔ خدا تو ان کے عقیدے کے مطابق آسمان پر ہے۔ ویسے بھی ایک ایسی غیر مرئی حقیقت ہے کہ اب اس کے ہاتھوں تو کوئی چیز دی نہیں جا سکتی تو پھر یہ بیچنے کی بات کیا ہے؟ یہ یونہی Academic (نظری) سی رہی کہ ٹھیک ہے جی' ہم نے بیچ دیا۔ نہ وہ خریدار آیا' نہ اس نے ہم سے مانگا' نہ ہم نے اس کو دیا۔ ٹھیک ہے جی ''جس دن اللہ میاں آئے گا منگن لئی تے دے دیاں گے [1]''۔

عزیزانِ من! دیکھتے ہیں الجھاؤ۔ لیکن جو قرآن ہے اس کے سامنے الجھاؤ باقی نہیں رہتا ہے۔ سورۃ الفتح میں دیکھیے جہاں وہ بائع کا ذکر ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (48:10) یہ جو بیع کرتے ہیں۔ اب بیع کا لفظ تو آپ کو معلوم ہے۔ یہ جو خدا کے پاس اپنی جان و مال' بیع کرتے ہیں' اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ تیرے پاس بیع کریں۔ اور یہ جو سودا پکا ہوتا ہے وہ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر یوں کرتے ہیں کہ سودا پکا ہوا' یہ جو تُو ان سے سودا پکا کر رہا ہے' کہہ دے کہ یہ میرا ہاتھ نہیں ہے' خدا کا ہاتھ ہے۔ دیکھا عملاً کیسے نکلی ہیں یہ چیزیں۔ وہ جو نظامِ حکومتِ خداوندی کا نمائندہ ہوتا ہے عملاً اس کے ساتھ یہ چیز ہوتی ہے۔ اور اسی لیے نبی اکرم ﷺ سے یہاں کہا گیا کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (9:103) یہ اپنے اس معاہدے کی صداقت کے ثبوت میں جو مال لائیں' وہ ان سے وصول کر لے۔ مگر یہ ہیں کہ کہتے ہیں کہ جی! یہ خیرات اور یہ چیزیں انفرادی ہیں' حکومت کو حق حاصل نہیں ہے۔ جب بھی میں حکومتِ خداوندی کہوں گا' قرآن کی رو سے اس نظام کو اسلامی حکومت کہوں گا تو وہاں ہے کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (9:103) ان سے وصول کر انہوں نے یہ بیچا ہوا ہے۔ ''اے اوہدے بعد اوہدے چاچے لگدے نیں [2]'' یہ ہے کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (9:103) وصول کر ان سے۔

قرآنِ حکیم کا معاشی نظام انسان کو دنیا بھر کی خباثتوں سے ہمیشہ محفوظ رکھتا ہے

عزیزانِ من! ایک جو وصول کرنا ہے' وہ تو دھاندلی کا ہوتا ہے' اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ یہاں کہا کہ تُطَهِّرُهُمْ (9:103) ان سے وصول کر تا کہ یہ دنیا بھر کی خباثتوں سے پاک اور صاف ہو جائیں۔ کس طرح سے ہوگا؟ کہا کہ تُزَكِّيْهِمْ (9:103) ان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچا۔ یعنی وہ جو خود لیتا ہے' وہ اپنی ذات کے لیے نہیں لیتا' وہ انہیں سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کے لیے لینا ہے یہ تُزَكِّيْهِمْ ہے'

---

[1] جس دن اللہ تعالیٰ مانگنے آئیں گے' انہیں دے دیں گے۔

[2] بعد ازاں اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہی زکوٰۃ کا مادہ ہے۔ برادرانِ عزیز! آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم میں حکومتِ خداوندی یا اسلامی مملکت سے کہا ہے کہ یہ زکوٰۃ دیتی ہے۔ زکوٰۃ کے کیا معنی ہیں؟ یہ ہے سامانِ نشوونما۔ اس اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ یہ انسانیت کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائے۔

قرآنِ حکیم کے برعکس سیکولر نظامِ حکومت میں زکوٰۃ کا خودساختہ تصور

سورۃ الحج کی یہ آیت ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ (22:41) یہ وہ لوگ ہیں کہ انہیں جب مملکت حاصل ہوگی، تمکن حاصل ہوگی، اپنے آپ کو، اپنی حکومت کو Establish (قائم) کریں گے تو کریں گے کیا؟ کہا کہ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (22:41) نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ (22:41) اور زکوٰۃ دیں گے، سامانِ نشوونما دیں گے۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ یہ بات کیا ہوئی؟ زیادہ سے زیادہ ہمارے ہاں جو یہ ذرا ماڈرن خیالات والے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ حکومت زکوٰۃ کو وصول کرے گی۔ اور پھر اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ اس کا حساب کتاب بھی الگ رکھے گی۔ یعنی اسلامی حکومت کے باقی جو محاصل ہیں، وہ تو سیکولر ہونگے اور یہ مذہبی ہوگا۔ وہ کہتے ہیں زکوٰۃ وصول کرے گی، الگ حساب رکھے گی اور پھر جس طرح ہم کہیں گے اس کے مطابق ہمارے اوپر صرف کرے گی۔ یہاں یہ و اٰتوا الزکوٰۃ ہے یعنی یہ کہا ہے کہ جب ان کی حکومت قائم ہوگی تو یہ زکوٰۃ دے گی تاکہ افرادِ معاشرہ کی نشوونما ہو۔

عزیزانِ من! آپ دیکھتے جارہے ہیں کہ قرآن کی اصطلاحات اور الفاظ کے جب ہم نے معنی اپنے ذہن کی رو سے متعین کیے تو ساری الجھنیں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ قرآن سے پوچھیے تو کہیں کوئی الجھن ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کتنی زکوٰۃ نکال دوں؟ اگر سال کے بعد اڑھائی فیصد ہے تو کیا نصاب؟ کیا شرح ہے؟ کس کو دینی ہے؟ کہاں خرچ کرنا ہے؟ یہ سوال ہی نہیں ہے۔ زکوٰۃ کے معنی سامانِ نشوونما ہیں۔ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ سامانِ نشوونما بہم پہنچائے گی۔ اور یہ وہ چیز ہے جو یہاں رسول اللہ ﷺ سے کہی گئی کہ ان سے یہ مال جو انہوں نے بچا ہوا ہے، وصول کرو۔ کاہے کے لیے کرو؟ یہ کہ تُزَكِّيْهِمْ (9:103) ان کے لیے سامانِ نشوونما بہم پہنچاؤ۔ اور آگے وہ لفظ وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (9:103) ہے یہاں وہی لفظ صلی علیٰ کا آگیا۔ خدا کہہ رہا ہے کہ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ (33:43) خدا اور اس کے ملائکہ جماعتِ مومنین، تمہارے اوپر یہ صلوٰۃ والی بات کرتے ہیں یعنی رسول سے حکم ہے، وَصَلِّ عَلَيْهِمْ جماعتِ مومنین کو حکم ہے کہ تم رسول کے ساتھ یہ کچھ کرو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ عملاً کس قدر ایک حسین سا تصور سامنے آرہا ہے۔ اس مشن کی کامیابی کے لیے، اس کو پروان چڑھانے کے لیے، یہ سب کچھ اس کے لیے ہو رہا ہے۔ خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید، رسول خود یہ کرتا ہے، وہ اپنا مال و جان لا کر حاضر کرتے ہیں تو وہ اس لیے کہ وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اور پھر اس کے جو معنی تحسین و تبریک (Appreciation) تھے، یہ بھی بڑی چیز ہے۔

مومنین کے لیے ذاتِ خداوندی کی طرف سے تحسین وتبریک کی آوازیں

عزیزانِ من! یہ ٹھیک ہے وہ دور ہی کھڑا کیوں نہ ہو‘ وہاں سے اگر للکار کر وہ کہہ دے کہ ’’او شاباش اے او جنے آ‘ کھڑا رہیں‘ تُو کلائیں ہیگا[1]‘‘ یہ وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ بڑی چیز ہوتی ہے۔ آگے ہے کہ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّهُمۡ (9:103) یہ جو تیری Appreciative (تحسین وآفریں آور) چیز ہوگی‘ یہ ان کے لیے بڑی وجہ تسکین ہوگی۔ قلب کا اضطراب رفع ہو کر اس کی جگہ ان کو ایک سکینت حاصل ہو جائے گی۔ اب صلی علیٰ کے جو الفاظ تھے وہ آپ کے سامنے آ گئے۔ خدا اور اس کے ملائکہ یہ کرتے ہیں۔ رسول سے کہا گیا کہ تم جماعتِ مومنین کے ساتھ یہ کرو۔ جماعتِ مومنین سے کہا کہ تم اس رسول کے ساتھ یہ کرو۔ اور اس کے بعد کہا کہ سَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا۔

ملتِ اسلامیہ کی اس جفاکشی اور شوقِ آگہی کو ماند کرنے کے لیے ایک گہری سازش کے خدوخال

برادرانِ عزیز! آپ دیکھتے ہیں یہ کتنا عظیم عملی پروگرام تھا! اور اس کے بعد جیسا کہ میں نے عرض کیا ہوا ہے‘ یہ قوم تو شمشیرِ برہنہ قوم پیدا ہوئی تھی‘ باطل کی ہر قوت کے ساتھ ٹکرانے والی ایک قوم‘ دنیا میں عدل اور انصاف اور احسان کو قائم کرنے والی ایک قوم۔ دنیا کا ہر باطل نظام کا پرستار‘ ملوکیت‘ سرمایہ داری‘ مذہبی پیشوائیت‘ طاغوطیّت‘ ہر قسم کی ابلیسیت سب اس سے خائف تھیں۔ یہ میدانِ جنگ میں ٹکراؤ سے تو کیا یہ ان کو مغلوب نہ کر سکیں!!! لیکن ’’مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ‘‘۔ انہوں نے آ کر یہ کیا کہ اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ تو خدا نے لیا تھا‘ اُنہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے‘ اس کے الفاظ کو محفوظ رکھتے رہو‘ اس کے Concepts (تصورات) کو‘ اس کی اصطلاحات کو‘ معنی وہ پہنا دیئے کہ یہ ایک مذہب کا صحیفہ بن کر رہ گئی۔ ’’تلاوت کرو‘ ثواب حاصل کرو‘ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں‘‘۔ صلوٰۃ تھی تو یہ ہوگئی‘ زکوٰۃ تھی تو وہ ہوگئی اور یہ جو صلی علیٰ جیسا عظیم پروگرام تھا اس فریضے کی ادائیگی کی شکل یہ ہوگئی کہ آپ بیٹھ کر یہ **اللھم صلی علیٰ محمد** پڑھیے‘ فریضہ ادا ہو گیا‘ آپ مطمئن ہیں۔ پھر مذہب کرتا یہ ہے کہ یہ جو چیزیں اس قسم کی محض فارم کی ہوتی ہیں‘ ان کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ

روزِ محشر کہ جاں گداز بود
اولیں پرسشِ نماز بود

وہاں اس قرأت کی اہمیت ہے‘ ادھر درود شریف کی اتنی زیادہ اہمیت جاگزیں کی ہوئی ہے صاحب! کہ آپ دیکھیے دل کی گہرائیوں کے اندر یہ پیوست ہے‘ یہ چیز جو ہے درود شریف کے فضائل‘ درود کا پڑھنا‘ وہ پڑھنے تک آ گیا۔ اور جنہوں نے یہ پڑھایا بھی آپ اس کی شکل

---

[1] او پیکرِ شجاعت! شاباش تمہارے۔ ڈٹ کر کھڑے رہنا‘ سنو! تم اکیلے نہیں ہو۔

دیکھیے، جو میں نے شروع میں عرض کیا تھا پھر دہرادوں کہ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ اللہ اور اس کے ملائکہ یہ کرتے ہیں، اے جماعتِ مومنین! تم بھی یہ کرو۔ اور جماعتِ مومنین جیسا میں نے کہا تھا، کہے جارہی ہے کہ **اللھم صلی علیٰ محمد** "تُوں وہی کر، تیرے فرشتے ای کردے رہن، ساہنوں کی لوہڑ پئی ہوئی ہیگی ❶"۔

ہزار ہزار دانوں کی تسبیح پر کہا جارہا ہے کہ "اللہ تو دُرود بھیجا کر"

پھر یہ چیز کہ ایک بار کہنے سے تو شاید نہ سنا ہو "پوری تسبیح سے کہے جا" "اے اللہ! درود بھیجا کر"۔ عزیزانِ من! لاکھ لاکھ دانے کی تسبیح ہے، ورد اس کے ہوتے ہیں، وظیفے اس کے ہوتے ہیں۔ یہ کیا بات تھی اور کیا بن کر رہ گئی۔ پھر اس کی برکات سنیے۔ کہتے ہیں کہ حضرت صاحب نے مچھلی پکڑی، وہ اس کو آ کر آگ کے اوپر بھونتے تھے، تو وہ تلی نہیں جاتی تھی، زندہ کی زندہ ہی تھی۔ بات سمجھ میں نہ آئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ نکالا، غور سے دیکھا، اس کے پروں پہ **اللھم صلی علیٰ محمد** لکھا ہوا تھا۔ تو سوچو پھر آگے واعظ کہتا ہے کہ "مچھی نوں اگ نئیں چھوندی جیہدے اتے درود لکھیا ہووے۔ تے جس مسلمان دے سینے دے اندر درود ہووے اوہنوں جہنم دی اگ چھو جائے گی ❷؟"۔ چل بھئی! مسئلہ ختم ہوا۔ اور یہاں کی آگ میں وہ انگلی دے تو وہ اسی وقت جلا دے۔

اسی حالت زار کے پیشِ نظر قرآن حکیم نے کہا تھا: "سوچا کرو"

برادرانِ عزیز! بڑی گہری سوچ کی باتیں ہیں کہ ہمارے ساتھ ہوا کیا ہے؟ اتنے جو عظیم تھے ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

اور اس آگ کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کرنے کے لیے آپ کے ساتھ ساری سازشیں ہوئی ہیں۔ معاف رکھیے گا، جو جی میں آئے، کسی کا کوئی کہتا پھرے۔ قرآن میرے سامنے ہے، قرآن ہاتھ میں ہو تو پھر لگی لپٹی نہیں رکھی جا سکتی۔ خدا کی سب سے بڑی لعنت اس کے اوپر ہوتی ہے، جو یہ کرے۔ میں اپنی طرف سے کبھی ایک لفظ نہیں کہا کرتا۔ قرآنِ کریم عربی زبان میں نازل ہوا ہے، عربی زبان کے آپ کے ہاں مستند لغت موجود ہیں۔ آپ جا کر خود دیکھیے۔ امام راغب کا ایک لغت لے لیجیے، دیکھیے کہ **صلی** کے ساتھ، جب **علیٰ** آتا ہے تو دیکھیے، اس میں کیا معنی لکھے ہوئے ہیں۔ پھر دیکھیے قرآن کی ان آیات کو کہ جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے، وہاں اس کے معنی کیا

---

❶ تُو ہی کر، تیرے فرشتے بھی یہ کرتے رہیں۔ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے۔

❷ جس مچھلی پہ درود شریف لکھا ہوا اسے آگ نہیں چھوتی۔ جس مسلمان کے سینے میں درود نقش ہو تو کیا اسے جہنم کی آگ چھو سکے گی؟

ہیں؟ جو سَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا سے خود اس کی وضاحت وہیں کر دیتا ہے لیکن اس سَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا کے معنی بھی سلام بھیجو ہو گیا۔ کیسے ہو گیا؟ میں نے ابھی سورۃ النسآء کی آیت (4:65) میں کہا ہے کہ خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہو گا' جو اپنے اختلافی معاملات میں اس شخص سے فیصلے نہ حاصل کرے اور پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ وہ دل میں گرانی محسوس کرے' وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا یوں سرِ تسلیم خم کرے۔ یہاں اب معنی یہ کر دیئے کہ سلام بھیجو تو بات ہی نہیں بنتی۔ عزیزانِ من! یہ تھی چیز جو کہا کہ

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

خودساختہ روایات کے تحت ایک عملی جدوجہد کو ثواب کے ایک لفظ میں محدود کر دیا گیا ہے

یہ جتنی فضیلتیں' یہ جتنی برکات' یہ جتنے ثواب اس درود کے کہے جاتے ہیں' وہ سارے ان روایات کی رو سے ثابت کیے جاتے ہیں جو نبی اکرم ﷺ کی وفات کے دواڑھائی سو سال بعد کہیں جا کر عجمیوں کے دور میں وضع ہوئیں اور وہ آپ کے ہاں اب عینِ دین بن گئیں۔ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا سے جو آپ نے فریضۂ خداوندی ادا کرنا تھا' وہ آپ نے چند الفاظ کے دہرانے سے کر دیا۔ اور پھر آگے بات چلی۔

میں نے پچھلی دفعہ بھی یہ عرض کیا تھا اور بار بار دہرا دوں کہ میرا تعلق کسی مذہبی فرقے سے نہیں ہے۔ فرقہ پرستی تو قرآن کی رو سے شرک ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ میں اس شرک سے بچا ہوا ہوں۔ اس لیے جب کبھی اس قسم کی کوئی بات آئے گی تو یہ نہ کہیے کہ یہ میری طرف سے کسی فرقے کی بات آتی ہے اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوۡنَ عَلَى النَّبِىِّ کے لیے۔ اللھم صلی علیٰ محمد کی یہ تو چیز آ گئی۔ اب اس کے بعد وعلیٰ آل محمد آیا۔ آپ نے دیکھا ہے کہ یہ آپ کی نمازوں کے اندر درود جز ہے جس کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی' اس درود کے اندر جو اتنی سی چیز تھی یعنی محمد ﷺ تک کی بات' وہ تو خدا کی تھی' اس کے آگے یہ علیٰ آل محمد کا اضافہ ہوا۔ انہوں نے یہ اضافہ کیا ہے۔ اِدھر سے اس سازش کا توڑ آلہ و اصحابہ ہوا۔ دیکھا اس کا توڑ۔ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات ؓ میں سے کسی پر کچھ طعن زنی کی' انہوں نے اس کے آگے وعلیٰ ازواجہ کہا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مکمل درود یوں ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں! اتنا ہی ہے: اللھم صلی علیٰ محمد و آل محمد۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہیں تک ہے ان کے توڑ کی وجہ سے سنیوں کے درود کے اندر آگے واصحابہ وازواجہ بھی شامل کیا جاتا ہے۔

صدیوں سے ہماری نماز فرقہ بندی کا سمبل بن کر رہ گئی ہے

برادرانِ عزیز! اندازہ لگائیے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ نماز کے اندر' نماز کے خاتمے سے پہلے' یہ جو فرقہ بندیاں ہیں' ان کو دہراتے

چلے جا رہے ہیں۔ وہاں آلِ محمد سے مراد ہوتی ہے "سادات نبی اکرم ﷺ کی وہ جو آل ہے"۔ اب سوچیے یہ جو سُنّی ہیں یہ تو بہر حال اس میں "آل" بھی ساتھ کہتے ہیں' اس کے بعد یہ کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ آل کے معنی سید کے ہیں۔ اب دیکھیے مثلاً سید کے خلاف عدالت کے اندر آپ 420 کا مقدمہ کیے ہوئے ہیں۔ ظہر کی نماز کا وقت آ جائے تو نماز کے اندر آپ اس کے اوپر درود وصلوٰۃ بھیج رہے ہیں' جس کو آپ عدالت میں کہہ رہے ہیں کہ یہ سب سے بڑا فریبی ہے' یہ بے ایمان ہے۔ عدالت کہتی ہے کہ آگے بیان کا حصہ تو دو۔ وہ کہتا ہے: " ٹھہر جاؤ ذرا میں ایہدے تے درود بھیج آواں۔ مسیتے جاکے ایہدے تے درود بھیجدا اائے' باہر نکلدے ای جتیاں ماردااے ❶"۔

عزیزانِ من! پھر میں وہی بات کرونگا' ان چیزوں سے سینے کے زخم چھل جاتے ہیں۔ دین کو اضحوکہ بنا دیا۔ عام انسانوں سے مذاق کرنا تو پھر بھی معاف ہو جاتا ہے لیکن خدا سے مذاق کرنے والی جو قوم ہے اس کو کبھی بخشا نہیں جاتا۔ کہا ہے کہ **وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ** (2:61) اور **ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْۤا** (3:112) جہاں کہیں یہ قوم جائے' ذلت اور مسکنت کی مار' خدا کا غضب' ان کے اوپر مسلط رہے گا۔ **اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ یَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ** (2:15) ہم سے مذاق کرتے ہو' خدا اس قسم کا مذاق کرے گا تو ذلیل وخوار ہو کر رہ جاؤ گے۔ محکومیت اور محتاجیوں کے ظلمات کے اندر اس قدر اندھے ہو کر تم چلتے چلے جاؤ گے کہ روشنی کی کرن بھی تمہارے سامنے نہیں آئے گی۔ تم خدا سے مذاق کرتے ہو' اس کے دین سے مذاق کرتے ہو اور سازش یہ ہے کہ پھر اس قسم کی چیزوں کو عینِ دین بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

برادرانِ عزیز! یہ تھا **صلوا علیه**۔ اب آیئے اور پھر وہ آیات سامنے لایئے جہاں سے بات شروع ہوئی تھی۔ کہا ہے کہ **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ - وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ** (2:153-54)۔ دیکھ رہے ہیں آپ! ان مجاہدین کا تذکرہ ہو رہا ہے جن پہ خدا اور اس کے فرشتے صلوٰۃ بھیج رہے ہیں' جنہیں حکم ہو رہا ہے کہ تم بھی نبی کے ساتھ صلوٰۃ میں شامل ہو' جنہیں کہا جا رہا ہے کہ اس نظام کی تقویت کے لیے سرِ تسلیم خم کر دو۔ یہ ان کا ذکر ہو رہا ہے جو اس سعی کے اندر صلوٰۃ بھیجتے ہوئے اس طرح سے سر دیدیں۔ کہا ہے کہ ان کو یہ نہ کہو کہ یہ مردہ ہیں' مردہ تو تم ہو کم بختو! ان کی کیفیت یہ ہے کہ **وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ** (2:155) قدم قدم پر ان کے ساتھ تصادمات ہونگے' مشکلات' معائب اور مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا' جانیں دینی پڑیں گی' مال خرچ کرنا ہوگا' اس کے اندر ثمرات کا زیاں ہوگا۔ یہ سب چیزیں ہونگی۔ **وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ - الَّذِیْنَ** (2:155-56) اور اے رسول! ان لوگوں کے لیے درخشندہ مستقبل کی خوش خبریاں دیدے جو اس راستے کے اوپر جم کر کھڑے ہوگئے۔ جن کی کیفیت یہ ہے کہ **اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ** (2:156) جب کوئی بھی نئی چیز' کوئی بھی

---

❶ ذرا ٹھہر جایئے' میں ذرا اس پہ درود بھیج آؤں۔ مسجد میں جا کر اس پر درود وسلام بھیجے اور باہر نکلتے ہی جوتم پیزار ہو۔

واقعہ ان کے سامنے سدِ راہ ہوتا ہے تو ان کا اعلان یہ ہوتا ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (2:156) ہم نے تو اپنے آپ کو اس کے ہاتھوں بیچ دیا ہوا ہے' ہمارا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھے گا جو ہم نے خدا کی وحی کے مطابق متعین کر لیا ہے' ہمارا کوئی قدم کسی دوسری طرف نہیں اٹھتا۔ اور یہ کچھ کہنے اور کرنے والوں کے متعلق یہ ہے کہ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (2:157) عزیزانِ من! اس صلٰوت کے اب معنی نہیں کیے جاسکتے۔ میں جو کہا کرتا ہوں کہ قرآن کا ترجمہ نہیں ہوسکتا صرف مفہوم ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ خدا اور اس کے ملائکہ کی کائناتی قوتوں کی تائید و نصرت ان کے شاملِ حال ہے' وہ ان کے اس مشن کو پروان چڑھانے اور کامیاب بنانے کے لیے' ہر قسم کے سامان ان کے لیے مہیا کرے گی۔

آ گے کہا ہے کہ وَ رَحْمَةٌ (2:157)۔ اب یہاں وہی سامانِ نشو و نما دیکھیے' رحمت کی حیثیت سے یہاں آ گیا۔ کہا کہ تم دعائیں مانگتے تھے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) بارِ الٰہا! زندگی کا وہ سیدھا اور ہموار راستہ ابھر اور نکھر کر ہمارے سامنے آجائے جو ہمیں بلاخوف و خطر ہماری منزلِ مقصود تک لے جائے۔ یہاں کہا کہ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (2:157) یہ ہیں وہ لوگ سیدھے صراطِ مستقیم پہ چل رہے ہیں۔ ان کے اتباع کی دعائیں مانگتے تھے یہ کچھ تم کرو۔ اور ہم نے اسی نماز کے آخر میں' جس میں پہلے یہ دعا مانگی تھی' اسی نماز کے آخر میں ہم نے **اللھم صلی علیٰ محمد و اٰل محمد** کہہ کر سمجھ لیا کہ یہ جو فریضہ **صلی علیٰ** تھا یہ تو ہم نے پورا کر دیا۔ آج اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

صلٰوت کی اس تفصیلی گفتگو اور وضاحت کے بعد حج کا ذکر' اور کچھ توہمات

عزیزانِ من! میرا خیال ہے کہ بات واضح ہوگئی ہوگی۔ اگرچہ ایک پورا درس اس نے لے لیا لیکن یہ بڑا اہم مقام تھا۔ اور یہ کچھ کہنے کے بعد' قرآن پھر آگے وہیں چلتا ہے' جو حج کے متعلق ہے یعنی وہی جو تمام دنیا کے الجھے ہوئے معاملات سنوارنے کے متعلق' جو اجتماع ہو رہا تھا' یہ اس پہ آتا ہے' پھر اس کی ذرا سی جزئیات میں بھی آتا ہے۔ ایک بات جو اگلی آیت میں آگئی ہے' میں وہ عرض کر دوں کہ اس نے کہا ہے کہ توہم پرستیوں کی طرف لے جانے والا کوئی راستہ نہیں۔ یاد رکھو! جب یہ دین عرب میں نہیں تھا' کعبہ تو موجود تھا' قومی حیثیت سے اس کی کچھ پرستش ہی کیا کرتے تھے' کچھ رسومات ادا کرتے تھے' کچھ توہمات تھے۔

صفا اور مروہ کی دو پہاڑیوں کے متعلق تورات کا بیان اور پھر ہمارے ہاں کی روایات کا جائزہ

یہ صفا اور مروہ کی جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں' ان کے متعلق ذہن میں یہ تھا کہ یہ پہاڑیاں مقدس بن گئی ہیں' ان کے اندر نہیں چلنا چاہیے یہ بہت مقدس ہیں۔ اور اس کے لیے آپ کو معلوم ہے کہ وہ ایک وضع کی ہوئی روایت تھی' وہ دراصل وضع کی ہوئی نہیں ہے' یہ تورات

سے لی ہوئی ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ اپنے شیر خوار بچے کو اور اپنی بیوی کو دوسری بیوی کے جلاپے کے کہنے کے مطابق' اندازہ لگائیے ابراہیمؑ کا ذکر ہو رہا ہے آپ کی روایات میں یہ چیز ہے' اس بیوی کو اور اتنے شیر خوار بچے کو لا کر یہاں وادئ غیر ذی زرع میں کہ جہاں کوئی آبادی تو ایک طرف رہی' کوئی کسی نباتات کا بھی نام ونشان نہیں تھا' گھاس کا تنکا بھی نہیں تھا' یہ کچھ کہا۔ ہاں تو انہیں وہاں لا کر تنہا چھوڑ دیا اور آپؑ چلے گئے۔ اور یہ بیچاری مامتا کی ماری ماں حضرتِ ھاجرہ' جب بچے کو پیاس لگی ہے تو وہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے' پانی کہیں نہیں ملتا۔ بھاگے بھاگے جاتی ہے' وہ ایک ٹیلے پہ چڑھتی ہے کہ دور سے کہیں پانی نظر آئے تو وہاں سے پانی لاؤں۔ جاتی ہے تو وہاں ڈر پیدا ہوتا ہے کہ بچے کو چھوڑ گئی ہوں' پیچھے سے کہیں کوئی بھیڑیا نہ اٹھا کر لے جائے۔ پھر بھاگتے ہوئے چلی آ رہی ہے اور بچے کو آ کر پھر دیکھتی ہے' پھر اس کا منہ چومتی ہے' پھر اس کو لٹاتی ہے' پھر بھاگتی ہوئی جاتی ہے۔ یعنی یہ آپ کے ہاں کی یہ صفا و مروہ کے متعلق ایک روایت ہے۔ اور اسی کے تابع ان لوگوں نے بھی یہ سمجھ لیا کہ یہ بڑی مقدس پہاڑیاں ہو گئیں' یہ وادیاں بڑی مقدس ہیں' ان میں قطعاً چلنا پھرنا نہیں چاہیے۔ مقدس مقامات میں یہ ہوتا ہے کہ وہاں کسی انسان کا پاؤں نہ پڑ جائے' ان کی بے حرمتی ہو جائے گی۔

کہا ہے کہ **اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ** (2:158) یہ جو پہاڑیاں ہیں' جیسا ہم نے تمہیں کہا تھا کہ یہ اس قسم کی چیزیں کوئی سمبل ہی ہیں۔ تو میں عرض کروں گا جب تاریخ میں آؤں گا کہ پھر یہ سمبل (Symbol) کیسے بنی ہیں؟ یہ پہاڑیاں مدافعت (Defence) کا سامان بہم پہنچاتی تھیں' یہ پہاڑیاں اس کعبے کی ڈیفنس کا کام دیتی تھیں۔ اس کا ایک ذہنی احترام ایسا ہی تھا جیسے 1965ء میں آپ نے اس نہر کے متعلق اپنے ذہن میں ایک بات قائم کی تھی۔ کہا کہ یہ اتنی سی چیز ہے۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ صاحب! اس نہر کے پانی میں ہاتھ نہیں ڈبونا چاہیے' ہمارے جو ہاتھ ہوتے ہیں' یہ گندے ہیں' یہ پاکیزہ اور مقدس نہر ہے' اس کا پانی بھی نہیں پینا چاہیے' اس میں نہانا بھی نہیں چاہیے' اس کے گرد بیٹھ کر رام جپنا چاہیے صاحب! یہ تو ہم پرستی آ گئی۔ کہا کہ یہ صفا اور مروہ کی پہاڑیاں شعائر اللہ ہیں۔ **فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ** (2:158) جو اس کانفرنس کے اندر آئے' یہ کانفرنسیں سالانہ ہوں یا ایمر جنسی میٹنگز ہوں' یاد رکھیے! حج اور عمرہ کے یہ معنی ہیں۔ حج تو وہ ہے جو متعین طور پر معلوم ہے کہ سال کے بعد یہ اجتماع ہوگا۔ اور اگر ہنگامی اجتماعات کی ضرورت ہے تو اپنی امتوں کے نمائندوں کو فوراً بلائیے۔ جو فوری ہنگامی اجلاس ہے' اسے عمرہ کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ جو اس کے لیے یہاں آئے **فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا** (2:158) تو اس میں کوئی بات مضائقے اور گناہ کی نہیں ہے کہ وہ ان کے اندر آ کر چلیں پھریں۔ کوئی مقدس چیز نہیں بن گئی ہے۔ اور اب آپ کو معلوم ہے کہ جو حج کر آئیں' ان کو پتہ ہے کہ وہ سعی بین الصفا والمروہ کرتے ہیں یعنی ان دونوں کے اندر چکر لگا لگا کر بھاگتے ہیں اور جو معذور ہوتے ہیں' سنا ہے کہ انہیں یہ جو وہیل چیئر ہیں' ان پر بٹھا کر ان کو وہاں پر چلاتے ہیں اور یوں وہاں انہیں سات پھیرے کرنے ہوتے ہیں۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے اس میں تو ہم پرستی کی بات نہیں ہے' یہ چیزیں فی ذاتہٖ کچھ مقدس نہیں

ہو جاتیں، یہ شعائر کا کام دیتی ہیں۔

وہاں پھر وہی بات ہے جو میں نے پہلے عرض کیا تھا' قرآن لے آتا ہے کہ یاد رکھو! یہ چیزیں صرف سمبل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰہَ شَاکِرٌ عَلِیۡمٌ (2:158) بات تو یہ ہے کہ تم دل کی رضامندی سے' نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے کیا کیا کام کرتے ہو۔ یہ ہے وہ چیز کہ جس کی وجہ سے شاکر محنتوں کا پھل دینے والا' عَلِیۡمٌ جاننے والا' تم کس نیت سے کیا بات کرتے ہو' بھلائی کے یہ کام کرنے سے تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کریں گی اس لیے کہ خدا کا قانونِ مکافات نیتوں تک سے واقف ہے۔ آپ دیکھتے ہیں شاکر کا لفظ یہاں کہاں آیا ہے؟ خدا کا قانونِ مکافات محنتوں کا پھل دینے والا بھرپور نتائج دینے والا ہے۔ یہ بھلائی کے کام بھی کوئی ایسی بات ہے جس میں کچھ محنت کی جا رہی ہے تو اس کے بھرپور نتائج بھی سامنے آئیں گے۔ اب یہ اگلی چیز کہی ہے۔

برادران عزیز! وقت دو تین منٹ باقی ہیں' بات اہم ہے' کہہ ہی دوں۔ کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَالۡہُدٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰہُ وَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰعِنُوۡنَ (2:159) یہ ہم نے اس طرح سے وضاحت سے بیان کر دیا کہ مقامِ ابراہیمؑ کیا تھا' قبلے سے مقصد کیا تھا' حج سے مقصود کیا تھا' مطلوب کیا تھا' یہ ساری چیزیں ہم نے کتاب میں بیان کر دیں۔

قرآنِ حکیم کے بیان کردہ حقائق سے دُوری کا نتیجہ پژمردگی اور افسردگی کے سوا کچھ نہیں ہوگا

عزیزانِ من! یہ چیز' یہ بات غور طلب ہے جو قرآن یہاں کہہ گیا کہ یاد رکھو! ہم نے اس کتاب میں یہ سب کچھ واضح کر دیا۔ اب اس کے بعد جو اس کو پردوں کے اندر چھپا کر رکھے' جو ان چیزوں کا کتمان کرے' ان کو چھپائے' ان کو باہر نہ آنے دے' اور ان کو محض رسومات بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرے' کہا کہ اس کے بعد ہمارا کیا جاتا ہے وہ خود ان تمام برکات سے محروم ہو جائے گا جو ان کے اندر خدا نے رکھی تھیں۔ اور وہیں سے محروم نہیں ہوگا' اس دنیا سے بھی جہاں جہاں ان کو یہ چیزیں ملیں گی' ان تمام قسم کی آسائشوں اور سہولتوں سے اور درخشندگیوں اور تابندگیوں سے یہ قوم محروم ہو جائے گی' جو ان چیزوں کو' جو خدا نے اپنی کتاب میں وضاحت سے بیان کر دی تھیں' چھپائے گا۔ آپ نے دیکھا کہ ان تمام چیزوں کی جو اصل اور حقیقت و غایت اور روح ہے' وہ آپ کی نگاہوں سے چھپائی ہوئی ہے۔ جو کتاب میں واضح طور پہ موجود ہیں' روایت کے پردوں نے ان سب کو چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ کہا کہ ان کی یہ کیفیت آ جائے گی لیکن اس میں ابدی مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں سے نظر آتا تھا کہ بس یہ قوم ختم ہوئی جس نے یہ کچھ کیا ہے' جس نے ان حقائق کو چھپایا ہوا ہے اور محض رسمیات میں الجھ کر رہ گئی۔ کہا کہ نہیں اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اَصۡلَحُوۡا (2:160) جو لوگ اپنی اس روش سے باز آ جائیں' پھر اپنی اصلاح

کرلیں' وہ اس سے محفوظ رہیں گے۔

قرآنی حقائق کے واضح طور پر سامنے آجانے کے باوجود ان کو چھپائے رکھنا خدائی نعمتوں سے محروم ہونا ہے

عزیزانِ من! سنیے! اگلا لفظ کیا آیا ہے۔ وہاں یہ کہا تھا کہ جو چیز ہم نے واضح طور پر کھول کر بیان کر دی' جو اس کو چھپا کر رکھے' اس کے ساتھ یہ ہوتا ہے۔ یہاں توبہ اور اصلاح کے بعد وَ بَیَّـنُـوْا (2:160) ہے جو بات قرآن نے کہی ہے' اس کو اعلانیہ واضح طور پہ جو کچھ کہنا شروع کر دے' یاد رکھیے! فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (2:160) ہم ان کی طرف پلٹ کر آتے ہیں۔ دیکھا! چھپائی ہوئی باتوں کے متعلق وہ کہتا یہ ہے' توبہ یہ ہے کہ دین کو جو مذہب بنالیا ہے' مذہب کو پھر دین بناؤ اور بتاؤ قرآن نے یہ کیا کیا چیزیں دی تھیں' ان کی غایت و مقصود کیا بتایا تھا۔ یہ ہے توبہ' یہ ہے اصلاح۔

ایسا کرلو گے تو پھر ہم بھی پلٹ کر تمہاری طرف آجائیں گے۔ اور جن کی طرف خدا پلٹ کر آجائے' آپ سوچتے ہیں' پھر دنیا میں ان کا مقام کیا ہوتا ہے۔ کہا کہ اِنَّ الَّـذِیْـنَ کَـفَـرُوْا وَ مَاتُوْا (2:161) جو اسی حالتِ کفر کے اندر جیے' اسی حالتِ کفر کے اندر مر جائے وَهُـمْ کُـفَّـارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِکَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا (2:161-62) پھر تو ان کے لیے محرومیاں ہی محرومیاں ہیں۔ آپ کو پتہ ہے ''لعنت'' کے معنی محرومی ہوتا ہے۔ ان کے لیے ہر قسم کی محرومیاں ہیں۔ اور تو اور خدا کی طرف سے محرومی تو ایک طرف' کہا کہ جو بلندئ کردار کی بناپہ' عام انسانوں کی طرف سے' جو کچھ تمہیں مرحمت ہونے والا ہے' وہ قوم اس سے بھی محروم رہ جائے گی۔ جو ان حقائق کو چھپا کر دین کو مذہب میں بدل دے گی' شعائر کو مقصود سمجھ لے گی' رسمیات کو مطلوب سمجھ لے گی' اس قوم کی کیفیت یہ ہوگی: خدا کے انعامات سے محرومی' کائنات کے انعامات سے محرومی' دوسرے انسانوں کی امداد و تقویت سے محرومی۔ بھیک کے ٹکڑوں کے اوپر وہ قوم دنیا کے اندر زندہ رہے گی۔ کہا کہ خٰـلِـدِیْـنَ فِیْهَـا لَا یُـخَـفَّفُ عَـنْـهُـمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ (2:162) پھر انہیں نہ مہلت دی جائے گی' نہ ان کی تباہی اور عذاب میں کسی قسم کی تخفیف کی جائے گی۔ یاد رکھو! بچنے کا طریقہ ایک ہے کہ وَ اِلٰـهُـکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (2:163) اس ایک خدا کے اقتدار کے سامنے جھکو' اس کی اس کتاب سے معلوم کرو کہ اس نے یہ کیا کہا ہے' اس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے' وہی رحمٰن و رحیم ہے۔

برادرانِ عزیز! ہم سورۃ البقرۃ کی آیت 163 تک آگئے۔ 164 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

چونتیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)، (آیت 164: انسان اور خارجی کائنات کا تعلق)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1969ء کی 23 تاریخ ہے۔ پچھلے اتوار موسم کی خرابی کی وجہ سے درسِ قرآنِ کریم میں ناغہ رہا۔ آج سورۃ البقرۃ کی آیت 164 سے آغازِ کلام ہوتا ہے: (2:164)۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک غیر مرئی بسیط حقائق کو پیش کرنے کا طریق

سابقہ آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ وَاِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِیۡمُ (2:163) ساری کائنات میں اقتدار اور اختیار صرف ایک خدا کا ہے' اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ یہ دین کی بنیادی حقیقت ہے کہ اقتدار صرف ایک ذات کا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ ایک Abstract Truth (غیر محسوس سچائی) ہے' بسیط' مجرد اور غیر مرئی حقیقت ہے' جو دیکھی نہیں جا سکتی' محسوس نہیں کی جا سکتی۔ اس قسم کے حقائق جو قرآن پیش کرتا ہے' ان کے لیے وہ جو دلائل پیش کرتا ہے' وہ عالمِ محسوسات سے متعلق ہوتے ہیں۔ قرآن کا عجیب انداز ہے۔ ایک بسیط حقیقت کو' Asbtract Truth (غیر محسوس صداقت) کو سمجھانے کے لیے بہترین انداز ہی یہ ہو سکتا ہے کہ اسے محسوس دلائل سے سامنے لایا جائے۔ اور یہ چیز کہ کائنات میں اقتدار ایک ہی ذات کا ہے' اس کے لیے قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ خارجی کائنات' جسے کہتے ہی World of Concrete (محسوس کائنات) ہیں' اس محسوس کائنات کے نظم و نسق کو سامنے لاتا ہے۔ اور کہتا یہ ہے کہ تم بتاؤ کہ تمہارا مشاہدہ' تجربہ' مطالعہ تمہیں کس نتیجے پر پہنچاتا ہے؟ یہ بات آج سے چودہ سو سال پہلے کہی گئی۔

علت ومعلول کے علاوہ تمام کی تمام کائنات کے لیے ایک وحدتِ قانون کا غیر متبدل اصول

سائنس کے انتہائی انکشافات، جو اس نے اس کائنات سے متعلق بنیادی قانون یا قوانین منکشف کیے ہیں، ان میں سب سے بنیادی دو قوانین ہیں۔ ایک ہے Law of Cause & Effect (قانونِ علت ومعلول) کہ ہر واقع جو سامنے آتا ہے، اس کے پیچھے اس کا ایک سبب ہوتا ہے اور ایک سبب جو ہے، وہ ہمیشہ ایک قسم کا نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ اور دوسرا ہے Law of Uniformity of Nature کہ ساری کائنات میں وحدتِ قانون ہے، ایک ہی قانون ہے جو ہر جگہ کارفرما ہے۔ آپ دیکھیے کہ یہ وحدتِ قانون، سائنس کا انتہائی انکشاف ہے۔ اور قرآن اپنے اس دعوے کے ثبوت میں بطور دلیل اسی کو پیش کرتا ہے کہ کائنات میں صاحبِ اقتدار ایک ہی ذات ہے۔ اس سے بڑا اہم سوال سامنے آتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آخری آیت میں والٰھم الٰہ واحد (2:163) تھا اور اس کے بعد اگلی آیت ہمارے سامنے آتی ہے کہ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّھَارِ وَ الۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِھَا وَ بَثَّ فِیۡھَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (2:164)۔ کہتا ہے اس خارجی کائنات کے اندر ذرا غور تو کرو۔ اور خارجی کائنات کے نظم ونسق کے ایک ایک گوشے کو وہ سامنے لے آیا۔ اختلافِ لیل ونہار، سمندر میں اتنے بوجھ لادی ہوئی کشتیاں جو بطخ کی طرح تیرتی چلی جاتی ہیں، بادلوں سے پانی کا برسنا، اس سے مردہ زمین کا حیاتِ تازہ حاصل کر لینا، پھر اس کی وجہ سے اس میں تمام جانداروں کا پھیلاؤ، ہواؤں کے رخ، بادلوں کا تسخیر ہو جانا، مسخر ہو جانا۔ یہ تمام چیزیں وہ کہتا ہے کہ یہ ایک نشانی ہے، ایک ثبوت ہے، ایک دلیل ہے۔ کس چیز کی ہے؟ اس کی کہ وَ اِلٰـھُکُمۡ اِلٰـہٌ وَّاحِدٌ (2:163) یہاں ایک ہی صاحبِ اختیار واقتدار ہے۔ لیکن یہ نشانی کن کے لیے ہے؟ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (2:164) اس قوم کے لیے جو عقل وفکر سے کام لیتی ہے۔ یہ حقیقت اب آپ کے سامنے آگئی ہے اور جسے میں برسوں سے دہرائے چلا جا رہا ہوں کہ اسلام مذہب نہیں ہے، دین ہے۔

دین کے مقابلے میں دنیا بھر میں پائے جانے والے مذہبی تصورات کی نوعیت اور نتائج

مذہب اور دین میں جہاں اور امتیازی گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں، ایک بنیادی گوشہ یہ بھی ہے کہ مذہب میں انسانی زندگی کا منتہا ایک فرد کی نجات ہے، Salvation ہے، مکتی ہے، اس سے زیادہ اور کوئی مذہب کا مقصد نہیں ہے۔ اس کا طریقہ کیا ہے؟ یہ کہ خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ سا تعلق ہے۔ مذہب کی دنیا میں انسان کو اس کائنات اور اس کے نظم ونسق سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس کا واسطہ ہی مذہب سے نہیں ہے۔ یہی نہیں کہ اس کا واسطہ نہیں ہے، دو قدم آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اس کائنات سے دور بھاگنا، یہ ہے

مذہب کی تلقین اور تعلیم۔ اس مادی کائنات کو قابلِ نفرت سمجھنا' یہ ہے مذہب کی بنیاد۔ دنیا کے ہر مذہب کی یہی صورت ہے' مذہب کے اندر یہ قدرِ مشترک ہے۔ اس لیے کہ مذہب کی دنیا میں نجات سے مفہوم ہی روح کا اس مادے کی دلدل سے نکل جانا ہے۔ تو جو مادہ اس قدر کثیف' غلیظ' کیچڑ نما ہو' جس میں روح پھنسی ہوئی ہے اور اس سے چھٹکارہ حاصل کرنا منتہا و مقصود ہے' اس مادی کائنات کو قابلِ نفرت نہیں سمجھا جائے گا تو اور کیا سمجھا جائے گا۔ لہٰذا اس کائنات کے متعلق انسان کا زاویۂ نگاہ کیا ہونا چاہیے؟ مذہب کی دنیا کو اس سے واسطہ نہیں تھا۔ مذہب کی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں Primitive (قدیم' ابتدائی' غیر مہذب) سا ایک انسان' ابتدائی دور کا انسان ہے۔ اس کا جو تصور تھا' اس کے لیے وہ ہمارا سب سے قریبی ہمسایہ' یہ بھارت ہے۔ ان کے ہاں جو مذہب ہے' اس میں اس کے زندہ شواہد ملتے ہیں۔

انسانی زندگی کے ابتدائی دور میں کائنات کے متعلق انسانی سوچ کی حالت زار

زندگی کے ابتدائی ایام میں انسان نے اپنے آپ کو بڑا ہی نہتا' عاجز' بیچارا' بے کس پایا۔ وہاں اسے رہنے کے لیے کہا گیا یا اس دنیا میں جب یہ آیا تو اپنے گرد و پیش اس نے ہر شے کو نامساعد پایا۔ بڑے بڑے سیلاب' آتش فشاں پہاڑ' جھکڑ' آندھیاں' آسمان سے آگ کے گولے برستے تھے' زمین بھی ابھی اتنی تپی ہوئی تھی' بڑے بڑے پہاڑ' مہیب دریا' بڑے بڑے درندے اور ان کے اندر نہتا انسان۔ انسان کو ان سب چیزوں کے مقابلے کے لیے تو عقل و فکر ہی ملی تھی۔ یہ ابھی Undeveloped Form (غیر نشو و نما یافتہ حالت) کے اندر تھی۔ انسان نے ابھی اس سے کام لینا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اتنے نامساعد حالات' اس میں نہتا گھرا ہوا انسان۔ اب اسے دشمن سے محفوظ رہنے کا' ان بلاؤں سے حفاظت پانے کا' ایک یہی طریقہ آتا تھا کہ وہ ان کے سامنے گڑگڑائے' ہاتھ جوڑے' منت کرے' خوشامد کرے' نذر و نیاز دے۔ چنانچہ اس کی کیفیت یہ ہوئی کہ بادل گرجا اور وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا' بجلی چمکی اور وہ سجدے میں گر گیا' مہیب دریا سامنے آیا اسے ماتا کہہ کر پکارنے لگ گیا' سانپ پھنکارا تو اس نے اس کے سامنے دودھ ڈالا' شیر کو اس نے دیوتا بنایا' پہاڑوں کو اس نے دیوتا کہا' اگنی دیوی' اندر دیوتا۔ کچھ اور اس کی سمجھ میں آتا ہی نہیں تھا۔ یعنی اس نے ساری کائنات کے مسجود اپنے آپ کو ساجد سمجھا' انسان سجدہ کرنے والا باہر کی کائنات کے سامنے۔ یہ ہے اولیں تصور جو مذہب کی دنیا سے خارجی کائنات کے متعلق انسان کو ملا۔ اس سے ہم آگے بڑھتے ہیں۔ مذہب کی دنیا سے ہٹ کر فلسفے کی دنیا میں آتے ہیں جو عقل و فکر کی دنیا کہی جاتی ہے۔

اڑھائی ہزار سال پیشتر حکمائے یونان کے نزدیک کائنات کا تصور

آج سے قریب اڑھائی ہزار سال پہلے یونان عقل وفکرِ انسانی کا گہوارہ تھا لیکن اس گہوارے میں انسان اور کائنات کے تعلق کی صورت کیا تھی؟ فلاسفروں کا ابوالآباء سقراط (C469-399 B.C) کہلاتا ہے۔اس کا فلسفہ یہ تھا کہ مطالعہ کے قابل صرف انسان کی ذات ہے باہر کی کائنات اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے اپنے فلسفے کی ساری توجہات کا مرکز انسان کا مطالعہ قرار دیا۔ یہ وہی فلسفہ ہے جس کا اثر ہمارے ہاں مشرق میں بھی بعد میں آیا۔حکمائے یونان کے اس فلسفے کا اثر دنیا کی قوموں نے بڑی گہری حالت تک لیا تھا۔ ہمارے ہاں بھی ایک اثر دیر تک رہا' آج تک بھی ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں کا وہ مشہور شاعر انسان سے مخاطب ہو کر لکھتا ہے کہ

ستم است اگر ھوست کشد کہ بہ سیر سرو وسمن در آ
تو زغنچہ کم نہ دسیدہ ای درِ دل کشا بچمن در آ

او یہ تو بڑی زیادتی ہے کہ تُو اٹھ کر باہر جا کر باغ کی سیر کو چلا جائے' وہاں گل وبوٹے کو دیکھے۔تیری ذات کے اندر خود ایک چمن زار ہے' دل کا دروازہ کھول' اس کی سیر کے لیے نکل اور دیکھ کہ یہ باغ کتنا حسین ہے۔ باہر کے باغات میں نہیں' اندر کے باغ میں آیئے۔ (مرزا اسد اللہ خاں) غالب (1869-1797) کے الفاظ میں کہ

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

سقراط کا دیا گیا تصور کائنات جو آج تک ماند نہیں پڑا

انسان کی اپنی ذات قابلِ مطالعہ ہے۔سقراط (C 469-399 B.C.) سے ہم آگے بڑھتے ہیں تو افلاطون (384-322 B.C.) ہمارے سامنے آتا ہے۔اس نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔اس نے کہا کہ باہر کی یہ سب دنیا فریبِ خیال ہے' اس کا وجود ہی کہیں نہیں ہے۔انسان اپنے خیالات میں جو کچھ تصور میں لاتا ہے' وہ باہر اس کو موجود نظر آتا ہے۔اگر کوئی سوچنے والا دل موجود نہ ہو تو باہر کی کائنات معدوم ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت میں Exist (موجود) ہی نہیں کرتی۔اور یہی وجہ ہے جو اس نے کہا کہ یہ جو حواس کے ذریعے علم حاصل کرنا ہے' جسے Perceptual Knowledge (علم بالحواس) کہتے ہیں یعنی 'Knowledge Through Perception' (حواس کے ذریعے علم حاصل کرنا) یہ علم نہایت ناقابلِ اعتماد ہے' اس پہ بھروسہ ہی نہیں کرنا چاہیے۔یہی اس کا فلسفہ ہے جو آج تک مشرق کی تمام

اقوام کے اعصاب پر سوار چلا آ رہا ہے۔

ہندومت کے نزدیک مادہ کی دنیا کو فریب تصور کیا جاتا ہے

میں نے اس وقت مشرق اس لیے کہا کہ مغرب بھی صدیوں تک اسی فریب میں الجھا رہا لیکن بالآخر انہوں نے اس جال کو توڑ دیا۔ یہ ایک الگ تاریخی بیان ہے۔ بیکن (1561-1626 A.D) نے کس طرح سے اس کی ابتدا کی' کس طرح سے وہ قرآن سے متاثر ہوا' کیسے اس زمانے کے مسلمان سائنسدانوں نے اس کی توجہ ادھر مبذول کرائی لیکن بہرحال یورپ کچھ صدیوں پہلے اس جال کو توڑ چکا تھا۔ مشرق کے اعصاب پر ابھی تک یہی تصورات چھائے ہوئے ہیں اور ان تصورات نے پھر ہندو فلسفے کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ ان کے ہاں ویدانت کا جو فلسفہ ہے' وہ یہ ہے کہ یہ مادہ کی دنیا ہے' یہ Material World (مادی دنیا) ہے' اس کو وہ مایہ کہتے ہیں' فریب کہتے ہیں' سراب کہتے ہیں' اسے وہ ایشور کا خواب کہتے ہیں کہ جونہی اس نے آنکھ کھولی یہ سب ختم ہو جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ اسے ایشور کی لیلا رچائی ہوئی کہتے ہیں' ایک ناٹک کا کھیل ہے' ایشور کا رچایا ہوا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں پرماتما کا ایک نام نٹ راجن بھی ہے یعنی نٹوں کا راجہ' تھیٹر کے ایکٹروں کا سب سے بڑا راجہ۔ باہر کی کائنات کے متعلق تصور یہ ہے کہ In Reality (حقیقت میں) یہ Exist (موجود) نہیں کرتی' یہ فی الواقعہ موجود نہیں ہے۔ تصور ہے' خواب ہے' ایک تھیٹر ہے' ایک ڈراما ہے فی الواقعہ نہ یہ Exist (موجود) کرتی ہے' نہ یہ اس قابل ہے کہ اس کا Seriously (سنجیدگی سے) مطالعہ کیا جائے' اس میں دل لگایا جائے اسے قابلِ توجہ سمجھا جائے۔ یہی وہ چیز ہے جو میں نے کہا ہے کہ مشرق کے مفکرین کے دماغوں پر چھائی رہی۔ (مرزا اسد اللہ خاں) غالب (1797-1869) کے الفاظ میں

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

یہ تمام عالم حلقۂ دامِ خیال ہے' اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

دنیائے مذاہب کے متعلق ''مذہب اور سائنس'' کے عنوان پر ایک ناقابلِ فراموش کتاب

اس کے مقابلے میں' میں نے عرض کیا ہے کہ یورپ میں جب سائنس کی دنیا کے ساتھ اس کا تعارف ہوا ہے تو ان کی سائنس نے یہ بتانا شروع کیا کہ یہ چیزیں فی الواقع موجود ہیں' ان کے یہ خواص ہیں' ان کی یہ Qualities (صفات) ہیں۔ وہاں مذہب اور سائنس میں ایک جنگ چھڑ گئی۔ ''معرکۂ مذہب و سائنس'' کتاب تو آپ نے سنی ہوگی وہ ریسرچ کی کتاب ہے' یہ اصل انگریزی کتاب

"Conflict Between Religion & Science" ہے یہ بڑی معرکے کی کتاب ہے ❶۔''معرکۂ مذہب و سائنس'' اس انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جو ظفر علی خاں مرحوم (1956-1874ء) نے کیا تھا۔ یہ ایک کتاب نہیں یہ یورپ کا وہ پورا دور ہے جو ایک معرکہ ہے' ایک جنگ ہے جو مذہب اور سائنس کی ایک لڑائی ہے۔ اور چونکہ مذہب پرست طبقے کا وہاں چرچ' کلیسا' میں ابھی زور تھا مذہبی پیشوائیت بڑی صاحبِ اقتدار تھی' اس لیے وہاں اہلِ علم' اہلِ سائنس یعنی اس Universe (کائنات) کو حقیقی کہنے اور سمجھنے والوں پر اس قدر مظالم ہوئے ہیں کہ آج ان کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ اتنی سی بات کہنے سے کہ یہ زمین گول ہے' زمین گردش کرتی ہے' وہ پھانسی کے تختے پہ چڑھا دیئے گئے' ان کی کھالیں کھنچوا دی گئیں' ان کو زندہ جلا دیا گیا' ابھی کل تک وہاں یہ بات ہو رہی تھی۔

آج سے چودہ سو سال پیشتر وحی کی طرف سے عقل کو جلا بخشنے والے کائناتی حقائق

میں نے یہ عرض کیا ہے کہ مذاہب کی دنیا میں وہ تصور آ رہا تھا۔ جن خطوں کو ہم عقل و دانش کا گہوارہ کہہ رہے ہیں وہاں خارجی کائنات کے متعلق یہ فلسفہ تھا۔ آج یورپ جسے خارجی کائنات سے متعلق انکشافات میں' Pioneer (السابقون الاوّلون) سمجھا جاتا ہے' دو تین صدیاں پہلے تک اس کی کیفیت یہ تھی کہ اتنی سی بات کہنے سے کہ زمین گردش کرتی ہے یا گول ہے' کھال کھنچوا دی جاتی تھی۔ اس کے مقابلے میں آج سے چودہ سو سال پہلے کی ایک دنیا پہ نگاہ ڈالیے اور عرب کا خطہ لیجیے جو اس دور میں بھی علم اور سائنس کے اعتبار سے سب سے پیچھے تھا۔ سائنس کا تو خیر نام ہی ابھی نہیں لینا چاہیے۔ فلسفے کے اعتبار سے بھی' علم کے اعتبار سے' اس زمانے کا یوں کہیے کہ تاریک تر خطہ تھا۔ اس خطے کے اندر درمیان میں حجاز کا ایک علاقہ واقع ہے' جہاں کوئی جانتا ہی نہیں تھا کہ کائنات کسے کہتے ہیں۔ اس کے اندر ایک شخص ﷺ پیدا ہوتا ہے اور سنیے کہ وہ اس کائنات کے متعلق کیا کہتا ہے۔ اور یہی چیز تھی جو اس نے کہا کہ میں یہ اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر وہ یہ نہ بھی کہتا' اس دور کا انسان اپنی طرف سے یہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ سقراط (C.469-399BC) نہ کہہ سکا' افلاطون (C.384-322 B.C) نہ کہہ سکا' مشرق و مغرب کے بڑے بڑے حکما اور فلاسفر نہ کہہ سکے تو چودہ سو سال پہلے کا عرب کے خطے کا ایک شخص ﷺ اپنی طرف سے کیسے کہہ سکتا تھا؟ اس نے اپنی وہ کتاب پیش کی اور کہا کہ یہ دیکھیے! یہ میرے علم کا منبع ہے' اس کے شروع میں ہی انسان اور کائنات کے تعلق کی ایک تمثیلاً کہانی بیان کی۔

---

❶ Draper John William (1910). History of the Conflict Between Religion & Science (25th edition). London:Kegan Paul, Trench, Thrabner & Co. Ltd.

ہندو مذہب کی موجودہ حالت آج بھی اس کی ذہنی پستی کی ترجمانی کر رہی ہے

برادرانِ عزیز! انسان کے متعلق میں پھر کہوں گا کہ یہ کتاب مبین آپ کے سامنے آج بھی موجود ہے۔ اس کی تعلیمات کے برعکس دنیا کے یہ مذاہب' خاص طور پہ یہ ہندو مذہب ہے' آج بھی ان کے ہاں گنگا کو' ماتا' 'ہی کہا جاتا ہے' آج بھی ان کے ہاں اِندر (بارش کو) کو دیوتا ہی کہا جاتا ہے' اگنی یا آگ کو آج بھی وہ اپنے ہاں دیوی ہی مانتے ہیں' آج بھی وہ سانپ کی پرستش کرتے ہیں' آج بھی وہ گائیوں کو دیوی کہتے ہیں۔ اس وقت بھی ان کے مندروں کے اندر یہ تمام دیوی دیوتا بنے ہوئے ہیں' یہ جتنے بھی مظاہرِ فطرت اور مظاہرِ کائنات ہیں' وہ ان کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ اس اُمی ﷺ نے چودہ سو سال پیشتر یہ کہا کہ جب آدم کی تخلیق ہوئی ہے تو کائنات کی ساری قوتوں نے اسے سجدہ کیا۔ اس چودہ سو سال پہلے کے انسان ﷺ نے اپنی پہلی ہی آواز میں ساجد کو مسجود اور مسجود کو ساجد بنا کر دیدیا۔

وحی نے انسان کو جہالت کی پستیوں سے اٹھا کر کائناتی علم کا گرویدہ بنا دیا

عزیزانِ من! پوچھتے ہیں کہ صاحب! اس قرآن کے متعلق کیا دلیل ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہے؟ چھوڑ دیجیے مابعد الطبیعات (میٹافزکس) کے جو بڑے بڑے مباحث ہیں' میں کہتا ہوں کہ یہ جو آپ کی World of Concrete (محسوس کائنات) ہے' اس کے متعلق پہلا اعلان جو سورۃ البقرۃ کے اندر آپ کو ملتا ہے' کیا یہ اس کی شہادت نہیں ہے کہ چودہ سو سال پہلے' عرب کے خطے کا ایک اَن پڑھ انسان' یہ بات خود نہیں کہہ سکتا تھا کہ کائنات کی ہر قوت' جسے اس نے ملائکہ سے تعبیر کیا ہے' اس نے آدم کے سامنے سجدہ کیا اور وہ قوتیں اس کے سامنے جھک گئیں۔ یہ کس بنا پہ جھک گئیں؟ یونہی نہیں کہانی بتا دی۔ بتایا کہ **وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا** (2:31) اس آدمی کے اندر اس کی صلاحیت دیدی گئی تھی کہ وہ کائنات کی تمام اشیا کے متعلق علم حاصل کر سکتا ہے۔ یہ علمِ اشیائے کائنات کیا چیز ہے؟ یہ کہ کائنات کی ہر شئے' ایک لگے بندھے قانون کے مطابق سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ اگر آپ کو اس قانون کا علم ہو جائے' جس کے مطابق وہ مشین چلتی ہے' وہ مشین آپ کے تابع فرمان ہو جاتی ہے۔ یہ آپ دیکھتے ہیں کہ آج آسمان کی بجلیاں سمٹ کر' انسانوں کے ہاتھوں میں کیسے آ گئیں۔ پہلے تو جب ہم آسمان کہتے تھے' تو ذہن میں نہیں آتا تھا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ آج یہاں زمین کے اندر بیٹھے ہوئے' ایک کمرے کے اندر' چاند پہ جانے والے راکٹ کا کنٹرول' یہاں بیٹھے ہوئے ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ **عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا** (2:31) ہے کہ اس نے اس چیز کا علم حاصل کر لیا ہے کہ کائنات کے اندر یہ Working Formula کیا ہے' ایٹمی قوتیں کیا ہیں' ریڈیائی توانائیاں کیا ہیں' کس طرح سے کسی خارجی ذریعے' جسے اس سے پیشتر ہم محسوس ذریعہ کہتے تھے' کے بغیر لاکھوں میل دور فاصلے کے اوپر چاند کے قریب پہنچا ہوا راکٹ' براہِ راست ہم تک اپنی آواز پہنچا دیتا ہے؟ یہ کیا چیز تھی اور ہے؟ یہ ہے **عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا**

(2:31)۔ میں پھر عرض کردوں کہ یہ کب کہا گیا؟ یہ اس زمانے میں کہا گیا جب ابھی چاند کو بھی دیوتا مانا جاتا تھا‘ سورج کو بھی دیوتا مانا جاتا تھا‘ اس زمانے میں جب فلسفے کی دنیا میں یہ کہا جاتا تھا کہ ”عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے“ کہ یہ کائنات باہر اپنا وجود ہی نہیں رکھتی۔ اس زمانے میں یہ چیز کہی جارہی ہے۔ قرآن یہ پیش کررہا ہے۔

انسان کے سامنے کائنات کے جمالاتی پہلوؤں کا ذکر

آیئے! اس کے بعد انسان کا اور خارجی کائنات کا تعلق دیکھیں کہ وہ کیا بتاتا ہے؟ اسے یوں کہیے کہ وہ ایک اصول دیا تھا‘ اجمالاً ایک بات کہی تھی کہ آدمی ملائکہ کا مسجود قرار پاگیا۔ اب اس اجمال کی تفصیل سامنے آتی ہے‘ اس اصول کی جزئیات محسوس شکل میں سامنے آتی ہیں۔ کہا ہے کہ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ دَآئِبَیۡنِ (14:33) یہ شمس اور قمر جو ہمیشہ مصروفِ گردش رہتے ہیں‘ اے انسانو! تمہارے لیے ہم نے ان کو مسخر کردیا۔ زمین کے اوپر ان کے سامنے سجدہ کرنے والے انسان سے کہا جارہا ہے کہ تُو جنہیں اپنا معبود سمجھ رہا ہے‘ یہ تو تیرے لیے قانون کی زنجیروں کے اندر مسخر کردیئے گئے ہیں۔ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَ النَّهَارَ (14:33) اور دن اور رات کی گردشیں‘ جو تمہیں نظر آتی ہیں‘ وہ سب تمہارے لیے قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ اور یہ لکم کا جو ’ل‘ ہے‘ یہ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ”ل نافع“ ہے۔ کہا ہے کہ ”تمہارے فائدے کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا ہے‘ یہ تمہاری منفعت کے لیے کیا گیا ہے‘ ان چیزوں سے تم نے فائدے حاصل کرنے ہیں“۔ یہ گردشِ لیل ونہار سے اور تسخیرِ شمس وقمر سے ہے۔ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الۡاَنۡهٰرَ (14:32) بظاہر یہ بات آج کچھ اہم نہیں نظر آتی لیکن دریاؤں کو دیوتا ماننے والوں سے پوچھیے کہ انہیں یہ کہنا کہ تم ان دریاؤں کو کیوں معبود سمجھ رہے ہو‘ بڑی بات ہے۔ یہ تو اس لیے بہائے گئے ہیں کہ تمہارے کام آئیں گے‘ تمہارے لیے منفعت کا سامان بنیں گے‘ یہ تمہارے لیے اتنی بڑی تسخیر ہے۔ اور بھی چار پانچ چیزیں گنانے کے بعد کہا کہ لمبی چوڑی تفصیل میں کیوں جاتے ہو؟ ہم نے تو وَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡهُ (45:13) اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے‘ وہ اس خدا نے تمام کا تمام تمہارے لیے مسخر کردیا۔ یہ اس کی طرف سے تمہارے لیے مسخر کیا ہوا ہے۔ عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے‘ عرب کے خطے کا‘ دنیا کی اصطلاح میں‘ ایک اَن پڑھ یہ اعلان کررہا ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں سب کا سب اس کی طرف سے تمہارے لیے قانون کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا گیا ہے اور تمہیں اس کے علم حاصل کرنے کی صلاحیت دیدی گئی ہے۔ علم حاصل کرو اور ہر شے کو تابعِ تسخیر بناتے چلے جاؤ۔

کائنات کا ذرہ ذرہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کی کوئی شے بھی فریب نگاہ نہیں ہے

اب آیئے وہ جو کہتے تھے کہ یہ خارجی کائنات سب فریبِ نگاہ ہے‘ سب مایہ ہے‘ سراب ہے‘ حلقۂ دامِ خیال ہے۔ کہا کہ وَ مَـــا

خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (15:85) اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اس میں کوئی شے بھی تم دیکھو وہ فریبِ نگاہ نہیں ہے۔ باطل حق کے مقابلے میں آتا ہے۔ حق کہتے ہیں ''جو چیز فی الواقع ٹھوس حقیقت ہو Exist (موجود) کرتی ہو''۔ حق کہتے ہیں ''وہ شے جو کسی تعمیری مقصد کے لیے وجود میں آئی ہوئی ہو''۔ حق کہتے ہیں ''ہر وہ شے جس کا ایک Purpose (مقصد) ہو''۔ حق کہتے ہیں ''وہ شے جو ٹھیک ٹھیک کسی تقاضے کے لیے فِٹ ان ہو جائے''۔ یہ عربی زبان کا عجیب جامع لفظ ہے۔ قرآن ان معنی میں اس لفظِ حق کو استعمال کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جب باطل لاتا ہے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہا کہ یہ کہتے ہیں کہ یہ فریبِ نگاہ ہے' یہ Exist نہیں کرتا۔ ہم نے اس کو بالحق پیدا کیا ہے' ایک ٹھوس حقیقت ہے' یہ جو کائنات ہے فریبِ نگاہ نہیں ہے' مگر یہ اسے سراب کہتے ہیں' ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (38:27) یہ علم نہیں ہے' یہ ان لوگوں کا ظن اور قیاس ہے' کفروا جو حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔ چودہ سو سال پہلے ایک اَن پڑھ دنیا بھر کے علما سے یہ کہتا ہے' فلاسفرز سے یہ کہتا ہے' افلاطون سے کہتا ہے' سقراط سے کہتا ہے کہ یہ جو تم نے کہا ہے' یہ تمہارا ظن اور خیال ہے' تخمین ہے' انداز ہے' حقیقت صرف یہ نہیں ہے' یہ علم نہیں ہے جو کچھ تم کہتے ہو۔ یونان کے فلاسفر کو ایک اَن پڑھ کہہ رہا ہے کہ یہ علم نہیں ہے جو کچھ تم کہہ رہے ہو' یہ تمہارا ظن ہے' قیاس ہے۔ اور انہی خطوں میں چند ہی سو سال کے بعد اہلِ فلسفہ نے یہ کہہ دیا کہ واقعی وہ ظن و تخمین تھا جو افلاطون اور سقراط کہہ گئے تھے۔ کائنات بالحق Exist کرتی ہے۔

کائناتی حقائق کو نظر انداز کرنا کفر ہے

عزیزانِ من! پوچھتے ہیں کہ کیا ثبوت ہے کہ یہ قرآن خدا کی کتاب ہے' انسان کی کتاب نہیں ہے؟ جو بات سقراط اور افلاطون نہ کہہ سکا' وہ بات وہ شخص کہتا ہے' کتنے زور سے کہتا ہے کہ ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (38:27) اور دیکھتے ہیں کہ کفر کا لفظ کہاں آیا ہے۔ اور آپ سوچیے گا کہ ایمان اس کے مقابلے میں کیا ہوگا۔ یہ ظن ہے' میں کہتا ہوں کتنے حتم و یقین سے یہ شخص کہہ رہا ہے' بہت بڑا چیلنج ہے جو یہ اہلِ علم کو' اہلِ دانش کو Through کر رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بینش کدۂ یونان کو مخاطب کرنا' ایک اَن پڑھ آدمی کا یہ کہنا کہ جو کچھ کہتے ہو' تم بکتے ہو' یہ ظن و تخمین ہے' یہ اس دور کے انسانی دماغ کی تخلیق نہیں ہو سکتا۔ کہا کہ کیا ہو گیا ہے اگر ہم نے یہ کہہ دیا ہے کہ یہ ظن ہے' یہ تخمین ہے' کیا اس سے فرق پڑتا ہے؟ کہتا ہے کہ کیا تم نے سمجھا ہے کہ فرق ہی کچھ نہیں پڑتا؟ یہ غلط ہے' فرق پڑتا ہے۔ یہ کائنات' یہ دنیا جس کی قوتوں کو مسخر کر کے تم نے یہاں عشقِ جاوداں کی زندگی بسر کرنی ہے' یہاں تم نے اپنی زندگی کو اتنا حسین بنانا ہے' اتنی بلندیوں تک لے جانا ہے' اتنے ارتقائی منازل طے کرنے ہیں' اگر اس کائنات کے متعلق تمہارا یہ عقیدہ ہو جائے کہ یہ باطل ہے' یہ قابلِ نفرت ہے تو تمہاری جو یہاں کی زندگی ہے' وہ جہنم ہو جائے گی: فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (38:27)۔ پھر سنیے! کہا ہے کہ ذٰلِکَ ظَنُّ

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (38:27) یہ ان کا ظن وتخمین ہے جو حقیقت سے انکار کرتے ہیں اور جو اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں' یاد رکھو! ان کی زندگی اسی دنیا میں جہنم کی زندگی ہو جائے گی۔ اس دنیا میں انسانوں کے لیے یہ ساری آسائشیں' جو آپ کو اب قدم قدم پہ نظر آ رہی ہیں' یہ اس وقت سے شروع ہوئی ہیں جب انسان نے اس پرانے بوسیدہ' بے ہودہ' ظنی' تخمینی تخیل سے چھٹکارا حاصل کیا کہ یہ کائنات فریبِ نگاہ ہے اور یہ سمجھا کہ یہ تو قانون کے دائروں میں جکڑی ہوئی ہے' اس قانون کا علم حاصل کرنا چاہیے' ان قوتوں کو مسخر کرنا چاہیے' انہیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ اس سے آپ کی اس صفحۂ ہستی کا نقشہ بدل گیا' تصویر بدل گئی۔

ظہورِ اسلام کے کچھ ہی عرصہ بعد ہم مسلمانوں نے کائنات کی افادیت اور اس کے مقام کو نظرانداز کر دیا

عزیزانِ من! کہا ہے کہ یہ لوگ' جو یوں سمجھیں کہ یہ ظن وتخمین ہے' انہیں بتا دو کہ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (38:27)۔ بات تو آگے چل کر آئے گی لیکن یہیں میں یہ عرض کر دوں کہ جس نے دنیا کو سب سے پہلے یہ کچھ بتایا تھا' اسی ﷺ کے نام لیوا' اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد' اسی ظن وتخمین کے متبع ہو گئے جس کو اس نے کہا تھا کہ اس کا نتیجہ جہنم ہے۔ آپ کے ہاں یہ دنیا قابلِ نفرت ٹھہری' ترکِ دنیا' ترکِ ترک' ہر قسم کا ترک' آپ کے ہاں منتہا ومقصود ہو گیا۔ آپ کے ہاں کے طریقت والے' معرفت والے جو کہتے ہیں کہ براہِ راست ہم خدا سے پوچھتے ہیں شریعت سے بھی آگے بڑھ گئے۔ کیا پوچھ کے آئے ہو؟ کہ جی یہ دنیا قابلِ نفرت ہے۔ کسی خالق سے' کسی مصور سے' اس کے شاہکار کے متعلق یہ کہنا کہ یہ قابلِ نفرت ہے' کیا یہ اس مصور یا خالق کی تعریف ہے یا اس کو قابلِ نفرت قرار دینا ہے؟ اور کہتے یہ ہیں کہ ہم اس سے پوچھ کر آئے ہیں۔ جیسے وہ یہ کچھ کرنے کے بعد' تورات کے الفاظ میں' پھر اس کے بعد اللہ میاں پچھتا رہے ہیں کہ میں نے یہ کیا باطل کا ایک نقشہ گھڑ دیا' یہ میں نے قابلِ مذمت' قابلِ نفرت ایک کائنات بنا دی۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس سے پوچھ کر آئے ہیں۔ یہ وہی ویدانت کا تصور' وہی حکمائے یونان کا فلسفہ ہے۔ صرف اس کے ہاں ترجمہ کر کے آپ نے اس میں عربی کے الفاظ رکھے اور سمجھ لیا کہ یہ عینِ دین ہے' مغزِ دین ہے۔ پھر یہ کائنات قابلِ نفرت ہوئی' پھر یہ مادہ اس قابل بنا کہ اس کو تیاگ دیا جائے' ترک کر دیا جائے۔ پھر یہ آپ کے ہاں کے یہ سارے تصور آ گئے کہ یہ مادی دنیا بالکل کافروں کے لیے بنائی ہوئی ہے' مومن کے لیے اگلی دنیا ہے۔ یہاں کا مومن اس طرح رہتا ہے جیسے قید خانے میں قیدی رہتا ہے۔ یہ سارے تصورات ہیں جو آپ کے ہاں یہ دین بن گئے۔ اور دین مذہب میں تبدیل ہو گیا' بات سیدھی سی ہے۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ قرآنِ حکیم کائنات کے متعلق کیا تصور پیش کرتا ہے

عزیزانِ من! ان تصورات نے آپ کے ہاں کیا قیامتیں برپا کیں' اسے میں کسی دوسرے وقت پہ اٹھا رکھتا ہوں کہ جب میں اسلام

کی تاریخ پر آؤں گا' مسلمانوں کی تاریخ تو آپ نے بہت پڑھی ہوئی ہے۔عزیزانِ من! اسلام کی تاریخ قابلِ مطالعہ ہے کہ یہ اسلام کیا دین تھا' اس کے بعد یہ موجودہ مذہب کس طرح سے بنا اور اس نے کیا کیا تباہیاں پیدا کیں؟ قرآن نے جو کہا ہے کہ **فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنَ النَّارِ** (38:27) تباہی ہے ان کے لیے جو اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے حالانکہ یہ بڑا عظیم اعلان ہے۔یہ تو انسانیت میں اعلانِ عظیم ہے جو قرآن نے آکر کیا تھا' یہ اس سے پہلے کہیں نہیں تھا۔کہا ہے کہ **خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ** (29:44) ارض و سما کو بالحق پیدا کیا ہے۔**اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ** (29:44) جو لوگ اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں' ان کے لیے اس میں' زندگی کی صحیح روش پہچاننے کے لیے' بڑی واضح نشانی ہے۔وہاں (38:27) میں کفر کہا تھا کہ اس کو بالحق نہ سمجھنا تو کفر ہے۔یہاں (29:44) میں اس کو بالحق کہا ہے اور یہ کہ اس کو بالحق سمجھنا ایمان ہے۔اور وہاں یہ ہے کہ وہ ایک کھیل کھیل رہا ہے اور کھیل کے طور پر اس نے یہ پیدا کیا۔

قرآنِ حکیم کی حقیقی تعلیم کی قدر و قیمت کو جاننے اور سمجھنے کا طریق

عزیزانِ من! قرآن سمجھنا ہو تو اس کے پس منظر میں پہلے یہ سمجھیے کہ دنیا کے مختلف اقوام اور مذاہب میں اور فلسفے میں پہلے اعتقادات کیا تھے؟ ان کے نظریات کیا تھے؟ وہ چیزیں جب سمجھ میں آئیں گی تو پھر پتہ چلے گا کہ قرآن یہاں کس چیز کی تردید کر رہا ہے' کس کی تصدیق کر رہا ہے۔پہلے یہ سمجھیے کہ یہ عقیدہ چلا آرہا تھا کہ یہ کائنات اور اس کی تخلیق ایشور کی لیلا ہے۔جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے' ہندوؤں کے ہاں اب بھی اس کو نٹ راجن کہتے ہو۔پھر قرآن کی اس آیت کی طرف آیئے کہ **وَمَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا لٰعِبِيۡنَ** (44:38) ہم نے اس سلسلۂ کائنات کو محض کھیل کے طور پہ پیدا نہیں کیا ہے' ہم کھلاڑی نہیں ہیں۔جب یہ پتہ چلے کہ یہ کس چیز کی تردید کرتا ہے' پھر حقیقت اجاگر ہو کر سامنے آتی ہے کہ قرآن کہہ کیا رہا ہے؟ می نہ سزد خدائے را کہ ہم کھیل کے طور پہ بچوں کی طرح ایک گھروندہ بنائیں' ناٹک کا کھیل رچایا ہوا ہو' یہاں سارے اسٹیج کے اوپر ایکٹر ہی آئے ہوئے ہوں' نہ بادشاہ بادشاہ ہو' نہ بھنگی بھنگی ہو۔سنو! یہ سب غلط ہے۔یاد رکھو **مَا خَلَقۡنٰهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ** (44:39) ہم نے اسے ایک حقیقتِ ثابتہ کے طور پر پیدا کیا ہے۔**وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ** (44:39) یہ علم کی کمی ہے جس بنا پر وہ ایسا سمجھتے ہیں۔

حواس کے تحت حاصل کردہ علم کے متعلق افلاطون کا تصورِ حیات اور قرآن حکیم کی تعلیم

PLATO (افلاطون: 428-347 BC) نے کہا کہ Sense Perception (ادراک بالحواس) کے ذریعے سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ قابلِ اعتماد نہیں ہے۔قرآن کہتا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ علم کس کو کہتے ہیں **وَ لَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ**

(17:36) جس چیز کا تمہیں علم نہ ہوا کرے اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ برادرانِ عزیز! یہ قرآن کی عظیم آیت ہے۔ ''جس چیز کا علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو''۔ سوال پیدا ہوا کہ پھر یہ علم کیا ہے؟ کہا کہ **اِنَّ السَّمۡعَ وَ الۡبَصَرَ وَ الۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا** (17:36) یاد رکھو! یہ جو تمہاری Sense Perceptions (ادراکات بالحواس) ہیں، یہ جو تمہاری آنکھیں، تمہارے کان، تمہارا مائنڈ (Mind) ہیں، ان سب سے پوچھا جائے گا کہ جس بات کو اس نے مانا تھا کیا اس کے صحیح ہونے کی شہادت تم نے دی تھی؟ اس طرح قرآن نے علم کی Definition (تعریف) دیدی کہ علم وہ ہے جو Perceptual Knowledge (ادراکی علم) ہوتا ہے، یہ Sense Perception (ادراک بالحواس) سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ سمع اور بصارت یعنی یہ سماعت اور بصارت گویا انسان کے حواس (Senses) کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد یہ ہے کہ سنتا تو دیوانہ بھی ہے، دیکھتا تو پاگل بھی ہے، اس کے سننے کو اور اس کے دیکھنے کو آپ علم نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے کہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ تمہارے ہاں کے یہ حواس جو Data (معطیات) مہیا کرتے ہیں یہ پھر آگے ایک اور مرکز کی طرف جاتا ہے جسے مائنڈ (Mind) کہا جاتا ہے، جسے فواد کہا جاتا ہے پھر وہ مائنڈ (Mind) جو نتائج مستنبط کرتا ہے، اسے علم کہا جاتا ہے۔ علم کی Definition (تعریف) ہوئی کہ ''حواس (Senses) کے ذریعے، خارجی کائنات کی معلومات بہم پہنچا کر، اسے دل کی دنیا کے سامنے لایا جائے، وہاں وہ اس کو چھان کر، پھٹک کر، جو صحیح نتائج مرتب کرے گا اس نتیجے کا نام علم ہوگا۔ قرآن اسے علم کہتا ہے، یہ قرآن کی رو سے علم کی Definition (تعریف) ہے۔ آپ نے دیکھا کہ Sense Perception (ادراک بالحواس) کو یا Perceptual Knowledge (ادراکی علم) کو جسے Plato (افلاطون: 428-347 BC) جیسا اتنا بڑا افلاسفر ہے ناقابلِ اعتماد قرار دیتا ہے، قرآن علم کی وہ Definition (تعریف) دیتا ہے۔

قرآن کے نزدیک جو لوگ عقل وفکر سے کام نہیں لیتے وہ جہنم کا ایندھن ہیں

سوال یہ ہے کہ کیا یہ ساری Discussion (بحث وتمحیص) قرآن کی رو سے محض Academic Discussion (نظری گفتگو) ہی تھی، یہ کوئی نظری تعلیم دی جا رہی ہے؟ قرآن کا تو یہ مقصد نہیں ہے، وہ تو اپنی ہر تعلیم سے ایک حقیقت کی طرف پہنچاتا ہے۔ سنیے! یہاں علم کی یہ Definition (تعریف) دی۔ اس سے تین چیزیں ہمارے سامنے آئیں: بصارت، سماعت، قلب۔ جو ان سے کام نہیں لیتے ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ **وَ لَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَهَنَّمَ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ** (7:179) اور دنیا میں شہری متمدن آبادیاں ہوں یا باہر صحرائی آبادیاں جنہیں قرآن جن وانس کہتا ہے، ان میں سے تمہیں ایسے نظر آئیں گے جو اپنی زبانِ حال سے پکار کر کہہ رہے ہونگے کہ یہ جہنم کی زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ کتنی بڑی چیز ہے کہ انہیں دیکھ کر آپ یہ کہہ دیں کہ یہ تو جہنم کی زندگی بسر کرنے

والے لوگ ہیں۔ کون ہیں یہ لوگ جو ظاہراطور پر اس چیز کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ جہنم میں زندگی بسر کرنے والے ہیں؟ کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو **لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا** (7:179) سینے میں دل رکھتے ہیں' اس سے کام نہیں لیتے' کھوپڑی میں دماغ رکھتے ہیں اس سے کام نہیں لیتے۔ دیکھا! جہنم کی زندگی بسر کرنے والے۔ اور آگے ہے کہ **وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا** (7:179) آنکھیں بھی ہیں ان کے ماتھے میں' ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ **وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا** (7:179) ان کے کان بھی ہیں ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ کہا کہ پیکر کے اعتبار سے دیکھیے تو انسان نظر آئیں گے لیکن **اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ**(7:179) انسان نہیں' حیوانی سطح پہ زندگی بسر کرتے ہیں' حیوان ہیں' پھر کہا کہ نہیں! ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ اس لیے کہ **اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ** (7:179) یہ سب کچھ رکھنے کے باوجود اپنے ماحول اور اپنی کائنات سے بے خبر رہ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ حیوان Instinct (جبلت) کے ذریعے سے تو ایک چیز حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کتا بھی اپنی سونگھنے کی قوت سے ان چیزوں تک پہنچ جاتا ہے جن تک ابھی انسان آلات کے ذریعے سے نہیں پہنچا۔ یہ پھر یہاں ایک دوسرا Subject (مضمون) آ جائے گا۔ یعنی حیوان بہر حال اپنی Instinct یا جبلی صلاحیتوں سے تو کام لیتے ہیں۔ یہ انسان جو یہ ساری صلاحیتیں رکھنے کے باوجود ان سے کام نہیں لیتے' کہا کہ یہ حیوانات سے بھی گئے گزرے ہیں۔ اپنے ماحول سے اور کائنات سے بے خبر رہ کر زندگی بسر کرنے والوں کو جہنمی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو ان چیزوں سے کام نہیں لیتے' یہ ہیں اہلِ جہنم۔

صاحبانِ عقل و بصیرت ہر آن تخلیق ارض و سما اور لیل و نہار کے اختلاف پر غور و فکر کرتے رہے ہیں

برادرانِ عزیز! ان تمام چیزوں کے برعکس ایک اور گروہ ہے۔ ان کے متعلق کہا کہ **اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ** (3:189) ارض و سما کی تخلیق میں لیل و نہار کے اختلاف میں **لَاٰيٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ**(2:189) صاحبانِ عقل و بصیرت کے لیے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ نشانی یعنی آیت ہے۔ قرآن وہاں کہتا ہے کہ آیت یا نشانی وہ چیز ہے جہاں آپ ایک محسوس شے سے کسی غیر مرئی حقیقت کی طرف پہنچ جائیں مثلاً دھواں نشانی ہوتی ہے اس بات کی کہ نیچے آگ چل رہی ہے۔ صحرا میں جہاں کوئی دور دور تک نظر نہ آئے' کتے بھونکنے کی آواز یہ کہہ دیتی ہے کہ یہاں کوئی آبادی ہے۔ یہ اس چیز کی آیت ہوتی ہے' آیت اسے کہتے ہیں۔ کہا کہ کائنات کے اندر جو کچھ یہ سلسلہ ہے' یہ آیت ہے' ان میں آیات ہیں۔ یہ آیات کن کے لیے ہیں؟ کہا کہ یہ **لِّاُولِی الْاَلْبَابِ** (3:189) صاحبانِ عقل و بصیرت کے لیے ہیں۔ یہ صاحبانِ عقل و بصیرت کون ہیں؟ کہا کہ **الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ** (3:190) یہ وہ لوگ ہیں جو کھڑے بیٹھے لیٹے اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اب ذکر سے ہمارا خیال' جیسا کہ

آپ کو پتہ ہے' میں پہلے درسوں میں بتا چکا ہوں کہ بس ذکر کا لفظ آیا اور اللہ کا ذکر آیا تو صاحب! ھوحق کی آوازیں ہمارے کان میں آنی شروع ہوگئیں' اللہ کے ذکر کی ضربیں لگ رہی ہیں۔ اور میں نے ابھی دو درس پہلے بتایا تھا کہ خدا نے یہ کہا ہے کہ تم میرا ذکر کرو' میں تمہارا ذکر وں گا۔ اس سے تو میں نے کہا تھا یہی ہوا کہ یہاں ہم ضربیں لگا رہے ہیں اور وہاں وہ بیٹھا یہ کچھ کر رہا ہوگا۔ یہاں کہا ہے کہ **يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ** (3:190) صاحبانِ عقل وبصیرت کے لیے نشانیاں ہیں جو کھڑے بیٹھے لیٹے یذکرون اللہ ہیں۔

سنیے! یہ ذکر اللہ کیا ہے۔ عزیزانِ من! قرآن ہے وہ تو ہمیں ابہام کے اندر کبھی چھوڑتا ہی نہیں کہ اس کے بعد بات نہ پتہ چلے۔ وہیں یا اس سے ذرا اِدھر اُدھر آپ دیکھیے گا اپنے ہر لفظ کی تشریح' اپنی ہر اصطلاح کا مفہوم' بیان کر دیتا ہے۔ کون ہیں یہ لوگ جو یہ کہتے ہیں؟ کہتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو **وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (3:190) تخلیقِ کائنات پہ غور وفکر کرنے والے ہیں۔ غور فرمایا آپ نے کہ ذکرِ الٰہی کیا ہے؟ ذکر کے معنی ہوتا ہے ''کسی شے کو ہر وقت اپنے سامنے رکھنا''۔ کہا ہے کہ وہ کھڑے بیٹھے لیٹے' ہر وقت قوانینِ خداوندی کو' اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ کائنات کا نظم ونسق جس طریق' انداز اور قاعدے سے چل رہا ہے' ہر وقت اس پہ غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔ یہ **يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ** (3:190) ہے یعنی وہ قوانینِ خداوندی کو ہر وقت' کھڑے بیٹھے لیٹے' اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وہ کرتے کیا ہیں؟ یہ کہ **يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (3:190) اٹھتے بیٹھتے لیٹے کائنات کی تخلیق پہ غور کرتے رہتے ہیں۔ غور وفکر کے بعد کس نتیجے پہ پہنچتے ہیں؟ کہتا ہے کہ وہ تو ایک ایک چیز کی ریسرچ کرتے ہیں اور ریسرچ کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ **رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا** (3:190) وہ اس کائنات کو نشو ونما دینے والی قوت' جسے ہم خدا کہتے ہیں' کی تخلیقِ ارض وسما پہ اس قدر مسلسل' متواتر' پیہم' غور وفکر اور ریسرچ اور تحقیق کے بعد اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تُو نے کائنات کی کسی شے کو باطل نہیں پیدا کیا۔

کائنات کی ہر شے پر متواتر غور وفکر کرنے کے بعد اسے حق تسلیم کرنے والے کو مومن کہتے ہیں

عزیزانِ من! انہیں مومن کہتے ہیں۔ یہ خدا کا ذکر ہے۔ کہا ہے کہ **رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا** (3:190)۔ کائنات کی ہر شے کے متعلق تحقیق کے بعد' اس نتیجے پہ پہنچنا کہ یہاں کوئی شے باطل نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ جو کام ہیں' یہ تو جو دنیا کے ریسرچ اسکالر' سائنٹسٹ ہیں وہ کر رہے ہیں۔ ہماری تو آج بیسویں صدی میں بھی ابھی یہ کیفیت ہے کہ ہمارے گرد وپیش بیسیوں چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بے فائدہ پیدا ہوئیں' ذہن میں یہ آتا ہے کہ پتہ نہیں' یہ پیدا ہی کیوں ہوگئیں۔ ''آ بھونڈ جیا اڑ دا پھر دا ہوندا اے گرمیاں اچ' ساہنوں ایناں ای پتہ اے پئی اولڑ دا اے' تے بتھاڑ سجا دیندا ہیگا۔ اوہدے بعد سوال پیدا ہوندا اے' پئی اے گل سمجھ اچ نئیں ہیگی کہ آ کیوں پیدا کر دتا اللہ میاں نیں [1]''۔ غالبِ خستہ کے بغیر کونسے کام بند تھے لیکن سنیں! پانچ چار سال کا عرصہ ہوا [2] ہے'

جنوبی امریکہ سے سائنٹسٹ کا ایک گروپ یہاں آیا تھا۔ وہ یہاں سے آپ کے ہاں کے جو تتیے اور بھڑیں ہیں' ان کو لینے کے لیے آیا تھا کہ ''لوائے تہاڈا ابو تھانئیں سجان گے' ساہڈا سجان گے ❸''۔ ان سے پوچھا گیا کہ یہ کیا بات ہے' یہ کیوں لے جانا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں' وہاں ایک چھوٹا سا کیڑا پیدا ہوتا ہے' جو ہمارے ہاں کی فصلوں کو بالکل تباہ کر دیتا ہے۔ برسوں کی ریسرچ کے بعد ہم اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ تمہارے ہاں کا یہ جو تتیا ہے' یہ اس کیڑے کو تلف کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ وہاں نہیں ملتا' ہم یہاں سے امپورٹ کر کے لے کر انہیں وہاں لے چلے ہیں صاحب! سچ کہا ہے قرآنِ کریم نے کہ **رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا** (3:190) اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تو نے اس کارگہہ ہستی کو نہ عبث اور بے کار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لیے۔

برادرانِ عزیز! یہ سانپ کو لیجیے جس کے متعلق کہا نہیں اور موت آئی کہ صاحب! اس کا تو کام ہی اتنا ہے یعنی یہ موت کا پیامبر' اجل کا فرشتہ ہے۔ اس کے علاوہ ذہن میں کوئی دوسری بات نہیں آتی۔ اس کے لیے امریکہ کے کسی Deputations (وفد) کی ضرورت نہیں پڑی' ذاتی بات ہے جو میں بتاتا ہوں۔ میرے آپریشن کے بعد جب میرے خون بہنے کی یہ صورت ہوگئی تھی کہ خون تھمتا ہی نہیں تھا اور اس کے بعد احباب کی بھی یہ صورت تھی اور معالجوں کی بھی یہ صورت تھی کہ

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں

اس بے آس حالت میں' جو آخری چیز تھی' بعد میں بتایا گیا کہ وہ سانپ کے زہر کا ایک انجیکشن تھا جس نے دوبارہ زندگی دیدی۔ ڈاکٹر صاحب ❹ اس کی تائید کریں گے۔ یہ ہیں **يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (3:190) وہ جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے' بیٹھے' لیٹے قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیقی ترکیب' انداز پیدائش پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اس کے بعد پکار اٹھتے ہیں کہ **رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا** (3:190) اے بارِ الہا! تو نے اس کارگہہ ہستی کو نہ عبث پیدا کیا اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لیے پیدا کیا۔ اور آگے کہا ہے کہ **سُبْحٰنَكَ** (3:190) اس سے بڑی بعید بات تھی کہ تیرے جیسا خدا ہو' اور کوئی چیز باطل پیدا کر دے۔ ''تینوں تے رب کہنا سجدا ای نہ ساہڈا' جے

---

❶ یہ کیڑا سا (تتیا) جو موسم گرما میں اڑتا نظر آتا ہے' ہمیں تو اتنا ہی معلوم ہے کہ جب یہ کاٹتا ہے تو چہرہ مہرہ سوج جاتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا ہی کیوں کیا ہے۔

❷ یہ غالباً 1963ء کی بات ہے۔

❸ کہ لو بھئی! اب وہ تمہارہ چہرہ نہیں سجائیں' ہمارا سجائیں گے۔

❹ آپ ہیں معروف سرجن ڈاکٹر سید عبدالودود مرحوم (1908-2001)۔

آ گل کتھے ہوندی[1]''۔ رب اُس کو کہا جائے گا' جس کا Purpose (مقصد) یہ ہو کہ وہ ہر شے کی نشوونما' نقطۂ آغاز سے تکمیل تک کرنے والا ہو۔ رب کہنا اور یہ کہنا کہ کائنات کی چیزوں کو باطل پیدا نہیں کیا سُبۡحٰنَکَ ہے۔ کلام اس کا ہے' باتیں ہمارے سینے کی ہو رہی ہیں مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟ ایسے وقت میں کسی سائنٹسٹ سے پوچھیے' جب برسوں کے بعد ٹیسٹ ٹیوب میں یہ نظر آ جائے کہ اوہو! یہ بات اس میں سے آئی۔ اس وقت بے ساختہ اس کی زبان کے اوپر یہ چیز آئے گی کہ سُبۡحٰنَکَ (3:190) تیری ذات اس سے بہت بعید ہے کہ تُو کسی شے کو بے مقصد اور بلا غرض و غایت یا تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لیے پیدا کر دے۔ یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سچ ہے کہ خدا کہنا چاہتا ہی اسے ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہا کہ پھر ہماری ہر وقت یہ آرزو ہے کہ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:191) تُو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد' اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں۔

بندۂ مومن کا شعار ہی یہ ہے کہ وہ کائنات کے ہر گوشے کو جہنم سے جنت میں بدل دے

یہ ہے وہ طریق جس سے ہم جہنم کی زندگی سے بچ سکتے ہیں۔ سانپوں کے ڈسے ہوئے' تتیوں نے جن کے ہاں کا یہ حلیہ بگاڑا ہوا ہو' جہنم کی زندگی نہیں تو کیا یہ جنت کی زندگی ہے؟ یہاں کہا ہے کہ پھر ان کی آرزوئیں یہ ہوتی ہیں کہ جو گوشے ابھی ایسے رہ گئے ہیں جہاں تک ہماری تحقیقات نہیں پہنچ سکیں' وہاں ابھی تک یہ صورت ہے کہ زندگی جہنم کی ہے' تُو تو رب کہلاتا ہے۔ اے رب! ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم تیری اس کائنات کے کسی گوشے کو بھی جہنم نہ رہنے دیں' جنت میں تبدیل کر دیں۔ اس لیے ہم یہ ربنا کہتے ہیں۔

عزیزانِ من! سنیے یہ النار کیا ہے؟ یہ جہنم کی زندگی کیا ہے؟ یہ جو کائنات کی ریسرچ کے بعد کائنات کی قوتوں سے فائدہ نہ اٹھانے والے ہیں' ان کی زندگی کیا ہے اور یہ جو جہنم کی زندگی ہے' وہ کیا ہے؟ کہا کہ رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ (3:191) جنہیں اس جہنم کے اندر زندگی بسر کرنی پڑے ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جاتی ہیں اور ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ (3:191) وہ قوم دنیا میں ذلیل و خوار ہو جاتی ہے۔ عزیزانِ من! ساری دنیا کی تاریخ پہ نگاہ ڈالیے' جتنی کوئی قوم مذہب پرست تھی اور اس کا کائنات کے متعلق تصور یہ تھا کہ یہ دنیا قابلِ نفرت ہے' اتنی ہی وہ قوم دنیا کی قوموں کے مقابلے میں ذلیل و خوار تھی۔

---

[1] اگر کہیں یہ بات ہوتی تو ہمیں تجھے رب کہنا ہی نہ چاہیے تھا۔

دنیا بھر میں قوموں کے معیارِ زندگی کو ماپنے کا طریق ''مذہب کی گرفت'' پر ہے: زیادہ گرفت' زیادہ ذلت وخواری

دنیا میں قوت وحشمت اور ذلت اور خواری کے ماپنے کا ایک معیار' (Standard) یہ ہے کہ جتنی کوئی قوم دوسری اقوام کے مقابلے میں ذلیل ہوگی' آپ سمجھ لیجیے کہ اسی حد تک اس قوم میں مذہب پرستی ہے۔ جتنی بلندیوں تک قوم پہنچے گی' یاد رکھیے! اس قوم میں دین اجاگر ہوگا۔ اس کا نام خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ رکھ لے۔ کہا ہے کہ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ (3:191) خود ذلیل وخوار ہوگی۔ اور اس کے بعد عجیب چیز کہی کہ اقوامِ عالم کے اندر ہوسکتا ہے کہ ذلیل وخوار قوم کو کوئی خیرات کے طور پر کچھ دیدے' کچھ مدد کردے۔ کہا کہ خیرات کے طور پہ لینے والوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس طرح جو ان کی مدد کرتے ہیں' ان کو کہیں یہ نہ سمجھ لو کہ یہ تمہارے دوست ہیں۔ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (3:191) یہ جنہوں نے کائنات کی قوتوں کو ان کے مقام پہ نہیں رکھا ہے' یہ جو اس سے کام نہیں لینے والے' یاد رکھو! دنیا میں ان کا کوئی دوست نہیں ہوگا' وہ مدد دے کر Exploit (استحصال) کریں گے۔ عزیزانِ من! کہاں لے جاتا ہے قرآن! بات سائنٹفک ریسرچز کی کر رہا ہے' آپ دیکھیے کہ کیونکہ یہ سائنس کی کتاب نہیں ہے' بات تو اس نے یہ بتانی ہے کہ اس دنیا کے اندر عزت کی زندگی کیسے بسر ہوتی ہے' ذلت کی زندگی کیسے بسر ہوتی ہے۔ لانا تو اس نے وہاں تھا' اس گوشے سے بھی وہیں لے کر آیا ہے۔ جو یہ نہیں کرے گا اسکی جہنم کی زندگی ہے۔ جہنم کے معنی ہیں ''ذلت وخواری کی زندگی''۔ ذلت وخواری میں تم سمجھ سکتے ہو کہ خیر کے لیے کہیں سے ''آٹا منگ کے ای کھالیا کوئی گل نئیں ہیگی ❶''۔ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے مدد مل تو جائے گی لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ تمہارے دوست ہوگئے۔

مذہب کی دنیا کے برعکس دینِ خداوندی میں متقی کا بنیادی تصور

برادرانِ عزیز! غور کر رہے ہیں بات کہاں جا رہی ہے! اور اب تو ہمیں کہیں دور جا کر کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ دوست ہوتے ہیں یا نہیں۔ کہا ہے کہ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (3:190) ایسی ذلیل وخوار قوموں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔ یہ آیات اللہ ہیں ان پہ غور کرنے والوں کے لیۓ سنیے کیا کہا گیا ہے؟ پہلے تو یعقلون کہا تھا یعنی عقل وفکر سے کام لینے والے۔ انہیں اولی الباب کہا تھا۔ کہا ہے کہ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (45:3) انہیں مومن کہا جا رہا ہے۔ اور آگے چلیے' کہا کہ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (45:4) ایمان سے بھی اگلا درجہ ہے صاحب! یقین کا ہونا۔ آپ کے ہاں انتہائی درجہ متقی کا ہے۔ مسلمانوں میں بھی آپ جانتے ہیں کہ صاحب! مسلمان تو ہیں لیکن بڑے ہی متقی ہیں۔ وہ تو الگ بات ہے

---

❶ آٹا کہیں سے مانگ کر بھی کھالیا تو کوئی بات نہیں۔

قرآنِ کریم کی رو سے اس کی Definition (تعریف) دیکھ لیجیے لیکن بہرحال سب سے بڑا مقام ہمارے ہاں مذہب کی دنیا میں بھی متقی کا ہی کہا جاتا ہے۔ ابھی ہم نے یہ دیکھا کہ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (45:3) اور اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (45:4) آیا ہے۔ اور آگے چلیے' کہا کہ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ (10:6) اختلافِ لیل ونہار اور تخلیقِ ارض وسما اور تسخیرِ شمس وقمر کے اندر آیات ہیں' ان کے لیے جو ان آیات پہ چشمِ بصیرت کو وا کر کے ان کا مطالعہ کر کے حقائق پہ پہنچتے ہیں۔ انہیں متقی کہا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ ان متقیوں کے لیے اس کے اندر آیات ہیں' یہی مومن ہیں' یہی مومنین ہیں یہی متقی ہیں' یہ اولی الباب ہیں' یہ صاحبانِ عقل وبصیرت ہیں۔ یہ Perceptual Knowledge (ادراکی علم) حاصل کرتے ہیں اور اس کے بعد صحیح نتائج پر پہنچتے ہیں۔

آج تبلیغ کرنے کا انداز قابلِ غور بھی ہے اور باعثِ افسوس بھی

اس سے آگے تو ایک اور آیت ہے جس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ دنیا کے اندر جا کر اسلام کی تبلیغ کرنی چاہیے یہ ٹھیک ہے۔ ان ملکوں میں جا کر تبلیغ کرنی چاہیے "جناں دا دتا کھاندے او تسی ❶"۔ یہ بھی عجیب قوم ہے۔ اسٹیج پہ کھڑے ہو کر وعظ ہوگا صاحب! کہ اس وقت ساری دنیا جہنم کے اندر زندگی بسر کر رہی ہے' نہ افراد کو کہیں چین ملتا ہے' نہ اقوام کو کہیں سکون ملتا ہے' عدمِ سکون اور عدمِ اطمینان سے' یہ دنیا شعلہ زار بن رہی ہے۔ دنیا نے تجربہ کرنے کے بعد دیکھ لیا کہ ہر نظام باطل ہوا' ہر نظام نے شکست کھائی' کسی نے کچھ نہیں دیا۔ ہمارے پاس ایک نظام ہے' ہمارے پاس ایک زندگی کا ضابطہ ہے جو نوعِ انسانی کی تمام معاشی' اقتصادی' تمدنی' عمرانی' نظامی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایک حل' واحد حل' جو کبھی ناکام نہیں ہوا' جسے کہیں شکست نہیں ہوئی' کائنات کا ذرہ ذرہ اس پر شہادت دیتا ہے' آسمان پہ اس کے خدا کے فرشتے اس کی تسبیح کرتے ہیں' ہمارے پاس وہ سارا کچھ ہے وہ ہے حل۔ اور اس کے بعد "دے جا بابا' اللہ دے واسطے ❷"۔ اسلام کی تبلیغ کرنے جا رہے ہیں۔ اسلام کی تبلیغ کیسے ہوتی ہے؟ ایمان کس طرح سے لایا جاتا ہے؟ یہ ہیں اہم اور بنیادی سوالات۔

---

❶ جن کا دیا ہوا تم کھاتے ہو۔

❷ بابا! اللہ کے نام پہ دے جا۔

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں پر علیٰ وجہ البصیرت غور وفکر کرنے والے شخص کا ایمان ہر قسم کے ابہام سے بلند ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ سارا کچھ بیان کرنے کے بعد اختلافِ لیل ونہار اور تسبیح شمس وقمر کہا ہے۔ یہ کہا ہے کہ **تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ**(45:6) یہ ہیں اللہ کی نشانیاں جو تمہارے سامنے حق کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں۔ سنیے! اگلی بات۔ کہا کہ **فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ** (45:6) ان آیات اللہ کے بعد کونسی بات باقی رہ گئی ہے جو پھر تم اس کے اوپر ایمان لاؤ گے یعنی اگر اس کے بعد بھی ایمان نہیں لا رہے تو پھر اور کونسی بات باقی ہے جس کے اوپر پھر تم ایمان لاؤ گے۔ آخری چیز قرآن نے یہ آیات اللہ ایمان لانے کے لیے بتائی ہے۔ کہا کہ پھر کونسی بات اور باقی ہوگی جسے دیکھنے کے بعد تم اللہ پہ ایمان لاؤ گے؟ یہ آیات اللہ ہیں جن کے بعد انسان مجبور ہو کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو کر' جھک جاتا ہے۔ یہی ہے وہ ذاتِ کائنات جن کے مطالعہ' مشاہدہ' تجربے کے بعد انسان یہ کہتا ہے کہ

مری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا

وہ ایک ایک ذرے پہ سجدہ کر لیتے ہیں۔ وہ تو جیمز جینز (1946-1877ء) کے الفاظ میں جو یہ کہہ گزرتا ہے کہ مجھے یہ تو پتہ نہیں کہ پادری جسے خدا کہتا ہے' وہ کون ہے' مجھے یہ پتہ ہے کہ جس نے اجرامِ فلکی کا یہ نظم ونسق جاری کیا ہے' وہ جو کچھ بھی ہے' اس کے سامنے بے ساختہ میرا سر جھک جاتا ہے[1]۔ **فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ** (45:6) اس کے بعد پھر کونسی بات باقی رہ جائے گی جو ہم پیش کریں اور تم اس کے اوپر ایمان لاؤ۔ برادرانِ عزیز! ایمان لانے کے بعد یہ قرآن کی' آخری دلیل ہے اور پھر اس نے اس ارض کی اشیا کے متعلق ہی یہ بات نہیں کہی' آپ نے دیکھا ہے کہ سماوات کے متعلق یہ کچھ کہتا چلا آیا۔ سماوات کے متعلق اس سے پیشتر کسی کے ذہن میں بھی یہ نہیں تھا کہ وہاں بھی کچھ ایسی چیزیں ہیں جو قابلِ مطالعہ ہیں' قابلِ مشاہدہ ہیں۔ یا تو وہ دیوی دیوتا تھے یا بہرحال یونان کے فلسفے کی دائروی تنظیم (Cyclic Order) یہ تھی۔

یونان کا فلسفہ حیات صراطِ مستقیم کے بجائے Cyclic Order (دائروی نظم ونسق) کا تصور لیے ہوئے ہے

آپ کو پتہ ہے جو یونان کا فلسفہ ہے۔ اس سے پھر بات آگے چلی جاتی ہے' وقت دوڑ رہا ہے۔ یونان کا فلسفہ دائروی تنظیم کا ہے

---

[1] حوالہ یہ ہے: Jeans, Sir James: The Mysterious Universe, Mac Million Company, New York, 1930.

لائف یا زندگی کو وہ Cyclic Order (دائروی نظم) کہتے ہیں۔ صراطِ مستقیم نہیں' آگے بڑھنے والی نہیں' ارتقائی منازل طے کرنے والی زندگی نہیں' بلکہ ایک چکر (Cycle) کے اندر زندگی چل رہی ہے۔ یہ بات تو اور ہے لیکن میں کہہ اس لیے رہا تھا کہ انہوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ اجرامِ فلکی جو خدا سے زیادہ قریب ہیں' وہ سارے گول ہیں اس لیے جو زندگی ہے' وہ چکر ہے۔ وہ زندگی کو اتنا ہی سمجھتے تھے۔ ہنسنے کی بات نہیں ہے ہم بھی اس دور میں ہوتے تو یہی کچھ سمجھتے۔ سماوات کے متعلق ذہن میں کچھ آ ہی نہیں سکتا تھا' اہلِ علم ابھی کچھ نہیں جانتے تھے۔

قرآن حکیم اپنے ہاں چودہ سو سال پیشتر ارض و سماوات میں زندگی کا ذکر کر رہا ہے

برادرانِ عزیز! قرآن کریم کیا کہتا ہے۔ اسے سنیے اور پھر اس کے بعد اس کے اوپر وجد کیجیے اور پھر اپنے دل سے پوچھیے کہ کیا چودہ سو سال پیشتر یہ کلام کسی طرح سے انسان کا ہو سکتا ہے؟ کہا ہے کہ وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَثَّ فِيۡهِمَا مِنۡ دَآبَّةٍ (42:29) نشانیاں ہیں اس کی اس زمین کے اندر اور یہ اجرامِ فلکی اور ان کے اندر جو جاندار مخلوق ہم نے پیدا کی ہوئی ہے۔ یہاں فیھما آیا ہے۔ ارض اور سماوات ان دونوں کے اندر' قرآن ''زندگی کا ہونا'' کہتا ہے۔ ارض کے اندر تو یہ جو زندگی ہے ہمارے سامنے ہے۔ سماوات میں سے' اجرامِ فلکی میں سے' ایسے اجرام ہیں' جن میں قرآن چودہ سو سال پیشتر زندگی کا امکان بتا رہا ہے۔ حیرت یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ کہا ہے کہ ارض و سماوات کے اندر جاندار ہیں۔

برادرانِ عزیز! ہر ذی حیات کو' اس کی کوئی شکل بھی کیوں نہ ہو' دآبہ کہتے ہیں۔ قرآن نے یہ نہیں بتایا کہ ان کی ہیئت کیا ہے' وہ پیکر کیا ہیں؟ کہا یہ ہے کہ ذی حیات کا یہ امکان ارض میں بھی ہے اور سماوات میں بھی ہے' قرآن نے دونوں کا ذکر کیا ہے۔ اور سنیے! اب آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ اس دور میں سائنٹسٹ اس چیز پہ پہنچے ہیں کہ بعض کرّے ایسے ہیں جن کے اندر زندگی کی نمود نظر آتی ہے۔ اور اس کے بعد یہ ہے کہ یہ ہمارا Era (دَور) نہیں۔ یہ ابھی چار ہی دن کی بات ہوئی ہے کہ انسانوں کی یہ Attempt (کوشش) ہے کہ جو زمین والے ہیں' وہ ان آسمانوں کے اوپر پہنچ کر ان کے ساتھ ایک رابطہ قائم کر رہے ہیں' لینڈنگ [1] تک کی صورت ہو رہی ہے۔ چاند میں سہی' جہاں زندگی کی ابھی نمود نظر نہیں آتی' اس کے بعد دوسرے اجرام بھی تو ہیں جن میں یہ کہتے ہیں کہ زندگی کے امکان ہیں' آج اس وقت وہاں تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آج سے دس سال پیشتر بھی کبھی یہ کسی کے ذہن میں نہیں آتا تھا کہ اگر ان میں کوئی ذی حیات ہیں تو کسی طرح

---

[1] جولائی 1969 کی 21 تاریخ کو نیل ایلڈن آرم سٹرونگ نے پہلی بار چاند کی سطح پر قدم رکھا اور پکار کر کہا کہ

That is one small step for a Man, one giant leap for mankind.

(انسان کے لیے ایک چھوٹا سا قدم' مگر بنی نوع انسان کے لیے ایک غیر معمولی جست)۔

سے ہم اور وہ کبھی اکٹھے ہو جائیں گے۔اب سنیئے قرآن کی آیت کہ ارض اور سماوات کے اندر جاندار مخلوق ہے۔کہا ہے کہ **وَّ هُوَ عَلٰی جَمۡعِهِمۡ اِذَا یَشَآءُ قَدِیۡرٌ** (42:29) اور یاد رکھو! خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی دن اکٹھے ہو جاؤ۔میرے اللہ!!! یہ چودہ سو سال پہلے بات ہو رہی ہے۔

ارض وسماوات کے متعلق آج تک ہمارے ہاں پائے جانے والے تصورات کی نوعیت اور قرآن کے نزدیک علما کی تعریف

یہ کچھ کہنے کے بعد اب آپ آیئے اپنے علمائے کرام کی طرف۔آج تو آپ کو پتہ ہے کہ علمائے کرام کن کو کہا جاتا ہے۔ان کے اپنے میدان کی تو بات چھوڑ دیجیے' عملی زندگی میں تو آپ کو پتہ ہے کہ انہیں ''سوئی اچ دھاگہ نئیں پونا اوندھیگا[1]''۔اس بیسیویں صدی میں بھی وہ یہ مانتے ہیں کہ یہ جو آسمان ہے' یہ شیشے کا ایک ڈل ہے اور اس میں یہ جواہرات جڑے ہوئے ہیں' سات آسمان ہیں' ایک آسمان اور دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے' جو ساتواں آسمان ہے' اس کے اوپر سمندر ہے' پانی ہے' اس سمندر میں آٹھ پہاڑی بکرے کھڑے ہیں' وہ اتنے بڑے ہیں کہ سمندر ان کے گھٹنوں تک پہنچ رہا ہے' ان پہاڑی بکروں کے سر کے اوپر ایک تخت ہے جسے عرش کہتے ہیں' اس عرش کے اوپر اللہ تعالیٰ بیٹھے ہوئے ہیں۔آج آپ کے ہاں یہ جو تعلیم حاصل کرنے والے ہیں' ان کو سندِ فضیلت ملتی ہے کہ اب آپ عالم ہو گئے۔اس کی جمع علما ہے۔

اب آیئے قرآنِ کریم سے پوچھتے ہیں کہ علما کسے کہا جاتا ہے؟ قرآنِ کریم میں بتایا گیا ہے کہ **اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهَا** (35:27) کیا تم نے اس حقیقت پر بھی غور کیا ہے کہ بادلوں سے بارش کس طرح برستی ہے؟ پھر اس بارش سے زمینِ مردہ حیاتِ تازہ کس طرح حاصل کرتی ہے؟ پھر ایک ہی زمین' ایک ہی پانی' ننھے سے بیج کے تفاوت سے' درختوں میں اور درختوں کے پھلوں میں' کس کس قسم کا اختلاف پیدا ہوتا ہے؟ آگے کہا کہ **وَ مِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیۡضٌ وَّ حُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهَا** (35:27) یہ تو پھر بھی زندگی کی نمود کی دنیا ہے' یہ پہاڑوں کی چٹانیں ہیں جن میں تمہیں حیات کا کوئی نشان نظر نہیں آتا' بظاہر یہ قابلِ مطالعہ ہی شے نہیں ہے۔کہا کہ کبھی ان پہ بھی جا کر غور کیا کہ ان کی مختلف تہیں اور تہوں کے مختلف رنگ اور ان کے اندر کے تفاوت' تمہیں کس کس چیز کی داستان بیان کر رہے ہیں؟ جاؤ ان گونگے پہاڑوں کے سامنے جا کر ان کے مختلف رنگ کی جو تہیں ہیں' ان سے پوچھو کہ تمہارے اندر کس کس ارتقا کی کہانیاں پوشیدہ ہیں۔ **وَ مِنَ النَّاسِ** (35:28) انسانوں کی دنیا کے اندر چلو پھرو۔ **وَالدَّوَآبِّ** (35:28) یہ رینگنے والے' یہ کیڑے مکوڑے' یہ چھوٹے چھوٹے جراثیم ہیں' ان پہ غور وفکر کرو۔ **وَ الۡاَنۡعَامِ** (35:28) اور مویشیوں کے اوپر دیکھو۔ **مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ كَذٰلِكَ** (35:28) دیکھو کہ ان کے کس قدر انواع واقسام ہیں' کس قدر متنوع قسم کی یہ ساری چیزیں ہیں!

---

[1] سوئی میں دھاگا ڈالنا بھی نہیں آتا۔

کائنات کی ساخت پر غور وفکر کرنے والوں کے دل ودماغ کی کیفیت اور اظہار خیال

برادرانِ عزیز! کہا ہے کہ تم تو شاید غور نہ کرو گے مگر یہ وہ لوگ ہیں جو ان پہ غور وفکر کرتے ہیں اور اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ (35:28) جب وہ اس تحیر انگیز کارگہ کائنات کے اوپر غور وفکر کرتے ہیں تو اس کی عظمت سے ان کے دل جھک جاتے ہیں وہ کانپ اٹھتے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں؟ کہا کہ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (35:28) انہیں علما کہتے ہیں۔ برادرانِ عزیز! غور فرمایا' کہا ہے کہ انہیں علما کہتے ہیں۔ وہ اس حقیقت پہ پہنچتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (35:28)۔ عزیز' بڑی قوتوں کے مالک کو کہتے ہیں۔ یہ ہے اللہ اور غفور ہر قسم کی تباہی سے اس سلسلہ کائنات کو محفوظ رکھنے والے کو کہتے ہیں۔ یہ ہے اللہ۔ یہاں کیا صفات آئی ہیں؟ کہا کہ تم یہ سمجھنا چاہتے ہو کہ قرآن واقعی ایک حقیقتِ ثابتہ ہے' یہ Realities (حقائق) دیتا ہے۔ کہا کہ یہ سمجھنا چاہتے ہو تو آؤ تمہیں بتائیں کہ اس کا طریقہ کیا ہے؟ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) انسانی علم کو آگے بڑھنے دو' جوں جوں اس کا علم آگے بڑھے گا' کائنات کے سربستہ رموز سے پردہ اٹھتا چلا جائے گا' ایک ایک کر کے پردہ اٹھتا چلا جائے گا۔ اور جوں جوں یہ پردے اٹھیں گے' ہر اٹھنے والا پردہ پکار کر کہے گا کہ قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ رموزِ کائنات کی پردہ کشائیاں قرآن کی حقیقتِ ثابتہ کے دلائل بنتے چلے جائیں گے۔

مذہب کی نشو ونما ہمیشہ اندھیرے میں' جہالت میں اور توہم پرستی میں ہوتی ہے

وہ مذہب تھا جو ڈرتا تھا کہ سائنس کے انکشافات ہوئے تو ہم ختم ہو گئے۔ مذہب تو ختم ہو جاتا ہے' مذہب تو چمگادڑ ہے' اندھیرے میں زندہ رہتا ہے' دیکھ سکتا ہے' روشنی آنے کے بعد تو وہ اندھا ہوتا ہے۔ یہ دین ہے جس کی کیفیت یہ ہے۔ یہ انکشافاتِ عالم کو چیلنج کرتا ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ تمہارا ہر جو نیا انکشاف ہے اس نے میری حقیقت کی دلیل بننا ہے۔ آؤ تم انکشاف کرو۔ برادرانِ عزیز! کہیں وقت ختم نہ ہو جائے اب اہم بات آ گئی ہے۔ میں نے کہا یہ ہے کہ حقائقِ کائنات کے اوپر غور وفکر کرنے والے' Perceptual Knowledge' حواس کے ذریعے سے' علوم کے ذریعے سے' انکشافات کرنے والے' کائنات کی قوتوں کو مسخر کر کے' ان سے کام لینے والے' قرآن نے کہا ہے کہ یہ مومن ہیں' یہ متقی ہیں۔

کیا اہل یورپ کی اقوام' مومن کی کیٹگری (شق) میں شمار ہوتی ہیں؟

اب اس سے ذہن اس طرف چلا جائے گا کہ کیا یورپ کی اقوام' جنہوں نے یہ سب کچھ کیا ہے' جو کچھ اس وقت تک بیان ہوا ہے' کیا پھر انہیں اس کیٹگری (شق) میں شمار کیا جائے گا؟ کیا انہیں کہا جائے گا کہ قرآن جن کو مومن یا متقی کہتا ہے' یہ وہ اقوام ہیں؟ نہیں' برادرانِ

عزیز! تم کہو گے کہ ابھی ابھی تم نے خود اپنی ہی تردید کر دی۔ بات آدھی تھی اسی لیے میں نے کہا تھا کہ مجھے جلدی سے بات پوری کر لینی چاہیے کہ کہیں آج آدھی بات نہ رہ جائے۔ زندگی اتنی ہی نہیں ہے جس کا تعلق Physical Laws (طبعی قوانین) یا Physical (طبعی) کائنات سے ہے' زندگی کا بڑا حصہ تو انسانی زندگی بھی ہے۔ جس طرح سے باہر کی کائنات کے اندر یہ قوانینِ خداوندی جاری و ساری ہیں' اس نے کہا ہے کہ اسی طرح انسانوں کی اپنی زندگی کے متعلق بھی ہم نے اسی قسم کے غیر متبدل قوانین دیئے ہیں لیکن وہ فطرت کے قوانین کی طرح باہر کی دنیا میں بکھرے ہوئے نہیں ہیں جنہیں تم اپنے علم اور ہنر سے' انکشافات سے' ان کی پردہ کشائی کر کے' معلوم کر سکو۔ یہ وہ قوانین ہیں جو ہم نے وحی کے ذریعے نازل کیے ہیں۔ باہر کی دنیا کے قوانین سے باہر کی قوتوں کو مسخر کرو' ان قوتوں کے ماحصل کو ان قوانین کی روشنی میں استعمال کرو جو وحی کے ذریعے قرآن میں دیئے ہوئے ہیں۔ جب یہ دونوں چیزیں اکٹھی کرو گے تو اسے مومن کہا جائے گا۔

قوانینِ خداوندی کے مطابق مومن اور کافر کے لیے زندگی کے دو اہم گوشے

برادرانِ عزیز! یہ اس لیے ہے کہ جہاں اس نے یہ کہا تھا جو کائنات کے قوانین پہ غور و فکر نہیں کرتے وہ کافر ہیں' اس کے ساتھ ہی اس نے یہ کہا ہے کہ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو کہ جو خدا کے قوانین کے مطابق' جو اس نے قرآن میں نازل کیے ہیں' ان کے مطابق انسانی زندگی کے معاملات کے فیصلے نہیں کرتے' وہی ہیں جن کو کافر کہا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آؤ تمہیں ایسی قومیں بتائیں۔ ہم نے کہا تھا کہ سمع و بصر سے' قلب سے' کام لو' پھر حقائق کے اوپر پہنچو تو کیا انسانی زندگی کو جہنم کی جگہ جنت بنانے کی اتنی سی چیز کافی ہو جائے گی؟ اس نے کہا ہے کہ نہیں وہ اس سے پیشتر ان ہلاک شدہ قوموں کی داستانیں سامنے لانے کے بعد کہتا ہے کہ وَلَقَدۡ مَکَّنّٰہُمۡ فِیۡمَاۤ اِنۡ مَّکَّنّٰکُمۡ فِیۡہِ وَجَعَلۡنَا لَہُمۡ سَمۡعًا وَّاَبۡصَارًا وَّاَفۡئِدَۃً (46:26) ہم نے ان ہلاک شدہ قوموں کو تم سے بھی زیادہ صاحبِ قوت اور صاحبِ تمکنت بنایا تھا' وہ غیر مہذب اور وحشی اقوام بھی نہیں تھیں' انہیں ہم نے سمع اور بصر اور قلب یعنی علم و دانش کے تمام ذرائع دیئے تھے' انہوں نے ان سے کام بھی لیا تھا لیکن چونکہ ان پر مفاد پرستی کے جذبات غالب تھے جس کی وجہ سے قوانینِ خداوندی کی مخالفت کرتے تھے اس لیے فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُمۡ سَمۡعُہُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُہُمۡ وَلَاۤ اَفۡئِدَتُہُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ (46:26) سمع اور بصر اور فواد سے حاصل کردہ ان کا جو علم تھا وہ ان کے کسی کام نہ آیا۔ اِذۡ کَانُوۡا یَجۡحَدُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ (46:26) جب انہوں نے خدا کے ان قوانین سے جانتے بوجھتے انکار کیا جو وحی کی رو سے ان کی زندگی کے متعلق دیئے گئے تھے تو وَحَاقَ بِہِمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ (46:26) جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے' اس چیز نے ان کا مذاق اڑا

دیا، جن نتائج کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے انہوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور پھر ان کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں۔ اب بات مکمل طور پہ سامنے آ گئی۔ خارجی کائنات میں سائنٹفک انکشافات کے ذریعے، ریسرچز کے ذریعے، خارجی کائنات میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں خدا کے ان قوانین کی روشنی میں نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے صرف کرنا ہے اور وہ قوانین اس نے وحی کے ذریعے دیئے ہیں جو آج قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ اگر کوئی صرف خارجی کائنات کی قوتوں کو ہی مسخر کرتا ہے اور ان قوانین کے مطابق زندگی نہیں بسر کرتا تو وہ جو ان کی تمدنی زندگی ہے، وہ بھی جہنم کی زندگی بن جائے گی۔ یہ ہے کیفیت جو آج مغرب کی اقوام کی ہو گئی ہے۔ اقبالؒ (1877-1938 AD) کے الفاظ میں کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

وہ سحر قرآن کے آفتابِ جہاں تاب کی روشنی کے اندر ہوتی تھی۔

آج نوعِ انسانی کو تین کیٹگری (شقوں) میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

عزیزانِ من! اب ہمارے سامنے تین کیٹگریز (شقیں) آ گئیں۔ پہلی کیٹگری (شق) ان اقوام کی ہے جو تسخیرِ فطرت کے ساتھ اتباعِ قوانینِ خداوندی، جو قرآن کے اندر دیئے ہوئے ہیں، کرتی ہیں۔ یہ جو قوم ہوگی یہ مومنین اور متقین کی قوم کہلائے گی، اس کی یہ دنیا بھی درخشندہ ہوگی، اس کا مستقبل یا جو آخرت ہے، وہ بھی تابندہ ہوگا۔ دوسری کیٹگری (شق) ان اقوام کی ہے جو تسخیرِ فطرت سے، فطرت کی جو قوتیں ہیں، ان کو مسخر کرتی ہیں اور اپنی تمدنی زندگی میں، خدا کے قوانین سے انکار کرتی ہیں۔ اس کیٹیگری میں مغرب کی اقوام آئیں گی، انہیں مومن نہیں کہا جائے گا۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے انہیں جو قوتیں حاصل ہونگی، اُن سے ان کی یہ زندگی یقیناً آسائشوں کی زندگی ہو جائے گی لیکن ان کی تمدنی زندگی جہنم کی زندگی ہوگی، یہی وہ ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ مستقبل میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ یہ دوسری کیٹگری (شق) ہے۔ اور تیسری کیٹگری، عزیزانِ من! ان کی ہے جو نہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہیں اور نہ خدا کے قوانین کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔ انہیں کیا کہا جائے گا؟ یہ مجھ سے نہ پوچھیے، اپنے آپ سے پوچھیے۔ یہ وہ قوم ہوگی جس کی یہ زندگی بھی تاریک ہوگی، ذلت اور خواریوں کی ہوگی اور جس کی آخرت کی زندگی بھی تباہیوں اور جہنم کی زندگی ہوگی۔ اس لیے کہ قرآن کے الفاظ میں

مَنۡ کَانَ فِیۡ ھٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَھُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیۡلًا (17:72) جو آج کی دنیا کے اندر اندھا ہے، وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا:

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

(اقبالؒ: ضربِ کلیم، آج اور کل)

انسانی زندگی کے متعلق نبی اکرمؐ کا قولِ زریں

امروز کا تقدیر میں ہونا تو وہ اہم چیز ہے، جو نبی اکرم ﷺ کی اس حدیثِ مصدقہ کے مطابق، ہیرے کی طرح چمکتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ من استویٰ یوماہ فھو مغبون جس کے دو دن ایک جیسے گزر جائیں، جس کا آج اور کل ایک جیسا ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ تباہ ہو گیا، جس قوم کا آج کل کے مقابلے میں آگے بڑھا ہوا نہ ہو تو یاد رکھو! کہ یہ قوم ہے جو تباہ ہو جایا کرتی ہے۔ اور یہ وہ قوم ہے جہاں دین کی جگہ مذہب لے لیتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ ماپنے کا پیمانہ یہ ہو جائے گا یعنی دین سے جتنا زیادہ بُعد ہوگا مذہب کے اندر جتنی زیادہ کوئی قوم ڈوبی ہوگی، اتنی ہی زیادہ وہ یہاں ذلیل وخوار ہوگی۔ اور جتنی یہاں ذلیل وخوار ہوگی اتنی ہی اس کی آخرت بھی تاریک ہوگی۔ اور جہاں دین آئے گا، فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا جائے گا، اور ان کے ماحصل کو قرآن کی دی ہوئی مستقل اقدار کی روشنی میں نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے صرف کیا جائے گا، یہ انسانی دنیا بھی جنت بن جائے گی، آخرت کی زندگی بھی جنت بن جائے گی۔

برادرانِ عزیز! یہ چیز تھی سورۃ البقرۃ کی آیت (2:164) کی تفسیر، جس سے آج ہم نے درس کا آغاز کیا تھا۔ اب وقت ہو گیا۔ آئندہ درس میں آیت 165 سے آغاز کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀

پینتیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2) (آیات 165 تا 169)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ
وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا
تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ
النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ
الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى
اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1969ء کی 2 تاریخ ہے' اتوار کا دن ہے اور درس کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 165 سے ہوتا ہے: (2:165)۔

ذاتِ خداوندی کو ماننے اور سمجھنے کا طریق

سلسلۂ کلام یوں چلا آرہا تھا کہ آیت 163 میں کہا گیا تھا کہ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (2:163) دین کی ساری تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ اقتدار اور اختیار کی مالک ایک ذات' ذاتِ خداوندی ہے' صرف اسی کا قانون واجب الاتباع ہے۔ اور اس کے لیے میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ خدا کی ذات تو ماورائے سرحدِ ادراک ہے' انسان کے شعور اور ادراک میں ذاتِ خداوندی تو آ نہیں سکتی۔ یہ جو اس کا دعویٰ ہے کہ اقتدار صرف خدا کا ہے اس کو سمجھانے کے لیے وہ ہمیشہ خارجی کائنات کو سامنے لاتا ہے۔ اور یہ کہتا ہے کہ تم اپنے تجربے' مطالعے اور محسوس مشاہدہ کے بعد دیکھو کہ کس طرح وہاں ساری کائنات کے اندر ایک ہی قانون کارفرما ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ قانون کی

زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

برادرانِ عزیز! آپ کو معلوم ہے کہ سائنس کے انکشافات میں یا مسلمات میں دو ہی چیزیں ہیں جو بنیادی کہی جاتی ہیں۔ ایک تو Law of cause & effect (علت اور معلول کا قانون) ہے کہ ہر واقعہ جو سرزد ہوتا ہے' اس کے پیچھے اس کا کوئی نہ کوئی Cause (سبب) ہوتا ہے' ایک ہی Cause (سبب) ہو' حالات ایک جیسے ہوں' تو اس کا نتیجہ ہمیشہ ہر حالت میں وہی برآمد ہوگا۔ اور دوسرا Law of uniformity of nature (فطرت کا وحدت کا قانون) ہے کہ اس کائنات میں جہاں بھی ویسے حالات ہونگے' وہاں ہمیشہ اسی قسم کے نتائج مرتب ہونگے۔ یہ وحدتِ قانون کی زندہ شہادت ہے جو کائنات کے نظم و نسق سے انسان کے سامنے آسکتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے اگلی آیت 164 میں تخلیقِ ارض و سما اور اختلافِ لیل و نہار اور تسخیرِ شمس و قمر کو سامنے لا کر کہا کہ دیکھو! یہ نظمِ کائنات تمہیں کس نتیجے پہ پہنچاتا ہے۔ کیا اسی پہ نہیں پہنچاتا کہ یہاں ایک ہی قانون ہے جو کارفرما ہے؟ یہاں اگر ایک سے زیادہ اِلٰہ ہوتے تو کائنات میں فساد ہی فساد برپا ہو جاتا' انارکی پیدا ہو جاتی۔ اس نے کہا ہے کہ اس نظم و ضبط سے انسان کس نتیجے پر پہنچتا ہے؟ اسی ایک نتیجے پر کہ یہاں ایک ہی ذات ہے' ایک ہی قوت ہے جس کا قانون کارفرما ہے۔

عزیزانِ من! اس نے کہا ہے کہ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (2:164) اس میں ان کے لیے حقیقت کی بہت بڑی نشانیاں ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں لیکن ان کے خلاف دوسرے لوگ ہیں جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے' وہ جذبات کے پیچھے چلتے ہیں۔ اب یہاں سے دین اور مذہب کا فرق سامنے آجاتا ہے۔ دین کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور براہان سے سمجھ میں آنے والا ہے۔ غور و فکر سے اس پر جب تدبر کیا جائے گا تو اس کے نتائج سمجھ میں آجائیں گے۔ اس کے برعکس مذہب کی ہر چیز جذبات سے متعلق ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا کہ یہاں تو لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (2:164) تھا لیکن اس کے برعکس وہ لوگ ہیں کہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا (2:165) تم یہاں ان لوگوں کو دیکھو گے جو خدا کی مثل اور نظیر' اور قوتوں کو بھی سمجھتے ہیں۔ یہاں انداد آیا ہے۔ اسی لفظ سے ند ہے۔ ند ایسی قوت ہوتی ہے کہ تم کسی اور طرف جانا چاہو اور وہ تمہیں کسی دوسری طرف لے جائے۔ اَنۡدَادًا صحیح راستے سے دوسری طرف کھینچنے والی قوتیں ہیں۔

نظامِ خداوندی کے قانون اور انسانی جذبات کے مابین باہمی تصادم کی کیفیت اور نوعیت

برادرانِ عزیز! پہلے ہم اسی اندادًا من دون الله کو لیتے ہیں کہ خدا کا نظام' خدا کا پروگرام' خدا کا قانون' تمہیں ایک طرف کھینچتا ہے اور تم اپنے جذبات کے تابع کچھ ایسے معبود تراش لیتے ہو جو تمہیں اس کے خلاف دوسری طرف کھینچتے ہیں۔ انہیں اَنۡدَادًا ' مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ

کہا گیا۔قرآن نے اس کی تفصیل نہیں دی۔اول تو ہر فرد کا نـد الگ الگ ہوگا' پھر وہ اس کی نـد کہلائے گی لیکن قرآنِ کریم نے دو ایک مقامات میں ان اَنْدَادًا ' مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی کچھ خصوصیت بتائی ہے۔وہ خصوصیت سامنے آجائے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ ند کس قسم کے ہوتے ہیں؟ یعنی خدا کے مثیل اور نظیر' یعنی خدا جیسے اور خدا بنالینا۔کن کن معنی کے اندر یہ اور خدا بنائے جاتے ہیں اس کے لیے (2:21-22) دیکھیے۔وہاں بھی جو ہم نے پہلے آیت (2:164) لی ہے اس میں بھی باہر کی کائنات کا نظم و نسق سامنے لایا گیا تھا۔یہاں بھی یہ کہا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ o الَّذِیْ......(2:21-22) اے نوعِ انسانی! محکومیت اختیار کرو تو صرف اس ایک خدا کے قانون کی کرو۔پہلی چیز یہ ہے کہ اس نے تمہیں بھی پیدا کیا' تم سے پہلے جو اقوام گزر گئی ہیں' ان کا بھی خالق وہی تھا۔وہی ہے کہ جس نے تمہارے لیے اس زمین کو رہنے کی جگہ' سکون کی جگہ بنایا۔آسمان اوپر ہے' بادلوں سے پانی برسایا' مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (2:22) اس سے' زمین سے' تمہارے لیے رزق پیدا کیا۔

ذرائع رزق کو ذاتی ملکیت میں لے لینا خدا کا ہمسر بن جانا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کی یہ چیزیں غور طلب ہیں۔یونہی آگے نہیں گزر جانا چاہیے۔اوپر الناس کہا گیا ہے یعنی پوری نوعِ انسانی اور رزقًا لکم کہا گیا ہے یعنی تمام نوعِ انسانی کے لیے رزق کے ذرائع۔زمین' پانی' ثمرات' ان تمام چیزوں کو کہا ہے کہ یہ سامانِ زیست ہے' تمام نوعِ انسانی کے لیے سامانِ رزق ہے۔اور اس کے ساتھ کہا کہ وَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا (2:22) یاد رکھو! یہ تمام ذرائعِ رزق خدا کے پیدا کردہ ہیں' خدا کی ملکیت ہیں۔مقصد یہ ہے کہ یہ تمام نوعِ انسانی کے لیے سامانِ رزق اور سامانِ زیست بنیں لیکن تم ہو کہ اس کے خلاف خدا کے ہمسر قائم کر دیتے ہو۔یہ کیا بات ہوئی؟ ذرائع رزق کے متعلق کہا کہ یہ خدا کی ملکیت ہیں' اس کے پیدا کردہ ہیں۔کسی اور کو ذرائع کا مالک قرار دینا انـدادًا ' مِـنْ دُوْنِ الـلّٰـهِ بنا دینا ہے۔آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن ان چیزوں کو کہاں لاتا ہے؟ آپ تاریخِ انسانیت دیکھیے۔جو بھی انسان کا معبود بنا ہے' یہاں جس کے سامنے یہ جھکا ہے' اس نے پہلے کیا ہی یہ ہے کہ اس کے رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔اور جب یہ رزق کے معاملے میں اس کا محتاج ہوا ہے تو محتاجی کا اگلا قدم محکومی ہوتا ہے۔پھر جو کچھ وہ کہتا ہے' یہ اس کی اطاعت کرتا ہے۔ایک دفعہ جب آپ نے اسے اَن داتا کہہ دیا اور آپ کو پتہ ہے کہ اس سے پیشتر حاکم اور راجہ اور بادشاہ کے لیے Term (اصطلاح) ہی یہ اَن داتا' رزق کا مالک' رزق دینے والا' روٹی دینے والا Use (استعمال) ہوتی تھی' یہی اصطلاح ہوتی تھی۔اس نے کہا ہے کہ یہ ذرائع رزق ہمارے پیدا کردہ ہیں' ہماری ملکیت میں ہیں' مقصد یہ ہے کہ پوری انسانیت کے لیے سامانِ زیست اس سے مہیا ہو۔انہیں اپنی اپنی ذاتی ملکیت میں لے لینا' خدا کا ہمسر بن جانا ہے۔تم ان کے مالک کیسے بن سکتے ہو؟ یہ تمہارے پیدا کردہ نہیں

ہیں۔ اور جو چیز تمہاری پیدا کردہ نہیں ہے' تم اس کے مالک نہیں بن سکتے۔ آگے جو زر خرید آ سکتا ہے' تو سنو! خدا نے تو تمہارے ہاں اس کو بیچا نہیں کہ تم نے یہ وراثت میں لی۔ تم نے تو اپنے باپ سے وراثت سے لے لی۔ سب سے پہلے کس نے اس کے اوپر اپنا قبضہ جمایا ہے' اس نے کس کی وراثت سے لی تھی؟ یہ نہ تمہاری پیدا کردہ' نہ تمہاری خرید کردہ' نہ تمہارے باپ کی ہے۔ جس نے بھی سب سے پہلے زمین کے کسی خطے کے اوپر لکیر کھینچ کر کہا ہے کہ میں اس کا مالک ہوں' یہ قبضہ ہی ناجائز ہے۔ جو اس کا مالک ہے اس نے اس کے ہاتھوں بیچا نہیں ہے تو ناجائز قبضہ خواہ سو پشتوں تک کیوں نہ چلا جائے' ناجائز کا ناجائز ہوتا ہے۔ چوری کا مال جو بھی خریدتا ہے وہ خود چور ہوتا ہے۔ قرآن نے اسے کہا ہے کہ وَلَاتَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا (2:22) تم جانتے ہو کہ یہ تمہاری زر خرید نہیں ہے' تم جانتے ہو کہ تم اس کے مالک نہیں ہو سکتے لیکن اس کے باوجود تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم ان چیزوں کے مالک بن بیٹھتے ہو۔ یہ خدا کا ہمسر ہو جانا ہے' اس کا مثیل و نظیر ہو جانا ہے۔ اور یہی چیز ہے جو دوسرے مقام پہ کہی ہے۔ عزیزانِ من! قرآن کریم یوں سمجھا کرتے ہیں اور اسی طرح سے سمجھیے گا۔

قرآن حکیم تصریفِ آیات سے ہی سمجھا جا سکتا ہے

قرآن نے کہا ہے کہ تصریفِ آیات سے بات تمہاری سمجھ میں آئے گی۔ تصریفِ آیات کے معنی ہوتے ہیں کہ قرآن میں جس جس مقام پر وہ Subject' وہ موضوع آیا ہے' اسے بیک وقت اپنے سامنے رکھیے۔ اور جب یوں آپ سامنے رکھیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ سارا قرآن آپ پہ واضح ہو جائے گا' آپ کے لیے کہیں کوئی مشکل نہیں پڑے گی۔ طریقہ اس کا یہ ہے کہ عربی زبان اور قرآنِ کریم میں جس جس مقام پہ جو موضوع آیا ہے اس سب کو ایک وقت میں سامنے لائیے' بات واضح ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ کہا کہ قُلۡ اَئِنَّكُمۡ لَتَكۡفُرُوۡنَ بِالَّذِىۡ (41:9) ان سے پوچھو کہ کیا تم اس خدا کا انکار کرتے ہو؟

نظامِ ربوبیتِ عالمینی کے لیے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں بکھرے ہوئے خزانوں کی تفصیل

دیکھیے کونسا خدا یہاں گنایا ہے؟ کہا ہے کہ خَلَقَ الۡاَرۡضَ فِىۡ يَوۡمَيۡنِ (41:9) وہ جس نے اس زمین کو دو منازل میں اس قابل بنایا کہ تم اس پہ رہ سکو اور اس میں سے تمہارے لیے سامانِ رزق پیدا ہو۔ پھر یہ وہی زمین کی تخلیق ہے' اور وہی اسے ذریعۂ رزق بنانا ہے۔ اور کہا ہے کہ وَتَجۡعَلُوۡنَ لَهٗۤ اَنۡدَادًا (41:9) اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم پھر اس کے مقابلے میں' اس کے ہمسر اور مثیل اور نظیر بنا دیتے ہو' اور خدا تجویز کر لیتے ہو۔ یہ وہی تخلیقِ ارض ہے' وہی اس کا خالق ہونا ہے' وہی اس کا مالک ہونا ہے اور اس کے مقابلے میں دوسروں کو اس کا مالک قرار دے دینا ہے؟ کہا ہے کہ ذٰلِكَ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ (41:9)۔ وہاں (2:22) میں کہا تھا کہ تمام انسانوں کے

لیے سامانِ رزق ہے اور یہاں (41:9) میں کہا کہ یہ جس نے پیدا کیا ہے اس نے اپنی ربوبیتِ عالمینی کے لیے ان کو پیدا کیا تھا کہ تمام نوعِ انسانی کی پرورش اور نشوونما ہوتی چلی جائے۔ اور اس کے لیے وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ (41:10) اس مقصد کے لیے اس نے بڑے بڑے پہاڑ کھڑے کیے کہ تمہارے لیے واٹر سپلائی کا کام دیں۔ پھر زمین کے اندر اس کی صلاحیت رکھی کہ اس کو اگر تم محنت سے بوتے جاؤ تو یہ رزق پہ رزق دیتی چلی جائے۔ اس کی چار فصلیں بنائیں' چار قسم کے موسم ہیں' تاکہ اس میں مختلف قسم کے اناج اور مختلف قسم کی فصلیں پیدا کریں۔ یہ سارا کچھ ہم نے کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کاہے کے لیے کیا ہے؟ کہا ہے کہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (41:10) تاکہ یہ ہر ضرورت مند کے لیے یکساں طور پر کھلی رہے۔ اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا (41:9) تم اس کے ساتھ' اس کے ہمسر اور مثیل مقرر کرتے چلے جاتے ہو' دوسروں کو خدا بنا دیتے ہو۔ میں دو ہی مقامات سامنے لایا ہوں دیگر مقامات کی تفصیل میں اگر جاؤں تو اسی لفظِ انداد پہ پورا ایک درس چاہیے لیکن میں نے کہا ہے کہ اس مقصد کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

عزیزانِ من! اوپر سے قرآن لا رہا ہے کہ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (2:164)۔ یہ وہی موضوع ہے کہ تمام کائنات کا جو باہر سلسلۂ نظم و نسق ہے یہ اس لیے تھا اور ہے کہ یہ نوعِ انسانی کے لیے سامانِ رزق دے لیکن لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ خدا کے ہمسر بناتے ہیں' اس کے مثیل و نظیر بناتے ہیں' ان کو اس کا مالک قرار دے دیتے ہیں۔ اور پھر کیفیت یہ ہوتی ہے کہ يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (2:165)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے کہ خدا سے محبت کرنی چاہیے حالانکہ جو لوگ ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔

خدا سے محبت کرنے کا مفہوم اور اس کی شکل و صورت

''خدا سے محبت'' یہ لفظ غور طلب ہے۔ جب ہم اپنے ہاں محبت کا لفظ بولتے ہیں تو آپ جانتے ہیں محبت کسی دوسرے شخص سے کی جاتی ہے خواہ وہ بچوں کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو' عورت کے ساتھ کیوں نہ ہو' دوست کے ساتھ کیوں نہ ہو۔ یہ ایک جذبہ ہے انسان کے اندر محبت کا لیکن کبھی آپ نے اسے سوچا ہے کہ کوئی ایسا شخص جسے آپ نے نہ کبھی دیکھا' نہ اس سے ملے' کیا اس سے بھی کبھی محبت کی جا سکتی ہے؟ یہ ایک غیر مرئی چیز ہے' نظر نہ آنے والی ہے' نظر ہی نہ آنے والی نہیں بلکہ یہ برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم ہے' جو تصور میں نہ آ سکے' خیال میں نہ آ سکے' گمان میں نہ آ سکے' وہم میں نہ آ سکے۔ خدا کی ذات کے متعلق اس نے خود کہا ہے کہ لا تدرکہ الابصار تمہاری Sense Perception (ادراک بالحواس) اس کا ادراک ہی نہیں کر سکتی۔ یہ ایک اس قسم کی Abstract (غیر محسوس) حقیقت ہے جو

تصور میں نہ لائی جاسکے۔خدا کا تصور کرنا چاہو تو ہر فرد اپنے ذہن میں الگ الگ تصور کرے گا۔ہم ایک جیسا تصور بھی نہیں کر سکتے۔جو تصور میں بھی نہ آئے، کبھی اس سے ایسی محبت کی جاسکتی ہے جس طرح سے ہم محبت کا عام لفظ بولتے ہیں؟

عزیزانِ من! کوئی شخص اگر کہیں باہر گیا ہوا ہو، اس کے بعد میں خبر آئے کہ تمہارے ہاں اللہ نے ایک بیٹا دیا ہے، چاند سا بیٹا بھی کیوں نہ کہیں لکھا ہوا ہو کہ بیٹا تمہارا بڑا ہی خوبصورت ہے۔وہاں بیٹھے ہوئے کبھی اس کے ذہن میں نہیں آئے گا کہ میں اس کو چوم لوں، لپٹا لوں، محبت کروں۔وہ جب اسے دیکھے گا، تو اس وقت پھر وہ بچہ اس کی طرف آئے گا، وہ اس کو گود میں اٹھائے گا۔اَن دیکھے تو بچے سے محبت نہیں کی جاسکتی۔اَن دیکھے خدا سے اس انداز کی محبت کا یہ تصور غلط ہے۔اور آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں تصوف کی ساری عمارت خدا کے ساتھ محبت پہ اٹھتی ہے۔تصوف میں خدا سے محبت ہے۔پھر وہ محبت کا بھی اگلا درجہ ہے جسے عشقِ باری تعالیٰ کہتے ہیں۔یہ محبت کس طرح سے کی جاسکتی تھی؟ یہ تو اس طرح ہے کہ اپنے ذہن میں کوئی تصور قائم کرلیا جائے پھر اس تصور کے ساتھ محبت کی جائے۔یاد رکھیے! یہ ساری بنیادی غلطی محبت کے اس معنی سے ہوتی ہے کہ جس طرح سے ہم اس لفظ کو اپنے ہاں استعمال کرتے ہیں اور پھر اس کے اوپر تصوف کی عمارت استوار ہوتی ہے۔انہوں نے خدا کو ایک Personal God (تجسیمی خدا) بنا رکھا ہے اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ہر رات اس کے پاس ہوتے ہیں، وہ کسی خاص مقام پہ ہے جہاں یہ پہنچے ہوتے ہیں، وہاں پھر ان کی محفلیں جمتی ہیں، راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں۔اور وہ اس قسم کے راز و نیاز کی باتیں ہیں کہ ''ایویں نظر اوندا اے جیویں خدا لنگوٹیا یار ہوندا اے ایناں دا❶'' اور پھر اس کے ساتھ بے تکلفی ہوتی ہے حتیٰ کہ با خدا دیوانہ باشد با محمدؐ ہوشیار اس سے مستی ہوتی ہے۔حالانکہ کہا یہ ہے کہ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (6:91) خدا کا انہوں نے اندازہ ہی نہیں لگایا جیسا اندازہ لگانا چاہیے۔لفظِ محبت کے یہ معنی نہیں ہیں۔

لفظ محبت کا لغوی مفہوم

برادرانِ عزیز! یہ عجیب لفظ ہے۔عربی زبان سے انسانوں کی خدا کے ساتھ محبت پوچھیے۔اِس زبان میں یہ جو اس لفظ ''حبا'' کا ''ح ب ب'' مادہ ہے، اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی کے ساتھ ثبات، لزوم، تمسک رکھنا یعنی کسی شے کو لازم پکڑنا اور اس کے ساتھ مستحکم طور پر رہنا، اس کو اس طرح جاذب ہونا، پکڑنا، اطاعت کرنا، ساتھ رہنا''۔اور خدا کی طرف سے محبت کے معنی ہوتے ہیں ''حفاظت کرنا، نشو ونما کرنا، نتائج کو ٹھوس حقیقتوں میں بدل دینا''۔''حب'' دانے کو کہتے ہیں مثلاً اَحبّ الزرع کھیتی میں دانے پڑ گئے یعنی اس کی نشو ونما کے نتائج ابھر کر سامنے آ گئے ''حب'' تو ہمارے ہاں پنجابی میں زمیندار کو بھی کہتے ہیں، اناج کے جو دانے ہوتے ہیں جب وہ پکتے ہیں تو اس کی محنت کے نتائج

---

❶ یوں نظر آتا ہے کہ خدا ان کا لنگوٹیا دوست ہے۔

سامنے آتے ہیں اور طب میں ''حب'' آپ گولی کو کہتے ہیں۔ یہ حبۃ کا لفظ بیسیوں دفعہ قرآنِ کریم میں ہے' یہ اناج کو کہتے ہیں۔ جب اناج کا دانہ پکتا ہے تو کسان کی محنت کے نتائج ایک ٹھوس حقیقت میں سامنے آتے ہیں۔ جسے آپ دانے کہتے ہیں کیا کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ اس دانے کو ''حب'' کیوں کہا جاتا ہے؟

خدا کی طرف سے کسان کی محنت کے نتائج ٹھوس شکل میں سامنے آتے ہیں تو اسے خدا کی طرف سے محبت کہا جاتا ہے۔اور جب انسان کسی کا اتباع اور اطاعت اس انداز سے کرتا ہے کہ مسلسل' لازماً' ثبات اور استقامت کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے کھنچے ہوئے چلے جاتا ہے تو اسے کسی کے ساتھ انسان کی محبت کہتے ہیں۔انسان کی خدا کے ساتھ محبت اس کے قوانین کی مسلسل' لزوم' ثبات اور استحکام کے ساتھ اطاعت کرنا ہے۔اور خدا کی انسانوں کے ساتھ محبت ان کی اس قسم کی محنت کے بھرپور نتائج' ٹھوس شکل میں ان کو عطا کر دینا ہے' ان کی حفاظت کرنا ہے' انہیں تھامے رکھنا اور ان کے لیے سہارا بننا ہے۔اسی سے حب الماء مٹکا یا ٹھلیا یا مشک کو کہتے ہیں جس میں پانی محفوظ رکھا جاتا ہے یا یہ گھڑونچی جس کے اوپر مٹکا رکھا جاتا ہے' اسے اس گھڑونچی کا ''حب'' کہا جاتا ہے جس کے سہارے کوئی چیز قائم ہوتی ہے۔

اب آپ خدا کے ساتھ اس چیز کو لیجیے۔کہا ہے کہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَهُمۡ کَحُبِّ اللّٰهِ (2:165) جو لوگ خدا کے علاوہ اوروں کو اپنا معبود تراش لیتے ہیں' رزق دینے والا بنا دیتے ہیں' رزق کے ذرائع کے اوپر ان کی ملکیتیں تسلیم کر کے پھر ان کے سامنے جھکتے ہیں' وہ ان کی اس طرح اطاعت کرتے ہیں جیسے کہ خدا کی اطاعت کرنی چاہیے بلکہ اس سے بھی زیادہ ان کی اطاعت کرتے ہیں۔عزیزانِ من! اس سے بات کیسی صاف ہوگئی! اس کے معنی ہی اطاعت کرنے کے ہیں۔کہا ہے کہ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (2:165) جو ایمان والے لوگ ہیں' وہ خدا کے قوانین کی سب سے زیادہ اطاعت کرتے ہیں' شدید ترین اطاعت کرتے ہیں' کسی انسان کی اطاعت نہیں' کسی انسان کے قانون کی اطاعت نہیں بلکہ خدا کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔یہی کسی انسان کے قانون کی اطاعت تو ان کو اِلٰہ بنالینا ہے۔

عزیزانِ من! اس لیے خدا کے ساتھ محبت وہ چیز نہیں ہے جس طرح سے ہم' کوئی ایک Person ہوتا ہے' یا کوئی ایک شخصیت ہوئی ہے' تو اس کے ساتھ کرتے ہیں' یہ عام الفاظ میں اس جیسی محبت والی بات نہیں ہے۔اسے زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسے اپنے مقصد سے بڑی محبت ہے' اسے اپنے مشن کے ساتھ عشق ہے۔ان معنی کے اندر بھی ہم خدا کے متعلق یہ نہیں کہیں گے کہ اسے خدا کے ساتھ محبت ہے البتہ یہ یوں ہے کہ وہ خدا کے قوانین کی طرف کھنچے چلا جاتا ہے' ان کی اطاعت کرتا ہے۔یعنی جب اس پہ آئیں گے تو یہیں یہ ایک لفظ آئے گا کہ وہ خدا کے قوانین کی اطاعت کرتا ہے۔یہ ہے خدا کی اطاعت سب سے زیادہ شدید شکل میں۔اور یہ لوگ جو ذرائع رزق پر دوسروں کی ملکیت کو تسلیم کر لیتے ہیں' انہیں پھر ان کی اطاعت ایسے کرنی پڑتی ہے جیسے کہ انہیں خدا کی اطاعت کرنی چاہیے تھی۔

تصوف کی دنیا میں پائے جانے والے محبت کے تصورات' قرآنِ حکیم کی تعلیم کے ہی خلاف ہیں

عزیزانِ من! یہ جو خدا سے محبت کا قصہ ہے' مجھے اس کو ذرا وضاحت سے بیان کرنا پڑا ہے کیونکہ وہ جو خدا کی محبت کا تصور میں نے کہا ہے کہ وہ تصوف کی رو سے ہمارے ہاں آیا ہوا ہے' ان کے ہاں اطاعت کا تصور نہیں ہوتا۔ مثلاً بھنگڑ خانے میں بیٹھے ہوئے ہیں ''سوٹے دا دم کھچن ڈے ہوئے ہیگے ❶'' جب عقل کا دیا گل ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ بارگاہِ خداوندی کے قُرب میں جا پہنچے' مقربِ بارگاہِ خداوندی ہو گئے۔ اور پھر وہاں پہنچتے پہنچتے جوان میں مجذوب ہو جاتا ہے' جسے بالکل پاگل کہتے ہیں ''اوسب توں زیادہ پہنچیا ہویا ہونداا ے ❷''۔ اور یہ ہیں جن کے لیے وہ سعدیؒ (شیرازی: 1291-1184) کہہ گیا ہے کہ

کاں را کہ خبر شود خبرش باز نہ آید

جسے اس کی خبر ہو جاتی ہے' اس کی خبر پھر واپس ہمارے ہاں نہیں آتی یعنی پھر ''ہتھنی مع ہودہ غائب''۔ آپ نے مجذوب دیکھے ہونگے ''خبرش باز نہ آید''۔ انہیں اپنا ہی پتہ نہیں ہوتا' وہ اس طرح سے اس کی محبت میں غرق ہو جاتے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ سارے تصورات غیر قرآنی اور عجم سے مستعار لیے ہوئے ہیں۔ قرآن خدا کے احکام وقوانین کی اطاعت سکھاتا ہے۔ وہ اس قسم کی میٹا فزیکل (مابعد الطبیعاتی) باتوں میں آتا ہی نہیں ہے۔ وہ کوئی ایک ایسی ذات ہے جو ہمارے حیطۂ ادراک میں ہی نہیں آسکتی' ہم اس کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ کیا اس کے ساتھ اس قسم کی سی محبت کی جا سکتی ہے جیسے کہ ہمیں آپس میں' دوستوں میں' بیوی بچوں کے ساتھ' محبوب کے ساتھ ہوتی ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ اب اس کے بعد یہ آپ کے ہاں کی ساری جتنی عاشقانہ غزلیں ہیں' جو ڈھولک پہ پڑھی جاتی ہیں' قوالی میں جن کا جھٹکا کیا جاتا ہے' آپ انہیں دیکھیے۔ یہ ساری عمارت اس کے اوپر استوار ہوتی ہے کہ ایک معشوق سامنے بنا رکھا ہے' زلفیں ہیں' خد ہیں' خال ہیں' اس کا سارا کچھ اسی طرح سے پیراہن بنایا ہوا ہوتا ہے اور اس کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ قرآن سے اس تصور کا کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کی رو سے ''خدا کے ساتھ محبت اس کے قوانین کی اطاعت سے ہے۔ اُس کی طرف سے انسانوں کی محبت ان کی اطاعت کے بھرپور نتائج مہیا کرنا ہے''۔

خدا سے محبت محسوس شکل میں اس کے عطا کردہ قوانین کی اطاعت اور اتباع کا نام ہے

عزیزانِ من! یہ متذکرہ بالا دونوں معنی عربی زبان کی رو سے ہیں۔ قرآن نے خود واضح کر دیا کہ یہ حباً اتباع ہے' یہ اطاعت ہے۔

---

❶ بھنگ کے نشے کا کش لگا رہے ہیں۔

❷ وہ سب سے زیادہ خدا رسیدہ ہوتا ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ یہ اتباع اور اطاعت کا نام ہے۔ دیکھیے یہ بات کس طرح سے واضح ہوتی ہے؟ کہا ہے کہ قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ (3:31) اگر تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم خدا سے محبت کرتے ہو' میں یہاں اب یہی معنی لیتا ہوں' تو یہ یونہی تمہارے ہاں کی ذہنی تصوراتی چیز نہیں ہے۔ اس تکیہ دائرے کے اندر بیٹھے ہوئے' خلوت گاہ کے اندر بیٹھے ہوئے' اپنے مصلے کے اوپر بیٹھے ہوئے اور اس جذب وانہماک کے اندر بیٹھے ہوئے' خدا کی محبت کے اندر بیٹھے ہوئے' کہتے ہو۔ کہا یہ ہے کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ ہے خدا سے محبت تو سنو! میں تمہیں بتاؤں کہ اس کا پہچاننے کا محسوس (Concrete) طریقہ کیا ہے؟ کہا ہے کہ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ (3:31) جس راستے پہ میں چلتا ہے اس کے پیچھے پیچھے چلتے آؤ۔ اب یہ کہنے والا ایک محسوس شخص ہے کہ ''میرے پیچھے چلتے آؤ''۔ یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ تم خدا سے محبت کرتے ہو' میں پھر وہی لفظ لاتا ہوں۔

خدا کی طرف سے محبت کے جواب کی محسوس شکل

کہا گیا ہے کہ اگر تم ایسا کرو گے تو يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ (3:31)۔ یہاں پھر وہ لفظ ''حب'' آ گیا۔ آپ اس لفظ کے معنی تو یہاں رہنے دیجیے بس یوں کہیے کہ ''اللہ محبت کرے گا تم سے'' جیسا ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ معنی دیکھیے کہ وہ یہاں کیا لاتا ہے۔ یعنی وہ کیا کرے گا؟ کہا کہ وَ يَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ (3:31) تمہاری لغزشوں کے نتائج سے تمہاری حفاظت کر دے گا۔ آپ دیکھیے کہ حفاظت کے معنی کس طرح سے یہاں واضح ہو گئے۔ کہا ہے کہ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (3:31) اللہ حفاظت کرے گا' سامانِ نشو ونما بہم پہنچائے گا۔ یہ ہے خدا کی طرف سے محبت۔ انسانوں کی طرف سے خدا کی محبت اس کے قوانین کا اتباع ہے' خدا کی طرف سے انسانوں کے لیے محبت ان کو سامانِ حفاظت اور نشو ونما بہم پہنچانا ہے۔ اور کہا یہ ہے کہ اگر اب بھی بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو یوں سمجھ لو: قُلۡ (3:32) ان سے کہو کہ آؤ تمہیں اور واضح کر کے سمجھاؤں۔ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوۡلَ (3:32) اطاعت کرو تم خدا کی اور اس کے رسول کی۔ لیجیے قرآن نے محبت کے معنی ''اطاعت'' خود بتا دیئے' پھر کہا کہ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡكٰفِرِيۡنَ (3:32) اگر یہ اس سے روگردانی کرتے ہیں' انحراف کرتے ہیں' تو یاد رکھیے! پھر اس قسم کے کفر کرنے والوں سے خدا محبت نہیں کرتا۔ وہ دیکھیے! محبت کے معنی کیا آ گئے۔ خدا کی محبت کا یہ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ ہے۔ خدا کی محبت کے معنی ''اطاعت'' ہیں' خدا کو یاد رکھنا ہے۔ اگر وہ خدا کے احکام وقوانین کی اطاعت نہیں کرتا ہے تو پھر کوئی مدعی نہیں ہوسکتا' جتنا زیادہ خدا کی اطاعت کرتا چلا جائے گا' اتنا ہی زیادہ' ان لفظوں میں کہہ دیجیے کہ وہ خدا سے محبت کرے گا' اور وہ خدا سے محبت کرنے والا ہوگا لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ ہمیں احتیاطاً اس کے بعد' اس کا ترجمہ ''محبت'' کرنا ہی نہیں چاہیے۔ یہ خدا کے قوانین کی اطاعت کرنے والا ہے اور خدا اس کی اس اطاعت کے نتائج اس کو بہم پہنچائے گا۔ عزیزانِ من! بات یوں واضح ہو جاتی

ہے۔یہی ہے دین۔

کہا ہے کہ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ (5:54) اے ایمان کے مدعیو! تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پھر جائے تو اس سے خدا کا کیا بگڑے گا؟ کچھ بھی نہیں۔ ''او ہنے کوئی الیکشن لڑنا اے پئی او ہنوں ووٹاں تھوڑیاں ملن گیاں تے ہار جائے گا ❶''۔ اپنے دین سے پھرتے ہیں' پھر جاؤ' اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔

خدا سے محبت کے الفاظ کی بجائے قوانین خداوندی کی اطاعت کے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں

عزیزانِ من! وہ اس وقت بھی خدا تھا جب کوئی بھی انسان اس کائنات میں نہیں تھا' وہ اس وقت بھی خدا ہوگا جب یہاں کوئی انسان ہی نہیں ہوگا۔ اسے ماننا یا نہ ماننا تو ایک طرف رہا' اس کی خدائی میں بھی کسی قسم کا کوئی حرف اور کوئی کمی نہیں آتی۔ تم اس کے محتاج ہو' وہ تمہارا محتاج نہیں ہے کیونکہ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (3:97) اس کی حکومت تمہارے سہاروں کی محتاج نہیں ہے۔ دوسروں کے سہاروں کی محتاج حکومتیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ کس طرح وہ تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹتی ہیں۔ وہ قیوم ہے' سب کا سہارا بنتا ہے' خود کسی سہارے کا محتاج نہیں ہے۔ اس لیے اگر تم میں سے کوئی اس سے پھر جاتا ہے تو پھر جائے۔ سنو! فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَ یُحِبُّوْنَہٗۤ (5:54) تمہارے بعد ایک اور قوم آجائے گی۔ اس کی خصوصیت یہ بتائی کہ پھر وہ دین سے پھر جانے والی نہیں ہوگی۔ یہاں دیکھیے محبت کے معنی ''دین کی اطاعت کرنے والے'' آ گئے۔ وہ اس خدا کی' اس کے دین کی اطاعت کرے گی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا کا قانونِ مکافات' ان کے عملی نتائج ان کے سامنے لے آئے گا۔ کیا کیفیت ہوگی اس قوم کی؟ یہ کہ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (5:54) اپنوں کے سامنے بریشم سے زیادہ نرم اور شاخِ ثمر دار کی طرح خمیدہ ہونگے لیکن اس نظام کے مخالفین کے مقابلے میں چٹانوں سے زیادہ سخت ہونگے۔ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (5:54) وہ اس نظام کے قیام اور استحکام کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں گے۔ بات صاف کر دی کہ دیکھیے خدا کی محبت کیا ہے؟ اب یہاں' ہمارے یہاں ان کی کیفیت یہ ہے' کہ بیٹھے ہوئے ہیں صاحب! گوشے میں' غاروں میں' جنگلوں میں۔ ارے بھئی! خدا نے تو کہا تھا کہ اس کے راستے میں جہاد کرو۔ کہتے ہیں کہ جی یہ جو تلوار ہاتھ میں لے کر دشمن کے مقابلے میں جہاد کرنا ہے' یہ تو جہادِ اصغر ہے اور اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا جہادِ اکبر ہے۔ یہ جہادِ اکبر میں لگے ہوئے ہوتے ہیں۔

برادرانِ عزیز! قرآن کہتا ہے کہ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ (5:54) یہ اس نظام کے قیام کے لیے مسلسل جہد کرتے رہتے ہیں اور پھر وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتے نہیں ہیں۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ پھر تصوف

---

❶ اس نے کونسا الیکشن لڑنا ہے کہ اسے کم ووٹ ملیں گے تو وہ ہار جائے گا۔

میں اس کے معنی کیا ہیں؟ ہمارے ہاں ایک فرقہ ملامتیہ ہے۔ یہ جتنی چیزیں خلافِ شریعت ہیں وہ یہ سب کرتے ہیں۔ ارے بھئی! یہ تو تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ یہ سارا کچھ کررہے ہیں؟ کہنے لگے کہ جی! وہ اس لیے یہ کرتے ہیں کہ لوگ ان سے نفرت کریں' ان کے پیچھے نہ بھاگیں' دور چلے جائیں۔ یہ ہے بات۔ اندر سے تو وہ بالکل خدا کے ہیں۔ ملامت ان پہ ہو۔ بھئی! یہ کیا انداز ہے؟ کہ جی! خدا نے کہا ہوا ہے کہ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (5:54) یہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتے نہیں ہیں۔ پوچھو نہیں کہ انہوں نے قرآن کو کیا کر رکھا ہے صاحب! اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ (5:54) یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ چاہتا ہے دیتا ہے۔ ٹھیک ہے تو پھر ''بھنگاں پیو' تے سوٹے مارو' تے ننگ دھڑنگ بیٹھے رہو' اے اللہ دا فضل ہوندا پیا ہیگا اے ❶''۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ یاد رکھو! جو تم سے' دین سے' پھرتا ہے' پھر جائے اس کی جگہ اور قوم آئے گی جو سمجھے گی کہ دین کے اوپر چلنے سے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ وہ خدا کی اطاعت کرے گی' خدا ان کی اطاعت کے نتائج دے گا۔ وہ قوم ایسی ہوگی کہ اپنوں کے سامنے جھکے ہوئے ہوگی مگر مخالفین کے مقابل میں فولاد کی طرح سخت ہوگی۔ ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ اپنے نصب العین پر یوں جم کر کھڑے ہونگے کہ دنیا کے ازمز (Isms) اور دنیا کے نظام' جو کچھ جی میں آئے' ان سے کہتے رہیں' مگر وہ کبھی اس کی پرواہ نہیں کریں گے کہ تم کیا کہتے ہو۔ وہ اس استحکام و لزوم اور استحکام وثبات کے ساتھ اپنے مشن کے اوپر جم کر کھڑے ہوئے ہونگے اور دنیا کے اندر ان کو کسی بات کرنے والے کی بات کی پرواہ نہیں ہوگی۔ یہ ہے خدا کا فضل' جو اسے حاصل کرنا چاہے' وہ اسے دے دیتا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک اولیا اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں ہے

عزیزانِ من! اس کے بعد کہا ہے کہ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ (5:55)۔ یہاں ولی کا لفظ ہے میں جب اولیا اللہ کے اوپر آؤں گا' آگے ایک آیت آئے گی' وہاں میں اس کی تفصیل بیان کرونگا' اس وقت میں یہ عرض کردوں کہ قرآن کی رو سے یہ اولیا اللہ کا بھی کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا' ہر مومن خدا کا ولی ہوتا ہے۔ یہ ''ولی'' کا لفظ بھی ''محبت'' کی طرح ہے۔ عربی زبان میں اگر بڑے کی طرف سے یہ ولایت ہوتی ہے تو اس کے معنی ''سرپرستی'' ہوتی ہے' چارہ سازی ہوتی ہے' سامانِ حفاظت دینا ہوتا ہے۔ اگر چھوٹے کی طرف سے ولایت ہوتی ہے تو اس کے معنی ''رفاقت'' ہوتی ہے' تائید ہوتی ہے۔ یہ انسان اگر خدا کا ولی ہوتا ہے تو اس سے دین کی نصرت اور رفاقت کرتا ہے۔ اگر خدا انسانوں کا ولی ہوتا ہے تو ان کے لیے سامانِ حفاظت بہم پہنچاتا ہے' ان کا سرپرست ہوتا ہے' چارہ ساز ہوتا ہے۔ کہتا ہے

---

❶ بھنگ پیو' نشے کے کش لگاؤ' ننگ دھڑنگ بیٹھے رہو۔ جی! یہ اللہ کا فضل وکرم ہو رہا ہے۔

کہ تمہارے جو ولی ہیں' وہ ہیں اللہ اور رسول اور وہ لوگ جو ایمان لانے والے ہیں۔ کہا ہے کہ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ ھُمۡ رٰکِعُوۡنَo وَ مَنۡ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَاِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ھُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ (5:55-56) پھر یاد رکھیے! جو بھی خدا کو' اس کے رسول کو' ایمان والوں کو' اپنا رفیق' اپنا حامی' اپنا محسن' تسلیم کر لیتا ہے تو یہ ہے خدا کی پارٹی اور خدا کی پارٹی ہمیشہ غالب رہے گی۔

اولیا اللہ کی پہلی نشانی: اقوامِ عالم کی امامت ہے

برادرانِ عزیز! اولیا اللہ کی تو کیفیت یہ ہوگی کہ وہ دنیا میں غالب رہیں گے۔ مگر یہاں جو سب سے زیادہ مغلوب' سب سے زیادہ مفتوح' سب سے زیادہ عاجز اور بے بس ہیں' وہ ہیں جنہیں اولیا اللہ کہا جاتا ہے۔ ان کے لیے کہا جاتا ہے کہ ''ککھ مسیت دا جنوں کیندے نیں پیراں تھلے آ کے وہ رڑ کے نہ' او ولی اللہ ہو جاندا اے [1]'' مگر قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ھُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ (5:56) دنیا میں غلبہ ان کا ہوگا۔ اولیا اللہ کی پہلی نشانی یہ ہے کہ اقوامِ عالم میں دین کا غلبہ ان کے ہاتھوں سے ہوگا۔ عزیزانِ من! یہ ہے قرآنِ کریم جس نے خدا کی محبت' انسانوں کی محبت خدا کے ساتھ' کے لیے یہ کچھ کہا ہے۔ اس میں جو تصوف والی محبت ہے' وہ محض اپنے ذہن کی Creation (تخلیق) ہے' Imagintion (تخیل) ہے' تصور ہے' اس کا حقیقت سے کوئی دخل نہیں ہے' وہ قرآن کی رو سے محبت نہیں ہے۔ یہ تو خدا کے قوانین کی اطاعت ہے۔ کہا ہے کہ وَ لَوۡ یَرَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ یَرَوۡنَ الۡعَذَابَ اَنَّ الۡقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا وَّ اَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعَذَابِ (2:165) ابھی یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی' یہ اس وقت آئے گی جس وقت یہ جو خدا کے علاوہ اوروں کو معبود بنائے ہوئے ہیں' ان کے خود تراشیدہ نظام کے تباہ کن نتائج جب سامنے آئیں گے' اس وقت یہ بات ان کی سمجھ میں آئے گی کہ واقعی محکومیت اور اطاعت کے لائق صرف خدا ہی کی ذات تھی' غیرِ خدا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ جسے حقیقی قوت اور غلبہ کہتے ہیں وہ خدا ہی کے قوانین کو حاصل ہے' انسانوں کے خود تراشیدہ نظاموں کو وہ غلبہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اس وقت ان کی سمجھ میں آئے گی۔

جہنم اور جنت کسی مقام کا نام نہیں بلکہ یہ دو کیفیات کا نام ہے

عزیزانِ من! آگے ایک نقشہ کھینچا گیا ہے' یہ بڑا غور طلب ہے' بڑا فکر انگیز ہے۔ قرآنِ کریم میں ایک مقام میں نہیں' متعدد مقامات میں وہ ایک چیز سامنے لایا ہے۔ یاد رکھیے! جسے قرآنِ کریم جہنم' جہنم کے اندر کیفیتیں' جنت' جنت کے اندر کے مناظر بیان کرتا ہے' وہ کوئی

---

[1] جسے مسجد کا تنکا کہتے ہیں' بے قدر و منزلت کہ پاؤں کے نیچے آئے تو پتہ بھی نہ چلے (کہتے ہیں کہ) وہ ولی اللہ ہو جاتا ہے۔

خاص ❶ Localities (قیامگاہیں) نہیں ہیں' مقامات نہیں ہیں جن کے اندر یہ کچھ ہوتا ہے۔ وہ کیفیات ہیں۔ جہنم انسانوں کے غلط نظام کے نتائج کی حالتِ زندگی ہے' یہ نتائج اس زندگی میں سامنے آئیں یا مرنے کے بعد سامنے آئیں۔ وہ جو اقوام کی اضطراب انگیز' ذلت آمیز' حسرت ناک' عبرت خیز ایک کیفیت ہو جاتی ہے وہ ہے اس دنیا میں بھی جہنم کی زندگی۔ اور جس کی زندگی اس دنیا میں جہنم کی ہے' اس کے لیے آخرت میں بھی جہنم ہے۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پہ جہنم میں عوام کے اور ان کے لیڈروں کے مکالمات گنائے ہیں۔ غور کیا آپ نے' یہ بات کتنی دلچسپ ہوگی! جس زمانے میں ان کی گڈی چڑھی ہوئی ہوتی ہے' اس زمانے میں وہ سب ساتھ ہوتے ہیں۔ مصاحب ہوتے ہیں' خوشامدی ہوتے ہیں' عوام بھی پیچھے ہوتے ہیں۔ وہ حاکم ہوتے ہیں' کامیاب لیڈر ہوتے ہیں' سب ساتھ ہوتے ہیں۔ جب ان کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج سامنے آتے ہیں تو یہ قوتیں' دولتیں' حشمتیں سب بکھر جاتی ہیں' ٹوٹ جاتی ہیں۔ پھر ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟

مکافاتِ عمل کے نتائج کی کیفیت

سنیے! برادران عزیز! قرآنِ کریم میں' متعدد مقامات میں' عوام اور ان کے لیڈرز' مطاع اور مطیع' خواہ وہ سیاسی لیڈر ہوں' خواہ یہ روحانی پیشوا ہوں جن کی اطاعت کی جائے' خواہ یہ کمزور لوگ ہوں اور خواہ وہ ان میں سے بڑے لوگ ہوں' ان کے جہنم میں یہ مکالمات ہیں۔ تباہی آگئی ہوئی ہے' پھر افراتفری اور نفسانفسی پھیل جاتی ہے۔ یہ وہ ہے جسے کہا ہے کہ مائیں بچوں کو چھوڑ دیں گی' دودھ پلانے والیاں دودھ پلانے والے بچوں کو بھول جائیں گے۔ پھر اس قسم کی افراتفری پڑا کرتی ہے جب غلط نظام کے تباہ کن نتائج سامنے آیا کرتے ہیں۔ کہا ہے کہ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ ان کی سمجھ میں یہ بات اس وقت آئے گی' اس وقت یہ کیفیت ہوگی کہ **اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ** (2:166) جب افراتفری آئے گی تو یہ ان کے جو بڑے بڑے ہیں' وہ ان کے ساتھ بڑے خوش کن وعدے کیا کرتے تھے کہ تم کسی بھی قسم کی پرواہ نہ کرو صاحب! ہم تمہارے ساتھ ہیں' ہم تمہاری حفاظت کریں گے' ہم تمہارے لیے سب کچھ سامان بہم پہنچائیں گے۔ ان کے سہاروں اور آسروں کے اوپر یہ بھی ہر قسم کے غلط قدم اٹھاتے تھے' ہر قسم کی قانون شکنیاں اور بدعنوانیاں کیا کرتے تھے۔ ذہن میں بھی کبھی نہیں آسکتا تھا کہ یہ نقشہ بدلے گا۔ ان کے اتنے بڑے

---

❶ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے الفاظ یہ ہیں:

"Heaven and Hell are states, not localities." (Iqbal, Allama Muhammad (1980) The Reconstruction of Religious Thought in Islam (Edited & Annotated by M. Saeed Sheikh) Lahore. Institute of Islamic Culture, P.98)

وعدے تھے ان وعدوں کی بنا پر ان لوگوں کی اس قسم کی اطاعت تھی۔ یوں ایک غلط نظام قائم ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ

بیک گردشِ چرخِ نیلو فری
نہ انجن بماند نہ انجینئری

ایک چکر آتا ہے جب غلط نظام کے نتائج سامنے ہوتے ہیں' افراتفری مچتی ہے تو سب سے پہلے یہ جوان کے ساتھ اتنے بڑے سہارے' وعدے اور وعید کیا کرتے تھے' یہ سب ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ پہلی چیز تو یہ ہے سنو! یہ ساتھ ہی نہیں چھوڑ جائیں گے' وہ تو ایسا ہوگا جیسے ان کے ساتھ ان کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا تَبَـرَّاَ الَّـذِيْنَ (2:166) کوئی چاہے گا نہیں کہ کسی کو معلوم ہو جائے کہ یہ بھی ان کے ساتھی تھے۔ کہتا ہے کہ یہ کیفیت ہوا کرتی ہے' اس وقت وَ تَـقَـطَّـعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ (2:166) وہ سارے سہارے' وہ سارے رشتے جو انہوں نے قائم کیے ہوئے تھے' ایک جھٹکے میں ٹوٹ جائیں گے۔ یہ تو ان کی کیفیت ہوگی۔ اور یہ جو پیچھے لگنے والے عوام تھے' جن کی قوت کے سہارے یہ بڑے بنے ہوئے تھے ان کے لیے کہا کہ وَ قَـالَ الَّـذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا (2:167) یہ لوگ' یہ عوام جو ان کے پیچھے تھے کہیں گے کہ اگر ایک دفعہ وقت کا دھارا پیچھے کی طرف مڑ جائے اور حالات وہی ہو جائیں جو ذرا پہلے تھے' تو پھر ہم انہیں اس بات کا مزہ چکھائیں' پھر ہم ان کا بھی اسی طرح ساتھ چھوڑیں جس طرح انہوں نے آج ہمارا ساتھ چھوڑا ہے' جس طرح آج وقت پڑنے پر منہ موڑ رہے ہیں اس وقت ہم ان سے منہ موڑیں' پھر ان کو یہ پتہ چلے کہ ساتھی کسے کہتے ہیں اور رفاقت کیا ہوتی۔ ایسے وقت میں ہماری قوتوں کے سہارے کے اوپر یہ بڑے بن رہے تھے اور اب جو تباہی کا وقت' نامساعد حالات' آئے ہیں تو اس طرح سے ساتھ چھوڑ گئے' ہم ان کے فریب میں تھے۔ اے کاش! کہیں پھر وہی وقت لوٹ آئے تو پھر ہم ان کو بتائیں' اس وقت ان کا ساتھ چھوڑیں اور کہیں کہ بتائیے صاحب! اب آپ کیا بھاؤ بکتے ہیں:

تمہیں تو ''تم'' کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا
''جناب'' ہم نے بنایا ''حضور'' ہم نے کیا

ہم نے یہ کچھ کیا اور آج حیرت ہے کہ تمہاری یہ کیفیت ہے۔

غلط معاشی نظام میں ذمہ داری بنیادی طور پر کس پر عائد ہوتی ہے؟

برادرانِ عزیز! جہنم میں یہ مکالمہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں سے اس غلط نظام کا ذمہ دار کون ہوتا ہے؟ یہ جو اوپر کے راہنما ہیں' یہ ذمہ دار ہوتے ہیں یا یہ جو عوام ان کے پیچھے لگتے ہیں یہ ذمہ دار ہوتے ہیں؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ آگے آیات آتی ہیں' وہ میں سامنے لاؤں گا۔ قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ یہ جو بڑے بڑے اوپر ہیں یہ تو یہ کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ صاحب! ہم تو ان کی خاطر سب کچھ کیا

کرتے تھے ان کے ترجمان تھے ان کی نمائندگی کرتے تھے مگر یہ جو نیچے والے ہیں یہ کہیں گے کہ صاحب! ہمارے پاس تو کوئی قوت ہی نہیں تھی، ہم نے کیا کرنا تھا۔ آگے دیکھیے گا کہ قرآن اس کا کیا جواب دیتا ہے یعنی قرآن ان کی زبان سے کیا چیزیں کہلواتا ہے؟ یہ بڑی دلچسپ چیزیں ہیں۔ یہاں تو اتنا ہی دیکھ لیجیے کہ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ (2:167) ان کے اپنے اعمال اس وقت ان کی درماندگی کا، حسرت کا، افسردگی کا، واماندگی کا، موجب بن کر سامنے آ گئے۔ اس وقت یہ کر رہے تھے، تو ذہن میں یہ آتا تھا کہ یہ ابدی خوشحالیاں اور قوتیں ہمیشہ کے لیے ہمارے پاس ہیں۔ ایک جھٹکے میں نظر آ گیا کہ وہ قوتیں اور خوشحالیاں نہیں، وہ ساری حسرت ناکیاں اور واماندگیاں تھیں جوان کے حصے میں آ رہی تھیں۔ کہا کہ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّار (2:167) یہ رہنما ہوں یا ان کے Followers (پیروکار)، پیچھے چلنے والے، یہ دونوں جہنم میں ہونگے اور دونوں میں سے کوئی بھی نہیں نکل سکے گا۔ اب یہاں تو یہ نظر آ گیا کہ قرآن ان میں سے ایک کو ذمہ دار قرار نہیں دیتا، وہ دونوں کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اس کی وجہ آگے چل کر بتاتا ہے۔ کہتا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (14:28)۔ یہاں اس آیت میں لیڈروں کو سامنے لایا ہے۔ کہا کہ تم نے ان لوگوں کی طرف بھی غور کیا ہے کہ خدا نے انہیں اتنی بڑی نعمتوں سے نوازا اور انہوں نے ان نعمائے خداوندی کی ناسپاس گزاری کی اور اس کے بعد اپنی قوم کے کارواں کو اس منڈی میں جا کر اتار دیا جہاں اس جنس کا سدکا کوئی بھی خریدار نہیں تھا۔ افوہ! یہ کاروان سالار ہیں اور انہیں، بڑی بڑی نعمتیں دی تھیں، انہوں نے ان نعمتوں کی ناسپاس گزاری کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کارواں سالاروں نے اپنی قوم کے قافلے کو اس جگہ جا کر اتارا، جہاں اس جنس کا سدکا کوئی خریدار نہیں تھا یعنی یہ ہے جہنم۔ کیا لفظ آئے ہیں!

باہمی الزام تراشی کا عمل قوموں کو جہنم میں لے جاتا ہے

برادرانِ عزیز! یہ ہے قوموں کا مقامِ جہنم جہاں ٹکے ٹکے قوم بکتی ہے پھر ذلت اور خواری کے میدانوں میں، کوئی ان کو پوچھتا نہیں ہے۔ کہا کہ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَ بِئْسَ الْقَرَارُ (14:29) کتنی بری جگہ ہے یہ ٹھہرنے کی! یہ اس لیے ہوا کہ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ (14:29)۔ دیکھیے! یہاں پہ پھر وہی اندادًا آ گیا۔ اس قوم کی یہ حالت اس لیے ہوئی کہ انہوں نے بھی تو ان کو اپنا خدا بنا رکھا تھا۔ یہ ان کو بہکا کر دوسرے راستے کے اوپر لے گئے اگر سالارِ کارواں وہاں پہنچے ہیں تو اس کے پیچھے یہ کارواں بھی تو وہیں پہنچے گا۔ اس لیے کہ کارواں کے یہ جو پیچھے چلنے والے تھے، ان کا جرم یہ تھا کہ ان کی قوتِ بازو سے ہی تو وہ بڑے بنے تھے۔ یہ جو آگے ایک لیڈر ہوتا ہے، اس کے پاس اپنی کیا قوت ہوتی ہے؟ یہ جو پیچھے ہوتے ہیں، اس طرح سے ہجوم کر کے، ہنگامے کرنے والے، ان کی باتوں کے اوپر آ کر اشتعال میں یہ ساری خرابیاں برپا کرنے والے ہوتے ہیں، یہی تو ان کی قوت ہوتی ہے۔ اس لیے ان سے کہا گیا کہ انہیں جو تم کہتے

ہؤان کے پاس اپنی قوت کیا تھی۔ اگر تم ان کے دست و بازو نہ بنتے تو یہ کیا کر سکتے تھے؟ کچھ بھی نہیں۔ اس کا ذمہ دار کون تھا؟ یہ ذمہ داری کی بات آگے چل کر آتی ہے لیکن یہاں تو قرآن نے یہ بتا دیا کہ یہ دونوں جہنم کے اندر ہوتے ہیں' پوری قوم جہنم کے اندر ہوتی ہے۔ کارواں سالار بھی جہنم میں ہوتا ہے' افرادِ کارواں بھی جہنم کے اندر ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ وَاِذْ یَتَحَآجُّوْنَ فِی النَّارِ فَیَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْٓا اِنَّا کُنَّا لَکُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِیْبًا مِّنَ النَّارِ (40:47) اس تباہی کے وقت یہ کمزور لوگ' جو پیچھے چلنے والے تھے' وہ انہیں' جو ان کے بڑے بڑے راہنما اور لیڈر بنے پھرتے تھے' کہیں گے کہ تباہی آئی ہے' تم اتنے اتنے بڑے وعدے کیا کرتے تھے' آج ہمیں اس سے بچاؤ' بچنے کی کوئی صورت پیدا کرو' یہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نکالو۔ کہا کہ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْٓا اِنَّا کُلٌّ فِیْهَآ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَکَمَ بَیْنَ الْعِبَادِ (40:48) وہ کہیں گے کہ اب یہ نہیں ہے کہ تم عذاب میں ہو اور ہم باہر کہیں کھڑے ہیں' ہماری تو تم سے بھی زیادہ مٹی پلید ہو رہی ہے' ہم تمہیں کیسے بچائیں' اب ہم نہیں بچا سکتے۔ اور کہا ہے کہ دیکھو یہ فیصلے ہمارے تمہارے نہیں ہیں' اس سے پیشتر تو ہم فیصلے کیا کرتے تھے' آج خدا کے فیصلے سب کے سامنے آ گئے ہیں۔ خدا کے فیصلے سامنے آ گئے ہیں' یہاں سے کوئی نہیں نکالے گا۔

درخشاں مستقبل کی محرومی کے باعث تباہ حال قوم کو ان کا ماضی ہمیشہ درخشاں نظر آتا ہے

ایک دوسری آیت ہے جہاں کہا ہے کہ یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ یَقُوْلُوْنَ یٰلَیْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ۝ وَ قَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا (33:66-67)۔ یہ بات میں آگے چل کر کہوں گا' یہ بڑی عجیب چیز کہی ہے کہ جہنم میں چہرے الٹے ہوئے ہوتے ہیں' آنکھیں پیچھے لگی ہوئی ہوتی ہیں' انسانوں کا ماضی درخشندہ نظر آتا ہے' حال و مستقبل تاریک ہوتا ہے۔ یہ ہیں وہ اقوام جو ماضی پرست اور اسلاف پرست ہوتی ہیں۔

تقلید پرست قوموں کا انجام اور ان کے افراد کے باہمی تکرار کا منظر

یہ آگے تقلید کی آیتیں آتی ہیں وہاں میں بیان کروں گا۔ کہتا ہے ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ یہ جہنم میں ہونگے' پوچھا جائے گا کہ کیوں کیا بات ہے' کیسے جہنم میں ہو؟ کہیں گے کہ صاحب! ہمیں تو کچھ پتہ نہیں' یہ جو بڑے بڑے ہیں' ہم نے تو ان کی اطاعت کی تھی' یہ ہمیں لے ڈوبے ہیں۔ کہا کہ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْهُمْ لَعْنًا کَبِیْرًا (33:68) یہ سارے جتنے بھی مرید ہیں' یہ سارے پیچھے چلنے والے کہیں گے کہ انہوں نے ہم کو ڈبویا' تباہ کیا۔ اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے' ایک تو ان کے اپنے جرائم کا کہ یہ ڈوبے اور یہ کہ یہ ہم سب کو ساتھ لے کر ڈوبے۔ ہمارے جرائم کا بھی ان کو عذاب دے' ان کو دوگنا عذاب دے۔ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ

اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْ لَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ (34:31) یہ پیچھے لگنے والے عوام (Followers) جہنم میں ان لیڈروں سے کہیں گے کہ ستیاناس ہو تمہارا' اگر تم ہمارے اندر نہ ہوتے تو ہم یقیناً صحیح راستے کے اوپر رہتے' ہم ایمان والے ہوتے۔ تم نے ہی ہمارے ساتھ یہ کچھ کیا۔ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ (34:32) وہ کہیں گے کہ کیا بکتے ہو؟ ہمارے پاس کونسی قوت تھی جو تمہیں ہم بہکا کر دوسرے راستے پر لے جاتے؟ تمہارا ہی اندر سے جی نہیں چاہتا تھا اس راستے کے اوپر چلنے کے لیے' اس لیے ہم نے ذرا سا اشارہ کیا' تم پیچھے لگ گئے۔

عزیزانِ من! کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ ارے دل یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے۔ برادرانِ عزیز! ہم سے زیادہ جہنم میں کون ہو سکتا ہے' یہ ہمارے ہی مکالمے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کونسی قوت تھی جو ہم تمہیں پیچھے لے آتے؟ بات بھی ٹھیک ہے کہ دو آدمی ہیں پچاس ہزار ان کے پیچھے ہیں' ان کے پاس نہ کوئی فوج' نہ کوئی توپ' نہ کوئی تلوار ہے۔ اسی لیے کہا ہے کہ ہمارے پاس کونسی قوت تھی؟ جواب سنیے' عزیزانِ من! کہا کہ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ نَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا (34:33) تمہارے پاس کوئی قوت نہیں تھی؟ وہ جو تم دن رات بیٹھ بیٹھ کر اپنے پولیٹکل پلان بناتے چلے جاتے تھے' سازشیں کرتے چلے جاتے تھے' ہم بیچارے سادہ لوح' ہماری سمجھ میں بات نہیں آتی تھی' یوں تم ہم کو کھینچ کر لے جاتے تھے۔ آج کہتے ہو کہ قوت نہیں تھی' کیا یہ تمہارے پاس چھوٹی قوت تھی؟ نہیں' یہ بہت بڑی قوت تھی۔

کیا بات ہے جو قرآن مجید نے کہی ہے! کہ تم دن رات یہ پلان بناتے رہتے تھے' اپنے سیاسی گورکھ دھندوں کا جال بچھاتے رہتے تھے۔ یہ باتیں عوام کی سمجھ میں کہاں آسکتی تھیں' تم نے ہمارے ساتھ یہ کیا' ہم اس کے اندر پھنس گئے۔ کیا کیا کرتے تھے تم؟ یہ کس قسم کے پلان بنایا کرتے تھے؟ یہ یہی چیز ہے کہ خدا کے راستے پہ نہیں چلنا بلکہ نَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا (34:33)۔ پھر وہی لفظ اَنْدَادًا یہاں آ گیا کہ اس کی اطاعت نہیں' ہماری اطاعت کرو۔ اور یہ اطاعت اس طرح سے کراتے تھے کہ اس میں ایک چکر بنا دیتے تھے کہ اس میں پھنسا ہوا آدمی نکل ہی نہیں سکتا' ہوتا ہی یہ ہے جب بھی آپ جذبات کو انگیخت کر دیتے ہیں۔

جذباتی کیفیت انسان کو پاگل بنا دیتی ہے

اس پچاس ہزار کے مجمع میں کسی سے پوچھو کہ تم یہ ہڑ بونگ کیوں مچا رہے ہو؟ اس کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ میں کیوں کر رہا ہوں؟ سب پاگل ہوتے ہیں۔ جب آپ جذبات کو مشتعل کر دیتے ہیں' تو فرد پاگل ہو جاتا ہے۔ فرد کے جذبات کو مشتعل کیجیے' وہ پاگل ہو جاتا ہے' ایک ہجوم کے جذبات کو مشتعل کر دیجیے' ہجوم پاگل ہو جاتا ہے۔ ایک فرد پاگل ہو' آپ دیکھیے کہ وہ کیا تباہی مچاتا ہے' ایک ہجوم پاگل ہوا ہو تو

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیا کرتا ہے۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب وہ جذبات فرو ہو جائیں' ان سے پوچھیے کہ بھئی! یہ بتاؤ کہ تم نے جو ٹریفک سگنل توڑا ہے تو یہ کیوں توڑا تھا؟ اس کیوں کا جواب ان میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔اور جب بھی کسی عمل کے کیوں کا جواب کسی کے پاس نہ ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ پاگل پن کی بات تھی۔ دیوانہ ''کیوں'' کا جواب نہیں دے سکتا۔اس کے بعد ہوتا کیا ہے؟ دیوانہ تو وہ ہے کہ پھر کبھی ہوش میں نہیں آتا۔ یہ وہ دیوانے ہیں جو بعد میں ہوش میں آجاتے ہیں۔ جب ان سے پوچھیے کہ تم نے یہ کچھ کیوں کیا تھا؟ کہا کہ **وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ**(34:33) پھر وہ ندامت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک جذباتی قوموں کا حشر

دیکھا! یہ جو عارضی طور پہ پاگل بنا دیئے جاتے ہیں' پھر جب ان کے ہوش ٹھکانے لگتے ہیں' اس کے بعد جذبات فرو ہوتے ہیں تو اس وقت قرآن یہ بتاتا ہے کہ ان کو احساسِ ندامت ہوتا ہے۔پھر اس ندامت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔کہا ہے کہ **لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ**(34:33)۔اب اس ندامت سے کیا حاصل؟ کہا کہ **وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْٓ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا** (34:33) پھر ان کے گلے میں طوق اور بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پڑی ہوئی ہوتی ہیں' سب جہنم میں کھنچے ہوئے چلے جارہے ہوتے ہیں۔ذہن میں آتا ہے کہ یہ کوئی بڑی انتقامی سی چیز ہو رہی ہے' جسے کہتے ہیں کہ صاحب! بلاوجہ تشدد ہو رہا ہے۔کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہے' یہ کسی غلط کار پہ بلاوجہ' بلاجواز تشدد نہیں ہے **هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ**(34:33) یہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں باہر سے نہیں آئیں' تمہارے اعمال کے نتائج ہیں جو بیڑیاں بن کر' ہتھکڑیاں بن کر' تمہارے پاؤں میں' ہاتھوں میں' پڑ گئے۔

عزیزانِ من! ایک ہنگامے میں جتنا نقصان ہو جاتا ہے' اس کے بعد آپ کو معلوم نہیں ہے کہ مالی طور پر وہ قوم کتنی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑی جاتی ہے' اس کو پورا کرنے کے لیے **وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ** (34:33) قوم ندامت کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔جہنم کے متعلق ہے کہ **وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَسَآءَ لُوْنَ** (37:27) ایک دوسرے کے ساتھ سوال جواب ہو رہے ہیں۔**قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ** (37:28) یہ جو Followers (متبعین) ہیں' وہ ان سے کہیں گے کہ تم خود ہی ان راستوں پہ چلتے تھے' وہ کہیں گے ہم چلتے تھے؟ دائیں بائیں سے گھیر کر تم ہمیں لے آتے تھے ان راستوں کی طرف۔ یہ صورت تھی' اس لیے ہم ادھر آجاتے تھے۔**قالوا بل لم تکونوا مؤمنین** (37:29) وہ کہیں گے کہ یہ بات غلط ہے۔اگر تم دل سے یقیناً قانون کا احترام کرنا جانتے' تمہارے ذہن کے اندر ہوتا کہ نہیں صاحب! ہم نے قانون سے ادھر اُدھر نہیں ہٹنا' کوئی لاکھ تمہیں بلاتا' تم کیسے آجاتے تھے۔تمہارے اندر ہی یہ لوٹ مار سب کچھ چیز تھی' بس ہم نے تو ایک آواز دی تھی۔تم پہلے اس کے لیے اپنے دل کے اندر آمادہ نہ ہوئے ہوتے تو ہم کیا

کر لیتے۔ دائیں بائیں سے ہم آتے تھے۔ ہمارے پاس کونسی قوت تھی جس کے بل بوتے پہ ہم تم کو جکڑ کر یہاں لے آتے۔ بَلۡ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ۚ وَمَا کَانَ لَنَا عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ ۚ بَلۡ کُنۡتُمۡ قَوۡمًا طٰغِیۡنَ (37:29-30) تمہارے اندر سرکشی کے جذبات پرورش پا رہے تھے بس ہم نے تو ان کو Exploit (استحصال) کیا ہے۔

عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ کہا کہ فَحَقَّ عَلَیۡنَا قَوۡلُ رَبِّنَاۤ ٭ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوۡنَ ۚ فَاَغۡوَیۡنٰکُمۡ اِنَّا کُنَّا غٰوِیۡنَ (37:31-32) بس اتنی سی بات ٹھیک ہے کہ ہم بھی یہ چاہتے تھے کہ ان غلط راستوں کے اوپر چلیں، تم بھی اپنے دل کے اندر یہ چھپائے ہوئے تھے، ہم نے ذرا پہل کر کے آواز دیدی، تم پیچھے چل پڑے۔ ہوا تو یہ ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اب یہ چیز کس کی (ذمہ داری) Responsibility تھی، ذمہ دار کون تھا، کس نے کس کو بہکایا؟ کہتا ہے کہ فَاِنَّہُمۡ یَوۡمَئِذٍ فِی الۡعَذَابِ مُشۡتَرِکُوۡنَ (37:33) یہ چیز لا حاصل ہے۔ تم سب کے سب مجرم ہو، تم پیچھے لگنے والے ہو۔ اگر ان کی بات کے جواب میں "نہ" کہہ دیتے تو ان کے پاس کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ ان سے کہا کہ تم Intellectuals (دانشور) تھے اور Intellectuals (دانشوروں) کے ہی بل بوتے کے اوپر قومیں جیتی ہیں، قومیں مرتی ہیں، جس طرف یہ چلاتے ہیں، عوام اس طرف چل کر آ جاتے ہیں۔ تم اگر ان کو صحیح راستے پہ چلاتے تو یہ غلط راستے پہ کیوں چلتے۔ عزیزانِ من! یہ دونوں چیزیں ہیں۔ قوموں کی ہسٹری میں ہوتا ہی یہ ہے۔ اسی لیے یہ کہا کہ فِی الۡعَذَابِ مُشۡتَرِکُوۡنَ (37:33) اس عذاب میں تو اب سب کو مشترک ہو جانا ہے۔

سیلاب نہ پرسد درِ میخانہ کُجاست

جب طوفان آ جاتا ہے تو پھر یہ نہیں پوچھا کرتا ہے کہ گھر کا دروازہ کہاں ہے "جی میں کنڈی کھڑکاواں تے اندر آ جاواں[1]"۔

غلط روش سے تحفظ دینے کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے راہنمائی

برادرانِ عزیز! قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ پھر ڈرو اس عذاب سے جو صرف ظالمین کے لیے مختص نہیں ہوتا، وہ اپنی لپیٹ میں سب کو لے لیا کرتا ہے۔ یہ ہے عذاب ۔ کہا ہے کہ فِی الۡعَذَابِ مُشۡتَرِکُوۡنَ ۚ اِنَّا کَذٰلِکَ نَفۡعَلُ بِالۡمُجۡرِمِیۡنَ (37:33-34) پہلے جو اقوامِ مجرم تھیں ان کے ساتھ بھی یہ ہوا تھا، اگر تم اس قسم کے مجرمین ہو گے تو تمہارے ساتھ بھی یہ ہوگا۔ یہ جہنم تو سب کے لیے ہے اس لیے کہ اِنَّہُمۡ کَانُوۡۤا اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ۙ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ (37:35) جب ان سے کہا جاتا تھا کہ او بابا! اطاعت صرف اُس ایک خدا کے قانون کی کرو، تو تکبر سے اکڑ کر چلتے تھے اور چلتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بس ٹھیک ہے دیکھا ہوا ہے یہ

---

[1] (کہ) جی! میں دستک دوں تو اندر آ جاؤں۔

سب کچھ۔ کہا کہ یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔

آج کرہ ارض کا انسان' انسان کے ہاتھوں محکومی' غلامی اور تقلید پرستی کے قید خانے میں مقید ہے

عزیزانِ من! یہاں قرآنِ کریم نے جہنم میں عوام کی اور لیڈروں کی گفتگو بتائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے' بعض قومیں دنیا کے اندر پس ماندہ قوموں کی لیڈر شپ حاصل کر لیتی ہیں۔ دیکھیے! قرآن ایک قوم کے اندر عوام اور ان کے لیڈروں کے باہمی مکالمات دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ دنیا کی اقوام میں بعض قومیں آگے بڑھ جاتی ہیں' ترقی حاصل کر لیتی ہیں' غلبہ حاصل کر لیتی ہیں' اور باقی ساری قومیں جو پیچھے ہوتی ہیں' پس ماندہ ہوتی ہیں وہ ان کی تقلید میں ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔ ہماری اس بیسوی صدی میں تو یہ نظارہ دیکھا ہے' اقوامِ یورپ اپنے استیلا اور غلبہ کی بنا پر دنیا کی باقی کمزور قوموں کے اوپر حکومت کر کے وہاں سے ان کی قوت اور دولت چھین کر لے جاتی ہیں جو بہر حال دنیا کی قوموں میں غالب قوم کی حیثیت سے ہوئی۔ نتیجہ یہ کہ جسے اب تہذیبِ مغریب کہتے ہیں' کسی نے یہ نہیں پوچھا' کسی نے یہ نہیں سوچا کہ ہم یہ کیا کر رہے ہیں؟ جو کچھ وہاں سے' یورپ سے' ہو رہا ہے صاحب! ساری کی ساری قومیں ان کی نقالی کرتی چلی جا رہی ہیں۔ ان کے تصورات' ان کا نظام' ان کی آئیڈیالوجی' ہر چیز جو وہاں ہے' آیہ مقدسہ کی طرح ہر قوم انہیں اختیار کیے چلی جا رہی ہے۔ حاکم قوم کی ہر ادا میں محکوم قوم ایک رعنائی کی شان دیکھتی ہے۔ پس ماندہ قوم ہمیشہ Follower (پیروکار) کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ وہی کیفیت ہے جو عوام اور ان کے لیڈروں میں ایک قوم کے اندر ہوتی ہے۔ جس طرح سے یہ عوام اس وقت نہیں سمجھتے' سوچتے' غور و فکر سے کام نہیں لیتے کہ ہم اس کے پیچھے کیوں چل رہے ہیں' پس ماندہ اقوام بھی کبھی سوچتی ہی نہیں ہیں کہ ہم ان کے پیچھے کیوں چل رہے ہیں؟ انہیں اس ''کیوں'' کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔

ظہورِ نتائج کے وقت تقلید پرست قوم کے سامنے جہنم ابھر کر آ جائے گا

قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ پھر جب ان اقوام کے غلط نظام کی وجہ سے تباہی آتی ہے' تو یہ جو ان کی نقال قومیں ہوتی ہیں' یہ خود بخود تباہی میں آ جاتی ہیں کہ انہوں نے بھی اپنے ہاں اسی قسم کے پیٹرن (Pattern) کا اپنا سیاسی' معاشی' معاشرتی' تہذیبی' تمدنی نظام رکھا ہوا ہوتا ہے۔ شروع میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جو قوم دوسری قوم کی نقالی کرتی ہے' وہ قوم اس کی پیٹھ تھاپتی ہے کہ شاباش! بہت اچھا کیا' ٹھیک ہے' لباس ہی یہی ہے جو تم نے پہن رکھا ہے' کھانا بھی اسی انداز سے ہونا چاہیے۔ مہذب کہتے ہی اس کو ہیں' Civilized (مہذب) ہوتے ہی وہ ہیں جن کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے جو بائیں ہاتھ سے کھایا کرتے ہیں لیکن جب جہنم آتی ہے' ان کا جہنم میں داخلہ ہوتا ہے تو کیفیت یہ ہوتی ہے۔ **هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ** (38:59) ایک قوم جہنم میں آتی ہے یعنی ان

کو جہنم کے اندر لایا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ بجائے اس کے کہ دوسری قوم اس کو دیکھ کر ذرا خندہ جبیں ہو' اسے Welcome (استقبال) کرے' ان کے چہرے پر سو قسم کے شکن پڑ جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ **لَا مَرْحَبًا بِهِمْ** (38:59) ان کے لیے کوئی استقبال نہیں۔ یہ آنے والی قوم ان سے پوچھتی ہے کہ ارے! **قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ** (38:60) ''او ہور تے ہور تسی وی لعنتاں پان ڈٹے ہو' سامنے ❶''۔ بڑی عجیب بات ہے۔ کل تک تو تم' ہماری تقلید میں فخر محسوس کیا کرتے تھے' آج تمہاری بھی یہ کیفیت ہے۔ وہ کہیں گے کہ ہاں ہم بھی: **لَا مَرْحَبًا بِكُمْ** (38:60) ہمارے لیے آج کوئی خوش آئند مقام نہیں ہے۔ **اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا فَبِئْسَ الْقَرَارُ** (38:60) یہ جہنم جس میں ہم اس وقت گھرے ہوئے ہیں' تم نے ہمارے لیے پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ ہم تو وہاں بھی Followers (متبعین) تھے' ہم یہاں بھی Followers (متبعین) ہیں۔

جنت اور جہنم کا انحصار اس آئیڈیالوجی پر منحصر ہو گا جو کسی قوم نے اپنے ہاں اپنا رکھی ہو گی

آپ نے دیکھا کہ جو دنیا کے اندر غلط تہذیبوں کے Pioneers (السابقون الاوّلون) ہوتے ہیں تو پھر وہ قومیں کیا کرتی ہیں۔ یعنی یہ کہ اپنے لیے تو تم نے جہنم تیار کرنا ہی تھا' **قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا** (38:60) ہمارے لیے بھی تم نے یہ جہنم تیار کر رکھا تھا۔ **قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِی النَّارِ** (38:61) وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! جس قوم نے یہ جہنم ہمارے لیے پہلے سے تیار کر رکھا تھا' اسے آج دو گنا عذاب دو۔ ہم تو عذاب میں ہیں' ٹھیک ہے لیکن ہمیں تو اکہرا عذاب ہو اور یہ قوم کہ جس نے ہمارے لیے یہ جہنم تیار کر رکھا تھا اسے دو گنا عذاب دے: ایک ان کے اپنے جرائم کا' اور دوسرا یہ کہ ہمیں بھی انہوں نے اس راستے کے اوپر ڈال دیا اس لیے ان کو دو گنا عذاب دے۔ اور سنیے! اب اس کا جواب آتا ہے۔ اسے پھر دہرا دوں کہ یہاں تو آپ دیکھتے ہیں ایک تہذیب کی حامل قومیں کس طرح سے اپنے آپ کو سمجھتی ہیں کہ صاحب! ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہی ہیں' ہم ایک ہی ہیں' ان کے درمیان یگانگت ہوتی ہیں۔ تباہی کے زمانے میں پھر جہنم کی کیفیت یہ ہے کہ **كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا** (7:38) جب انہی جیسی قوم اس جہنم میں پھر آتی ہے تو یہ قوم اس پہ لعنت بھیجتی ہے' وہ اس پہ لعنت بھیج رہے ہیں۔ دوستی کے قرینے سب ختم ہو جاتے ہیں۔ **حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا** (7:38) حتیٰ کہ یہ ساری قومیں' جتنی بھی اپنی آئیڈیالوجی اور تہذیب و تمدن میں مشترک ہوتی ہیں' وہ ساری اکٹھی جہنم کے اندر آ جاتی ہیں۔

---

❶ دوسروں کو تو چھوڑیئے' تم بھی برسرِ عام لعنت ملامت کر رہے ہو۔

قوم کو غلط لیڈ کرنے والے افراد کے لیے بھی دوگنا عذاب

اب قرآنِ کریم ان کا مکالمہ دے رہا ہے۔ سنیے! کہتا ہے کہ قَالَتۡ اُخۡرٰىهُمۡ لِاُوۡلٰىهُمۡ (7:38) یہ جو بعد میں آنے والی ہیں' انہیں جو پہلے جہنم میں گھری ہیں' کہیں گی کہ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوۡنَا (7:38) اے ہمارے پروردگار! یہ آ رہی ہے وہ قوم جس نے ہمیں بھی تباہ کیا تھا' ہمیں بھی بہکا دیا تھا' ہم کو غلط راستے پہ ڈال دیا تھا' یہ وہ قوم آ رہی ہے۔ اس لیے فَاٰتِهِمۡ عَذَابًا ضِعۡفًا مِّنَ النَّارِ (7:38) انہیں دوگنا عذاب دے۔ سن لیا آپ نے! عزیزانِ من! اب خدا کی طرف سے جواب سنیے۔ کہا کہ قَالَ لِكُلٍّ ضِعۡفٌ (7:38) سب کے لیے دوگنا عذاب ہوگا۔ قرآن بڑی بات کہہ گیا ہے۔ ٹھیک ہے ان کا تو یہ جرم تھا کہ انہوں نے اپنی مفاد پرستیوں کے لیے تمہیں بہکایا یہ تمہاری غلطیوں کا بھی کچھ خمیازہ بھگتیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر تم ان کی تقویت کا سامان نہ بنتے تو یہ ایسا کچھ کس طرح سے کرتے؟ اس لیے تمہیں بھی دوگنا عذاب ہے۔ ان کے دماغ میں جو فرعونیت اور خناس بھرا گیا تھا' اس کا ذمہ دار کون تھا؟ تم اس کے ذمہ دار تھے۔ ان خداؤں کی کیفیت تو یہ ہے کہ

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست

ان کی خدائی تمہارے سجدوں کے سہارے قائم تھی۔

چوں یکے اندر قیام آئی فنا ست

تم اگر ان کے سجدوں سے انکار کر کے ان کے سامنے کھڑے ہو جاتے تو ان کی ہستی کیا تھی؟ کچھ بھی نہیں' یہ خود بخود ختم ہو جاتے۔ تم نے ہی انہیں یہ سب کچھ بنایا ہے۔ عزیزانِ من! قرآن عجیب چیز کہہ جاتا ہے۔ انہیں کہتا ہے کہ تمہارے مکر وفریب نے' ان عوام کو بہکایا' انہیں کہتا ہے کہ تم بھی بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ تمہیں کس نے کہا تھا کہ بھیڑوں کی طرح تم تھوتھیاں نیچے کیے ہوئے' لٹکائے ہوئے' آنکھیں بند کیے ہوئے' دوسرے کی آواز کے اوپر چلتے چلے جاؤ۔ غور وفکر اور تدبر وتعقل کے' سمجھ سوچ کے راستہ اختیار کرنا ہر انسان کا فریضہ ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک بدترین جرم عقل وفکر سے کام نہ لینا ہے

عزیزانِ من! دو ہی آیات آگے چل کر تقلید کی بات آتی ہے۔ قرآن کی رو سے بدترین جرم آنکھیں بند کر کے کسی کے پیچھے چلنا' افراد کا کسی کے پیچھے چلنا' اقوام کا دوسری اقوام کے پیچھے چلنا اور آنکھیں بند کر کے چلنا ہے۔ اور میں یہ کہتا ہوں کہ جہنم تو یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑی چیز جو وجۂ شرفِ انسانیت ہے' وہ تو عقل وفکر ہے۔ جونہی آپ نے اپنی عقل وفکر کے دِیوں کو گل کیا اور دوسرے کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلے گئے' جہنم تو آپ کا یہیں سے شروع ہو گیا۔ اور پھر یہ چیز کہی گئی ہے کہ تمہیں بھی دوگنا عذاب ہے۔ یہ کتنی

بڑی چیز ہے کہ اگر تم اپنے عقل وشعور سے کام لیتے' اندھا دھند ان کے پیچھے نہ چلنا شروع کر دیتے' تو ان کے پاس کونسی قوت تھی جو یہ اتنی تباہیاں مچا دیتے؟ تم ان کی قوت کا راز بنے تھے۔ اس لیے **لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ** (7:38) بات ساری یہ ہے کہ تم جذبات میں آ کر یہ سارا کچھ کرتے چلے گئے' اگر علم وبصیرت سے کام لیتے تو یہ کیفیت کبھی نہ ہوتی۔ **وَ قَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ** (7:39) اس وقت پھر یہ ان سے کہیں گے کہ دیکھ لیا تم نے! ہمیں کہتے تھے کہ ہم ذمہ دار ہیں' ہم تو صاحب! بالکل معصوم اور بے گناہ ہیں۔ آج دیکھ لیا کہ تمہیں ہم پہ بھی کہیں کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے "سب چورا کو جئے ای ہوندے نیں ❶"۔

عزیزانِ من! یہ عجیب چیز ہے کہ ایک قوم کے اندر عوام اور ان کے رہنماؤں کی جہنم میں یہ کیفیتیں ہیں اور اُدھر اقوام عالم میں' وہ قومیں جو Pioneers یا لیڈر شپ کا مقام حاصل کر لیتی ہیں' وہ دوسری قوموں کے لیے کیا ہیں' جہنم کے اندر ان اقوام کا باہمی مکالمہ ہے۔ کس انداز سے قرآن یہ مکالمے بصورتِ بات بیان کر جاتا ہے۔ جہنم وہ تباہی ہے' جو غلط نظام کے نتائج جب قوموں کے سامنے آتے ہیں تو جو اس وقت اس کی حالت ہوتی ہے۔ وہ جہنم ہے۔ وہاں آپ دیکھتے ہیں کہ پھر کس طرح سے آپس میں ایک دوسرے کو طعن دیتے ہیں' ایک دوسرے کو ان تباہیوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اور قرآن کس طرح سے تجزیہ کر کے رکھ دیتا ہے کہ نہیں صاحب! نہ تنہا' یہ جو رہنما ہیں' جو لیڈر ہیں' جو آگے چلنے والے ہیں' ذمہ دار ہوتے ہیں' نہ تنہا پیچھے چلنے والے ذمہ دار ہوتے ہیں بلکہ یہ دونوں مل کر اس تباہی اور اس عذاب کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے اعمال کی جو سزا ہے' جو نتائج ہیں' وہ سب کو بھگتنے پڑتے ہیں۔ کہا ہے کہ **وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ** (2:167) یہ جہنم سے نکل نہیں سکیں گے۔ ایک دوسرے پر الزام تراشی کر کے' ذمہ داری ڈال کر' کوشش کر کے' کہ دوسرے کو ذمہ دار قرار دے دیں' ان میں سے کوئی بھی جہنم سے نہیں نکل سکے گا۔ جہنم سے نکلنے کا یہ طریقہ ہی نہیں ہے۔

جہنم کی آگ سے محفوظ رہنے یا اس سے نکلنے کا طریق' قرآن حکیم کے معاشی نظام میں ہے

جہنم سے نکلنے کا طریقہ کیا تھا؟ اس کے لیے بات وہاں (2:165) سے شروع کی تھی کہ **مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا** (2:165) انہیں اپنا انداد نہ بنا دو جو خدا کی ملکیتیں ہیں' سنو! ان میں انسانوں کو مالک نہ بناؤ' خواہ وہ حکمرانی کی قوت ہو یا دولت کے اوپر اقتدار اور اختیار کی قوت ہو یعنی معاشی قوت ہو' سیاسی قوت ہو۔ قرآن کی رو سے کسی انسان کو دوسرے انسان کے اوپر کوئی قوت ہی حاصل نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **ان الحکم الا للہ** (6:57) حکومت ہے تو خدا کے قوانین کی ہے' رزق کے سرچشموں کے اوپر ملکیت ہے تو خالص خدا کی

---

❶ سب چور ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔

ہے۔وہاں سورہ البقرہ کی 164ویں آیت سے بات شروع کی تھی' یہاں یہ مکالمہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ **یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا** (2:168)اے نوعِ انسانی! آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ کیا طریق ہے جس سے پھر یہ جہنم نہیں پیدا ہوتا' جنت پیدا ہوتی ہے۔عزیزانِ من! یہاں پھر الناس سے کہا گیا ہے' پھر پوری انسانیت سے کہا ہے کہ اے نوعِ انسانی! تمہارے لیے ہم نے' یہ سارے جو رزق کے سرچشمے ہیں' بہا دیئے ہیں' کھاؤ جو کچھ بھی زمین سے پیدا ہوتا ہے۔زمین ہی بنیادی ذریعۂ رزق ہے' اس سے کھاؤ مگر **حَلٰلًا طَیِّبًا** (2:168) حلال طریق سے کھاؤ۔کسی کا ناجائز قبضہ اگر کسی چیز کے اوپر ہو جائے تو وہ حلال نہیں رہتی ہے۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہی خدا کی زمین' خدا کے بندوں کے لیے ہے' رزق تمام انسانیت کے لیے ہے۔اب اس میں Regimentation (گروہ بندی) نہیں۔

جیل کی روٹی سب سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے

ایک رزق تو جیل میں بھی ملتا ہے۔کیا آپ کو پتہ ہے کہ جیل میں جو سب سے زیادہ سخت سزا ہوتی ہے جس سے وہ قیدی چیخ اٹھتا ہے' وہ کیا ہوتی ہے؟ وہ یہ ہے کہ وہاں اس کی مرضی کے مطابق کھانے کو نہیں ملتا' جیل والوں کی مرضی کے مطابق ملتا ہے۔اور جیل تو خیر دور کی بات ہے' یعنی یہ وہ ہے جسے ہم جیل کہتے ہیں' ورنہ جیل میں تو ہم سب ہیں۔برادرانِ عزیز! یہ دیواروں والی جیل نہیں ہے' ہم سب اپنے اپنے جذبات اور خواہشات کی جیل میں جکڑے ہوئے ہیں لیکن بہر حال روزمرہ کی زندگی میں آپ کو نہایت عمدہ چیز' جو کوئی پسند ہو' اچھے سے اچھا ہو' وہ ملتا ہے' وہ کھانا پلاؤ ہو' کوئی مرغی ہو' کوئی مُتنجن ہو' وہ ملتی ہے۔اگر صبح کو بھی وہی ہو' شام کو بھی وہی ہو' دوسری صبح کو بھی وہی ہو' دوسرے دن شام کو بھی وہی ہو تو '' تیسرے ہی دن پیں بول جاندی اے آدمی دی۔او کہندا اے کوئی دال دا بھورا کتھے ہیگا جے تے لیاؤ' سیاپا میری جان دا فیر ایہو جیا کھانا او ہوای پلاؤ❶ ''۔ایک آدھ وقت تو وہ ٹال دیتے ہیں' اسے کھا لیتے ہیں لیکن اس کے بعد طبیعت اس سے اکتا جاتی ہے۔عزیزانِ من! یہ قرآن ہے' حلال تو (چار چیزوں کے علاوہ) یہ سب چیزیں ہیں جو خدا کی طرف سے ملتی ہیں لیکن کہا ہے کہ اس حلال میں سے جو طیبا ہے یعنی جو تمہیں خوش آئند ہوں' انہیں کھایا کرو' یہاں No Regimentation (کوئی گروہ بندی نہیں) ہے۔

قرآنی معاشرے میں سامان زیست کی کیفیت اور نوعیت

عزیزانِ من! قرآن کے معاشی نظام کے اندر' یاد رکھیے! Regimentation (گروہ بندی) نہیں ہے۔سامانِ زیست سب کے لیے ہے' وہ Individual Taste (انفرادی پسند) کا خیال رکھتا ہے' جو انفرادی ذوق ہے وہ اس کی پرورش بھی کرتا ہے۔گو کہ حلال چار

---

❶ تو تیسرے ہی دن آدمی میں شدید اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔وہ پکار اٹھتا ہے کہ اگر کہیں دال ہی ذرا بھر ہے تو وہی لے آؤ۔ یہ اس پلاؤ جیسا کھانا ہی تو میری جان کا عذاب ہے۔

ہی چیزیں ہیں' رزق کے اوپر ہر ایک کے لیے ذاتی ملکیت نہیں' یہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (41:10) ہے' جتنی کسی کی ضرورت ہے سب کے لیے مہیا کرو۔ اس میں سے تم اپنے اپنے ذوق اور مزاج اور ٹیسٹ کے مطابق انتخاب کر سکتے ہو۔ جہاں بھی قرآن نے حلال کہا ہے' ساتھ طیّب کہا ہے۔ دیکھا کمیونزم میں اور قرآن کے نظامِ ربوبیت کے اندر کیسے فرق ہوتا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کہا کہ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ (2:168)۔ یہ دیکھیے کہ یہ شیطان کہاں آ گیا۔ کہا ہے کہ اس کے پیچھے نہ چلنا۔ آپ نے سمجھ لیا کہ یہ شیطان کیا ہے؟ یہ وہ ہے جو مَّا فِی الْاَرْضِ (2:168) کو الناس کے لیے نہیں رکھتا' جو اس حلال کو حلال نہیں قرار دیتا' حرام کر دیتا ہے' جو حلال میں سے بھی دیتا ہے تو اسے طیّب طریق پر تمہیں نہیں دیتا۔ یہ ساری چیزیں اس کے اندر آ گئیں۔ کہا ہے کہ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (2:168) یہ تھا وہ جس نے تمہیں جنت سے نکال دیا تھا' کھلا دشمن ہے۔ وہ جنت جس کے متعلق کہا تھا کہ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35) جہاں کسی کو بھوک لگے' جو جی میں آئے' وہاں سے کھاؤ۔ یہ جنت تھی۔ وہاں سے نکالا تھا تو کہا تھا کہ شیطان نے تمہارے ساتھ یہ کچھ کیا ہے۔ یہ تمہارا دشمن ہے [1]۔

(اس لیے اے نوعِ انسان! دیکھنا' تم نے اِن' قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے والے' مفاد پرستوں کے پیچھے نہ لگ جانا۔ ان کی کوئی بات نہ ماننا۔ یہ تمہارے بھلے کی نہیں کہتے۔ یہ تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ اگلی ہی آیت میں کہا کہ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (2:169) خدا کا فرمان یہ نہیں ہے کہ تم سب کچھ سمیٹ کر اپنے ہی لیے رکھ لو اور اس طرح معاشرہ میں ایسی شکل پیدا کر دو کہ کسی کے ہاں انبار کے انبار لگے ہوئے ہیں اور کسی کو ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہیں۔ اُس کا فرمان یہ ہے کہ تم رزق کے سرچشموں کو تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لیے کھلا رکھو۔ اس میں سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق' نہایت خوشگوار طریق سے کھاؤ پیو۔ (حوالے یہ ہیں: 2:21-22;41:10) اور خدا کی طرف ایسی باتوں کو منسوب نہ کرو جن کا تمہیں علم نہ ہو۔

عزیزانِ من! آگے جو آیہ جلیلہ ہے' وہ ایک عظیم حقیقت کو سامنے لا رہی ہے اور غور و فکر کی متقاضی بھی ہے اور اہمیت کی حامل بھی۔ اب درس کا وقت پورا ہوا۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

---

[1] ریکارڈنگ یہیں تک ہے۔

چھتیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)' (آیات 170 تا 171)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَآ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ
اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـًٔـا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا كَمَثَلِ الَّذِىۡ يَنۡعِقُ
بِمَا لَا يَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡـىٌ فَهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۷۱﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1969ء کی 9 تاریخ ہے اور سلسلۂ درسِ کلام سورۃ البقرۃ کی آیت 170 سے شروع ہوتا ہے: (2:170)۔

کائنات کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ' زندگی کو جامد بنا کر رکھ دیتا ہے

اس آیہ جلیلہ (2:170) میں ایک عظیم حقیقت سامنے آرہی ہے جو غور وفکر کی متقاضی بھی ہے اور اہمیت کی حامل بھی۔ اگر آپ کبھی ٹیکسلا یا ہڑپہ گئے ہوں تو وہاں آثارِ قدیمہ کا ایک میوزیم (عجائب گھر) ہے۔ اس میں آپ مٹی کے برتن' وہی ڈوئی ہانڈی کنالی' آبخورے دیکھیں گے' پھر وہاں توا' پرات' چمٹا' پہننے کے کپڑے بھی ہیں اور زیورات بھی۔ کچھ ہل کی قسم کی یہ چیزیں بھی وہاں رکھی ہیں۔ آپ سمجھ لیجیے کہ یہ تین چار ہزار سال پیشتر کی ہیں۔ انہیں دیکھنے کے بعد سامنے گاؤں میں چلے جایئے تو آپ دیکھیں گے کہ جس قسم کی چیزیں اس عجائب گھر میں رکھی ہیں' بعینہٖ اسی قسم کے برتن' اسی قسم کے ملبوسات' اسی قسم کے زیورات' وہی ہل' وہی یہ سب چیزیں' وہ تمام گاؤں میں' علاقے میں' پنجاب میں' پورے ملک میں' ملیں گی۔ وہ تین چار ہزار سال پہلے کا لوٹا' کنالی یا ڈوئی یا ہنڈیا ہے اور آج کی آپ کی ہنڈیا' بعینہٖ اسی قسم کی ہے۔ وہاں کی تاریخ میں دیکھیے کہ بیل گاڑی' جو کچھ تصویر میں چار ہزار سال پہلے کی نظر آئے گی' بعینہٖ وہی بیل گاڑی سامنے چلتی ہوئی آپ کو دکھائی دے گی۔ چار ہزار سال کے اندر ایسے ہی لگتا ہے جیسے کہ آج زمانے میں تمام کاروبار اور ساز وسامان اسی انداز پہ روک دیئے گئے ہوں' دن اور رات کی حرکتیں منجمد کر دی گئی ہوں' وہیں کا وہیں زمانہ ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ ساری چیزیں' ان لوگوں کا تہذیب و تمدن گویا تھرماس بوتل کے اندر رکھا ہوا ہے' جسے باہر کی فضا قطعاً متاثر نہیں کر رہی۔ یہاں کی دنیا یہ ہے۔

اور اب آپ مغرب کی دنیا میں چلے جائیے۔ وہ تو اب سچ مچ آسمان کے اوپر چلے جا رہے ہیں۔ آج جبکہ ہم یہ باتیں کر رہے ہیں' وہاں غالباً وہ پہلا انسان' چاند کے اوپر اترنے کے لیے پر تول رہا[1] ہے۔ ہر نیا سورج ان کے ہاں ایک نئی چیز لے کر آتا ہے۔ وہ اپنے ہاں' ان چیزوں کے اندر لگے ہوئے ہیں۔ ہر دور کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں ہوتی جا رہی ہیں' نئی نئی اختراعات ہو رہی ہیں' ایجادات ہو رہی ہیں' اڑنے شروع ہو گئے ہیں۔ وہاں یہ کیفیت ہے اور یہاں یہ حالت ہے کہ

ہوئی لاکھ دنیا اِدھر کی اُدھر ہے
وہی سنگِ در ہے' وہی اپنا سر ہے

اگر کہیں ترکھان یا کم بخت لڑکا کسی طرح سے بھی کسی نئی چیز کا تخیل اپنے دل میں رکھتا ہے اور اس میں ذرا کہیں کوئی اختراع کی بات کرتا ہے یا فرق پیدا کیا جاتا ہے تو سارے گاؤں کے بڑے بوڑھے آجاتے ہیں ''او بے پیرے آ! او بے مرشدے آ! تیرا پیو' ایتھے نٹھل ٹھوکدا ہوندا سی' جتھے توں اے ٹھوکن ڈیا ہیگا اے؟ گڈے اچ تیرا پیو' جتھے نٹھل ٹھوکدا سی' او تھے نٹھل ٹھوک' نئیں تے توں بے پیرا' بے مرشدا[2]۔ ''پیرومرشد'' کے معنی ہیں کہ ''جس طرح سے ہوتا چلا آ رہا ہے' اسی طرح سے ہوتا چلا جائے''۔

عزیزانِ من! آپ سوچیے کہ انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز' بنیادی خصوصیت کیا ہے؟ انسان کو عقل و فکر دی گئی ہے' علم و بصیرت حاصل کرنے کی استعداد دی گئی۔ اور یہی وہ شے ہے جس سے انسان حیوان سے متمیز ہوتا ہے۔ حیوان کی کیا کیفیت ہے؟ یہ کہ جس قسم کی بکری چار ہزار سال پیشتر تھی' ویسی ہی بکری آج پیدا ہوتی ہے۔ اور بکری کا ہر بچہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی بکری ہوتا ہے' اس کا جسم ایک حد تک بڑھتا پھولتا ہے لیکن اس میں ساری خصوصیات بکری کی ہوتی ہیں۔ بکری کی کوئی خصوصیت نہ چار ہزار سال میں بدلی' نہ ایک بچہ بوڑھے ہونے تک بدلتا ہے۔ وہ اسی طرح سے جامد اور منجمد حیثیت سے زندگی بسر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے کہ ان میں عقل و فکر نہیں' سوچ و بچار نہیں۔ کچھ Instincts (جبلتیں) ہیں جو ان کی طبعی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

ہر صبح چڑھنے والا سورج' انسان کو ایک نئے راستے کی نشاندہی کی طرف مائل کرتا ہے

برادرانِ عزیز! یہ جو آپ جانوروں میں' حیوانات میں اور Species (انواع) میں بھی کچھ تبدیلی دیکھتے ہیں تو یہ وہاں ہوتی ہے

---

[1] جولائی 1969ء کی 21 تاریخ کو نیل ایلڈن آرم اسٹرونگ نے پہلی بار چاند کی سطح پر قدم رکھا اور برملا کہا کہ

"That is one small Step for a man, one giant leap for mankind"

(انسان کے لیے ایک چھوٹا سا قدم' مگر بنی نوع انسان کے لیے ایک غیر معمولی جست)

[2] او بے پیرومرشد! جہاں اب تم یہ لکڑی کی کیل لگا رہے کیا تمہارا باپ بھی وہاں لگاتا تھا؟ بیل گاڑی میں جہاں تمہارا باپ لکڑی کی کیل لگاتا تھا' وہیں یہ کیل ٹھوکو ورنہ تم بے پیرومرشد ٹھہرے۔

جہاں اس میں انسان کا ہاتھ لگتا ہے۔ اگر انسان کا یہ ہاتھ نہ لگے تو ہزاروں لاکھوں سال سے جس قسم کی وہ انواع (Species) چلی آتی ہیں وہ ویسی کی ویسی آگے چلی جاتی ہیں۔ اس ہزاروں سال پہ پھیلی ہوئی چیز کو تو چھوڑ دیجئے' بھیڑ چال کا محاورہ تو آپ کے ہاں روز سننے میں آتا ہے۔ یہ کیا ہوتی ہے؟ یہ کہ جدھر اگلی بھیڑ نے رخ کر لیا' ہر پچھلی بھیڑ اس کے پیچھے چلی جا رہی ہے۔ چلتے چلتے اگر کہیں کھائی آ گئی اور دو قدم اس طرف ہٹنے سے راستہ صاف ہے مگر اگلی بھیڑ نے وہ صاف راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ وہ پھاند گئی' تو ہر پیچھے آنے والی جو بھیڑ ہے' وہ پھاندتی چلی جائے گی صاحب! کسی بھیڑ سے پوچھیے کہ تم ایسا کیوں کرتی ہو؟ وہ کہتی ہے کہ اگلی بھیڑ جو کر رہی ہے۔ اور جو اگلی بھیڑ ہے وہ آگے گزر چکی ہوتی ہے' اس سے پوچھنے کا آپ کو وقت ہی نہیں ملتا۔ ایک یہ روشِ زندگی ہے اور ایک میں نے عرض کیا کہ ہر سورج چڑھنے کے بعد عقل و فکر اور ہوش و حواس سے' علم و بصیرت سے' کام لے کر یہ سوچنا کہ اس چیز میں کیا Improvement (بہتری) ہو سکتی ہے؟ اس میں کس قسم کی ترقی ہو سکتی ہے' اور نئی ایجادات کس قسم کی ہو سکتی ہیں؟ اس سے زندگی آگے بڑھتی ہوئی اوپر چڑھتی ہے۔ یہ شرفِ انسانیت ہے۔

مذہب میں اسلاف پرستی عین شریعت کا درجہ اختیار کیے ہوتی ہے

عزیزانِ من! میں نے یہ مثالیں تو آپ کو اس طبعی زندگی میں دیں۔ فکری زندگی میں دیکھیے تو یہ جمود اور بھی نمایاں طور پہ سامنے آ جاتا ہے۔ اور پھر اس جمود کی شدید ترین شکل' مذہب کی دنیا میں ہوتی ہے۔ یہ ہے: غور و فکر حرام' سوچ و بچار ممنوع' جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے' وہ عین مطابقِ شریعت۔ Ancestor Worship (اسلاف کی پرستش) مذہب کا بنیادی تقاضا' اسلاف کے مسلک کی تقلید' سب سے بڑا کارِ ثواب۔ یہ ثواب خواہ 'ص' کے ساتھ لکھیے یا 'ث' کے ساتھ لکھیے۔ یعنی صائب راستہ بھی یہ' اور ثواب کا موجب بھی یہ۔ ذرا ایک انچ آپ اِدھر اُدھر ہٹے تو اس کا نام بدعت۔ اور بدعت کے متعلق یعنی نئی بات کے متعلق' ہر خطبے میں آخری اعلان یہ کہ **کل بدعة ضلٰلة و کل ضلٰلة فی النار** ' ہر نئی بات گمراہی' ہر گمراہی جہنم۔ تو آپ سوچیے جہاں مسلک یہ ہو جائے وہاں عقل و فکر کی قوتیں کیوں نہیں مفلوج ہو کر رہ جائیں گی۔ وہاں کوئی گنجائش بھی نہیں ہوگی کہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی کوئی شخص کوئی نئی بات سوچ سکے' کسی طرح سے بھی غور و فکر سے کام لے سکے۔ کوئی بات کہیے' پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ صاحب! اس سے پہلے بھی کسی نے یہ کہا ہے۔ گویا انہوں نے اگر یہ نہیں کہا تو یہ اس کا قصور ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کہا تھا۔ اور وہ دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں۔ اب پہلی بھیڑ سے کس طرح سے پوچھا جائے کہ تم نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا تھا؟

قرآن حکیم کے نزدیک جہنم میں زندگی بسر کرنے والوں کی حالتِ زار

آپ کسی سے بات کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ دلائل و براہین کی رو سے گفتگو ہو رہی ہے' عقل و بصیرت کی رو سے آپ بات کر رہے

ہیں فریقِ مقابل کسی مقام پہ جا کر رک جاتا ہے تو اس کے سامنے دلیل نہیں آتی۔ اب وہ یہ ایک لفظ کہتا ہے کہ فلاں امام علیہ الرحمۃ نے یہ فرمایا ہے لہٰذا سارے فتوے آپ کے خلاف آجاتے ہیں۔ چل بھئی! بات ہی آگے رک جاتی ہے چل ہی نہیں سکتی۔ آپ سوچیے کہ جہاں انسانوں کے ساتھ یہ کیفیت ہو وہاں مجھ سے نہ پوچھیے وہاں قرآن یہ کہتا ہے کہ **ولقد ذرانا لجھنم کثیرًا من الجن والانس** (7:179) آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں جن کی چلتی پھرتی زندگی یہ بتاتی ہے کہ یہ اہلِ جہنم پھر رہے ہیں۔ آپ غور کیجیے یہاں اگر کسی کے متعلق یہ بتا دیا جائے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ جہنم والے کون ہوتے ہیں تو کتنی عجیب بات ہو جائے گی۔ قیامت کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا حشر و نشر حساب اور ترازو کے متعلق کہیں منتظر نہیں رہنا پڑے گا یہیں پتہ چل جائے گا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ جہنم کی زندگی کن کی ہوتی ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا** (7:179) یہ وہ لوگ ہیں جو آنکھیں رکھتے ہیں ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے کان رکھتے ہیں ان سے سننے کا کام نہیں لیتے دل رکھتے ہیں سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ جو کہا ہے کہ تمہیں جہنم والوں کی زندگی بتائیں وہ کیسے ہوتے ہیں؟ اور یہ قرآن کے اندر ہے۔ کہا ہے کہ **اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ** (7:179) یہ انسانی سطح کی زندگی نہیں ہے یہ حیوانی سطح کی زندگی ہے۔ پھر کہا کہ **بَلْ هُمْ اَضَلُّ** (7:179) نہیں یہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ حیوانات پھر بھی اپنے Instincts (جبلتوں) کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں ان کی بھی وہ کیفیت نہیں ہے۔ انہیں تو قرآن نے **شَرَّ الدَّوَآبِّ** (8:22) کہا ہے جو بدترینِ خلائق ہیں۔ کہا ہے کہ یہ **صم بکم الذین لا یعقلون** (8:22) اندھے بہرے گونگے عقل و فکر سے کام نہ لینے والے بدترین خلائق ہیں جو ہوتا چلا آرہا ہے اس کے مطابق چلتے چلے جا رہے ہیں۔ آپ دیکھیے گا کہ مذاہب کی دنیا میں ہر جگہ یہی روش آپ کو ملے گی کہ جو ہوتا چلا آرہا ہے اس کے مطابق کرتے چلے جانا کہیں کھڑے ہو کر سوچنا نہیں ہے کہ یہ کیوں ہو رہا ہے ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں؟

اور عزیزانِ من! جیسا کہ میں آپ کو ہمیشہ کہتا چلا آرہا ہوں یہ قرآن کی انقلابی تعلیم تھی کہ وہ مذہب کی اسٹیج پہ کھڑا ہوتا ہے اور یہ جتنی اس قسم کی چیزیں خلافِ انسانیت آئی ہوئی ہیں مذہب کی اسٹیج پہ کھڑا ہو کر مذہب کی ان چیزوں کی مخالفت کرتا ہے۔ اب یہی چیز ہے جسے ہر اہلِ مذہب نے اپنے ہاں سب سے زیادہ مقدس مسلک بتایا تھا کہ اسلاف کا اتباع کرو یعنی جو ہوتا چلا آرہا ہے اس کے مطابق کرتے چلے جاؤ۔ آپ قرآنِ کریم میں دیکھیے اس میں شروع سے آخر تک آپ دیکھتے چلے جائیں گے قرآن اس مسلک کی پرزور تردید کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کفار کے سامنے جب آپ قرآن کے دلائل و براہین پیش کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہم تو اسی مسلک پہ چلتے جائیں گے جس پہ ہمارے آباؤ اجداد چلتے چلے گئے۔

تقلید پرستی انسانی صلاحیتوں کو مفلوج ہی نہیں بلکہ جامد کر دیتی ہے

کبھی آپ نے اس پہ غور کیا ہے کہ ہر مذہب میں' جو چیز ایک مسلمہ کی حیثیت رکھتی تھی' اسلاف کا مسلک تھا' وہ ان کے ہاں کسی بات کے صحیح ہونے کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ قرآن سب سے زیادہ شدت سے اس کی تردید کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ تو انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما کے لیے آیا ہے' وہ انہیں برومند کرنے کے لیے آیا ہے' وہ انہیں مفلوج کرنے کے لیے نہیں آیا۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ جتنا زمانہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے' ہر نیا ردا جو آپ دیوار پہ رکھیں گے' اس سے دیوار بلند ہوتی چلی جائے گی۔ علمِ انسانی مسلسل مشاہدات' مطالعات اور تجربات سے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ہر آنے والی نسل پچھلی نسل سے علم کی دنیا میں ایک قدم آگے ہوتی ہے۔ انسانیت کے متعلق اس کا نقطۂ نگاہ Optimistic (خوش امید) ہوتا ہے' وہ انسان سے مایوس نہیں۔ مایوسی یہ ہے کہ آپ ہر آنے والے دور کو' پچھلے دور سے پستی میں' تنزل میں' گری ہوئی حالت کے اندر' قرار دیں۔ اور اس طرح اس حالت سے آگے بڑھتے ہوئے' آپ دیکھیے گا کہ پھر جتنا آپ آگے بڑھتے چلے جائیں گے' اس کے بعد انسانیت اتنی ہی تنزل میں پہنچتی چلی جائے گی۔ قرآن کا یہ نظریہ نہیں ہے۔ وہ ارتقائے انسانیت کا نظریہ (Theory of Human Evolution) لے کر آیا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' آج کی بکری وہی ہے جو چار ہزار سال پیشتر کی بکری تھی مگر آج کا انسان وہ نہیں ہے جو غاروں میں رہنے والا انسان تھا۔ یہ کونسے وہ انسان نہیں ہیں' جو ان سے آگے ہیں؟ یہ وہ ہیں جنہوں نے عقل وفکر سے کام لیا' جنہوں نے علم سے' مشاہدات سے' تجربات سے' نت نئی چیزیں ایجاد کیں' جنہوں نے اپنے اس علم کو آنے والی نسلوں کی طرف منتقل کیا۔ پھر آنے والی نسلوں نے اس پر مزید غور وفکر کیا اور اس کے بعد ایک اور ردّا اوپر رکھا۔ اس طرح سے علم کی دنیا میں وسعتیں ہوتی گئیں' کاروانِ انسانیت آگے بڑھتا چلا گیا۔ اور وہ قومیں جنہوں نے اس مسلک کو اختیار نہیں کیا' وہ جامد ہو کر اسی مقام پر کھڑی رہ گئیں جہاں وہ کسی زمانے میں ہوا کرتی تھیں۔ قرآنِ کریم' جیسا میں نے عرض کیا ہے' ان تمام مسالک کو چیلنج کرتا ہے' وہ اسے کفر کی روش کہتا ہے۔

دین کے بالمقابل دنیا کا ہر مذہب ہمیشہ تقلید پرستی کا گہوارہ ثابت ہوا ہے

برادرانِ عزیز! سلسلۂ کلام پچھلے درس میں چلا آ رہا تھا' جس میں کہا یہ گیا تھا کہ **یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ** (2:168) اے نوعِ انسانی! حلال وطیّب طریق سے کھاؤ جو کچھ زمین میں اگتا ہے۔ شیاطین کے نقوشِ قدم کا اتباع نہ کرو' وہ تمہارا کھلا دشمن ہے کیونکہ **اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ** (2:169) وہ تمہیں بخل سکھاتا ہے' وہ تمہیں ناہمواریاں سکھاتا ہے' یہ روش اختیار نہ کرو۔ اور اس کے بعد تھا کہ **وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا**

تَعۡلَمُوۡنَ (2:169)اور خدا کی طرف ایسی باتوں کومنسوب نہ کرو جن کا تمہیں علم نہ ہو یعنی روش تو اختیار کی جائے شیطان کی اور اسے منسوب کیا جائے خدا کی طرف۔اس کے لیے کیا دلیل ہوسکتی ہے؟ کونسی سند ہوسکتی ہے؟ آپ دیکھیے کہ ایک چیز بالبداہت غلط نظر آتی ہے اور پھر اس کو جو پیش کیا جاتا ہے' تو وہ اتنے بڑے تقدس کے ساتھ ہے۔اس کے لیے سند کیا ہے؟

اب یہاں سے بات شروع ہوتی ہے کہ وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَیۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا (2:170)جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کا اتباع کرو جو خدا نے نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہم تو اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔آپ نے غور فرمایا کہ وہ چیز جو تمام مذاہبِ عالم میں متفق علیہ طور پر بطور ایک مسلمہ (Aprioi) کے مانے چلی آرہی تھی اور آج بھی ہے وہ اسلاف کا مسلک ہے۔

قرآن حکیم کی عظمت یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو کبھی زبردستی نہیں منواتا

قرآنِ کریم کس طرح سے اس کی تردید کرتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اتباع اس کا نہیں' اتباع ماانزل اللہ کا ہے۔اور جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا اور بیسیوں دفعہ بات سامنے آگئی' خود قرآنِ کریم کا اتباع بھی آنکھیں بند کر کے نہیں ہے' یہ بھی غور وفکر کے ساتھ ہے۔یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف آپ کہتے ہیں کہ اس میں قرآن کا اتباع' ماانزل اللہ کا اتباع ہے' پھر آپ کہتے ہیں کہ غور وفکر اور عقل وبصیرت ہے۔اب اس طرح کے اتباع کے اندر اس غور وفکر اور عقل وبصیرت کی گنجائش کہاں رہتی ہے؟ جو ماانزل اللہ ہے' اسے تو آپ کہتے ہیں کہ غیر متبدل ہے' اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی تو پھر وہ غور وفکر کیا ہے؟ اس سوچ بچار کے بعد اس ایک نتیجے پہ پہنچتے ہیں' اب ان دونوں میں تطابق کیسے ہوگا؟ اسے سمجھنے کے لیے آپ محض اس مثال کو سامنے رکھیے کہ آپ میں سے کئی افراد' کل ہی ہاکی کے میچ میں گئے ہونگے جو یہاں ہو رہا ہے۔اس میں آپ نے کیا دیکھا؟ کچھ باؤنڈری لائنز لگی ہوئی ہیں' اور دو تین دائرے کھنچے ہوئے ہیں۔کچھ قواعد و ضوابط بتائے گئے ہیں کہ Stick (ہاکی) یہاں تک رہے گی' اس سے اونچی نہیں ہوگی' اس طرح سے فلاں چیز کو وہ نہیں چھوئے گا۔یہ حدود' یہ خطوط' یہ لائنیں' یہ قواعد' یہ چند ایک ضوابط یہ ان کا مسلمہ ہے۔دونوں ٹیموں نے اس چیز کو مان لیا' بلکہ ان کے ہاں جہاں جہاں بھی اس انداز سے ہاکی کا یہ میچ ہوگا انہوں نے اس چیز کو اپنے ہاں بحیثیت مسلمہ کے مان لیا۔یہ ماننے کے بعد وہ ٹیمیں میدان میں اتر گئیں۔اب ان ٹیموں کو ان بنیادی حدود کا تو لحاظ رکھنا ہے اور اس کے بعد ہر کھلاڑی آزاد ہے کہ ہر وقت غور وفکر سے سوچے کہ مجھے گیند کو کدھر لے جانا ہے' جن کو یہ توڑ نہیں سکتا اور یہ ہے اس کی وہ آزادی جو مفلوج نہیں ہو رہی۔اگر آپ ان گیارہ کھلاڑیوں میں سے ہر کھلاڑی کو پہلے ہی یہ چیز بتا دیں کہ گیند آئے تو تم نے دائیں طرف کو مارنا ہے' اسے بائیں طرف نہیں مار سکتے' آپ دیکھیے گا' وہ ٹیم کھیل ہی نہیں سکتی' وہ جیت ہی

نہیں سکتی۔ آپ کو تو صرف یہ بتاتا ہے کہ اس گیند کو اس لائن سے تجاوز نہیں کرنا۔ یہ تم اس وقت خود سوچو کہ جب گیند تمہارے سامنے آئے تو تم نے کس طرف کو پاس کرنا ہے' کس طرف کو ہٹ لگانا ہے۔ ایک ایک سیکنڈ کے اوپر عقل وفکر سے کام لو۔ وہاں اگر آپ کا کھلاڑی آکر کہے کہ صاحب! میں نے اس لیے دائیں طرف پھیر دیا تھا کہ اس سے پیشتر جو میکسیکو کے اندر میچ ہوا ہے' تو وہاں ہمارے کیپٹن نے اس مقام پر گیند کو دائیں طرف ہٹ لگایا تھا' اس لیے میں نے بھی دائیں طرف ہٹ لگا دیا۔ وہ کان سے پکڑ کر ٹیم سے نکال دیا جائے گا کہ تمہیں ہر موقعے کے اوپر خود فیصلہ کرنا ہو گا کہ مجھے اس وقت کیا کرنا ہے۔ اور وہی ٹیم جیتتی ہے جس کے کھلاڑی اس طرح سے بروقت اور صحیح فیصلہ کرتے ہیں۔ ٹیمیں تو دونوں یکساں ہوتی ہیں۔ ناکامی اور کامیابی کا مدار اس پہ ہوتا ہے کہ ٹیم کے کھلاڑی ہر موقع پر فیصلہ کس قسم کا کرتے ہیں اور Over-all (مجموعی طور پر) ان کے اوپر جو کیپٹن ہے' وہ کیسے فیصلہ کرتا ہے۔ یہ حدود اور یہ قیود تو غیر متبدل رہتی ہیں ان ٹیموں کے لیے اور ان حدود کی چار دیواری کے اندر ہر کھلاڑی کو کامل آزادی ہوتی ہے کہ وہ ان کا لحاظ رکھتے ہوئے' موقع کے لحاظ سے' تقاضے کے لحاظ سے' خود فیصلے کرے کہ مجھے اس وقت کیا کرنا ہے۔ اور پوری ٹیم کا ایک نصب العین ہو کہ مجھے اس گیند کو گول میں لے جانا ہے۔

برادرانِ عزیز! یہ ہے روشِ زندگی جو قرآن پیش کرتا ہے۔ زندگی کے کھیل میں کچھ حدود' کچھ شرائط' مقرر کر لیے۔ کھیل میں بھی اگر آپ کے ہاں کچھ قواعد وضوابط نہ ہوں تو کھیل بالکل بے لذت ہو جاتا ہے' اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ زندگی کا اتنا بڑا کھیل ہے جس میں انسان نے یہ ارتقائی منازل طے کرنا ہیں' وہ منازل بغیر حدود اور قیود کے نہیں رکھی جا سکتیں۔ یہ رکھی گئی ہیں لیکن یہ جو حدود و قیود تھیں وہ اگر پاؤں میں ایسی زنجیریں ہوتیں کہ جن میں انسان ایک قدم بھی اپنی عقل وفکر کی رو سے نہ چل سکتا' تو انسانیت منجمد ہو کر رہ جاتی اور حیوانیت کے درجے پر رہتی۔ یہ جو ثبات اور تغیر (Permanence and Change) کا امتزاج ہے کہ حدود غیر متبدل ہوں' ان کے اندر رہتے ہوئے ہر دور کے مسلمان کو پوری آزادی ہو' امت کو آزادی ہو کہ وہ باہمی مشورے سے خود طے کرے کہ ہم نے اس وقت کس قسم کا قدم اٹھانا ہے۔ اسے اسلام کہتے ہیں۔ یہاں یہ کہا ہے کہ ما انزل اللہ کا اتباع کرو تو ما انزل اللہ کے اندر جو حدود اور قیود دی گئی ہیں' انہیں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اور ان حدود کے اندر رہتے ہوئے' آپ کی قوتِ فکر' انتخاب اور چوائس اور Freedom (آزادی) کو کسی قسم کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔

قرآنِ حکیم کے عطا کردہ اصولِ زندگی' کائنات کے غیر متبدل اصولوں کی طرح' کبھی نہیں بدل سکتے

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن نے کیا چیز پیش کی تھی۔ یہ چیز قرآنِ کریم نے ہی پہلی مرتبہ پیش کی۔ دین تو خدا کے پہلے رسول کے ساتھ بھی' اصولی طور پر' وہی تھا جو آخری رسول ﷺ کے ساتھ دیا گیا۔ دین کے اصول' حدود' مبادیات' شروع سے ایک ہی تھے۔ یہ چیز جو میں نے ابھی کہی ہے کہ اتباع اس کا نہیں جو آپ کے آباؤ اجداد کرتے چلے آ رہے تھے' اتباع اس کا ہے جو خدا نے بطور حدود و قیود مقرر کیا۔

یہ دین کے اصولوں میں سے ایک چیز ہے۔ اس لیے کہ قرآنِ کریم نے حضرت نوحؑ سے لے کر جتنے انبیائے کرامؑ آئے ہیں' ان میں سے جس کا بھی تذکرہ آپ دیکھیں گے' وہاں یہ چیز آپ کو نظر آئے گی۔ انہوں نے خدا کی طرف دعوت دی' مخالفین نے اس کی مخالفت کی۔ انہوں نے دلیل و برہان پیش کی' انہوں نے سامنے سے یہ کہا کہ نہیں صاحب! ہم تو اسی راستے پہ چلتے جائیں گے جس پہ ہمارے آباؤ اجداد چلتے آئے ہیں۔ اور ہر نبی نے ان کی اس دلیل کی مخالفت کی۔ گویا یہ چیز بھی کوئی پہلی مرتبہ سامنے نہیں لائی گئی۔

یاد رکھیے! دین کی جتنی باتیں بطور اصول اور اساس دی گئی ہیں' قرآنِ کریم ہر نبی کی تعلیم میں اسے بطور قدرِ مشترک بیان کرتا ہے۔ مثلاً یہ چیز کہ اس کائنات میں اقتدار و اختیار صرف ایک ہستی کا ہے' یہ چیز دین کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ ہر رسول کی تعلیم میں یہ چیز آئے گی۔ اسی طرح سے یہ جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ہر رسول کی دعوت کی مخالفت کرنے والوں نے دلیل یہ دی کہ ہم اس لیے اس راستے پہ چل رہے ہیں کہ یہ ہمارے اسلاف کا راستہ ہے' آباؤ اجداد کا طریقہ ہے۔ ہر رسول کے مخالفین نے اپنے مسلک کی سچائی کی یہ دلیل دی اور ہر رسولؑ نے یہ کہہ کر اس کی تردید کی کہ یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ جو ہوتا چلا آ رہا ہے' ہم اسی کے پابند رہیں گے۔ جو ہوتا چلا آ رہا ہے' اسے ما انزل کی روشنی میں پرکھ کر دیکھو۔ جو کچھ اس کے مطابق ہے' اس کے خلاف نہیں جاتا' ٹھیک ہے اسے رکھ لو' جو اس کے خلاف جاتا ہے اسے چھوڑنا ہو گا کہ وہ دینِ حقہ نہیں ہو سکتا۔ دین کے' شریعت کے' برحق اور مبنی برصداقت ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ ما انزل اللہ کے خلاف نہ جائے لیکن یہ چیز کہ جو کچھ تمہیں کہا جائے اس کے بجائے تم یہ کہو کہ نہیں صاحب! چونکہ یہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے' جو کچھ ہمارے ہاں متوارث چلا آ رہا ہے یہ اس کے خلاف ہے' اس لیے ہم اس کو نہیں مانتے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ دین کے مخالفین کی روش ہے۔

برادرانِ عزیز! یہی آیت (2:170) آج ہمارے سامنے آئی ہے۔ کہا ہے کہ **وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ** (2:170) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ما انزل اللہ کا اتباع کرو تو قالوا یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! **بَلۡ نَتَّبِعُ مَآ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَ نَا** (2:170) ہم تو اپنے آباؤ اجداد کے راستے پہ چلے جائیں گے۔ یہیں قرآن ان کی تردید کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ **اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّ لَا يَهۡتَدُوۡنَ** (2:170) تم اپنے آباء کی تقلید کرتے چلے جاؤ گے' انہی کے راستے پہ چلے جاؤ گے' خواہ یہی کیفیت کیوں نہ ہو کہ نہ تو وہ خدا کے بتائے ہوئے صحیح راستے پہ ہوں' نہ ہی وہ عقل و فکر سے کام لیتے ہوں۔ قرآن نے یہاں دونوں چیزیں کہیں۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے لیے یہاں اس چیز کے پرکھنے کے لیے کسوٹی ہو گئیں کہ جو چلا آ رہا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ یہ چیزیں عقل و فکر اور وحی کے دیئے ہوئے اصول ہیں۔ غور کیجیے کہ قرآن نے کس کس انداز میں یہ چیز کہی؟ دوسری جگہ کہا کہ **وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَ نَا** (31:21) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کا اتباع کرو جو خدا نے نازل کیا ہے' تو وہ کہتے ہیں کہ

نہیں! ہم تو اسی کا اتباع کرتے چلے جائیں گے جس پہ ہم نے اپنے اسلاف کو پایا۔ ان سے کہا گیا کہ **اَوَلَوْ کَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْھُمْ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ** (31:21) خواہ ان نقوشِ قدم کی کیفیت یہی کیوں نہ ہو کہ وہ شیطان کے نقوش ہیں جو انہیں جہنم کی طرف لیے چلے جا رہے ہیں۔ خواہ یہی کیفیت کیوں نہ ہو، یہ یہی کہتے چلے جائیں گے۔ اور اس سے آگے کہا کہ یہ راہ سعادت اور نجات کی نہیں ہے۔

انسانیت کے پژمُردہ چہرے کو جلا بخشنے کے لیے، یہی وہ حرفِ آخر (قرآنِ کریم) نسخہ کیمیا ہے جو محفوظ کر دیا گیا ہے

سعادت و نجات کی راہ یہ ہے کہ **وَ مَنْ یُّسْلِمْ وَجْھَہٗٓ اِلَی اللّٰہِ وَ ھُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی** (31:22)۔ صحیح راستہ یہ نہیں ہے کہ جو کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آ رہا ہے، آپ آنکھیں بند کیے اسی کے اوپر چلتے جایئے۔ ''صحیح راستہ یہ ہے کہ خدا نے جو کچھ کہا ہے، اس میں اس کی رضامندی ہے، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا، اس کے قوانین و احکام کی اطاعت کرنا، اور حسن کارانہ انداز سے اس کی اطاعت کرنا، یہ ہے وہ محکم سہارا، اور دوسری جگہ کہا ہے کہ یہ ٹوٹ نہیں سکتا''۔ یہ جو ہوتا چلا آ رہا ہے اس کی سند، اس کی دلیل کیا ہے؟ قرآنِ کریم نے سورۃ یوسف میں اور دوسرے مقام پہ بھی بڑے حسین انداز میں ایک بات کہی۔ آپ غور کیجیے جب بھی آپ کے سامنے کسی دلیل کے مقابلے میں یہ جو اتباعِ اسلاف کی روش پیش کی جاتی ہے تو اس میں ہوتا کیا ہے؟ یہ کہ اس میں ایک بہت بڑا نام لے لیا جاتا ہے۔ اس نام کا تقدس پہلے ہی شروع بچپن سے بزرگانِ کرام کی حیثیت سے، آئمہ عظام کی حیثیت سے، اولیائے کرام کی حیثیت سے، ذہنوں کے اوپر مسلط کیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ کسی حیثیت سے بھی ہو، ذہنوں میں ان کے تقدس کو پہلے ثبت کیا ہوتا ہے۔ اسی طرح سے بعض کتابوں کا تقدس ذہنوں کے اندر ثبت کیا ہوا ہوتا ہے۔ بچپن سے یہ چیز ذہن میں ڈالی ہوئی ہوتی ہے۔ جب یہ مقام آتا ہے کہ اپنے دعوے کے اثبات میں مخالف کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی تو ان میں سے کسی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اس نام کی عظمت اور تقدس غیر شعوری طور پر انسان کے ذہن پہ اس طرح سے غالب ہوتا ہے کہ اس کے بعد پھر وہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ اور اگر کوئی یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ نہیں صاحب! اس کے بعد بھی میں یہ کہونگا تو ایک شور مچا دیا جاتا ہے کہ لیجیے صاحب! فلاں حضرت صاحب، فلاں امام، فلاں محدث تو سمجھتے ہی نہیں تھے اور یہ جناب، ان سے بھی زیادہ سمجھنے والے آ گئے۔

کسی کی بات کو تسلیم کرنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی راہنمائی بڑی واضح اور محکم ہوتی ہے

عزیزانِ من! سوال تو یہ ہے نہیں۔ سوال تو یہاں یہ ہے کہ خود خدا' جس نے یہ دین دیا ہے' کیا کہتا ہے؟ کیا وہ یہی کہتا ہے کہ جب اس قسم کا نام تمہارے سامنے آجائے تو پھر تم اپنی عقل و فکر کے سارے سوئچ آف کر دیا کرو' آنکھوں پہ پردے ڈال دیا کرو' کانوں میں ڈاٹ دے دیا کرو' دلوں کو اپنے غلافوں میں لپیٹ لیا کرو۔ کیوں؟ کہ صاحب! ایک بہت بڑا نام سامنے آ گیا ہے۔ سنیے! قرآن کیا کہتا ہے؟ کہا کہ **مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ** (12:40) یہ جو انہوں نے خدا کے علاوہ دوسروں کے سامنے جھکنے کی روش اختیار کر لی ہے' ان کی بات کو سند جان رہے ہیں' ان کی محکومیت اختیار کی ہے' قرآن کی رو سے اسی کا نام عبودیت ہے یہی عبادت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ جو انہیں اپنے لیے سند مان رہے ہیں' یہ کیا ہیں؟ کہا کہ **اِلَّاۤ اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ** (12:40) یہ صرف کچھ نام ہیں جو تمہارے بڑوں نے رکھ لیے' کچھ تم نے رکھ لیے۔ نام کا جادو بہت بڑا جادو ہوتا ہے۔ ایک بات آپ بغیر نام لیے کہے جائیں تو آپ دیکھیں گے' اس کے متعلق آپ سوچیں گے' فکر کریں گے' آن میرٹ پرکھیں گے' اس کی دلیل مانگیں گے' سند مانگیں گے لیکن اسی بات کے ساتھ ایک بہت بڑا مقدس نام چسپاں کر دیجیے' یہ سارے سرچشمے غور و فکر کے جتنے بھی ہیں' مسدود ہو جائیں گے۔ یہ انسان کی نفسیات کا ایک کمزور پہلو ہے۔

شخصیات کی بنیاد پر قائم کردہ نظامِ حیات' ہمیشہ محدود ہو کر ختم ہو جاتا ہے

اب آیئے' دیکھیے قرآن کیا کہتا ہے؟ کہتا ہے کہ یہ صرف بڑے بڑے نام ہیں جو رکھ لیے گئے ہیں۔ اور آگے کہا ہے کہ **مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ** (12:40) خدا کی طرف سے اس کے لیے کوئی سند نازل نہیں ہوئی۔ سند صرف خدا کی ہے' باقی سب نام رکھے ہوئے ہیں۔ ناموں کے تقدس میں جو نفسیاتی کمزوری آتی ہے' قرآن اس کو اٹھاتا ہے' ان زنجیروں کو توڑتا ہے۔ سورۃ الاعراف کے اندر نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا کہ **وَ یَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ** (7:157) یہ رسول آیا ہی اس لیے ہے کہ انسانیت کو زنجیریں پہنائی گئی تھیں' وہ ان زنجیروں کو توڑ دے' جو بوجھل سلیں ان کے سروں پہ رکھی گئی تھیں' وہ ان سلوں کو ہٹا دے۔ سب سے بڑی سنگین فولادی زنجیر' اس سے بھی زیادہ مضبوط اور محکم زنجیر' یہ زنجیر ہے جسے قرآن کہتا ہے کہ **اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ** (12:40) یہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے آپ بیچ میں سے نام ہٹا دیجیے' آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے دل کے اوپر جو ایک بوجھ آ جاتا ہے' وہ ختم ہو جاتا ہے۔ جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ یہ بڑے بڑے جو مقبرے بنے ہوئے ہیں' ان کو اٹھا دیجیے۔ اگر کسی کھیت میں سادہ سی قبر ہو' آپ کے عقیدے کے مطابق خواہ وہ کتنے ہی

بڑے قطب کیوں نہ ہوں' اس کے آستاں پہ کسی کا سر نہیں جھکے گا۔ نیچے کچھ سنگِ مرمر وغیرہ لگایا ہوا ہو' اس کے اوپر دو لاکھ روپے کا ایک مقبرہ بنا دیجئے' آپ دیکھیے گا کہ دور سے ہی اس کی طرف پشت کر کے کوئی نہیں چلے گا' اس کی طرف پیٹھ نہیں کرے گا۔ اب اس میں تقدس آ گیا۔ اسی لیے قرآن مجید نے کہا کہ **اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُكُمۡ** (12:40) ان کی اصلیت بس اتنی ہی ہے کہ یہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں ورنہ ان کی اپنی کوئی حقیقت اور پوزیشن نہیں۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔

برادرانِ عزیز! الفاظ تو دو ہیں مگر نفسیات کا طالب علم اس کو جانتا ہے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے؟ بس ان کے نام ہٹا دیجیے حتیٰ کہ بڑا مقبرہ بھی بنا دیجئے' مگر اس کا نام کچھ نہ رکھیے۔ باہر کئی بنے ہوئے ہیں' آپ سیر کے لیے جاتے ہیں' کبھی آپ پکنکوں (Picnics) کے لیے جاتے ہیں دور دور آپ کو یہ بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ کا ذہن کبھی اُدھر جاتا ہی نہیں' توجہ مرکوز ہی نہیں ہوتی' آپ کے دل میں کوئی جذبۂ تقدس نہیں اٹھتا۔ جونہی آپ نے کہا کہ یہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکیؒ کی ملفوظات فوائد السالکین' خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی ملفوظات دلیل العارفین اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی مرتب فرمودہ راحت القلوب ہے اور یہ ان کے مقبرے ہیں۔ یوں آپ نے یہ نام رکھے آپ دیکھیے سڑک پہ چلتے ہوئے' آپ جھکے جاتے ہیں' تانگے والا تانگہ کھڑا کر لیتا ہے "ریل گڈی کھلو جاندی اے' سلام کردا اے ڈرائیور' ہے ایتھے ایک پیر صاحب ساری سمگلنگ او تھے ہوندی ہیگی' ڈرائیور نوں پوچھو کھلوتا کیوں ایں؟ کہندا اے جی سلام کرنا ہیگا حضرت صاحب نوں' ایویں لنگ جاندا ہنیں ایتھے حادثہ ہو جاندا' کئی واری ہو یا۔ اوا ے کرن ڈیا ہوندا اے ❶"۔ وہ آگے سلام کرنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور نیچے بریک میں سے مال اتار رہے ہوتے ہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ ناموں کا تقدس ہے جس کی بنا پہ آپ غیر اللہ کے آستانوں کے اوپر جھک جاتے ہیں۔ یہ ہے **اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُكُمۡ** (12:40) یہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ دیئے ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں' کوئی حقیقت نہیں' کوئی پوزیشن نہیں۔

خدا تعالیٰ نے عبودیت کے لیے صرف اپنے حکم کو ہی تسلیم کیا ہے

عزیزانِ من! قرآن ہے' چار لفظوں میں یہ سارا جادو توڑ کر رکھ دیا۔ کہتا ہے کہ ناموں کے جادو کے اندر نہ آؤ۔ وہ کونسی چیز ہے جو آپ کے لیے کسوٹی اور پرکھ بنتی ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ** (12:40) وہ ہے جو خدا نے نازل کیا

---

❶ ریل گاڑی رک جاتی ہے' اس کا ڈرائیور سلام کرتا ہے۔ (کہتا ہے کہ) یہاں ایک پیر صاحب ہیں۔ وہاں ساری اسمگلنگ ہوتی ہے۔ اگر ڈرائیور سے پوچھو کہ یہاں کیوں رکے ہو؟ کہتا ہے کہ جی! حضرت صاحب کو سلام کرنا ہے۔ اگر بغیر رکے چلا جاتا تو یہاں حادثہ ہو جاتا۔ کئی دفعہ ہوا ہے۔ (مگر در پردہ سمگلنگ ہے) وہ یہ کر رہا ہوتا ہے۔

ہے۔اس کے علاوہ کسی اور کا نہیں اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ (12:40)اسی نے یہ حکم دیا ہے کہ کسی اور کے فیصلے کے سامنے نہیں جھکنا۔ یہ کہہ کر تقدس کی زنجیریں چھٹ گئیں کہ یہ نام ہیں صرف۔ یہ کہ کیا کسی اور کا جو فرمودہ ہے' جو ارشاد ہے' وہ بھی ایک سند اور حجت اور حکم ہو جائے گا؟ کہہ دیا کہ نہیں! حکم اور فیصلہ صرف خدا کا ہے اور اسی کا نام عبودیت قرار دیا' صرف خدا کے فیصلے کے سامنے جھکنے کو کہا۔ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ (12:40) یہی دینِ قیم ہے۔تو اب یہ سب کچھ' پھر کیا ہو رہا ہے؟ کہا کہ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (12:40) یہ جہالت ہے' علم نہیں ہے۔

عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح سے بعثتِ نبی اکرمﷺ نے وہ زنجیریں کاٹ کر رکھ دیں جنہیں دنیائے مذاہب نے اس طرح لباسِ تقدس کی صورت میں لپیٹ لپیٹ کر انسانیت کو پہنا دیا ہوا تھا۔اسے اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡہَاۤ کہا۔اور آپ دیکھتے ہیں کہ پھر قرآن کو ماننے والا کس طرح دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جاتا ہے۔دنیا میں بڑی سے بڑی آستان بھی اس کو سر جھکانے کی دعوت نہیں دے سکتی۔کتنا ہی بڑا نام کیوں نہ آ جائے' وہ کہتا ہے کہ نہیں! اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ (12:40) حکم صرف اس کا ہے' کسی اور کا نہیں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ تمہیں پتہ ہے کہ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کون ایسا کرتے ہیں؟ پہلی چیز تو ان آیات میں جیسا میں نے عرض کیا' یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ تو چار چار ہوتے ہیں' دو دو الفاظ کے ایک فقرے کی آیت ہوتی ہے لیکن آپ کے ہاں کے دین کے جتنے بھی محکمات ہیں وہ ان کے اندر آ جاتے ہیں۔بات تو میرے ہاں' اس وقت' تقلید کی ہو رہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ دیکھیے کہ دو لفظوں میں تقدیر کا مسئلہ کیسے حل ہو رہا ہے؟ کہتا ہے کہ یہ جو شرک کرنے والے ہیں' خدا کے علاوہ اور آستانوں پہ جھکنے والے' اوروں کے فیصلوں کو ماننے والے ہیں' ان سے جب کہیے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ تو وَ قَالُوۡا لَوۡ شَآءَ الرَّحۡمٰنُ مَا عَبَدۡنٰہُمۡ(43:20) وہ کہتے ہیں کہ ہم مجبور بندہ بشر کیا کر سکتے ہیں؟ اگر خدا کی مرضی ایسی نہ ہوتی تو ہم ایسا کیوں کرتے۔

''چاہتے ہیں سو آپ کریں' ہم کو عبث بدنام کیا''

برادرانِ عزیز! آپ نے سوچا ہے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔صبح سے شام تک' ہم ہر بات میں یہ چیز کہتے ہیں کہ صاحب! خدا کی مرضی کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہل سکتا' سارا کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ مترفین کا قول ہے۔ان سے جب کہتے ہیں کہ ایسا کیوں کرتے ہو؟ تو کہتے ہیں کہ صاحب! ہم کون ہیں ایسا کرنے والے؟ اگر خدا کی منشاء' خدا کی مرضی' اس کی مشیت' ایسی نہ ہوتی تو ہم ایسا کس طرح سے کرتے۔مَا لَہُمۡ بِذٰلِکَ مِنۡ عِلۡمٍ(43:20) ان کا یہ کہنا علم پر مبنی نہیں ہے' جہالت پر مبنی ہے۔ اِنۡ ہُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ (43:20) وہ قیاس آرائیاں کرتے ہیں' قیاسات کے گھوڑے دوڑاتے ہیں' یہ علم نہیں ہے۔آپ نے سوچا کہ یہ کہنا علم

پہ مبنی نہیں ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے۔ آپ کے ہاں سب سے زیادہ مقدس اور مقرب وہ ہوتا ہے جو ہر سانس میں ''مرضی مولا برہما اولیٰ'' کہے 'اس کی مرضی کے مطابق سب ہوتا ہے' اس کی مشیت کے مطابق سب ہوتا ہے۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ اَمۡ اٰتَیۡنٰـهُمۡ کِتٰبًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ فَهُمۡ بِهٖ مُسۡتَمۡسِكُوۡنَ (43:21) یا ان سے کہو کہ کیا اس سے پہلے خدا کی طرف سے کوئی ایسی کتاب آئی ہے جس کے اندر یہ لکھا ہوا ہو' اور تم اس کے ساتھ چمٹے ہوئے ہو؟ نہ یہ علم ہے' نہ یہ ہدایت ہے۔ یہی نہیں کہ قرآن میں نہیں کہا بلکہ اس سے پیشتر بھی دین کی کوئی غیر محرف کتاب ایسی نہیں ہوگی جس میں تمہیں یہ عقیدہ ملے جو تم خدا کی طرف منسوب کر رہے ہو۔

برادرانِ عزیز! ان سے کہا کہ ان کے پاس اس عقیدے کی سند کیا ہے؟ بَلۡ قَالُوۡۤا اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ (43:22) بس یہ کہنا ہے کہ صاحب! ہمارے آبا وٴاجداد دیکھیے' وہ یہی کہتے چلے آئے۔ اس کے لیے اتنی اتنی بڑی کتابیں اٹھا کر لے آئیں گے کہ دیکھیے صاحب! اس کے اندر یہ لکھا ہے' اس کے اندر یہ لکھا ہے' فلاں حضرت صاحب نے یہ فرمایا ہے' فلاں امام یہ فرما گئے ہیں۔ کہتا ہے کہ یہ کہیں گے کہ صاحب اَسۡمَآءً سَمَّيۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُكُمۡ (12:40) ہمارے آبا وٴاجداد یہ کرتے چلے آئے۔ یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آبا وٴاجداد نے رکھ چھوڑے ہیں' ورنہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ نئی بات نہیں ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہر رسول کے ساتھ یہ ہوتا چلا آیا۔ وَكَذٰلِكَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ فِىۡ قَرۡيَةٍ مِّنۡ نَّذِيۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَاۤ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ (43:23) جو رسول بھی آیا' اس نے خدا کا دین پیش کیا۔ آگے ایک لفظ آتا ہے' جس کے لیے میں یہ آیت سامنے لایا ہوں۔ یہ بڑا غور طلب ہے۔ وہاں کے مترفین نے یہ کہا کہ نہیں صاحب! ہم تو اسی راستے پہ چلتے جائیں گے جس راستے پہ ہمارے اسلاف چلتے گئے۔ مترفین نے یہ بات کہی۔ یہ کیا بات تھی؟ مترفین وہ ہوتے ہیں جو خود محنت نہ کریں' دوسروں کی کمائی کے اوپر اپنی زندگی بسر کریں۔ اب یہاں دیکھیے کہ ایک تو طبعی محنت ہے' جسمانی محنت ہے' وہ بھی محنت ہے۔ اس سے کہیں زیادہ پر مشقت محنت ذہنی اور دماغی محنت ہوتی ہے۔ آپ سارا دن جسمانی محنت کرتے رہیں تو اتنے تھکتے نہیں ہیں' گھنٹے بھر کے لیے آپ کہیں دماغی طور پر' فکری طور پر' محنت کیجیے' سوچنے کی بات کیجیے' آپ دیکھیے کہ کیا کیفیت ہوتی ہے۔ سوچ فکر تحقیق کیجیے' اپنے طور پہ کسی چیز کو معلوم کرنا اس کے بعد استنباطِ نتائج کرنا شروع کیجیے پھر پوچھیے نہیں کہ اس میں کتنی محنت پڑتی ہے۔ مترفین میں یہ دونوں آتے ہیں یعنی ذہنی مشقت سے بچنے والے اور جسمانی مشقت سے بچنے والے اور اس میں یہ چیز ہوتی ہے کہ اس کے بعد خوشحال زندگی بسر کرنے والے بن جاتے ہیں۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ کیا کرایا کچھ نہ جائے' نہ کوئی ذہنی محنت ہو' نہ کوئی کسی قسم کی جسمانی مشقت ہو یعنی نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی' رنگ چوکھا ''او کچھ کھان نوں ملے' جیہڑا کسی مزدور نوں نہیں مل سکدا[1]''۔ کہا کہ یہ

---

[1] کھانے کو وہ کچھ ملے جو کسی مزدور کو نہیں مل سکتا۔

مترفین ہیں جن کا یہ شیوہ ہے بے فکری محنتوں سے بچنے والے دوسروں کی محنتوں کے اوپر خوشحالی اور عیاشی کی زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ اور ان کا مسلک یہ ہے کہ جب بھی کسی رسول نے آ کر کہا' انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! ہم اسے نہیں مانتے' جو آباؤ اجداد سے چلا آ رہا ہے ہم اس پہ ہی چلیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ قٰلَ اَوَلَوۡ جِئۡتُكُمۡ بِاَهۡدٰى مِمَّا وَجَدۡتُّمۡ عَلَيۡهِ اٰبَآءَكُمۡ (43:24)۔ کیا دلیل دی ہے! کہا ہے کہ کیا تم اسی راستے پہ چلتے جاؤ گے' خواہ جو کچھ خدا کا یہ دین یا جو ما انزل اللہ ہے وہ دے اور وہ اس سے کہیں زیادہ صحیح راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کرے تو کیا پھر بھی تم غلط راستے پہ ہی چلتے جاؤ گے؟ بڑی عمدہ دلیل ہے لیکن ان کے پاس تو دلیل کا جواب دلیل سے ہوتا ہی نہیں ہے۔ کہا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کا انہوں نے کیا جواب دیا؟ یہ کہ قَالُوۡۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ (43:24) نہیں صاحب! جو کچھ تم کہتے ہو' ہم نہیں مانیں گے' چلو جاؤ یہاں سے' ہم تمہیں گاؤں سے نکال دیں گے۔

مترفین کے سب سے خطرناک حربے کی نشاندہی اور خدا تعالیٰ کے قانون کی طرف سے ان کا انجام

برادرانِ عزیز! عوام کو اشتعال دینے کے لیے ان کے پاس بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ تمہارے بزرگوں کی تحقیر کر رہا ہے' اسلاف کی ہتک ہو رہی ہے۔ ایک شور مچ جاتا ہے۔ اور ماس سائیکولوجی (گروہی نفسیات) تو آپ جانتے ہیں' اس ماس سائیکولوجی میں تو پھر ہر فرد کی عقل و ہوش کے سوئچ آف ہوتے ہیں۔ قرآن کیا بات کہہ گیا ہے؟ کہا کہ ٹھیک ہے' اپنی اس روش کے اوپر بڑے مطمئن ہو' ان کو بھی دھتکار دیا' پھٹکار دیا' کہہ دیا کہ تمہیں گاؤں سے نکال دیں گے۔ ایک دوسری جگہ کہا کہ سنگسار کر دیں گے' مار دیں گے' صلیب پہ چڑھا دیں گے۔ ٹھیک ہے انہیں تو یہ کہہ دیا' اس روش کا جو نتیجہ ہے پتہ ہے کہ وہ کیا ہے؟ کہا کہ فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ (43:25) ٹھیک ہے' یہ جو سامنے کہنے والا تھا' اس کے پاس اس وقت تو کہنے کی کوئی بات نہ تھی' ہم نے اس بات کا انتقام لیا۔

برادرانِ عزیز! عربی میں اور قرآن میں انتقام ان معنوں میں نہیں آتا جن معنوں میں ہم انتقامی طور پہ لیتے ہیں۔ کہا کہ ان کی اس روش کا نتیجہ ان کے سامنے آ گیا۔ کیا نتیجہ تھا؟ قرآن بتاتا ہے۔ قرآن کی کیا بات ہے! کہا کہ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ (43:25) ہم سے نہ پوچھو' تاریخ کے اوراق سے پوچھو' ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے پوچھو کہ پھر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح کے اوپر آ گئے' زندگی جامد ہو کر رہ گئی' زمانے کی گردشیں انسانیت کے قافلے کو کہیں سے کہیں لے گئیں اور یہ اپنے اسلاف کی اور اپنے آباؤ اجداد کی وہی لکیر پیٹتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا شمار زندہ قوموں کی صف میں بھی نہ ہوا' وہ سانس لینے والی لاشیں بن کر رہ گئیں۔ وہ ساری دنیا یعنی اقوامِ عالم کے سامنے ذلیل اور خوار ہو کر رہ گئے خزی فی الحیوٰۃ الدنیا دنیا کی زندگی کے اندر ذلیل و خوار۔ اور پھر قیامت میں تو جو عذاب اس کے بعد آتا ہے وہ تو پوچھیے نہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ یہ ان قوموں کی کیفیت

ہو جاتی ہے۔

عزیزانِ من! دوسری جگہ یہ کہا گیا ہے کہ **وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوۡا مَا ھٰذَاۤ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیۡدُ اَنۡ یَّصُدَّکُمۡ عَمَّا کَانَ یَعۡبُدُ اٰبَآؤُکُمۡ وَ قَالُوۡا مَا ھٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡکٌ مُّفۡتَرًی** (34:43) جب بھی ان کو قرآن کی طرف بلایئے' تو یہ مترفین شور مچا دیتے ہیں' عوام کو یہ کہہ کر بھڑکاتے ہیں کہ یہ شخص چاہتا ہے کہ تمہیں اس مسلک پر چلنے سے روک دے جس پر تمہارے اسلاف چلتے ہیں اور کہتا ہے یہ سب جھوٹی باتیں ہیں۔

قرآنِ حکیم کی آواز پر مترفین کا اخلاق سوز حربہ اور کردار

دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ ان کی کیفیت اس وقت یہ ہوتی ہے کہ یہ قرآن کے الفاظ میں **والغوا فیہ** (41:26) چڑیوں کی طرح' کووں کی طرح' کائیں کائیں کرنے لگ جاتے ہیں' شور مچانے لگ جاتے ہیں کہ دیکھنا! یہ ایک شخص اٹھا ہے' یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ کیا کرتا ہے یہ؟ کہ تمہیں تمہارے آباء کے راستے سے بہکاتا ہے۔ یعنی وہ قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے' وہ ماانزل اللہ کی طرف بلاتا ہے اور یہ عوام کی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑتے ہیں۔ قالوا (34:43) کہتے یہ ہیں کہ **یُرِیۡدُ اَنۡ یَّصُدَّکُمۡ عَمَّا کَانَ یَعۡبُدُ اٰبَآؤُکُمۡ** (34:43) تمہیں ان اسلاف کے راستے سے بہکاتا ہے' راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ **مَا ھٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡکٌ مُّفۡتَرًی** (34:43) جو کچھ یہ کہہ رہا ہے' یہ افترا ہے۔ یعنی وہ خدا کی طرف سے دیا ہوا دین پیش کر رہا ہے' یہ کہتے ہیں کہ یہ افترا ہے۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ یہ کہ تمہارے اسلاف کے مسلک کے خلاف بات کہہ رہا ہے۔ یعنی جو بات اس کے مطابق ہے وہ تو صداقت ہے اور جو اس کے خلاف جا رہی ہے وہ افترا ہے خواہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا دین ہی کیوں نہ ہو۔

عزیزانِ من! ہر دور میں یہی کچھ ہوتا ہے' ہر دور میں یہی کچھ ہوتا چلا جائے گا۔ اس لیے کہ مترفین ہر دور کے اندر آپ کے سامنے آئیں گے۔ ان کی تن آسانی کی زندگیاں ہوتی ہیں اور اتنی بڑی جاذبیت ہوتی ہے کہ اس کے اندر راوی عیش لکھتا ہے۔ اس میں نہ دماغ سے سوچنے کی کوئی بات ہے' نہ خود محنت مزدوری کرنے کی بات' مگر جو زندگی ہے وہ نہایت عمدہ' سب سے اچھی' بسر ہو رہی ہے۔ کھانے پینے کو بھی مل رہا ہے' گھٹنوں کو بھی چھوا جا رہا ہے' پاؤں بھی دبائے جا رہے ہیں' منتیں خوشامدیں کی جا رہی ہیں۔ اور ان سے بڑھ کر یہ کہ جب کبھی کوئی بات سامنے آئے تو پوچھنے کے لیے آئیں' کوئی مسئلہ ہو تو دریافت کرنے کے لیے آئیں۔ کوئی فتویٰ پیش ہو تو اس پہ عقل و فکر سے کچھ نہیں سوچتے کہ کیا معاملہ درپیش ہے' اس کے متعلق کیا چیز آنی چاہیے۔ بس اتنی سی چیز اس کو معلوم ہونی چاہیے کہ اس کے متعلق فلاں کتاب میں کیا لکھا ہے' فلاں کتاب میں کیا لکھا ہے۔ جسے اتنی دسترس ہو جائے گی وہ عالم ہو جائے گا۔ اس کی جتنی زیادہ کتابیں چھپ چکی

ہونگی' وہ علامہ ہوتا چلا جائے گا۔

برادرانِ عزیز! انہیں Cataloger (کیٹلاگ ساز) کہتے ہیں۔ یعنی وہ جنہیں کتابوں کے حوالے یاد ہوں۔ یہ نہایت عمدہ لائبریرین ہیں۔ جو بڑے بڑے ہوتے ہیں' ان کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ انہیں یہ بتائیے کہ صاحب! اس Topic (عنوان) پہ مجھے کچھ ریسرچ کرنا ہے۔ یہاں تو خیر ہمارے ہاں نہیں ملتے' لائبریری نہیں ہوتی' لائبریرین کیا ہوگا۔ جہاں لائبریریاں ہیں' ان کے اندر لائبریریز ہوتے ہیں۔ وہ بات یہاں نہیں سمجھ میں آتی کہ صاحب لائبریرین کو چار ہزار روپے تنخواہ ملتی ہے' ان کی مت ماری گئی ہے۔ وہ کرتا یہ ہے کہ آپ اس کو Topic (عنوان) دیدیجیے' وہ فوراً آپ کو ایک لسٹ بنا کر دیدے گا کہ صاحب! فلاں فلاں کتاب میں اس کے متعلق یہ چیز ملے گی' پھر وہ کتابیں بھی نکلوا کر آپ کو دیدے گا لیکن اسی Topic (عنوان) کے متعلق اس سے کہیے کہ اپنی عقل وفکر سے کچھ بات بتائیے تو وہاں وہ ختم ہو جاتا ہے ''اوہدا گھوڑا ای مک جانداا اے اوتھے [1]''۔ اس کا کام ہی اتنا ہے کہ اسے یہ پتہ ہو کہ کس کتاب میں کیا لکھا ہے۔

ہمارے ہاں حاصل کیے جانے والے علم کی کیفیت اور افادیت

عزیزانِ من! ہمارے ہاں جس کو علم کہا جاتا ہے' وہ علم اتنا ہی ہوتا ہے کہ کس کتاب میں کیا لکھا ہے۔ اس لیے کہ سند تو یہ ہوتی ہے کہ پہلے لوگوں میں اسلاف نے اس کے متعلق کیا کہا ہے۔ دین تو یہ نہیں ہے۔ دین تو ان حدود' ان قیود کے اندر ہے جو غیر متبدل ہیں' جن کو کلمات اللہ کہا گیا ہے' جو ما انزل اللہ ہیں۔ کوئی مسئلہ درپیش ہو' کوئی پرابلم آپ کے سامنے آئے' تو اس میں پہلی چیز آپ کو یہ معلوم ہونی چاہیے کہ اصولی طور پر اس کے متعلق خدا نے کیا کہا ہے؟ پھر آپ کے حالات کیا ہیں؟ ان واقعات میں جو چیز پیش ہوئی ہے' اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اس میں دین ہمیں کیا راہنمائی دیتا ہے؟ آپ دیکھتے ہیں کہ ایسا کرنے کے لیے آپ کو بڑی ہی عقل وفکر کی ضرورت ہوگی' بڑی محنت کرنے کی ضرورت ہوگی۔ مترفین تو ایسا نہیں کرسکتے۔

لفظ تقلید کا قرآنی مفہوم اور اثرات

عزیزانِ من! یہ ایسی بات ہے جس پہ ایک درس نہیں' بیسیوں درس بھی کافی نہیں ہیں۔ اس کے لیے مجھے یہ بتانا ہوگا کہ قرآنِ کریم نے عقل وفکر پہ کتنا زور دیا ہے! دلیل و برہان کو کتنی اہمیت دی ہے! اس تقلید کی روش کی مخالفت میں کیا کیا کہا ہے؟ تقلید کا یہ لفظ میرے سامنے آگیا۔ آپ کو پتہ ہے کہ اس تقلید کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ قلد کس کو کہتے ہیں؟ سنیے! یہ جو مویشیوں کے گلے میں پٹا ڈالا ہوا ہوتا ہے'

---

[1] وہاں اس کا گھوڑا ہی ختم ہو جاتا ہے (یعنی اس کا علم ہی باقی نہیں رہتا)۔

رسی ڈالی ہوئی ہوتی ہے' اسے قلد کہتے ہیں۔ اونٹ کی نکیل کے لیے یہ جو تھلی ہوتی ہے' اسے قلد کہتے ہیں۔ گلے میں رسی ڈالی ہوئی ہے کھینچنے والا کھینچ رہا ہے' یہ اس کے پیچھے چلے جا رہے ہیں' تقلید کی یہ راہ انسان کو حیوانوں کی سطح پر پہنچا دیتی ہے جو عقل وفکر سے کام لینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ کہا کہ وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ (2:171) ان کی اور ان کے پیشواؤں کی مثال یوں سمجھیے کہ بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہے جس کے پیچھے چرواہا ہے۔ چرواہے نے اپنے بڑوں سے کچھ آوازیں سیکھ رکھی ہیں' بلا الفاظ۔ اور کچھ الفاظ یاد کر رکھے ہیں بلا مطلب۔ وہ یہ آوازیں نکالتا اور ان الفاظ کو دہراتا رہتا ہے اور بھیڑ بکریاں ان اشاروں پر اِدھر اُدھر مڑتی رہتی ہیں۔ یہ ہیں آباء کی تقلید کرنے والے: بہرے' گونگے' اندھے عقل وفکر سے کچھ کام نہ کرنے والے۔

عزیزانِ من! حیوان کے گلے میں ایک محسوس رسی ڈالی جاتی ہے' ہوسکتا ہے کہ وہ گھس گھس کر کبھی ٹوٹ جائے۔ ان تقلید کرنے والے انسانوں کے گلے میں اندر ایسی غیر محسوس رسیاں ڈال دی جاتی ہیں' جو گھس کر ٹوٹتی ہی نہیں ہیں' وہ مرورِ زمانہ سے اور بھی پختہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔

برادرانِ عزیز! ہم میں جو زندہ انسان ہوتا ہے' اس کی بات پر اعتراض کیا جاسکتا ہے' یہ خود اعتراض کرتے ہیں' تنقید کرتے ہیں' ان کے خلاف مباحثے ہوتے ہیں۔ جونہی اس نے آنکھ بند کی' وہ مٹی کے نیچے دفن ہوا' اسلاف کے زمرے میں شریک ہوگیا' اب اس کی ہر بات سند ہوگئی۔ اور پھر یہ جتنا پرانا ہوتا چلا جائے گا' اتنی ہی وہ سند مستحکم ہوتی چلی جائے گی۔ یعنی اگر آپ کسی کتاب میں یہ کہیں جو ابھی دس برس ہوئے لکھی ہوئی ہے' اس کا اتنا رعب نہیں پڑتا' اگر یہ کہہ دیا جائے کہ تیسری صدی ہجری کے اندر یہ چیز تھی۔ تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے متعلق ذہن میں کیا چیز ہوجاتی ہے۔ یعنی اس کا جو زیادہ پرانا ہونا ہے اس رسی کا جو زیادہ کہنہ ہونا ہے' وہ اس کی مضبوطی کا زیادہ باعث بن جاتا ہے۔

جو روٹی اسلاف کے زیادہ قریب ہو' وہ اتنی ہی زیادہ قیمتی کیوں ہوجاتی ہے؟

بس کچھ عرصے کی بات ہے ہمارے ایک بڑے قابل اعتماد فرد تھے انہوں نے آ کر بتایا کہ مکے میں ایک نان بائی تھا' وہ روٹی بیچتا تھا اور یہ پکارتا تھا کہ آج کی تازہ روٹی دو پیسوں [1] میں' کل کی' گذشتہ کل کی' باسی روٹی ایک آنے میں۔ انہوں نے پوچھا کہ بھئی! یہ کل کی جو باسی ہے' وہ دوگنی قیمت میں کیوں؟ تو اس نے کہا کہ صاحب! وہ کل والی روٹی اسلاف سے زیادہ قریب ہے ''جنی باسی ہوندی چلی جائے اوہناں مُل ودھ جاندا اے اوہدا [2]''۔ عزیزانِ من! یہ باتیں یونہی مذاق نہیں ہیں۔ یہ عقائد ہمارے ہاں ذہنوں میں راسخ ہیں۔

---

[1] اس زمانے میں چار پیسوں کا ایک ''آنہ'' ہوتا تھا اور 16 آنے کا ایک روپیہ تھا۔ تین ''پائی'' کا ایک پیسہ اور 64 پیسے کا ایک ''آنہ''۔

[2] جتنی باسی ہوتی چلی جائے' اتنی ہی اسکی قیمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔

آپ کوئی کتاب اٹھا کر دیکھیے یہ تو نفسیاتی کیفیت ہے۔ پرانی کتاب ہو بوسیدہ اوراق ہوں کھولنے سے آپ کو اس میں اتنی چھینکیں آئیں پھٹے ہوئے کاغذ ہوں جلد بھی نہیں نہ ہو جتنی زیادہ بوسیدہ ہوتی چلی جائے گی کتاب کھولتے ہی اس کا تقدس بڑھتا چلا جائے گا کہ یہ بڑی مستند ہوسکتی ہے صاحب! اس کا پرانا ہونا کیا ہی تقدس ہو گیا!

جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

عزیزانِ من! خدا کا دین یہ نہیں ہے اس کا دین یہ ہے کہ **سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ** (41:53) ہم اس عالمِ آفاق میں اور عالمِ انفس میں اپنی نت نئے دن نئی نئی نشانیاں تمہیں دکھاتے جائیں گے تا آنکہ یہ حقیقت تمہارے سامنے ایک مشہود حقیقت بن کر آجائے کہ قرآن نے جو کہا ہے وہ حق ہے۔ قرآن کی حقانیت کے ثبوت میں کیا چیز ہے؟ یہ کہ ہر دور میں خدا کی نئی نشانیاں سامنے آنا جبکہ یہاں یہ ہے کہ جتنی پرانی ہوتی چلی جائیں اتنی زیادہ سند بنتی جائیں گی۔

غیر قرآنی سوچ انسانی ذہنیت کو ہمیشہ پیچھے کی طرف دھکیلنے میں مصروف رہتی ہے

عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ ذہنیت کس قدر الٹ ہو گئی۔ قرآن نے کہا ہے کہ جہنم میں آنکھیں گدی کی طرف لگی ہوئی ہونگی چہرے پیچھے کی طرف ہونگے۔ یہ جہنم کیا چیز ہے؟ یہ پیچھے کی طرف لگی ہوئی آنکھیں کیا چیز ہے؟ یہ کہ آپ کا ماضی جتنا بھی ہے وہ سارا درخشندہ ہوگا اور آپ کا حال اور مستقبل سارا تاریک۔ جسے سنو! اپنے دور کا رونا روتا ہے جتنا پچھلا گزرا ہوا دور ہوتا ہے اس کے متعلق پوچھیے نہیں کہ وہ کتنا درخشندہ اور تابناک دکھائی دیتا ہے۔ ہم نے تصوف کی ساری کتابیں پڑھیں اولیا اللہ میں سے حضرت نظام الدین اولیا لے لیجیے۔ ان کے ہاں تو جو اولیا ہے وہ بھی واحد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ہاں تو حضرت نظام الدین اولیاؒ کی کتاب [1] لیجیے۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ وہ اپنے خلیفے سے کہتے ہیں کہ ارے بیٹا! ہم جس دور میں پیدا ہو گئے اس دور کا کیا پوچھتے ہو وہ فسق وفجور کا دور ہے تاریکیوں برائیوں کا دور ہے دور تو فلاں حضرت سلطان کا تھا۔ میں نے یہ ساری کتابیں پڑھی ہوئی ہیں مجھ پہ بھی یہ دور گزرا ہے۔ ہم نے ان کی کتاب اٹھائی کہ صاحب! دیکھیں ان کا دور کس قسم کا تابانی اور درخشندہ دور تھا؟ وہ اپنے خلیفے سے کہہ رہے ہیں کہ بیٹا! ہم کس دور میں پیدا ہو گئے یہ تو دنیا میں برائیوں کا ہر قسم کی خرافات کا دور ہے دور تو فلاں حضرت صاحب کا تھا۔ ہم نے فلاں حضرت صاحب کی کتاب اٹھائی وہ بھی رو رہے ہیں ہم اس سے پہلے کے فلاں حضرت صاحب کی کتابیں اٹھاتے چلے جا رہے ہیں وہ اپنے سے پہلے کا بتاتے چلے گئے ہیں۔ اب اس پہلے سے پوچھتے ہیں تو وہ بھی اپنے کو رو رہا ہے پھر پیچھے چلا جا رہا ہے۔

---

[1] اس کتاب کا نام ''راحت القلوب'' ہے۔ اس میں خواجہ فرید الدین شکرؒ کے وہ ملفوظات ہیں جنہیں حضرت نظام الدین اولیاؒ نے مرتب فرمایا تھا۔

قرآن حکیم ہر آن، قدم قدم پر، انسان کو غور و فکر کی ترغیب دیتا ہے

عزیزانِ من! خدا کہتا ہے کہ ہم ہر دور میں نت نئی نشانیاں تمہیں دکھائیں گے، جو قرآن کے دعاوی کی صداقت کا ثبوت بنتی چلی جائیں گی۔ اس کے لیے طریقہ کیا ہوگا؟ میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے لیے کئی درس چاہئیں لیکن جس طرح سے نبی اکرم ﷺ نے قرآن کے الفاظ میں ارشاد فرمایا، میں بھی وہی بات کیوں نہ کہہ دوں، لمبے درسوں کی کیا ضرورت ہے؟ کہا کہ **قُلۡ اِنَّمَاۤ اَعِظُكُمۡ بِوَاحِدَةٍ** (34:46) تئیس سالہ نبوت کی زندگی ہے، مسلسل کاوش ہے۔ قرآنِ کریم اتنا پھیلا ہوا ہے۔ ''کہا جاتا ہے کہ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میں تم سے بات کہنا چاہتا ہوں، صرف ایک بات''۔

عزیزانِ من! دیکھا آپ نے! کتنی اہمیت ہو جاتی ہے اس ایک بات کو کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کہنا چاہتا، تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ کیا بات ہے وہ؟ پہلی ہی چیز آپ دیکھیے نفسیاتی طور پہ کہ بھئی! کوئی لمبی چوڑی بات نہیں، میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ دیکھیے! آپ خود بھی سوچ سکتے ہیں کہ اس سے کس قدر توجہات اس نقطے پہ مرکوز ہو جاتی ہیں کہ بات ایسی اہم ہے! کہا کہ **اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ مَثۡنٰى وَ فُرَادٰى** (34:46) بات ایسی نہیں ہے جو چلتے چلتے سنیے، نہیں، تھم جاؤ، کھڑے ہو جاؤ۔ خدا کے لیے کوئی اور جذبہ نہیں ہے نہ میرے دل میں، نہ تمہارے دل میں ہونا چاہیے۔ ساری کی ساری بھیڑ نہیں رکتی تو ایک ایک دو دو کر کے رک جاؤ۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں، رک کر سنو۔ عزیزانِ من! دیکھا آپ نے، یہ انداز کس قدر Effective (مؤثر) ہو جاتا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ بھی سننے کے لیے ہمہ تن انتظار میں ہونگے کہ بات کیا ہے؟ ایک بات اور وہ ایک بات بھی نہیں، عزیزانِ من! ایک لفظ کہا ہے کہ سن لو۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ **تَتَفَكَّرُوۡا** (34:46) سوچا کرو۔ ایک بات ہے اور وہ ہے **تَتَفَكَّرُوۡا** سوچا کرو۔ ہم نے سوچنا شروع کر دیا تو آدھا کام ہو گیا۔ بتایا کہ **مَا بِصَاحِبِكُمۡ مِّنۡ جِنَّةٍ** (34:46) اگر تم نے سوچنا شروع کیا تو تم سمجھ لو گے، تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ بات کہنے والا، کوئی دیوانہ نہیں تھا، یہ بات کسی دیوانے کی نہیں تھی۔ دیوانہ دوسروں کو کیسے کہہ دے گا کہ سوچا کرو۔

قرآنِ حکیم کو قرآنِ حکیم کے آئینہ میں سمجھے بغیر، انسان میں نفسیاتی پختگی آ ہی نہیں سکتی

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا! یہی چیز ہے جو پھر قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پہ کہی ہے۔ کس میں سوچا کرو؟ کہا کہ **اَفَلَا يَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ** (47:24) کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔ قرآن میں تدبر کا کہا ہے۔ عزیزانِ من! یہ تدبر ہے۔ قرآن قیامت تک کے لیے، پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے تو ظاہر ہے کہ یہ جو قرآن کے احکام ہیں جن کے لیے کہا ہے کہ تدبر فی القرآن کا حکم تمام انسانوں کے لیے ہے، ہمیشہ کے لیے ہے۔ اس لیے کسی ایک انسان کا تدبر دوسرے انسان کو اس کی اس ذمہ داری سے بچا نہیں سکتا۔

ہر فرد کو تدبر کرنا ہوگا۔ اور کسی ایک دور کے اندر تدبر کیا ہوا جو قرآن ہے وہ کسی دوسرے دور کے لیے سند نہیں ہو سکتا' آپ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں لیکن وہ سند نہیں ہو سکتا۔ قرآن کا حکم ہے کہ قرآن میں تدبر کرو۔ کہتا ہے کہ یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔ تدبر نہ کرنے والوں کے متعلق کہا کہ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (47:24) ان کے دلوں کے اوپر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ اقفالھا ہے یعنی باہر کا کوئی تالا آ کر نہیں پڑا' اسی کا اپنا تالا پڑ گیا ہے۔

حیوان ہوں یا انسان' جو کوئی بھی اپنی صلاحیتوں سے کام لینا چھوڑ دے' اس میں وہ صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں

عدمِ تدبر سے خود قلبِ انسانی مقفل ہو جاتا ہے۔ سوچنے کی آپ عادت ہٹا دیجیے تو سوچنے کی صلاحیت کم ہونی شروع ہو جاتی ہے' وہ مفقود ہو جاتی ہے۔ بائیالوجی والے (ماہرینِ علمِ حیات) ہمیں بتاتے ہیں کہ جن جن حیوانات نے اپنے کسی خاص Organ (عضو) سے کام لینا چھوڑ دیا' کچھ عرصے کے بعد جا کر فطرت نے یہ دیکھا کہ یہ تو بیکار سی چیز ہو گئی' ان کے لیے کام ہی کچھ نہیں آتی' اس کے بعد اس نوع میں سے وہ Organ (عضو) ہی مفقود ہو گیا' باقی ہی نہیں رہا۔ جو چوہے غاروں کے اندر رہتے ہیں' اندھیرے میں رہتے ہیں' پہلے ان کی بھی آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی تھی' روشن ہوتی تھیں' چمگادڑوں کی جو پہلے نسل تھی' وہ آنکھوں والی تھی۔ اندھیرے میں رہنے سے انہوں نے آنکھوں سے کام نہ لیا' کچھ عرصے کے بعد پیدائشی طور پہ ان کے بچے اندھے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ فطرت نے کہا کہ یہ بیکار شے ہے' ان کے لیے ان کو دی ہی نہ جائے ''کسی ہور نوں دیوو' اوہدے کم آئے گی ❶ ''۔ قرآن کہتا ہے کہ جب یہ تدبر نہ کیا جائے تو خود دلوں پر اس کے تالے پڑ جاتے ہیں۔ اور کیا آپ کو اس کا پتہ ہے کہ قرآن کی رو سے اس چیز کا نام کیا ہے؟ عزیزانِ من! غور سے سنئے' بڑی غور طلب ہے۔

انسان کی سرکش عقل ہمیشہ انسان کے غلط جذبات کو خوش نما بنا کر پیش کرتی ہے

کہا کہ یہ کیفیت جو پیدا ہو جاتی ہے تو یاد رکھو! کہ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰى لَهُمْ (47:25) جو لوگ اس طرح اپنے دین سے مرتد ہو جاتے ہیں' بعد اس کے کہ ان کے پاس ایسا کھلا ہوا قرآن آ جائے تو عزیزانِ من! سوچیے کہ قرآن ان کے متعلق کیا کہہ رہا ہے۔ کہا کہ پھر وہ اسی روشِ کہن کے اوپر لوٹ جاتے ہیں۔ یہاں یہ ارتداد کا لفظ ہے۔ دین تو وہ ہے جو ما انزل اللہ ہوتا ہے۔ پچھلوں (اسلاف) کے راستے کے اوپر چلنا ہو تو دین سے پہلے بھی وہ

---

❶ کسی دوسرے کو دے دو' وہ ان کے کام آئے گی۔

پچھلوں (اسلاف) کا راستہ چلا آ رہا تھا۔ درمیان میں دین آیا' دین پہ آپ نے تدبر چھوڑ دیا' پھر اسی کے اوپر چل پڑے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ تو پھر اپنی ایڑیوں پر' اپنے گھٹنوں کے اوپر' منہ موڑ کر دوسری طرف چل دینے کا نام ہے۔ کہا کہ یہ اس طرف کیوں چل دیئے؟ اس لیے کہ شیطان نے ان کے سامنے وہ روش بڑی خوش نما بنا کر رکھ دی۔ یہ روش بڑی خوش نما بن جاتی ہے۔ یہ میں نے ابھی کہا ہے کہ ذرا ایک سند دیجیے' کوئی نام لیجیے' وہ کتنے خوش ہو جاتے ہیں۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ جب ان کے سامنے خدائے واحد کا ذکر کرو' تو بے حد کبیدہ خاطر ہوتے ہیں' ان کے ماتھے پہ جفر کے نقشے بننا شروع ہو جاتے ہیں' منہ بسور لیتے ہیں۔ اور جب اس کے ساتھ اوروں کا نام لیجیے تو باچھیں کھل جاتی ہیں: **سبحان اللہ** کیا بات ہوئی صاحب! ''گل کتی' ناہن ہویا نا' صحیح رستہ جیہڑا ہیگا[1]''۔ اس نے کہا ہے کہ **الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ** (47:25) شیطان ان کو خوش نما بنا دیتا ہے۔ **وَاَمْلٰى لَهُمْ** (47:25) اور بڑی بڑی فریب انگیز امیدیں اور آرزوئیں ان کے سامنے پیش کر دیتا ہے' ان کو ایک آس دلاتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے یہ تدبر کی طرف آتے ہی نہیں ہیں۔

شخصیت پرستی کا جال بڑا مضبوط ہوتا ہے اور اس کو توڑنا آسان نہیں ہوتا

عزیزانِ من! قرآن میں تدبر کرنے سے پھر یہ جتنا کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے' اس پہ تنقیدی نگاہ ڈالنی پڑ جاتی ہے' اس میں سے جو چیز اس کے مطابق ہوتی ہے اسے رکھا جاتا ہے' جو اس کے خلاف ہوتی ہے' اسے چھوڑنا پڑتا ہے خواہ اس کی نسبت کتنی ہی بڑی شخصیت کی طرف کیوں نہ کر دیجیے۔ اور یہ جو شخصیتوں کا چھوڑنا ہے' یہ بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ مشکل اس اعتبار سے ہے جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ انسان کی جو عقیدت مندیاں ہیں' یہ اس کے راستے میں حائل ہو جاتی ہیں ورنہ مشکل کچھ نہیں ہے۔ اور یہ ہے وہ چیز جس کے لیے آپ کو ایمان لانے سے پہلے لا الہ کرنا ہے کہ اس میں ہر الہ کی نفی ہے۔ ہر وہ جو آپ کے لیے سند بن گئے' حجت بن گئے' جس کا آپ اقتدار مان لیں' جس کا فیصلہ آپ سمجھ لیں کہ قابلِ تسلیم ہو گیا ہے' جس کے سامنے جھکنا ہے' آپ نے ہر وہ جو خدا کے علاوہ ہے' لا الہ اس کو آپ جب تک مٹاتے نہیں ہیں' الا اللہ تک پہنچ نہیں سکتے۔ اور سب سے بڑی چیز جو آپ کے راستے میں حائل ہوتی ہے' وہ یہ ہے جسے آپ اسلاف کی روش کہہ کر پکارتے ہیں۔

عزیزانِ من! میں پھر عرض کر دوں کہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کچھ ہمارے ہاں ہوتا چلا آ رہا ہے' اسلاف نے جو کچھ کیا ہے' وہ سارے کا سارا لے کر دریا برد کر دو' قطعاً نہیں۔ تاریخ تو انسان کا بہت بڑا متاع ہے۔ انسان میں یہ خصوصیت ہے کہ ایک دور کا جو تجربہ اور علم ہے' انسان وہ اگلے دور تک منتقل کرتا ہے۔ حیوان یہ نہیں کر سکتا۔ یہ Accumulative Knowledge (مجموعی علم) ہے جو آگے

---

[1] اب کیا ہی انوکھی اور صحیح بات کی! یہ ہوا صحیح راستہ۔

بڑھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن کسی Knowledge (علم) کے لیے جو سند اور حجت ہونا ہے' آج کی دنیا کے علم کے متعلق تو اب آنے والی نسل کا تجربہ اس کے لیے بتا دیتا ہے کہ یہ نظریہ غلط ثابت ہوا' وہ اسے چھوڑ دیتا ہے لیکن جو مذہبی عقیدت مندی ہے اس کے لیے اس قسم کی کوئی خارجی کسوٹی نہیں ہوتی۔ دنیا کے باقی مذاہب کے پاس کوئی کسوٹی باقی نہ رہی کہ ان کے پاس خدا کی طرف سے دی ہوئی کتاب اپنی اصلی شکل میں نہیں رہی۔ وہ اگر چاہیں بھی کہ وہ معلوم کرلیں کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے' اس میں کونسی چیز خدا کا دین ہے اور کونسی انسانوں کی وضع کردہ ہے' ان کے پاس اس کے لیے کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

قرآن حکیم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنے کا مقصدِ عظیم

قرآنِ کریم کو جو قیامت تک کے لیے محفوظ رکھا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لیا ہے' اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم اس Advantageous Position (افادی حیثیت) کے اندر ہیں کہ قدم قدم پہ کھڑے ہو کر ہم دیکھ لیں کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے یا جو کچھ اس وقت جو قوم ہماری مخاطب ہے' وہ کہہ رہا ہے' اس میں کونسی بات خدا کی کتاب کے مطابق ہے' کونسی اس کے خلاف ہے۔ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے' وہ سرمایہ علمی ہے' وہ ہمارے ہاں بڑی متاع ہے لیکن سند اور حجت بلا دلیل کے نہیں ہے' دین میں دلیل صرف خدا کی کتاب ہے۔ برادرانِ عزیز! اس کو پرکھ کر دیکھیے۔ جو اس کے مطابق ہو سر آنکھوں پہ رکھیے' جو اس کے خلاف ہو اس کو یہ کہہ دیجیے کہ یہ یا تو ان کی طرف غلط منسوب ہوا ہے یا بہرحال انسان سے اس میں غلطی ہوئی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ (2:141) یہ اقوام اپنے اپنے وقت میں چلی گئیں لَھَا مَا کَسَبَتْ وَ لَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ (2:141) جو انہوں نے کیا ہے وہ ان کے لیے تھا' جو تم کرو گے وہ تمہارے لیے ہے۔ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (2:41) اور ہم تم سے پوچھیں گے بھی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ ہم تم سے یہ پوچھیں گے کہ جب تم نے اس چیز کو صحیح اختیار کیا ہے اور اپنے لیے قابلِ قبول قرار دیا ہے' تو کیا اس کے لیے تمہارے پاس ہماری طرف سے بھیجی ہوئی کونسی سند تھی؟ برادرانِ عزیز! یہ ایک ہی سوال ہوگا۔ اور کہا یہ ہے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (6:57) اس کے سوا کسی اور کا حکم نہیں ہے۔

عزیزانِ من! آج دو ہی آیات ہمارے سامنے آئیں۔ اگلی آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

سینتیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)' (آیات 172 تا 176)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ
تَعْبُدُوْنَ ﴿172﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ
فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿173﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ
بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿174﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ
عَلَى النَّارِ ﴿175﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ
شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿176﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1969ء کی 16 تاریخ ہے۔ درس قرآن کے سلسلہ نو کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 172 سے ہوتا ہے: (2:172)۔

اجتماعی اور انفرادی حلال اور حرام کے مسئلے کی اہمیت اور اس کی مختلف شکلیں

آج کی نشست میں ایک بڑا ہی اہم نکتہ سامنے آ رہا ہے اور وہ ہے حلال اور حرام کا مسئلہ۔ اس سے پیشتر جو آیات ہمارے سامنے آئی ہیں' ان میں اجتماعی حلال اور حرام کا ذکر تھا' اب انفرادی حلال اور حرام کا بھی ذکر آئے گا۔ شاید یہ بات بعض احباب کے لیے کچھ نئی سی ہو کہ میں نے یہ اجتماعی حلت و حرمت اور انفرادی حلت و حرمت کی یہ کیا بات کہہ دی؟ اور بات بڑی اہم ہے۔ عام طور پہ آج یہ بمشکل سمجھ میں آ سکتی ہے۔ سابقہ آیات میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر ارض یا زمین یا بنیادی ذریعۂ پیداوار' خدا کی ملکیت ہے' اس کے ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (2:22) اس لیے تم غیر اللہ کو اس کا مالک بنا کر خدا کے ہمسر مت بناؤ۔ اس کا مالک وہ ہے۔ جب تم اس کے سوا کسی اور کو ارض کا' زمین کا' مالک تسلیم کر لیتے ہو تو وہ ند ہو جاتا ہے' وہ خدا کا ہمسر ہو جاتا

ہے لہٰذا کہا تھا کہ ایسا نہ کرو بلکہ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا (2:168) جو کچھ زمین سے ہم نے دیا ہے اسے حلال طریقے سے کھاؤ۔ آپ نے غور فرمایا کہ پھر اجتماعی حرام کس کو کہا گیا ہے؟ اگر کوئی معاشی نظام غیر اللہ کے قوانین کے مطابق ہو تو اس ملک کی جو معیشت ہے وہ حرام کے زمرے میں آجاتی ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اس بات کا سمجھنا آج کی فضا میں شاید کچھ دشوار سا ہو لیکن اتنی بات تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر رشوت کے روپے سے قصائی کی دکان سے بکرے کا حلال گوشت لیا جائے تو کیا وہ حلال ہوگا؟ چوری کی کمائی سے اگر آپ کہیں سے دودھ خریدتے ہیں تو کیا یہ حلال ہوگا؟ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی ملک کا قانون ان چیزوں کو جائز قرار دے۔ یہاں ہم ملک کے قانون کے متعلق سوال نہیں کہہ رہے' خدا کے قوانین کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ کیا جس چیز کے اوپر خدا کے علاوہ کسی کی ملکیت جائز نہیں ہے' وہ جب ناجائز ملکیت میں آجائے تو ناجائز ملکیت کی پیداوار کسی طرح سے جائز ہوجائے گی؟ یہ تھی وہ چیز جو میں نے کہا کہ اس سے پیشتر یہ جو آیات پہلے آئی ہیں' ان میں اجتماعی حلت اور حرمت کا ذکر تھا کہ اگر آپ کا پوری مملکت کا نظام غیر اللہ کے قوانین پر قائم ہے تو اس کے اندر اجتماعی طور پر معیشت کا جو حلال ہونا ہے' یہ ناممکن ہوجاتا ہے۔ اور یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ایک آزاد مملکت کو بنیادی شرط قرار دیتا ہے۔

قرآنی بنیادوں پر آزاد مملکت کے خدوخال کی نوعیت اور غلامی کی تعریف

قرآن کی رو سے آزاد مملکت کے معنی ہیں وہ مملکت جس میں قرآنِ کریم کے قوانین نافذ ہوں۔ آزادی اور غلامی کا تو ہمارے ہاں یا دنیا میں' عام تصور یہ ہے اگر کسی ملک پر' اس ملک کے رہنے والوں کی اپنی حکومت ہو تو اسے آزادی کہا جاتا ہے' اگر غیر ملک کے لوگ آکر اس پہ حاکم ہوجائیں تو اسے غلامی کہا جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے آزادی اور غلامی کا معیار مختلف ہے۔ وہاں اگر اپنے ملک میں اپنوں کی طرف سے غیر اللہ کے قوانین کے مطابق حکومت ہو' تو یہ غلامی ہے۔ اور اس ملک میں اس ملک کے رہنے والے ہوں یا کسی دوسرے ملک کے رہنے والے' قوانینِ خداوندی کو نافذ کرکے اگر حکومت قائم کریں تو یہ آزادی ہے۔ خدا کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا آزادی ہے' اس کے علاوہ کسی غیر اللہ کے' انسانوں کے' خودساختہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرنا غلامی ہے۔ قرآن نے جب کہا ہے کہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے اپنی آزاد مملکت کی ضرورت ہے تو اس کے معنی یہ ایسی مملکت کے ہیں جس میں خدا کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کی جاسکے تو پھر وہی مملکت ہوگی جس میں آپ کو اجتماعی طور پر رزقِ حلال مل سکے گا۔

حرام معاشی نظام میں حلال وطیّب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

اب آگے ہمارے سامنے وہ آتا ہے جو میں نے انفرادی طور پر حلت وحرمت کا سوال کہا تھا۔کہا ہے کہ **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَ اشْکُرُوْا لِلّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ** (2:172)۔آپ دیکھیے حرام وحلال کا معاملہ کتنا گہرا ہے۔کہا ہے کہ اے ایمان والو! اگر تم سمجھتے ہو'اگر تم چاہتے ہو کہ صرف اسی کی عبودیت اختیار کرو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ تم حلال اور طیّب کھاؤ۔حرام معاشی نظام کے اندر خدا کی عبادت کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔یہاں **اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ** (2:172) آیا ہے۔اس پر غور فرمایئے۔اب اس کے بعد انفرادی حلّت وحرمت کا سوال آتا ہے۔یہ بڑا اہم سوال ہے اور اسے سمجھنے کے لیے تمہیداً یوں سمجھ لیجیے کہ قرآنِ کریم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ انسانوں کو آزادی دینا ہے۔نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد' جیسا کہ میں کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں' سورۃ الاعراف کی آیات (7:157) میں واضح طور پہ کہا گیا کہ حضور ﷺ اس لیے تشریف لائے ہیں کہ انسانوں نے جتنی زنجیریں پہن رکھی ہیں' وہ ان کو توڑ دیں۔کہا ہے کہ **وَ یَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ** (7:157) استبداد کی جتنی بوجھل سلیں ان کے سروں کے اوپر رکھی جا چکی ہیں ان کو اتار دے' انسانیت کو مختلف نوع کی غلامی کی جتنی زنجیریں پہنائی گئی ہیں وہ ان کو توڑ کر رکھ دیں۔بنیادی تعلیم آزادی دینا ہے لیکن آزادی کوئی بھی ہو'اس میں کچھ نہ کچھ حدود مقرر کرنا پڑتی ہیں' کچھ نہ کچھ شرائط اور قیود ہوتی ہیں۔جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ یہ عرض کیا تھا کہ کھیل کے میدان میں بھی آپ کو کھیلنے کے لیے بھی کچھ شرائط' کچھ حدود' کچھ قیود' کچھ باؤنڈری لائنز' رکھنی پڑتی ہیں۔یہ جو حدود مقرر کی جاتی ہیں انہیں Transgress (تجاوز) نہیں کرنا' یہ ہے کہ جسے آپ حرام کہتے ہیں۔

حلال وحرام اشیا کی نوعیت کے سلسلہ میں حدود کے تعین کا معاملہ خدا تعالیٰ کے ہی پاس ہے

حلال کے لفظی معنی ہیں ''گرہیں کھول دینا' آزادی دے دینا''۔اور قرآن کی صورت یہ ہے کہ وہ صرف حرام چیزوں کے متعلق بتا کر' باقی کہتا ہے کہ سب کچھ حلال ہے۔یعنی آپ نے دیکھا کہ یہ نہیں ہے کہ حلال چیزوں کے صرف نام بتائے اور کہے کہ باقی سب حرام ہے۔وہ تو ایک پوری دنیا حرام ہو جائے گی۔وہ تو حرام چیزوں کے متعلق تصریح کر کے کہتا ہے کہ باقی سب تمہارے لیے حلال ہے۔گویا اس نے آزادی کا اتنا بڑا میدان کھلا چھوڑ دیا۔ٹیم سے کہہ دیا کہ یاد رکھو! یہ باؤنڈری لائنز ہیں' ان کے اندر یہاں ڈی ہے' یہاں یہ قاعدہ ہے' یہاں یہ قانون ہے' یہ دو چار پانچ باتیں ہیں اور اس کے بعد تمہیں اجازت ہے کہ تم اس گیند کو گول تک لے جانے کے لیے' ٹیم ورک کی حیثیت سے' باہمی تعاون سے' جس طرح سے جی چاہے کرو۔یہ آزادی ہے' وہ اس کی پابندی ہے' یہ حلال ہے' وہ حرام ہے۔اب اس کے بعد آپ یہ سوچ لیجیے کہ کسی انسان کی' کسی آزادی پر' کوئی پابندی عائد کرنا اس کا حق کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ حق کسی انسان کو نہیں ہوسکتا۔کسی

انسان کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے انسان کی آزادی چھین لے۔ وہ تو اس جیسا انسان ہے' اس کو تو کوئی Superior Right (افضل حق) نہیں ہے' اقتدارِ اعلیٰ نہیں ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم اپنے سیاسی نظام میں قوانینِ خداوندی کے علاوہ کسی کی Sovereignty (حاکمیت) کو تسلیم نہیں کرتا۔

اسلامی مملکت کے اندر کوئی Power Sovereign (قوتِ حاکمیت) نہیں ہوتی۔ اقتدارِ اعلیٰ یا Sovereignty جو ہے' وہ صرف خدا کی کتاب کو' قوانینِ خداوندی کو' حاصل ہوتی ہے۔ مملکت ایک ایجنسی ہوتی ہے قوانینِ خداوندی کے نافذ کرنے کی۔ اس اعتبار سے آپ کہہ لیجیے کہ دوسری مملکتوں کے ساتھ جب معاملات کرنے ہونگے اور وہ کہیں گے کہ تمہارے ہاں اقتدارِ اعلیٰ کسے حاصل ہے تو اس قرآنی نظام میں بھی کوئی اتھارٹی ایسی ہوگی جس کے متعلق کہا جائے گا کہ اسے اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے تو وہ اقتدارِ اعلیٰ کیا ہوگا؟ اختیارِ اعلیٰ نہیں بلکہ خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کا اقتدار اسے حاصل ہوگا۔ اسے یہ قوت حاصل ہوگی کہ وہ خدا کے قوانین کو نافذ کر سکے۔ کسی انسان کی آزادی پر کوئی پابندی عائد کرنا' کسی انسان کے لیے جائز نہیں ہوسکتا۔ اسے تو انسان کی غلامی کہا جائے گا۔ غلامی تو بنیادی طور پر شرفِ انسانیت کے خلاف احترامِ آدمیت کی تنقیص ہے۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی آزادی پر پابندی نہیں عائد کرسکتا۔ اب یہ پابندی کا حق کسے ہوا؟ اسے ہی ہوا جس نے یہ ابدی قوانین دیئے کہ جس پر ایمان لانے سے ہم اس ایک سوسائٹی کے ممبر بنتے ہیں۔ یہ ہے جسے اسلام کہا جاتا ہے۔ یہ صرف خدا کو حق حاصل ہے۔ اور اس کے دیئے ہوئے دین کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے کم از کم پابندیاں عائد کی ہیں۔ وہی چار لائنیں ہیں جو ہاکی کے فیلڈ (میدان) میں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ دو ایک قسم کے ضوابط ہیں صاحب! Stick (ہاکی) اتنی اونچی نہ جائے اور کسی کو زخمی نہ کیا جائے وغیرہ۔ اس کے بعد آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اور پھر قرآن ہے جو قیامت تک کے لیے پوری نوعِ انسانی کے لیے ایک ضابطہ ہے۔

کسی انسان کا حلال وحرام کا اشتہار جاری کرنا' نوعِ انسانی کو اپنا غلام بنانے کے مترادف ہوگا

آپ سوچیے کہ اگر کسی کھانے پینے کی چیز کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ یہ تمہارے اوپر' تمام دنیا کے مسلمانوں پر' ساری آنے والی نسلوں پر' قیامت تک کے لیے حرام ہے' سوچیے تو سہی اس سے بڑی پابندی' اس سے بڑا اقتدار' اس سے بڑا اختیار' بھی کسی کو ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی ایک انسان کہہ دے کہ یہ چیز حرام ہے اور وہ پورے کروڑوں انسانوں پر' آنے والی نسلوں تک' قیامت تک کے لیے حرام ہو' اس سے بڑی بادشاہت' اس سے بڑی حکومت' اس سے بڑا استبداد' دنیا میں کوئی نہیں ہوسکتا۔ کسی مستبد حاکم کا بھی کوئی فرمان ہوگا تو کم از کم اس کی حکومت کے دائرے تک ہوگا' اس کی حکومت کے عہد تک ہوگا۔ کسی ایک انسان کا یہ فیصلہ کہ فلاں چیز تمام انسانوں کے لیے قیامت تک

کے لیے حرام قرار دی گئی' یہ کتنی بڑی اتھارٹی ہے۔ یہ اسے کیا حق حاصل ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم اس معاملے میں کتنی وضاحت سے یہ چیز کہتا ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ کسی شے کو جسے خود خدا نے حرام قرار نہیں دیا' وہ حرام قرار دیدے۔ عزیزانِ من! یہ بہت بڑا اقتدار ہے۔ بیماری کے زمانے میں چار دن کے لیے ڈاکٹر یہ کہہ دیتا ہے کہ صاحب! یہ چیزیں تمہارے لیے مضرِ صحت ہیں' انہیں نہ کھانا' ان سے پرہیز کرنا' وہ تمہاری صحت کے لیے ناصحانہ طور پہ یہ کہتا ہے۔ دو ایک دن کے بعد آپ دیکھیے کہ آپ کو وہ چیز کتنا کھلنے لگ جاتی ہے۔ خواہ ہم خود اپنی مرضی سے دس دن تک بھی نہ کھائیں۔ پابندی سے' آپ دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں سے انسان کی طبیعت اِبا کرنے لگ جاتی ہے۔

خدا تعالیٰ نے چار چیزوں کو حرام قرار دیا ہے

برادرانِ عزیز! ایسی پابندی کے لیے جو قیامت تک کے لیے' تمام انسانوں کے اوپر لگے' بہت بڑی اتھارٹی کی ضرورت ہے اور وہ اتھارٹی' خدا کے سوا قرآنی نظام میں' کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق بھی خود پابندی عائد کر دی اور وہ ہیں چند چیزیں۔ کہا ہے کہ **اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ** (2:173)۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ انما کہاں آیا کرتا ہے؟ یہ ہے کہ ''یہی ہیں' یہ چیزیں ہیں'' آگے کہا ہے کہ **حَرَّمَ عَلَيْكُمُ** (2:173) تمہارے اوپر خدا نے حرام قرار دیدی ہیں۔ میں ذرا آگے چل کر اس لفظِ ''حرام'' کے متعلق عرض کروں گا۔ ''حلال'' کا تو میں نے عرض کر دیا ہے کہ یہ ''گرہیں کھول دینا' آزادیاں دے دینا'' ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تم پر کن چیزوں کو حرام کر دیا؟ بتایا کہ **الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ** (2:173) یہ تین فزیکل چیزیں ''مردار' لہو' خنزیر کا گوشت'' ہیں۔ لہو کے متعلق دوسری جگہ قرآن نے تصریح کر دی کہ وہ **دمًا مسفوحا** (4:146) ہے یعنی بہتا ہوا لہو۔ اب یہ مردار' لحمِ خنزیر' بہتا ہوا لہو ہیں۔ یہ تین طبعی چیزیں ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ ایک چوتھی چیز بھی ہے اور وہ آگے آتی ہے۔ چار ہی کا ذکر ہے قرآن میں۔

حلال چیز کو بھی حلال کرنے کی ایک شرط سے مشروط کیا گیا ہے

ان چار چیزوں کے علاوہ کہا ہے کہ باقی سب حلال ہے۔ جو باقی حلال ہے اس کے متعلق ایک شرط عائد کی ہے کہ **تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ** (6:119) حلال میں سے جس پر خدا کا نام لیا جائے اسے کھاؤ۔ گویا حلال جانور ہے' پھر اس کے حلال ہونے کی ایک اور شرط ہے کہ اس پر خدا کا نام لیا جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی پر خدا کا نام نہ لیا جائے' یعنی نہ خدا کا نام لیا جائے' نہ کسی اور کا نام لیا جائے' ایسے ہی اس کو کاٹ دیا جائے' ذبح کر دیا جائے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ یہاں تو یہ حکم ہے کہ جس پر خدا کا نام لیا جائے

اسے کھاؤ (6:119)۔ چار آیات آگے کہا کہ وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ (6:122) جس پر خدا کا نام نہ لیا جائے وہ تم نہیں کھا سکتے۔ گویا یہ حکم Positive (مثبت) ہو گیا' نام لینا ضروری ہو گیا۔ ایک تو وہ چیز ہو گی کہ خدا کے علاوہ کسی اور کا نام لیا جائے' اس کی بات تو آگے آتی ہے' وہ تو حرامِ مطلق ہے۔ ایک یہ چیز ہے کہ نام ہی کسی کا نہ لیا جائے' یوں ذبح کر دیا جائے۔ قرآن نے اس کی تصریح کر دی کہ نہیں' جس پر نام نہ لیا جائے' وہ بھی حرام ہے۔ نام لے کر ذبح کیا جائے تو یہ ہو گئی حلال' قرآن کی رو سے۔ حرام تو حرام ہے' حلال میں سے بھی خدا کے نام کے اوپر جو ہو' وہ حلال ہوتا ہے۔ کہنے کو تو یہ خدا کا نام لینا ایک رسم ہے اور وہ رسم بھی' جس طرح سے ادا ہوتی ہے' وہ کہیں مذبح میں جا کر دیکھیے۔ جہاں بکرے ذبح ہوتے ہیں' وہاں اس ذبح کرنے والے' چھری پھیرنے والے' جس نے ساتھ نام لینا ہوتا ہے' کے لیے ہر بکرے کا ایک پیسہ ❶ دو پیسے مقرر رہوتا ہے۔ وہاں جا کر آپ دیکھیے' سینکڑوں بکرے ہوتے ہیں' اور ہر ایک قصائی کو یہ جلدی ہوتی ہے کہ اس کا بکرا جلدی سے ذبح ہو' اور اس میں دیر نہ لگے۔ مشین تو ہوتی نہیں ہے' ہاتھ سے ذبح کرنا ہوتا ہے' تو اس کو حساب بھی رکھنا ہوتا ہے' تو وہ چھری لی ذبح کیا' اور کہا کہ لو! تمہارے ذمے پانچ پیسے ہو گئے' سات ہو گئے۔ یہ چل رہا ہے اللہ کا نام۔

عزیزانِ من! وہ کہتے ہیں کہ وہ چھری پھونکی ہوئی ہوتی ہے۔ یہاں تو پتہ نہیں' جب ہم انڈیا میں تھے تو وہاں وہ شاہ مدار کے مزار سے ایک چھری پھونکی ہوئی آتی تھی۔ گاؤں والے قصائی جب وہ سالانہ میلہ ہوتا تھا تو وہ شاہ مدار کے مزار پر اپنی اپنی چھریاں لے جاتے تھے۔ وہاں سے جو چھری ہے' وہ پھونکوا کر لے آتے تھے اور وہ سال بھر کے لیے کافی ہو جاتی تھی جیسے اس کا میگنا ٹائز (مقناناً) ہو گیا ہو۔ ایک سال تک کے لیے وہ اس چھری سے ذبح کرنا حلال ہوتا تھا۔ بہر حال یہ تو جہالت اور Superstition (وہم) کی باتیں ہیں۔

یہ جو چیز ہے کہ صاحب! خدا کا نام لیا جائے تو یہ بات یوں سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ ہوتا کیا ہے؟ عزیزانِ من! ہوتا یہ ہے کہ بنیادی شرط یہ قرار دی ہوئی ہے کہ یہاں جو اختیار ہے' وہ صرف خدا کو ہے' کسی اور کو اختیار نہیں ہے۔ مومن کو زندگی کے ہر سانس میں یہ دہرایا جاتا ہے کہ خدا نے اس کو حلال قرار دیا ہے' اس لیے یہ میرے لیے حلال ہے' اگر وہ حلال قرار نہ دیتا تو حلال نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ہر وقت یاد دہانی ہوتی ہے' یہ اس کو سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ اسی کو ذکر اللہ کہتے ہیں کہ اس حقیقتِ کبریٰ کو ہر وقت سامنے رکھنا کہ جو حلّت و حرمت ہے' اس کے لیے معیار کیا ہے؟ کیوں میں اِس کو کھا رہا ہوں؟ میں اُسے کیوں نہیں کھا رہا؟ اس لیے کہ وہ' جس کو میرے اوپر پابندی عائد کرنے کا اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے' اس نے اس پہ یہ یوں پابندی عائد نہیں کی کہ یہ حلال ہو گیا' اس نے پابندی عائد کر دی ہے کہ حرام ہو گیا۔ خدا کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے کا ہر وقت جو ذہن نشین رکھنا ہے' یہ ہے جسے آپ اللہ کا نام لینا کہتے ہیں۔ تین طبعی چیزیں یہ ہو گئیں اور ان کے متعلق تو ہر ایک کو معلوم ہے۔ سؤر کا گوشت تو آپ سمجھتے ہیں اور مردہ بھی۔ دمِ مسفوح (بہتا ہوا خون) تو ہمارے ہاں کوئی کھاتا نہیں ہے۔ قرآن میں اگلی

---

❶ یاد رہے یہ بات مارچ 1969ء کی 16 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

چیز وہ ہے جو میں نے گزارش کیا ہے کہ ان چار ہی چیزوں کی تصریح کی ہے۔

غیراللہ کے نام پر دی گئی حرامِ مطلق شے، ہمارے ہاں حلالِ مطلق تصور کی جاتی ہے

تین تو یہ ہیں اور چوتھی وہ ہے جو قرآن نے ساتھ ہی حرام کی ہے مگر ہمارے ہاں معاشرے کے اندر یہ شیرِ مادر کی طرح حلال ہے، یہ اس سے بھی زیادہ حلال، مقدس طریقے کے اوپر حلال ہے۔ سنیئے! وہ چوتھی حرام چیز کیا ہے؟ کہا کہ **وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ** (2:173) جس شے کو بھی اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے، وہ حرامِ مطلق ہوگئی۔ یہ روز آپ کے ہاں یہ نیازوں کی دیگیں پکتی ہیں۔ یہ فلاں بزرگ کی نیاز ہے، یہ فلاں حضرت صاحب کی فاتحہ ہے۔ یہ کیا ہے؟ اور یہ جو نیاز ہے، عام طور پہ پکی ہوئی جو حلال وطیب پلاؤ کی دیگ ہے، وہ آپ کھاتے بھی ہیں، کرتے بھی ہیں۔ نیاز کا دانہ آپ زمین پہ گرنے نہیں دیتے یعنی حلال ہی نہیں، وہ مقدس بھی اتنا ہو جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تین چیزیں یہ ہیں اور چوتھی چیز یہ ہے حرامِ مطلق۔ عزیزانِ من! غور فرمایا کہ یہ کیوں حرامِ مطلق ہے؟ ٹھیک ہے کہ گوشت حلال ہے، چاول طیب ہیں، اچھا گھی اس کے اندر ڈالا ہے، پلاؤ پکا ہوا ہے پھر یہ کیا ہوگیا؟ یہ حرامِ مطلق کیوں ہوگیا؟ بات تو ساری وہی اقتدارِ خداوندی کی تھی۔ جونہی آپ نے یہ اقتدارِ اعلیٰ کسی اور کی طرف منسوب کیا، آپ نے اقتدارِ اعلیٰ کی ہستی کسی اور کو تصور کر لیا، جونہی وہ تصور آپ کے ذہن میں آیا، شرک ہوگیا۔ شرک تو ہے ہی یہ کہ خدا کے علاوہ کسی اور اقتدارِ مطلق کا حاکم تصور کر لینا۔ دنیا کے اندر یہ سب سے بڑا شرک ہے۔ یہ ہے قرآن۔

تین چیزیں تو وہ دیں جو میں نے کہا ہے کہ یہ طبعی یعنی Physical ہیں، یہ وہ چیزیں ہیں، محسوس ہیں، وہ تو معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے چوتھی چیز، جو اصل تھی جہاں سارے مذاہب کی دنیا اکٹھی تھی۔ تمام مذاہب کے اندر آپ دیکھیں گے کہ یہ جتنی عقیدت مندیوں کی نذر نیازیں دی جاتی ہیں، یہ ساری غیر اللہ کے نام پر منسوب ہوتی ہیں۔ قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ تین چیزیں جو صرف طبعی تھیں، ان کو کہا اور چوتھی چیز کو ساتھ دہرا دیا کہ حلال وطیّب میں سے بھی، جو شے خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کر دی جائے، حرامِ مطلق ہو جاتی ہے۔ عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا جب قومیں دین سے الگ ہٹتی ہیں، تو ان کے ہاں کیفیت کیا ہو جاتی ہے۔

بچپن کے دورِ تصوف میں اپنے منہ پہ کھایا ہوا طمانچہ کبھی نہ بھولے گا: پرویزؒ

میں نے یہ عرض کیا ہے کہ غیر اللہ کے نام پہ منسوب کردہ یہ نذر و نیاز نہ صرف یہ کہ ان کا عام رواج ہو چکا ہے، بلکہ یہ اتنی مقدس ہوگئی ہے کہ اس کا دانہ گرنے بھی نہیں دیا جاتا جسے آپ نیاز کا دانہ کہتے ہیں، مجھے آج تک یہ گال (رخسار) یاد ہے، جس پہ طمانچہ پڑا تھا۔ بچپن کا زمانہ تصوف میں گزرا کرتا تھا۔ یہ بات ابھی سامنے نہیں آئی تھی۔ نیاز بٹ رہی تھی، دینے والے نے دیا تو میں نے ایک ہاتھ آگے کیا۔ وہ

جو استاد تھے یا مرشد تھے' ان کا اگلا ہاتھ اس گال کے اوپر آیا' وہ طمانچہ آج تک یاد ہے۔ کہا کہ نیاز لے رہے ہو' ایک ہاتھ سے لے رہے ہو' گستاخ کہیں کے! یوں لیا کرتے ہیں۔ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (2:173) کو یوں لیا کرتے ہیں۔ وہ دور اور تھا' قرآن ابھی سامنے نہیں تھا۔

مذہب زدہ قومیں دین کے پرلطف نظاروں سے ہمیشہ محروم رہتی ہیں

آپ نے دیکھا کہ جب قومیں دین کو چھوڑتی ہیں تو کس مقام پہ جا پہنچتی ہیں۔ ذرا بے ادبی اور گستاخی کر کے دیکھیے' وہ جو Inhibitions & Contradictions (مزاحمتیں اور تضادات) ہمارے اندر آ کر پڑے ہوئے ہیں' وہ سونے نہیں دیتے: ''پتہ نہیں کیا ہو جائے گا صاحب! میں نے آج گستاخی کر دی' وہ نیاز کے دانے گر گئے زمین کے اوپر میرے ہاتھ سے' یہ کچھ ہو گیا''۔ کانپ رہا ہے' لرز رہا ہے' غائبانہ ہی کہہ رہا ہے ''یا حضرت! معاف کر دیجیے گا' میری نیت یہ نہیں تھی''۔ اندازہ لگائیے آپ' اور اُدھر قرآن کریم نے اسے حرامِ مطلق کہا ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے حلّت و حرمت کے سلسلہ میں ایک زبردست وارننگ

اب آیئے ذرا ان چیزوں کی تفصیل دیکھیے۔ آپ جانتے ہیں کہ اب ہمارا درس کا انداز یہی ہے کہ جو باتیں سامنے آتی ہیں' تو قرآنِ کریم نے جہاں جہاں ان کی تفاصیل دی ہیں' ان ضروری تفاصیل کو بھی میں سامنے پیش کرتا چلا جاتا ہوں۔ یہ چار چیزیں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ حرام ہیں۔ اور قرآن کا میں نے اصول بتا دیا کہ جو چیزیں حرام ہیں' جہاں اس نے کوئی لائن لگائی ہے' صرف لائن لگاتا ہے' باقی کے متعلق یہ ہے کہ تمہیں چھٹی ہے۔ ٹھیک ہے' آزادی ہے' کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ (5:87) اے ایمان والو! جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے' انہیں حرام قرار نہ دو۔ یہاں یہ حکم دیدیا کہ جنہیں خدا نے حلال قرار دیا ہے' انہیں حرام قرار ہی نہیں دے سکتے' انہیں مت حرام قرار دو۔ اگلا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ قرآن نے کیا کہا ہے۔ کہا یہ ہے کہ وَ لَا تَعْتَدُوْا (5:87) اپنی حد سے آگے نہ بڑھو۔ کیا بات ہے! تمہارا حدِ اختیار نہیں ہے' تم اپنے اختیار سے آگے بڑھ رہے ہو' تمہیں اس کا حق حاصل نہیں' تمہیں اقتدار نہیں' اختیار نہیں' Right نہیں' اتھارٹی نہیں۔ تَعْتَدُوْا نے کیا بات کہہ دی؟ یہ کہ اپنی حد تک رہو۔ تمہیں اس کا اقتدار حاصل نہیں ہو سکتا یا وہ اتھارٹی حاصل نہیں ہو سکتی کہ کسی چیز کو حرام قرار دے دو' اس لیے تم حرام قرار نہیں دے سکتے۔ عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کسی کی آزادی کو سلب کر دینا ہے۔ کیا وہ اس کی اجازت دے سکتا ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔

عیسائیوں کی شریعت احکام سے محروم ہے اور یہودیوں کی خودساختہ شریعت عملی طور پر دشوار

حلت و حرمت بات چونکہ بڑی اہم تھی' اس سے پیشتر عیسائیوں کے ہاں تو آپ کو شاید معلوم ہے' انجیل کے اندر احکام و شریعت ہیں ہی نہیں' اس میں صرف وعظ ہے' اخلاقی تعلیم ہے۔ جسے آپ Law ' قانون کہتے ہیں وہ انجیل میں نہیں ہے۔ Law (قانون) جو تھا' شریعت جو تھی' وہ یہودیوں کے ہاں تھی۔ اور ان کی شریعت کو کہیں بھی دیکھیے' ان کے ہاں کی کیفیت یہ ہے کہ نو من تیل ہو تو پھر رادھا ناچے۔ ان کے ہاں ایک بکرے کو ذبح کرنے کے لیے' جانور کو ذبح کرنے کے لیے' جس قدر مقدس رسومات ادا کرنا پڑتی ہیں' اتنے میں یہاں آدمی پکا کر' کھا کر' فارغ ہو جاتا ہے اور وہ ابھی اسی دائرے میں لگے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کے ہاں کا جو ''کوشر [1]'' ہوتا ہے' وہ عام طور پہ بہت مہنگا ملتا ہے' اس میں اس کا بھی تو خرچ داخل ہوتا ہے۔ ان کے ہاں کی شریعت نے بال بال جکڑ دیا تھا۔ خدا کے دین نے تو اس میں اتنی سی ہی پابندیاں عائد کی ہونگی۔ ان کے ہاں کی ساری پابندی ان کی فقہ نے عائد کی ہوئی ہیں۔ ان کے ہاں دو چیزیں ہیں' ایک تو وہ تورات کو مانتے تھے' اور دوسرا تورات کے علاوہ وہ وحی خفی کو مانتے تھے۔ وحیٔ خفی' وحیٔ غیر مکتوب' وحی غیر متلو یعنی وہ وحی جو لکھی نہیں گئی' جس کی تلاوت نہیں ہوتی تھی۔ اور اس کے آگے تالمود ان کی فقہ کا مجموعہ ہے۔ آج کی محرف تورات میں تو چند ہی احکام ہیں اور اس کے بعد یہ دیکھیے کہ ان کے ہاں یہ جو وحی کی دوسری قسم' وحیٔ خفی' تھی جسے روایات کہتے ہیں' ان کے ہاں کی جو فقہ تھی اس میں آپ دیکھیے تو اس قدر پابندیاں ہیں کہ بال بال جکڑا ہوا ہے صاحب! قرآن کے سامنے یہ چیز تھی جو اس طرح سے حلّت و حرمت کے احکام کو واضح کیا۔

قرآن حکیم کی روشنی میں حلّت و حرمت کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی وضاحت

وہ لوگ پوچھتے ہونگے کہ صاحب! یہی چار چیزیں آپ نے بتا دیں۔ کہا کہ **قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ** (6:145) جو کچھ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتا ہے یا جو وحی مجھے ملی ہے' اس میں تو میں ان چار چیزوں کے علاوہ کسی چیز کو حرام نہیں پاتا۔ اب تم جو مجھ سے آ کر ان کی دیکھا دیکھی اور طلب کرتے ہو تو میں کیسے مرتب کر کے تمہیں دے دوں۔ غور کرو کہ جو مجھ پہ وحی ہو رہا ہے' جو مجھ پہ خدا کی طرف سے وحی ہوا ہے' اس میں تو اس کے علاوہ میں کسی اور چیز کو کچھ حرام پاتا ہی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! یہودیوں کے ہاں تو اتنی اتنی بڑی چیزیں حرام ہیں۔ سنیے! قرآن نے کیا

---

[1] کہا جاتا ہے کہ یہودی اُسی طرح جانوروں کو ذبح کرتے ہیں جس طرح مسلمان ذبح کرتے ہیں۔ اس پر وہ خدا کا نام بھی لیتے ہیں۔ اس عمل (Process) کو ان کی Terminology (اصطلاح) میں ''کوشر'' کہا جاتا ہے۔

کہا؟ کہتا ہے کہ وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِىْ ظُفُرٍ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ (6:146) یہودیوں کے اوپر یہ جو تم ہر پنجے دار جانور دیکھتے ہو وہ بھی حرام اس قسم کی چربی بھی حرام۔ یہ جو اتنی اتنی چیزیں جزئیات میں دی گئی ہیں، تم ان کے ہاں دیکھتے ہو ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ (6:146) یہ انہوں نے بڑی سرکشیاں برتی تھیں، ہم نے ان کی سزا دی۔ غور فرمایا آپ نے، ان کے علاوہ جو اور چیزیں اس طرح سے حرام قرار دی جاتی ہیں، کہا کہ یہ انہیں سزا ملی تھی۔ یہی چیز (4:160) میں دہرائی ہے۔ کہا کہ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ (4:160) یہ حلال وطیب چیزوں کو جو یہودیوں کے اوپر بعض چیزوں کو حرام قرار دیا تھا، انہوں نے بڑی ظلم وزیادتی اور سرکشی اختیار کر رکھی تھی، ہم نے ان کو اس چیز کی سزا دی تھی۔ گویا وہ چیزیں جنہیں خدا نے حرام قرار دیا ہے، ان کے علاوہ اگر کوئی اپنے اوپر اور چیزوں کو خود حرام قرار دیتا ہے یعنی اپنی آزادیوں کو خود ہی وہ پابند کر دیتا ہے، بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پہننا شروع کر دیتا ہے تو یہ تو سزا ہوتی ہے۔ کہا کہ یہ سزا تھی جو ہم نے ان کو دی تھی۔

قوانین خداوندی کے علاوہ خودساختہ پابندیاں انسانی زندگی کو مفلوج ہی نہیں بلکہ جامد کر دیتی ہیں

غور فرمایا آپ نے، کسی کی آزادی کو جو سلب کر لینا ہے اسی کو تو سزا کہتے ہیں۔ ایک تو قانون کی حدود ہیں کہ بائیں طرف چلو، یہ سڑک کے اوپر ٹریفک کا Rule (قانون) ہے، ہر ایک کے لیے ہے۔ تمدنی زندگی کے لیے ایک حد باندھنا، یہ ایک پابندی عائد کرنا ضروری ہوا لیکن اس قانون کے علاوہ کسی کی آزادی کو پابندی میں بدل دینا تو خود سب سے بڑی لاقانونیت (Lawlessness) ہے۔ اسی کے خلاف تو اتنے اتنے احتجاج ہوتے ہیں۔ یہ جو چیز ہے کہ خدا کے قانون نے پابندی نہیں عائد کی، جس چیز پہ اس کے اوپر تم خود پابندی عائد کر لو یا کوئی تمہارے اوپر پابندی عائد کر لے تو کہا کہ یہ تو سزا ہے۔ آپ نے قرآن کی رو سے دیکھا سزا کی Definition۔ سزا ہے اس قوم کے اوپر، جو یہ چیزیں اپنے ہاں کرے۔ کہا کہ قرآن میں تو یہی ہے جو کچھ ہم نے تمہیں کہا ہے۔ کہا کہ اس کے علاوہ اور چیزوں کو حرام قرار دینے والے ہم نہیں ہیں۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا (10:59) جو چیزیں ہم نے حلال قرار دیں، تم خود ہی ان کو اپنے اوپر حرام قرار دیتے ہو۔ کہا کہ مجھے بتاؤ کہ تمہارے پاس ایسا کہنے کے لیے کونسی اتھارٹی ہے، کونسی سند ہے؟ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ (10:59) کیا خدا نے ایسا کرنے کا کوئی حکم دیا ہوا ہے یا یونہی اپنی طرف سے یہ کچھ کر کے خدا کی طرف منسوب کرتے ہو اور افترا کرتے چلے جاتے ہو؟ یہ تم حلال و حرام کی لسٹیں تیار کرتے پھرتے ہو، یہ بتاؤ کہ خدا کی طرف سے تمہارے پاس کونسی سند ہے؟۔

ارشادِ خداوندی کے علاوہ ہمارے ہاں حلال و حرام کی خود ساختہ لسٹیں

عزیزانِ من! میں پھر عرض کردوں جو میں نے پہلے کہا تھا کہ بات تو یوں سرسری سی نظر آتی ہے کہ فلاں چیز ہے' اس کو حرام قرار دیا۔ اصولاً آپ دیکھیے یہ قیامت تک کے لیے ارب ہا ارب انسانوں کی آزادی کو پابند کرنا ہے' ان کو آزادی سے محروم کرنا ہے' آزادی کو سلب کرنا ہے۔ اور یہ دین کی بنیاد ہے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے' کسی دوسرے انسان کی آزادی کو سلب کرے بجز ان پابندیوں کے جو خدا نے انسانوں کے اوپر عائد کی ہیں' کہتا ہے کہ وَ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَا تَصِفُ اَلۡسِنَتُکُمُ الۡکَذِبَ ہٰذَا حَلٰلٌ وَّ ہٰذَا حَرَامٌ لِّتَفۡتَرُوۡا عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ(16:116) یونہی اپنی زبانوں کو موڑ تروڑ کر یہ کچھ نہ کہتے رہا کرو کہ یہ حلال ہے' یہ حرام ہے' یہ مکروہ ہے' یہ ناجائز ہے' یہ مکروہِ تحریمی ہے۔ وہ حرام کے نیچے آپ کے ہاں اور لسٹیں بنی ہوئی ہیں۔ کچھ تو حرام ہو گیا پھر اس کے بعد آگے یہ چیزیں چلتی ہیں۔ کہا کہ یونہی بیٹھے بیٹھے نہ کرتے رہا کرو کہ یہ حلال ہے' یہ حرام ہے۔ ارے! حرام ہے جو کچھ خدا نے تمہیں بتا دیا۔ یونہی بیٹھے ہوئے یہ کچھ کرتے چلے جاتے ہو۔ لِّتَفۡتَرُوۡا عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ(16:116) گویا پھر تم یہ کہتے ہو کہ صاحب! یہ شریعتِ خداوندی نے حرام قرار دیا ہے تو یہ تو خدا کے اوپر افترا ہے۔ ہم نے تو ان چیزوں کو حرام قرار نہیں دیا۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ لَا یُفۡلِحُوۡنَ (16:116) یاد رکھو! یہ خدا کے ذمے جھوٹ لگانا ہے' ایسا کرنے والے کبھی فلاح نہیں پا سکتے' ان کی کھیتیاں پروان نہیں چڑھ سکتیں۔

ارض و سما میں نبی اکرم ﷺ جیسی بلند ترین ہستی کو بھی کسی حلال شے کو حرام قرار دینے کا اختیار نہ تھا

عزیزانِ من! یہاں ایک اور چیز قرآنِ کریم نے ہمارے سامنے لائی اور وہ بڑی اہم چیز تھی۔ کہا کہ یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ(66:1) اے نبی! جس چیز کو خدا نے حلال قرار دیا ہے' تُو اس کو کیوں حرام قرار دیتا ہے؟ عزیزانِ من! یہ وہ ذاتِ گرامی ﷺ ہیں جن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر' اس کائنات میں بزرگ ترین' مقدس ترین' افضل ترین ہستی ہے لیکن وہ جو پہلی شرط لگا دی ہے بعد از خدا' وہ ہے حقیقت میں چیز۔ یہاں خدا کہہ رہا ہے کہ یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ (66:1) جس چیز کو خدا نے تیرے لیے حلال قرار دیا تھا' تجھے بھی اس کی اجازت نہیں مل سکتی کہ تُو اس کو حرام قرار دے۔

قرآن حکیم نے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے مقام کو کلمے کے الفاظ میں متعین کر دیا ہے

عزیزانِ من! یہ احترامِ شرفِ انسانیت کی انتہا ہے۔ وہ ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ وہ ہے جس کے ایک اشارے کے اوپر وہ متبعین تھے' صحیح ایمان لانے والے' ہتھیلی پہ اپنے سروں کو لے کر میدانِ جنگ میں نکل آتے تھے۔ یہ سب ٹھیک تھا لیکن اسی نے یہ بھی کہا تھا کہ یاد

رکھو! جب تم شہادت دو کہ لا الہ الا اللہ تو اس کی بھی شہادت دو کہ محمد رسول اللہ ﷺ ہے۔ مگر الٰہ صرف وہ ہے، اقتدار اسی کو حاصل ہے۔ اس کے بعد تمہارے ذہن میں ایک ہی بزرگ ترین ہستی آسکتی ہے وہ ہے محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس۔ اس نے یہ کہا کہ اسی سانس میں یہ بھی کہو، کہیں میرے متعلق یہ نہ کہنے لگ جانا کہ اس کو بھی الوہیت میں کسی قسم کا دخل ہے، جس سانس میں یہ کہو کہ خدا کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں، اسی سانس میں یہ کہو کہ حتیٰ کہ محمد ﷺ بھی صرف رسول ہے، اس کو بھی الوہیت میں کوئی دخل نہیں ہے۔

دنیا بھر میں قوموں کی زبوں حالی کی بنیادی وجہ مقامِ نبوت کو پیشِ نظر نہ رکھنا ہے

عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ آپ کے کلمے کے جو یہ دو حصے ہیں، اس کے معنی کیا ہیں؟ کیوں اسی سانس میں رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اعتراف ہو رہا ہے؟ کہ کہیں الوہیت کے اندر شریک نہ مان لیا جائے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ قومیں غلو کی وجہ سے، مبالغے کی وجہ سے، دین سے بگڑا کرتی ہیں۔ کوئی قوم بھی، کوئی مذہب بھی، آپ کو ایسا نہیں نظر آئے گا جو اپنے بانی کی کسی طرح سے تحقیر کرے۔ سارے مذہب بگڑے ہوئے نظر آئیں گے کہ وہ اپنے بانیٔ مذہب کو اس کے اصل مقام سے آگے لے جاتے ہیں۔ کسی نے ان کو اوتار بنا دیا، کسی نے خدا کا بیٹا کہہ دیا، کسی نے خود خدا ہی کہہ دیا۔ اگر ایسا نہ کہا تو خدائی قوتوں کا حامل قرار دیدیا۔ غلو، مبالغہ اس کے مقام سے اونچا لے جانا ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہے کہ یہ کہیں ان کے ماننے والے بھی، وہی کچھ نہ کریں جو پہلے اہلِ مذاہب نے کیا تھا کہ ان کو ان کے مقام سے اونچا لے جائیں، اسی سانس میں اقرار کراتے چلے گئے، دہراتے چلے گئے کہ الٰہ صرف ایک خدا ہے، اس کے بعد عام مذاہب میں جس ہستی کو اس مقام سے بڑھا کر الوہیت میں داخل کیا تھا، وہ خدا کا نبی ہوتا تھا، اس کے متعلق ہمارا ایمان یہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ خدا کا پیغامبر ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ (3:144) محمد بجز این نیست کہ خدا کا رسول ہے، اس سے پیشتر کئی رسول آئے، چلے گئے اَفَا۠ئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ (3:144) اگر کل کو یہ رسول فوت ہو جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم یہ کہو گے کہ وہ دین تو اس کی ذات کے ساتھ تھا، یہ یہاں نہیں رہا، دین ختم ہو گیا، پھر اب آپ عہدِ جاہلیت کی طرف چلے جاؤ گے۔ یہ سوال نہیں ہے۔ یہ تو رسول تھا، رسول ایک بشر ہے، اس کی طبعی زندگی ہے، وہ ختم ہونی ہے، اس کی جو رسالت ہے وہ تو قیامت تک کے لیے ہو گئی۔ مقصد رسالتِ رسول اللہ ﷺ سے ہوا، رسول اللہ ﷺ کی بشری حیثیت تو اس میں نہ رہی۔

برادرانِ عزیز! اس رسولؐ سے یہ کہا گیا ہے کہ یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ (66:1) کیوں حرام قرار دیتا ہے اس چیز کو جو ہم نے حلال قرار دی ہے تیرے لیے؟ اور پھر یہ چیز تو بڑے ہی دھڑلے سے کہہ گیا۔ قُلۡ (7:32) اے رسول! کہو ان سے، پوچھو ان سے کہ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِہٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ (7:32) کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو،

اور طیّب رزق کو جسے خدا نے اپنے بندوں کے لیے حلال قرار دیا ہے وہ ان کو حرام قرار دے۔ پوچھو ان سے کہ کس کو یہ اختیار حاصل ہے؟ یہ خدا کی طرف سے بہت بڑا چیلنج ہے۔ پوچھو کون ہے وہ جو ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے' جنہیں خدا نے حلال قرار دیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ بہت بڑی چیز ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ لوگ اس چیلنج کا جواب کس طرح سے دیں گے جنہوں نے آپ کے لیے فہرستوں پہ فہرستیں مرتب کر کے رکھ دیں: یہ حلال' وہ حرام' یہ مکروہ' یہ مباح۔ قرآنِ کریم نے' جیسا میں نے عرض کیا ہے' جیسا اس نے خود کہا ہے' کہ یہ ہیں وہ چیزیں جن کے متعلق کہا ہے کہ یہ حرام ہیں۔

حلال کی اس تفصیل کے بعد لفظ ''طیباً'' کی وضاحت

برادرانِ عزیز! اب آگے بات آتی ہے کہ باقی ساری چیزیں حلال ہیں۔ ان حلال چیزوں کے ساتھ قرآن نے جہاں بھی حلال کہا ہے' وہ ساتھ طیّب کا لفظ بھی لایا ہے مثلاً **حلالا طیبا** کہا کہ ان حلال میں سے جو تمہیں پسند ہوں' جو تمہیں خوشگوار نظر آئیں۔ اب پھر اس میں انفرادی چوائس (انتخاب) آ گیا۔ ایک چیز مجھے پسند نہیں ہے' وہ مجھے خوشگوار نہیں نظر آتی۔ اب جو طیّب ہے اس میں ہر چیز آ جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹری نقطۂ نگاہ سے ایک چیز آپ کے اوپر طیّب نہ رہے' ہوسکتا ہے کہ آپ کا انفرادی ذوق ایک چیز کو پسند نہ کرے۔ پابندی کوئی عائد نہیں کر سکتا۔ تمہیں اگر کوئی چیز ناخوشگوار نظر آتی ہے' وہ ناپسند ہے' تم نہیں کھا سکتے تو نہ کھاؤ۔ **حلالا طیبا** کہا ہے کہ خوشگوار طریقے پر ان چیزوں کو تم کھاؤ۔ یہ جو حلال چیزیں ہیں' ان کے اوپر ایک تو پابندی خود عائد کر لی' یہ وہی ہے جو میں نے کہا تھا کہ یہ انفرادی چیز ہے۔ اجتماعی طور پہ بھی ایسا ہوسکتا ہے۔ جنگ کا زمانہ آ گیا' خاص قسم کے ایک راشن کی کمی اور مقام کے اوپر زیادہ ضرورت ہے بہ نسبت کسی سول آبادی کے۔ یہ چیز وقتی طور پہ کی جاسکتی ہے کہ تمہارے لیے یہ چیز اتنے وقت کے لیے طیّب نہیں رہے گی۔ دو دن کے لیے گوشت کا ناغہ اگر اس کی اجتماعی ضرورت ہے تو کیا جا سکتا ہے مگر یہ حرام نہیں ہے۔ حرام قرار دینا اور بات ہے۔ جس طرح سے کہ آپ حلال میں سے اپنی ذات کے لیے طیّب چیز کا انتخاب کرتے ہیں' اسی طرح بعض چیزوں کو طبیعت نہیں چاہتی' آپ وہ ساری عمر نہیں کھاتے' وہ حرام نہیں ہو جاتیں۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کا انداز دیکھا! مذاہبِ عالم نے جو ایک ایک بال جکڑ کر رکھ دیا تھا' حرام حرام کی فہرستیں مرتب کر کے رکھ دی تھیں' اس نے ان تمام زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا۔ اب یہ چار چیزیں ہیں' ان میں تین فزیکل ہیں' مادی ہیں اور چوتھی چیز اعتقادی اور نظری ہے کہ ہر وہ شے جس کو خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے۔ اور اس کے بعد باقی جتنا میدان ہے' وہ اس نے طیّب کہہ کر کھلا چھوڑ دیا اور تمہاری انفرادی آزادی کو قائم رکھا۔

ایک غلط نگہی کا ازالہ

اب ایک غلط نگہی تھی۔ اس کی ایک مثال مجھے یاد ہے۔ جب ہم پارٹیشن کے بعد کراچی میں آئے تو ایک صاحب بہار کے تھے' وہ بڑے متشدد قسم کے واقع ہوئے تھے' اکٹھے رہتے تھے۔ وہ کتا ذبح کرتے تھے اور اپنے ہاں پکاتے تھے' اور لوگوں کو پکڑ پکڑ کر کھلاتے تھے۔ جو کہتا تھا کہ میں نہیں کھاتا' اسے کہتے تھے کہ بتاؤ کہاں لکھا ہے کہ یہ حرام ہے؟ میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ مگر ان کی غلط نگہی یہ تھی کہ ان کے نزدیک جو چیز بھی حرام نہیں کہی گئی' اس کو مجبوراً کھانا پڑے گا۔ یعنی اس کے ذہن میں نہیں تھا کہ اس کو طیّب بھی ہونا چاہیے۔ عزیزانِ من! یہ طیّب ہونا تو خوشگواری کی ایک چیز ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ شرابی نے شراب کا پیالہ اپنے سامنے رکھا ہو جس کے ناجائز ہونے کے اندر شبہ ہی نہیں ہے' وہ خود بھی اسے تسلیم کرتا ہے۔ اسے تو وہ نہایت مزہ لے کر پیے گا۔ اگر اس شراب کے پیالے کے اندر چوہے مر جائیں' تو وہ شراب پھینک دیتا ہے۔ یہ ہے طیّب کی چیز کہ آپ کے ہاں کے نہایت اچھے کھانے میں' کسی وقت مکھی نکل آئے' آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے گھِن آتی ہے۔

لفظ طیّب کا قرآنی مفہوم

قرآن ہے اس نے آپ کو مجبور نہیں کیا کہ جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے' وہ تمہیں مجبوراً' ضرور کھانا پڑیں گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ طیّب ہونی چاہئیں۔ اور پھر اجتماعی طیّب تو آپ کو معلوم ہے۔ کیا بات ہے عربی زبان کی! طیّب وہ درخت ہوتا ہے جو نہایت عمدہ پھل لائے۔ جو قرآن کی حدود کے اندر صحیح معاشی نظام ہے' اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس کا شجر طیّب ہوتا ہے' وہ بڑے عمدہ پھل لاتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں خبیث وہ درخت ہوتا ہے جو کبھی پھل نہیں لاتا۔ اب یہ بات دوسری طرف چلی گئی۔

حرام قرار دی گئی چیزوں کی وجہ جواز

ہاں' میں نے عرض کیا تھا کہ پہلے قرآن نے اجتماعی حلال اور حرام بتایا' اب انفرادی حرام اور حلال پہ آیا۔ یہاں تک یہ چیز آئی۔ عام طور پر یہ پوچھا جاتا ہے کہ صاحب! قرآن نے خنزیر کے گوشت کو' مردار کو' بہتے ہوئے خون کو' کیوں حرام قرار دیا؟ اس کی جو بڑی بڑی توجیہات پیش کی جاتی ہیں' وہ عام طور پر طبی نقطۂ نگاہ سے ہوتی ہیں۔ ڈاکٹروں کے ہاں' صاحب! یہ چیز ہے کہ اس میں کچھ مضرِ صحت جراثیم ہوتے ہیں' اس کے خلاف اس قسم کے جوابات دیئے جاتے ہیں' جن کا پھر کوئی جواب ان کے پاس نہیں ہوتا۔ کئی اور جانور بھی ہیں جو وہ کہتے ہیں کہ ان میں خنزیر سے بھی زیادہ' مضرِ صحت جراثیم قسم کی چیز ہوتی ہے۔ پھر وہ بتاتے ہیں کہ ان کی بھی اگر صحیح طور پہ پرورش کی جائے' تو ان کے اندر یہ چیز نہیں ہوتی اور ویسے بھی طبی نقطۂ نگاہ سے تو قرآن نے کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا۔ اگر یہ دیا ہوتا تو سنکھیا کا پہلے

ذکر آتا کہ یہ حرام ہے۔ قرآن ان چیزوں کو جو انسان اپنے ذاتی تجربے مشاہدے اور مطالعہ کے بعد خود دریافت کر سکتا ہے مثلاً سائنس کے اصول Physical World (طبعی کائنات) کے اصول وغیرہ تو وہ انہیں نہیں دیتا۔

عزیزانِ من! اس سے آگے بڑھے تو ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! یہ جانور (خنزیر سُور) کچھ بڑا بے شرم سا واقع ہوا ہے۔ عزیزانِ من! یہ شرم اور بے شرمی تو انسانی قدر (Value) ہے یہ حیوان کی چیز نہیں ہے کہ وہ بے حیا ہوتا ہے بے شرم ہوتا ہے۔ بات یہ بھی نہیں بنتی۔ اس پہ بہت کچھ غور کیا گیا لیکن ایک ہی چیز ہے جو سمجھ میں آسکتی ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ حرفِ آخر ہے بلکہ میں اسے کچھ یوں سمجھا ہوں کہ یہ خود لفظِ حرام حرمت تحریم احترام کا مادہ (Root) ایک ہی ہے۔ آپ ساری دنیا کا لٹریچر دیکھ جائیے معلوم نہیں کیوں قدیم سے قدیم لٹریچر وہ کسی قوم کا ہو کسی مذہب کا ہو اس میں آپ دیکھیں گے کہ سور کو ہمیشہ گالی کے طور پہ استعمال کیا جاتا رہا گالی دی جاتی ہے۔ آج بھی جو قومیں سور کھاتی ہیں میز پہ سور کھا رہی ہوتی ہیں دوسرے کو You Swine کہہ کر گالی دیتی ہیں Pig-Headed کہتی ہیں۔ ابھی تک اس پہ تحقیق تو نہیں ہوئی کہ اس کی ابتدا کس چیز سے ہوئی کب ہوئی کیوں ہوئی؟

خون پینے والے کو آپ نے دیکھا کہ اس سے دہشت اور بربریت آتی ہے برملا کہتے ہیں: او مردار خور۔ مسلمانوں میں ہی نہیں دنیا کی ہر قوم کے اندر ہر لٹریچر میں مذہبی اور غیر مذہبی لٹریچر کے اندر قدیم سے قدیم زبانوں کے اندر بھی آپ کو یہ چیزیں ملیں گی۔ عالمگیر انسانیت میں ان کے خلاف کچھ نفرت کے جذبات رکھے ہوئے ہیں طبیعت ان چیزوں سے ابا کرتی ہے۔ میں عالمگیر انسانیت کہہ رہا ہوں یہ لوکل (مقامی) چیزیں نہیں ہیں۔ لوکل میں تو ہو سکتا ہے کہ (مثلاً) ہندوستان میں گائے ہو چاہے ہمارے ہاں یہ چوہا اور کتے ہو جائیں چین والے تو انہیں نہایت مزے سے کباب بنا کر کھاتے ہیں وہاں یہ چیز ایسی نہیں ہے عالمگیر نہیں ہے لیکن یہ چیز جو میں نے ابھی آپ سے کہی ہے یہ چین ہو یا جاپان ہندوستان ہو یا ایران یا یونان یا قدیم ترین قبائل یعنی قدیم تریں اقوام جو مہذب ہو چکی ہیں جہاں جہاں قومیں مہذب ہوئی ہیں ان کے ہاں کے لٹریچر میں نظر آتا ہے کہ انہوں نے ان چیزوں کے خلاف ہمیشہ اِبا کیا ہے انسانوں کے اندر نفرت کے جذبے پیدا ہوئے یہ الفاظ گالی کے طور پہ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ جو ایک عالمگیر نفرت کا جذبہ چلا آتا تھا قرآن نے اس کا احترام کیا ورنہ اگر کسی قوم سے شروع میں یہ چیز کہہ دی جاتی کہ مسلمان ہونا ہے تو تمہیں مردار کھانا پڑے گا سُور کھانا پڑے گا پھر مسلمان ہو سکتے ہو جیسے آج کہیں کوئی کسی کو یہ کہہ دے کہ صاحب! ہماری اس سوسائٹی میں داخل ہو جاؤ بڑے بڑے فضائل ہیں بس اتنی سی چیز ہے کہ پہلے دن شام کو اس کے اندر ایک ضیافت ہوگی اس میں کتے کا گوشت ہوگا اس کا قورمہ ہوگا چوہے کے کباب ہونگے پیسہ نہیں دینا پڑے گا ساتھ کچھ انعام بھی ملے گا۔ کہیے! کیا خیال ہے؟ اور اگر آپ سے پوچھا جائے کیوں تو آپ جواب نہیں دے سکتے۔ سنیے! ''کیوں'' کا جواب نہیں دے سکتے۔ آپ نے آج تک کبھی تجزیہ کر کے دیکھا ہی نہیں ہے کہ چوہے میں کیا برائی ہے جو اسے کھایا نہیں جاتا۔

لیکن کہیں کھاتے ہوئے پلیٹ پر سے چوہیا گزر جائے تو دل چاہتا ہے کہ اس پلیٹ کو اٹھا کر کہیں باہر پھینک دیں مگر آپ ''کیوں'' کا جواب نہیں دے سکتے۔ اس کا تعلق جذبات سے ہے۔ لہٰذا اس قسم کی چیز خواہ مخواہ کے لیے کیوں عائد کر دی جائے؟ ہمارے ہاں کے جو متشدد ہیں' وہ یہ غلطیاں کرتے ہیں۔ انڈیا میں کئی واقعات میرے سامنے آئے۔ اچھوتوں کا گاؤں کا گاؤں مسلمان ہونے کے لیے تیار تھا۔ مولوی صاحب نے شرط لگا رکھی ہوئی تھی کہ ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد جو پہلی دعوت ہوگی' وہ گائے کے گوشت کی ہوگی۔ اسلام ان کے نزدیک قابلِ قبول تھا۔ اس کے بعد پہلے ہی دن اس چیز کو جس کے خلاف ان کے دل میں یہ جذبات تھے' اس کے خلاف یہ کرنا ناممکن تھا' یہ نہیں کیا جا سکتا۔

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ یہ یہی بات ہے' ورنہ میں ذاتی طور پر' یہ جو کرتے ہیں' طبی نقطۂ نگاہ سے اس کے اوپر بحث کر کے' ان چیزوں کو لا کر' ان کو اپنی ایک دلیل نہیں تسلیم کر سکتا' یہ جو کرتے ہیں' اس کے خلاف بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اگر کل کو طبی نقطۂ نگاہ سے بھی یہ ثابت کر دیا جائے کہ اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے تو کیا یہ آپ کے لیے حلال ہو جائے گا؟ یہ چیز نہیں ہے۔ بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ کسی انسان کے اوپر یہ پابندی عائد کرنا' یعنی کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے کا اختیار اور اقتدار خدا کے علاوہ کسی اور کو نہیں ہے۔ قرآن کریم نے پابندی عائد کر دی کہ کوئی انسان دوسرے انسان کی آزادی کو نہیں چھین سکتا۔

اضطراری حالت میں حرام شے کو ایک حد تک استعمال کرنے کی اجازت

یہ قرآن ہے اور اسی سے نظر آتا ہے کہ اس میں کوئی طبی بات نہیں ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ **فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ** (2:173) لیکن اگر بھوک کی وجہ سے' اضطراری حالت ایسی پیدا ہو جائے کہ...... یہاں ''اضطرار'' کا لفظ ہے' اضطراب کا لفظ نہیں ہے۔ اتنی مجبوری کی حالت ہو کہ حلال کوئی شے مل نہیں رہی۔ یہ چیزیں ہیں' حرام قرار دی ہوئی' وہیں قرآن نے اس کے لیے Relaxation (رعایت) کر دی۔ یہ ہے دین کہ اگر کسی کی کسی وقت ایسی کیفیت پہنچ جائے تو پھر اسے اجازت ہے کہ جو چیزیں عام حالات میں حرام اور ناجائز ہیں' وہ انہیں کھا سکتا ہے۔ اس کی شرط یہ ہے کہ یہ **غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ** (2:173) ہو۔ یعنی قانون سے سرکشی کی نیت نہ ہو کہ وہ کیا شے ہے' میں اس کی کیا پرواہ کرتا ہوں' اس کی **وَلَا عَادٍ** یہ ہے کہ جتنی ضرورت ہے اس سے زیادہ آگے بڑھ کر نہیں کھانا ہے۔

اضطراری حالت کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے دور کا ایک واقعہ اور وضاحت

اضطراری حالت میں یہ چیز ہو سکتی ہے اور یہ ہے وہ چیز جس پر ہمارے ہاں یہ مسائل مستنبط ہوئے کہ جو اضطراری حالت ہے' بھوکا ہے' ہر طرح کی کوشش کر دیکھی ہے کہ جائز طریقے سے کوئی چیز کھانے کی مل جائے' جس سے میں زندہ رہ سکوں' میں اور میرے بچے بھوک

سے بچ سکیں۔ غلط معاشرے کے اندر نہیں مل رہی' کوئی طریقہ نہیں ہے' اضطراری حالت پیدا ہوگئی ہے۔ اس وقت کیا کرے؟ کیا قرآن کی اس آیت کی رو سے اس کو اجازت نہیں ہے کہ جو چیز عام حالات کے اندر ناجائز تھی' اس کے لیے ان حالات میں' اضطراری حالات میں' وہ جائز ہو جائے گی۔ یہ وجہ تھی کہ حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) کا وہ فیصلہ ہمارے سامنے آتا ہے جب ایک شخص نے کسی کے کھیت سے کوئی غلہ' کوئی بھٹہ' کوئی اس قسم کی چیز' جس سے پیٹ بھرتا ہو' وہ اتنا سا لے کر' کسی کے کھیت سے چرا کر' کھا لیا۔ گرفتار ہو کر آئے' چوری تھی۔ ان سے پوچھا گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے مالک کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہمیں اتنا کم کھانے کو دے رہا ہے کہ جس سے ہماری بھوک نہیں مٹتی ہے اور مسلسل یہ صورت تھی۔ ہماری حالت اب یہ ہوگئی تھی کہ پیٹ بھرنے کے لیے کوئی اور ذریعہ ہمارے پاس نہیں رہا تھا۔ وہاں سے ہم بھاگے' یہ کھیت سامنے آیا' یہاں سے ہم نے یہ چیز چرا کر کھائی ہے۔ یہ ہے وہ کیفیت۔ حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) نے اس آیت کے تابع یہ کہا کہ اس اضطراری حالت میں ان کے اوپر کوئی جرم نہیں۔ ان کے آقا کو بلایا اور بلا کر اس کو سزا دی کہ تم نے انہیں اس حالت کے اندر پہنچایا' مجرم تم ہو' یہ نہیں ہیں۔ یہی اصول ہے۔ جس کے متعلق ہمارے ہاں امام ابنِ حزم (384-456/994-1064) نے اس کے لیے فتوے دیئے ہیں کہ اگر بھوکا شخص جس کی شرط یہ ہے کہ اس کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے کہ جائز طریقے سے اس کو کچھ مل سکے' اضطراری حالت تو وہی ہوگی جی! اس میں اگر کسی ایسے شخص سے جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ کھانا ہے' وہ جو زائد ہے' وہ اگر اس سے چھینتا ہے اور وہ مزاحمت کرتا ہے' اس مزاحمت میں اگر وہ شخص مارا جاتا ہے' تو اس کے اوپر کوئی جرم عائد نہیں ہوسکتا۔ اور اگر یہ مارا جاتا ہے تو اس کو دیت دینی پڑتی ہے حتیٰ کہ یہ بھی چیز ہے جو نبی اکرم ﷺ نے فرمائی تھی کہ جس بستی میں رات کو کوئی ایک شخص بھوکا سو جائے' اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس بنا پہ ان لوگوں نے یہ ایک فیصلہ کیا کہ کسی بستی میں' یہ نہ ہو کہ قحط کی وجہ سے وہاں کسی کے پاس بھی کھانا نہ ہو' یہ نہ ہو کہ باقی کھا کر' پیٹ بھر کر' سوئیں اور وہاں ایک فرد' اس بستی کے اندر اگر بھوکا رہ گیا اور مر گیا ہے تو ساری بستی کے اوپر اس کی دیت لازم آجاتی ہے۔ اضطراری حالت کے متعلق قرآن نے کہا کہ انہیں اس کی اجازت دی جاسکتی ہے لیکن پھر غور کیجیے گا' اس پہ ذہن میں رکھیے گا کہ یہ **غیر باغ و لا عاد** (2:173) ہے یعنی قانون شکنی کی نیت سے یہ چیز نہ ہو' نہ ہی حد سے بڑھنے والی بات ہو۔ وہاں تک کی یہ چیز ہے۔

قرآن حکیم کے معاشی نظام میں اضطراری حالت کی نوبت ہی نہیں آتی

عزیزانِ من! یہ ہے قرآنِ کریم کے معاشی نظام کا اصل الاصول کہ وہ کسی پر اضطراری حالت طاری نہیں ہونے دیتا۔ اور اس کے لیے اس نے انتظام یہ کیا ہے کہ **وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا** (11:6) **مملکت** کی حدود میں یا اس ارض کے اوپر' کوئی ذی حیات ایسا نہیں ہونا چاہیے جس کے رزق کی ذمہ داری خدا کے نام پر قائم ہونے والی مملکت نے نہ لے رکھی ہو۔ اسے اعلان کرنا پڑے گا کہ **نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ** (6:151) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں' تمہاری اولاد کے رزق کے بھی ذمہ دار

ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس قوم کے اوپر کوئی وقتی' ہنگامی' ایسی آفت آجائے کہ رزق کی کمی ہو لیکن وہ کمی سب کے لیے کمی ہونی چاہیے۔

ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی ایک روایت

یہ تھے وہ ہنگامی حالات جن کے اندر پہلی چیز جو نبی اکرم ﷺ کی مکی زندگی ہے اس میں نظر آتی ہے۔ وسائل بہت کم تھے' احتیاج بہت زیادہ تھی۔ اس میں ہیرے کی طرح وہ چمکتی ہوئی روایت ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ ہمارے ہاں قبیلۂ اشعر میں' اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانے میں بھی' عرب جاہلیہ کے اندر بھی' وہ بہت بلند خوبیوں کے حامل تھے' یہ رواج تھا کہ اگر کہیں قحط پڑ جاتا یا کسی اور وجہ سے کھانے پینے کی چیزوں میں کمی آجاتی تو ہمارا قبیلہ اپنے اپنے گھر میں پھر کچھ نہیں پکاتا تھا۔ وہ سارا کچھ باہر لاتے' ایک دسترخوان پہ ہم اکٹھا کر لیتے تھے اور سارے اہلِ قبیلہ وہاں جمع ہو کر جتنا کسی کے حصے میں آتا تھا' اتنا کھا لیا جاتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس بات میں قبیلۂ بنو اشعر میں سے ہوں۔ آپ ﷺ نے مکے کے اندر یہ نظام قائم کیا تھا۔

حضرت عمرؓ کے دور میں قحط کے دوران اجتماعی زندگی کی ایک روشن مثال

مدنی زندگی کے اندر تو آپ جانتے ہیں کہ وظائف مقرر کیے تھے' وہ وظائف کیا تھے؟ یہ کہ کوئی فرد محتاج نہ رہنے پائے۔ جو آمدنی آرہی ہے اس میں سے یہ بانٹ دیا جائے اور قحط کے زمانے میں تو آپ کو پتہ ہے کہ حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں (634-644/45ء) ایک ہی بہت بڑا قحط آیا تھا۔ آپؓ نے پہلے تو یہ چیز کی تھی کہ جتنا سرپلس (زائد) تھا' اس کو دیتے گئے مگر وہ قحط نہیں گیا۔ اس کے بعد یہ صورت ہوئی کہ اِدھر اُدھر کے باہر کے جو لوگ تھے' وہ مدینے میں' مرکز میں' آکر جمع ہونا شروع ہوگئے۔ آپؓ نے حکم دے دیا کہ مدینے میں کسی کے گھر خود کچھ نہیں پکے گا۔ چنانچہ سارے کا سارا اجتماعی طور پر' اشتراکی طور پر' وہ باہر لے آتے تھے۔ وہ قحط اس طرح سے گزرا تھا' وہاں سارے مل کر کھاتے تھے۔ اور اس میں چونکہ ایسا تو فراواں وہاں تھا نہیں کہ وہ گھی اور دودھ اور یہ کچھ بھی ملے۔ جو کچھ بھی تھا' حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) کی اپنی صحت کے اوپر اس کا بے حد اثر پڑا تھا۔ چنانچہ ان کے متعلق ان کے اربابِ شوریٰ نے کہا کہ آپؓ اپنے اوپر اتنی سختی نہ کیجیے' اس سے تو آپؓ کی صحت دن بدن ضائع ہو رہی ہے۔ آپؓ نے کہا تھا کہ

خونِ شاہ رنگیں تر از معمار نیست

عمرؓ کی رگوں کا خون ان بدوؤں کے خون سے زیادہ قیمتی نہیں ہے' جو کچھ انہیں ملتا ہے وہی کچھ میں لوں گا۔ اور دوسری جگہ یہ کہا تھا کہ اگر یہ چیز پیدا ہو جائے' اگر میں اس چیز کو اپنے اوپر وارد نہ کروں تو مجھے کیسے محسوس ہو کہ کسی کے ساتھ بھوک کیا کرتی ہے[1]۔

---

[1] وہ اصل الفاظ کچھ یوں ہیں:

"مجھے لوگوں کی تکلیف کا احساس کس طرح ہو سکتا ہے' جب تک مجھ پر بھی وہی کچھ نہ گذرے جو ان پر گذرتی ہے۔" (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت، 1987' ص 257)

نظام صرف قوانین کا نام نہیں‘ یہ سیرت و کردار کا رہینِ منت ہوتا ہے

عزیزانِ من! کیا باتیں یہ لوگ کہہ گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ جی! نظام غلط ہوتا ہے‘ نظام صحیح ہوتا ہے۔ میں پھر عرض کر دوں نظام قوانین کا نام نہیں ہے۔ دنیا میں آج وہ کونسا نظام ہے‘ جہاں اچھے اچھے قانون نہیں۔ صاحبِ سیرت و کردار ہستیوں کے زور پر صحیح نظام چلتا ہے۔ انسانوں کے اندر تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اچھے سے اچھا قانون بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اگر یہ کیفیت اس چلانے والے کی نہ ہو جو یہ کہہ رہے تھے کہ عمرؓ کے جسم کے اندر اس بدو کے جسم سے بہتر خون نہیں ہے۔ اور اگر میں بھوکا نہ رہوں تو مجھے کیسے معلوم ہو کہ بھوک انسان پہ کیا کرتی ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا۔ قرآن نے کہا ہے کہ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَيۡرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ (2:173)۔ کیا بات ہے اثم کی‘ یہاں جو لفظ آیا ہے! اثم کے لفظ کے معنی ہوتے ہیں ’’واماندگی‘ اضمحلال‘ افسردگی‘ پیچھے رہ جانا‘ کمزور ہو جانا‘‘۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ’’رزقِ حرام سے انسانوں کے اندر وہ جو توانائیاں اور قوتیں ہوتی ہیں‘ وہ سلب ہو جاتی ہیں اور وہ قوم زندہ قوموں کی صف میں چلنے کے قابل نہیں رہتی‘‘۔ یہ اثم ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے دوسری جگہ ربوٰ کو بھی اثم کہا ہے۔

جنسی جذبات کی تسکین کے لیے اضطراری حالت کے سہارے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

عزیزانِ من! یہاں پھر اور بات آ گئی۔ اضطراری حالت قرآن نے ان کھانے پینے کی چیزوں میں کہی ہے جن کے اوپر زندگی کا دارومدار ہے۔ بات اگرچہ موضوع سے متعلق نہیں لیکن میں یہ عرض کر دوں کہ ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال پھیلایا جاتا ہے کہ جنسی جذبے کی تسکین بھی ایک Physical Demand (طبعی مطالبہ) ہے‘ ایک طبعی تقاضا (Physical Urge) ہے۔ اور پھر وہ بات چلی ہوئی ہے کہ صاحب! اگر اسے پورا نہ کیا جائے تو اس سے بڑی بیماریاں پھیلتی ہیں اور اس سے یہ کچھ ہوتا ہے۔ اب یہ ٹھیک ہے کہ اگر آپ اسے کیفیت اضطراری کہتے ہیں کہ اگر اس کے لیے کسی کو کوئی جائز طریقہ نہیں ملتا تو پھر وہ اس سے استنباط کر لے کہ قرآن نے اس کی اجازت دی ہے۔

سنیئے‘ عزیزانِ من! یہ بڑی غلط چیز ہے۔ یہ قرآن ہے۔ ایک مقام پر آیا ہے کہ یہ جذبہ جنسی ہے‘ اس کی تسکین کے لیے‘ یہ جائز طریقہ ہے‘ جسے آپ نکاح کہتے ہیں۔ اور وہاں یہ ہے کہ اگر یہ صورت پیدا ہوتی ہو‘ کہ کھانے کو نہ ملے تو یہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کھانے پینے کی چیز میں اور اس جذبہ جنسی میں‘ ان دونوں میں‘ کیفیتیں یہ آ گئی ہیں کہ اضطراری حالت ہے‘ کھانے کو حلال نہ ملتا ہو‘ تو یہاں یہ کہا کہ یہ حرام چیز یہاں تک کھا لیجیے کہ جان بچ جائے مگر وہاں جذبہ جنسی میں کہا کہ اگر یہ حالت ہوتی ہو‘ تو ضبطِ نفس سے کام لینا ہوگا۔ اسی کو عفت کہتے ہیں۔ یہ آیت سورۃ نوح میں ہے۔ وہاں یہ نہیں کہا کہ پھر تمہیں اس حد تک اجازت ہے۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ قرآن ہے۔ عزیزانِ

من! یہ سوال ہی غلط ہے کہ اس تسکینِ جذبۂ جنس کے اندر یہ اضطراری حالت پیدا ہوتی ہے۔ وہ جسے کہتے ہیں کہ اس سے صاحب! بیماریاں پیدا ہوتی ہیں‘ وہ ہوتا یہ ہے‘ ضمناً عرض کردوں کہ اگر اس جذبے کو آپ خود بخود خیال ارادے سے‘ مشتعل کرتے رہے‘ پھر اس کی تسکین نہ ہو‘ تو اس کا اثر تو اعصاب پہ پڑتا ہے۔

جنسیات کے متعلق قرآن حکیم کی تعلیم انسانی صلاحیتوں کو مضمحل ہونے سے محفوظ رکھتی ہے

قرآنِ کریم وہ تعلیم دیتا ہے کہ اس سے ایک جو عفیف مرد اور عورت ہے‘ وہ اپنے اس جذبے کو‘ اپنے خیال اور ارادے سے‘ مشتعل ہی نہیں کرتے۔ اس لیے جنسی جذبے کی تسکین کی صورت میں اضطراری حالت پیدا نہیں ہوسکتی‘ قرآن نے کہا ہے کہ وہاں تم عفت سے کام لو‘ Self Control (ضبطِ خویش) کرو۔ کھانے پینے کا جو معاملہ ہے' اس میں انسان کے اپنے ارادے کا کنٹرول نہیں ہے۔ آپ کسی کام میں جذب بیٹھے ہوئے ہوں‘ منہمک ہوں‘ دنیا و مافیہا کا بھی کچھ علم نہ ہو' آپ کو پیاس از خود لگتی ہے‘ یہ نہیں ہے کہ آپ پانی پینے کا ارادہ کرتے ہیں‘ خیال کرتے ہیں‘ تو پیاس کا جذبہ ابھرتا ہے۔ پیاس کا تقاضا ابھرتا ہے‘ پیاس لگتی ہے' اگر آپ توجہ نہیں دیتے تو یہ اور تیز نہیں ہو جاتی ہے توجہ دیتے تو زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا نہیں ہے۔ پیاس میں شدت آتی ہے حتیٰ کہ وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ آپ کام نہیں کرسکتے‘ اس ٹائم اٹھ کر پانی کے لیے بھاگنا پڑتا ہے اور اگر یہ نہ کریں‘ آپ پانی نہ پئیں‘ اس کے بعد روکتے چلے جائیں‘ تو آپ بیمار ہو جائیں گے‘ آپ کی موت ہو جائے گی۔ اسے کہتے ہیں اضطراری حالت۔ جنسی جذبے کی تسکین میں یہ چیز کبھی نہیں پیدا ہوتی۔ یہ جذبہ آپ کے اپنے خیال کے تابع ابھرتا ہے۔ بھوک اور پیاس کی طرح طبعی طور پر از خود نہیں ابھرتا۔ اور قرآن چور کو نہیں‘ چور کی ماں کو مارتا ہے۔ پھر میری بیٹیاں کہیں گی‘ ماں کیوں کہتے ہو‘ باپ کیوں نہیں کہتے۔ ''اچھا جی چور دے پیؤ نوں کیوں نئیں ماردا[1]۔

جنسی توانائی کو محفوظ کرنے والی قوم‘ قوتِ آزادی میں بہت آگے نکل جاتی ہے

قرآن حکیم انسان کو ایسی تعلیم دیتا ہے کہ اس جذبے کے لیے تم اُدھر خیال ہی نہیں کرتے۔ خیال نہیں کرتے‘ ارادہ نہیں کرتے‘ جذبہ بیدار ہی نہیں ہوتا‘ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اگر خیال اور ارادے کے بغیر یہ جو جذبہ ہے‘ اسے آپ بیدار نہ کریں تو اس کے عدمِ تسکین سے یہ نہیں کہ کوئی بیماری نہیں ہوتی بلکہ اتنی توانائی پیدا ہوتی ہے‘ اس کی جو انتہا ہوتی ہے‘ وہ جو ملتی ہے‘ اس کو Psychology (نفسیات) میں Sublimation (تصعید) کہتے ہیں۔ یہ جو زائد توانائی پیدا ہوتی ہے‘ اس کو کسی اور تعمیری کام کی طرف آپ پھیر دیتے ہیں‘ اسے منتقل کر دیتے ہیں۔ اور یہ جو چیز ہے قرآن نے تو چودہ سوسال پیشتر کہی تھی۔ آج کے سائیکولوجسٹ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر جنسی جذبے کو

---

[1] اچھا جی! چور کے باپ کو کیوں نہیں مارتا۔

بیدار نہ کیا جائے اور یہ جواز خود جسم کے اندر پہنچ کر یہ توانائیاں ہیں' ان کو اگر تعمیری کاموں کی طرف منتقل کیا جائے' تو وہ قوم دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی ہے۔

جنسیات کے متعلق اہل یورپ کی تحقیق

عزیزانِ من! آپ حیران ہونگے کہ یہ کسی مسلمان کی تحقیق نہیں ہے خود انگلستان کے ڈاکٹر اَن وِن (Unwin) کی تحقیق ہے۔ اس کی کتاب "Sex & Culture" ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ جو قوم سیکس (جنس) کے معاملے میں' عفت کو Neglect (فراموش) کردیتی ہے' تو وہ قوم زیادہ سے زیادہ تین جنریشن تک اوپر جاسکتی ہے' اس کے بعد تنزل کی طرف آنی شروع ہوجاتی ہے۔ میں نے یہ بات ضمناً کہی ہے کہ اضطراری حالت کھانے پینے کے معاملے میں ہے' جس پہ انسان کو کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ جنسی جذبہ انسان کے اپنے کنٹرول کی چیز ہے۔ جو اپنے کنٹرول کی چیز ہے اس میں اضطراری صورت کے پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کہا ہے کہ **فَمَنِ اضۡطُرَّ غَیۡرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ** (2:173) پھر اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہوجائے کہ کھانے کے لیے اور کچھ نہ ملے' اور تم جان بچانے کے لیے مجبور ہوجاؤ' تو ایسی حالت میں ان چیزوں کو بھی کھا سکتے ہو جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے بشرطیکہ تم واقعی مجبور ہو جاؤ اور تمہاری نیّت قانون شکنی یا ہوس پروری کی نہ ہو۔ ویسی حالت میں ان چیزوں کے کھانے سے تمہاری ذات پر جو مضر اثرات مرتب ہونگے قانون کے احترام کا احساس تمہیں ان اثرات سے محفوظ رکھے گا اور تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما بدستور ہوتی رہے گی یعنی اس طرح سے وہ سامانِ حفاظت عطا کرے گا اور سامانِ نشوونما عطا کرے گا۔

ہمارے ہاں حرام وحلال کے سلسلہ میں مرتب کی جانے والی لسٹوں کی تفصیل اور ان کا مقصد

برادرانِ عزیز! اب یہ چیز ہوئی ہے کہ حرام کی' حلال کی' مکروہ کی' مکروہِ تنزیہی' مکروہِ تحریمی کی' لسٹوں پہ لسٹیں بن رہی ہیں' فہرستیں مرتب ہو رہی ہیں۔ اُدھر سے حلال کے مقابلے میں مستحب ہوتا ہے' پھر مباح ہوتا ہے۔ یہ ساری چیزیں ہیں لیکن جو قرآن میں کیا کہا گیا ہے' یہ کبھی سامنے نہیں آتا۔ کہا ہے کہ **اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ یَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۙ اُولٰٓئِکَ مَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ اِلَّا النَّارَ وَ لَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ لَا یُزَکِّیۡہِمۡ ۚۖ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ** (2:174)۔ یہ کیا کرتے ہیں؟ یہ کہ اللہ نے جو کتاب کے اندر نازل کیا تھا' وہ اس کو تو چھپا رکھتے ہیں' خود ساختہ فہرستوں کو شریعت بنا بنا کر سامنے لاتے ہیں۔ یہ کاہے کے لیے یہ کچھ کرتے ہیں؟ تاکہ ہم سے آکر فتویٰ مانگیں اور چار پیسے مل جائیں۔ یہ ہے **یَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا** (2:174)۔ اندازہ لگایئے۔

ثمنِ قلیل کا قرآنی مفہوم

یوں تو ہمارے ہاں، ویسے ہی فتوے کی قیمت ہی ثمنِ قلیل ہوتی ہے لیکن ثَمَنًا قَلِيْلًا (2:174) کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پھر زیادہ پیسے لینا جائز ہے۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ناجائز طریقے کے اوپر، جو کچھ بھی تم لو گے، وہ ثمنِ قلیل ہو گا اس کے مقابلے میں جو حلال اور طیّب طریقے سے لیا جائے۔ میں نے کہا تھا کہ وہ جو قرآن نے فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ (2:173) کہا ہے، عزیزانِ من! وہ یہ ہے کہ رزقِ حرام سے توانائیوں میں اثم پیدا ہو جاتا ہے۔ عربوں کے ہاں ناقة الاثمه اس اونٹنی کو کہتے تھے جو چلنے سے، تکان کی وجہ سے، اتنی مضمحل ہو جائے کہ اپنی قطار سے پیچھے رہ جائے۔ ہم کیا جانیں کہ رزقِ حلال کی قوتیں کیا ہوتی ہیں، جو اس سے آشنا ہی نہیں ہیں۔ فکری طور پہ جو آشنا[1] تھا، اس نے قرآن کی بات کہی تھی کہ

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی

رزقِ حلال کے مقابلے میں رزقِ حرام کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی

عزیزانِ من! یہ "پرواز میں کوتاہی آنا"، اثم کا ترجمہ ہے۔ کہا ہے کہ قانون شکنی کا ارادہ نہ ہو، حدود سے بڑھ جانے کی بات نہ ہو، جان تک بچا لینے کے لیے یہ ہو تو اس سے وہ اثم پیدا نہیں ہو گا، اللہ غفور اور رحیم ہے، وہ حفاظت کا سامان تمہارے لیے کر دے گا۔ وہ تو ساری بات اس پہ ہے کہ ایک تو یہ چیز ہو کہ رزقِ حلال و حرام میں تمیز ہی نہ ہو، پھر اس کے بعد یہ ہو کہ حرام کے اوپر لپک لپک کر پڑ رہا ہے، کچھ اضطراری حالت بھی نہیں ہے۔ "باغ" (2:173) کی کیفیت یہ ہے کہ ٹھیک ہے جی "ایس معاشرے اچ تے فیر ہو ہی نئیں سکدا انا آدمی بہت مشکل ہو گیا[2]"۔ یہ ٹھیک ہے کہ بڑی حد تک معاشرے کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے، یہ چیز ہو جاتی ہے لیکن کوئی چیزیں تو عدمِ ضرورت کی بنا پہ بھی ہو جاتی ہیں یعنی قانون کا احترام اٹھ جاتا ہے۔ باغ یہ ہوتا ہے۔ رزقِ حلال کی تو شاید کوئی حد ہوتی ہو گی اور عاد تو پھر یہ ہے کہ "اے حرامیاں دی حد ای کوئی نئیں ہوندی ہیگی[3]"۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ الھٰکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر (102:1-2) ایک دوسرے سے بڑھنے کی ریس چلی جا رہی ہے۔ عزیزانِ من! رزقِ حلال کے اندر تو بڑی محنت کرنا پڑتی ہے لیکن یہ کیفیت کہ محض تکاثر

---

1. یہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف اشارہ ہے۔
2. اس معاشرے میں تو آدمی پھر یہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ کچھ ہونا تو بہت ہی مشکل ہو چکا ہے۔
3. حرام پنے کی تو پھر کوئی حد ہی نہیں ہوتی۔

کی خاطر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن نے وَّ لَا عَادٍ (2:173) کہہ کر کیا بات کہہ دی کہ یہ نہ ہو کہ پھر اس کے اندر آپ کو جو یہ رزقِ حرام کی چاشنی یا لذت پڑی ہے' اس کے لیے دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر یہ لوگ جو چھپاتے ہیں جو کچھ خدا نے قرآن میں نازل کیا ہے' اس لیے کہ محض دو ٹکے ان کو مل جائیں' ان سے کہہ دو کہ یہ جو رزق کھا رہے ہیں' اپنے پیٹ کو آگ سے بھر رہے ہیں۔ یہ قرآن کی اصطلاح ہے۔ کسی دوسرے وقت جب جہنم آئے گی تو میں عرض کروں گا کہ قرآن اس سے کیا مفہوم لیتا ہے۔ ٹھیک ہے' یہ کچھ کر لیں' اس طرح سے چھپالیں لوگوں پہ یہ پابندیاں عائد کرتے چلے جائیں۔

حیوان کے نزدیک حرام اور حلال کی اقدار کا تصور تک نہیں ہوتا

محاورے میں جسے کہتے ہیں کہ اللہ کے سامنے جاؤ گے تو وہ رخ پھیر لے گا' تم سے بات نہیں کرے گا۔ اصل چیز وَ لَا يُزَكِّيهِمْ (2:174) ہے یعنی انسانی ذات کی نشو ونما رک جائے گی' وہ حیوانی سطح کے اوپر زندگی بسر کریں گے۔ عزیزانِ من! حیوان میں حرام اور حلال کی تمیز نہیں ہوتی' اس کے سامنے صرف طبعی تقاضا ہوتا ہے۔ بیل گھر سے باہر جاتا ہے' اسے بھوک لگتی ہے' جو کھیت سامنے آتا ہے وہ اس سے چر لیتا ہے۔ دائیں ہاتھ پہ اپنے مالک کا کھیت ہو' بائیں پہ غیر کا کھیت ہو' اسے اس کی تمیز نہیں ہوتی کہ میں اپنے مالک کے کھیت سے چروں۔ وہ دونوں طرف منہ مار دیتا ہے اور مجرم نہیں قرار پاتا' اس لیے کہ Values (اقدار) کی Sense (تمیز) انسانیت کی سطح پر آتی ہے۔ یہ Value (قدر) ہے کہ یہ حلال ہے' یہ حرام ہے' یہ جائز ہے اور یہ ناجائز ہے۔ آپ کے جسم کی پرورش تو ہو جائے گی' کسی طریقے سے بھی آپ یہ چیز کیوں نہ لے لیں۔ پیٹ بھرنے کے لیے چوری کے پیسے کا گھی ہو یا حلال طیّب کمائی کا ہو' اس میں گھی کی طبعی خصوصیات نہیں بدلتیں۔ ''حرام والے تے سگوں ہور موٹے ہوندے جاندے نیں۔ خورے ایس گھیوُ اچ کی ہونداا ے [1]''۔ یہ ٹھیک ہے کہ محنت نہیں کرنا پڑتی مگر چوری کے گھی اور حلال وطیّب گھی کے Physical Contents (طبعی اجزا) میں' طبعی طور پہ' کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ جو يُزَكِّيهِمْ (2:174) کہا ہے اس میں یہ نہیں ہے کہ مثلاً چوری کے گھی سے تمہارے جسم کی پرورش رک جائے گی۔ اس کے علاوہ انسانی سطح کے اوپر ایک اور شے بھی ہے' جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔ مقصدِ حیات تو اِس انسانی ذات کی نشو ونما ہے۔ جسم کی نشو ونما تو ہر قسم کے رزق سے ہو جائے گی لیکن انسانی ذات کی نشو ونما صرف رزقِ حلال سے ہو سکتی ہے۔

ہم صرف فتوؤں کو ہی نہیں بیچتے بلکہ اس کے ساتھ ہدایت یعنی صراطِ مستقیم کو بھی بیچتے ہیں

برادرانِ عزیز! یہاں انسانی ذات کی نشو ونما میں Values (اقدار) آ گئیں۔ کہا ہے کہ وَ لَا يُزَكِّيهِمْ (2:173) یہ ٹھیک ہے

---

[1] حرام کھانے والے تو اور بھی زیادہ پنپتے چلے جاتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ اس گھی میں کیا ہوتا ہے۔

کہ اس سے یہ پیسے بٹور لیتے ہیں' مگر وہاں جا کر ان کا جسم اور ان کی توند تو دیکھو۔ یہ وَ لَا یُزَکِّیۡهِمۡ آیا ہے۔ سنو! اس سے انسانیت کی نشوونما نہیں ہوسکتی۔ کہا ہے کہ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ o اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰی وَ الۡعَذَابَ بِالۡمَغۡفِرَةِ فَمَآ اَصۡبَرَهُمۡ عَلَی النَّارِ (2:174-75) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے فتویٰ ہی نہیں بیچا' ہدایت کے راستے کو بیچ کر گمراہیوں کے راستے کو اختیار کر لیا۔ خدا کی پناہ! انہوں نے اس ہدایت کے راستے کو بیچ دیا' تباہیاں مول لے لیں۔ کیا انداز ہے قرآن کا! کہا کہ ان کی جرأتیں دیکھو' کتنی بے باک ہیں! سیلاب آ رہا ہے اس کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں' زلزلہ آ رہا ہے رک نہیں رہے' بڑے بے باک ہیں لیکن کیا یہ سیلاب اور زلزلہ ان کو چھوڑ دے گا؟ نہیں' کبھی نہیں۔ کہا کہ ان کی یہ حالت کیوں ہوئی؟ یہ اس لیے کہ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ (2:176) خدا نے تو کتاب' حق پر مبنی' نازل کی تھی' اس کے مطابق یہ کچھ کرتے تو کبھی معاشرے میں یا افراد کے اندر یہ صورت پیدا نہ ہوتی لیکن وَ اِنَّ الَّذِیۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِی الۡکِتٰبِ لَفِیۡ شِقَاقٍۭ بَعِیۡدٍ (2:176) جب وہ کتاب میں اختلاف کر کے' انسانوں کے خود ساختہ فیصلوں کو شریعت بنا لیں' تو پھر تو وہ اصل مقصد سے دور ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد کیفیت وہ ہو جاتی ہے جو صدیوں سے ہماری چلی آ رہی ہے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ البقرۃ کی آیت 176 تک آ گئے' 177 ویں آیت سے اگلے درس میں لیں گے اور وہاں پھر بڑی اہم چیز شروع ہو جائے گی کہ اس طرح سے' اس سارے رزقِ حرام سے' یہ سارا کچھ اکٹھا کرتے چلے جانا' اور پھر یہ سمجھنا کہ ٹھیک ہے' یہاں اگر ایک مسجد بنوا دی جائے' تو پھر جنت میں ایک موتیوں کا گھر ملتا ہے اگر قالین بچھا دیا جائے تو پھر گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ''اگر بہت ہی زیادہ چنبڑ جان تے جا کے کعبے اچ زم زم دے پانی نال دھولیا جائے' گل بن جاندی اے [1] ''۔ اس رزقِ حلال وطیّب کے بعد وہ یہ کہتا ہے کہ اب یہ بات بھی سمجھ لو کہ یہ جو اتنی سی چیزیں ہیں' ان کے کر لینے سے پھر یہ سب کچھ ہو جاتا ہے' ایسا نہیں ہے۔ اگلی آیت اس عظیم حقیقت کو سامنے لائے گی' اس لیے اسے ہم آئندہ کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

---

[1] اگر بہت زیادہ گناہ چمٹ جائیں تو کعبہ جا کر آبِ زم زم سے دھو لیا' تو بس بات بن جاتی ہے۔

اڑتیسواں باب: سورة البقرة (2)' (آیات 177 تا 179)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ
الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِکَۃِ وَالۡکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنَ
وَابۡنَ السَّبِیۡلِ ۙ وَالسَّآئِلِیۡنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَہۡدِہِمۡ
اِذَا عٰہَدُوۡا ۚ وَالصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا ؕ
وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۷﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی ؕ اَلۡحُرُّ بِالۡحُرِّ
وَالۡعَبۡدُ بِالۡعَبۡدِ وَالۡاُنۡثٰی بِالۡاُنۡثٰی ؕ فَمَنۡ عُفِیَ لَہٗ مِنۡ اَخِیۡہِ شَیۡءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَیۡہِ
بِاِحۡسَانٍ ؕ ذٰلِکَ تَخۡفِیۡفٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَرَحۡمَۃٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰی بَعۡدَ ذٰلِکَ فَلَہٗ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَکُمۡ
فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۹﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1969ء کی 23 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ البقرۃ کی آیت 177 سے ہوتا ہے: (2:177)۔

حرام وحلال کا معاملہ تمام مذاہب میں کچھ فرق کے ساتھ مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے

سابقہ آیات میں حرام اور حلال کے متعلق تفصیلات سامنے لائی گئی تھیں۔ یہ چیزیں دنیا کے تمام مذاہب میں ہیں' تفاصیل میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن حرام اور حلال کی چیزیں' اس قسم کی جزئیات' تمام مذاہب میں ہیں۔ یہاں سے یہ نظر آیا کہ یہ بھی وہ مشترکہ اقدار ہیں' جو مذہب میں اور دین میں پائی جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دین میں بھی جزئیات ہوتی ہیں لیکن جونہی یہ جزئیات اور فروعات سامنے آئیں' قرآنِ کریم نے ایک ہی سانس میں یہ بتادیا کہ مذہب اور دین میں کیا فرق ہوتا ہے؟

عملی نتائج کے سلسلہ میں دین اور مذہب میں ایک بنیادی فرق

مذہب میں یہ جزئیات وتفاصیل مقصود بالذات ہو جاتی ہیں۔ان رسومات اور مظاہر کو جن شکلوں کے اندر کسی ایک اصول کے لیے سامنے لایا جاتا ہے' تو صرف یہ مقصود بالذات ہوتی ہیں لیکن دین میں یہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہیں۔اگر وہ مقصد سامنے نہیں ہے' اگر یہ اس کے حصول کا ذریعہ نہیں بن رہیں' تو وہیں یہ سوچنے کے لیے کھڑے ہو جانا پڑتا ہے کہ کہیں کوئی غلطی ہو رہی ہے۔یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں' یہ کچھ Mechanically (میکانکی طور پر) ہو رہا ہے' اس کا نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا۔ہم نے یہ ساری لکڑیاں اکٹھی کی ہوئی ہیں' یہ خشک لکڑیاں ہیں' سردی بھی بہت ہے' لکڑیوں کے گرد الاؤ تاپنے کے لیے بیٹھے بھی ہیں۔سردی کم نہیں ہو رہی' گرمی نہیں پہنچ رہی۔دیکھنا یہ پڑتا ہے کہ کمی کیا ہے؟ ماچس نہیں ہے' سوزِ اندروں باقی نہیں ہے' لکڑیاں جل نہیں رہیں۔لکڑیاں مقصود بالذات نہیں ہیں' لکڑیاں حرارت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔مذہب صرف خشک لکڑیوں کو کھڑا کر دیتا ہے' کہتا ہے کہ اس کے گرد آ کر بیٹھ جایا کرو' تمہاری سردی کم ہو جائے گی۔کہا جاتا ہے کہ بیٹھتے ہیں' سردی نہیں ہٹتی۔کہتا ہے کہ بیٹھتے رہو' یہاں نہیں ہٹتی تو وہاں آخرت میں' مرنے کے بعد جا کر ہٹے گی۔''جہنم اچ جاکے تے ہٹے گی [1] ''۔دین وہیں کھڑا کر دیتا ہے کہ اگر سردی کم نہیں ہو رہی ہے تو کہیں غلطی ہو رہی ہے' سوچو! کہاں غلطی ہو رہی ہے۔اس کا معیار' نتیجہ ہوتا ہے' اس کا ٹیسٹ Pragmatic (استنتاجی) ہوتا ہے' وہ کر کے بتاتا ہے' نتیجہ نکالتا ہے۔یہ نتیجہ اس کے دعوے کی صداقت کا ثبوت بن جاتا ہے۔یہ ہے دین۔

برادرانِ عزیز! جونہی قرآن نے پیچھے سے یہ جزئیات فروعات یا وہ چیزیں جو مذاہب کے اندر مشترک ہوتی ہیں' جسے میں نے کہا ہے کہ حلال وحرام کی چیز ہے' وہ تو کہیں بھی آپ کسی مذہب میں دیکھیے' تو آپ یہ ضرور کہیں گے کہ ہم یہ نہیں کھا سکتے۔یہ چیزیں دینے کے بعد' وہ فوراً کہتا ہے اور یہ قرآنِ کریم کی عظیم آیت ہے جو دین کو مذہب سے الگ کر کے بتاتی ہے اور جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ مذہب کے اسٹیج پہ یہ کھڑا ہوتا ہے' دین مذہب کے خلاف چیلنج دیتا ہے۔اور یہ کہتا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177) کہیں اسی کو نیکی نہ سمجھ لینا' اپنے ذہن میں تم یہی کشادکی راہ نہ سمجھ لینا کہ مشرق کی طرف منہ کر لیا یا مغرب کی طرف منہ کر لیا۔آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کتنا بڑا چیلنج ہے۔یوں نظر آتا ہے کہ جیسے ایک Atheist (دہریہ) یہ کہہ رہا ہے کہ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ نمازیں پڑھتے رہتے ہو کہ صاحب! منہ طرف قبلہ شریف کیا اور یوں کھڑے ہو گئے یعنی بظاہر یوں نظر آ رہا ہے۔کتنی بڑی چیز ہے! یہ کتنا بڑا اعلان ہے کہ مذہب کی اسٹیج پہ کھڑے ہو کر جو مذہب سے کہہ رہا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ

---

[1] جہنم میں جا کر تو ہٹے گی۔

وَالْمَغْرِبِ (2:177) قانونِ خداوندی کی رو سے وسعت وکشاد کی راہ جس سے انسان معیار خداوندی پہ پورا اترتا ہے یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔

مذہب میں صرف ارکان کی صحیح ادائیگی کو ہی مقصود بالذات سمجھ لیا جاتا ہے جبکہ دین میں ایسا نہیں

دراصل مذہب میں سارا زور اس پہ دیا جاتا ہے کہ رخ کی جو سمت ہے' یہ جو جزئیات ہیں' یہ جنہیں ہم اپنے اپنے ارکان کہتے ہیں' وہ صحیح انداز کے مطابق طے ہو رہے ہیں یا نہیں؟ مثلاً یہ کہ ہاتھ کہاں بندھا ہے؟ کہاں تک اٹھ رہا ہے؟ پاؤں کے درمیان کا فاصلہ کتنا ہے؟ رکوع میں زاویہ کیا بنتا ہے؟ سجدے میں وہ پانچوں چیزیں زمین پہ ٹکتی ہیں یا نہیں؟ پھر اس سے ذرا اور آگے بڑھ جایئے۔ الفاظ صحیح مخرج سے نکل رہے ہیں یا نہیں؟ یہ ساری چیزیں ہیں مگر یہ ہے کہ لفظ کے معنی نہیں سمجھے جاتے' لیکن مخرج سے صحیح نکلنے چاہئیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ زبان کے لیے تلفظ کا صحیح ہونا ضروری ہے لیکن یہ ساری چیزیں تو اس لیے تھیں کہ الفاظ کے کچھ معنی ہوتے ہیں' الفاظ تو معنی کے پیکر ہوتے ہیں۔ اگر اس کے اندر یہی چیز نہیں ہے تو یوں سمجھو کہ صدف ہے اور بغیر گوہر کے ہے" بادام اے بغیر گری دے [1] "۔ اس چھلکے کا ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے اندر وہ گری Preserve (محفوظ) رہتی ہے۔ اگر وہ چھلکا نہایت محکم مستحکم رہے مگر اس کے اندر گری نہیں ہے تو اس چھلکے کا کیا فائدہ۔ یہ چھلکا مقصود بالذات نہیں ہے' مقصود اس نظام کا قیام ہے عزیزانِ من! جونہی یہ حلال وحرام کی چیز سامنے آئی یہ کہتے ہیں صاحب! کہ قرآن کی ترتیب نہیں ہے مگر میں اقبالؒ (1938-1877ء) کی ہمنوائی میں کہتا ہوں کہ

محرم نہیں ہے تُو ہی نوا ہائے راز کا

اس میں ترتیب تو ایسی سمجھ میں آتی ہے کہ میں اس ترتیب سے وجد میں آ جاتا ہوں۔

قرآن حکیم کا یہ خاصہ ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک موتیوں کی لڑی کی طرح باہمی ربط ہے

یہ کتاب اس خدا نے لکھی ہے' منتشر اشعار نہیں لکھے ہیں' غزل نہیں ہے کہ جس کا ایک شعر تو وصال کی لذتیں دیتا ہے' دوسرا فراق کے نوحے گا رہا ہے۔ اس کے اندر یہاں سے وہاں تک ایک تسلسل ہے۔ اور یہاں دیکھیے کہ نگاہ ادھر جاتی تھی کہ یہ وہی چیزیں ہیں جو مذاہب میں پائی جاتی ہیں کہ یہ نہ کھاؤ' یہ کھاؤ' یہ اس طرح سے کھاؤ۔ یہ کچھ یہاں تک ہم پہنچے' پہنچنے کے فوری بعد اگلی چیز آتی ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177) کہیں اس فریب میں مبتلا نہ ہو جانا کہ مقصود بالذات یہ جزئیات ہیں' یہ رسوم ہیں' یہ ارکان ہے۔ مقصود بالذات وہ اصل مدعا' مقصد' منزل' نتیجہ ہے' جس تک پہنچانے کا یہ ذریعہ ہے' مشرق یا مغرب کی طرف منہ

---

[1] بادام ہے مگر بغیر گری کے ہے۔

کرنا نہیں۔ سفر کرنے والے کے لیے ٹکٹ نہایت ضروری ہے۔ ٹکٹ خرید کر گھر میں بیٹھ جایئے' اسے جیب میں ڈال لیجیے' مکے نہیں پہنچ سکتے۔ یہ ذرائع (Means) اور مقصود (Ends) میں فرق کر کے دکھا دینا' یہ ہے قرآن کا اعجاز۔ کہا ہے کہ **لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ** (2:177) کشادگی راہ یہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرنا نہیں ہے۔ پھر بر کا لفظ آیا ہے جیسا میں نے کہا ہے آپ دیکھیے' ہمارے ہاں تو ایک ہی لفظ ہے جسے ہم نیکی کہتے ہیں۔ اور پھر وہ نیکی کا مفہوم آپ کو معلوم ہے۔ پہلی نیکی تو وہ ہے جو ماں بچے کو جس سے ڈرایا کرتی ہے'' آئی نیکی' او آیا بھاگ''۔ ذرا اونچے اٹھتے ہیں تو'' اینوں اینی اللہ دی نیکی ہے کوئی۔ آ نیکی ویکھدے او کتھے کتھے تری جاندی اے [1]''۔ اور آگے بڑھ جایئے تو صحیح معنی میں وہ آتا ہے جسے آپ کہتے ہیں کہ بڑا نیک آدمی ہے۔ اور آپ کو یہ معلوم ہے کہ پھر اس سے تصور کیسا سامنے آتا ہے۔

رسومات میں الجھ کر رہ جانے والا شخص تنگ نظری کا شکار ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! نیکی تو عربی کا لفظ ہی نہیں ہے یہاں بِر ہے یعنی وسعتیں' کشادگی اور زندگی کی وسعتیں ہی تو اصل شے ہے۔ اس کے لیے دوسرا لفظ خیر آتا ہے۔ جیسا میں نے کہا ہے کہ خیر کا مادہ (Root) تو وہی ہے جو'' اختیار'' کا ہے۔ یہ انسانی اختیارات کی وسعتیں ہیں۔ یہاں اس کو بر کہا ہے۔ زندگی کی کشادگی کی راہ یہ نہیں ہے کہ تم ان رسومات کے الجھاؤ میں الجھ جاؤ۔ اگر صرف انہی میں الجھے رہو' زندگی تو ان کے اندر سمٹ جاتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ کتنے ہی لوگ انہی چیزوں کو مقصود بالذات سمجھے ہوئے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کتنے تنگ نظر ہوتے ہیں' ان کے اندر گھٹن ہوتی ہیں' ان کے ظرف کے اندر کشادگی نہیں ہوتی۔ آپ کے پاؤں میں ذرا سا فاصلہ کم ہو' اس کے بعد دیکھیے کہ اس مسجد سے کس قسم کی پھر آپ کے خلاف آوازیں اٹھتی ہیں جو کفر تک جا کر منتج ہوتی ہیں۔ کئی نماز پڑھنے والے میرے ذہن میں ہے کہ انہوں نے مسجد میں جانا چھوڑ دیا۔ ایک عزیز ترین دوست کے ساتھ کیا ہوا؟ یہ کہ مسجد میں وہ کھڑے تھے۔ نماز میں کھڑے ہو گئے' جو ساتھ کھڑا تھا اس نے نیت توڑی' جھٹ سے نیچے بیٹھا۔ وہ اس کی پتلون ٹخنے سے ذرا نیچے تھی' جلدی سے اس کو یوں یوں لپیٹ کر اس پتلون کی نیکر بنایا اور اس کے بعد پھر' اللہ اکبر کہہ کر' کھڑا ہو گیا۔ اپنے ذہن میں سمجھتا ہو گا'' پتہ نئیں کنا تیر ماریا جناب [2]''۔ تیر وہ تھا کہ اس کے بعد ہمارے وہ دوست پھر مسجد میں نہیں گئے۔

برادرانِ عزیز! یہاں وہ بِر کہتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ جب آپ ان چیزوں میں الجھ کر انہی کو مقصود بالذات بنا لیتے ہیں تو تنگ نظری

---

[1] اسے اللہ کی کوئی اتنی نیکی ہے۔ آپ یہ نیکی دیکھتے ہیں کہ کتنی آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

[2] اپنے ذہن میں سمجھتا ہو گا کہ جناب! کتنا بڑا نیکی کا کام کیا ہے۔

کتنی پیدا ہوتی ہے۔آپ کی ساری لڑائیاں اس پہ ہو رہی ہیں کہ ہاتھ کہاں باندھنا چاہیے' کہاں کھولنا چاہیے۔سر پھٹول ہو رہی ہے' مسجدوں پہ تالے پڑ رہے ہیں'پولیس میں رپورٹیں ہو رہی ہیں۔کس بات کے اوپر یہ سب کچھ ہو رہا ہے؟ کہ جی!اس مسجد میں یہ آ گیا جس نے رکوع میں جانے سے پہلے کانوں تک ہاتھ نہیں اٹھائے۔نفرت'انتقام'تنگ نظری یہ ساری چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔اس سے آپ نے دیکھا قرآن نے بــر کا لفظ یہاں کیوں استعمال کیا ہے؟ یہ زندگی کی وسعتیں'نگاہ میں کشادگیاں'مذہب کی جزئیات کی تنگ ناؤں میں گھر کر پیدا نہیں ہو سکتیں۔آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی۔زندگی کی وسعتیں ہوں تو پھر یہ نہ سمجھ لو کہ یہ چیزیں مقصود بالذات ہیں۔جیسا میں کہا کرتا ہوں یہ بھی نہ سمجھ لیجیے کہ ان کی اہمیت نہیں ہے۔وہ جو میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ فوج کے اندر سپاہی کے لیے تو یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس کے بوٹ کے تسمے صحیح طریق کے اوپر بندھے ہوئے ہیں یا نہیں؟اس کی پیٹی ٹھیک جگہ لگی ہوئی ہے یا نہیں؟ ڈسپلن کا یہ قاعدہ ہے لیکن ڈسپلن تو ایک نظم کے اندر ہے۔اس نظم سے باہر ہونے کے بعد جب وہ فوج کا سپاہی نہیں' ریٹائر ہونے کے بعد گاؤں میں چلا گیا' وہ وردی بھی گھر میں لے جائے۔نہایت ٹھیک طریقے کے اوپر اسی طرح سے وہ بوٹ کے تسمے باندھے' پیٹی بھی وہاں رکھے' اسی طرح سے استری کی ہوئی وردی بھی ہو' بندوق ہاں نہیں ہے تو چلو ڈنڈا ہی سہی' وہی ہاتھ میں لے لیا۔اور اس کے بعد صبح اٹھ کر گاؤں کی گلی کے اندر لیفٹ رائٹ کرتا ہوا وہ چلا آئے اور یہ سمجھے کہ وہ جتنا کام فوج کے اندر کرتا تھا' وہ سارا پورا ہو گیا ہے' اب دشمن ادھر کا رخ نہیں کر سکتا سوچیے کہ یہ کتنا غلط ہے۔

قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ نظم وضبط' قرآنی ضابطہ حیات کو عملاً متشکل کرنے کی ترغیب کے لیے ہے

کہا ہے کہ لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ(2:177)۔اہمیت تو اتنی ہے کہ جہاں کہیں بھی تم ہو' اپنا رخ کعبے کی طرف کرو۔یہ بھی ایک طرف حکم ہے۔عزیزانِ من!یہ عجیب کتاب ہے۔کہا ہے کہ اس نظم وضبط اور ڈسپلن کی اہمیت کم نہ ہو جائے۔ابھی وہ حکم آتا ہے۔کہیں اسی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لو۔اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ یاد رکھو!اتنی سی جو بات ہے یہی بر و تقویٰ کی' یہی کشادگی' یہی وسعت کی راہ نہیں ہے کہ یہ کچھ کرو۔اب آگے بات آئی۔وہ کچھ اور پھر ہے کیا؟ یہ ٹھیک ہے کہ حلال وحرام کی تمیز بھی نہایت ضروری ہے۔اصل شے کیا ہے؟اب اس کے بعد دیکھیے وہ چیز آتی ہے۔پہلی چیز تو اس کے اندر آتی ہے جسے آپ آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔قرآن اسے ایمان کہہ کر پکارتا ہے۔کہا ہے کہ وَ لٰكِنَّ الۡبِرَّ (2:177)۔اس پوری آیت میں' یہ پروگرام دیا گیا ہے۔پہلے اس کا وہ حصہ دیکھیے جسے مکان کی بنیاد کہتے ہیں۔

قرآن حکیم کے نزدیک ایمان کی تعریف کیا ہے؟اور پھر یہ کہ ایمان لانے کا طریق کیا ہوگا؟

قرآن کی رو سے اعمال کی عمارت کی بنیاد ایمان ہے۔ہم ایمان کی بات بھی آج نہیں سمجھ سکتے۔عام طور پہ اعتراض ہوتے ہیں۔

میرے پاس تو روز لوگ آتے رہتے ہیں' وہ نوجوان سچے بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں صاحب! ایک شخص خدا کو مانتا ہے' ایک شخص خدا کو تو نہیں مانتا لیکن تمام نیکی کے کام کرتا ہے' خیرات دیتا ہے' لوگوں کی بھلائی کے کام کرتا ہے وہ دیکھیے! گنگا رام (1927-1851ء) نے ہسپتال بنا دیا' فلاں نے یہ کر دیا' یہ بتایئے کہ یہ نیکی ہے یا نہیں؟ اچھا جی۔ نیکی ہے تو بتایئے پھر اس کے درمیان وہ ایمان کہاں آیا؟۔ ٹھیک ہے کہ ایمان اگر یہی چیز ہے کہ ایک نے زبان سے کہہ دیا کہ خدا ہے' دوسرے نے کہہ دیا کہ خدا نہیں ہے' اس سے تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ان آیات میں' میں آؤں گا تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے خود کہا ہے کہ ان لوگوں سے پوچھیے: زمین و آسمان کو کس نے بنایا؟ کہیں گے: خدا نے بنایا۔ پوچھیے کہ باہر یہ جتنی فطرت کے قوانین کی قوتیں چل رہی ہیں' یہ کس کی رو سے ہے؟ وہ کہیں گے: خدا کی ہے۔ یعنی وہ یہاں تک خدا کا اقرار کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد انہی آیات میں قرآن کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ پھر خدا پہ ایمان کیوں نہیں لاتے ہو؟ یعنی وہ جو ہم نے ترجمہ کر لیا ہے کہ کہہ دینا کہ خدا ہے' عزیزانِ من! یہ نہیں ہے' ایمان کچھ اس سے آگے کی چیز ہے۔ اور وہ ہے اصل و بنیاد' واقعی اس کے بغیر اوپر اٹھی ہوئی عمارت صحیح چلتی نہیں ہے' اعمال اعمالِ صالحہ نہیں ہوتے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے؟ کوئی سائنٹسٹ اپنی لیبارٹری میں کسی فارمولے پر عمل نہیں کر سکتا' کوئی نتیجہ نہیں مرتب کر سکتا' جب تک وہ سائنس کے Basic (بنیادی) اصولوں کی صداقت پہ ایمان نہ رکھے۔ یہ ہے ایمان کے معنی۔ فارمولے پہ جو اس کا یقین ہے' وہ اسے اس محکم مشقت کی طرف لے جاتا ہے۔ کتنے دن کیوں نہ لگ جائیں اس کے لیے وہ چلا جا رہا ہے۔ کہہ رہے ہیں دوسرے کہ صاحب! صبح سے شام تک تم لگے ہوئے ہو' اس میں تو کچھ نہیں نکلتا۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں کہیں غلطی ہوئی ہے۔ یہ ہو کر رہے گا' میں کہیں غلطی کر رہا ہوں۔ بھئی! کیسے کہہ رہے ہو تم کہ میں غلطی کر رہا ہوں؟ کہتا ہے کہ یہ جو فارمولا میرے پاس ہے' اس کی صداقت پر مجھے یقین ہے۔ یہ Faith (عقیدہ) نہیں ہے' یہ Conviction (ایمان) ہے۔ اور یہی ایک یقین ہے جو اس کو لیے چلا جا رہا ہے۔ ایک بحرِ بے کنار ہے' سمندر ہے۔

کسی منزل کی صحیح ڈائریکشن کے لیے ایک گائیڈ کرنے والے پر ایمان لانا ضروری قرار پاتا ہے

ہم میں سے جنہوں نے سمندر کو ساحل پہ دیکھا ہے' ہم تصور نہیں کر سکتے کہ اور آگے جا کر ساحل کہیں نظر ہی نہیں آتا' کوئی سمندر کا کنارہ نظر نہیں آتا' میلوں تک نگاہ دوڑایئے ادھر دائیں بائیں آگے پیچھے کوئی کنارہ نہیں ہوتا' بالکل سمندر ہے۔ اس میں جہاز چلا جا رہا ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ جہاز ٹھیک سیدھا اس راستے پہ چل کر اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ کیا چیز ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ منزل پہ پہنچتا ہے؟ ایک قطب نما' اس کیپٹن کے سامنے لٹکا ہوا ہوتا ہے' وہ وہاں اپنے کیبن میں بیٹھا ہوا اس پہ نگاہ کیے ہوئے ہے' وہاں سے ڈائریکشن (ہدایات) دیتا چلا جاتا ہے: ذرا دائیں کو' ذرا بائیں کو اور وہ یہ کچھ کرتا چلا جاتا ہے اس طرح سے وہ جہاز سیدھا ٹھیک منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ کس چیز سے ہوتا ہے؟ اس سے کہ اسے اس اتنے سے آلے کی صحت پہ یقین ہوتا ہے کہ یہ مجھے صحیح راہنمائی دے رہا ہے۔

وہ تو پھر بھی دور کی بات ہے' یہ ہمارے ہاں جو ہوائی جہاز اڑتا ہے' اوپر جانے کے بعد اس کے سامنے نہ لندن ہوتا ہے' نہ نیویارک ہوتا ہے' نہ پیچھے لاہور ہوتا ہے۔ بے کنار فضا ہے جس میں کہیں کسی باؤنڈری کا سوال ہی نہیں ہے کہ کسی بھی قسم کا کوئی نشان ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح سے یہاں سے اڑتا ہے اور ٹھیک وقت پر اور ٹھیک راستوں سے' اپنی صحیح منزل پر پہنچتا ہے۔ یہ اس کے پاس کیا چیز ہے؟ اس کے پاس بھی یہی ایک آلہ ہوتا ہے۔ اگر اسے اس آلے کی صحت کا یقین نہ رہے تو پھر آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد نہ انجن بمانند' نہ انجینئر' قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ جو اپنے سامنے کے آلے (Instrument) کی صحت پر یقین ہے' اسے ایمان کہتے ہیں کہ یہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے مجھے صحیح راہنمائی دے گا' اسے ایمان کہتے ہیں' یہ آئیڈیالوجی ہوتی ہے۔

قرآن حکیم کی طرف سے ملنے والی آئیڈیالوجی' آسمان پر چمکنے والے ستاروں کی طرح' کبھی دھوکا نہیں دیتی

اس ایمان کی' اس آئیڈیالوجی کی بنیاد یہ ہے کہ یہ جو ہدایت' راہنمائی مجھے مل رہی ہے' یہ مرغ بادنما کی Guidance (راہ نمائی) نہیں ہے کہ ابھی میں نے دیکھا کہ اس نے رخ اِدھر کیا ہوا تھا' دو منٹ کے بعد دیکھتا ہوں تو رُخ اُدھر ہے۔ یہ کیا ہوا؟ کہ جی! ہوا کے ساتھ اس کا رخ بدل رہا ہے۔ مجھے یہ جو Guidance (راہ نمائی) مل رہی ہے' یہ مرغ بادنما نہیں ہے' یہ ہوا کے ساتھ نہیں بدلے گا' یہ کبھی دھوکا نہیں کرے گا۔ یہ **فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا** (2:256) ہے۔ جو قوم غیر خداوندی نظام سے منہ موڑ کر اس نظام کی صداقت پر ایمان لے آئے گی' وہ اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنالے تو سمجھ لو کہ اس نے ایسے محکم سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ قرآن نے **لَا انْفِصَامَ لَهَا** (2:257) کہا ہے کہ ایمان وہ محکم رسی ہے جس نے اسے تھام لیا' یہ کبھی دھوکا نہیں دے گی' کبھی ٹوٹے گی نہیں۔

قرآنی آئیڈیالوجی سے ثمر بار ہونے کے لیے حق پر مبنی طرق و اسالیب کو قرآن حکیم نے اعمالِ صالحہ کہا ہے

عزیزانِ من! ایمان اسے کہتے ہیں۔ یہ جسے آپ فطرت کے قوانین' پر ایمان کہتے ہیں' جو آپ کے ہاں تمام Scientific Discoveries (سائنسی انکشافات) کی بنیاد ہے وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ یہ جو قوانین ہیں' اٹل ہیں' غیر متبدل ہیں' کبھی دھوکا نہیں دیں گے۔ یہ آپ کا اس بات کے اوپر ایمان ہے کہ صبح سوئی گیس کو جب میں نے ماچس دکھائی' میں نے اس کے اوپر دیگچی رکھی' پانچ منٹ کے اندر پانی کھولے گا۔ کس اطمینان سے آپ اس پہ وہ دیگچی رکھ کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں' ٹھیک پانچ منٹ کے بعد دیکھتے ہیں کہ پانی کھول رہا ہوتا ہے۔ اسے ایمان کہتے ہیں۔ قانون کے اٹل' غیر متبدل' یقینی ہونے کی جو Conviction ہے' وہ ایمان ہوتی ہے۔ اس کے بغیر کسی عمل کے لیے آپ کا قدم اٹھ ہی نہیں سکتا۔ اور اگر آپ اٹھائیں گے بھی تو وہ یہ سارا کچھ **حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (9:17) کرتے جائیے۔ آپ کے ہاں انگیٹھی بھی ہو' دیگچی بھی رکھ دیجیے' پانی بھی ڈال دیجیے' یہ سارا کچھ ہو' اس کے اندر سوئی گیس نہیں ہے۔

لکڑیاں بھی رکھ دی ہیں' آپ کے ہاں ماچس نہیں ہے۔ اسے حبطِ اعمال کہتے ہیں۔ اب آپ نے دیکھا کہ اعمال کی کتنی اہمیت ہے۔ اس Conviction (یقین) کے بغیر تو آپ ایک قدم آگے نہیں اٹھا سکتے۔ راستہ بھولے ہوئے مسافر سے پوچھیے کہ شام کو تکان کے سوا اس کے حصے میں کیا آتا ہے' ہوسکتا ہے کہ وہ صبح کی نسبت شام کو منزل سے دوگنا دور ہو۔ یہ ہے ایمان کہ خدا کی راہنمائی پر یہ Conviction (یقین) ہے کہ یہ مجھے صحیح منزل تک پہنچا دے گی۔ جو پروگرام اس نے دیا ہے' اس کے مطابق اگر میں کرتا جاؤں گا تو یہ نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا' یہ اٹل ہے' یہ **لَا انْفِصَامَ لَهَا** (2:256) ہے' یہ دھوکا نہیں دے سکتا۔ یہ Conviction (یقین) ایمان کہلاتا ہے۔

اللہ پر ایمان کے معنی یا لم' قوانین خداوندی پر ایمان لانا ہے

ایمان کیا ہے؟ یہ سب سے بنیادی چیز ہے۔ یہ جسے اللہ کہتے ہیں' یہ اس اللہ کے قوانین کے اٹل ہونے پر ایمان ہے ورنہ اگر یہ اتنی سی ہی چیز ہے کہ ایک نے کہا ''اللہ ہے'' دوسرے نے کہا ہے ''نہیں ہے'' تو اس سے کچھ فرق ہی نہیں پڑتا۔ مذہب صرف اتنا منواتا ہے۔ دین خدا کے قوانین کی محکمیت پر Conviction (یقین)' منواتا ہے' ایسا یقین محکم کہ یہ ہو کر رہے گا جیسا یہ کہہ رہا ہے۔ اور جب اللہ کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین' غیر متبدل نہیں ہوسکتے۔ بس اتنی سی چیز ہے۔ کائنات خدا کی بنائی ہوئی ہے اس کے قوانین کو پرکھ کر دیکھ لو کہ کتنے غیر متبدل ہیں۔ تمہاری زندگی کے اندر بھی جب اس نے قوانین دیئے ہیں' تو وہ بھی اسی طرح سے محکم اور غیر متبدل ہونگے۔ یہ ہے جسے آپ خدا پر ایمان کہتے ہیں۔ خدا پہ ایمان کے معنی ہیں' اس کی وحی پہ ایمان' اس کی راہنمائی پر ایمان۔ صرف خدا پر جو ایمان ہے اور آگے وحی پر ایمان نہیں ہے' تو یہ بے معنی چیز ہے۔

انسانوں کے بنائے ہوئے برہمو سماجی دین کی ایک مثال

اس ایمان کی ضرورت اس لیے ہے کہ وحی کی Guidance (راہنمائی) پر ایمان ہو ورنہ برہمو سماجیوں [1] نے بھی تو ایک دین نکالا

---

[1] یہ اشارہ برہمو سماج تحریک کی طرف ہے۔ انیسویں صدی (1830ء) میں بنگال (ہندوستان) کے ایک ہندو راہنما' راجہ رام موہن رائے نے ایک تحریک اٹھائی جو ''برہمو سماج'' کے نام سے متعارف ہوئی۔ اس تحریک کی بنیاد اس نظریہ پہ تھی کہ مختلف مذاہب کے پیروؤں میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ کہ حقیقت اور صداقت صرف ان کے پاس ہے' کسی اور مذہب میں نہیں' باطل ہے اور ان کے باہمی اختلافات و نزاعات کا موجب۔ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ ان سچائیوں کو یکجا کر کے انہیں صحیح تسلیم کر لینے سے تمام مذہبی نزاعات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی تحریک کا نام ''برہمو سماج'' تھا۔ کچھ عرصہ تک اس تحریک کا چرچا رہا لیکن یہ آگے نہ بڑھ سکی۔ 1931ء کے لگ بھگ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم (1958-1888ء) نے اپنی مشہور تفسیر ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع کی تو اس میں نظریہ کو دہرایا گیا...... ہندوؤں نے اسے بہت اچھالا۔ چنانچہ جون 1941ء میں شولا پور کے مقام پر ''تمام مذاہب کی کانفرنس'' منعقد ہوئی تو اس کے صدر پنڈت سندر لال جی نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تفسیر کی تائید میں اس نظریہ کو ابھارا (پرویزؒ: مطالب الفرقان جلد اول' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1987ء' ص ص 83085)۔

تھا کہ خدا پر ایمان ہے تو خدا کی پوجا پاٹ کر لیجیے' دنیا میں معاملات زندگی کے لیے اچھی اچھی باتیں جہاں کہیں تمہیں ملتی ہیں' ان کو لے لیجیے۔ اب ان لوگوں کے نقطۂ نگاہ سے اچھی اچھی باتیں دیکھیے اور جو ان کو اچھی سمجھتے ہیں' ذرا پھر اس مجموعے کو اکٹھا کر کے دیکھیے۔ مثلاً ٹھگ کا بیٹا جب تک پہلا قتل نہ کر لے' اس وقت تک وہ دیوی کے مندر میں نہیں جا سکتا تھا۔ پہلے قتل کا جو مالِ غنیمت ہوتا تھا' اس لوٹ کا پانچواں حصہ لے کر اس کو مندر میں جانا ہوتا تھا۔ یہ سب سے بڑی نیکی تھی۔ یہ برہمو سماج چل نہیں سکا۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے غیر متبدل اصولوں پر مبنی وحی بذریعہ رسول ہوتی تھی

اٹل قوانین کے معنی ہیں وحی' وحی کے معنی ہیں وہ ذریعہ جس سے اس کے قوانین ہم تک منکشف ہوتے ہیں۔ اس کے لانے والے کو رسول کہا جاتا ہے جو ان کے Messengers (پیغامبر) ہیں۔ ہر انسان کو براہِ راست وحی نہیں مل سکتی۔ طریق یہ ہے۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ کیوں یہ ایسا طریق اختیار کیا گیا' اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہر حال وہ جن کی وساطت سے وہ قوانین آتے تھے' ان کے متعلق کیا ایمان ہے؟ وہ قوانین لانے والے رسول تھے۔ غور کیجیے آپ کہ ایمان کے اجزا کی کتنی اہمیت ہے۔ کہا ہے کہ کہیں ان پیغام لانے والوں کو' رسولوں کو' خدا نہ سمجھ لینا۔ یعنی رسالت پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ وہ الوہیت کے درجے پہ نہیں ہیں' وہ صرف Messengers (پیغامبر) ہیں' خدا کا پیغام ہم تک پہنچاتے ہیں۔ آپ درمیان میں یہ ساری چیزیں دیکھتے ہیں۔ یہ تو اس الوہیت کو پاک کرنے کے لیے یہ سارے دوسرے اجزائے ایمان آتے ہیں۔ مذہب میں یہی وہ اجزا ہیں' جو باقی ہیں ان کو خدا بنا لیا جاتا ہے۔ دین میں بات صاف ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک بنیادی اہم جزوِ ایمان تو اللہ پر ایمان ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی وحی یا Guidance (راہ نمائی) کے اوپر ایمان۔ یہ چیز کہاں ملے گی؟ یہ اس کی کتاب میں ملے گی۔ اس لیے کتاب پر ایمان ہے۔ یہ جنہوں نے آ کر دی ہے' تمہیں تو معلوم نہیں' یہ انہوں نے آ کر دی ہے۔ یہ کیا ہے؟ کہنے لگے: یہ پیغامبر' اس کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔

فطرت کی قوتوں کو دیوی اور دیوتا بنا لیا گیا جبکہ قرآن نے انہیں ملائکہ کہا اور انسان کے سامنے انہیں سربسجود کر دیا ہے

مذہب کی دنیا میں یہ ہے کہ یہ جو ملائکہ تھے' انہی کو دیوی اور دیوتا بنایا تھا۔ خواہ وہ یونان کے بڑے بڑے فلاسفر تھے' یا ہندوؤں کے ہاں کی جہالت' سب نے ان کو' یہ جتنی بھی فطرت کی قوتیں تھیں' انہیں دیوی دیوتا بنایا ہوا تھا۔ قرآن ان باطل عقائد کی نفی کرتا چلا جاتا ہے۔ ملائکہ تو فطرت کی قوتیں ہیں جو آدمی کے سامنے سربسجود ہیں۔ یہ عالمِ امر سے متعلق' خدا کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کے ذرائع ہیں' بس اس سے زیادہ نہیں ہیں۔ ایمان صرف اسی چیز کے اوپر رہ جاتا ہے' جسے آپ وحی یا خدا کی Guidance (راہ نمائی) کہتے ہیں۔ خدا پر ایمان صرف Guidance (راہ نمائی) کے لیے ہے کہ اس نے اٹل قوانین دیئے ہوئے ہیں۔ یہی ہے تعلق انسان کا اور خدا کا۔ کتاب کے اندر قوانین محفوظ ہیں' کتاب کو لانے والا پیغامبر ہے۔ باقی رہی یہ قوتیں' جو اتنی بڑی بڑی مہیب نظر آتی ہیں' وہ خدا کے پروگرام کو

بروئے کار لانے کے لیے خدا کی پیدا کردہ قوتیں ہیں۔

آخرت یعنی ظہورِ نتائج کے وقت پر ایمان اور پھر اس ایمان کا نتیجہ

پہلی چیز قانون ہے اور اس کے بعد آخرت ہے۔ آخرت کے معنی ہیں اس کا نتیجہ۔ قانون کے نتیجے پر یقین یہ ہے' اس ایمان کا ماحصل۔ اس کا یہ قانون ہے کہ یہ نتیجہ نکل کر رہے گا۔ اسے آخرت کہتے ہیں۔ ہر عمل ایک متعین نتیجہ پیدا کر کے رہے گا۔ عزیزانِ من! یہ ہے ایمان۔ اب سوچیے کہ کیا اس کے بغیر عمل کی کوئی عمارت بھی استوار ہو سکتی ہے؟ میں کہتا ہوں کہ عمل کے لیے انسان تیار ہی نہیں ہو سکتا اور پھر ایمان اگر غلط چیزوں کے اوپر ہے' آپ کوشش کرتے چلے جائیے' وہ کوششیں ضائع ہو جائیں گی۔ اگر ایمان صحیح قانون کے اوپر ہے تو اتنی کوشش' بلکہ اس سے بھی کم کوشش' صحیح نتائج پیدا کر دے گی۔ یہ جو نتائج ہیں' ان کو آخرت کہتے ہیں یعنی آخر میں آنے والی چیز۔ یہ سارا عمل' جو آپ کے ہاں کا ہوتا ہے' وہ کہاں جا کر ختم ہوتا ہے' کہاں منتج ہوتا ہے؟ وہ نتیجے پر منتج ہوتا ہے۔ یہ اس عمل کا آخری نتیجہ جو ہے اس پہ یقین آخرت پر ایمان ہے۔ اب یہ جو چیز ہے کہ وہ آخری نتیجہ کہاں نکلتا ہے؟ اس طبعی زندگی میں' اس دنیا کی زندگی میں نکلے تو اس کے بعد آگے چل کر نکلے تو بھی۔ زندگی مسلسل چلتی ہے' آخرت میں یہ چیز بھی آئی۔ آخرت تو آپ نے انجامِ کارِ عمل کے نتیجے کا نام لینا ہے۔ کس وقت وہ نکلتا ہے' اس وقت کا سوال ہی نہیں ہے لیکن وہ نکلے گا ضرور۔

آخر کار انسان کو قرآن حکیم کی پیش کردہ ائیڈیالوجی پر ایمان لانا ہے

یہ ہے آئیڈیالوجی' یہ ہے ایمان۔ اب سوچیے کہ عملی زندگی میں آپ کو اس ایمان کی ضرورت پڑتی ہے یا نہیں۔ ضرورت پڑتی کیا ہے میں کہتا ہوں اس کے بغیر آپ ایک قدم نہیں اٹھا سکتے' چل ہی نہیں سکتے۔ اور اگر غلط قانون اور غلط ذریعے پہ ایمان ہو جائے' اسے لے کر آپ اڑے جائیں' پھر اس کا نتیجہ سامنے ہے' وہ بھی آخرت ہے۔ صحیح راہنمائی جو ہے اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے' وہ بھی آخرت ہے۔ غلط اعمال کے ساتھ اڑنے کا آخری نتیجہ جہنم ہے۔ صحیح کے ساتھ اڑنے کا آخری نتیجہ جنت ہے۔ اب دیکھتے ہیں کس قدر بات صاف واضح ہے' اس میں کسی منطقیانہ موشگافیوں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ عملی زندگی میں ہم روز یہ دیکھتے ہیں کہ ایمان کے بغیر آپ ایک قدم بھی چل ہی نہیں سکتے۔ پھر ایمان تو غلط چیز پہ ایمان ہے اور صحیح چیز پہ بھی یہ ہے وہ آئیڈیالوجی جسے ایمان کہا گیا ہے۔ کہا ہے کہ **لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ** (2:177)۔

خدا‘ ملائکہ‘ وحی‘ رسول‘ آخرت‘ پر ایمان لانے کے لیے وہ معیار جو قرآن نے متعین کیا ہے‘ وہی تسلیم کیا جائے گا

عزیزانِ من! اس آیت (2:177) کے آخری حصے میں وہی پانچوں اجزا آ گئے جو میں نے ابھی گنائے تھے۔ قرآن میں یہی پانچ اجزا ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار کفر ہے۔ ان پر اس طرح ایمان ہو جو میں نے اوپر عرض کیا ہے۔ یہ یونہی نہیں ہے کہ جی ہم خدا کو مانتے ہیں اور رسولوں کو بھی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔ کہا ہے کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (2:137) اگر یہ خدا کو ماننے والے اس طرح خدا کو مانیں‘ جیسا ہم نے اس قرآن میں کہا ہے اور جیسا تم مانتے ہو‘ پھر سمجھو کہ وہ ایمان والے ہیں ورنہ چند دہریوں کو چھوڑ کر خدا پہ ایمان تو ساری دنیا کہہ رہی ہے‘ سارا مغرب اپنے آپ کو Believers in God کہتا ہے۔ اور اسی لیے آپ کو‘ اپنے حریف کے مقابلے میں‘ اس پردے کے اندر اکٹھا کرتا ہے کہ Believers in God (خدا پر ایمان والو!) آؤ اور اکٹھے ہو جاؤ۔ وہ اچھے Believers ہیں‘ قرآن تو ان Believers in God (خدا پر ایمان لانے والوں) کو مانتا ہی نہیں ہے۔ یہ دھوکا ہے۔ ان کو میں نے کہا ہے‘ تو فوراً ایک چیز نے چٹکی لی کہ کیا وہ ہمیں یہ مانتا ہے؟ جن کے اعمال کے یہ نتائج ہی نہیں نکل رہے ہیں‘ ان کو وہ Believers (صاحبِ ایمان) کیسے تسلیم کرے گا۔ اگر یہ ایمان ہے‘ تو یہ تو بنیاد ہوگئی۔ اس کے بعد آگے کیا چیز ہے۔

ہمارے ہاں ایمان لانے کی کیفیت اور اس کا نتیجہ

ہمارے ہاں ایمان تو اتنا ہی ہوتا ہے۔ یہ وہ ہے جس کی شہادت اگلے دنوں ملی تھی۔ کسی نے پوچھا تھا کہ صاحب! آپ کے مسلمان ہونے کا ثبوت کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں نے دو شادیاں کی تھیں۔ مطلب ان کے کہنے کا یہ تھا کہ بہر حال اس وقت تو میں نے کلمہ پڑھا تھا۔ تو ہمارے ہاں کا ایمان تو یہ وہ کلمہ ہے اور وہ بھی اس Modern age (جدید دور) سے پہلے کی بات ہے۔ اس دور میں تو آپ دیکھتے ہیں کہ اب اس نکاح کے اندر کلمہ بھی نہیں پڑھاتے۔ بہر حال آخری مرحلے میں جا کر جب وہ کلمہ کسی کام نہیں آتا‘ مرتے وقت ضرور پڑھاتے ہیں۔ تو ایمان تو ہمارے ہاں یہ رہ گیا۔ اس کے اوپر آگے ارکانِ اسلام ہیں‘ یہ ستون کھڑے ہوئے ہیں۔ اب آپ سوچ لیجیے‘ فرض کر لیجیے‘ بنیاد بھی ٹھیک تھی‘ اب اس کے اوپر آپ نے Pillars (ستون) کھڑے کر دیئے تو پھر عمارت بن گئی‘ بارش سے بھی آپ کو حفاظت مل گئی‘ گرمی سردی سے بھی مل گئی‘ چوروں سے بھی آپ محفوظ ہوگئے۔ کیوں ”کہ جی پنج تھمب جو کھڑے کردتے نیں [1]“۔ یہ ارکان اوپر کوئی عمارت بنانے کے لیے‘ چھت ڈالنے کے لیے کھڑے کرنے تھے۔ وہ چھت وت کچھ نہیں ہے۔ یہاں نہ اس کی بنیاد ہے جسے آپ ایمان کہتے ہیں‘ اس کا پتہ نہیں کہ یہ کیا بات ہے جو ایمان کہتے ہیں۔ اس کے اوپر جو آپ کھڑے کرتے ہیں‘ وہ صرف ارکان

---

[1] پانچ ارکان (ستون) جو کھڑے کر دیئے۔

(Pillars) کھڑے کرتے ہیں۔نہیں، عزیزانِ من! یہ لیس البر محض رسوم کی پابندیاں ہیں، کوئی کشادکی راہ نہیں ہے۔ پہلی چیز کاٹ کر رکھ دی۔کشاد کی راہ یہ بنیاد محکم ہے، خدا کے قوانین کی محکمیت پر یقینِ کامل ہے، یہ Conviction (یقین وایمان) کی طرح ہے کہ اس کے مطابق میں نے یہ کچھ کیا تو یہ نتیجہ مرتب ہوکررہے گا۔ یہ ہوگئی بنیاد۔اب آگے بات عمل کی آئی۔ بـر ہوتا کیا ہے؟ یہاں تک صرف یہ چیز ہے کہ بنیاد رکھی گئی ہے۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ کہا ہے کہ اتـی الـمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ (2:177)۔یہ بڑا ٹیسٹ ہے۔بر اس کے لیے ہے، کشاد اس کے لیے ہے، جو مال کی اس قدر کشش کے باوجود اسے دے دیتا ہے۔

مال ودولت کا حصول اوراس کوخرچ کرنے کا طریق، قرآنی آئیڈیالوجی کے مطابق لازم قراردیاجائے گا

آپ کہیں گے کہ اس کے لیے پہلے جو اتنی بڑی بنیاد بنائی گئی، یہ ایمان بنایا گیا، اس کی ضرورت کیا ہے؟ ابھی اس کی ضرورت سمجھ میں آجاتی ہے۔ مال لے لینا، اپنے پاس جمع کرلینا، حاصل کرلینا، جیب میں رکھ لینا، گھر میں رکھ لینا، اس کا نتیجہ تو آپ کو پتہ ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کتنا روپیہ میرے پاس ہے، اس سے میں مکان خریدلوں گا، زمین خریدلوں گا، موٹر آجائے گی، یہ آپ کو معلوم ہے۔ مال کے لینے کے نتائج کا تو آپ کو پتہ ہے، مال کے دے دینے کے نتائج کیا ہیں، کیا اس کا آپ کو پتہ ہے۔وہ تو کسی سے پوچھیے، وہ کہے گا کہ صاحب! یہ تو بے وقوفی ہے۔ مال لے لینے کے بعد کیا حاصل ہوگا، اس کے لیے نہ وحی کی ضرورت ہے، نہ کسی رسول کے بتانے کی ضرورت ہے، نہ کتاب پر ایمان ہے، نہ خدا پر ایمان کی ضرورت ہے۔ ہر شخص جانتا ہے، جس کی مٹھی میں پیسہ آجاتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس پیسے سے کیا کرنا ہے۔ یہاں خدا کی ضرورت نہیں پڑتی، یہاں ایمان کی ضرورت نہیں پڑتی، یہاں آکر پڑتی ہے جہاں آپ نے جو اپنے پاس ہے، وہ دوسرے کو دے دیا۔اب ساری دنیا کہے گی کہ یہ پاگل ہوگیا ہے۔ یہاں اس بات کی ضرورت پڑتی ہے کہ لے لینے کے نتائج تو میں بھی جانتا تھا، سب جانتے تھے۔دے دینے سے کیا نتیجہ مرتب ہوتا ہے، یہ صرف خدا کی راہنمائی بتا سکتی ہے۔اس نے یہ چیز بتادی کہ یاد رکھیے! الَّـذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی (92:18) مال لے لینے سے تمہارے جسم کی پرورش ہوجاتی ہے، اس چیز کو تم بھی جانتے ہو، بچہ بھی جانتا ہے، دیوانہ بھی جانتا ہے۔ مال دے دینے سے تمہاری ذات کی نشوونما ہوتی ہے، اسے تم نہیں سمجھ سکتے تھے جب تک ہم نہ تمہیں بتاتے۔

عزیزانِ من! یہاں وحی کی ضرورت پڑ گئی۔ روٹی کھا لینے سے کیا ہوتا ہے؟ ڈاکٹر بتادے گا، مشینیں بتادیں گی، سائنٹسٹ بتادے گا، جسم کا نتیجہ بتادے گا۔اس میں نہ خدا کو ماننے کی ضرورت ہے اور نہ کسی رسول پہ ایمان لانے کی ضرورت ہے۔اس کے دے دینے سے کیا ہوا؟ ساری دنیا کہے گی کہ مال ہاتھ سے جاتا رہا لیکن اس کے بعد کچھ ملا، یہ مجھے سائنٹسٹ نہیں بتا سکتا، ڈاکٹر نہیں بتا سکتا، آپ کا جسم نہیں بتا سکتا، طبعی قوانین نہیں بتا سکتے کہ دینے سے کیا ملا ہے۔اس کے لیے یہ وہی قانون بتا سکتا تھا جو جسم سے ماورا، کسی اور چیز سے متعلق ہو۔

اسے انسان کی ذات کہا جاتا ہے' جس نے جسم کے Disintegrate (فنا' منتشر) ہونے کے بعد بھی آگے چلنا ہے اور باقی رہنا ہے۔

قرآنی آئیڈیالوجی میں سُود وزیاں کے پیمانے ہی الگ الگ ہیں

عزیزانِ من! معلوم ہوا کہ ایمان کی ضرورت کیا ہے۔ یہ خالی خدا کو اس طرح سے مان لینے والا کہ ہاں! عرش پہ بیٹھا ہوا ہے' والی بات نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس میں یہ بات نہیں آتی۔ خدا کے اس قانون پر ایمان لے آنے سے تو ذرا وقتی فائدہ ہوتا ہے' طبعی فائدہ ہے' کتنا زیادہ سے زیادہ اٹھا لو گے' فائدہ کتنے دن تک کے لیے ہوگا لیکن اس کے دے دینے سے وہ شے جو موت سے بھی نہیں مرتی' اور آگے چلتی ہے' اس سے اس کی پرورش ہو جائے گی۔ عزیزانِ من! یہ ہے ایمان۔ اس لیے پہلے یہ بات کہی۔ اس ایمان کے بعد ورنہ باقی دنیا میں خدا کے نہ ماننے والے بھی' کہتے ہیں کہ خیرات دے دیتا ہے' یہ کچھ کر دیتا ہے۔ اس نے پہلے بنیاد بنانے کے بعد کہا کہ **وَاٰتَـــى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ** (2:177) وہ دیتا ہے۔ یہ **عَلٰى حُبِّهٖ** بڑی عجیب چیز ہے کہ یہ جو راہنمائی ہے' اس کو بیچ میں سے چھوڑ دیجیے' دنیا کا ہر قاعدہ قانون ہر ناصح مشفق یہی بتائے گا کہ مال کی بڑی کشش ہے۔ اور ہر شخص جانتا ہے۔ صاحب! جو پاگل ہے' وہ بھی اپنے ہاتھ میں پیسہ لے کر نہیں چھوڑتا۔ **عَـلٰـى حُبِّـهٖ** کیا بات کہی ہے؟ کہ یہ جو حُب ہے' اس کی کشش ہے' اس کے لیے تمہیں کسی آسمانی راہنمائی کی ضرورت نہیں تھی' یہ تو تم جانتے ہو' سب جانتے ہیں' بچہ جانتا ہے جس کے ہاتھ میں پیسہ مل جائے کہ پیسہ ملنے سے کیا ہوتا ہے: ٹافی ملتی ہے' غبارہ ملتا ہے: بچہ جانتا ہے۔ نہ خدا پہ ایمان کی ضرورت تھی' نہ وحی پہ ایمان کی ضرورت۔ اس **عَـلٰـى حُبِّهٖ** کی جو کشش ہے' تم خود جانتے ہو' ہر انسان جانتا ہے' اس کی کشش کے علی الرغم اس کو دوسروں کو جو دے دینا ہے' یہ کوئی اور قانونِ طبعی نہیں بتا سکتا کہ اس سے کیا ملتا ہے' اس کے لیے خدا کی وحی پر ایمان کی ضرورت ہے۔ یہی علیٰ حبه وہ چیز ہے۔

قرآن حکیم کے معاشی نظام کی بنیاد انفاق کے محکم تصور پر استوار ہے

سارا قرآن آپ دیکھیں گے: انفاق انفاق انفاق ہے۔ آپ کے ہاں کے طبعی قوانین جمع جمع جمع اور سمیٹنا' لیتے چلے جانا ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ ان کی روشِ زندگی **جَـمَـعَ مَـالًا وَّعَدَّدَهٗ** (104:2) ہے۔ وہ جمع کرتا ہے اور پھر روز بینک بیلنس دیکھتا ہے کہ کتنا ہوگیا۔ **وَجَـمَـعَ فَـاَوْعٰى** (70:18) تھیلی میں ڈالتا ہے اور اوپر سے اس کو کس کر باندھتا ہے۔ اس کے لیے یہ کسی وحی کی ضرورت نہیں یہاں **عَلٰى حُبِّهٖ** ہے۔ قرآن اس اوعیٰ کے برعکس لفظ ''نفق'' استعمال کرتا ہے۔ اوعیٰ یہ ہے کہ نیچے سے تو وہ تھیلی پہلے ہی بندھی ہوئی ہوتی ہے' جو ڈالیں اس میں سے نکلتا نہیں ہے۔ اوپر سے ایک منہ ہوتا ہے' اس منہ کو ڈالنے کے لیے کھولا جاتا ہے' پھر باندھ دیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کے مقابل میں سارے قرآن میں ''انفاق'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا ترجمہ ہم خرچ کرنا کرتے ہیں۔ یہ خرچ کرنا

نہیں ہوتا۔ ''نفق'' کہتے ہیں اس قسم کی تھیلی کو جس کے دونوں سرے کھلے ہوں' ادھر سے ڈالتے جایئے ادھر سے نکلتا چلا جائے۔ یہ ''مال دولت'' جمع ہونے کی چیز نہیں ہے۔ دولت کے تو لفظی معنی ہیں ''گردش میں رہنے والی چیز''۔ جونہی اس کی گردش رکی' وہ دولت نہیں رہتی۔ البتہ اس نے اس کی گردش کے لیے ایک قانون دے دیا کہ کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ (59:7) گردش تو کرے لیکن اوپر کے طبقے میں ہی نہ گردش کرتی ہے۔ اب یہ تو دوسرا سوال آ گیا۔ انفاق کا لفظ ہے' جس کے معنی ہیں کہ جس نیفے کے' میانی کے 'دونوں سرے کھلے ہوئے ہوں۔ اب یہاں جَمَعَ فَاَوۡعٰی نہیں ہے' حاصل کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ یہ دوسروں کی ضروریات کے لیے آگے کھلے راستے چلتی رہے۔ کہا ہے کہ وَاٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ (2:177) مال و دولت کی محبت کے باوجود اسے دوسروں کے لیے عام کردے۔ اسی لیے دوسری جگہ کہا ہے کہ لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ (3:92)۔ یہاں پھر وہی بر ہے کہ تم کشادگی کو نہیں پہنچ سکتے' زندگی کی وسعتوں کو نہیں حاصل کر سکتے: لن تنالوا البر (3:92) تاوقتیکہ تم وہ مال' وہ چیزیں' جن کی تمہارے اندر سب سے زیادہ کشش ہے' اسے دوسروں کی نشوونما کے لیے کھلا نہ رکھو' حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ (3:92)۔ یہاں لفظ تُنۡفِقُوۡا آیا ہے یعنی تاوقتیکہ اسے اس طرح نہ حاصل کرو کہ اِدھر سے حاصل کرو اور اُدھر سے راستہ کھلا رکھو کہ ضرورت کے لیے دوسروں کی نشوونما کے لیے چلتا رہے۔ اس کے بغیر بر حاصل نہیں ہوسکتا۔ اگر اس کا ترجمہ نیکی کرتے ہو تو پھر اس کے بغیر نیکی نہیں مل سکتی۔ اب اس کے بعد پھر نظم و نسق آیا ہے کہ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی (2:177) مال و دولت کی محبت کے باوجود اسے دوسروں کی پرورش کے لیے کھلا رکھے خواہ وہ تمہارے رشتہ دار ہوں۔

ہر فرد کی انفرادی زندگی کو اجتماعی زندگی میں ڈھالنے کے لیے پورے کا پورا نظام بدلنا ہوتا ہے

عزیزانِ من! اب یہ جو انفاق کی چیز آئی ہے' یہ نظم و نسق کے لیے ہے کہ تم نے یہ چیز کرنی ہے' اسے اُس وقت تک کرنا ہے جب تک یہ نظام پورا نہیں آجاتا کہ جس میں تمام افراد کی پرورش کی ذمہ داری' صلاحیتوں اور نشوونما کی ذمہ داری آپ کے اُس نظام کے ماتحت ہو جائے' اجتماعی نظم و نسق کے تابع ہو جائے' یہ احکام اس وقت تک کے لیے ہیں' انہیں انفرادی طور پر شروع کردو۔ ذوی القربیٰ کے یوں تو معنی رشتہ دار کے ہوتے ہیں لیکن لفظوں کو دیکھیے تو اس کے معنی ہیں کہ اپنے اردگرد سے ابتدا کرو۔ یوں صبح اٹھ کر اپنے گھر کی دائیں اور بائیں دیوار گرا دیجئے' اِدھر اور اُدھر کے یہ تین گھر' ایک گھر بن گئے۔ ذوی القربیٰ کے اندر آ گئے۔ یہ نظم و نسق کے لیے ہے۔ یوں اس کو انفرادی طور پر شروع کیا۔ پھر اس کے بعد آگے نگاہ دوڑائی۔ وَ الۡیَتٰمٰی (2:177) معاشرے میں جو تنہا رہ گئے ہوں۔ یہاں ذوی القربیٰ ہے کہ وہ تمہارے قریب ہیں' یہ تنہا نہیں ہیں۔ پھر وہ آگے دیکھو کہ جس کے قرب میں بھی کوئی نہیں ہے' اس کے قریبی بن جاؤ کہ وہ

یتیم (تن تنہا) نہ رہے۔ وَ الْمَسٰكِيْنَ (2:177) کل تک کام کاج کرتا تھا' ایک حادثہ گزرا' اس کی حرکت مبدل بہ سکون ہوگئی' ساکن ہوگئی' اس کی چلتی ہوئی گاڑی رک گئی۔ اٹھو! اس کو بھی ایک دھکا دے دو۔ بیٹری کام نہیں کررہی' ذرا سا دھکا دینے کی ضرورت ہے' تھوڑا سا Push کردو گے' گاڑی چل پڑے گی۔ یہ ہے مسکین۔ اس کے لیے یہ کردو۔ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ (2:177)۔ دیکھیے قرآن کہاں تک جاتا ہے! جب یہ کہا کہ یہ جو اپنے اردگرد ہیں یہ تو اپنے ہیں۔ اس سے نظر آیا کہ یہ بھی ایک گروہ بندی ہے' یہ جو کچھ کہہ رہا ہے یہیں تک ہے کہ جو تمہارے اپنے ہیں انہی تک یہ چیز کرو۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ تمہارے ہاں سے جو گزرنے والا ہے' مسافر ہے' اس کو بھی دیکھو' اگر اس کو ضرورت ہے وہ زادراہ سے محروم ہے تو اس کو بھی لو۔ اور مسافر کے مقابلے میں' ابنِ سبیل تو وہ کہتے ہی اس مسافر کو تھے جس کی کوئی ضرورت رک جائے اور وہ تمہارے پاس آجائے۔ اس میں سارے اپنے اور بیگانے آگئے۔ یہ بھی تمہارا قریبی ہوگیا جو راستہ گزرتے ہوئے تمہارے ہاں سے گزر کر چلا گیا ہے' پھر وہ السَّآئِلِيْنَ (2:177) ہے' کام کررہا ہے' محنت کررہا ہے' اس کی محنت کے ماحصل سے ضرورت پوری نہیں ہوتی' کمی رہ جاتی ہے' اسے سائل کہتے ہیں۔

جو معاشرہ افراد کی ضروریات کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے سر نہیں لیتا' وہ معاشرہ جہنمی معاشرہ ہے

برادرانِ عزیز! آج کے اس معاشرے میں تو اس سے کسی کو واسطہ ہی نہیں ہے کہ جتنا اس سے ملتا ہے' اس کی ضرورت پوری ہوتی ہے یا نہیں۔ یہاں تو یہ ہے کہ صاحب! ٹھیک ہے تین روپے روز مقرر کیے۔ بڑے سے بڑا وہ جو اپنے آپ کو آجر کہتا ہے' عادل کہتا ہے' وہ یہ ہے کہ صاحب! میں تو شام کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری دے دیتا ہوں۔ بھئی! یہ بات ٹھیک ہے تین روپے مقرر کیے تھے' تین روپے شام کو دے دیئے۔ کیا اس تین روپے میں اس کے بچوں کے لیے آٹا آسکتا ہے یا نہیں؟ وہ کہتا ہے صاحب! یہ تو میرا کام نہیں ہے۔ یہ اس کا کام نہیں' یہ اس معاشرے میں کسی کا بھی کام نہیں کہ وہ یہ کچھ دیکھے۔ آج بھی مبنی برانصاف معاشرہ اسے کہا جاتا ہے جس میں یہ Wages (اجرتیں) اس کو ملتی رہیں۔ ایک تو وہ ہے کہ دھاندلی سے یہ بھی نہیں دیتے' مزدور روتا رہا ہے۔ اچھا معاشرہ وہ گنا جاتا ہے' اچھا فرد وہ گنا جاتا ہے کہ صبح کو اس کے ساتھ بات طے کرے' شام کو یہ دیدے۔ اچھا معاشرہ وہ جس میں یہ جو کچھ ہے' مل جائے۔ یہ جو دیا جاتا ہے اس سے اس کی ضروریات پوری ہورہی ہیں یا نہیں؟ آج کے کسی معاشرے نے یہ بات اپنے ذمے نہیں لی۔ قرآن نے پہلے یہ بات بتائی۔ سائل کے معنی ہمارے ہاں تو بھکاری ہوگیا یعنی سوال کرنے والا۔ یہ اس کے بنیادی معنی نہیں ہیں۔ اس کے معنی ہیں ''جس کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہے' جس کی احتیاج باقی رہ جائے''۔ جس نے بھی حاصل کرنی ہے' اس کا فریضہ یہ ہو جاتا ہے کہ یہ دیکھے کہ جو میں نے اس سے مقرر کیا تھا وہ میں نے دے دیا۔

قرآن حکیم نے اپنے ہاں عمل کے ساتھ احسان کا لفظ بھی استعمال کیا ہے

قرآن نے کہا ہے کہ تمہارے اوپر اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ (16:90) اللہ کا حکم ہے کہ ہر ایک سے عدل کرو۔ ایک عدل تو یہ ہے' یہ کرلیا' تم نے جو مقرر کیا وہ دیدیا۔ کہا کہ اس کے بعد یہ دیکھنے کی بات ہے کہ اس سے کوئی کمی تو نہیں رہتی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے آگے ہی کہا کہ وَ الْاِحْسَانِ (16:90) کمی پوری کرو۔ عدل کے بعد جو سائل رہ جاتا ہے' جو بھی اس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے' یہ بھی معاشرے کا فریضہ ہے کہ اسے پورا کرے۔ ذَوِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ کے فوراً بعد کہا کہ وَالسَّآئِلِیْنَ وَ فِی الرِّقَابِ (2:177) جو ضرورت مند ہے یا جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو انہیں بنیادی چیز انسانیت کی آزادی ہے۔ یہ آپ کے دین کی' شرفِ انسانیت کے احترام کی بنیاد ہے۔ اب یہ جو ضروریاتِ طبعی تھیں یہ تو پوری ہوئیں۔ کہا ہے کہ اس کے بعد نگاہ اٹھا کر دیکھو کہ کوئی اس حالت میں نہیں ہے کہ دوسرا شخص اس کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر اس کو اپنا محکوم بنائے ہوئے ہے۔ جہاں جہاں یہ صورت ہے' تمہارے اوپر فریضہ ہے کہ اپنا مال اس مقصد کے لیے حاصل کرو کہ اس کی گردن کو اس کی محتاجی سے آزاد کرا لو۔

نبی اکرم ﷺ کی طرف سے لڑی گئی جنگیں کیا مدافعانہ تھیں یا جارحانہ؟

یہ تھی وہ چیز جس کے لیے بحثیں (Discussions) ہو رہی ہیں کہ صاحب! اسلام کی جنگیں مدافعت کے لیے تھیں یا Aggression (جارحیت) کے لیے تھیں' Defensive (مدافعانہ) تھیں یا Offensive (جارحانہ) تھیں۔ یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ وہ تو نبی اکرم ﷺ کے مکتوبِ گرامی کا ایک فقرہ ساری بات واضح کر دیتا ہے۔ ایران کے کسریٰ کو جو خط لکھا تھا' اس میں یہ کہا تھا کہ ''تمہارے ہاں کے کاشتکاروں کے اوپر' تمہارے زمیندار' اتنے ظلم کر رہے ہیں اور وہاں کوئی نہیں ہے کہ ان کو ان کے مظالم سے چھڑا دے۔ میں تمہیں وارن کرنا چاہتا ہوں اگر ان زمینداروں نے ان مظالم سے ہاتھ نہ روکا' تو ان کے جرائم کا بار تمہاری گردن کے اوپر ہو گا اور اس کے لیے ہمیں آنا پڑے گا''۔ اب آپ فیصلہ کر لیجیے کہ یہ جنگیں Defensive (مدافعانہ) ہیں یا Offensive (جارحانہ) ہیں۔ جب یہ لوگ مدینے میں Settle (رہائش پذیر) ہو گئے' کوئی مخالف نہ رہا' تو اس وقت قرآن ان سے کہہ رہا ہے کہ تم بڑے اطمینان سے بیٹھ گئے ہو کہ ہاں صاحب! ٹھیک ہے' ہم محفوظ ہو گئے' اب کوئی ڈر نہیں' کیا تم ان کمزوروں کی چیخ و پکار کو نہیں سن رہے جو کہہ رہے ہیں کہ اے خدا! ہمیں اس بستی سے' ظالموں کے ہاتھوں سے' نجات دے' کوئی اپنی طرف سے ہمارا والی بھیج' کوئی اپنی طرف سے ہمارا حمایتی بھیج۔ وہ ان سے کہہ رہا ہے کہ او سن نہیں رہے تم' وہ ہمیں پکار رہے ہیں۔ وہ پکار رہے ہیں خدا کو۔ یہاں سے بات سیدھی واضح ہو گئی۔ اس

کے لیے کیا مشکل تھا اُسے زلزلے کا ایک ذرا سا جھٹکا دینا ہے' انجن بماننده انجینئری ادھر پورے کا پورا مکہ گڑم (غرق) ہو جاتا' لیکن نہیں۔ خدا کہتا ہے کہ تم سن نہیں رہے' وہ ہمیں پکار رہے ہیں' تم اٹھتے کیوں نہیں ہو۔ اس واسطے کہ یہ اللہ کے سپاہی ہیں۔

برادرانِ عزیز! جب کوئی مظلوم کسی مملکت کو پکارتا ہے تو مملکت کا ہیڈ آف دی اسٹیٹ نہیں جاتا' وہ فوج کو بھیجا کرتا ہے۔ مومن خدا کا سپاہی ہوتا ہے۔ جو مدد کے لیے خدا کو پکارتا ہے' خدا کے سپاہی کا فریضہ ہو جاتا ہے کہ اس کی مدد کے لیے پہنچے۔ یہ جب جہاد کی بات آئے گی تو عرض کروں گا کہ یہ بات کیا ہوتی ہے۔ وہ جو ہمارے ہاں یہ ہیں کہ یہ پہنچنے کے بعد بھی بس وہ خدا ہی کیا کرتا ہے' کہیں وہ آندھی چلا دیتا ہے' کہیں وہ ریت کی مٹھی مارتے ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں' کہیں ان کو غرق کر دیتے ہیں۔ یہ ایسا نہیں ہے' خدا یہ کہتا ہے کہ سنتے نہیں ہو وہ مجھے پکار رہے ہیں' تم بیٹھے کیوں ہو؟ یہ تو بنی اسرائیل والے کہا کرتے ہیں کہ **فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ** (5:24) تم اور تمہارا خدا[1] دونوں جاؤ اور ان سے جنگ لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے نتیجہ کا انتظار کرتے ہیں وہ بنی اسرائیل والے کہا کرتے ہیں کہ تمہیں پکارتے ہیں تو تم جاؤ'' واجاں تینوں ماردے نیں' جان اسی دیے۔ کھان پین نوں بھاگ بھری' دھون بھنان نوں جمعہ[2] ''۔ کیا بات ہے صاحب! دیکھتے ہیں کہ ایک ایک فقرے میں قرآن کس طرح سے باتیں صاف کرتا چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ ہمیں پکارتے ہیں' تم اٹھتے کیوں نہیں ہو؟ یہ **وَ فِی الرِّقَابِ** (2:177) کتنی جامع چیز تھی! یہ کسی کی گردن کا کسی کے پنجے میں ہونا ہے۔ یہ یہی نہیں ہے کہ سچ مچ کی رسی بندھی ہوئی ہوتی ہے' اس کے لیے تو سینکڑوں چیزیں ہیں۔ برادرانِ عزیز! سوچیے تو سہی! دیکھیے' ذرا تصور میں لا کر' کس کس نوعیت کی رسیاں ہوتی ہیں جن میں گردنیں بندھی ہوئی ہوتی ہیں' وہ گردنیں بھی' جو بظاہر بڑی اٹھی ہوئی نظر آتی ہیں' پتہ نہیں کس قسم کی غیر مرئی (Invisible) رسیاں ہوتی ہیں' جن میں بندھی ہوئی ہوتی ہیں۔

مومن کی زندگی بھر کا مقصدِ حیات' عہد کی اہمیت اور امانت وخیانت کا مفہوم

قرآن کی رو سے مومن کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی گردن میں کسی نوعیت کی بھی' کہیں کسی دوسرے کی رسی پڑی ہوئی ہے تو وہاں جا کر اس رسی کو اتار دے۔ یہ **وَ فِی الرِّقَابِ** تو اس کی ایک (Item) (شق) ہے۔ آگے کہا کہ **وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ** (2:177) اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسے معاشرے کا قیام ہو جس میں افراد خود بخود قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے ہوئے' ان کے پیچھے پیچھے چلتے چلے جائیں۔ اب وہ اپنے معاشرے سے آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ **وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ** (2:177) نوعِ انسانی کو نشوونما بہم پہنچانے کا

---

[1] اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ''تم اور تمہارا بڑا بھائی (ہارونؑ) دونوں جاؤ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' فٹ نوٹ ص-247)۔

[2] واہ! پکار تمہیں رہے ہیں' جان کا نذرانہ ہم پیش کریں۔ کھائے کوئی' اور بھرے کوئی اور۔ واہ! کیا کہنے!

انتظام کرے۔ دیکھیے یہ بــــــر کن کے حصے میں آ رہی ہے؟ بنیادی طور پہ یہ دو چیزیں کہی ہیں کہ نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرنا تاکہ تمام ضرورت مندوں کو سامانِ نشوونما مہیا ہوتا رہے اور وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا (2:177)۔ عزیزانِ من! دیکھیے! یہاں بڑی بنیادی اصولی چیزیں بیان ہو رہی ہیں۔ ان اصولی چیزوں میں ایک یہ چیز ہے کہ ''جب وہ کسی سے عہد کرتے ہیں تو عہد پورا کرتے ہیں''۔ اس عہد کے اندر یہ جو ہم انفرادی وعدے کرتے ہیں' وہ بھی آتے ہیں جو اجتماعی Treaties (معاہدات) ہوتے ہیں وہ بھی آتے ہیں۔ اور اصل میں تو اس میں ہر وہ چیز آتی ہے' جو کسی سے آپ کہیں اور دوسرا آپ پہ اعتماد کر لے۔

یہ وعدہ یا Treaty یا عہد ہوتا کیا ہے؟ اس وقت تو یہ بات لفظی ہوتی ہے کہ ہاں بھئی! میں تمہارے لیے یہ کر دوں گا۔ ان الفاظ کے نیچے بات کیا ہوتی ہے؟ یہ کہ اس کو اس کا اعتماد اور بھروسہ ہو جاتا ہے کہ بھئی! یہ میرا کام تو ہو گیا' اس نے اپنے ذمے لے لیا۔ یہ ہے اعتماد جو آپ کے پاس ہو گا' اس کا Trust ہوتا ہے۔ اور اگر یہ پورا نہیں ہوتا' تو پھر آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد کیا دھچکا لگتا ہے؟ اسی لیے اس کو یہ جو اس انداز کا عہد دینا ہے اسے امانت کہا جاتا ہے اور امانت تو امن سے ہے۔ جسے آپ یہ عہد دیتے ہیں' وہ اپنی اس مشکل کے معاملے میں' امن میں ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں' جو چیز امانت کو توڑنے میں ہے' اس کے لیے خیانت کا لفظ ہے۔ کیا یہ پتہ ہے کہ یہ عرب اسے کہاں Use (استعمال) کرتے تھے؟ اب تو ہمارے ہاں یہاں وہ کنویں نہیں ہوتے ''اگلی نسل نے تے نہ کتھے او کھوہ ویکھیے نیں' ایناں نوں دسیے تو ٹِنڈ کی ہوندی ہیگی اے' ایناں نوں پتہ ای نئیں لگنا۔ ایناں نوں کہو لد کی ہوندی اے' اے کہے گا ترجمہ کرا یہدا[1] ''۔

وہ کنواں جس پہ وہ چرخی ہوتی تھی' اس میں پھر وہ رسی ہوتی تھی' پھر وہ نیچے ایک ڈول ہوتا تھا۔ پانی کا بھرا ہوا ڈول ہے آپ اسے اوپر سے کھینچ رہے ہیں' زمین کی کشش اسے نیچے لے جا رہی ہے' آپ اسے زور دے کر اوپر لا رہے ہیں' ایک کشمکش ہو رہی ہے۔ یہ سارا جو کچھ آپ کر رہے ہیں' کس چیز کا بھروسہ ہے جس پر آپ کر رہے ہیں؟ سارا اس رسی کے مضبوط ہونے کا بھروسہ ہے۔ آپ اس پانی سے بھرے ہوئے ڈول کو لیے چلے آ رہے ہیں' آپ اس امن میں ہیں کہ بس ابھی دو چار ہاتھ اور ہے اس کے بعد یہ پانی کا بھرا ہوا ڈول میرے ہاتھ میں آیا۔ کس قدر یقین ہوتا ہے' کس قدر اس کے اوپر ٹرسٹ ہوتا ہے! اور اگر عین درمیان میں آ کر جو بھرا ہوا ڈول ہے' اور آپ اطمینان سے کھینچ رہے ہیں' درمیان میں سے وہ اگر ٹوٹ جائے' تو بسا اوقات تو یہ اوپر والا جو ہے' یہ کنویں میں گر جاتا ہے۔ اس طرح سے تناؤ میں وہ رسی ہو اور نیچے سے وہ ڈول آ رہا ہو' اور درمیان میں آ کر جو یوں ٹوٹے' تو عرب اس کو خیانت کہتے ہیں۔ جسے آپ وعدہ دیتے ہیں' عہد دیتے ہیں' اور جب اس عہد کو آپ توڑتے ہیں'' تے فیر ایس طراں دی جنیہڑی رسی ہے' کھوہ تے کھلوتے ہوئے دی ٹٹی

---

1. اگلی نسل نے تو کہیں کھوہ (کنوئیں) دیکھے ہی نہیں ہیں۔ انہیں بتائیے کہ ''ٹِنڈ'' کیا ہوتی ہے تو انہیں تو پتہ ہی نہیں چلے گا۔ ان سے پوچھو کہ ''لد'' کیا ہوتی ہے تو یہ کہیں گے کہ اس کا ترجمہ کرو۔

ہیگی اے [1]''۔ آپ نے دیکھا کہ اس عہد کی اہمیت کتنی ہے اور قرآن اسے کہاں لایا ہے؟ اس وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ (2:177) کے اندر وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا (2:177) ہے یعنی دارومدار ہی Mutual Trust (باہمی اعتماد) پہ چلتا ہے۔

یہ جسے آپ لاقانونیت کہتے ہیں' وہ ہوتا کیا ہے؟ یہ کہ وہ Mutual Trust (باہمی اعتماد) اٹھ جاتا ہے۔ امن کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ آپ نہایت اطمینان سے' یہاں سے نکلتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اِدھر اُدھر آپ کے دائیں بائیں انسان پھر رہے ہوتے ہیں' آپ کو کسی کی طرف سے کوئی خدشہ' کوئی خوف' کوئی بے اطمینانی نہیں ہوتی۔ بھرے میلے میں ہزاروں نامانوس آدمی' اجنبی لوگ ہیں' جن کے اندر آپ پھر رہے ہیں' پوری انارکلی [2] میں سے گزر جاتے ہیں' راتوں کی تنہائیوں میں آپ چلے جاتے ہیں' یہ سارا کچھ ہوتا ہے۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ آپ کو ایک دوسرے کے اوپر اعتماد ہے' ٹرسٹ ہے۔ اور اس کے بعد جب آپ کہتے ہیں کہ بھئی! نہیں' اب باہر نہیں نکل سکتے۔ یہ کیا بات ہوگئی؟ وہی انسان ہیں' جن کے اندر روز آپ پھر رہے تھے۔ اب ہوا یہ کہ ان سے آپ کا بھروسہ اٹھ گیا کہ پتہ نہیں کون کس وقت خنجر گھونپ دے۔ انسانی زندگی اجتماعی زندگی ہے' یہ انسان Social Animal (سماجی حیوان) ہے' اس نے مل جل کر رہنا ہے۔ مل جل کر آپ اعتماد اور بھروسے کی بنا پر ہی رہ سکتے ہیں۔ جونہی آپ کا بھروسہ اٹھا' اعتماد اٹھا' ایک دوسرے سے Trust اٹھا باہر تو ایک طرف' گھر کے اندر بھی آدمی رات کو سو نہیں سکتا اگر میاں بیوی کے اندر اعتماد اور بھروسہ باقی نہ رہے تو بھی سو نہیں سکتا۔ یہ ہے وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ (2:177)۔ عہد کے معنی صرف یہ معاہدات اور Treaties (میثاقات) ہی نہیں ہیں' وہ بھی اس میں آتے ہیں جیسا میں نے کہا ہے لیکن یہ تو قدم قدم کے اوپر باہمی اعتماد اور بھروسے اور Confidence (اعتماد) کی چیز ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ یہ ہیں بر کی راہیں۔

لفظ بر کا وہ قرآنی مفہوم جس کے تحت الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ کے نظام کو عملی شکل دی جاتی ہے

بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اگر ترجمہ نیکیاں ہی کرنا ہے' تو یہ کن کی نیکیاں ہیں؟ یہ کہ مال کو اس کی محبت کے باوجود دوسروں کی ضروریات کے لیے کھلا رکھنے والے' اس اپنے میں اور بیگانے میں کوئی تمیز نہیں کرتے' پھر اس کے بعد وہ قریبی ہو' تنہا رہ گیا ہو' کاروبار چلتا ہوا رک گیا ہو' ضرورت پوری نہ ہوتی ہو' اور کسی قسم کی دوسروں کی غلامی کے اندر ہو۔ یہ جو چیز تھی اس کے لیے اَقَامَ الصَّلٰوۃَ انفرادی چیز نہیں ہے۔ انفرادی طور پہ تو اس وقت' میں نے عرض کیا ہے' کیا جائے گا جب تک یہ نظام پورا نہیں ہوتا۔ کہا کہ یہ چیز انفرادی خیرات تک اپنے ذہن میں محدود نہ رکھنا کیونکہ یہ چیز سرگرم سرگرم کرتے رہنے سے یہ معاملہ پورا نہیں ہوگا۔ اصل مقصد تو وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ ہے یعنی ایک ایسے معاشرے کا قیام تا کہ اس میں ان قوانین کا اتباع خود بخود ہوتا چلا جائے۔ اور مقصد اس کا

---

[1] تو پھر اس طرح کی جوری ہوتی ہے' وہ کنویں پر کھڑے ہوئے بھی ٹوٹ جاتی ہے۔

[2] شہر لاہور کا ایک پرانا خوبصورت بازار۔

نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما دیتے چلے جانا ہے لہٰذا اس کے لیے ضروری چیز باہمی اعتماد کا ہونا' ٹرسٹ کا ہونا ہے۔ اس لیے **وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا** (2:177) کہا ہے۔ یہ ہوگا نظام۔

اب عزیزانِ من! اس نظام کا مفاد پرست گروہ' خواہ وہ اس ملک کے اندر ہوں یا ملک کے باہر ہوں' ان کے ساتھ تو ٹکراؤ ضرور ہوگا۔ اس ٹکراؤ کے زمانے میں اب یہ دیکھیے کہ یہ ''تکیے دے فقیراں دا مذہب نئیں'' ایلۂ مسجد کا بھی مذہب نہیں' یہ مجاہدین کا دین ہے۔ یہاں اس ٹکراؤ میں جو صورت پیدا ہوتی ہے اسی کے ساتھ یہ کہا کہ **وَ الصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ** (2:177) مخالف قوتیں آمادۂ پیکار ہو جائیں' اس کے اوپر کوئی حادثہ آتا ہے' کوئی واقعہ گزرتا ہے' کوئی مصیبت آتی ہے' کوئی مشکل پیش آتی ہے' قحط پڑتا ہے' سیلاب آتا ہے' تو وہ اس میں ہمت ہار کر بھاگ نہیں اٹھتے وہ **وَ الصّٰبِرِيْنَ** ہیں۔ وہ تو پھر میں نے کہا ہے کہ اگر آپ اردو یا پنجابی میں صبر اپنے ہاں لیں گے' تو اس کے تو معنی ہونگے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے والا ''سوائے صبر دے چارہ ای کوئی نئیں ہیگا❶''۔ یہ بے چارگی کا نام رکھنا ہے اور اس کے بعد کہنا کہ اس کے سوائے کچھ چارہ نہیں ہے' گویا یہ بھی ایک چارہ ہے۔ جی نہیں۔ اس کے معنی ہیں: ''استقامت سے' ہمت سے' برداشت کرنے والا' ذرا بے ہمتی یا بزدلی اس کے اندر نہ آئے' جم کر کھڑے ہو جانے والا''۔ اسے صابر کہتے ہیں۔ معاشرے کے اندر کوئی اس قسم کا ہنگامی حادثہ ہو یا باہر سے اس چیز کو توڑنے کے لیے کسی قسم کی کوئی چیز ایسی آئے' کسی کے ساتھ جنگ ہو جائے' ان معاملات میں ہمت سے' استقلال سے' جم کر کھڑے ہو جانے والے صابرین ہیں۔

چند ایک رسومات کے ادا کرنے کا عمل غیر قرآنی معاشرے کا علاج نہیں

اب اس کے بعد آگے ایک عجیب چیز آئی۔ تم یہ پوچھتے تھے کہ مومن کون ہوتا ہے؟ اور اس کے ایمان کی صداقت کا ثبوت کیا ہوتا ہے؟ تمہارے دل میں یہی سوالات تھے۔ ہم نے بتا دیا کہ محض رسومات کو ادا کر لینے والا' محض زبان سے چند کلمات کہہ دینے والا' نہ یہ مومن ہے' نہ وہ عمل ہے' نہ وہ بر ہے' نہ یہ تقویٰ ہے۔ یہ چیزیں ہیں' جو کہی ہیں۔ یہ سارا کچھ کہنے کے بعد کہا کہ **اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا** (2:177) یہ ہیں جو اپنے دعوئے ایمان کو سچ کر کے دکھاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ دعوے کی صداقت پر نتائج دلیل بن گئے۔ یہ چیزیں نہیں ہیں تو ایمان کا کچھ فائدہ نہیں ہے' اگر عمل کے اندر اس کا اظہار نہیں ہوتا۔ آپ کو ہزار فارمولے یاد ہوں' ڈاکٹر کے لاکھوں نسخے ازبر ہوں' کسی مریض کو نہ دیں' مریض اس کو برت کر نہ دیکھے' اس کا نتیجہ نہ نکلے' تو اس کا فائدہ کیا ہے۔ وہ تو ''فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا''۔

---

❶ صبر کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔

فریبِ نفس انسانی صلاحیتوں کو پامال کردیتا ہے

کہا ہے کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا (2:177)۔ تمہارے ہاں سوال پیدا ہوتا تھا' سب سے بڑی چیز یہی ہے کہ متقی کون ہوتا ہے؟ کہا کہ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ (2:177) یہ ہیں جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے دعوے دار تھے۔ یہ کچھ کر کے دکھاؤ۔ اب یہ چیز آئی کہ لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ (2:177) یونہی اپنے آپ کو دھوکا دے کر نہ بیٹھ جاؤ کہ ہم نے ان تمام جزئیات اور رسومات کی ایک ایک تفصیل کو ٹھیک ٹھیک انداز ے اور قاعدے کے مطابق درست پڑھ دیا اور اس کے بعد اسے کہا گیا کہ ہاں جناب! تمہاری نماز ہوگئی۔ ''اوئے تیری نماز نئیں ہوئی اے [1] '' وہاں سے للکار آتی ہے ''او کنڈ کے کھلو جاندا ہیگا: جی! او کیوں نئیں ہوئی ہیگی؟ میں دیکھیا سی تیرے انگوٹھے جیہڑے سن او کناں دی لونوں نئیں او ہناں چھویا ہیگا' تھلیوں دی ایوں آ گیا۔ فیر مڑ کے پڑھ۔ او پہلاں کی نئیں سی ہویا جیہڑا ہن [2] ہو گیا''؟۔ عزیزانِ من! پہلے نہیں ہوئی تھی تو اس کے معنی یہ تھے کہ وہ نتیجہ نہیں نکلا جو اس نماز سے نکلنا چاہیے تھا۔ تمہیں بتانا پڑے گا کہ کیا نہیں ہوا تھا؟ میری نماز کیوں نہیں قبول ہوئی؟ تمہیں کیسے پتہ چل گیا؟ مجھے سمجھاؤ' کیسے نہیں ہوئی تھی؟ اب جو تم نے کہا کہ یہ کرو تو اب اس کے بعد بتاؤ کہ یہ کیسے ہوگئی ہے' بارِ ثبوت تمہارے ذمے ہے۔ قرآن وہ کہتا ہے کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا (2:177) یہ ہیں جنہوں نے اس دعوے کی صداقت میں ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ نماز قبول ہوگئی۔

مذہب کی دنیا انسان کو ہمیشہ خوش فہمی میں مبتلا رکھتی ہے' تعمیری نتائج سے کبھی ہم کنار نہیں کرتی

عزیزانِ من! یہ ہے کہ مذہب کی دنیا میں انسان خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے۔ چند الفاظ دہرا دیئے' چند حرکات و سکنات ہیں ان کو بجا لایا' مطمئن ہوگیا کہ میرے ذمے جو کچھ تھا' وہ ہوگیا اور بس۔ اس کے لیے کوئی ٹیسٹ نہیں' کوئی کسوٹی نہیں' اس کے پاس کوئی میزان نہیں۔ دین میں ہر عمل کی میزان ہے' ہر آن تلتا ہے' اس کے نتائج مرتب ہو کر سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ جب نتیجہ مرتب نہیں ہوتا تو کھڑے ہو کر اس ڈاکٹر کو سوچنا پڑتا ہے کہ یہ جو دوائیاں میں نے دی تھیں' ان سے بخار نہیں اترا' کم نہیں ہوا' یا تشخیص میں غلطی ہے یا نسخے میں غلطی ہے یا دوائی صحیح نہیں پہنچی' یہ یقینی بات ہے۔ اور اگر ڈاکٹر صاحب وہ ہوں جو ایک گھنٹہ میں تین سو مریض بھگتائیں' وہ بھی اس طرح کہ ''

---

[1] ابھی! تمہاری نماز نہیں ہوئی۔

[2] وہ اکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے: جی! کیوں نہیں ہوئی ہے؟ میں نے دیکھا تھا کہ جو تیرے انگوٹھے تھے انہوں نے تمہارے کانوں کی لو کو نہیں چھوا تھا' نیچے سے ہی آ گئے تھے۔ دوبارہ نماز پڑھو۔ بتاؤ کہ پہلے کیا نہیں کیا تھا جواب کر دیا ہے؟

پر چی ایتھے' گل کمپوڈر نال کردا پیا' اے قلم رجسٹر دے لگدی پئی اے' او کہندا اے: جی کج نئیں ہویا' ہو جائے گا' او جی ایویں پیڑ ہوندی اے' ہٹ جائے گی ❶''۔ نہیں عزیزانِ من! اسے تو کھڑے ہو کر سوچنا پڑے گا کہ نقص کہاں رہ گیا۔ اس لیے کہ اس کے اس دعوے کی جو دلیل تھی کہ اس نسخے سے اسے آرام ہو جائے گا' اس کی صداقت کی دلیل یہ تھی کہ اسے آرام ہو' وہ ہو گیا اس طرح سے دین اپنے دعاوی کی صداقت کے ثبوت مہیا کرتا ہے۔ آگے کہا ہے کہ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (2:177) وہ لوگ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوئے خطرات کی گھاٹیوں سے بچتے ہیں۔ اور یہ چیز تھی' جو کہی کہ بیرونی خطرات کے مقابلے میں اس قدر مدافعت ہے۔ اب اس کے بعد یہ جو آپ کے ہاں کا اندرونی دائرہ ہے اس کے بعد قرآن اس کی طرف آیا۔

انسانی زندگی کی اہمیت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کے وجود سے انسانی ذات کی نشوونما پاتی ہے

سب سے پہلی چیز' جس کے لیے قرآن اہمیت دیتا ہے' وہ انسان کی جان کی قیمت ہے۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی بڑی گراں بہا متاع ہے۔ قرآن اس کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ یہ اسے کیوں اتنی اہمیت دیتا ہے؟ اس لیے کہ اس کا مقصد انسانی ذات یا اس کے نفس یا اس کی خودی یا اس کی Personality (شخصیت) کی Development (نشوونما) ہے۔ اور زندگی کی اس سطح پہ' جہاں تک یہ Evolution (ارتقا) سے پہنچی ہے' انسانی ذات کی نشوونما اس کے جسم کے اندر رہتے ہوئے ہو سکتی ہے۔ یہ اس کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔ تو قرآن اس ذریعے کو اتنی اہمیت دیتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے جب یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ ذریعہ ہے تو ذریعہ تو بڑا اہم ہوتا ہے۔ سفر میں جانے والے کے لیے اس کا گھوڑا' سپاہی کے لیے اس کی بندوق' بڑی اہم چیزیں ہیں۔ یہ جسم انسانی ذات کی نشوونما کے لیے ضروری ہے لیکن قرآن پھر اس کو مقصود بالذات نہیں کہتا' اس کو ذریعہ کہتا ہے۔ جب کبھی اس مقصد میں انسانی ذات کی نشوونما میں اور اس ذریعہ یعنی جسم میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے اور یہ اس نشوونما کے راستے میں سدِ راہ بن کر کھڑا ہو جائے' اس وقت وہ کہتا ہے کہ اس جسم کی جان کا جو دے دینا ہے' یہ ہے نیکی کی راہ۔

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

(اقبالؒ)

Preservation of Self (تحفظِ خویش) نہایت ضروری ہے۔ کاہے کے لیے ضروری ہے؟ ذات کی نشوونما کے لیے۔ اور اگر

---

❶ پر چی یہاں ہے' بات کمپوڈر سے ہو رہی ہے' قلم ہے جو رجسٹر پر لکھ رہی ہے۔ وہ (مریض) کہتا ہے: جی! دوا سے کچھ فرق نہیں ہوا' (ڈاکٹر) کہتا ہے کہ ہو جائے گا' مریض کہتا ہے کہ جی! اس طرح درد کی ٹھیسیں اٹھ رہی ہیں' وہ کہتا ہے کہ ہٹ جائے گی (اور اسی طرح مریضوں کو بھگتائے جا رہا ہے)۔

یہی اس کے راستے میں آ کر کھڑا ہو جاتا ہے' تو وہاں وہ یہ کہتا ہے کہ پھر اب اس کا جو دے دینا ہے' یہ ضروری ہو گیا۔ انسانی جان کی' انسانی زندگی کی' بڑی اہمیت ہے۔ بات میں یہ کہہ رہا تھا۔ اور وہ اہمیت اتنی ہے کہ کہا ہے کہ مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًاۢ بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا (5:32) یاد رکھو! جس نے کسی ایک کی زندگی ناحق لے لی' بجز اس کے کہ جہاں عدل وانصاف کا تقاضا ہو' جس نے کسی ایک جان کو ناحق تلف کر دیا یا ملک میں فساد برپا کر دیا' بجز اس کے کہ فساد پیدا کرنے والے مجرمین کو قانون کے مطابق سزائے موت دی' کہا کہ یوں سمجھو گویا کہ اس نے پوری نوعِ انسانی کو ہلاک کر دیا۔ اس کی اہمیت آپ دیکھتے ہیں' اس کے برعکس پھر آگے کہا کہ وَ مَنۡ اَحۡيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا (5:32) جس نے کسی ایک جان کو بچا لیا' یوں سمجھو جیسے اس نے پوری انسانیت کو بچا لیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن نے اس کو کتنی اہمیت دی ہے۔ اسی کے پیشِ نظر اس نے کہا کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِصَاصُ فِى الۡقَتۡلٰى (2:178)۔ معاشرے میں امن برقرار رکھنے کے لیے جان کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔

انسانی جان کی حفاظت کا سوال ہو یا ذات یا خودی کی نشو و نما کا معاملہ' اس کے لیے معاشرتی نظام ایک لازمی جز ہے

جان کی حفاظت کے لئے' یہ ٹھیک ہے کہ میرا فریضہ ہے کہ میں اپنی جان کی حفاظت کروں' آپ کا فریضہ ہے کہ آپ اپنی جان کی حفاظت کریں لیکن اجتماعی زندگی کے اندر ایک فرد تو اپنی حفاظت کا پورا اہتمام و انتظام نہیں کر سکتا' یہ تو پورے معاشرے کا کام ہوتا ہے۔ اس لیے اس نے یہ کہا کہ یاد رکھو! اگر کہیں اس قسم کی لاقانونیت آ جائے یا کوئی شخص قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر کسی دوسرے کی جان لے لیتا ہے' زندگی تلف کرتا ہے تو قانون یہ مقرر کیا جاتا ہے کہ قاتل کو معاشرہ کی طرف سے سزا ضرور دی جائے' اسے خود معاشرہ یا نظام کے خلاف جرم سمجھا جائے' افرادِ متعلقہ کے خلاف نہیں۔ عزیزانِ من! یہ ہے قرآن۔ یہاں اس مقتول یا مقتول کے وارثوں کے متعلق نہیں ہے کہ جاؤ' اس کا انتقام لیتے پھرو' تم اپنی حفاظت آپ کرو۔ یہ بات نہیں ہے۔ کہا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِصَاصُ (2:178) اے ایمان والی جماعت کے معاشرے! یہ معاشرے کا فریضہ ہے کہ جہاں کہیں کوئی اس قسم کی واردات ہو کہ کسی کی جان ناحق تلف ہو گئی ہے' یہ معاشرے کا فریضہ ہے کہ یہ قصاص لے۔

قصاص کا قرآنی مفہوم

اب یہاں لفظ قصاص آیا ہے۔ عام طور پہ اس کا یہ ترجمہ کیا کرتے ہیں ''اس کی جان لے لینا' اس کو سزا دے دینا'' اس کے یہ معنی نہیں ہوتے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''ملزم کا یا مجرم کا اس طرح سے پیچھا کرنا کہ اس کو آخر میں جا کر پکڑ لیا جائے''۔ قص (ق ص ص) کے

معنی ہوتا ہے ''کسی کے پیچھے پیچھے چلنا'' جنوں کیندے نیں پئی جا تاہاں کتھوں تیکر جائیں گا توں ❶''۔ ہر مجرم کے متعلق معاشرہ اٹھ کر یہ کہے گا کہ تم کہاں جاسکتے ہو؟ کہیں نہیں جاسکتے تم۔ قصاص اسے کہتے ہیں۔ یہ جواب بھی ہمارے ہاں یہ منٹگمری (موجودہ ساہیوال) کے ضلع میں ''اوجیہڑے کھوجی ہوندے ہیگے نیں ناکھراکڈن والے'' ❷ وہ عربوں کے زمانے کا قصاص ہوتا تھا۔

کہا ہے کہ یہ پورے معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ ''اوکھرا نپے پہلاں ملزم دا ❸'' پھر وہاں جا کر اس کو پکڑے۔ یہاں جس بے چارے کا کوئی مرجاتا ہے تو وہ جو مرنے والا ہے' وہ تو مر گیا' یہ جو زندہ ہوتے ہیں' بعد میں ان پہ زندگی حرام ہوجاتی ہے۔ اس مرنے والے کی کمی کی وجہ سے ہی صرف نہیں' یہ جو قانون کا تقاضا ہے کہ یہ جو اس کے بعد قاتل ہیں یا اس کے ساتھ اور حمایتی ہیں' ان کو گرفتار کرانا' ان کو عدالت میں لے جانا' ان کو پھر سزا دلوانا' یہ سارا کچھ یہ جو اس کے بعد رہ جاتے ہیں' ان کے لیے وبالِ جان ہوجاتا ہے۔ اور یہ تو پتہ ہے کہ پھر مقتول کے وارثوں کو کتنا وبالِ جان ہوتا ہے۔ '' مراثی دے گھر چوری ہوگئی۔ پولیس آ بیٹھی' او ہناں کہیا: لکھا' او کی کی گیا تیرا؟ او ہنے کیا: جی ایک میرا گو لا گیا' اک ایتھے دیگچی پئی سی' اووی لے گیا کوئی۔ اووی لکھ لیا او ہنے' اک ایتھے تھوڑا سا صندوقچا جیا سی' اووی لکھ لیا' کہن لگا: جی ہور لکھو اک میری پرات گئی' کہن لگے: او پرات تے اے سامنے پئی ہوئی اے' کہن لگا: جی او پہلے گیاں سن' ہُن ایہہ جاندی نیں'' ❹۔

قرآن حکیم اصول ہی ایسا متعین کرتا ہے کہ قوانین کی لمبی چوڑی فہرستیں بنانے کی ضرورت ہی نہ پڑے

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے' کہتا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ (2:178) او! یہ اس کی ذمہ داری نہیں ہے' یہ اسی کا فریضہ نہیں ہے جس کا مال گیا ہے' یہاں یہ سوال نہیں ہے۔ یہ تو تمہارے معاشرے کا فریضہ تھا کہ وہ ہر فردِ معاشرہ کی جان اور مال کی حفاظت کرتے۔ اگر ایک فرد کی جان گئی ہے' تو اس میں اپنے فریضے کی ادائیگی میں تم سے کوتاہی ہوئی ہے' تمہارا فرض ہے کہ اٹھ کر اس کوتاہی کو پورا کرو۔ کہتے ہیں کہ قرآن کے قوانین کی فہرست بنائیے۔ برادران عزیز! فہرست کا سوال نہیں ہے۔ قرآن اصول ایسے

---

❶ جسے کہتے ہیں کہ جاؤ تو' کہاں تک جاؤ گے۔

❷ وہ جو کھوجی ہوتے ہیں' قدموں کے نشان لے کر ان کا تعاقب کرنے والے۔

❸ ملزم کے نقش پا کے پیچھے پیچھے چلے۔

❹ ایک مراثی کے گھر چوری ہوگئی' پولیس آ گئی۔ اس نے کہا کہ لکھاؤ تمہارا کیا کچھ چوری ہوا؟ مراثی نے کہا کہ ایک میرا بڑا سا برتن تھا اور یہاں ایک دیگچی تھی وہ بھی کوئی لے گیا۔ اس نے وہ بھی لکھ لیا۔ مراثی نے کہا کہ ایک یہاں چھوٹا سا صندوقچہ سا تھا۔ اس نے وہ بھی لکھ لیا۔ پھر مراثی کہنے لگا کہ پھر اور میری ایک پرات گئی۔ پولیس والے کہنے لگے کہ یہ لو پرات تو یہ سامنے پڑی ہے' وہ مراثی کہنے لگا کہ وہ پہلے گئی تھی اب یہ جاتی نہیں۔

دیتا ہے' میں کہتا ہوں کہ یہ جو اتنا سا اصول ہے کہ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى (2:178) آپ دیکھتے ہیں اس اصول کے تحت جو آپ کے ہاں پھر قانون کا ضابطہ بنے گا' وہ بنے گا کیا! مقتول یا اس کے وارثوں کو یا مظلوم کو تو یہ کہا ہی نہیں ہے۔ مظلوم کو کیا کہا ہے؟ یہ کہ وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (17:33) انسانی زندگی جسے خدا نے واجب الاحترام قرار دیا ہے' اسے کہیں ضائع نہ کرو بجز اس کے کہ اسی کے قانون کا تقاضا ہو کہ ایسا کیا جائے۔ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا (17:33) جو ظلم سے مارا گیا دیکھیے! پہلے بالحق کہا گیا' ہر مارے جانے والے کے متعلق نہیں ہے۔ قاتل کو سزائے موت ملتی ہے کہ وہ اس کا جو قتل ہے بالحق ہے۔

قرآنی معاشرے میں کوئی فرد بھی لا وارث نہیں ہوتا' وہاں ہر فرد ایک دوسرے کا نگران ہوتا ہے

کہا ہے کہ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا (17:33) تو اس کا جو وارث رہ گیا ہے' وہ یہ نہ سمجھے کہ میرے ہاں کا تو ایک فرد تھا' وہ چلا گیا' میں تو لا وارث رہ گیا' میری کون سنے گا؟ کہا کہ ہم نے اس کے لیے تقویت کا موجب اس معاشرے کو خود اسلامی حکومت کو بنایا ہے۔ یہ اس مظلوم کے وارثوں کا جو وہ اب تنہا رہ گئے ہیں' ہم نے تمہیں اس کے لیے سلطان بنایا۔ سلطان! قرآن کیا بات کہہ گیا ہے! اتھارٹی' Power بنایا۔ بظاہر تو وہ ایسا ہے کہ جس بے چارے کے پاس نہیں رہا' لا وارث رہ گیا ہے' 'بانہاں کوئی نئیں رہیاں اوہدیاں ٹٹ گیاں۔ اوکہن لگے ڈرنہ [1]'' یہ سارا معاشرہ جو ہے اس لیے ہم نے اس معاشرے کو قائم رکھا ہے کہ وہ تیرا حمایتی بنے۔ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (17:33) لوگ سمجھتے تھے کہ ان کا کوئی ہے نہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم ہیں اس کے۔ اس کو نصرت اور حمایت اور قوت اور تائید ہماری طرف سے پہنچے گی۔ یہ ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى (2:178)۔

قرآن حکیم میں عدل و مساوات کی آیات کے سلسلہ میں مروجہ تراجم کی نوعیت

اور اس کے بعد عدل کا' مساوات کا ایک اصول بیان کیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں کہ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى (2:178) اس باب میں مجرم اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔ مجرم خواہ کتنا ہی بڑا اور مقتول کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو' عدل کے معاملہ میں دونوں کو یکساں سمجھا جائے اس لیے کہ ہر انسانی زندگی وہ مرد آزاد کی ہو یا غلام کی' عورت کی ہو یا مرد کی یکساں قیمتی ہے۔ اب اس کا ترجمہ اور مفہوم غلط لیا جاتا ہے کہ آزاد کے بدلے میں آزاد' غلام کے بدلے میں غلام' عورت کے بدلے میں عورت۔ اب اگر اتنا سا ہی ترجمہ دے دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہو گئے کہ اگر کسی غلام نے کسی آزاد کو مار دیا ہے' تو یہاں ہے الحر بالحر آزاد کو مارا گیا ہے تو

---

[1] اسکی کوئی طاقت نہیں رہی' ٹوٹ گئی وہ طاقت۔ وہ معاشرہ کہنے لگا کہ مت ڈرو۔ (ہم تمہارے ساتھ ہیں)۔

کسی آزاد کو مارنا ہوگا'' تے او غلام نوں چھڈ دیئو تے کوئی آزاد نوں لبھو ❶''۔ کسی غلام کو کسی آزاد نے مار دیا ہے تو وہ جو آزاد مجرم ہے اسے آپ کچھ نہیں کہہ سکتے' کوئی غلام تلاش کرو۔ اور اگر کسی مرد نے کسی عورت کو مار دیا ہے'' مرد دے تے پھایا لگ ہی نہیں سکتا ❷'' قرآن نے وَ الۡاُنۡثٰی بِالۡاُنۡثٰی کہا ہے۔'' تے عورت لبھوں جنوں پھایا دینا ہیگا' میں تے کج نئیں کیتا' خدا نے کہیا اے ❸ وَ الۡاُنۡثٰی بِالۡاُنۡثٰی ''مقتول جو عورت ہوئی۔

عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ یوں ترجمہ کرنے سے بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔ وہ تو اس نے یہ مساوات کا اصول اتنا عظیم دیا ہے کہ اس میں کسی قسم کی رورعایت کا سوال ہی نہیں ہے۔ اب اس غلط مفہوم کی مثالیں سنیے وہ جو گاؤں کا بڑا چوہدری ہے' وہ روز جس ہے جی چاہے ڈاکا ڈالوئے گا' جس کا جی چاہے قتل کروا دے' اس کے بعد اگر کہیں آئیں'' تے آپڑے نوکراں اچوں دو بندے گاں کر چھڈے ❹'' یہ روز ہوتا ہے۔ وہ یہ بات ہے کہ تمہارے ہاں معاشرے کے اندر کہیں یہ بات نہ ہو جائے کہ یوں رعایت ہونی شروع ہو جائے۔ یا جو معاشرے کے اندر اس قسم کے بیچارے آپ کے کوئی غلام' کوئی ملازم ہیں' ان کو رکھا ہی آپ نے اس لیے ہے کہ جو کچھ آپ کرواتے رہیں'' اندر اوہناں نوں پھڑاندے رہو ❺''۔ ہمارے ہاں روز یہ ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ چیز جو یہاں اصولاً بیان کی ہے کہ اس قتل میں کوئی رعایت نہیں ہے۔ اگر چوہدری بھی قاتل ہے جس نے حر یعنی آزاد کو قتل کیا ہے' تو وہی ہے جس کو سزا ملے گی' یہ نہیں ہے کہ اس کے بدلے میں' تم اس کے نوکروں کو پکڑ لو یا وہ بھی اپنے مزارعوں کو بھیج دے۔ یہ سوال ہی نہیں ہے۔ کسی کے بدلے میں کوئی دوسرا نہیں پکڑا جائے گا۔

مقتول کے وارثوں کے لیے خون بہا کے قانون کی وضاحت اور ہمارے ہاں پایا جانے والا غلط تصور

قرآن کہتا ہے کہ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی (53:38) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ عدل کا یہ تقاضا ہے' یہ کیا جائے گا۔ آگے کہا ہے کہ فَمَنۡ عُفِیَ لَہٗ مِنۡ اَخِیۡہِ شَیۡءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیۡہِ بِاِحۡسَانٍ (2:178) اس کا ترجمہ یہ ہے کہ جس کو اس کا بھائی یعنی مقتول کے وارثوں میں سے کوئی' جس کو کچھ معاف کر دے تو وہ ٹھیک ہے' وہ اسے

---

❶ غلام کو چھوڑ دو اور کسی آزاد کو تلاش کرو۔
❷ مرد کو تو پھانسی لگ ہی نہیں سکتی۔
❸ پھر عورت تلاش کرو جسے پھانسی پہ چڑھانا ہو۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا حالانکہ خدا نے کہا ہے کہ......
❹ نوکروں میں دو آدمیوں کو جنہیں وہ آگے کرے آ کر پکڑ لیں۔
❺ اندریں صورت انہیں ہی گرفتار کرواتے رہو۔

ادا کرے اوراس کی کمی کو پورا کرے۔قرآن کے اتنے ٹکڑے سے ہمارے ہاں ایک ایسا غلط قانون بن گیا ہوا ہے' جسے شریعت میں دیت یا خوں بہا کا قانون کہتے ہیں۔وہ یہ ہے کہ قتل کسی قسم کا ہو'وہ جو مقتول کے وارث ہوتے ہیں'ان کو اجازت ہے کہ وہ اس قاتل سے کچھ خوں بہا لے کراس کو معاف کردیں۔آپ دیکھیے کہ یہ چیز معاشرے میں کتنے بڑے فتنے کا موجب بن جاتی ہے اور بنتی ہے۔بھائی بھائی کا دشمن ہے۔وہ اپنے کسی ایک سے کہہ کر اس کو قتل کرا دیتا ہے۔اب جو مقتول ہے'اس کا وارث یہ بھائی ہے۔اب اس بھائی کو اجازت دیدی جاتی ہے کہ وہ اس قاتل سے کچھ لے کر اس کو معاف کردے۔''سوروپے نال سودا کرلیا پلےاوں ای اوہنوں دے کے'اپنے کول لے لیا۔اے معاف ہوگیا جنوں قتل کرانا سی اوکرادتا❶''۔آپ دیکھیے یہ چیز!مقتول کے وارث کو یہ حق ہے کہ وہ قاتل سے براہِ راست معاملہ کرے اور اس سے کچھ پیسے لے لے اور یہ معاملہ ختم ہوگیا۔آپ دیکھیے کہ پھر ہوگا کیا؟اس سے کتنی بڑی انارکی (خلفشار) قتل کے معاملے میں پھیل جائے گی۔کیا یہ خدا کا قانون ہوسکتا ہے؟

قرآن حکیم نے قتل کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے: قتل عمد اور قتل خطا

برادرانِ عزیز!دیکھیے' قرآن یہ بات کہاں کہتا ہے۔اور یہی چیز ہے جس کو ہمارے قانون بنانے والوں نے نظر انداز کیا ہے۔خوں بہا ہے جسے دیت کہتے ہیں۔کہا ہے کہ وَ مَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ اَنۡ یَّقۡتُلَ مُؤۡمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا (4:92)۔اس نے کہا ہے کہ قتل کی دو قسمیں ہیں'جرم کی دو قسمیں ہیں:ایک یہ قتلِ عمد'ارادتاً کسی کو قتل کرنا ہے'ایک یہ قتلِ خطا ہے' کہ قتل کرنے کا ارادہ نہیں ہے'وہ کسی طرح خطا کے طور پر'غلطی سے'سہواً کوئی ایسی بات ہوگئی ہے'جس سے اگلا قتل ہوگیا ہے۔یونہی اتفاقاً بندوق چل گئی'یہ قتلِ خطا ہے۔قرآن نے دونوں قسم کے قتل کے اندر خود یہ فرق کردیا کہ وَ مَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا (4:93)۔یہ دیکھیے'یہاں مُّتَعَمِّدًا اور خطاً ہے۔یہ جو خوں بہا ہے'دیت ہے'جس میں اس وارث کو اجازت دی جاتی اس میں یہ ہے کہ فَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَۃٍ مُّؤۡمِنَۃٍ وَّ دِیَۃٌ مُّسَلَّمَۃٌ اِلٰۤی اَہۡلِہٖۤ (4:92)وہ ایک تو کسی غلام کو آزاد کریں اور یہ جو اس کے وارث ہیں'ان کو خوں بہا دیں۔یہ صرف قتلِ خطا میں اس کی اجازت ہے۔اور یہی چیز ہے یہاں قرآن نے جس میں کہا ہے کہ ذٰلِکَ تَخۡفِیۡفٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ رَحۡمَۃٌ(2:178)ٹھیک ہے یہ قتل تو ہے لیکن جب یہ خطا کی چیز ہے'دانستہ نہیں'بالارادہ نہیں'اس کی سزا کے اندر بھی عدل کا تقاضا ہے کہ تخفیف کی جائے۔

وارثان کو قتل عمد کی صورت میں خون بہا وصول کرنے کی اجازت ہی نہیں

عزیزانِ من!کیا بات ہے اس تخفیف کی!یہ صرف اس میں ہے'یاد رکھیے۔اور وہ جو قتلِ عمد ہے'بالارادہ ہے'اس میں مقتول کے

---

❶ (قتل کے لیے) سوروپے کا سودا کیا۔اپنے ہی پاس سے سوروپیہ دے کر (قتل کے بعد) لے لیا۔یہ قتل معاف ہوگیا' جسے قتل کروانا تھا'وہ کروادیا۔

وارثوں کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ خود کوئی فیصلہ کر کے خوں بہا یا دیت لے لیں۔ بالکل نہیں۔ وہ ---- Versus ---- State ہے کراؤن (Crown) [1] کا کیس ہے' معاشرے کا مجرم ہے' وہ مملکت کا مجرم ہے۔ اس میں قرآن کی رو سے خوں بہا اور دیت کی کوئی اجازت نہیں ہے وہاں موت کی سزا موت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ اس قسم کے حالات ہوں' جن میں سزا میں کمی کی جاسکتی ہو تو یہ عدالت کی صوابدید کے اوپر ہے' مقتول کے وارثوں کو اس کے اندر یہ حق نہیں ہے کہ وہ اگر چاہیں تو اس کو معاف کر دیں اور پیسے لے لیں۔ اس میں جس قدر فساد کا امکان ہوسکتا ہے' وہ روز ہمارے سامنے اس قسم کے قتل ہوتے ہیں۔ اس ایک غلط قانون سے ہر قسم کے قتل میں اجازت دے دی جاتی ہے کہ مقتول کے وارث قاتل سے سودا کر کے خوں بہا لے لیں۔

قتل بالعمد کی سزا موت ہے کیونکہ قاتل معاشرے کا مجرم ہے

برادرانِ عزیز! یہاں شہری زندگی میں تو یہ چیزیں پتہ نہیں چلتی ہیں یا نہیں' گاؤں کی زندگی میں یہ چیزیں معلوم ہوتی ہیں کہ جائیداد کے ورثہ کے لیے کیا کچھ کرایا جاتا ہے؟ اس کے مرنے کے بعد ایک ہی اس کا مالک یعنی وارث ہوتا ہے وہ ادھر سے ساری کی ساری یہاں آرہی ہوتی ہے' تیسرے دن قتل کرا دیا جاتا ہے۔ اب اسے قتل کرانے کے بعد مقتول کا یہی ایک وارث ہوتا ہے یہی اس سے وہ سودا کرتا ہے۔ تو یاد رکھیے! یہ دو چیزیں ہیں۔ قتل بالعمد کی سزا موت ہے' اسی کو قتل بالحق کہا ہے یعنی قانون کے' عدل کے' تقاضے کے مطابق کسی کی جان لے لینا۔ اور یہ جو دیت ہے جس میں یہ کہا ہے کہ یہ جو مقتول کا وارث ہے' یہ اس میں سے کچھ چھوڑ سکتا ہے۔ یہاں دیکھیے' اس چیز کو نظر انداز کیا۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ (2:178)۔ وہ جرمِ قتل معاف نہیں کرسکتا۔ یہاں شیء کا تو لفظ ہی یہ بات ہے کہ کوئی چیز ایسی ہے جو یوں دی جاتی ہے کہ جس میں سے کچھ وہ معاف کرسکتا ہے۔ عدالت نے بھی یہ کہہ دیا کہ اچھا اس کی جو دیت (معاوضہ) ہے' ہزار روپیہ بنتی ہے' وہ کہتا ہے کہ جی میں آدھا چھوڑتا ہوں لیکن یہ صرف قتلِ خطا میں ہے۔ اِس دیت کی رقم سے اگر مقتول کا وارث' برضا و رغبت کچھ چھوڑنا چاہے تو اسے اس کا اختیار ہے۔ یہ نظامِ خداوندی یعنی اسلامی معاشرہ خود مقتول کے وارثوں کا پشت پناہ بنے گا۔ اس کے لیے (17:33) دیکھیے۔ اس صورت میں قرآن کہتا ہے کہ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (2:178) مجرم کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ طے ہوگیا ہے' اُس کی پابندی کرے اور حسن کارانہ انداز سے اِس کی ادائیگی کرے۔ قتل سہو کی سزا مقرر کرنے میں تمہارے نشو ونما دینے والے کی طرف سے قانون میں رعایت رکھ دی گئی ہے تاکہ اس سے تم سب کی صلاحیتیں مناسب نشو ونما پاتی رہیں۔ لیکن جو

---

[1] اسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں ......VS...... Crown کہا جائے گا۔

شخص اس طرح معاملہ طے ہو جانے کے بعد زیادتی کرے تو اُسے سخت سزا دی جائے۔ عزیزانِ من! قتلِ عمد کے اندر مقتول کے وارثوں کو کوئی اجازت نہیں ہے۔ وہ معاشرے کا جرم ہے وہ معاشرے کا ملزم ہے معاشرہ اس کی سزا دیتا ہے کیونکہ معاشرے پر قصاص فرض قرار دیدیا گیا ہے بات تو یہ تھی۔

اگلی ہی آیت میں ہے قرآن نے کہا ہے کہ **وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ** (2:179) یاد رکھو! قتلِ عمد میں یا قتلِ خطا میں اگر ملزم مجرم قرار پا جائے تو اسے اس کے جرم کی سزا دینے میں اے صاحبانِ عقل و بصیرت! تمہارے لیے زندگی کا سامان پوشیدہ ہے۔ جس معاشرے میں فی الواقعہ مجرم کو سزا مل جاتی ہو تو جو زندہ رہنے والے ہوتے ہیں ان کو زندگی مل جاتی ہے جسے تم یوں کہتے ہو کہ صاحب! ایک فرد کی جو جان لی تو پورے معاشرے کو اس جان لینے نے زندگی عطا کر دی۔ اسی لیے کہا کہ **وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ** (2:179) اگر تم سطحی جذبات سے ہٹ کر عقل و فکر کی رو سے غور کرو تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قصاص کے اس قانون میں تمہاری اجتماعی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ تم اس کے بعد قوانین کی نگہداشت کرو۔ یوں حیات ملتی ہے قصاص کے اندر۔

آج کے اس درس میں ہم آیت 179 تک آ گئے۔ برادرانِ عزیز! اگلی آیت میں آئے گا کہ حفاظتِ مال کیا چیز ہوتی ہے؟ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀......❀......❀

انتالیسواں باب: سورۃ البقرۃ (2)' (آیات 180 تا 184)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ
وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى
الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ
بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨٢﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ
الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ
كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ
طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾

عزیزانِ من! آج اپریل 1969ء کی 13 تاریخ ہے۔ درسِ قرآنِ کریم کی ابتدا سورۃ البقرۃ کی آیت 180 سے ہوتی ہے: (2:180)۔

معذرت خواہ ہوں کہ میری بیماری کی وجہ سے پچھلے دو اتواروں کو درس کا ناغہ رہا۔ بیماری سے مجھے جسمانی تکلیف تھی اور درس کے ناغے سے روحانی اذیت۔ اور پھر آپ احباب کا یہاں تشریف لا کر مایوس لوٹ جانا اور بھی قلبی پریشانی کا باعث تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ پھر اس قابل ہو گیا ہوں کہ آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ اس عمر میں خاص طور پر اب میری کیفیت تو غالب (1797-1869ء) کے الفاظ میں یہ ہو چکی ہے:

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

ایک درس کا بھی ناغہ ہو جاتا ہے تو کچھ اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کرنے لگ جاتا ہوں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمائے۔

قصاص کے سلسلہ میں ''مجرم کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے''

سابقہ آیات میں قانونِ قصاص کے متعلق ذکر آ رہا تھا۔ اس میں جان کی حفاظت کا سوال تھا۔ اور اس میں کہا یہ گیا تھا کہ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دینا معاشرہ کے لیے زندگی بہم پہنچانے کے مرادف ہوتا ہے۔ بڑی جامع خوبصورت اصطلاح ہے۔ **وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ** (2:179) اے صاحبانِ عقل و بصیرت! اس حقیقت کو غور سے سن رکھیے کہ قصاص میں مجرم کا پیچھا کر کے اس کو اس کے جرم کی سزا دینے میں ایک فرد کی ٹھیک ہے' قانون کی رو سے جان جائے گی' لیکن معاشرے کو اس سے زندگی مل جائے گی۔ اب اس کے بعد مال کے متعلق کچھ ہدایات آتی ہیں۔ یہ آیت بھی بڑی غور اور اہم ہوگئی ہے اور آپ دیکھیں گے کہ اس کی اہمیت کیوں بڑھ گئی ہے۔

قانونِ وراثت کی اہمیت بڑی حکمت پر مبنی ہے' مگر چند ایک سوالات؟

قرآنِ کریم کے قانونِ وراثت کے متعلق ہمارا ایمان ہے اور دنیا کے سامنے دعویٰ ہے کہ قرآن نے ان چار آیتوں کے اندر نہایت جامع قوانین دیئے ہیں۔ عزیزانِ من! ان قوانین کے اندر بڑی جامعیت ہے لیکن عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ پہلے اس عام طور پہ جو میں نے کہا' اس کو ذہن میں رکھیے گا' پھر میں عرض کرونگا کہ یہ جو اعتراض ہے' اس کا جواب کیا ہے۔ مثلاً ایک شخص دو بیٹے چھوڑ جاتا ہے' ان بیٹوں کا حصہ برابر ہوتا ہے۔ بڑا بیٹا ہے جسے اس نے پڑھایا لکھایا' ولایت بھیجا' وہ بیرسٹر بن کر آیا' ہزاروں روپے ماہوار کماتا ہے' اس کو ایک پائی کی بھی ضرورت نہیں۔ اس کا دوسرا بچہ ابھی دو ایک سال کا ہے اور اس کی وفات ہو جاتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ قانونِ وراثت کی رو سے تو ان دونوں بچوں کو آدھا آدھا' کامل برابر جاتا ہے۔ کیا عدل کا تقاضا یہی ہے کہ ایک بچہ اتنا کچھ باپ سے لے چکا ہے' اس حالت میں پہنچ چکا ہے کہ اب اس کو ضرورت ہی کچھ نہیں۔ دوسرا وہ ہے جس نے ابھی ساری عمر پرورش پانا ہے' اس کی احتیاج ہے' محتاجی ہے۔ اسے بھی آپ برابر دے رہے ہیں۔ یا اس دوسرے بچے کی جگہ لڑکی ہے۔ دو حصے لڑکا لے جاتا ہے' ایک حصہ اس لڑکی کو ملتا ہے۔ وہ لڑکی ہے مگر اب بیوہ ہو کر گھر میں آگئی ہے' اس کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم رہ گئے ہیں۔ چار بھائی اور ہیں' وہ برسرِ روزگار ہیں' کوئی جج ہے' کوئی بیرسٹر ہے' کوئی ڈپٹی سیکرٹری ہے۔ اس بیٹی کے حصے میں کیا آتا ہے؟ نواں حصہ۔ آپ نے دیکھا کہ کیا اعتراضات پڑتے ہیں۔ خاوند کی بیوی ہے' کوئی اور سہارا اور آسرا نہیں' اولاد بھی نہیں۔ وہ مر جاتا ہے' بے آسرا بیوی کو روپے میں سے صرف چار آنے مل سکتے ہیں۔ ساری عمر' اس خاوند کے جو بھائی ہیں وہ اس کے ساتھ مقدمے بازیاں کرتے رہے' بھائی کی موجودگی میں اس بے چاری بھاوج کو گھر سے نکالنے کے درپے رہے ہیں۔ اور بھائی کے مرنے کے بعد تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ وہ اس کے ساتھ کیا کچھ نہیں کریں گے۔ اولاد نہیں ہے'

دنیا میں کوئی سہارا نہیں ہے۔ قانونِ وراثت اسے چار آنے دیتا ہے اور باقی وہ لے جاتے ہیں جو ساری عمر ان سے دشمنی کرتے رہے ہیں اور اب اس فکر میں ہیں کہ اس گھر سے بھی اس کو دھکا دے کر باہر نکال دیا جائے۔

وراثت کے سلسلہ میں وصیت کا حکم فرض کے طور پر دیا گیا ہے نیز وراثت میں حصوں کے تعین کی وجہِ جواز

برادرانِ عزیز! آپ نے غور فرمایا۔ میں نے جو شروع میں یہ کہا تھا کہ وہ قانونِ وراثت' جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے اور یہ دعویٰ ہے کہ وہ نہایت جامع ہیں اور سیدھی سی بات ہے کہ وہ مبنی بر عدل ہے۔ قرآن کے قوانین کی یہ تو بنیادی چیز ہے۔ اور یہ جو میں نے آپ کے سامنے چند مثالیں دی ہیں' ان میں کچھ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالبداہت نظر آتا ہے کہ یہ تو نہ عدل کے مطابق ہے' نہ ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرنے کی چیز ہے۔ اس کا کیا جواب ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ہر مسلمان پر وصیت کرنا فرض قرار دیا ہے۔ وصیت کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ میرے پس ماندگان میں سے کس کس کی کتنی کتنی ضرورت ہوگی۔ اور وہ عدل کے مطابق ان کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جتنا جی چاہے' جس کو جی چاہے' دے جائے۔

آپ کہیں گے کہ پھر قانونِ وراثت کہاں آیا؟ اس وصیت کے بعد اگر کچھ بچ جائے یا کبھی شاذ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ وصیت نہیں کر سکا حالانکہ میں ابھی عرض کروں گا کہ یہ نماز سے زیادہ فرض ہے لیکن اگر کہیں ایسی صورت ہو جائے یا وصیت میں پورا مال Cover نہ ہوتا ہو' کل پر محیط نہ ہو' اس میں سے کچھ بچ جائے تو اس کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ بجائے اس کے کہ پھر دھاندلی سے' جو لوٹ کا مال ہے جس کے حصے میں کچھ آیا' وہ لے جائے تو وہاں قرآن نے خود حصے متعین کر دیئے کہ یہاں تمہیں دھاندلی کی اجازت نہیں دی جا سکتی لیکن مقدم چیز یہ ہے کہ یہ شخص جو خود جانتا ہے کہ میرے بعد میرے پس ماندگان میں سے کس کی کتنی ضرورت ہے' اس کو پورا اختیار حاصل ہے کہ اس کے مطابق اپنی وصیت کے اندر جس کو جتنا جی چاہے دیدے۔

عزیزانِ من! وصیت کے متعلق سنیے کہ قرآنِ کریم کن الفاظ میں حکم دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ **كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ** (2:180)۔ غور فرمائیے! پہلا لفظ **كُتِبَ عَلَيْكُمْ** ہے کہ فرض قرار دیا گیا ہے تمہارے اوپر۔ جیسا اگلی آیت میں ہے کہ **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** (2:183) روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح سے **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ** (2:216) ہے کہ جنگ فرض قرار دیا گیا ہے۔

قرآن حکیم میں وصیت کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی جزئیات تک متعین کی گئی ہیں

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ فرائض جو قرآن نے کہے ہیں' یہ واجب ہے' یہ تمہارے لیے ضروری ہے' IMPERATIVE (لازم)

ہے۔ وہی لفظ یہاں استعمال ہوا ہے کہ کُتِبَ عَلَيْكُمْ (2:180) تمہارے اوپر فرض قرار دیدیا گیا ہے۔ یہاں یہ آیت کتب سے شروع ہوتی ہے اور جہاں ختم ہوتی ہے وہاں حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (2:180) لکھا ہے' یہ متقی کے اوپر Incumbent (فرض) ہے۔ آیت کی ابتدا کتب سے ہو رہی ہے' اس کا آخر حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ہے' اس سے بھی زیادہ کوئی اور اہمیت بتانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ بہت کم احکام ہیں جن میں قرآنِ کریم اس قسم کی اتنی زیادہ اہمیت کے ساتھ کسی چیز کی تاکید کی ہے۔ کہا ہے کہ کُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَ نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ (2:180)۔ اس کے بعد ہے کہ بالمعروف یعنی قاعدے کی رو سے' قانون کی رو سے' قرآن کی رو سے حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (2:180) یہ متقین کے اوپر ایسا کرنا فریضہ ہے۔ اہمیت آپ کے سامنے آگئی۔

قرآنِ کریم عام طور پر اصول دیتا ہے' بہت کم ایسے احکام ہیں جن کی جزئیات اور تفاصیل بھی وہ خود ہی متعین کرتا ہے۔ یہ وصیت کا جو حکم ہے' غور فرمائیے کہ اس کی اہمیت اتنی تھی کہ سورۃ المائدۃ کی تین آیتوں میں تفصیلی طور پر بتایا گیا ہے کہ یہ وصیت کیسے لکھنی چاہیئے' کیسے لکھانی چاہیئے' گواہ کس قسم کے ہونے چاہئیں۔ کہا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَ لَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ (5:106) اگر تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آگیا تو وصیت کرو اور وصیت کے لیے اپنے میں سے دو عادل گواہ رکھو۔ اگر کہیں سفر کی حالت میں ایسی صورت آجائے تو جو بھی عادل گواہ تمہیں ملیں' وہ عادل گواہ تمہارے سامنے ہوں' ان کے سامنے یہ وصیت کرو۔ پھر آگے یہ چیز ہے کہ جن کے سامنے وصیت کی گئی ہے' اگر وہ لکھی نہیں گئی ہے تو اس صورت میں ان کو بلاؤ' ان کو قسم دو' ان سے یہ بات سنو۔ اگر تمہیں کہیں شبہ پڑے کہ یہ صحیح بات نہیں کہتے اور گواہ بلاؤ۔ یعنی یہ ساری تفاصیل قرآنِ کریم میں اس وصیت کے متعلق دی ہوئی ہیں۔ معلوم ہو گیا کہ قرآن کی رو سے یہ کتنی اہم چیز ہے۔

وراثت کے متعلق حصوں کا تعین

اب وہ اگلی بات آئی جو میں نے کہا تھا کہ قرآن نے وراثت کے متعلق قوانین دیئے ہیں۔ سورۃ النساء کی آیات 12-11 میں وراثت کے متعلق قرآنِ کریم نے حصے گنے ہیں' یہ خود دیئے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ وہ حصے اس صورت میں مقرر کیے ہیں کہ وصیت پورے مال کو Cover نہ کرتی ہو' کچھ باقی رہ جاتا ہو۔ اور اگر وصیت پورے مال کو Cover کرتی ہے تو وراثت کے تعین کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ جو میں نے کہا ہے' یہ استنباط نہیں ہے' قرآنِ کریم کی نص صریح ہے۔ یہ آیات نکالیے' آپ کے سامنے آجائیں گی۔ یہ بڑی اہم چیز ہے

جو میں بیان کر رہا ہوں۔ ابھی پتہ چل جائے گا کہ یہ کیوں اتنی اہم ہیں۔ اس سورۃ النساء کی گیارھویں آیت کے اندر اس مال کے حصے مقرر کیے ہیں کہ اس کو اتنا' اس کو اتنا' اس کو اتنا۔ یہ مقرر کرنے کے بعد کہا ہے کہ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِىْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ (4:11) مرنے والے کی وصیت پوری کرنے کے بعد اور اس کا قرضہ دینے کے بعد۔ یہ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِىْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ (4:11) وصیت پوری کرنے کے بعد اور اس کا قرضہ چکا دینے کے بعد جو باقی بچے' اس میں سے یہ حصہ ہے۔ ایک ہی فقرہ ہے اور آگے چلیے' یہ اس کا حصہ' یہ اس کا حصہ' کہا کہ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ م بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ (4:12) جو کچھ وصیت کے بعد اور قرضے کے بعد بچ جائے' اس میں سے۔ پھر دو سطروں کے اندر اور حصے مقرر کیے' اس کے بعد کہا کہ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِىْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ (4:12) وصیت پوری کرنے کے بعد اور قرضہ پورا کرنے کے بعد۔ میں تفصیل سے اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ آپ کو پتہ چلے کہ قرآن نے کس وضاحت و صراحت' تشریح و تبیین کے ساتھ' ان چیزوں کو بیان کیا ہے۔ اس میں دو آیات ہیں' جن میں مختلف حصے مقرر کیے ہیں۔ چار مرتبہ ہر حصے کے بعد' یہ دہرایا ہے کہ وصیت کے بعد اور قرضہ چکانے کے بعد یہ حصے دیئے جائیں گے۔ اب آپ نے یہ سمجھ لیا کہ وہ جتنے اعتراض پڑتے تھے' ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہتا۔ یہی نہیں کہ اسے اجازت ہے کہ وصیت کرے' یہ اس پہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ یہ وصیت کرے۔ وہ دیکھے ورثا میں سے کس کو کتنی ضرورت ہوگی' اس کے مطابق وصیت کرے۔ وصیت کے متعلق کہا کہ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ (2:180) یعنی اس میں سارے آ گئے والدین بھی اور باقی بھی جو تمہارے اقربا وارث ہو سکتے ہیں' ان سب کے لیے وصیت کرنا فرض ہے۔ وراثت کے ترکے کے جو حصے مقرر کیے ہیں وہ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ وصیت پوری کرنے کے بعد ہیں۔ اب کوئی اعتراض باقی رہتا ہی نہیں۔

قرآن حکیم کی تعلیم کے بالکل برعکس ہمارے ہاں کا وراثت کا قانونِ شریعت

آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں کا وراثت کا قانونِ شریعت کیا ہے؟ قانونِ شریعت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے وارثوں کے لیے وصیت نہیں کر سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ (2:180) لیکن قانونِ شریعت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین اقربین کے لیے وصیت نہیں کر سکتا۔ وہ کہتا ہے حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (2:180) مگر (معاذ اللہ) یہ کہتے ہیں کہ وہ وصیت نہیں کر سکتا۔ اور دوسروں کے لیے بھی صرف ایک تہائی مال میں کر سکتا ہے' اس سے زیادہ میں نہیں کر سکتا۔ وہ کہہ رہا ہے کہ پورا مال جو تم چھوڑ کر جاؤ' اس میں یہ بھی نہیں ہے کہ تمہاری مرضی ہے کہتا ہے کہ یہ تمہارے اوپر ایسا کرنا' والدین کے لیے' اقربین کے لیے فریضہ ہے ترک خیرًا مال میں جو کچھ تم چھوڑ چلے ہو۔ آپ کا قانونِ شریعت یہ کہہ رہا ہے کہ نہیں صاحب! وارثوں کے لیے وصیت نہیں ہو سکتی۔

اور غیرِ ورثا کے لیے بھی ایک تہائی مال میں ہوسکتی ہے‘ اس سے زیادہ میں نہیں ہوسکتی۔ اور اس کے بعد وہ جو سارے اعتراضات ہیں‘ وہ وارد ہوگئے جو میں نے پہلے گنائے تھے مثلاً وہ چھوٹا سا تین سال کا بچہ جس کو پوری عمر پرورش پانے کی محتاجی ہے‘ وہ بیوہ ماں کی گود میں رہے گا۔ ان دونوں کے لیے آپ وصیت نہیں کرسکتے۔ آپ کی بیوی‘ بیوہ ہونے کی صورت میں وارث ہے‘ آپ کا چھوٹا بچہ وارث ہے‘ وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جاسکتی۔ وہ بیوہ بچی جو چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کو لے کر ماں باپ کے گھر میں آگئی ہے‘ اس کے حق میں وصیت نہیں کی جاسکتی۔ یہ جو بیوہ بعد میں رہ جاتی ہے‘ بے آسرا بے سہارا‘ اس کے حق میں وصیت نہیں کی جاسکتی۔ یا اللہ! یہ کیسے قانون بنا؟ کہتے ہیں کہ جی ایک حدیث ہے اس میں آیا ہے کہ لا وصیة للوارث وارث کے لیے وصیت نہیں کی جاسکتی۔ ارے بھئی! قرآن کی یہ آیات آپ کے سامنے ہیں۔

مروّجہ شریعت کے نزدیک وصیت کی آیات منسوخ ہیں: یہ صحیح نہیں ہے

اب آپ نے غور فرمایا کہ میں نے کتنی صراحت اور وضاحت سے کیوں یہ چیزیں پیش کی تھیں۔ یہ ساری آیات ایک طرف‘ قرآن نے وہ قاعدہ مقرر کیا تھا‘ اس کی جزئیات تک بتائی ہیں۔ یہاں وراثت کے احکام دیئے ہیں انہیں دو آیات میں چار مرتبہ دہرایا ہے کہ ارے بابا! وصیت کے بعد یہ ہوگا‘ وصیت کے بعد یہ ہوگا‘ فریضہ ہے وصیت کا‘ **کُتِبَ عَلَيۡكُمۡ** اور **حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِيۡنَ** قرآن نے کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! وصیت نہیں کی جاسکتی۔ کہا کہ بھئی! یہ جو ساری آیات ہیں یہ کاہے کے لیے ہیں؟ کہا کہ منسوخ ہیں یہ آیات۔ بھئی! وہ قرآن کی آیت تو قرآن کی کسی آیت سے‘ تم کہا کرتے تھے کہ وہ منسوخ ہوتی ہے۔ وہ میں نے آپ کو ناسخ و منسوخ میں بتایا تھا کہ یہ عقیدہ یکسر قرآن کے خلاف ہے کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ ہے۔ قرآن میں ناسخ و منسوخ کا سوال ہی نہیں۔ یہ خدائے علیم و خبیر کا کلام ہے جس کو قیامت تک تمام نوعِ انسانی کے تقاضوں‘ ضرورتوں کا پتہ تھا‘ جس نے کہا تھا کہ **تَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ** (6:116) میں نے مکمل کیا ہے اپنے قوانین کو‘ کوئی اس میں تبدیلی نہیں کرسکتا۔ قرآن کا ایک شوشا بھی اپنے مقام سے منسوخ نہیں‘ نہ ہلا ہوا ہے۔ می نہ سزد خدائے را لیکن ایک عقیدہ آپ کے ہاں یہ آیا کہ قرآن کی آیات‘ قرآن کی دوسری آیات سے منسوخ ہیں۔ اور پھر یہ کہ یہ نہیں کہ خدا نے کہیں کہہ دیا ہو کہ ہماری یہ آیت فلاں آیت کو منسوخ کرتی ہے‘ کہیں نہیں ہے۔ یہ علمائے کرام کے اوپر چھوڑ دیا کہ جس آیت کو جی چاہے‘ کسی دوسری آیت سے منسوخ قرار دیدیں۔ چلیے صاحب! قرآن کی آیت قرآن سے ہی منسوخ کرتے ہیں‘ تو میں نے بتایا تھا کہ بقول ان کے پانچ سو کے قریب منسوخ ہیں:

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

انسانوں کے فیصلوں کی بنا پر قرآن حکیم کی 500 آیات کو منسوخ کر رکھنے کا نتیجہ

قرآنِ کریم میں احکام کی آیات کتنی ہیں جن میں سے پانچ سو آیات منسوخ ہیں۔ اور یہ خدا کے حکم سے نہیں' انسانوں کے فیصلے سے ہیں۔ چلیے صاحب! قرآن کی آیت نے قرآن کی آیت کو منسوخ کیا' کچھ تھوڑا سا تو احترام باقی رہا لیکن یہاں یہ کیفیت ہو رہی ہے کہ قرآن کی ایسی آیات جن کے اندر اس تاکید کے ساتھ وصیت کو فرض قرار دیا گیا' ہے' یہ آئمہ کرام کہتے ہیں کہ جی' ایک روایت ہے' اس نے اس کو منسوخ کر دیا۔ اور آپ کے ہاں یہ تواتر سے چلا آ رہا ہے۔ اس میں جتنی جتنی قباحتیں نکلتی ہیں' جتنی مصیبتیں پڑتی ہیں' جو پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں' وہ روز ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایسے ایسے Pathetic Case (روح فرسا واقعات) اس قدر جاں گداز' اس قدر جاں گسل' اس قدر ہمدردی کے مستحق واقعات میرے سامنے آتے ہیں لیکن قانونِ شریعت کے سامنے مجبور ہیں۔ اور آپ کا رائج الوقت قانون' وہی قانونِ شریعت کہ وصیت نہیں کر سکتا' کی ہوئی وصیت کو بھی منسوخ قرار دیدیتا ہے' باطل قرار دیدیتا ہے وہ عدالت میں مانی نہیں جاتی اور یہ سب ایک روایت کی رو سے ہے۔ جسے یہ بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں۔ اس کے لیے دیکھیے یہ ہے کتابچہ: فتنۂ انکارِ حدیث۔ ان مُتُفَنِّیُوں نے' فتنہ برپا کرنے والوں نے یہ کہہ دیا ہے۔

وضعی روایات کو نہ ماننے والا منکر حدیث قرار پاتا ہے

بھئی! قرآنِ کریم کی اس قدر محکم' اس قدر واضح' صاف متعین آیت ہے' اس کے متعلق آپ کہتے ہیں کہ اس کو ایک روایت نے منسوخ کر دیا۔ ذرا سوچیے تو سہی اور خود روایات کے متعلق آپ یہ بات کہتے ہیں کہ کسی حدیث کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ جسے آپ صحیح حدیث کہتے ہیں' یاد رکھیے! صحیح کا یہ لفظ Technical (تکنیکی) ہے' اصطلاحی لفظ ہے۔ انہوں نے خود ایک قاعدہ مقرر کیا ہے کہ اگر کسی حدیث کے روایت کرنے میں' اس قسم کے لوگ ہوں' تو اسے صحیح حدیث کہا جا سکتا ہے۔ اور جو صحیح ترین حدیث ہے' اس کو بیان کرنے کے بعد' ہر حدیث کے بعد لازماً آپ نے سنا ہوگا اور لکھا ہوگا کہ یہ **قال رسول اللّٰہ**' حضور ﷺ نے فرمایا او **کما قال رسول اللّٰہ** یا یہ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا ہو۔ کہا یہ گیا کہ بھئی! اس قسم کی ایک چیز قرآن کی ایسی محکم آیت اور ایک آیت نہیں' وراثت کے احکام کے اندر چار دفعہ دو آیات میں اس کو دہرایا گیا ہے۔ بھئی! اسے منسوخ کرنے کے لیے تو کوئی اس سے زیادہ محکم حجت اور سند کی ضرورت ہے۔ اتنی سی بات ہم نے کہہ دی تو صاحب! طوفان برپا ہو گیا۔ عزیزانِ من! یہ ہے جسے فتنہ انکارِ حدیث کہا جاتا ہے۔ کتابیں شائع ہو گئیں' علامہ محمد ایوب صاحب دہلوی ❶ کا یہ کتابچہ میرے ہاتھ میں ہے۔ پہلے انہوں نے ایک مسلمہ یہ قائم کیا کہ یہ جو مُتُطَنّٰی

---

❶ علامہ حافظ محمد ایوب دہلوی مرحوم (1969-1889)

ہیں' یہ کہتے ہیں کہ بھئی! اگر کوئی رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کردہ حدیث قرآن کے مطابق ہو' اسے صحیح مانا جاسکتا ہے لیکن اگر کوئی حدیث صریحاً قرآن کے خلاف ہے تو وہ دین میں کیسے حجت ہوسکتی ہے؟

کیا تواتر سے تسلیم کی جانے والی روایت قرآن حکیم کی آیت کو منسوخ کرسکتی ہے؟

جواب یہ ہے کہ جس طرح قرآن کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہو' تو حجت ہو اور ہماری عقل کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو' اسی طرح نبی کے قول کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو' تو حجت ہو اور قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو۔ لیجیے جناب! یہ ہوا مسلمہ۔ اچھا جی! کہتا ہے کہ اب اس کی دلیل کیا ہے؟ بلا دلیل تو یہ بات کرتے نہیں ہیں۔ رہی یہ بات کہ قولِ رسول قرآن کے خلاف ہو تو وہ بھی حجت ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں **كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ** (2:180) آیا ہے کہ فرض قرار دیا تمہارے اوپر وصیت کرنا' قرآن کی یہ آیت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لا وصية للوارث وارث کے لیے وصیت نہیں ہے۔ میں یہ ان علامہ صاحب [1] کے الفاظ میں پڑھ رہا ہوں ''اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے''۔

برادرانِ عزیز! سند ملاحظہ فرماؤ۔ چونکہ یہی ہوتا چلا آرہا ہے یعنی وارث کے لیے وصیت ناجائز قرار دی گئی' حدیث نے قرآن کی آیت کو منسوخ کردیا۔ اور قولِ رسول قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجبِ عمل رہا [1] ''۔ اور اس حدیث کا ''موجب عمل اور حجت'' ہونا ''تواتر سے ثابت ہے''۔ لہٰذا ثابت ہوگیا کہ رسول کا قول قرآن کے خلاف بھی ہو تو حجت ہوتا ہے۔ قرآن کی یہ آیت منسوخ ہوگئی۔ سند یہ ہے کہ جی ''ہونداجے چلیا آیا ہے [2] ''۔ قرآن بیس مرتبہ کہتا ہے کہ جب ان سے کہو کہ آؤ بھئی! قرآن کی طرف آؤ' جو خدا نے نازل کیا ہے تو یہ کفار کے جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہمارے ہاں جو ہوتا چلا آرہا ہے' ہم تو اُس کے اوپر قائم رہیں گے' ہم اِس کی طرف نہیں آئیں گے۔ قرآن ان اقوال کو کفار کے اقوال کہہ کر ان کی تردید کرتا ہے۔ یہ اسی کو اپنے ہاں بطور حجت قرآن کے خلاف پیش کرتے ہیں۔ میں نے پڑھ کر الفاظ سنا دیئے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ تواتر سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ تواتر تو Snow ball (برف کا گول تودا) ہوتا ہے' جتنا زیادہ آگے بڑھتا چلا جائے گا' آپ دیکھیں گے' وہ بال بڑا ہوتا چلا جائے گا۔ پہلا تواتر تو سال بھر کا ہوگا' اب تواتر ہزار سال کا ہوگیا۔ غلط چیز مرورِ زمانہ سے صحیح قرار پا جائے گی' جو باطل ہے وہ حق قرار پا جائے گا۔ ''پرانے سنیاسیاں کولوں سنیا ہیگا سی کہ سوورے دا گڑ ہووے تے تریاق ہوجاندا اے [3] '' یا غالب (1797-1869ء) نے کہا تھا کہ

---

1. علامہ حافظ محمد ایوب (مرحوم): فتنۂ انکارِ حدیث' ص۔ 85 ملاحظہ ہو۔
2. ہوتا ہی چلا آرہا ہے۔
3. پرانے سنیاسیوں سے سنا تھا کہ گڑ اگر سو سال پرانا ہو تو وہ تریاق ہوجاتا ہے۔

ایں مے از قحطِ خریداراں کہن خواہد شدن

شراب جتنی پرانی ہو، تیز ہو جاتی ہے۔

ہمارے ہاں صدیوں سے مذہب رائج ہے، دین نہیں: پرویزؒ کی آہ وفغاں

عزیزانِ من! یہ باتیں بیان کرتے ہوئے جگر کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ ان ائمہ کرام کا مسلمہ یہ ہے کہ اگر رسول کا قول قرآن کے خلاف ہو، تو وہ حجت ہوگا، اور قرآن کی آیت منسوخ قرار دی جائے گی۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ یہ کہ تواتر سے ہو رہا ہے۔ غور فرمایا آپ نے؟ پھر آپ پوچھا کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ہوا کیا؟ آپ کے ساتھ یہ کچھ ہوا ہے۔ اسی کو میں کہا کرتا ہوں کہ دین جب مذہب میں بدل جاتا ہے، تو پھر یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ یہ دین ہے جو میں نے پیش کیا ہے، وہ مذہب ہے جو آپ کے سامنے رائج ہے۔

عزیزانِ من! اس دوران میں گزشتہ بیس سال کے عرصے میں، جیسا میں نے عرض کیا تھا، بڑے بڑے خوں رُلا دینے والے Cases (واقعات) میرے سامنے آئے۔ اور میں نے متعدد بار اس کے لیے سر توڑ کوشش کی کہ کسی طرح سے یہ قانون قرآن کے مطابق ہو جائے۔ ہر بار اس بات میں میری اس قدر مخالفت ہوئی، کفر کے فتوے لگے، قتل کے لیے محاذ بنے اور فتنے کو دبانے کے لیے ہر قسم کی اسکیمیں تجویز ہوئیں اور یہ اتنا لٹریچر شائع ہوا۔ یہ کس چیز کے اوپر ہے؟ یہی چیزیں جو میں پیش کر رہا ہوں۔ ارے بابا! یہ تو قرآن کی یہ صریح آیت ہے۔ کہتے ہیں کہ منسوخ ہے۔

کیا نبی اکرم ﷺ کا کوئی قول معاذ اللہ حکم خداوندی کے خلاف بھی ہو سکتا ہے؟

عزیزانِ من! صاف نظر آتا ہے، آپ سوچ سکتے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ جو دنیا میں قرآن ہی کو نافذ کرنے کے لیے تشریف لائے تھے، کیا کبھی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس قدر نص صریح جو قرآن کی ہے، کے بعد اس کے علی الرغم ایک چیز کہیں اور پھر کہیں کہ یہ دین ہے، وہ دین نہیں ہے؟ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ کسی اور کو یہ جرأت ہو سکتی ہو کہ وہ اپنے رسول کے متعلق کچھ کہہ دے، ہم تو اس کے لیے مکلّف نہیں۔ ہمیں تو اس کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ ہم اپنے رسول ﷺ پہ جس پہ ہمارا ایمان ہے، یہ کہیں کہ وہ یوں دھڑلے سے قرآن کے خلاف ایک چیز کہہ کر یوں منواتے ہونگے (معاذ اللہ)۔ یہ آپ کا قانون ہے اس کے خلاف آواز اٹھانے والا منکرِ حدیث ہے، کافر ہے، مرتد ہے، واجب القتل ہے۔

پاکستان کے مروّجہ قانون میں وصیّت کرنے کی نوعیت قرآن کریم کے ہی خلاف ہے

آپ کے ہاں کا قانون یہی ہے، ملا کی شریعت بھی یہی کہتی ہے، آپ کے ہاں کا عدالت کا قانون بھی یہ کہہ رہا ہے۔ اس کا نام

شریعتِ محمدی' محمڈن لا' قانونِ شریعت ہے۔ اندازہ لگاؤ! قرآن بے چارہ منہ دے دے کر رو رہا ہے۔ اور پھر اس کے بعد جو مصیبتیں آپ کو روز آ کر پڑتی ہیں' ان کا اعتراض آپ کے اسلام پہ آ کر پڑتا ہے۔ میں نے آپ کے ہاں کے اس قانون کے مطابق جو Comments (تنقیدات) دیکھے ہیں کہ وصیت نہیں ہوسکتی اور یہ جو لے جاتے ہیں وہ اس چیز کا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ ہیں ان کے ہاں کے Laws (قوانین) جن کو کہتے ہیں کہ خدا کے دیئے ہوئے Laws (قوانین) ہیں اور دنیا میں سب سے زیادہ افضل اور اعلیٰ اور جامع ہیں۔ ان کی یہ کیفیت ہے۔ وہ سچے ہیں۔ ہم کیا کرتے ہیں؟ کبھی ان کو چار گالیاں دے دیتے ہیں' بہت زور پکڑتے ہیں تو ان کی کتاب یہاں امپورٹ (درآمد) ہونی بین (Ban) کر دیتے ہیں۔ سمجھ لیا کہ صاحب! مرض کا علاج ہوگیا۔ اور اپنے ہاں وہی قانونِ شریعت ہے جو آپ کے ہاں رکھا ہوا ہے۔

وصیت کے سلسلہ میں چند ایک ضروری ہدایات

عزیزانِ من! قرآن کو سامنے رکھیے اور پھر دیکھیے' پھر ذہن میں آتا ہے کہ قرآن کی جامعیت کیا ہے اور واقعی خدائے خبیر وعلیم کا یہ کلام ہے۔ پہلے وصیت کی آیت دیدی اور اس کے اوپر فرض کر دیا کہ یہ کرنا ہے تو عدل کے تقاضے پورے ہوگئے' مستحقین کے تقاضے پورے ہوگئے۔ یہی شخص بہتر جان سکتا ہے کہ کس کو اس میں سے کتنا ملنا چاہیئے' کون اس کا مستحق ہے۔ ہوسکتا تھا کہ جو وصیت آج کی ہے' دس دن کے بعد کچھ اس میں اور Add (اضافہ) ہوگیا ہے ابھی فرصت نہیں ملی کہ اس کو بھی اس کے اندر رکھ لے۔ آپ قرآن کی جامعیت دیکھیے کہ اس استثنا (Exception) کے لیے بھی دوسرا قانون دیدیا۔ دونوں کو اکٹھا رکھیے' آپ دیکھیے جامع قانون اس کو کہتے ہیں۔ اگلی دو آیات میں بھی یہ بات چلی۔ کہا کہ **فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ** (2:181) اگر لکھنے کا وقت نہیں رہا اور گواہ بلا لیے اور زبانی بات کہیں ہوگئی ہے اور صرف انہوں نے اس کو سنا ہے۔ یاد رکھو! اگر یہ گواہ اس کو سننے کے بعد اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی کر دیں گے' تو ان کے خلاف سخت جرم ہوگا۔ ایک چیز اور ہوسکتی ہے کہ وصیت کرنے والا' کسی وقت یونہی ناراض ہو کر بیٹے کو کہتے ہیں کہ میں نے تمہیں عاق کر دیا۔ ضمناً میں یہ عرض کر دوں' یہ جو آپ کے ہاں کا قانون ہے اس کی رو سے یہ جو عاق کر دوں گا ہے یہ سارا ڈراوا ہی ڈراوا ہے۔ وصیت تو یہ کر نہیں سکتا اور وراثت کے قانون کی رو سے اس کو یہ حق ملتا ہے کہ وہ اس کو چھین نہیں سکتا۔ یہ سب دھمکی ہوتی ہے۔ وصیت نہیں کر سکتا پھر تو یہ بات ہے لیکن اگر وصیت کر سکتا ہے' اس میں تو یہ بات ہوسکتی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت رنج میں' غصے میں' آ کر اس قسم کی کوئی حرکت کر بیٹھے۔ یہ قرآن ہے' کہتا ہے کہ **فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** (2:182) اگر تم لوگ یہ دیکھو کہ اس نے جو کچھ یہ وصیت کی ہے' اس

میں یونہی کسی طرف جھک گیا ہے یا کسی کے خلاف کوئی چیز ہوگئی ہے' کوشش کرو کہ ان کے درمیان مصالحت کی صورت پیدا ہو جائے اس معاملے کے اندر سمجھاؤ بجھاؤ۔ یعنی ایک فرد کے ذاتی جذبات جو تھے اس کے اوپر بھی کچھ تھوڑی سی معاشرے کی پابندی عائد کردی۔ **فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ** (2:182) باہمی مصالحت کی صورت' ان کے مابین پیدا کرلو' یہ ایسا کیا جاسکتا ہے لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد اگر وہ جو وصیت ہے' اس کے بعد اس نے یہ وصیت قائم رکھی ہے' تو یہی Binding (بندھن) ہے اور یہ کرنا قرآن کی رو سے ضروری ہے۔

قرآن حکیم کے برعکس مذہب کے نام پر انسان کے اپنے ہی حکم کا نفاذ

عزیزانِ من! جیسے آپ کے ہاں آج کل قانونِ شریعت نافذ ہے اور اس کے بعد بھی یہ قانون اس طرح نافذ کیا جائے گا تو اس کی خلاف ورزی کرنے والا سزا کا بھی مستحق ہو جائے گا۔ آج اگر کوئی شخص یا ان کی اس شریعت کے قانون کے بعد کوئی شخص وصیت لکھ کر مر جاتا ہے' وہ وصیت کالعدم قرار دی جاتی ہے' تو آپ کے قانون میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے' آپ کی شریعت کی رو سے اس کو کوئی نہیں مانتا۔ وہ جس خدا نے اس کو فرض قرار دیا ہے' وہ لکھتا ہے۔ میرے سامنے کیس آئے' اس نے یہ لکھا ہے کہ صاحب! میں خدا کی کتاب کو قانون' ضابطہ' حجت' سند مانتا ہوں' میرے خدا نے مجھ پہ فرض قرار دیا ہے جیسے نماز پڑھنا فرض تھا' روزہ رکھنا فرض تھا' وصیت کرنا فرض تھا۔ میں خدا کے حکم کی تعمیل میں یہ وصیت کر رہا ہوں۔ خدا کے حکم کی تعمیل میں وصیت کرنے والے کے بعد یہ بیٹھا ہوا انسان کہتا ہے کہ ہم نہ تمہارے خدا کی بات مانتے ہیں' نہ تمہاری وصیت کی بات مانتے ہیں' ہمارا حکم چلے گا' تم کچھ نہیں کرسکتے' تمہارا خدا کچھ نہیں کرسکتا۔ اور حکم ان انسانوں کا چلتا ہے لیکن اپنے نام سے نہیں' اپنے نام سے تو کوئی مانتا نہیں' مذہب میں بات یہی ہے کہ خدا اور رسول اور شریعت کا نام رکھ کر ہر بات اپنی منواتے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ ہے انسانوں کا خود ساختہ قانون جو مذہب کا لبادہ اوڑھ کر آپ کے سامنے آتا ہے۔ اور یہ ہے خدا کا دیا ہوا قانون جس میں کہا ہے کہ **لا مبدل لکلماته** (6:116) اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ اور یہ تھا میرا وہ جرم کہ ایسٹ پاکستان بننے کے بعد میری پکار یہ تھی کہ اس کو تم نے خدا کی اطاعت کے لیے لیا ہے' یہاں خدا کی کتاب کے مطابق قوانین بنا دیجیے۔ اس جرم کی پاداش میں' یہ ساری عمر کی سزائیں بھگت رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ مجھے یہ شکوہ یا شکایت ہے یا میں کسی کی خاطر یہ کر رہا ہوں۔ جس کے سامنے قرآن ہو' اس کے اوپر تو فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ جو کچھ قرآن سے اس نے سمجھا ہے' اس کو آگے پیش کرے۔ میں تو یہ کرتا ہوں۔ کہہ یہ رہا ہوں کہ یہ جو دہائی مچا دی جاتی ہے کہ یہ کافر ہے اور مرتد ہے اور سب کچھ ہے وہ یہ چیزیں ہیں۔ جان کی حفاظت کے متعلق وہ اتنا بڑا Check رکھا ہے' اتنی روک ہے' اتنی بڑی پابندی ہے' جو تمہارے جذبات کے اوپر لگا دی گئی ہے۔ تمہارے خلاف اگر کسی نے کچھ کیا ہے تو

اسے مار ہی کیوں نہیں دیا ہے اس سے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ آپ کے ہاتھ میں رائفل بھی ہے' خنجر بھی ہے' قوت بھی ہے' حکم یہ ہے کہ تم خود قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے' عدالت کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ یہ بڑی چیز ہے۔ مال کے متعلق یہی چیزیں ہیں جو احکام دیئے ہیں۔

لفظ صیام کا قرآنی مفہوم ''خود کو روکنا'' ہوتا ہے

احکام کی اطاعت کے لیے حدود کی پابندیاں اپنے اوپر عائد کرنا پڑتی ہیں۔ اطاعت کے تو معنی یہ ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ میرے جو جی میں آئے' میں اس وقت کر دوں۔ آپ کو اس وقت رکنا پڑتا ہے' اپنے آپ کو روکنا پڑتا ہے۔ یہ جو اپنے آپ کو روکنا ہوتا ہے' عربی زبان میں اس کو صیام کہتے ہیں' جس کا ترجمہ روزہ ہے۔ اب اگلی آیت صیام کے متعلق ہے۔ آپ نے دیکھا کہ صیام کی آیت کہاں آئی ہے۔ کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ (2:183)۔ ان احکام کی پابندی کیسے ہوگی؟ ایک تو پابندی ہے سپاہی کا ڈر۔ اور سپاہی کے ڈر سے جو پابندیاں ہوتی ہیں' ان کا حشر تو ہم نے گزشتہ تین چار مہینوں میں دیکھ لیا تھا۔ کسی مملکت کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ ہر فرد کے سر پہ ایک سپاہی کھڑا کر دے۔ اور اگر سپاہی اور مجرم ایک ہو جائیں تو پھر کیا ہوگا؟ اور پھر بسیار شیوہ ہا بتاں را کہ نام نیست۔ سپاہی تو اس جرم کی Detection کرے گا جو سرزد ہو گیا ہو۔ اور سرزد ہونے سے پیشتر جو آپ کے اندر اس کے لیے سازشیں ہو رہی ہوں' تدبیریں ہو رہی ہوں' بدنیتیں ہو رہی ہوں' خرابیاں پیدا ہو رہی ہوں' اس کے اوپر تو کسی کی نگاہ ہی نہیں جا سکتی۔ لہٰذا یہ نظامِ مملکت' یہ سپاہ' یہ فوج' یہ ضروری چیزیں' صرف ان کے لیے ہیں جو اپنے اوپر پابندیاں عائد نہ کرنا چاہیں۔

مقامِ مومن کی بنیادی خصوصیت: حکمِ خداوندی کی ہر آن پابندی ہے

قرآن کا نظام یہ ہے' مومن وہ ہے جو اپنے اوپر خدا کی بتائی ہوئی پابندیاں خود عائد کرتا ہے' اسے صیام کہتے ہیں۔ صام کے معنی ہی ہوتا ہے ''سرکش گھوڑے کو لگام کے ذریعے سے روک لینا''۔ گھوڑے کو گولی مار کر فنا کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کی سرکشی نکال دینا ہے' تاکہ اس کی قوتوں کو قاعدے اور ضابطے کے مطابق استعمال کیا جائے۔ قرآن نے صرف صیام کہا ہے۔ آپ کے ہاں عجمی تصوف آیا' اس نے کہا کہ نہیں! یہ جتنے جذبات' یہ آرزوئیں' یہ تمنائیں' جو سینے میں بیدار ہوتی ہیں' یہ سب شیطنت اور ابلیسیت ہے۔ مقصدِ حیات نفس کشی ہے' مار دو ان سب کو۔ یہ نفسیاتی طور پر ناممکن ہے۔ آپ اپنے کسی جذبے کو فنا نہیں کر سکتے' اس کو دبا سکتے ہیں۔ اور جب آپ دبائیں گے تو وہ باہر آنے کے لیے Un-Natural (غیر فطری) راستے اختیار کرے گا۔ اسے Perversion (بدنہادی) کہتے ہیں۔ وہ سعدی شیرازی (1184-1291) کہہ گیا:

پری رو تابِ مستوری ندارند

جن کے اندر حسن کی نمود کا جذبہ ہوتا ہے ان کو آپ بند کیجیے تو وہ چھپ کر نہیں رہتے

چوں در بندی زِ روزن سر برآرند ❶

دروازہ بند کرو تو وہ کھڑکی میں سے جھانکنے لگ جاتے ہیں۔

تصوف کی انتہا انسانی جذبات کی پامالی یا نفس کشی ہے جو کہ ایک سعیٔ لاحاصل ہے

اگر آپ جذبات کو کچلنا شروع کریں گے' جو آپ کے ہاں تصوف کا' نفس کشی منتہا ہے تو یہ مر نہیں سکتے' یہ غلط راستوں سے نکلنا شروع کر دیں گے۔ اور اگر آپ نے کہیں ان کی تاریخیں پڑھی ہوں' خواہ وہ ❷ Twelve Years in a Monastey ہو' یہ چھوٹی سی بڑی عمدہ کتاب ہے' وہاں سے تصوف آپ کے ہاں آیا ہے۔ یا آپ کے ہاں جو زوایئے یا خانقاہیں ہیں' ان کے ہاں کے حالات ہوں۔ جہاں کہیں بھی یہ ہوگا' آپ دیکھیں گے کہ وہاں Perversion (بدنہادی) ہی Perversion (بدنہادی) ہوگی۔ فطرت کے صحیح راستوں کے ذریعے سے تقاضوں کو پورا کر دینا' ان پابندیوں کے تابع رہتے ہوئے' جو خدا نے ان تقاضوں کو پیدا کرنے والے خالق نے عائد کی تھیں' یہ فطرت کے مطابق ان تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ جونہی آپ نے اس کے خلاف کچھ پابندیاں عائد کیں اور ان کو مارنے کی کوشش کی' یہ سانپ کے بچوں کی طرح ہزار راستوں سے اپنا سر نکالیں گے۔ یہ Perversion ہوتی ہے' یہ بدنہادی ہوتی ہے۔

قرآن نے صیام کہا' روکنا کہا ہے۔ ٹھیک ہے جہاں تک ایک متعین چیز کا نام ہے' وہ تو یہی ہے جسے ہم روزہ کہتے ہیں لیکن یہ اس کی ایک شکل ہے۔ صیام کے تو معنی یہ ہیں کہ ہر وہ چیز' یعنی پہلی چیز تو یہ ہے کہ جو ناجائز ہے' حرام ہے' اس سے مستقل طور پر رکنا ہے الا اضطراری حالت کے۔ اگلی چیز یہ ہے کہ جن عام حالات میں جو چیزیں بالکل جائز اور حلال وطیّب ہیں' ایسے مواقع' ایسے حالات' آسکتے ہیں کہ ان سے بھی رکا جائے۔ یہ جو ان سے رکنے والی بات ہے' اسے صیام کہا جائے گا۔ اور جس قوم نے مسلسل جہاد کرنا ہو' جس نے ساری دنیا کے خلاف اپنی مدافعت کرنا ہو' اور حق کو نافذ کرنا ہو' مسلسل جہاد کرنے والی قوم کے لیے تو اس قسم کی پابندیوں کی' ڈسپلن کی' نہایت ضرورت ہے۔ ہمارے سامنے ایک فوج کا ہی کام آتا ہے کہ میدان میں جاتے ہیں اور وہ ڈز اور ڈز مارتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک پہنچنے سے پیشتر جتنے مقامات ان کے ہوتے ہیں' وہ ہمارے سامنے نہیں ہوتے۔ یہاں ہمیں نظر آتا ہے کہ فوج کو اتنی بڑی آزادی ہوتی

---

❶ (سکندر علی) جگر مراد آبادی (1890-1960) نے اس نفسیاتی کشمکش کا نقشہ' اپنے مخصوص انداز میں کچھ یوں کھینچا ہے۔
کس قدر حسن بھی مجبورِ کشاکش ہے کہ آہ! سر جھکائے نہ بنے' آنکھ اٹھائے نہ بنے

❷ اس کا پورا حوالہ یہ ہے: McCabe, Joseph (1930) Jwlve years in a Monastery London: C.A Watts& Co, Limited

ہے کہ میدانِ جنگ ہے' ہاتھ میں ان کے بندوق پکڑی ہوئی ہے اور وہ بھاگ رہے ہیں' اس کو مارا' نہ کوئی قاعدہ' نہ کوئی قانون۔ آپ کو پتہ نہیں کہ ان کی Life (زندگی) کتنی Disciplined (پابندِ قواعد وضوابط) ہوتی ہے؟ قاعدے اور قانون کی صورت یہ ہے کہ اس میدانِ جنگ کے اندر بھی جہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسے کامل آزادی ہے' سپاہی کے سر کے اوپر اور کھڑا ہوتا ہے' وہ وہاں یہ دیکھ رہا ہوتا کہ بندوق اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہے یا بائیں میں پکڑی ہے۔ ان پابندیوں ہی سے اختیار حاصل ہوتا ہے' یاد رکھو۔ جس قوم نے مسلسل مجاہد پیدا کرنے تھے اور وہ یہ نہیں ہے کہ الگ کوئی جماعت پیدا کرنی تھی' یہاں ہر مومن کو مجاہد ہونا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسے تو بڑی پابندیاں لگانی پڑتیں۔ اور یہ پابندیاں یہ نہیں ہیں کہ باہر سے کوئی حکم دے کر Impose (عائد) کرے گا' اپنے اوپر خود عائد کی جائیں گی۔ مومن تو کہتے ہی اس کو ہیں جو ان پابندیوں کو اپنے اوپر عائد کرے گا۔ اور یہ ہے وہ ٹریننگ جو آپ کو سال میں فوج کے لیے Reserve رکھے ہوئے ہوتے ہیں' وہ اپنا کام کاج کرتے رہتے ہیں اور سال میں ایک آدھ مہینہ تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ آکر جو ٹریننگ کا ریفریشر کورس ہے اس میں داخل ہو جائیں۔ یہ آپ کے ہاں' ایک مہینہ' آپ کے مجاہدین کے لیے' سال کے بعد Reserve کے لیے' ریفریشر کورس ہے۔

مومن کی مصروفیات کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان

مومن کی تو زندگی یہ تھی جو حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمادی۔ پوچھا کہ مومن کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب قتال ہو رہا ہو تو اس میں شریک ہو' جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ تیاری میں مصروفیت تو ان پابندیوں سے ہوتی ہے۔ کبھی کبھی فرصت دے تو ان فوجیوں کی ٹریننگ دیکھ آیا کیجیے لیکن یہ تو وہ دیکھنے جائے جس نے اپنے اوپر کوئی پابندی عائد کرنی ہو۔ جس میں عائد شدہ پابندی کی بھی یہ کیفیت ہو کہ سائیکل پہ جا رہا ہے' سامنے سے موڑ آیا ہے یہ Keep to the left (بائیں چلو) قانون ہے۔ دور سے سر اٹھا کر دیکھے گا اگر تو اسے وہ لال پگڑی والا❶ نظر آ گیا تو پھر تو نہایت قاعدے کے مطابق بائیں طرف چلا جائے گا' بڑے مہذب شریفانہ انداز سے' پرامن شہری چلے جا رہے ہیں۔ اور اگر وہ نہیں ہے اور دائیں طرف جانے سے کوئی دو پاؤں سائیکل کے اوپر بچ سکتے ہیں' زیادہ سے زیادہ وہاں جانے کے بعد دیکھے گا کہ نہیں ہے' اگر وہ کھڑا ہوا نہیں ہے تو سیٹی بجاتے ہوئے یوں نکل جائے گا جیسے قلعہ فتح کر کے آ رہا ہے۔ جس قوم نے اپنے ہاں یہ کیفیت پیدا کر لی ہو' وہ ان فوجیوں کی ٹریننگ کاہے کے لیے دیکھنے کے لیے جائے۔

جماعتِ مومنین کے لیے ریفریشر کورس کے مہینے میں (روزوں کے مہینے میں) پابندیوں کو برداشت کرنے کا نتیجہ

برادرانِ عزیز! سال کے بعد آپ کے ہاں ریفریشر کورس کا ایک مہینہ تھا۔ اور اس میں ٹریننگ کس قسم کی ہوتی تھی اس کا ثبوت یہ ہے

---

❶ پولیس کا سپاہی۔

کہ سن 2 ہجری میں روزے فرض ہوئے' ابھی سترہ دن کے روزے رکھے تھے کہ بدر کے میدان میں یہ مجاہدین چلے گئے اور تین سو نے ہزار کے اوپر وہ فتح پائی کہ قرآن نے اس کو یوم الفرقان کہا ہے۔ سترہ دن کے روزوں کا یہ نتیجہ تھا۔ اور انہی کو حق حاصل تھا کہ آکر پھر عید منائیں۔ اب یہاں کروڑوں کی تعداد کے اندر تو ساری دنیا میں مسلمان روزہ رکھتا ہی ہے۔ اس روزے سے جو پابندی اپنے اوپر عائد کرنی تھی' وہ پابندی تو صاحب چھوڑ دیجیے' یہ تو آپ نے سنا ہوگا خاص طور پہ گرمی کے دنوں کے جو روزے ہوتے ہیں' اور عصر کے وقت روزے دار کے قریب جائیے اس سے کچھ بات کیجیے تو وہ اس وقت یہ کہتا ہے ''پئی میرے نال ایس ویلے گل نہ کریں' میں روزے نال آں یعنی دند باہر کڈ دیاں گا ❶''۔ روزے دار کے قریب ہو کر دیکھیے' شارٹ مارتا ہے ''ساری دنیا نال لڑن ڈیا ہے' او تینوں پتہ نئیں میں روزہ رکھیا ہویا ہے ❷''۔ یہ تھی Self Imposed Discipline (نظم وضبط خود عائد کرنے) والی قوم کی کیفیت۔ برادرانِ عزیز! اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعداد کے اعتبار سے دیکھیے تو ان تین ❸ سو کے مقابلے میں شاید لاکھ گنا زیادہ روزے رکھنے والے ہیں' نتیجے کے اعتبار سے دیکھیے کہ وہ تین سو نے ہزار کو فتح کر لیا' یہاں تین آتے ہیں ہزار ہزار کو مار کر چلے جاتے ہیں اور یہ ہے اپنے اوپر خود عائد کردہ پابندیوں والی اس نامِ نہاد قوم کی کیفیت۔

مجرمین کے بالمقابل دوسرا شخص اپنے اوپر خود پابندی عائد کرتا ہے

برادرانِ عزیز! قرآن کہتا ہے کہ **لا اکراہ فی الدین** کیا بات ہے قرآن کی! کہ خدا اس قدر عظیم قوتوں کا مالک ہے' اگر چاہتا تو جس طرح خارجی کائنات میں اس کا نظام از خود قائم ہے' انسانی دنیا میں بھی از خود ہو جاتا اور انسان اس کے مطابق چلنے پر مجبور ہوتا لیکن اس باب میں وہ زبردستی نہیں کرنا چاہتا۔ اسے انسان کو اپنے دل کی رضا مندی سے قائم اور اختیار کرنا ہے۔ Super Imopsed (خارج سے عائد) پابندی تو مجرم کے اوپر عائد کی جاتی ہے۔ شریف انسان اپنے اوپر آپ پابندیاں عائد کرتا ہے۔ **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ** (2:183)۔ یہ صیام کوئی نئی بات نہیں ہے جہاں جہاں بھی ہم نے مجاہدین تیار کیے تھے' اس سے پیشتر انبیائے کرامؑ تھے' ان کی امتوں سے بھی یہی کہا گیا تھا۔ یہ تو ازل سے حق و باطل کی لڑائی چلی آ رہی ہے۔ ازل سے اس قسم کے جو حزب اللہ ہیں' وہ تیار ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ان پر بھی یہ پابندیاں ہم نے عائد کی تھیں۔ کاہے کے لیے یہ

---

❶ مجھ سے اس وقت بات نہ کرو۔ میں روزے سے ہوں یعنی دانت باہر نکال کر رکھ دونگا۔

❷ سب سے لڑ رہا ہے۔ (کہتا ہے کہ) کیا تجھے معلوم نہیں ہے کہ میں نے روزہ رکھا ہوا ہے۔

❸ یہ کفار کے مقابلے میں میدانِ بدر میں آنے والے تین سو مجاہدین کی طرف اشارہ ہے۔

پابندیاں عائد کیں؟ واعظ کو آپ نے دیکھا کہ روزے کے احکام بیان کر رہا ہے ''پانی پین ڈیا ہے ❶'' ہر واعظ یہی کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ روزہ کیوں رکھا ہے؟

قدرت نے حضرتِ انسان کے لیے غیر متبدل اصولوں کے ساتھ ساتھ ان مستقل اقدار کی حقانیت کو قدم قدم پر واضح بھی کیا ہے

آپ کو معلوم ہے قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ ہم نے کتاب اور حکمت نازل کی۔ کتاب تو قانون کو کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ اس کے ساتھ یہ حکمت بھی نازل کی ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ ہمارے ہاں عام طور پہ ایک شکایت ہوتی ہے کہ صاحب! یہاں جب کوئی حکم نافذ ہوتا ہے تو یہ نہیں بتایا جاتا کہ ہم یہ کیوں نافذ کر رہے ہیں' کیا ضرورت پڑ گئی تھی' اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ What is The why of it؟ عزیزانِ من! بڑا اطمینان ہو جاتا ہے اگر آپ دوسرے کو Rationally (حکمت سے) سمجھا دیں کہ یہ یوں کہہ رہے ہیں۔ گھر کے بچے کو آپ ایک جگہ حکم دے کر دیکھیے کہ بیٹھ اوئے! یوں نہیں کرتے۔ اور دوسرے وقت میں یا دوسری جگہ یا دوسرا باپ اس بچے کو سمجھائے کہ دیکھو بیٹا! یہ یوں نہیں کرتے' اس کا یہ نقصان ہوتا ہے' ایسا کر لینے سے یہ فائدہ ہوتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو آپ کے احکام کی تعمیل ہوتی ہے ان دونوں صورتوں میں انہیں کتنا فرق پڑتا ہے۔ پہلی صورت میں وہ ہر وقت محسوس کرتا ہے کہ ہاں صاحب! ''ٹھیک ہے جی! پیو جے ہویا' منّنا ہیگا وے' روٹی کھان نوں دیندا اے' نہ مناں گے تے تھپڑ مارے گا ❷''۔ ہر وقت اس کے خلاف Revolt (بغاوت) ہوتی ہے۔ اور اگر آپ ذہنی طور پہ اس کو مطمئن کر دیتے ہیں' Rationally Explain (فکری طور پہ وضاحت) کر دیتے ہیں' The why of that order of yours (اپنے اس حکم کی وجۂ جواز) بتا دیتے ہیں تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ اسے حکمت کہتے ہیں۔ یہ قرآن نے کہا ہے کہ یہ جو حکمت ہے' یہ منزل من اللہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ منزل من اللہ کیوں ہے؟ اس میں بڑی گہری چیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے آپ کو ایک دوائی دی' کہا کہ چار چار گھنٹے کے بعد یہ پیتے جانا۔ یہ تو ہے کتاب' یہ تو ہے حکم' یہ تو ہے قانون۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ پیتے جایئے' شام کو چھ بجے آپ دیکھیں گے کہ آپ کا بخار اتنا کم ہو جائے گا' یہ پیجیے تاکہ بخار کم ہو جائے۔ اگر ڈاکٹر صاحب یہ نہ بتائیں تو آپ پیئے جائیں گے' آپ کو کچھ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ دوائی نے وہ اثر کیا ہے یا نہیں کہ جو ہونا چاہیے تھا۔ اگر انہوں نے کہہ دیا ہے' اگر چار گھنٹے کے بعد آپ کا بخار اتر

---

❶ پانی پی رہا ہے۔
❷ ٹھیک ہے جی! باپ جو ہوا۔ اسے مانتا ہے' ہمیں کھلاتا پلاتا ہے۔ اگر اسے نہیں مانیں گے تو تھپڑ رسید کر دے گا۔

جائے گا تو چار گھنٹے کے بعد آپ کھڑے ہو کر دیکھیں گے' اگر تو وہ اترا ہے تو ٹھیک ہے' تشخیص ٹھیک ہے' دوائی ٹھیک ہے' اس نے اپنا نتیجہ دکھا دیا۔ اگر بخار نہیں اتر رہا تو آپ اس کے بعد فوراً ڈاکٹر صاحب سے کہیں گے۔ ڈاکٹر صاحب بھی پھر دوبارہ کھڑے ہو کر سوچے گا' تشخیص میں غلطی ہوئی' دوائی تجویز کرنے میں غلطی ہوئی یا خود دوائی ہی غلط مل رہی ہے۔ یعنی اگر وہ متعین نتیجہ نہیں نکل رہا ہے جس کے لیے کہا تھا کہ ایسا کرو تو پھر وہ اس کو Continue (جاری) نہیں کرتا جائے گا' یہ کیفیت نہیں ہوگی کہ

نہ دکھ جائے' نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے' اور میں ہوں

مگر وہ ہے کہ پئے جا رہا ہے۔ او کیوں پئے چلا جا رہا ہے؟ ''ڈاکٹر صاحب نے جو کہا سی''۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا **لَعَلَّكُمْ** تا کہ یہ ہو جائے۔ او یہ نہیں ہو رہا' کھڑے ہو جاؤ' کیوں خوامخواہ پئے چلے جا رہے ہو۔ آپ یہ کبھی نہیں کرتے کہ پئے چلے جائیں لیکن آپ نماز پڑھے جائیں گے' روزے رکھے جائیں گے۔ کیوں؟ کہ جی! یہ حکمِ خداوندی ہے۔ بھئی! اس نے تو ساتھ کہا تھا **لَعَلَّكُمْ** (2:183) تا کہ یہ ہو جائے۔ تو کھڑے ہو کر کبھی دیکھو کہ جو اس نے کہا تھا ہو جائے وہ ہو رہا ہے۔ برادرانِ عزیز! آپ نے سوچا کہ کیوں قرآن نے خود حکمت کو بھی ساتھ بتا دیا۔ اگر وہ یہ نہ بتاتا تو ہم اپنے آپ کو مطمئن کر کے بیٹھ جاتے کہ ہو رہا ہے۔ ہمارے پاس کوئی Objective Standard (خارجی معیار) کوئی معیاری کسوٹی' کوئی تھرمامیٹر ہوتا' جو بتا دیتا کہ مریض کا بخار کم ہو گیا ہے۔ یہ جو اپنے متعلق خود ہی فیصلہ کر لینا ہے کہ وہ ٹھیک ہو رہا ہے' یہ فریبِ نفس ہے۔

مذہب کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو نتائج حاصل کیے بغیر اُسے خود فریبی میں الجھائے رکھے

مذہب فریبِ نفس دیتا ہے۔ ہر فرد خود فیصلہ کر لیتا ہے' اور اپنے ہی زعم میں مقربِ بارگاہِ خداوندی بنتا چلا جا رہا ہوتا ہے۔ خوابوں میں دیدارِ الٰہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہاں سے نیچے اتریئے وہ اربابِ شریعت ہوتا ہے جی! اس سے ہوتا کیا ہے؟ ثواب ہوتا ہے' جی! تا کہ کوئی بتا ہی نہ سکے کہ یہ ثواب ہوتا کیا ہے۔ قرآن **لَعَلَّكُمْ** (2:183) کہتا ہے تا کہ یہ ہو جائے۔ اور وہ اس دنیا کے اندر ہونے والی بات بتاتا ہے۔ کہتا ہے کہ **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** (2:183)۔ عزیزانِ من! تین آیات کے اندر آپ دیکھیے اور پھر قرآن کو دیکھیے کہ اس نے حکمت کیوں خود نازل کی تھی؟ تا کہ تم کبھی فریب میں نہ رہو کہ ویسا نہیں ہو رہا اور کرتے چلے جاؤ۔ اگر ویسا نہیں ہو رہا تو کھڑے ہو کر سوچنا پڑے گا۔ یہ بات تو نہیں ہوگی کہ ہم یہ دیکھیں کہ تشخیص غلط تھی (معاذ اللہ)۔ وہ تو خدا کی تشخیص ہے۔ دوائی غلط تجویز ہوئی تھی (معاذ اللہ)۔ خدا کی تجویز کردہ ہے۔ نتیجہ نہیں برآمد ہو رہا' ہم میں کوئی نقص ہے۔ نسخہ صحیح نہیں بنوا رہے' ہمارے پاس دوائی صحیح نہیں آ رہی۔ نہ ڈاکٹر میں

نقص ہے نہ اس کی دوائی تجویز کرنے میں نقص ہے' مجھ میں کوئی نقص ہے' جس کی وجہ سے نتیجہ نہیں پیدا ہو رہا۔

قانون کے ساتھ حکمت انسان کے ارادے کو عمل کے میدان میں استقامت عطا کرتی ہے

عزیزانِ من! یہ ہے منزل من اللہ ہونے کی حکمت۔ یہ فریب نہیں ہے۔ دین میں کتاب اور حکمت دونوں دوش بدوش چلتی ہیں تا کہ ہر قدم پہ کھڑا ہو کر یہ دیکھ لے کہ نتیجہ وہ نکل رہا ہے' ویسا ہو رہا ہے جیسا اس نے کہا ہے۔ اور یہ ہے حکمت قرآن کی۔ جہاں اس نے قانون دیا ہے اس کے ساتھ **لَعَلَّكُمْ** (2:183) کہا ہے۔ آپ پھر قرآن میں دیکھیے گا آپ کو پتہ چلے گا کہ حکمت کیا شے ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** (2:183) تم پر روزے فرض کیے گئے۔ میں نے کہا ہے کہ دو آیات کے اندر تین بار **لَعَلَّكُمْ** (2:183) آیا ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ** (2:183) تا کہ تم قوانین کی نگہ داشت کرنے کے قابل ہو جاؤ۔ حلال وطیب چیزوں کے استعمال کے اوپر ایک پابندی عائد کی ہے اور کہا ہے کہ تم خود پابندی عائد کرو تا کہ جن چیزوں پر چلنے کے لیے روکا گیا ہے اس سے خود تمہارے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جائے۔ جب میں نے جو جائز کمائی ہے' اس سے حاصل کردہ رزق بھی اپنے لیے کہہ دیا کہ میں نے آج یہ روٹی نہیں کھانی تو اس سے تمہارے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ حرام کا جو رزق سامنے آئے گا تم اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے۔ آپ کو یہ بھی یاد ہے کہ یہ روزے کی چار آیات ہیں' ان چار آیات کے بعد جو آپ کو کہا ہے وہ کیا کہا ہے؟ یہ کہ **وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ** (2:188) او! یہ سارا کچھ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھا جایا کرو۔ یہ ہے **لَعَلَّكُمْ**۔

اپنے آپ کو بدعملی کے نتائج سے محفوظ رکھنے کا نام تقویٰ ہے

غور کیجیے گا قرآن کی حکمت کیا ہے۔ کہتے ہیں صاحب! کہ یہ آیات یونہی جوڑ کر رکھ دی ہوئی ہیں' کوئی ترتیب یا ربط تو ان میں ہے نہیں۔ آپ ربط دیکھتے ہیں' ان کو اس میں کیا نظر آئے جنہوں نے روزہ رکھ کر باطل کا مال کھانا ہو۔ ربط تو یہ تھا۔ **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ** (2:183) یہ غلط قدم اٹھانے کے مضرت رساں انجام کا ڈر ہے جسے تقویٰ کہتے ہیں: نہ بھئی! یہ کیا' تو یہ ہو جائے گا' کہا ہے تا کہ تمہارے اندر اس کی استعداد پیدا ہو جائے۔ میں وہ پھر ٹریننگ کہوں گا جو فوجی کو سال بھر ملتی ہے یعنی ان کے پاس کھانے کے لیے ہوتا ہے' پانی ہوتا ہے' یہ پندرہ پندرہ میل سپاہی کو دوڑاتے ہیں حالانکہ موٹریں ساتھ ہوتی ہیں مگر یہ ان کو دوڑاتے ہیں۔ اور اس میں ہوتا یہ ہے کہ پانی نہیں پینا' کچھ نہیں کھانا۔ بھئی کیوں؟ اس لیے کہ کل کو جب میدانِ جنگ میں جانا ہے تو یہ تربیت اس وقت کام آئے گی۔

روزے فرض کرنے کا مقصد انسان میں نہایت استقامت کے ساتھ قانون کی پابندی کی استعداد پیدا کرنا ہے

1965ء کے میدانِ جنگ میں ہم نے دیکھ لیا کہ چھ چھ دن تک یہ سپاہی ان مورچوں کے اندر بغیر دانے اور پانی کے بیٹھے رہے۔ یہ نتیجہ تھا اس ٹریننگ کا جوان کو جنگ کے علاوہ امن کے زمانے میں ملی تھی۔ کہا کہ اپنے اوپر یہ پابندیاں امن کے زمانے کے اندر Impose (عائد) کیا کرو لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (2:183) تا کہ تم میں قانون کے پابند ہونے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ قانون کی پابندیاں عائد کر دیں۔ کیا ہوا اس کے لیے؟ میں نے کہا تھا کہ یہ تو مجاہدین کا ایک پروگرام ہے۔ یہ جہاد کا ہے کے لیے ہے؟ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185) تا کہ جو تمہیں ہدایت اور راہنمائی دی گئی ہے' اس کی بنا پر تمہارے خدا کا قانون دنیا میں سب سے بلند رہے اس لیے یہ صیام فرض کیے گئے ہیں۔ صیام کا کیا پروگرام ہے؟ لَعَلَّكُمْ کیا ہے؟ قانون کیا ہے اور اس کی حکمت کیا ہے؟ اس سے لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185) ہوگا' اس سے Self Discipline (ضبطِ خویش) ہوتا کہ اس دنیا میں خدا کے نظام اور قانون کو کبریائی حاصل ہو جائے۔ دیکھ رہے ہیں آپ کہ یہی نتیجہ سامنے نکلتا ہے یا نہیں؟ کروڑوں کی تعداد میں صیام کی اتنی پابندی ہے کہ صاحب! اگر عید کے چاند کے متعلق کہیں ہو گیا ہے کہ وہ چاند نہیں ہوا' دوسرے دن روزہ نہیں رکھا گیا تو قیامت برپا ہو گئی' شریعتِ حقہ تباہ ہو گئی کہ ایک روزہ رکھنا تھا اور انہوں نے نہیں رکھا یا۔ آپ کو پتہ ہے جو کچھ قیامتیں یہاں بپا ہوا کرتی ہیں ''تے انتیس رکھ کے کیہڑا خیبر فتح کر لیا سی' جیہڑ اتیس رکھ کے کرلوگے۔ جیویں ستیاناس ایویں سوا ستیاناس[1]''۔ یہاں (بدر کے میدان میں) تو سترہ روزے رکھنے کے بعد لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185) ہوا تھا۔ پوچھو بدر کے میدان سے کہ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ کہا کہ یہ کرو۔ اور اس کے ساتھ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (2:185) تا کہ تمہاری محنت رائیگاں نہ چلی جائے' بھرپور نتائج پیدا کرے' اس لیے یہ کچھ کرو۔

عزیزانِ من! یہ بھی تو ہوتا ہے کہ محنت بھی آدمی کرتا ہے' وقت بھی دیتا ہے' نیک نیت بھی ہوتا ہے لیکن کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہوتی ہے' بھرپور نتائج نہیں پیدا ہوتے۔ کہا کہ یہ جو جزئیات کے اوپر ہم نے کہا ہے کہ نگاہ رکھو' اس میں جزئیات کیوں ہیں؟ وہ اس لیے دی ہیں۔ برادرانِ عزیز! وہ چیزیں دو تین آیات میں آ گئیں۔ پہلی چیز تو یہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (2:183) ہے کہ ہر قانون کی نگہداشت کرنے کی صلاحیت خود پیدا ہو جائے۔ یعنی یہ With effort (کوشش سے) نہ کرنا پڑے' آپ کے اندر کی یہ چیز ہو جائے کہ خود بخود آپ اس کی اطاعت کرتے چلے جائیں۔ پھر سپاہی کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ خود بخود اطاعت کرنے لگتا ہے۔ اطاعت کی چیز کے لیے تو مجھے ایک سپاہی دوست کا وہ فقرہ پسند آیا۔ بریگیڈیر کہتا ہے کہ اطاعت کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ مجھے تو اپنے اردلی کی بھی اطاعت کرنی پڑتی

---

[1] 29 روزے رکھ کر کونسا خیبر فتح کیا ہے جو تیس رکھ کر کرلوگے۔ جیسے ایک ستیاناس اسی سے سوا ستیاناس۔

ہے جب وہ صبح آواز دیتا ہے کہ صاحب! پانچ بج گئے ہیں' صاحب کو کتنی ہی نیند کیوں نہ آئی ہو' مجھے اٹھنا ہوتا ہے۔ وہ بڑی بات کہہ گیا ہے۔ Self Discipline (ضبطِ خویش) کا جذبہ' اس کے اندر اتنا سرایت کر جاتا ہے کہ پھر اس کی عادت ہو جاتی ہے۔ اس **لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ** میں قرآن کیا بات کہہ گیا ہے! کہ از خود تم قانون کی پابندیاں کرتے چلے جاؤ' اس لیے تمہیں یہ کہا ہے۔ کیوں پابندیاں عائد کرتے چلے جاؤ؟ یہ نہیں ہے کہ ہمارا حکم ہے' حکمِ حاکم مرگِ مفاجات کہ ''صاحب نے کہہ دتا جی' منا ہیگا' کی کِتا جائے [1] ؟'' **لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمۡ** (2:185) دنیا میں کبریائی صرف نظام خداوندی کے لیے ہو جائے۔ اور جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو اس کبریائی کو قائم کرنے کے لیے تم جو کوشش کرو وہ **لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ** (2:185) بھرپور نتائج کی حامل ہو۔ یہ سب اس لیے ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔

پرویزؒ کی طرف سے' تین دن یا نو دن کے روزوں کے سلسلہ میں' الزام تراشی کا جواب

عزیزانِ من! یہ **اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ** (2:184) چند گنتی کے دن ہیں۔ یہ گنتی کے دن کیا ہیں؟ ساری آیات سامنے آئیں گی تو ان میں عرض کروں گا لیکن عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔ شور اُٹھتا ہے کہ صاحب! یہ نو دن کے روزے ہیں' کوئی کہتا ہے کہ تین دن کے روزے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ کن کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں؟ **محاورةً** کہتا ہوں کہ جو بلا آسمان سے آتی ہے خانۂ انوری کی طرف ہوتی ہے۔ ایک پرویزان کو مل گیا ہے جو ان کے قول کے مطابق کہتا ہے کہ تین نمازیں پڑھو۔ جی! کہاں کہتا ہے؟ کہاں لکھا ہے اس نے؟ جی کہتا ہے۔ جی! وہ تو نہیں کہتا؟ ''ساری دنیا کہندی اے۔ او کہندی اے ساری دنیا' پھاہے اینوں دے [2] دیو''۔ یہ کہتا ہے کہ جی نو دن کے روزے رکھو۔ برادرانِ عزیز! میں یہ چیز اللہ کی بارگاہ میں' شکرانے کے طور پہ کہتا ہوں کہ یہ میں تھا جس نے یہ کہا تھا کہ قرآن میں یہ کہیں نہیں لکھا ہوا کہ تین یا نو دن کے روزے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن میں یہ لکھا ہوا ہے کہ **فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ** (2:185) جو تم میں سے اس مہینے میں گھر پہ موجود ہو **فَلۡيَصُمۡهُ** (2:185) وہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ اس کے لیے یہ مہینہ روزوں کا ہو۔ میں نے یہ کہا تھا کہ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ روزوں کا مہینہ ہے۔ خیر قرآن کہتا ہے کہ **اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ** (2:184) یہ روزے گنتی کے دنوں کے ہیں۔ گنتی کا تعین' بجائے خویش' ڈسپلن پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔

---

[1] صاحب نے کہہ دیا ہے۔ اسے ماننا ہی ہے' اس کا اسے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

[2] ساری دنیا یہی کہتی ہے۔ یہ بات ساری دنیا کہتی ہے مگر پھانسی چڑھا دو۔

روزوں کی گنتی کے پورا کرنے کے متعلق قرآن کریم کا حکم

عزیزانِ من! مجھے ایک اور اہم بات کہنی ہے اس میں' خواہ اس کے لیے پانچ منٹ زیادہ ہی کیوں نہ لگ جائیں۔ سنیے! قرآن نے رمضان کے متعلق ایسی تفصیل دی ہے' کم احکام ہیں جن کی تفصیل آئی ہے۔ نماز کی تو قرآن میں زیادہ تفصیل نہیں آئی' کہا ہے کہ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (2:184)۔ عزیزانِ من! پہلے یہاں دیکھیے' آیا ہے کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ (2:184)۔ اس کے معنی عام طور پہ یہ کیے جاتے ہیں کہ جو تم میں سے اس مہینے میں زندہ ہو' وہ روزے رکھے۔ اندازہ لگاؤ کہ ''جیہڑا مر گیا ہیگا اے' اوہدے لئی وی کہن دی لوڑ ہیگی ❶؟'' عربی زبان میں شہد کہتے ہیں: ''وہ شخص جو گھر پہ موجود ہو''۔ ہمارے تصور میں نہیں آسکتا اس لیے کہ ہم لوگ تو تمدنی زندگی کے رہنے والے ہیں' عام طور پہ گھر پہ ہی رہتے ہیں' کبھی کبھی باہر گئے۔ وہ جوان لوگوں کی صحرائی زندگی تھی' وہ اکثر باہر سفر میں ہی رہتے تھے۔ اور سفر وہ صحرا کا تھا' ائر کنڈیشن کا سفر نہیں تھا۔ وہاں یہ بڑی اہم چیز تھی۔ شھد کے معنی ہوتا تھا وہ جو ''گھر پہ موجود ہو''۔ گھر پہ موجود ہونا پہلی چیز ہوگئی۔ اور غاب وہ ہے جو سفر میں ہو۔ یہ ہیں شھد اور غاب کے الفاظ اس کے بعد ہے کہ من كان منكم مريضًا (2:185) یہاں استثنا کے لیے مریضًا کہہ دیا۔ گویا تندرست ہونا ضروری ہوگیا۔ اب اگر وہ گھر پہ نہیں ہے اور تندرست بھی نہیں ہے تو کیا کرے؟ کہا کہ مَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (2:184) وہ مریض ہو یا حالتِ سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرے۔

عزیزانِ من! ٹریننگ کے لیے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مختلف Badges (گروپ) بنائے جائیں گے جو اس قسم کے' اس نارمل کورس میں شامل نہیں ہو سکیں گے' ان کے لیے پھر دوسرے مقام پہ' دوسرے وقت میں' دوسرا ٹریننگ کورس ہوگا۔ ہاں تو یہ بات ہوگئی کہ گھر پہ موجود ہو' تندرست ہو۔ اگر موجود نہ ہو' مسافر ہو' تو دوسرے دنوں میں' اور اگر مریض ہو' تو جب تندرست ہو جائے تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرلے۔

روزوں کے سلسلہ میں جناب مودودیؒ کی ایک عجیب وغریب منطق

برادرانِ عزیز! بظاہر نظر آتا ہے کہ بات مکمل ہوگئی لیکن یہ قرآن ہے' کہتا ہے کہ بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ ایک تیسری کیٹگری (شق) بھی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نہ تو بیمار ہے اور نہ ہی حالتِ سفر میں ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ (2:184) وہ روزے کو بہ مشقت نبھا سکتا ہے۔ اس کے لیے دوسرے اوقات میں روزے پورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں

---

❶ جو مر گیا ہے اس کے لیے بھی یہ کہنے کی ضرورت ہے؟

ہوتا۔اس کے لیے یہ ہے کہ فِدۡيَةٌ طَعَامُ مِسۡكِيۡنٍ (2:184) وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ یہ کون ہیں؟ یہی تھا جس کے لیے میں نے کہا تھا کہ مجھے ذرا تفصیل سے بیان کرنا پڑے گا۔ میرے الفاظ میں نہ سنیئے' آپ کے ہاں یہ قصہ چلا آ رہا ہے۔ پہلے دن سے جو ایک بھیڑ گئی' وہ ایک راستے سے چلی جا رہی ہے۔ میں' جو زیادہ قدامت پرست لوگ ہیں' ان کی بات نہیں پیش کر رہا' یہ ہمارے ہاں اسی لفظ کے متعلق ایک بحث چلی تھی' میں وہ پیش کر رہا ہوں۔ اتفاق سے وہ بات سید ابولاعلیٰ مودودی صاحب (1979-1903ء) کے ساتھ چلی تھی۔ گویا وہ ہمارے دور کے ماڈرن قسم کے مفسر ہیں۔ میں نے اس لیے یہ عرض کیا ہے کہ یہ نہ کہا جائے کہ صاحب! وہ جو پکی روٹی کی قسم کے ملا ہیں' یہ ان کی بات کر رہا ہے۔ پہلے انہوں نے قرآن کی اس آیت کا ترجمہ کیا۔ کہا کہ یہ چند گنے چنے دن ہیں' پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو' تو ان کا شمار دوسرے دنوں میں ہونا چاہیے۔ ٹھیک ہے آگے وہ آیت آتی ہے' قرآن شریف سامنے ہے تو نکال لیجیے' یہ بڑی اہم بات ہے جواب آئے گی۔ وہ آیت یہ ہے کہ وَ عَلَى الَّذِيۡنَ يُطِيۡقُوۡنَهٗ فِدۡيَةٌ طَعَامُ مِسۡكِيۡنٍ (2:184)۔ ترجمہ سنیئے کہ جو مریض ہو' مسافر ہو' تو وہ دوسرے دن میں پورا کرے اور جو لوگ اس کی یعنی روزے کی' طاقت رکھتے ہوں' ان پر ایک مسکین کے کھانے کا فدیہ ہے۔ یعنی جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں' وہ تو ایک مسکین کا فدیہ دیدیں' جو طاقت نہ رکھتے ہوں وہ ضرور روزہ رکھیں۔ مریض ہے' دوسرے دنوں میں رکھیں' مسافر ہے واپسی پہ رکھے۔ ہٹا کٹا ہے' گھر پہ بیٹھا ہے' مسافر بھی نہیں ہے' مریض بھی نہیں ہے' تندرست ہے' روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہے تو کہا ہے کہ اور جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں' ان کو فدیہ ہے ایک مسکین کا۔ آپ نے غور فرمایا یا ابھی کچھ اور سمجھنے کی بات ہے؟ ہے ضرور' اس لیے کہ آپ سمجھ نہیں سکتے کہ یہ ہو کیا رہا ہے؟ اور میں نے اس لیے اپنے الفاظ میں نہیں کہا' عبارت پڑھ کر سنا دی ہے۔ ان کی تفسیر موجود ہے' اسے نکال کر دیکھ لیجیے گا۔ اب نئی بات نہیں ہے' ہزار برس سے یہ لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ ہو گئی یہ بات تواتر سے ثابت ہے۔ یہ لکھنے کے بعد' اب زمانہ یہ دورِ موجودہ ہے کہ صاحب! جو پڑھے گا' وہ تو کہے گا کہ یہ کیا صاحب! کہ جو ''روزہ رکھن دی طاقت رکھے تے فدیہ دے کے چھوٹ جائے' جناں نوں طاقت نہ ہووے اور روزہ رکھن [1] '' مرے کو مارے شاہ مدار۔ ''میں بیمار آں اچھا جدوں تندرست ہوویں گا او ہدوں رکھیں۔ میں تے واندے گیا ہویاں۔ کدی تے گھر آویں گا ای نا۔ گھر بیٹھا اے چنگا بھلا تندرست طاقت رکھدا اے ہیگا' او ہنوں کہندا اے کہ اک فقیر نوں کھانا کھلا' تینوں نئیں روزہ [2] ''۔ انہوں نے یہ لکھا۔ اس کے بعد کسی نے اعتراض کیا تو انہوں نے اس کا نام ایک نیا فتنہ رکھا۔ کہا کہ یہ پھر فتنہ ہے کہ جی! دیکھیے' یہ اعتراض کرتے ہیں۔ اس کے بعد بڑے فخر سے

---

[1] جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھے وہ فدیہ دے کر چھوٹ جائے اور جنہیں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو وہ روزہ رکھیں۔

[2] میں بیمار ہوں۔ اچھا' جب تندرست ہو جاؤ تو پھر رکھ لینا۔ جی! میں تو سفر میں ہوں۔ اچھا' کبھی تو گھر آؤ گے۔ وہ گھر بیٹھا ہے' چنگا بھلا تندرست و توانا ہے' روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اسے کہتا ہے کہ ایک فقیر کو کھانا کھلا دو۔ تمہیں روزہ رکھنا نہیں ہے۔

لکھتے ہیں کہ کسی سے کہیے کہ قرآن شریف سے اس اعتراض کا جواب دیدے۔قرآن پہ اس طرح تنقید کرتے ہیں جیسے وہ ''پرویز صاحب دی کوئی کتاب ہوندی اے ❶''۔ذہن میں نہیں ہے کہ یہ اس خدا کی کتاب ہے جس پہ ہمارا بھی ایمان ہے۔مگر اعتراض یوں کریں گے کہ جیسے وہ کوئی ہماری کتاب ہے۔

عزیزانِ من! اِن سے کہیے کہ وہ اس اعتراض کا جواب قرآن سے دیں۔اب درس کا وقت نہیں ہے ورنہ میں پڑھ کر سناتا کہ یہ جو اس قسم کی چیزیں ہیں' اس قسم کی باتیں ہیں' وہ ایک اناڑی بھی یوں نہیں کہتا۔یہ لکھا ہوا ہے خدا کی کتاب کے متعلق اس بات سے تو بہ بھئی! اب اس کے بعد صاحب! آگے چلیے' اب دیکھیے کہ حدیث کس طرح ہمیں قرآن مجید کے اس مقام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔اچھا جی! کیا مدد دیتی ہے؟ کہتے ہیں کہ یہ جو پہلا حصہ تھا' یہ ایک سال پہلے نازل ہوا' دوسرا حصہ اس کے ایک سال بعد نازل ہوا۔پہلے سال روزے فرض کرتے وقت یہ رعایت رکھی گئی کہ آدمی روزے کی طاقت رکھنے کے باوجود' اگر روزہ نہ رکھے تو فدیہ دیدے۔مگر دوسرے سال اس رعایت کو منسوخ کر دیا گیا۔چل بھئی! قصہ ہوا ختم۔کہاں ہے جی! وہ کہ دوسرے سال اسے منسوخ کر دیا؟ حدیث شریف میں جو آ گیا۔ پہلے سال روزے کو فرض کیا' فرض کرنے کے ساتھ کہہ دیا کہ جن میں روزہ رکھنے کی ہمت ہے' وہ نہ رکھیں' وہ فدیہ دیدیں۔سال کے بعد چونکہ رمضان آتا ہے' پہلے رمضان میں تو یہ کر گئے (معاذ اللہ معاذ اللہ)' اس کے بعد پھر خود ہی اللہ میاں کو خیال پیدا ہوا کہ ''اے حکم کی دے دتا؟ دوسرے سال دے روزے آن تو پہلاں پہلاں کہہ دتا ❷'' کہ وہ حکم منسوخ ہے۔آپ نے دیکھا کہ حل کیسے تلاش ہوا۔اس بیان سے نہ صرف یہ ہوا کہ سارے اشکالات' یہ ان کی عبارت ہے' رفع ہو گئے' بلکہ یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ دوسرے سال آخری اور قطعی حکم دیتے وقت یہ بات کیوں کہہ دی۔کیا بتائیں کہ انہوں نے قرآن کو کیا سمجھ رکھا ہے؟

قرآن حکیم کو محاورۂ عرب میں تصریف آیات کے تحت ہی سمجھا جا سکتا ہے

عزیزانِ من! سنیے' کہا کہ **وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ** (2:184)۔انہوں نے کیا کیا؟ یہ کہ **يُطِيْقُوْنَهٗ** کا اردو زبان میں ترجمہ کر لیا کہ ''جو اس کی طاقت رکھے'' اور طاقت کے معنی ہمارے ہاں تو پتہ ہی ہے جو ہوتے ہیں۔یہ عربی زبان میں سمجھے ہی نہیں۔اور پھر مجھ سے لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! یہ تو زبانِ عربی کے اندر قرآن کا لفظ تھا تو کیا بات ہو گئی کہ تم اس سے کوئی نئی باتیں نکالتے ہو' کیا ان لوگوں کو عربی زبان بھی نہیں آتی تھی؟ اب میں کیا بتاؤں۔عزیزانِ من! بات یہ نہیں ہے' زبان کا سوال نہیں

---

❶ جیسے وہ پرویز صاحب کی کوئی کتاب ہوتی ہے۔

❷ یہ کیا حکم دے دیا!!! دوسرے سال کے روزے آنے سے قبل ہی یہ حکم دے دیا۔

ہے۔ ہمارے ہاں تو اسلاف میں سے کسی کے ہاں سے کوئی غلطی ہوگئی۔

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

اب اس کو جو غلطی کہنا ہے یہ سخت غلطی ہے۔ بات بنے نہ بنے' آپ یہ کہتے چلے جایئے کہ صاحب! اس کے اندر بھی بات کچھ ہوگی بات یہی ٹھیک ہے۔ کہیں ایک غلطی چل پڑی تو اتر کے ساتھ Snowball (برف گولا) بنتا چلا گیا۔ عزیزانِ من! یہ معنی میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا' میں آپ کو کہا کرتا ہوں کہ میں نے جو "لغات القرآن" لکھا ہے' اس میں ہر لفظ کے لیے' عربی زبان کے جو مستند لغت ہیں' ان کے حوالے دیئے ہیں۔

لغت کی بنا پر روزوں کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے احکامات کی وضاحت

عزیزانِ من! اب سنیئے' اور پھر وجد میں آجایئے۔ کہا ہے کہ جو گھر پہ موجود ہو' تندرست ہو' اس کے لیے روزے فرض ہیں' مریض ہو جب تندرستی آجائے' صحت یاب ہو جائے' تو روزے فرض ہیں۔ مرض ایک عارضہ ہوتا ہے پھر آدمی تندرست ہو جاتا ہے' سفر ایک عارضی چیز ہے پھر گھر پہ آجاتا ہے۔ ایک شخص بوڑھا ہو چکا ہے' بڑھاپے کی وجہ سے روزہ رکھنے کی اس میں طاقت نہیں' وہ اس کو بہ مشقت کر سکتا ہے' یہ نہ مسافر ہے' نہ مریض ہے۔ بعض لوگ Constitutionally (جسمانی طور پر) اس قدر کمزور پیدا ہوتے ہیں کہ وہ تھوڑے سے وقت کے لیے بھی بھوک اور پیاس برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ یہ نہ مریض ہوتا ہے' نہ مسافر ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا کام اس قدر مشقت کا ہوتا ہے جیسے جیل خانے کے قیدی' دودھ پلانے والی عورتیں' حاملہ عورتیں' بڑھاپا۔ یہ ایک کیٹیگری (شِق) ہے جو نہ مریضوں میں آتی ہے' نہ مسافروں میں آتی ہے۔ برادرانِ عزیز! عربی زبان میں یطیق کہتے ہیں "جو کام بہ مشقت کیا جاسکے"۔ اس کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ یہ طوق (ط و ق) سے ہے جو طاق ہے' جیسا کسی کے گلے میں طوق پڑ گیا ہو۔ یہ ہے جو کام کوئی بہ مشقت کرے یعنی جس میں اس کے کرنے کی طاقت نہ ہو لیکن بڑی مجبوری سے کوئی کام کرے۔ یہ تیسری کیٹیگری (شِق) ہے۔ کہا ہے کہ اگر تندرست گھر پہ موجود ہے تو روزہ رکھے' مریض ہے مرض کے بعد رکھے' مسافر ہے واپسی پر رکھے۔ اور وہ شخص جس میں اب روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رہی ہے' اتنا بوڑھا ہو چکا ہے کہ ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے' وہ نہ اس وقت رکھ سکتا ہے نہ اسے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگلے سال رکھنا۔ ستر برس کے بوڑھے سے یہ کہنا کہ "اچھا ایدکیں نہ رکھ' جدوں اکہتراں دا ہو جائیں گا او ہدوں رکھیں [1]"۔

کیا بات ہے قرآن کی! کہا ہے کہ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (2:184)۔ دل سے تو اس جماعت کے ساتھ شامل ہو جائے' رمضان

---

[1] اچھا! اس سال نہ رکھو' جب 71 سال کے ہو جاؤ گے تو رکھ لینا۔

بھر میں یہ چیز کرے۔ اس کے اندر یہ کیفیت ہوگی کہ باقی دنوں سے کچھ دوسرے دن آئے ہوئے ہیں احساس ہوگا کہ مجھ میں ہمت نہیں' کوئی استعداد نہیں' میں نہیں رکھ سکتا' میری طرف سے ایک سپاہی کا جو خرچ ہے وہ میں بھیجتا چلا جاتا ہوں اس طرح یہ کر لیا کہ ایک مسکین کو کھانا کھلاؤ۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ** (2:184)۔ عزیزانِ من! آپ نے حکم کی جامعیت دیکھی! کیا اب اس کے بعد بھی کوئی کیٹگری (شق) باقی رہ گئی ہے؟ اب میں نے یہ کہا ہے کہ یہ میرا ترجمہ نہیں ہے۔ عربی زبان کے مستند لغت سے ہے۔ عربی لغت میں محیط المحیط [1] ایک مستند لغت ہے۔ اول تو آپ میرا لغات القرآن دیکھیں گے اس میں سارے حوالے آجائیں گے۔ محیط المحیط نہایت مستند لغت ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ طاقت کے معنی ''کسی چیز پر قدرت رکھنا ہے لیکن یہ ایسی قدرت کا نام ہے جسے انسان بہ مشقت کر سکے''۔ دراصل یہ اس طوق کے ساتھ تشبیہ ہے جو کسی کے گلے میں ڈال دیا جائے۔

حقیقی مفہوم کے برعکس اپنی علمی کم مائیگی کی بنا پر ہمارے ہاں کیے گئے تراجم کی نوعیت

عزیزانِ من! اس میں اس نے ایک بڑی چیز کہی ہے۔ قرآن میں وہ جو دعا سکھائی گئی ہے کہ **لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ** (2:286)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ''جن چیزوں کی ہمیں طاقت نہ ہو' ہم پہ وہ بوجھ نہ ڈال دینا''۔ یعنی اللہ میاں کو یہ سمجھانے جا رہے ہیں کہ حکم جو دے رہے ہو' دیکھنا! دس سال کا بچہ ہے' اس کے سر پہ دو من بوجھ نہ رکھ دینا۔ یعنی اللہ میاں کو سکھا رہے ہیں کہ ایسی بات کا ہمیں حکم نہ دینا جس کی ہمیں طاقت نہ ہو۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ''جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو' وہ ہم بہ مشقت کر سکیں جس کے ہم متحمل نہ ہو سکیں''۔ تاج العروس [2] عربی زبان کا بڑا مستند لغت ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ **الطاقة** اس قوت کا نام ہے جس سے کوئی کام کرنا کسی انسان کے لیے بہ مشقت ممکن ہو' وہ کام اس پر اتنا شاق گزرے جیسے کسی نے اس کی گردن میں طوق ڈال دیا ہو۔ مصر کے مشہور مفتی (علامہ محمد) عبدہ (1849-1906ء) نے اپنی ''تفسیر المنار'' میں یہ چیز لکھی ہے کہ'' عرب **اَطَاق الشيئى** صرف اس وقت کہتے ہیں جب قوت اتنی کم ہو کہ اس کی وجہ سے کسی کام کے کرنے میں شدید مشقت کا متحمل ہونا پڑے' جب اس کی قوت انتہائی دشواری کے ساتھ' اس کو برداشت کر سکے چنانچہ **الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ** سے مراد بوڑھے ضعیف اپاہج لوگ ہیں' جن کی بیماریوں کے اچھا ہونے کی اُمید نہ ہو۔ وہ لوگ بھی جوان کے مثل ہیں مثلاً وہ کام کرنے والے' جن کی معاش پر مشقت کام میں رکھی ہے' ان کو مسلسل کام ہی یہ

---

[1] یہ پطرس بستانی کی تالیف ہے۔ یوں تو یہ کتاب مختصر ہے لیکن اس کی افادی حیثیت بہت زیادہ ہے۔

[2] یہ محبّ الدین' ابن الفیض' السید محمد مرتضی الحسینی الواسطی الزبیدی الحنفی (م 1205ھ/ 1791ء) کی تالیف ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے یہ لغت بڑا سائنٹیفک ہے۔

مزدوروں کا سا کرنا ہوتا ہے۔ دوسرے دنوں میں اگر کہیں گے تو یہ کام نہیں کر سکیں گے۔ اسی بنا پر امام راغب ❶ نے اپنے مفردات میں کہا ہے کہ **الطاقة** اس قوت کا نام ہے جس سے کسی کام کا کرنا' کسی انسان کے لیے بہ مشقت ممکن ہو۔ کشاف ❷ میں اس کی تاکید کی ہے' روح المعانی ❸ میں آلوسی نے اس کی تاکید کی ہے۔ قرطبی ❹ کی ایک تفسیر القرآن ہے اس کے اندر اس نے **الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ** کی تفسیر لکھی ہے کہ اس سے مراد بوڑھے مرد' بوڑھی عورتیں ہے۔ اس کے بعد تاج (العروس)' محیط (المحیط) اور راغب (اصفہانی) کی مشہور تصنیف "المفردات فی غریب القرآن" نے لکھا ہے کہ یہ بھی اس کیٹگری (شِق) میں آسکتے ہیں' یہ بھی آسکتی ہیں۔ یہ جو کیٹگریز (شقیں) ہیں وہ آپ اپنے ہاں خود تجویز کر سکتے ہیں۔

روزہ نہ رکھ سکنے کی صورت میں فدیہ دینے کی کیفیت اور نوعیت

برادرانِ عزیز! اصولی بات یہ ہوگئی کہ جو اسے بہ مشقت کر سکیں' طاقت نہ رکھتے ہوں' اردو زبان میں ہم یہ کہیں گے' ان کے لیے فدیہ ایک مسکین کا ایک کھانے کا ہے۔ ایک کے کھانا کھلانے کا کہنے کے بعد کہا کہ **فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ** (2:184) او بھئی! کم از کم یہ ایک تو ہم نے کہہ دیا ہے' اگر اپنے دل کی مرضی سے اس سے زیادہ کرو گے' تو زیادہ اچھا ہے۔ اب آگے بارڈر لائن کیس ہے جس کے لیے کوئی دوسرا فیصلہ نہیں کر سکتا کہ واقعی میں یہ بہ مشقت رکھ سکتا ہوں یا میں رکھ سکتا ہوں' اس رکھ سکتا ہوں کے لیے کہا کہ اس بارڈر لائن کیس کے اندر یہ یاد رکھو کہ اگر دونوں طرف بین بین کی بات ہو تو **وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ** (2:184) اس صورت میں اگر روزہ رکھو' تو زیادہ بہتر ہے۔ **اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** (2:184) اگر تم بات سمجھو تو یہ سمجھ جاؤ گے کہ بارڈر لائن کیسز کے اندر جہاں رکھ نہیں سکتے' ذرا سی برداشت کرنا پڑتی ہے' یہ ٹھیک ہے ہماری طرف سے اجازت تو ہے کہ تم فدیہ دے سکتے ہو لیکن یہ سمجھ لو کہ اگر تم روزہ رکھ سکو تو وہ زیادہ بہتر ہے۔

برادرانِ عزیز! یہ 184 ویں آیت آ گئی۔ اس سے آگے یہی احکام چل رہے ہیں۔ یہاں تک یہ بات واضح ہوگئی کہ رمضان کے مہینے کے روزے ہیں' تندرست گھر پہ موجود تو روزے رکھو' اگر مریض ہو یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں اس کی گنتی پوری کرے۔ اور اگر وہ لوگ ہیں جو بہ مشقت رکھ سکیں مثلاً بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں' آدمی آدھے گھنٹے کے لیے بھی پیاس روک نہیں سکتا' بے ہوش ہو جاتا ہے

---

❶ امام راغب اصفہانی (م۔ 502ھ) کی یہ مشہور تصنیف "المفردات فی غریب القرآن" ہے۔
❷ زمخشری کی تفسیر کشاف ہے۔
❸ روح المعانی آلوسی کی تفسیر ہے۔
❹ قرطبی کی تفسیر القرآن ہے۔

وغیرہ وغیرہ۔اور یہ چیز ہے کہ کیا یہ دوسرے وقت میں رکھے یا پھر کیا کرے؟ یہ کہ ''پانی پی لے' فیر رکھ لے' فیر پانی پی لے ❶''۔اب یہ جو ساری کیٹگریز ہیں' وہ سب اس کے اندر آ گئیں۔تو یوں قرآنِ کریم نے جامع طور پہ آپ کو احکام دیئے۔اور آپ نے دیکھ لیا کہ اس **یطیقونه** کا ترجمہ اردو زبان کی طاقت کر کے پھر وہ کیا کیا مصیبتیں پڑیں۔پہلے وہ مصیبتیں خود اپنے ذمے ڈال لیں' پھر خدا پہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) اعتراض کیا کہ جو طاقت رکھتا ہے' وہ اس کے بعد فدیہ دیدے' اس کا (معاذ اللہ) مذاق اڑایا' پھر کہا کہ قرآن سے اس کا حل بتاؤ۔ارے! قرآن نے یہ کہا ہو' تو وہ اس کا حل بھی بتائے' تم نے تو خود ہی قرآن کے منہ میں ایک بات ڈال دی ہے۔اس کا حل یہ ہے کہ صاحب! پہلے سال جو روزے فرض کیے گئے' اس میں تو یہ چیز تھی کہ طاقتور روزے نہ رکھے' دوسرے ہی سال یہ بات سمجھ میں آ گئی تو یہ جو حکم تھا یہ منسوخ کر دیا۔اور اس کے لیے یہ اگلی بات آ گئی۔ یاللعجب!

عزیزانِ من! 184 ویں آیت تک ہم آ گئے' 185 ویں آیت سے آگے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ پانی پی لے' پھر (روزہ) رکھ لے' پھر پانی پی لے۔

چالیسواں باب: سورة البقرة (2)' (آیات 185 تا 188)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ
شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ
بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ۝١٨٥ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ
فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝١٨٦ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى
نِسَاۗىِٕكُمْ ۭ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ
فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا
حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى
الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝١٨٧ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ
وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝١٨٨

عزیزانِ من! آج اپریل 1969ء کی 20 تاریخ ہے اور ہم درسِ قرآنِ کریم کے سلسلۂ جدید میں سورۃ البقرۃ کی آیت 185 سے آغازِ کلام کرتے ہیں: (2:185)۔

عیدالفطر دراصل جشنِ نزول قرآن کی وہ تقریب ہے جس کو منانے کا حکم خود خدا نے قرآنِ کریم میں دیا ہے

سابقہ درس میں پچھلی دو تین آیات میں روزوں کے متعلق احکام چلے آرہے تھے' وہی سلسلہ اب آگے بھی چل رہا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہا کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (2:185) یہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآنِ کریم کے نزول کا آغاز ہوا۔ یہ وہ قرآن ہے جو تمام نوعِ انسانی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ایسی راہ بتاتا ہے جو

ہے جو واضح اور ابھری ہوئی ہے' اور جو مستقل اقدار کے پیمانے پیش کرتا ہے تاکہ حق اور باطل کے مابین تمیز ہو سکے۔ گویا یہ جو مجاہدین کی ٹریننگ کے لیے ریفریشر کورس مقرر کیا گیا تو اس کے ساتھ ہی اسے رکھا' اس مہینے میں جس میں کہا کہ قرآنِ کریم کے نزول کا آغاز ہوا تھا۔ گویا یہ نزولِ قرآن کے آغاز کی ایک ایسی تقریب ہے جس کی یاد اس طرح سے قائم رکھی گئی کہ مومنین مجاہدین کی زندگی میں جہاد کی تیاری کے لیے جو ایک وقت مخصوص کیا' اسے وقت کے' ٹائم کے' اعتبار سے اس تقریبِ عظیم کے ساتھ ملا دیا جو نزولِ قرآنِ کریم کی تھی۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ سورۃ یونس میں یہ کہا گیا ہے کہ قرآن جیسی نعمت کا ملنا فضلِ ایزدی ہے' تمہیں چاہیے کہ اس نعمت کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ اسی لیے آپ کو یاد ہو گا کہ ہم عید الفطر کو ہمیشہ جشنِ نزولِ قرآن سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ یہ ہے ہی حقیقت میں قرآنِ کریم کے نزول کی مسرت میں ہمارے ہاں کا یادگاری تہوار' ہم اسے ہی عید کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔

قرآن حکیم کی عظمت کا بیان اور اس کی بنیادی خصوصیات کی وضاحت

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کیا ہے؟ یہ پوری نوعِ انسانی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کے راستے کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔ اور **بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى** (2:185) یہ راستہ مبہم نہیں' پیچیدہ نہیں' معین واضح صاف روشن کھلا ہوا راستہ ہے۔ **وَ الْفُرْقَانِ** (2:185) اور حق اور باطل میں فرق کر کے بتا دینے والا' تفریق کر دینے والا ہے۔ فرقان الگ الگ کر دینے والی چیز کو بھی کہتے ہیں۔ جیسا یہ بالوں کی مانگ نکالی جاتی ہے' ایک ایک بال دائیں اور بائیں کر دیا جاتا ہے' اسے بھی فرقان کہتے ہیں۔ اور فرقان ان پیمانوں کو بھی کہتے ہیں جن سے کوئی چیز ماپی جائے۔ اسی لیے دوسری جگہ نزولِ قرآن کے سلسلے میں یہ کہا کہ **اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ** (97:1) اسے **لَيْلَةِ الْقَدْرِ** [1] کہا اور قدر کے معنی بھی پیمانہ (Measure) ہوتے ہیں۔ یہ میں جب وہاں آؤں گا جب پچھلی دفعہ کے آخر میں ان سورتوں پہ پہنچا تھا' تو ان چیزوں کو واضح کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے جو Values (اقدار) دی ہیں انہی کو اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ نئی اقدار دینے کا ایک ضابطہ تھا' اس اعتبار سے اسے فرقان کہا جائے گا یعنی نئے پیمانے' جدید Values, Objective Standard (اقدار' خارجی معیار و کسوٹی) صحیح اور غلط کے ماپنے کا Measure (پیمانہ) ایک خارجی معیار۔ فرقان یعنی حق اور باطل کو' غلط اور صحیح کو واضح طور پر الگ کر دینے والا۔ کہا ہے کہ **فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** (2:185)۔ میں نے سابقہ درس میں بتایا تھا کہ عربی زبان میں **شھد** اور **غاب** کے الفاظ ہوتے ہیں۔ **شھد** وہ ہے جو گھر پہ موجود ہو اور **غاب** وہ جو سفر میں ہو۔ تو کہا کہ جو تم میں سے گھر پہ موجود ہو

---

[1] جس رات میں قرآن کے نزول کا آغاز ہوا' وہ ایک جہانِ نو کے نمود کی رات تھی۔

تو وہ فَلْيَصُمْهُ (2:185)۔ پچھلی دفعہ بھی میں نے کہا تھا کہ یہ جو ''ہ'' کی ضمیر ہے یہ اسمِ شھر کی طرف جاتی ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (2:185)۔ پھر وہی بات دہرا دی کہ جو گھر پہ ہو اور تندرست ہو' وہ ان دنوں کے روزے رکھے' جو سفر میں یا مریض ہے تو وہ سفر کی واپسی پر یا تندرست ہونے کے بعد اس کے روزے رکھے۔

قرآن حکیم کوئی ایسا حکم صادر نہیں کرتا جو ناممکن العمل ہو

یہ جو کہا گیا ہے کہ جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہوں ان کے لیے رعایت ہے۔ یہ رعایت اس لیے ہے کہ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (2:185) ہم تمہارے لیے آسانیاں چاہتے ہیں' تمہیں مشکلات میں پھنسانا نہیں چاہتے۔ سختی اور تنگی پیدا کرنا نہیں چاہتے' کوئی اس قسم کا حکم ہم نہیں دیتے جو ناممکن العمل ہو اس لیے وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (2:185)۔ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم یہاں کتاب کہتا ہے وہ ضابطۂ قوانین ہے اور بتایا تھا کہ جہاں قانون دیتا ہے' اس قانون کے ساتھ' اس قانون کی حکمت بھی بیان کرتا ہے' علت بھی بیان کرتا ہے' The why of it (اس کی وجۂ جواز) بھی بیان کرتا ہے' اس کا Object, Purpose (مقصد و مدعا) دیتا ہے' یہ بتاتا ہے کہ اس پہ عمل کرنے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اسے حکمت کہا جاتا ہے۔ روزوں کے متعلق یہ کہا ہے۔

قرآنِ حکیم کی راہنمائی کا ماحصل ہمیشہ محسوس شکل کی صورت میں سامنے آتا ہے

برادرانِ عزیز! میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا کہ پہلے کہا ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (2:183) تاکہ تم میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کی صلاحیت بیدار ہو جائے۔ یہاں کہا ہے کہ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185)۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس راہنمائی کی بنا پر' جو ہم نے قرآن میں دی ہے' تم دنیا میں نظامِ خداوندی کو تمام نظام ہائے عالم پر غالب کر دو' اس کی کبریائی ہو جائے۔ دوسری جگہ قرآن نے کہا ہے کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) ہم نے تو یہ دین اس لیے بھیجا ہے تاکہ یہ تمام نظام ہائے عالم پر' جو انسانوں کے وضع کردہ ہیں' غالب آ کر رہے۔ یہی معنی ہیں وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ کے۔ لیکن اس کبریائی کے لیے کہا ہے کہ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185) خدا نے تمہیں جو راہنمائی کی ہے اس سے اس کبریائی کو بلند کرو۔ اس مقصد کے لیے تم کوشش کرو لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (2:185) تاکہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ تو یہاں سے ہمیں پتہ چل گیا کہ روزوں کا مقصود یہ ہے۔ ان سے اس امت کے اندر وہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی جس سے یہ خدا کے بتائے ہوئے نظام کو دنیا میں رائج ہی نہیں کرے گی' بلکہ دنیا میں

انسانوں کے بنائے ہوئے تمام نظاموں پر اس کی کبریائی' اس کا غلبہ' اس کی بڑائی' ثابت کر کے بتا دے گی۔ اور اس طرح سے ان کی محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں گی۔

روزوں کے دوران جنسی اختلاط کا معاملہ اور قرآن حکیم کی تعلیم

اب روزوں کے احکام کے درمیان میں یہ آیت آتی ہے کہ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (2:186)۔ یہ آیت ایک بڑے اہم موضوع کی حامل ہے جسے دعا کہا جاتا ہے' اس سے آگے پھر روزے کے احکام کی مزید تفاصیل ہیں۔ میں ربطِ مضمون کے اعتبار سے وہ جو احکام ہیں' ان کو پہلے بیان کر دیتا ہوں اور یہ درمیان کی آیت جو 186 ہے' اسے بعد میں لوں گا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہمیں ایک پورا درس ہی اس کے اوپر چاہیے۔ اگلی آیت یہ ہے کہ اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ فَتَابَ عَلَیْکُمْ وَ عَفَا عَنْکُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ وَ کُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰکِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ (2:187)۔ دن کے وقت یہ کہا کہ کھانا پینا ممنوع ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ جس طرح رات کو خانقاہیت کی زندگی میں' بیویوں سے جنسی اختلاط کو کچھ قابلِ نفرت سی شے قرار دیا جاتا تھا' اسی طرح یہاں بھی یہی ہے۔ آپ تمام مذاہبِ عالم میں دیکھیے اور مذاہب کا کیا کہنا ہے جہاں بھی آپ مذہب کہہ دیں گے تو وہ دین سے خود متمیز ہو جائے گا۔ مذہب کی دنیا میں یہ جنسی اختلاط ہی قابلِ نفرت نہیں بلکہ خود عورت کا وجود بھی نہایت گھناؤنا اور قابلِ نفرت گنا جاتا تھا۔ یہ دین کی خصوصیت ہے کہ اس نے مرد اور عورت دونوں کو یکساں واجب التکریم انسان قرار دیا۔ اور جنسی اختلاط کو جو افزائشِ نسل کا فطری ذریعہ ہے' کہیں قابلِ نفرت یا گھناؤنا نہیں قرار دیا بلکہ کہا کہ وہ تو فطرت کے ایک مقصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اس لیے قرآن نے یہ کہا ہے کہ زین لکم للناس...... (3:13)۔ یہ گھر کی زندگی' بال بچوں کی زندگی' میاں بیوی کی زندگی' یہ بڑی خوش نما چیز ہے' مزین ہے' جاذبِ توجہ ہے' یہ قابلِ نفرت شے نہیں ہے۔

خانقاہیت کی زندگی یا دوسرے مذاہب کی روش کو دیکھ کر تمہارے دل میں شاید یہ خیال پیدا ہو کہ روزوں میں بھی شاید کیفیت یہ ہو کہ یہ جو جنسی اختلاط ہے یہ بھی ممنوع ہے۔ کہا کہ نہیں! روزوں کی راتوں میں یہ میاں بیوی کا تعلق ممنوع نہیں ہے۔ یہاں وہ ایک چیز کہی ہے کہ چلتے چلتے بھی قرآن ایک بات بیان کر جاتا ہے جو ایسی گہری اور اصولی ہوتی ہے کہ اس میں آپ دیکھیے میاں بیوی کے تعلق کو کیسے حسین

انداز میں، تشبیہی رنگ میں، بیان کیا ہے! کہا ہے کہ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (2:187) میاں بیوی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایسا قریبی رشتہ کہ ان کے درمیان کوئی تیسرا حائل نہیں ہوسکتا۔ یہ تو جسم اور لباس کا تعلق ہے۔ ان کے مابین کسی قسم کا کوئی ایسا راز نہیں جو مخفی رہے۔ یہ ایسی یگانگت، ایسی ہم آہنگی ہے کہ اگر ان دونوں کے درمیان کوئی ذرا سی چیز آ جائے، بنیان پہنی ہوئی ہو اور اس میں کہیں چھوٹا سا بال اندر آ جائے تو آپ دیکھیے کہ وہ آپ کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ اس لیے کہ لباس اور بدن کے درمیان ایک تیسری چیز آ گئی ہے۔ میاں اور بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہے اس قدر قریب ہونے کا رشتہ کہ ان کے درمیان کوئی تیسری چیز نہیں آنی چاہیے۔ اس کی مزید وضاحت تو میں وہاں چل کر کروں گا جب ہم سورۃ النسآء میں پہنچیں گے اور وہاں قرآنِ کریم میاں بیوی کے رشتے کو، نکاح کے رشتے کو، باہمی یگانگت مودت اور رحمت قرار دیتا ہے۔ وہاں میں عرض کروں گا کہ ان آیات کا مفہوم کیا ہے۔ یہاں تو یہ بات ضمناً آ گئی ہے۔

اس نے کہا ہے کہ یہ جو چیز ہے یہ تمہارے دل کے اندر کوئی ایسا خیال نہ پیدا کر دے کہ تم یہ سمجھو کہ اس قسم کا جو خیال آنا ہے، وہ تقدس کے، پارٹی کی پاکیزگی کے راستے میں کوئی روڑا بن کر اٹک جائے گا۔ یہ دین ہے، خانقاہیت نہیں ہے، اس میں یہ چیزیں قابلِ نفرت نہیں ہیں۔ اس لیے رمضان کی جو راتیں ہیں، ان میں روزہ نہیں ہوتا، ان میں قرآن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے تمام چیزوں کی اجازت ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہا کہ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ (2:187)۔ اس کا عام ترجمہ تو یہ ہوتا ہے کہ رات کو پھر سحری کے وقت تک کھاؤ پیؤ تا آنکہ سفید تاگا سیاہ تاگے سے متمیز ہو جائے۔ وہ یہ بات نہیں کہ اپنے پاس دو قسم کے تاگے رکھنے چاہئیں اور دیکھنا چاہیے کہ جب سیاہ اور سفید تاگا متمیز ہو جائے تو کھانا چھوڑے۔ یہ جو سپیدۂ سحر ہوتا ہے اور تاریکئ شب ہوتی ہے عربی زبان میں اس کے لیے یہ بولا جاتا ہے۔ ہم صبح کی دھاری بھی کہتے ہیں۔ علی الصبح سحر کے وقت جو پہلے روشنی کی ایک دھاری نمودار ہوتی ہے وہ سفید تاگا ہے اور رات کی سیاہی سے متمیز کرتا ہے۔ اس وقت تک کھاؤ پیؤ۔ یاد رکھیے! یہ اس چیز کی اجازت ہے کہ روزہ کھولنے کے بعد اس صبح تک آپ کھا پی سکتے ہیں۔ یہ کوئی فریضہ نہیں ہے کہ اگر کھایا پیا نہ جائے تو روزہ نہیں ہوسکتا۔ ہمارے ہاں تو روزے کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی سحری کو اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ صرف یہ چیز ہے کہ تمہیں کھانے پینے کی اجازت ہے۔ کھانے پینے کے معاملے میں جبر اور زبردستی اور حکم اور تاکید تو ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ کا جی چاہتا ہے کھائیے، بھوک ہے، اشتہا ہے۔ جی چاہتا ہے وہ کھائیے، جی نہیں چاہتا، نہ کھائیے۔ یہ صرف اجازت کی بات ہے۔ آگے کہا کہ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (2:187) پھر اس کے بعد تم نے کھانے پینے وغیرہ سے رات تک رُکے رہنا ہے۔ یہاں ایک چیز آئی ہے کہ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ (2:187) جب تم مساجد میں، جسے آج کل کہتے ہیں کہ اعتکاف میں ہو، تو اس زمانے میں یہ اختلاط ٹھیک نہیں ہے، اس سے باز رہو۔

مذہب کی زبان میں یوں کہیے کہ تمام دنیاوی معاملات' مسجد میں ہی طے ہوتے تھے

عزیزانِ من! مشکل یہ ہے' جیسا میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ قرآنِ کریم کی اصطلاحات کا مفہوم ہم نے بعد میں مذہب کی رو سے متعین کیا اور یہیں سے سارا مبحث غلط ہو جاتا ہے' صحیح تصور ذہنوں میں نہیں آتا۔ مسجد ہمارے ہاں صرف سجدہ گاہ بن کر رہ گئی ہے کہ جہاں پانچ وقت کی نماز پڑھی جاتی ہے اور بس حالانکہ دین میں مسجد کو اگر جگہ کا نام رکھا جائے تو اس کو یاد رکھیے! کہ عربی زبان میں اس کے معنی اطاعت کرنا بھی ہوگا اور وہ مقام بھی ہوگا جہاں اطاعت کے متعلق معاملات طے کیے جائیں۔ آپ کی پارلیمان دین کی مسجد ہے' آپ کی Administration (انتظامیہ) کی Secretariat (سکرٹیریٹ) دین کی مسجد ہے' آپ کے سپاہیوں کی ٹریننگ گاہ دین کی مسجد ہے' آپ کی عدالتیں دین کی مسجد ہیں۔ اور یہ وہ مسجد ہے جو آپ کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ جب امت کی ایک ہی مسجد تھی' اور امت کے لیے ایک ہی مسجد ہونی چاہیے تو یہ وہ جگہ ہے جسے آپ سنٹرل پارلیمنٹ کہتے ہیں' یہ ایک ہی مسجدِ نبوی ﷺ' نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تھی۔ اور اس کے بعد بھی خلافتِ راشدہؓ میں' مدینے کی یہ مسجد تھی' جو آپ کی Secretariat (سکرٹیریٹ) کی' آپ کی پارلیمان کی' آپ کی سپریم کورٹ کی جگہ تھی جہاں آپ کے تمام معاملات' اس مسجد کے اندر طے ہوتے تھے۔ قاصد وہاں آتے تھے' سفیر وہاں آتے تھے' اجتماعات وہاں ہوتے تھے' مشاورت کی مجلس وہاں منعقد ہوتی تھی۔ یہ سارا کچھ اس مسجد میں ہوتا تھا حتیٰ کہ آپ کا کمیونٹی سنٹر بھی وہ مسجد تھا۔ بخاری کی حدیث یہ بتاتی ہے کہ حبشیوں کا ناچ بھی اس مسجد کے صحن میں ہوتا تھا۔ اور اسے رسول اللہ ﷺ بھی دیکھتے تھے ازواجِ مطہراتؓ بھی اپنے حجروں سے اسے دیکھتی تھیں۔ یعنی Entertainment (تفریح) کا سامان بھی یہیں ہوتا تھا۔ مسجد کے اندر اتنی جامعیت رکھ دی گئی تھی کہ انہیں زندگی کے کسی دوسرے شعبے کے لیے کسی دوسری جگہ جانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اور مسجد اس لیے تھی کہ یہ ساری چیزیں' جتنی بھی ہوں' وہ قوانینِ خداوندی کے تابع رکھ کر کی جائیں' جھکا جائے تو اِن کے سامنے جھکا جائے۔ اور زندگی کے جو مختلف شعبے ہوں' یہ ان کا ایک مرکز ہو۔ یہ تو تھی آپ کے ہاں کی وہ مسجد۔ اب جب مسجد کا تصور صرف یہ رہ گیا کہ یہ سجدہ گاہ ہے جہاں پانچ وقت کی نماز پڑھی جاتی ہے تو جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ جتنی باتیں میں نے بتائی ہیں' انہیں آپ دنیاوی معاملات کہیں گے' دنیا والوں کی باتیں کہیں گے جبکہ دین کا مسجد کے بارے میں یہ تصور تھا کہ یہ ساری چیزیں' جسے آپ دنیاوی امور کہیں گے' یہ سارے مسجد میں طے ہوتے تھے۔

ہم نے آج مسجد کو صرف نماز کی حد تک محدود کر رکھا ہے

اب ہمارے ہاں مذہب میں مسجد کا تصور یہ ہے کہ اس میں جو دنیا کی بات کرنا ہے' وہ حرام ہے۔ وہاں جا کر صرف' جسے اب ہم نے

عبادت کہہ دیا، جس کے معنی خدا کی محکومی اختیار کرنا ہے، وہ اب آپ کے ہاں پوجا پاٹ پرستش بھگتی ہو گیا۔ یہ ہو گئی عبادت، اور مسجد ہو گئی صرف نماز پڑھنے کے لیے۔ لاکھوں روپے لگا کر آپ ایک عمارت بناتے ہیں، اس کا مصرف صرف یہ ہوتا ہے کہ صبح کو وہاں آپ نے فرائض کی دو رکعتیں پڑھیں، یا چار پڑھیں۔ صبح سے ظہر تک کا درمیان کا وقت ہے، اس میں آپ کو چوکیدار رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں کتا نہ آجائے، وہ اس دوران بیکار پڑی ہوئی ہے۔ پھر وہاں گئے دس پندرہ منٹ کے لیے ایک نماز پڑھی، پھر درمیان کا عرصہ وہ بیکار پڑی ہے۔ آپ کے ہاں کی اتنی اتنی بڑی عمارتیں ہیں ایک محتاط اندازے کے مطابق کم از کم پاکستان میں کوئی اسی ہزار یا ایک لاکھ [1] کے قریب یہ مساجد ہیں۔ ان میں کام صرف یہ ہے کہ آپ نے وہاں پانچ وقت جمع ہو کر صرف نماز پڑھنی ہے۔ باقی وقت وہ بالکل بے کار پڑی ہوئی ہیں بلکہ ان کی حفاظت کے لیے آپ کو کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے، آدمی مقرر کرنے پڑتے ہیں۔ ان میں جھاڑ اور فانوس اور قالین اور کم از کم دریاں یا کم از کم صفیں، یہ سب کچھ ہے۔ مسجد کے دروازے پہ چوکیدار کھڑا ہے کہ کوئی اندر نہ آئے۔ محلے کے بچے آوارہ پھر رہے ہیں، انہیں پڑھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں مل رہی۔ لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں آپ کے بچے، محض اس لیے جاہل رہ رہے ہیں، جاہل ہی نہیں رہ رہے، بالکل آوارہ پھرتے ہیں کہ پرائمری اسکولوں کے لیے آپ کے ہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ کیسا یہ انتظام تھا کہ آپ کے ہاں مکان بھی موجود ہے، صبح کی نماز کے بعد ظہر کا وقت، یہی درمیان کا وقت، اسکول کا ٹائم ہوتا ہے اور اس درمیان میں Adjust (موافق) کیا جا سکتا ہے، وہیں وہ بچے نماز بھی پڑھ سکتے ہیں۔ نماز کے بعد، بے کار رکھا ہوا، یہ آپ کے ہاں کا امام ہے، وہ بھی ان پانچ وقتوں میں اتنے وقت کے اندر آ کر اس نے نماز پڑھائی، اس کے بعد وہ بھی بے کار ہے، مؤذن بے کار ہے، خوامخواہ کے لیے ایک چوکیدار رکھا ہوا ہے۔ Establishment (عملہ) بھی آپ کے پاس موجود ہے، عمارت بھی آپ کے پاس موجود ہے، مذہب درمیان میں آ کر حائل ہو رہا ہے۔ اس سے نہ آپ فائدہ اٹھاتے ہیں، بچے آپ کے الگ آوارہ اور جاہل رہ جاتے ہیں۔ اور آپ ہیں کہ خوش ہو جاتے ہیں کہ ان سے ہم اسلام کا ستون تھامے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ مساجد کا تصور ہے۔ اب جب مسجد کا یہ تصور رہا، تو یہ **عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ** (2:187) مسجد میں اعتکاف رہ گیا ہے۔

مذہب کے پیدا کردہ تصور کے برعکس دین میں اعتکاف کا قرآنی مفہوم

برادرانِ عزیز! اب اعتکاف کا، آپ کو معلوم ہے کہ رمضان کے آخری دس دنوں میں جو بہت زیادہ عبادت گزار ہیں، وہ مسجد میں ڈیرہ لگا لیتے ہیں۔ سوائے حوائجِ ضروریہ کے وہ مسجد سے باہر نہیں نکلتے، مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ خالص

---

[1] یاد رہے کہ یہ تعداد 1969ء کی ہے جبکہ اس وقت اس تعداد میں چار گنا اضافہ ہو چکا ہے۔

خانقاہیت ہے۔ دنیا جہان کے کاموں سے کٹ کر مسجد کے گوشے میں بیٹھے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ''اس بیٹھے ہیں'' میں کریں گے کیا؟ کہ جی! عبادت کر رہے ہیں' بیٹھے بیٹھے تسبیح پھیر رہے ہیں' تھک جاتے ہیں تو اٹھ کر نفل پڑھنے لگ جاتے ہیں' اس سے اُکتاتے ہیں پھر بیٹھ کر وظیفے میں چلے جاتے ہیں۔ صبح کرنا شام' کا لانا ہے جوئے شیر کا۔ اعتکاف اس کا نام رکھ لیا گیا۔

برادرانِ عزیز! دین سے پوچھیے کہ یہ چیز کیا تھی۔ یہ عکف (ع ک ف) سے ہے' اس کا اسم فاعل عاکف ہے یعنی عکف کرنے والا۔ اس ع ک ف کے لفظی معنی ہیں ''الجھے ہوئے بالوں میں اس طرح سے کنگھی کرنا کہ وہ بالکل صاف ستھرے ہموار ہو جائیں' مشکل معاملات کو اس طرح سے حل کرنا کہ وہ ساری الجھنیں دور ہو جائیں' بگڑے ہوئے کاموں کو سنوارنا''۔ اس سنوارنے کے لیے چونکہ خاص طور پر توجہ دینے کی' تمام توانائیاں مرکوز کرنے کی' ضرورت تھی اس لیے اس چیز کے ثانوی معنی تھے کہ ان ''مقاصد کے لیے کہیں اس طرح سے جم کر بیٹھ جانا کہ توجہ کہیں دوسری طرف منتقل ہی نہ ہونے پائے۔ اسے اعتکاف کہتے تھے۔ ماہِ رمضان کے اس ٹریننگ کے مہینے میں ایک تو انہوں نے Generally (عموماً) پروگرام دیا۔ اور اس کے بعد کئی اہم معاملات تھے جن کے سلجھانے کے لیے باہمی مشاورت کی ضرورت تھی۔ اسے آپ Intensive Training (عملی تربیت) کہیے۔ ہر ٹریننگ کے اندر دو سیکشن ہوتے ہیں' سپاہیوں کی ٹریننگ الگ ہوگی' جرنیلوں کو الگ بیٹھنا پڑے گا۔ تو کہا کہ یہ تو عام ٹریننگ والے لوگ ہونگے۔ اور ان میں سے یہ لوگ' جو اربابِ حل وعقد ہونگے' ذمہ دار لوگ ہونگے' ان کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ الگ بیٹھ کر اپنی پوری Concentration (توجہ) سے امت کے جو الجھے ہوئے معاملات ہیں' ان کو سلجھانے کے لیے سوچیں' غور وفکر کریں' تدبیریں کریں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کام کے لیے کہاں پہ بیٹھیں؟ کہا کہ مساجد میں۔ یہ یہی ہیں جو آپ کے ہاں کے مراکز ہیں۔ اس کو وہ اعتکاف کہتے تھے۔ یہ تھا اس پروگرام کا ایک Intensive (عمیق' مرتکز) حصہ۔ وہ تو Extensive (توسیعی) پروگرام سب کے لیے ہے۔ یہ اس میں جسے ارتکاز کہتے ہیں' اس کا یہ حصہ تھا' جسے اعتکاف کہتے ہیں کہ اعتکاف میں بیٹھنے والے' البتہ کہا کہ ان کو تو اس کی فرصت ہی نہیں ہوگی کہ وہ گھروں کو جائیں یا ان معاملات کے اندر دلچسپیاں لیں۔ وہ لوگ تو دن بھر ان سپاہیوں کے ساتھ ٹریننگ' اس کے بعد جب رات کا فرصت کا وقت ملا ہے تو رات کو بیٹھ کر ان تمام اہم معاملات کے لیے باہمی مشاورت ہے۔ اس طرح سے یہ عوام کے لیے بھی' اربابِ فکر ونظر کے لیے بھی پورے مہینے کا پروگرام دیا گیا۔ یہ ہے عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ (2:187)۔ اور یہی چیز حج میں بھی آئے گی۔ وہاں عاکفین کہا گیا ہے۔ جب میں سورۃ الحج میں آؤں گا تو وہاں عرض کرونگا کہ طآئفین اور عاکفین جو قرآن نے کہا ہے' ان سے مفہوم کیا ہے۔ یہاں صرف اتنی سی چیز سمجھ لینی چاہیے کہ یہ ہے جسے دین میں اعتکاف کہتے ہیں۔

عزیزانِ من! اس کے برعکس وہ ہے اعتکاف جو مذہب میں آجاتا ہے' جس میں وہ خانقاہیت کا جو جذبہ تھا وہ تو ان کے دلوں میں

گدگداہٹ پیدا کررہا تھا جو وہاں سے نئے نئے مسلمان ہوکر آئے تھے۔اب اگر اس قسم کی خانقاہیت نہیں ہے تو بہر حال چلیے' رمضان کے مہینے میں' مسجد کے ایک گوشے میں' دس دن کے لیے بیٹھ کر ہی سہی۔''چور چوریوں جاندا' ہیرا پھیری اوں نئیں جاندا ہیگا[1] ''۔

اب قرآن کہتا ہے کہ **تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَقْرَبُوْھَا**(2:187)۔قرآن کیا بات کہہ جاتا ہے! میں نے کہا ہے کہ میں دین کے اصول کی مثال دیا کرتا ہوں کہ فٹ بال کے گراؤنڈ کے حدود ہیں' باہر باؤنڈری لائن ہے' اندر کچھ سرے سے حدود' لائنیں کھینچی ہوئی ہیں۔ٹیم سے کہا جاتا ہے کہ یہ جو لائنیں کھینچی ہوئی ہیں' یاد رکھو! تم نے ان سے تجاوز نہیں کرنا دیکھنا! ان پہ پاؤں بھی نہ آ کر پڑے۔یہاں سے یہ ان حدود کا تجاوز ہوا تو انہوں نے کہہ دیا کہ وہ خلافِ قانون ہوا ہے۔حدود کے اندر رہتے ہوئے ہر ٹیم کو اجازت ہے کہ گیند کو گول میں لے جانے کے لیے باہمی تعاون سے ہر ممکن کوشش کرے اور اس کوشش کرنے میں اس کو پوری آزادی ہوگی بشرطیکہ وہ ان حدود سے تجاوز نہ کریں۔قرآن نے کہا ہے کہ یہ حدود ہیں جو ہم نے کھینچی ہیں اور تاکید کی صورت یہ ہے کہ اس میں شبہ بھی نہیں ہے۔قرآن نے **تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَقْرَبُوْھَا**(2:229) بھی کہا ہے کہ ان حدود سے تجاوز (Transgress) نہ کرو لیکن تاکید یہ کی ہے کہ حدود کے قریب بھی نہ جاؤ' ذرا ہٹ کر رہو اس لیے کہ قریب جانے سے تو ہوسکتا ہے کہ آپ میں ذرا جوش آجائے تو اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ جائے' کیا غیر شعوری طور پہ ہی بڑھ جائے تو تجاوز ہوگیا۔تاکید کی یہ صورت ہے کہ قرآن نے **فلا تقربوھا** (2:187) کہا ہے کہ ذرا ان حدود سے ہٹ کر رہا کرو تاکہ کسی طرح غیر شعوری طور پہ بھی تمہارا قدم ان حدود سے آگے نہ پھاند جائے۔

قرآن حکیم نے کہیں بھی اپنے احکام کو غیر متعین شکل میں بیان نہیں کیا

برادرانِ عزیز! کہا ہے کہ **کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ**(2:187) اس طرح سے ہم اپنے احکام کو لوگوں کے لیے واضح کردیتے ہیں تاکہ وہ ان کی نگہداشت کرسکیں۔جب احکام دیئے جائیں تو ان کو بڑا واضح طور پہ دیا جانا چاہیے' وہ کسی طرح سے بھی مبہم نہ رہیں' معین ہوجائیں' متعین ہوجائیں' واضح اور روشن ہوجائیں۔اور یہاں ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! قرآن مجمل کتاب' ہے اس میں تفصیل نہیں ہے' یہ مبہم کتاب ہے' اس میں وضاحت ہی نہیں ہے' اس میں غیر معین چیزیں دی ہوئی ہیں' اس کے اندر کچھ متعین ہی نہیں ہے' اس کے سمجھنے کے لیے یہ انسان اٹھارہ علوم کا محتاج ہے حالانکہ قرآنِ اپنے آپ کو نور کہتا ہے' روشنی کہتا ہے' سورج کہتا ہے۔یہ سورج کو دِیوں سے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔وہ کہتا ہے کہ **کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ**(2:187) ہم اس طرح سے اپنے قوانین کو واضح کردیتے ہیں تاکہ تمہیں قوانین کی نگہداشت کرنے میں کسی قسم کی دشواری ہی نہ ہو' کوئی ابہام نہ ہو'

---

[1] چور چوری سے تو جائے مگر ہیرا پھیری سے نہیں۔

کوئی الجھن ہی نہ ہو۔ یہ خدا کا' کتاب بنانے والے کا دعویٰ ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) آپ اس کو کیا سمجھ سکتے ہیں یہ بڑی مشکل کتاب' بڑی مجمل کتاب ہے۔ یعنی اگر کوئی کسی سے اس کے معنی بیان کرنے کی کوشش کرے تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب! دیکھیے! ان کی جرأتیں کتنی بے باک ہوگئیں کہ یہ خدا کی کتاب ہے اور انسان اس کے لیے کہتا ہے کہ ہم اس کو سمجھ سمجھا سکتے ہیں۔

روزے کے احکام ختم ہوئے۔ بظاہر یہی کہا گیا ہے کہ عام دنوں میں جو چیزیں تمہارے لیے جائز ہیں' حلال ہیں' طیّب ہیں' کچھ دن وہ ہیں جن میں تم یہ چیزیں بھی اپنے اوپر ناجائز اور حرام قرار دے لو' ان سے بھی رکو۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے!

رزق کے سلسلہ میں زندگی کو بااصول طریق پر گامزن کرنے کا فریضہ ہر لمحہ ادا کرنا ہوتا ہے

برادرانِ عزیز! جس سے روکا گیا ہے کیا یہ صرف کھانے پینے کی چیز تھی؟ یہاں رکوع ختم کیا ہے' آیات یہاں ختم کی ہیں' احکام ختم کیے ہیں' آخر میں اس ضمن میں ایک آیت دی ہے کہ **وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ** (2:188) سوچو! جب تمہیں ٹریننگ یہ دی گئی ہے کہ جو چیز عام حالات میں حلال وطیّب ہے' اس کو بھی ان دنوں نہیں کھانا تو اس سے مقصد یہ ہے کہ ناجائز دولت کبھی کسی طرح سے بھی مت کماؤ۔ یہ یاد رکھو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اب قرآن ایک ہی آیت میں کہاں لے گیا! دولت کمانا برا نہیں ہے' جیسے رمضان کے علاوہ اور دنوں میں کھانا پینا بالکل جائز ہے لیکن ناجائز طریق کے اوپر یہ کچھ حاصل کرنا ناجائز ہے۔ کہا ہے کہ یاد رکھو! دوسروں کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ۔ کہا ہے کہ **وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** (2:188)۔ دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ خود ہی دوسرے کا مال کسی طرح سے' ناجائز طریقے سے' کھا جاؤ' خرد برد کر جاؤ۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حکام کو جا کر رشوت دو اور پھر ان کے ساتھ مل کر دوسروں کا مال کھا جاؤ۔ کیا بات ہے' قرآن کی! دونوں ہی چیزیں سامنے آ گئیں کہ خود دوسرے کو فریب دے کر یہ کچھ کرو اور یہ کہ تم حکام کو مال دے کر' رشوت کے ذریعے سے' اپنے ساتھ ملا لو تاکہ دوسروں کا مال تم حرام طریق کے اوپر کھا جاؤ۔ کہا کہ اب تم سمجھے کہ روزے میں یہ جو تم پہ Self Imposed Restriction (خود عائد کردہ پابندیاں) لگائی گئی تھیں کہ خود اپنے اوپر آپ پابندیاں عائد کرو' ان پابندیوں سے مفہوم یہ نہیں تھا کہ ان دس دنوں میں یا ایک مہینے کے اندر' دن بھر میں کھانا پینا بند کر دو اور وہ سارے دن کی کسر شام کو سحری کے وقت نکال دو۔ صرف یہ مقصد نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تم اپنے جذبات کے اوپر ایسا کنٹرول رکھو کہ جس چیز کو ناجائز کہا گیا ہے' اسے ہر حال میں ناجائز سمجھو اور اس کے قریب بھی نہ جاؤ۔

برادرانِ عزیز! یہ تھے روزوں کے متعلق قرآنِ کریم کے احکام۔ اور یہ احکام ایک ہی جگہ نہایت وضاحت سے قرآن نے دے دیئے ہیں ان کی جزئیات تک بھی قرآن نے بیان کر دی ہیں۔

ذاتِ خداوندی کا قُرب حاصل کرنے کا ایک غلط تصور

میں نے عرض کیا تھا کہ درمیان میں ایک آیت آتی ہے' یہ بڑی اہم آیت ہے' اب میں اس آیت کو لیتا ہوں۔ جیسا کہ خانقاہیت میں کہا جاتا ہے کہ نفس کشی کے لیے کھانا پینا سونا آسائشیں آرائشیں' یہ تمام چیزیں' اپنے اوپر حرام کر لی جائیں تا کہ اس سے انسان خدا کا مقرب بن جائے' اس کا قرب حاصل ہو جائے۔ دنیا میں قربِ خداوندی کے لیے یہ اس قسم کی ریاضتیں مشقتیں بڑی ضروری قرار دی گئی ہیں۔ کہا کہ تمہارے ذہن میں بھی یہ بات آ سکتی ہے کہ شاید اس طرح سے خدا کا قرب حاصل کیا جائے۔ کہا کہ **وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ** (2:186) روزے کی پابندیوں کے ساتھ ذہن میں یہ خیال آ سکتا تھا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ خدا کہیں دور نہیں ہے کہ اس کا قُرب حاصل کرنے کے لیے تمہیں یہ کچھ کرنا پڑے۔ جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو کہو کہ **اِنِّیْ قَرِیْبٌ** (2:186) میں تو پہلے ہی ان سے قریب ہوں۔ دوسری جگہ **مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ** (50:16) کہا ہے کہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ ایک اور جگہ کہا کہ **وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ** (57:4) تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ **فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ** (2:115) جدھر بھی نگاہ اٹھاؤ گے خدا کو موجود پاؤ گے۔ کہا یہ ہے کہ جس خدا کے قریب ہونے کی یہ کیفیت ہے اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے تم یہ سمجھو کہ یہ ریاضتیں' یہ مشقتیں اس کے لیے تھیں تو سنو! یہ بات نہیں ہے۔ ہم ہر انسان کے قریب ہیں۔ اس کے بعد ہے کہ **اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ** (2:186) میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

لفظ ''دعا'' کی حقیقت اور خدا تعالیٰ کے ہاں اس کی قبولیت کی نوعیت

اب یہاں جو یہ الفاظ آئے ہیں آپ دیکھیں گے کہ **دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ** (2:186) میں یہ وہی ہے جہاں سے دعا کا لفظ آپ کے ہاں آیا۔ اور یہ ہے وہ اہمیت جس کے لیے میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تو ایک مستقل موضوع ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ پچھلے سال (1968ء) جب ہم نے اس درسِ نو کا مارچ میں آغاز کیا تھا' آج تو اپریل کی بیس تاریخ ہے' پچھلے سال اپریل کی جو 28 تاریخ تھی' اس میں بھی یہی موضوع سامنے آیا تھا جب سورۃ الفاتحۃ میں **اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ** آیا تھا۔ میں نے اس وقت بھی دعا[1] کے متعلق تفصیل سے عرض کیا تھا۔ یہ بات سال بھر کی ہو گئی ہے۔ جو احباب اس وقت موجود تھے' شاید ان کے ذہن میں بھی اس کے نقوش اتنے ابھرے ہوئے نہ

---

[1] جو قارئین اس سے دل چسپی رکھتے ہوں' وہ ملاحظہ فرمائیں۔ پرویزؒ: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ الفاتحۃ (مدیر پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق)' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص ص۔ 159 تا 175۔

ہونگے اور بہت سے احباب تو بعد میں شریک ہوئے ہیں۔اس لیے میں اس تفصیل میں تو نہیں جاؤں گا' جو اس زمانے میں گیا تھا لیکن اس کے متعلق بتانے کی ضرورت ضرور ہے۔

یہاں اپنی زبان میں اگر ہم یہ کہیں تو کہا یہ گیا ہے کہ **اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ** (2:186) جب بھی کوئی دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔ یہ ہے اس کا عام ترجمہ جو کیا جاتا ہے۔اور یہ چیز واقعہ کے خلاف ہے۔ ہر دعا کرنے والے کی دعا تو قبول ہوتی نہیں ہے' ہوسکتی بھی نہیں ہے۔اب آپ یہ کہیں گے کہ یہ کیا کہہ دیا' ہوسکتی نہیں ہے'۔بات تو صاف ہے ہائی کورٹ میں زید اور بکر کا مقدمہ پیش ہے۔ زید خدا سے دعا کرتا ہے کہ میرے حق میں فیصلہ ہوجائے اور بکر دعا کرتا ہے کہ میرے حق میں فیصلہ ہوجائے۔کیا یہ دونوں کی دعا قبول ہوسکتی ہے؟ کس کی دعا قبول ہوگی؟ ''اک او ہناں اچوں کہندا اے: جی' میں سونفل سُکھدا اں جے ہوجائے' دوہا کہندا اے ہزار سکھدا اں۔او کہندا اے پنجاں روپیاں دی نیاز دیاں گا' او کہندا اے پانچ سو روپے دی دیاں گا۔اے تے بولی لگن لگ پئی [1]''۔ کس کی دعا قبول ہوگی؟ جو زیادہ بڑھ کر بولی دے گا (معاذ اللہ)۔اس سے بڑے اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ان دونوں میں سے ایک تو وہ ہے جو اس مقدمے میں حق پہ نہیں ہے۔کیا یہ کچھ کرنے سے' دعا مانگنے سے' گڑگڑانے سے' رونے سے' نذر و منت مانگنے سے ''نفل سُکھن نال'' خدا اس کے حق میں فیصلہ کرادے گا؟ اگر یہ ہوا تو پھر تو عجیب قسم کا خدا ہے کہ ایک شخص جو حق پہ نہیں ہے وہ اس کے حق میں فیصلہ کرادیتا ہے محض اس لیے کہ اس نے ذرا گڑگڑا کر اس سے التجا کی تھی۔خدا عادل نہیں رہا۔اور جو حق پر نہیں ہے اس کے حق میں فیصلہ ہوگا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جو حق پہ تھا اگر یہ دعا نہ کرتا' تو کیا پھر یہ فیصلہ اس کے حق میں نہ ہوتا' کیا فیصلہ اس کے خلاف چلا جاتا؟ اگر وہاں صورت یہ ہے' خدا نے دخل دینا ہے تو پھر تو جو حق پہ ہے' اس کے حق میں ہی فیصلہ ہونا چاہیے۔اور اپنی عدالتوں میں ہم یہ روز دیکھتے ہیں' فیصلہ کرنے والے کی اجتہادی غلطیاں ہی کہہ لیجیے کہ غلط فیصلے بھی ہوتے ہیں۔اس سے تو یہ نظر آیا کہ ان فیصلوں کے اندر خدا دخل نہیں دیتا ورنہ اگر اس کے مطابق یہ فیصلے از خود ہونے ہوتے' تو یقیناً حق والے کے حق میں فیصلہ ہوتا' ناحق کے حق میں فیصلہ ہوتا ہی نہیں۔

''دعا'' کے معنی مانگنا نہیں بلکہ ''پکارنا'' کے ہوتے ہیں

برادرانِ عزیز! پھر یہ دعا کیا ہے؟ کہا یہ گیا ہے کہ' میں اس کا ترجمہ دعا ہی کررہا ہوں' ہر دعا مانگنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں' میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ بات یہ نہیں ہے۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو دعا کا تصور ''مانگنا'' ہے یہ سرے سے ہی غلط ہے۔دعا کے

---

[1] ان میں سے ایک کہتا ہے: جی' میں ایک سو نفل مانتا ہوں کہ یہ فیصلہ میرے حق میں ہوجائے' دوسرا کہتا ہے کہ میں ایک ہزار نفل ادا کرنا مانتا ہوں۔ پہلا کہتا ہے کہ میں پانچ روپے کی نیاز دونگا۔وہ دوسرا کہتا ہے کہ میں پانچ سو روپے کی دونگا۔یہ تو بولی لگنے لگی۔

معنی مانگنے کے ہیں ہی نہیں۔ دعا کے معنی ''کسی کو آواز دے کر پکارنے'' کے ہیں۔ یہ پکارنا کیا ہے؟ جب تک آپ سیدھے راستے پہ چلے جاتے ہیں آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستہ مجھے منزل تک لے جائے گا' آپ کو کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جہاں زندگی کا دوراہا آتا ہے' جہاں راستے دو طرف مڑتے ہیں' وہاں کھڑے ہو کر آپ کو پوچھنا پڑتا ہے کہ یہ راستہ کدھر جائے گا اور یہ راستہ کدھر جائے گا؟ یا یہ کہ صاحب! میں نے شہر لاہور میں مزنگ جانا ہے' بھئی! میں اس میں سے کس طرف جاؤں؟ وہاں دوراہے پہ پہنچ کر' کراس روڈ کے اوپر پہنچ کر' آپ کو پوچھنا پڑتا ہے۔ کہا کہ اے کاروانِ انسانیت! جب تم کسی دوراہے کے اوپر پہنچو گے' وہاں تمہیں معلوم نہ ہوگا کہ صحیح راستہ کس طرف ہے؟ وہاں تم ہمیں پکارو گے تو ہم جواب دیں گے کہ یہ راستہ صحیح ہے' اس طرف جاؤ' یہ تمہاری منزل کی طرف لے جائے گا۔ ہم تمہاری پکار کا جواب دیں گے۔

خدا کی کتاب قرآنِ کریم قدم قدم پر انسانیت کی پکار کا جواب دیتی ہے

اب سوال یہ ہے کہ اس پکار کا جواب کہاں سے ملتا ہے؟ کہا کہ خدا کی کتاب سے ملتا ہے۔ وہ قرآن اس قدر قریب ہے کہ تمہارے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے' وہ قرآن تمہارے سینوں کے اندر ہے۔ ہر وہ معاملہ جہاں تمہیں کسی قسم کا اشتباہ ہو' ابہام ہو' بات صاف نہ ہوتی ہو' دوراہا آ گیا ہو' معلوم نہ ہوتا ہو کہ میں کس طرف مڑوں' یہ مقام انسان کے لیے بڑی الجھن کا ہوتا ہے' وہاں انسان سر اٹھا کر دیکھتا ہے کہ کوئی آنے جانے والا ملے تو اس سے پوچھے کہ ''جاؤں کدھر کو میں''۔ کہا ہے کہ ایسے مقام پہ کسی سے نہ پوچھو' کشمکش کی ضرورت نہیں' اضطراب کی ضرورت نہیں' کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں' مجھے آواز دو۔ اور جب تم مجھے آواز دو گے تو میں جواب دوں گا کہ کدھر جاؤ۔ اب خدا براہِ راست تو کسی کو جواب نہیں دیتا۔ حضراتِ انبیائے کرامؑ کا معاملہ ہم نہیں جان سکتے کہ وہ کیا تھا۔ نبوت نبی کی ایک خصوصیت تھی غیر از نبی اس کا ادراک ہی نہیں کر سکتا' جان ہی نہیں سکتا کہ اس کا اور خدا کا تعلق کیا تھا۔ بات عام انسانوں سے ہو رہی ہے اور ختمِ نبوت ﷺ کے بعد تو سارے انسان ہی عام رہ جائیں گے۔ خدا کو جب بھی پکارا جاتا ہے تو خدا براہِ راست کسی کو جواب نہیں دیتا۔

یہ خدا کا جواب ہمیں کہاں سے ملے گا؟ یہ کلام اللہ سے ملے گا۔ خدا نے تو کلام کر دیا ہے۔ ہم جب کلام پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ کوئی معاملہ' جو مشکل آ پڑے' جس میں وضاحت نہ ہو' میں جب اس سے پوچھوں گا' تو یہ قرآن اس کا جواب دے گا' میری ہر دعا کا جواب دے گا' یہ ہر پکار کا جواب دے گا۔ دور نہیں قریب تر ہے' اسی وقت جواب دے گا۔ اگر گائیڈ (قرآنِ کریم) جیب میں رکھا ہو' اس کے اندر نقشہ بنا ہوا ہو' ہر دوراہے پہ کھڑا ہو جائے تو کسی پوچھنے والے کی آپ کو ضرورت ہی نہیں ہے' گائیڈ نکالیے' وہاں سے دیکھیے' نقشہ بنا ہوا ہے' Indication (نشانی) دی ہوئی ہے نیچے ریفرنس دی ہوئی ہے' دیکھیے' اسے Consult کیجیے' اور چلتے چلے

جائیے۔ سارے Travellers (سفر کنندگان)' دنیا کے جتنے بھی ہیں' وہ اپنی اپنی گائیڈ (قرآنِ کریم) کتابیں لے جاتے ہیں۔ وہ جب بھی وہاں دوراہے پہ کھڑے ہو کر کسی راستہ بتانے والے کو آواز دیتے ہیں تو ان کی یہ گائیڈ بک ان کو راستہ بتاتی ہے' اس کا جواب دیتی ہے۔ کہا کہ کھانے پینے کی مشقتوں سے' یہ ریاضتیں ایسی نہیں کہ جس سے میں پھر ایسا کرنے والے کے قریب ہو جاتا ہوں۔ میں تو ہر انسان کے قریب ہوں' جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے اس کی پکار کا میں جواب دیتا ہوں۔ یہ جو چیز ہے ''پکارنا'' میں نے کہا کہ گائیڈ بک سے آپ نے دیکھ لیا' دوراہے پہ کھڑے ہو کر آپ نے خدا کا سائن پوسٹ پڑھ لیا۔ اس کے بعد جو اگلی چیز ہے تو اگر آپ اس کے مطابق چلیں گے تو صحیح منزل پہ پہنچ سکیں گے۔

خدا کی طرف سے عطا کردہ گائیڈ بک (قرآنِ حکیم) کے مطابق سفرِ زندگی طے کرنے کا نام عبادت ہے

یہ جو اس گائیڈ بک (قرآنِ کریم) کے مطابق آگے چلنا ہے' اسے عبادت کہتے ہیں یعنی دوسرے کا حکم مان لینا' اس کی محکومیت اختیار کر لینا' اس کے مطابق کام کرنا۔ دیکھیے! قرآنِ کریم نے دعا اور عبادت کو کس طرح مرادف المعنی قرار دیا ہے۔ یاد رکھیے! ہمارے ہاں جو مغالطہ ہوتا ہے وہ اپنے الفاظ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دعا' پکارنا تھا' ہم نے اپنے ذہن میں تصور بنا لیا ''مانگنا'' تو کہا کہ خدا سے مانگو۔ اور پھر اپنے ہاں جو اصطلاح بنائی اس میں ''اسی دوہاں نوں کٹھاں کردتا' دعا مانگنا بنا لیا' توں وی راضی رہو' توں وی راضی رہو۔ او عربی والا یا قرآن والا لفظ دعا وی آ گیا تے او منگتے آں والی گل وی نال آ گئی [1]''۔ دعا مانگنا یعنی دعا بھی مانگنا رہ گیا۔ آپ دیکھتے ہیں ہم نے کھڑے ہو کر کبھی غور نہیں کیا' کہ ہم الفاظ کیا بولتے ہیں۔ سنیے کہ قرآنِ کریم کی رو سے یہ دعا کے معنی کیا ہے۔ کہا ہے کہ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (40:60) تمہارا رب یہ کہتا ہے: مجھے آواز دو' میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ یہ وہی الفاظ ہیں جو یہاں ابھی ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیے ہیں' سورۃ البقرۃ کی آیت' جو زیرِ نظر ہے' اس میں یہی لفظ آئے ہیں کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2:186)۔

قرآن حکیم کی عطا کردہ راہنمائی سے غرور و تکبر برتنے کا نتیجہ جہنم ہے

اوپر یہ آیت آئی ہے کہ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (40:60) مجھے آواز دو' میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ آگے ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ (40:60) یاد رکھو! جو لوگ ہماری عبودیت' محکومیت اختیار کرنے

---

[1] ہم نے دونوں کو اکٹھا کر دیا اور ''دعا مانگنا'' بنا لیا۔ یہ بھی راضی اور وہ بھی راضی۔ وہ عربی والا یا قرآن والا لفظ 'دعا بھی' آ گیا تو وہ ''منگنے'' والی بات بھی ساتھ ہی آ گئی۔

سے تکبر برتتے ہیں' وہ جہنم میں چلے جائیں گے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن نے کس طرح واضح کر دیا کہ خدا کے بلانے کے' آواز دینے کے' معنی کیا ہیں؟ یہ کہ اس کی عبادت سے استکبار نہ برتا جائے' اس کی محکومیت اختیار کرنے سے تکبر نہ برتا جائے۔ یہ ہے جسے خدا کو پکارنا کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی دوسری چیز ہی نہیں ہے۔ اس عن عبادتی کے معنی یہ ہیں' یہ اس سے الگ کوئی دوسری چیز ہی نہیں ہے۔

اب اگلی چیز یہ ہے کہ یہ دعا کس کی قبول ہوتی ہے؟ یہ دعا' عزیزانِ من! میں وہی لفظ لے رہا ہوں' جو اپنے ہاں کے استعمال ہونے والے ہیں' کس کی قبول ہوتی ہے؟ لفظ یاد رکھیے' یہ وہی استجاب' مستجاب الدعوات ہے جو ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے' قرآن کا لفظ ہے اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2:186)۔ اس کے آگے آپ دیکھیے کہ یہ سارے وہ الفاظ ہیں' ایک دوسری جگہ کہا کہ وَیَسۡتَجِیۡبُ الَّذِیۡنَ (42:26) ان لوگوں کی دعا قبول ہوتی ہے۔

دعا کی قبولیت کے لیے اولین شرط

دعا قبول ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کن کی؟ کہا کہ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (42:26) جو خدا کے احکام پر ایمان لاتے ہیں' وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (42:26) اور اعمالِ صالحہ کرتے ہیں۔ یہ یَسۡتَجِیۡبُ کا لفظ یہاں ہے' تو یہ کیا بات ہوئی؟ یہ وہی ایمان اور اعمالِ صالحہ کی بات ہوئی' یہ ایمان و اعمال صالحہ کا نتیجہ ہے' جسے آپ دعا کی قبولیت کہتے ہیں۔ ایمان و اعمالِ صالحہ سے ہوتا کیا ہے؟ انسان کے کاموں کے نتائج خدا کے قوانین کے مطابق مرتب ہو جاتے ہیں۔ اسے ہی حصولِ مقصد کہتے ہیں' اسے ہی دعا کا قبول ہونا کہتے ہیں۔ خود قرآن نے یہ بتا دیا۔ وہاں پہلی چیز ہے کہ دعا عبادت کے مرادف ہے' دوسری جگہ بتا دیا کہ دعا کا جو قبول ہونا ہے' وہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر صرف وہ دعا مانگی جائے' جیسے ہم یہ کچھ کرتے ہیں اور یہ اعمالِ صالحہ نہ ہوں تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ کہا کہ لَہٗ دَعۡوَۃُ الۡحَقِّ (13:14) یاد رکھیے! سچی پکار صرف خدا کے لیے ہونی چاہیے۔ ہر الجھے ہوئے معاملے کا حل اس کے ہاں سے تلاش کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس وَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ لَا یَسۡتَجِیۡبُوۡنَ لَہُمۡ بِشَیۡءٍ (13:14) جو لوگ یہ چاہیں کہ اس کے قانون کو چھوڑ کر کسی اور کے قانون کی رو سے تعمیری نتائج پیدا کر لیں تو ان کی یہ آرزو اور کوشش رائیگاں جائے گی۔ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے بغیر' جہاں سے بھی تم کسی چیز کا جواب مانگتے ہو' تم صرف اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو' بیٹھے ہوئے ہو اور دعائیں مانگ رہے ہو' تو سنیے عزیزانِ من! یہ قرآن کیا کہتا ہے؟ دعا اور اس کے ساتھ انسان کی یہ کیفیت' بالکل فطری سی ہو گئی ہوئی ہے۔ اصل میں دعا کے لیے ہر مانگنے والا ہمیشہ ہاتھ پھیلاتا ہے اور یہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا تو محاورہ ہے۔ مانگنے کے ساتھ ہی' غیر شعوری طور پر ہاتھ بڑھ جاتا ہے اور اس کی کیفیت بھی یہ ہوتی ہے کیونکہ وہ کچھ لینا چاہتا ہے۔ زیادہ تاویل کی صورت ہوتی ہے تو اس کے دونوں ہاتھ اس کے سامنے بڑھ

جاتے ہیں اور یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔

اعمالِ صالحہ کیے بغیر خدا سے کچھ مانگنے کا نتیجہ

قرآن کہتا ہے کہ اعمالِ صالحہ کے بغیر خدا سے اس طرح سے ہاتھ اٹھا کر مانگنے اور محض ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جانے اور مانگنے کی مثال یہ ہے کہ **کَبَاسِطِ کَفَّیْہِ اِلَی الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاہُ وَ مَا ھُوَ بِبَالِغِہٖ** (13:14) وہ دریا کے کنارے پہ کھڑا ہو کر ہاتھ پھیلائے ہوئے ہو' پیاسا ہو اور کہے کہ 'آجا پانی' آجا پانی' آجا پانی''۔ قرآن کہتا ہے کہ پوچھو اس سے کہ کیا پانی آجائے گا؟ وہ تو صرف ہاتھ پھیلائے ہوئے کھڑا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ ایسا عمدہ Graphic (صحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کردہ ترسیمی) نقشہ کھینچتا ہے کہ دریا کے کنارے ہاتھ پھیلائے ہوئے کھڑا ہے اور پکار رہا ہے کہ آجا پانی''۔ کہا ہے کہ پوچھو اس سے کہ کیا پانی اس کے ہاتھ میں آجائے گا؟ عزیزانِ من! بات صاف ہوگئی کہ دعا ہوتی کیا ہے۔

فرعون کے متعلق دعا مانگنے کے سلسلہ میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو خدا تعالیٰ کا جواب

ہم آپ تو ایک طرف رہے' سنیے! دعا مانگنے والے ہیں خدا کے دو اولی العزم پیغمبر حضرتِ موسیٰؑ اور حضرتِ ہارونؑ۔ فرعون' اس کے سرداروں اور فوج کے ساتھ ٹکراؤ ہو رہا ہے' بڑا عظیم مرحلہ ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ **قَالَ مُوْسٰی رَبَّنَآ** (10:88) حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! **لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِکَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِھِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ** (10:88) فرعون کی فوجوں کو تباہ کر دے' ان کا جاہ و جلال جس کی بنا پہ یہ تیرے خلاف سرکشی اختیار کیے ہوئے ہیں' خاک میں ملا دے' ہمارے اس پروگرام کو عروج دیدے اور جس عقل و فہم سے یہ اس قسم کی انسانیت سوز تدابیر سوچتے ہیں' اسے سلب کر لے اس لیے کہ لوگ کبھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک یہ اس قسم کے الم انگیز عذاب کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیں گے۔ اسے ہم کہتے ہیں کہ یہ دونوں اولیٰ العزم پیغمبر دعا کر رہے ہیں۔ اس پر **قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا** (10:89) خدا نے کہا ہے کہ ہاں اے دونوں بھائیو! ہم نے تمہاری دعا قبول کر لی۔ کیا اب موج ہوگئی؟ خدا کے دو پیغمبر مانگنے والے ہیں' خدا براہِ راست جواب دینے والا ہے اور اس جواب میں شبہ ہی نہیں ہو سکتا' پیغمبر کو تو شبہ ہی نہیں ہو سکتا کہ خدا کا جواب ہے' خدا نے تصدیق کر دی ہے' تو اب اس کے بعد'' لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ کہہ کر گھر آجانا چاہیے تھا' کام بن گیا تھا'' اس کے بعد یہی ہونا چاہیے تھا۔ اس سے زیادہ حتمی' یقینی چیز اور کیا ہو سکتی ہے کہ خدا براہِ راست تم سے کہتا ہے کہ ٹھیک ہے' دعا قبول ہوگئی۔ لیکن عزیزانِ من! ابھی فقرہ پورا نہیں ہوا۔ کہا یہ ہے کہ **قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا فَاسْتَقِیْمَا** (10:89) اس پر اللہ نے کہا کہ ہم نے تم دونوں بھائیوں کی دعا کو سن لیا اور اسے قبول بھی کر لیا۔ اب

اپنے پروگرام پہ جم کر کھڑے ہو جاؤ' یاد رکھو! پاؤں میں لغزش نہ آنے پائے' تم اپنے پروگرام میں پوری ثابت قدمی دکھاؤ اور جلد بازی میں وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيۡلَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (10:89) ان لوگوں کا طریق نہ اختیار کرو جو ہمارے قوانین اور ان کے نتیجہ خیز ہونے کے انداز سے واقف نہیں ہوتے۔ اور کسی ایسے شخص کا راستہ اختیار نہ کر لینا جس کو علم و حقیقت نہ ہو۔ سیدھے راستے کے اوپر رہو اور جم کر مستقل مزاجی سے' ثابت قدمی سے' استقامت سے' پروگرام کے اوپر کھڑے ہو جاؤ' تمہاری دعا قبول ہو جائے گی۔

برادرانِ عزیز! پیغمبروں کی دعاؤں کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے اور یہ نتیجہ ہو بھی رہا ہے۔ اس کے برعکس یہ ہماری دعائیں ہیں' ان کا نتیجہ بھی دیکھیے کہ ہزار برس سے آپ دیکھتے ہیں کہ ہر جمعہ کی نماز کے بعد' ہر عید کی نماز کے بعد' ہر خطبے کے بعد' ہر اجتماع میں' دعائیں مانگی جا رہی ہیں کہ یا اللہ! دشمنوں کا بیڑہ غرق کر' ان کی بستیوں کو تباہ کر دے' ان کی اجتماعیت میں انتشار پیدا کر دے۔ گڑگڑا رہے ہیں اور ہزار برس سے یہ دعائیں مانگی جا رہی ہیں۔ یہ وہی دعا ہے جو حضرتِ موسیٰؑ اور ہارونؑ نے بھی مانگی تھی۔ یہی تھی وہ دعا۔ اس دعا کے بعد اُنہیںؑ کچھ کہا گیا' انہوں نے وہ کیا' تو وہ ان کے سامنے ہو کر رہا۔ چند دنوں میں انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان کی بستیاں بھی مسمار ہو گئیں' ان کی شان و شوکت بھی خاک میں مل گئی' اور ان کے نظام کو کبریائی بھی حاصل ہو گئی۔ یہاں ہزار برس سے وہی دعا ہم مانگ رہے ہیں۔ ہو کیا رہا ہے؟ یہ کہ فَاسۡتَقِيۡمَا (10:89) والی جو بات ہے' وہ ہم نے آگے نہیں پڑھی۔ وہ ہم نے اتنا ہی پڑھا کہ دعا مانگنے سے کام ہو جاتا ہے۔

دعا کی پہلی شرط: سرکش جذبات سے ہٹ کر صحیح نصیب العین کا ہونا ضروری ہے

عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ دعا ہوتی کیا ہے؟ کسی مقصد کے حصول کے لیے تین چار کڑیاں بڑی ضروری ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ نصب العین کا صحیح تعین ہو جائے۔ یہ بڑی ضروری چیز ہے۔ اس لیے کہ انسان اگر اپنے جذبات کے تابع چلے' تو سینکڑوں مرتبہ ایسی چیزوں کی آرزوئیں کرنے لگ جاتا ہے جو آخر الامر اس کے لیے بڑی نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ غلط چیزوں کی آرزو ہو جاتی ہے۔ تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس کے دل میں جو آرزو پیدا ہو' جو مقصد پیدا ہو' جو کرنا چاہتا ہے' وہ اپنے ہی جذبات کے تابع نہ کرے بلکہ خدا کا قانون جو چاہتا ہے اس کے مطابق دل کے اندر اپنا نصب العین' اپنی آنکھوں کے سامنے اپنا نصب العین' متعین کرے۔ یہ ہے مقصد قرآن کی اس آیت کا جس کے غلط مفہوم اور ترجمہ نے ہمیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ کہا ہے کہ وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ (81:29) تمہیں چاہیے کہ تمہاری مشیت خدا کی مشیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ تم وہ چاہو' جو ایسے مقام پہ خدا چاہتا ہے کہ تم چاہو۔ چاہو ہی تم وہ۔ آپ نے دیکھا کہ پہلی ہی شرط کیسی عجیب ہو گئی۔ خدا کے قانون کے خلاف دعائیں مانگو گے تو سوال ہی نہیں ہے کہ تمہاری وہ دعا پوری

ہو جائے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ تم اپنے اندر آرزو، دعا، مقصد، نصب العین، وہ متعین کرو جو خدا کا قانون چاہتا ہے کہ تم ایسا کرو۔ ان معاملات میں اقبالؒ (1877-1938) بہت آگے جاتا ہے اور اتفاق ہے کہ آج بیس تاریخ ہے اور کل اکیس کو تو ان کی برسی بھی آتی ہے۔ ان کی تقریب میں افسوس ہے کہ اس دفعہ ہم کوئی اجتماع نہیں کر سکے لیکن خیر بات سامنے آگئی، تو ان کا ذکر یونہی سہی۔ ان معاملات کو وہ نہایت حسین انداز سے بیان کرتے تھے۔ قرآن پہ ان کی نگاہ تھی Expression (اظہار) کا فطرت نے ان کو بڑا حسین ملکہ دیا تھا۔ بات یہ کہی ہے کہ تم اپنے دل میں چاہو ہی وہ، آرزو ہی وہ کرو جو قانونِ خداوندی کے مطابق ہو۔ کہتا ہے کہ

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے!

(ضربِ کلیم)

دعا کی قبولیت کے لیے شدتِ آرزو کی اہمیت

عزیزانِ من! دعا کے قبول ہونے کا پہلا مرحلہ تو یوں طے ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ دعا بدل کیسے جائے؟ کہا کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (81:29) تم اپنی آرزوؤں کو اس کے قانون سے ہم آہنگ کر لو۔ پہلی چیز تو یہ ہو گئی۔ دوسری چیز یہ ہے کہ یہ تو صرف آرزو بیدار ہوئی ہے۔ آرزو میں شدت پیدا کرو۔ صحیح بات ہے صحیح مقصد ہے، اس کو حاصل کرنا ہے۔ اس کے حصول کے لیے اپنے دل کے اندر، اس آرزو کو شدید کرتے چلے جاؤ۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کی آرزو جتنی شدید ہوتی چلی جائے گی، اتنی ہی آپ کے اندر اس کے حصول کے لیے خاص قسم کی توانائیاں بیدار ہوتی چلی جائیں گی، ہمتیں بڑھتی چلی جائیں گی، عزم بلند ہوتے چلے جائیں گے۔ اس شدتِ آرزو سے انسان کے اپنے اندر ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ یاد رکھیے! یہ جسے آپ پکارنا کہتے ہیں، یہ اپنی صحیح آرزو میں شدت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ، انتہائے شوق ہے، اقبالؒ (1877-1938) اس کو عشق کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، یہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنے اندر ایک عشق کی سی کیفیت پیدا ہو جانا، جنون پیدا ہو جانا ہے۔ اس سے انسان کے اپنے اندر ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔

تکمیلِ آرزو کے عشق سے کائناتی قوتیں انسان کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں

یاد رکھیے! دعا سے، باہر سے کوئی چیز، آپ کے لیے نہیں ہوتی، آپ خود اندر سے بدل جاتے ہیں۔ اس کے لیے ایک دوسرا شعر اقبالؒ ہی کا ہے کہ

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تُو بدل جائے

(ضربِ کلیم)

اور ساری بات تو تُو بدل جانے سے ہے۔ باہر کی ساری دنیا اس تُو کے بدلنے سے بدل جاتی ہے:

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں، دنیا مرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے رنگ ہر اک چیز کا بدلا!

نگاہ میں تبدیلی پیدا کیجیے، اپنے اندر نفسیاتی تغیر پیدا کیجیے۔ اور قرآنِ کریم دیکھیے کہ اس نے سورۃ الرعد کے اندر کیا کہا ہے کہ یاد رکھیے! کسی قوم کی حالت کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آسکتی تاوقتیکہ اس قوم کے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہ ہو جائے: **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ** (13:11) قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کرے تو باہر کے خارجی احوال و کیفیات بدلتے ہیں، اس کے بغیر نہیں بدل سکتے۔ اور یہ جو ذہنیت اور نفسیات میں تبدیلی ہے اس کو ایمان کہتے ہیں۔

مستقل اقدار کی قدر و قیمت کو ذہنی طور پر تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے

عزیزانِ من! ایمان صرف ذہنیت کو بدلنے کا نام ہے، یہ نہیں ہے کہ جب بھی ہم نے **امنوا باللہ و ملائکتہ** کہہ دیا تو یہ ہمارا ایمان ہو گیا، یہ چیز بالکل نہیں ہے۔ ایمان سے اقدار بدل جاتی ہیں، Values بدل جاتی ہیں، ذہنیت بدل جاتی ہے، انسان کی نفسیاتی کیفیت بدل جاتی ہے۔ اسے ایمان کہا جاتا ہے۔ تو دوسری چیز یہ ہوئی کہ اس شدتِ آرزو سے انسان کے اپنے اندر ایک تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس تبدیلی سے اس کے اندر کی جو مضمر قوتیں ہوتی ہیں، چھپی ہوئی صلاحیتیں ہوتی ہیں، جسے آپ Potentialities کہتے ہیں، وہ Actualize (بارز) ہو جاتی ہیں، وہ ابھر کر اوپر آجاتی ہیں۔ کبھی انتہائی خطرے کے وقت آپ دیکھیے، کاٹنے والا کتا کہیں بھونکے اور آپ کے پیچھے لگے، تو آپ دیکھیے کہ جس تیزی سے آپ بھاگتے ہیں، اس کے بعد آپ خود حیران ہو رہے ہوتے ہیں کہ یہ تیزی کہاں سے آئی۔ یہ کیا ہے؟ یہ ہے کہ خطرے کے احساس نے، آپ کے اندر اس سے حفاظت کی، آرزو نے شدت پیدا کی، شدتِ آرزو سے جو آپ کی دبی ہوئی قوتیں جو آپ نے کہیں چھپا کر رکھی ہوئی تھیں، وہ از خود نمود میں آگئیں اس تیزی سے کارفرما ہوئیں کہ عام حالات میں آپ ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ عزیزانِ من! وہ اگلی چیز پیدا ہوئی۔ یہ جو شدت سے یہ آرزو پیدا ہوتی ہے، اس سے میں نے کہا ہے کہ یہ چھپی ہوئی قوتیں باہر آجاتی ہیں۔

عربوں کے ہاں دعا اور لفظ ''الداعیۃ'' کا استعمال اور شکر کا مفہوم

میں بار بار کہا کرتا ہوں' شاید ہر درس میں دہرایا کرتا ہوں کہ عربوں کی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے ایک ایسی زبان بنائی۔ پتہ نہیں یہ کیا قوم تھی صاحب! کہاں تک ان کی نگاہیں پہنچی ہوئی تھیں! دعا کا جو لفظ ہے' اس سے ان کے ہاں الداعیة ایک لفظ تھا۔ یہ کیا چیز تھی؟ آپ گائے یا بھینس کا دودھ دوہیے' ان میں ایسی بھی ہوتی ہیں ''جنوں کیندے نیں دودھ چڑھا گئی [1]'' دودھ ہوتا ہے' اسے وہ چڑھا جاتی ہے۔ اب ایسے جانور کے لیے یہ کیا کرتے تھے؟ یہ کہ جو دودھ آرہا ہوتا تھا اس میں سے بھی کچھ حصہ یہ نکالنے کی بجائے' اس کو وہیں چھوڑ دیتے تھے۔ اب یہ جو دودھ تھا' یہ تو وہاں سے' اس کے سرچشمے سے' نکل کر آگے آگیا ہوا ہوتا تھا' اس کا اپنا تقاضا ہوتا تھا کہ وہ اس دودھ کو باہر نکالے لیکن نکلتا تو جب تھا کہ اس کو دبا کر یوں باہر نکالا جائے جسے یہ کرنا انہوں نے چھوڑ دیا۔ اب فطرت کا تقاضا یہ ہو جاتا تھا کہ وہ پیچھے سے جو دودھ ہے' وہ آگے بڑھے اور وہ اس دودھ کو دھکیلے تاکہ یہ دودھ خود بہہ نکلے۔ اور جب وہ آگے بڑھے تو وہ خود اپنی جگہ سے آگے آگیا۔ یہ جو اتنا سا دودھ چھوڑ دیتے تھے کہ اس کی وجہ سے چھپایا ہوا دودھ آگے آجائے' اسے وہ عربی میں الداعیة کہتے تھے۔ میں کہتا ہوں کیا قوم تھی یہ صاحب! ایسے محرکات جو چھپی ہوئی توانائیوں کو کھینچ کر باہر لے آئیں۔

دعا کی قبولیت کا دارومدار اجتماعی نظام کے خدوخال کا رہین منت ہوتا ہے

اور یہاں سے ان کے ہاں کا لفظِ دعا ہے۔ اب آپ سوچ لیجیے کہ دعا کہتے کس کو ہیں۔ اب شدتِ آرزو بھی آگئی' چھپی ہوئی توانائیاں بھی باہر آگئیں اور اس کے بعد تو پھر عملی قدم تو خود اٹھے گا۔ اب وہ جو تھن ہیں' پھر جا کر ان کو دوہنا ہوگا۔ معاملہ سارا تیار ہوگیا' وہاں دعا قبول ہوگئی' چھپی ہوئی توانائیاں بھی ان کے زور کے اوپر آگے بڑھ آئیں' اب دودھ نکال لیجیے' یہ ہے جسے کہا ہے کہ **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ** (2:185)۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ شکر کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ دودھ سے بھرے ہوئے تھن جن میں سے دودھ ٹپک رہا ہو۔ یہی قرآن نے دعا کے مقام میں بھی کہا ہے کہ پھر یہ کیفیت ہو جائے گی کہ یہ تھن پھر دودھ سے بھر جائیں گے۔ یہ جو اس کے بعد صحیح اقدامات ہونگے' انہیں آپ اعمالِ صالحہ کہتے ہیں۔ ایمان' صحیح نصب العین کا تعین ہے' دعا' اس کے حصول کے لیے شدتِ آرزو کی بیداری ہے تاکہ اس سے آپ کی چھپی ہوئی توانائیاں' اس سطح کے اوپر آجائیں' بروئے کار آجائیں۔ اعمالِ صالحہ' اس نصب العین کے حصول کے لیے صحیح اقدامات پیہم اقدامات ہیں' یہ **فاستقیما** (10:89) ہیں یعنی اس کے اوپر جم کر کھڑے ہو جانا۔

---

[1] جس کو کہتے ہیں کہ دودھ چڑھا گئی۔

مذہب میں انسان کا خدا کے ساتھ تعلق سراپا انفرادی ہوتا ہے جب کہ دین نوعِ انسانی کی حد تک اجتماعی نظام عطا کرتا ہے

یہ چیز انفرادی نہیں ہے بلکہ یہ اجتماعی نظام کے اندر ہی ممکن ہے اور یہ عجیب چیز ہے۔ مذہب میں خدا اور بندے کا تعلق انفرادی ہوتا ہے: Individual Ralationship(انفرادی تعلق) A Private Relationship Between Man and God (بندے اور خدا کا ایک پرائیویٹ تعلق)' میرا تعلق خدا کے ساتھ ذاتی سا ہوتا ہے' وہاں اس کا تعلق اس کے ساتھ ذاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ رام پر سادھو اپنے طریق کے اوپر' خانقاہ میں بیٹھا ہوا فقیر اپنے طریق کے اوپر' مسجد میں نمازی اپنے طریق کے اوپر' یہ تعلق استوار کرتا ہے اور میں گھر میں مصلیٰ بچھا کر بیٹھا ہوا' تسبیح لے کر بیٹھا ہوا' اپنے طریق کے اوپر قائم کرتا ہوں۔ یہ اپنا اپنا تعلق خدا سے ہوتا ہے۔ مذہب میں یہ چیز ہوتی ہے اور اسی سے آدمی فریب کھاتا ہے۔ میں نے اپنے ذہن میں تصور کر لیا کہ ہاں صاحب! خدا کا قرب حاصل ہو گیا' سادھو نے اپنے طور کے اوپر وہ تعلق تصور کر لیا۔ وہ جو کرشن کی مورتی کے سامنے بیٹھا ہوا ہے' وہ خدا سے اپنا تعلق قائم کیے ہوئے ہے' ادھر یہ جو مسجد میں سجدہ کر رہا ہے' یہ خدا سے اپنا تعلق قائم کیے ہوئے ہے۔ اس کا کوئی Pragmatic Test (استنتاجی ٹسٹ) تو ہے نہیں' کوئی ایسا معیار تو ہے نہیں کہ جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا تعلق ہے اور اس کا تعلق نہیں ہے۔ دین میں یہ تعلق نہیں ہوتا۔ یہ بات دور چلی جائے گی اور وضاحت چاہتی ہے۔ مختصراً دین میں Personal God (خدا کا تجسیمی و ذاتی و شخصی) تصور نہیں ہوتا' خدا کا شخصی تصور نہیں ہوتا۔ اس کا ایک عالمگیر قانون ہوتا ہے' اس قانون کا تعلق ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ اس قانون کا اتباع کرنے سے محسوس نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں اور اسی زندگی میں آتے ہیں۔ لیکن یہ چیز اجتماعی ہوتی ہے۔

قرآن حکیم کی تمام دعائیں اپنے اندر جمع کا صیغہ لیے ہوئے ہیں

برادرانِ عزیز! اسی اجتماعی چیز کے لیے قرآن نے یہ کہہ دیا ہے کہ **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** (9:119) اے وہ لوگو جو قانون خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہو! یہ انفرادی طور پہ نہیں ہو سکے گی' یہ جو سچے ہیں' ان سچوں کی جماعت کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ یہی چیز ہے کہ قرآنِ کریم میں' آپ دیکھیے گا' ساری دعائیں جمع کے صیغے میں آئی ہیں۔ آپ **اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ** (1:5) سے شروع ہو جائیے' پہلی جو دعا ہے' اس میں آپ جمع کا صیغہ لے لیجیے۔ سارے قرآن میں ربنا ہی آئے گا۔ نبی تو کہتا ہے کہ خدا میرا رب' مومنین کے لیے ہر جگہ ''ربنا'' ہی قرآن نے کہا ہے۔ نبوت کی انفرادیت تو اپنے مقام پہ ہوتی ہے لیکن وہ بھی جب اس مقام نبوت سے نیچے آ کر جماعتِ مومنین کا فرد بنتا ہے تو وہ بھی ان کی ہم نوائی میں ''ربنا'' ہی کہتا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس وقت کہتا ہے **اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ** (6:163) میں اس جماعتِ مسلمین کا سب سے پہلا یعنی Founder

Member ہوں۔ قرآنِ کریم نے اسی لیے ہر جگہ دعا کے لیے جمع کے صیغے دیئے ہیں۔

آج دنیا بھر میں تمام کی تمام مسلمانوں کی حکومتیں ہیں' اسلامی یا قرآنی حکومت کہیں بھی موجود نہیں ہے

اجتماعی نظام میں ہی دین پر عمل ہوسکتا ہے' انفرادی طور پر نہیں اور اجتماعی نظام اپنی آزاد مملکت کے اندر بروئے کار آ سکتا ہے' محکومیت میں نہیں۔ اپنی مملکت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ مردم شماری کے رجسٹر میں مسلمان نام رکھائیں تو آپ کی مملکت میں خدائی مملکت بن جائے بلکہ یہ وہ مملکت ہے جس میں خدا کے قوانین کو عملاً نافذ اور رائج کیا جاسکے اور اس کے نتائج اسی زندگی کے اندر' اسی دنیا کے اندر' عالمگیر فلاح و بہبودِ انسانیت کی محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں اور مرنے کے بعد پھر یہ جو قوم ہے' یہ جو افراد ہیں' زندگی کی اگلی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ زندگی کے ہر دوراہے پر جہاں فیصلہ کرنا ہو' ان کی یہ پکار ہوتی ہے کہ ہمیں کس طرف قدم اٹھانا چاہیئے' کیا رخ کرنا چاہیے؟ یہ زندگی کے اس دوراہے پر کھڑے ہوکر قانونِ خداوندی کو آواز دیتا ہے اور چونکہ اس نے یہ کہا ہے کہ **وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا** (6:115) ہم نے مکمل ضابطۂ حیات دیا ہے۔ یہ ضابطۂ حیات آپ کی ہر پکار کا جواب دے گا۔ انسانیت کی اجتماعی زندگی کے تمام معاملات' جتنے بھی ہیں' ان کے لیے قرآنِ کریم Guidance (ہدایت) دیتا ہے۔ اسی لیے اس کا دعویٰ یہ ہے کہ ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب ملے گا۔ وہاں سے جواب لیا جائے اور اس کے بعد جو بھی تمہارے لیے نصب العین یا منزل متعین کرے' اس پر پہنچنے کے لیے شدتِ آرزو آپ کے اندر ہو' اس کے حصول کے لیے ایک عشق کی کیفیت آپ کے اندر پیدا ہوجائے۔ جس سے آپ کے اپنے اندر ایک نفسیاتی تغیر پیدا ہوگا۔ اجتماعی طور پہ آپ کو یہ قدم اٹھانا ہوگا اور محسوس طور پر منزل آپ کے سامنے آجائے گی۔ عزیزانِ من! یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے یہ کہا تھا کہ **وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ** (2:186)۔ یہاں تک یہ بات ہوئی۔

دعا کی قبولیت کے لیے انسان کو خدا کی پکار کا پہلے جواب دینا ہوتا ہے

اس کے بعد کہا ہے کہ **فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ** (2:186) ان سے کہو کہ اپنی دعائیں قبول کرانا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ یہ ہے۔ وہاں یہ کہا تھا کہ پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے' یہاں **فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ** (2:186) کہا ہے کہ تم میری پکار کا جواب دو۔ کیا الفاظ ہیں' قرآن کے! اپنی پکار کا ہم سے جواب لینا چاہتے ہو؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہماری پکار کا تم جواب دو' اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو' ''ایتھے تے سودا نقد ہے بھائی صاحب! ساڈی گل تسی منو' تہاڈی گل اسی مناں گے ❶۔''

---

❶ بھائی صاحب! یہاں تو نقد سودا ہے۔ ہماری بات تم مانو' ہم تمہاری مانیں گے۔

عزیزانِ من! خدا سے اپنی بات منوانے کے لیے سب سے پہلے خدا کی بات خود ماننی چاہیے اور جب خدا کی بات مان لی جائے تو وہ جو اگلی بات ہے وہ تو پھر صرف کہنے کی رہ جاتی ہے کہ خدا سے وہ بات منوانے کی بات ہے۔ اس کی بات مانی جائے تو اپنی بات تو پھر خود ہی مانی جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ کس طرح سے مستجاب الدعوات بنتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ دعا کی اجابت کیسے ہوتی ہے؟ وہاں کیسے قبول ہوتی ہے؟ دو لفظوں کے اندر جواب ہے کہ **اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ** (2:186) دیتا ہوں جواب ہر پکارنے والے کا بشرطیکہ **فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ** (2:186) میری پکار کا جواب وہ دے۔ بات ذرا گہری سی ہے فلسفیانہ بات ہے۔

One Who Can Not say Thou Can Not Say I

یہ بڑی اونچی بات ہے۔ ''میں'' کہنے کے لیے کسی کو ''تو'' کہنا پڑتا ہے اس کے مقابلے میں یہ جو اپنا آپ ہے اس کا اثبات کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے وقت میں میں عرض کروں گا کہ قرآن نے یہ کیا بات کہی ہے۔ قرآن نے بات یہ کہی ہے کہ اپنی بات منوانا چاہتے ہو تو دوسرے کی بات مانو اور دوسرا خدا کے سوا کوئی نہیں ہے اس کی مانو تمہاری مانی جائے گی۔ یہ ہے **اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ** (2:186) دیتا ہوں جواب ہر پکارنے والے کا مگر **فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ** (2:186) ان سے کہو کہ میری پکار کا جواب دیں۔ تم خدا سے اپنی پکار کا جواب لینا چاہتے ہو وہ تم سے اپنی پکار کا جواب لینا چاہتا ہے یہ کس طرح سے ہوگا؟ **وَ لۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ** (2:186) ہمارے ان قوانین کی صداقتوں کے اوپر یقین رکھو۔ کا ہے کے لیے یہ سارا کچھ ہوگا؟ تم پکارو ہم جواب دیں گے ہم پکاریں تم جواب دو گے۔ یہ کا ہے کے لیے ہے؟ کہا کہ **لَعَلَّہُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ** (2:186) تاکہ تم زندگی کے صحیح راستے کے اوپر چل نکلو۔

''مرشد'' کے لفظ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! کیا آپ کو اس کے لیے مرشد کی تلاش ہوتی ہے؟ یہیں سے لفظ ''یرشدون'' ہے۔ یہیں سے لفظِ مرشد نکلا ہے صاحب! ''ارشاد'' ہے روشنی دینے والا۔ یہ ہے طریقہ اس کا جو قرآن نے بتایا ہے۔ ہم ان سب چیزوں کو چھوڑ کر پہلے تو ایک مرشد کی تلاش میں نکلتے ہیں پھر وہاں پہنچنے کے بعد یہ نہیں ہے کہ اپنی آرزوؤں کو اپنے اعمال کو اس کے قوانین سے ہم آہنگ کریں۔ نہیں صاحب! ''بے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید'' ''او کیندا اے کہ مصلیٰ وصلی سارا شراب دے مٹکے اچ ڈبو دے'' [1]۔

کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

تہانوں تے کجھ پتہ نئیں ہیگا کہ اے جاندا روز اوتھوں پھر کے اوندا [2] ہے۔ **لَعَلَّہُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ** (2:186) مرشد کی تلاش ہے۔ یہ

---

[1] وہ کہتا ہے کہ مصلیٰ وغیرہ سب شراب کے مٹکے میں ڈبو دے۔

[2] آپ کو تو کچھ بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ جا کر روزانہ وہاں سے پھر کر آتا ہے۔

ہے تمہارے لیے مرشد۔ یہ چیز جو میں نے کہی ہے کہ قرآن نے یہ کہا ہے' اس نے خود یہ چیز کہی ہے کہ جو رشد اور غی ہے' قرآن کی رو سے واضح ہو چکے ہیں۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (2:256) قرآن میں یہی لفظِ رشد ہے جو آپ دیکھتے ہیں وہاں آتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں "عقل و فکر کی رو سے جس راستے کی محکمیت یا جس کی حکمت کو عقل و فکر کی رو سے بھی پورا اترتا ہوا ہم دیکھ لیں" اس کو رشد کہتے ہیں۔ سنِ رشد آپ دیکھتے ہیں کہ اس کو کہتے ہیں جب انسان کی عقل و فکر پختہ ہو جاتی ہے۔ قرآن میں یہ چیز واضح ہو گئی ہوئی ہے اس لیے اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری دعائیں قبول ہوں تو فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي (2:186) ہماری پکار کا جواب دو' ہمارے قوانین کی محکمیت پر یقین رکھو۔

انسانیت کی دنیا میں خدا کے سوا کوئی دوسرے کا مرشد نہیں

ان سے کہو کہ یہ ہے وہ طریقِ عمل: لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (2:186). جس سے زندگی کا صحیح راستہ نکھر کر' ابھر کر' کھل کر' واضح طور پر' تمہارے سامنے آ جائے گا۔ اور یہی طریق ہے جس کو آپ مرشد پکڑنا کہتے ہیں۔ برادرانِ عزیز! خدا کے سوا کوئی دوسرا مرشد نہیں۔ راستہ وہی صحیح ہے' جو اس نے دکھا دیا ہے اور وہ قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ کر کے اس نے دکھا دیا۔ دعا مانگنا نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر دوراہے پہ کھڑے ہو کر جہاں آپ کو ذرا سا بھی اشتباہ گزرے کہ صحیح اور غلط میں امتیاز نہیں ہو سکتا' وہاں خدا کے قانون کو پکارو۔ خدا کا قانون' جو قرآن کے اندر محفوظ ہے' آپ کی پکار کا جواب دے گا' اس کے مطابق آپ عمل کریں گے تو آپ کی دعائیں قبول ہو جائیں گی۔ اس کے سوا نہ دعا کا کوئی مفہوم ہے' نہ قرآن کی رو سے اس کی قبولیت کا کوئی دوسرا طریق ہی ہے۔

عزیزانِ من! وقت ہو گیا' سورۃ البقرۃ کی آیات 188 تک ہم آ گئے' 189 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے' وہ میرے ذہن کی نارسائی۔

(پرویز۔ معراجِ انسانیت)